جاسوسی ڈائجسٹ
ستمبر 2021
بانی
معراج رسول
گولڈن جوبلی نمبر
50
Golden Jubilee
خاص شمارہ
قیمت 150 روپے

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
کے بانی
محترم معراج رسول

مدیرہ اعلیٰ محترمہ عذرا رسول
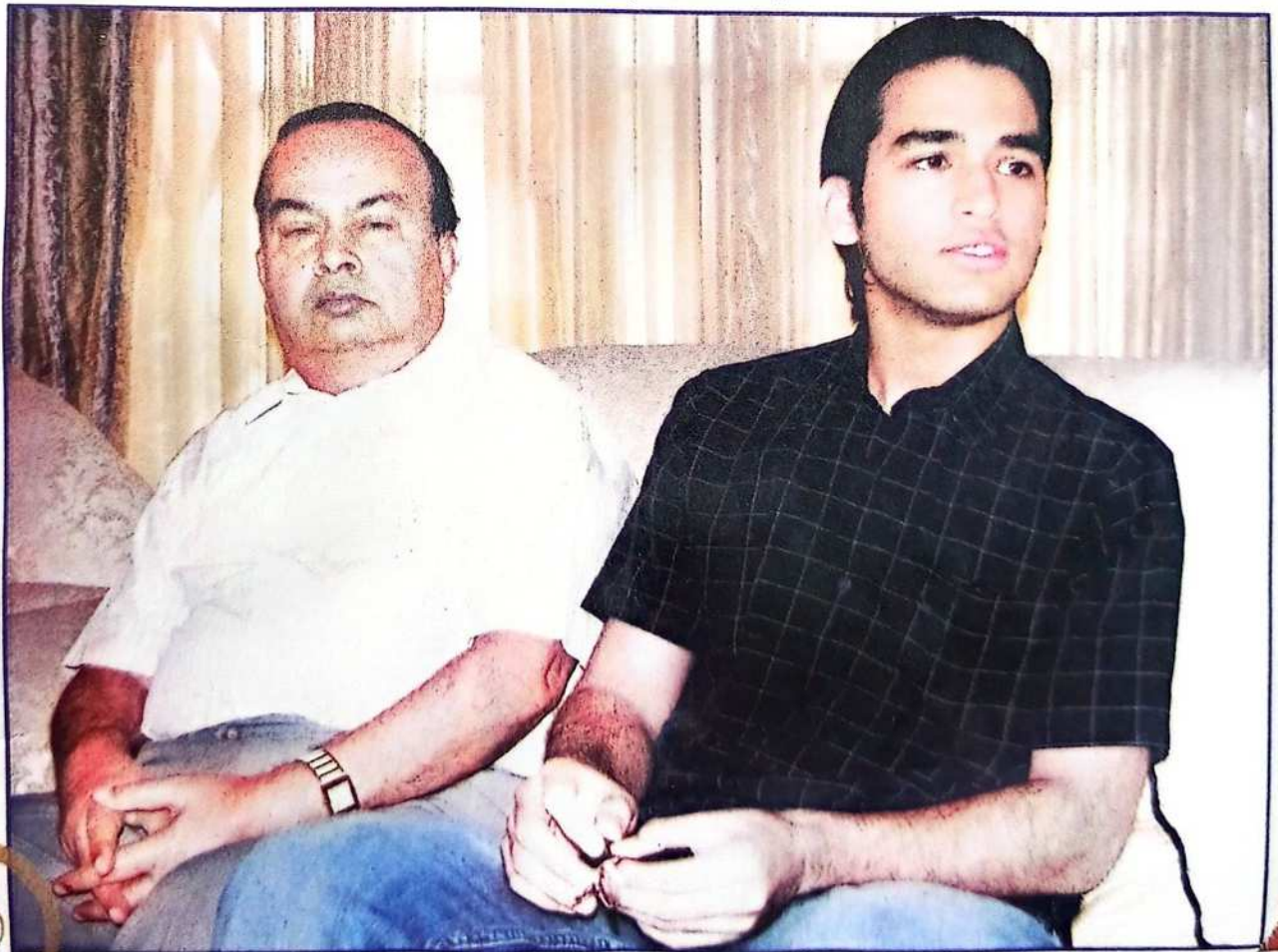
ذیشان رسول اپنے والد جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے بانی محترم معراج رسول (مرحوم) کے ہمراہ

ماہنامہ پاکیزہ کی معاون آمنہ حماد، جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ لبنیٰ خیال، مدیرہ اعلیٰ محترمہ عذرا رسول،
سسپنس ڈائجسٹ کی مدیرہ یمنیٰ احمد اور ماہنامہ پاکیزہ کی مدیرہ نزہت اصغر

ماہنامہ سرگزشت کے مدیر پرویز بلگرامی، جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ لبنیٰ خیال،
سسپنس ڈائجسٹ کی مدیرہ یمنیٰ احمد اور ماہنامہ پاکیزہ کی مدیرہ نزہت اصغر

ادارے سے
وابستہ
مصنفین
امجد رئیس
غلام قادر
طابر جاوید مغل
ایچ اقبال
ساجد امجد
احمد اقبال
محمود احمد مودی
روبینہ رشید
اسما قادری
پروین زبیر
منظر امام
فاروق انجم
حسام بٹ
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
سلیم انور

# بچھڑے ہوئے مصنفین اور ساتھی

احمد صغیر صدیقی | محی الدین نواب | شین صغیر ادیب | اقبال کاظمی

مختار آزاد | کاشف زبیر | علیم الحق حقی | شگفتہ پروین

سلیم فاروقی | شین میم جمیل | جبار توقیر | شکیل صدیقی

شاہد حسین | ذاکر حسین | اختر حسین شیخ | ایم اے راحت

جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269





Scanned By: AMANULMUSTAFA 0333-4585215

جلد 51 • شمارہ 09 •
ستمبر 2021 •
زرِ سالانہ 1500 روپے •
قیمت فی پرچا
پاکستان 150 روپے •



خط و کتابت کا پتا:
پوسٹ بکس نمبر 229
کراچی 74200 •
فون: 35895313 (021)
E-mail:
jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول •
مقام اشاعت: C-63 فیز II
ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا،
مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن •
مطبوعہ:
ابن حسن پرنٹنگ
پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

# ادارے کے پس پردہ اراکین
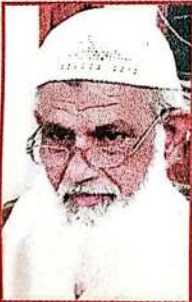
عزیزانِ من...... السّلام علیکم!

الحمدللہ آپ کا پسندیدہ ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ 1970ء میں اپنے اجرا کے بعد مسلسل اشاعت کی نصف صدی مکمل کر چکا ہے اور آپ کے تعاون سے یہ کامیاب سفر جاری ہے۔ اس مبارک موقع پر گولڈن جوبلی نمبر پیشِ خدمت ہے۔ جو آپ کی توقعات پر یقیناً پورا اترے گا۔ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے بانی محترم معراج رسول (مرحوم) کافی عرصہ علیل رہے۔ اس دوران میں ان کی ہم سفر...... شریکِ حیات عذرا رسول صاحبہ نے اپنی استقامت اور حوصلہ مندی سے ان کی خوب تیمارداری کی...... انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں ادارے کے استحکام کے لیے تندہی سے اپنا کام جاری رکھا۔ اپنے ذاتی دکھ سکھ سے بے نیاز ہو کر ادارے کی بقا کے محاذ پر پوری طرح سرگرم اور کوشاں ہیں۔ ادارے سے شائع ہونے والے چاروں پرچے اُن کی انتھک محنت کی روشن مثال ہیں۔ جاسوسی نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی نصف صدی مکمل کر کے آگے کی جانب گامزن ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے اور اس سے معاشی طور پر جڑے ہزاروں افراد کو مزید کامیابیاں عطا کرے۔ گولڈن جوبلی کے خاص شمارے کی تیاری اور اشاعت کے لیے ہر شخص نے خوب محنت کی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اُترے۔ اس خاص شمارے کی ضخامت بھی عام پرچوں سے زیادہ رکھی گئی ہے۔

اگست کا مہینہ جہاں ہمارے لیے یومِ آزادی کا پیغام لایا، وہیں ہمارے پڑوس میں افغانستان نے غیرملکی سامراج سے آزادی حاصل کی۔ اب وہ اپنے معاملات اور مسائل کے حل کے لیے خود ذمے دار اور خودمختار ہوں گے۔ ان کے امن و امان اور استحکام سے پاکستان میں بھی سکون ہو سکے گا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں وہاں کے معاملات کس ڈھب پر چلائے جاتے ہیں۔ اس پہلو سے قطع نظر ہم سب کے لیے پریشانی کے اسباب اور بھی ہیں۔ ایک طرف کورونا نے خوف و ہراس کے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں تو دوسری طرف روزافزوں مہنگائی نے نیم جان کیا ہوا ہے۔ حکومتی سطح پر ان دونوں مسائل کا نمایاں ادراک موجود ہے لیکن تدارک کی صورت بنتی نظر نہیں آرہی۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے مہنگائی کے عفریت کے سامنے سب بے بس ہو چکے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ہم سب کو بڑھتی ہوئی مہنگائی سے جلد از جلد نجات عطا ہو۔ رہی وبا تو اس کے مقابلے کے لیے ہر سطح پر حفاظتی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ لاکھوں جانوں کی بھینٹ لینے کے باوجود اس کے وار جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے اور یہ وبا جلد دم توڑ دے۔ اس کے عاجز اور گنہگار بندے بس دردمندانہ التجا ہی کر سکتے ہیں۔ اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں...... وہاں بھی التجائیں اور دھمکیاں ہماری منتظر ہیں۔

اسلام آباد سے بینا راجپوت کی مبارک باد ”سب سے پہلے تو جاسوسی ڈائجسٹ کی کامیابی کے بہترین پچاس سال مکمل ہونے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ اس بار شمارے کے سرورق پر سبز آنکھوں والی حسینہ ٹاپس کی صورت میں ایک تیسری سبز آنکھ اپنے کان پر سجائے پتا نہیں کن سوچوں میں کھوئی تھی۔ شاید لمبے بالوں والے بھائی صاحب کی پستول نے اسے گم صم کر دیا تھا۔ سرورق کا بغور معائنہ کرنے کے بعد چینی نکتہ چینی میں پہنچے تو شروع کے چند تبصرے پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ اس بار تبصروں میں چینی کم اور نکتے زیادہ ہیں۔ منظر سلیم ہاشمی صاحب کی جولائی میں شائع ہونے والی کہانی نقاب چہرے کے کردار رانیہ پر کافی اعتراضات اٹھائے گئے تھے جو مجھے عجیب لگے۔ میرے حساب سے تو رانیہ کا کردار کہانی میں بالکل فٹ تھا۔ کہانی اگر بغور پڑھیں تو وہ کردار ڈاکٹر عظمان کی اپنے کام میں اعلیٰ درجے کی مہارت کی دلیل تھی۔ مزید رانیہ کے پاس سفیان کے اغوا کا بڑا پختہ جواز تھا، جس سے کہانی میں آخر تک سسپنس قائم رہا۔ خیر ہر کسی کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر عباس کو بارہ سال بعد نکتہ چینی میں خوش آمدید، میرے تبصروں کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اور آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ نئے دور کے نئے تقاضے، تبصروں میں اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ نکتہ چینی کے بعد خالد شیخ طاہری کی کہانی لہو رنگ پڑھی چونکہ جشنِ آزادی کا مہینہ ہے تو یہی سوچا پہلے وطنِ عزیز کی محبت میں لکھی گئی کہانیوں کو ہی پڑھا جائے۔ کہانی شروع میں جتنی پاورفل لگ رہی تھی، اختتام تک پہنچتے پہنچتے کہانی کا گراف گر گیا۔ اس کی بڑی وجہ شاید کرداروں کی بہت زیادہ تعداد اور منظرنگاری میں ضرورت سے زیادہ تفصیلات بتانا تھا۔ کہانی کا کینوس جتنا وسیع ہوتا ہے کہانی کو سمیٹنا اتنا مشکل ہو جاتا ہے، جیسے یہ کہانی مرکزی کردار منیر کو مکمل طور پر خراج نہیں دے سکی۔ باقی طاہری صاحب کا اندازِ تحریر ہمیشہ ہی عمدہ، رواں اور دلچسپ ہوتا ہے۔ منظر امام کی چودہ اگست
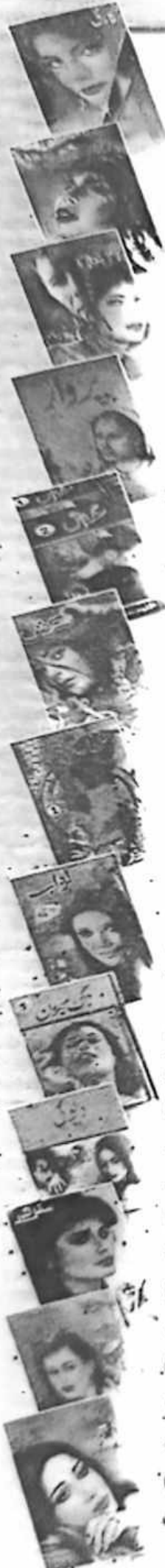
مختصر سی سبق آموز کہانی ٹھیک لگی۔ صائمہ کاظمی کی پہلی کاوش گھات مختصر ترین مگر پر اثر کہانی پڑھ کر مزہ آیا۔ صائمہ جی کے لیے نیک خواہشات۔ ایم الیاس کی خونی محافظ کافی دلچسپ تھی۔ معاشرے کے تلخ اور تاریک پہلو کو حساس دل کے لوگ بعض اوقات سہہ نہیں پاتے اور جذبات کے مدوجزر پر قابو نہ رکھ پانے کی وجہ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں، پھر کبھی کبھی وہ اپنے اور دوسروں کے لیے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ سبق اور کتابوں کی چوری بالترتیب تنویر ریاض اور تنویر واسطی کی کہانیاں کوئی بھی تاثر ڈالنے میں ناکام رہیں۔ سرور اکرام کی صنفِ بے نام ہمارے معاشرے میں موجود اس مخصوص طبقے کی دلگداز کہانی تھی، سچی بات ہے کہ اعلیٰ تعلیم وترقی کے اس دور میں بھی انسانوں کی اس تیسری صنف کو والدین آج تک قبول کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔ حسام بٹ کی طرفہ تماشا کا مرکزی خیال بہت عمدہ ہونے کے باوجود کہانی کا بالکل مزہ نہیں آیا۔ مردوں کی برائی سے اچھائی کی طرف ایسی تیز ترین کایا پلٹ صرف ہندی فلموں میں نظر آتی ہے۔ کہانی کو اگر تھوڑا طویل کیا جاتا تو قاری کے ذہن سے بہت سی الجھنیں خود بخود دور ہو جاتیں جو اختصار کی وجہ سے پیدا ہوگئیں۔ کبیر عباسی صاحب کی کچھ اچھی تحاریر میں نے پڑھ رکھی ہیں لیکن ہر لکھاری کی ہر کہانی اچھی ہو، یہ ممکن نہیں۔ فتنہ زر میں ابتداء سے اختتام تک کافی جھول تھے، عام طور پر ہم نہیں دیکھتے کہ کسی پرائیویٹ کمپنی کا اکاؤنٹنٹ شلوار سوٹ پہن کر دفتر جاتا ہو، لیکن لکھاری صاحب نے صرف مدثر کی جیب سے پرائز بانڈ چوری کروانے کے لیے ایک باقاعدہ سچویشن تخلیق کی، اور صرف یہی نہیں پوری کہانی اتفاقات سے بھری ہوئی تھی۔ بہت سے نکتے ایسے تھے جو اتنے غیر مدلل تھے کہ ذہن قبول نہیں کر پایا پھر اختتام میں مدثر کو مار ہی ڈالا جبکہ حامد جس نے سارے دھوکے کیے اور جس کی بدنیتی کی وجہ سے سارے فسادات ہوئے اس کو نہ صرف محفوظ کرلیا بلکہ مظلوم بھی دکھانے کی کوشش کی۔ روبینہ رشید صاحبہ کی شعلہ زن کمال کی قسط تھی، کہانی کی ابتدا بہت زبردست ہے، پڑھتے ہوئے پرانے وقتوں کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ امید ہے کہانی کا یہ دلچسپ تاثر ہر قسط میں یونہی قائم رہے گا۔ مغل صاحب کے نام کو فہرست میں دیکھنے کے بعد امید تھی کہ ان کے مخصوص دلچسپ انداز میں ایکشن اور رومانس کا بہترین تڑکا پڑھنے کو ملے گا لیکن ٹکے باز تو ایک مکمل تخیلاتی وافسانوی کہانی نکلی جس کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق محسوس نہیں ہوا، اتنے معجزات حقیقی زندگی میں کم ہی وقوع پزیر ہوتے ہیں اور میرے جیسے قاری اتنا سارا فکشن ہضم نہیں کر پاتے۔ مجموعی طور پر اگست کا شمارہ جشنِ آزادی کا ایک خوبصورت تحفہ تھا۔‘‘ (آپ کی رائے باعثِ احترام ہے۔ بہت شکریہ)

رحیم یار خان سے ماورا عالمگیر کی مبارک باد...... شکایتیں حکایتیں ’’ہر طرف یہی سننے کو مل رہا تھا کہ کراچی میں لاک ڈاؤن کے سبب جاسوسی اس دفعہ پندرہ بیس دن بعد ہی ملے گا۔ میرا دل ڈوبا ہوا تھا کہ ہمارا تو عام حالات میں بھی پانچ چھ کو ملتا ہے، اب کیا ہوگا دو تاریخ کو مغرب کی نماز کے بعد گیٹ پر بیل ہوئی۔ ہمارے ہاں جاننے والے بیل بجا کر نہیں آتے اس لیے بہت حیرت ہوئی کہ اس وقت کون ہوسکتا ہے؟ عینی گیٹ پر گئی تو پتا چلا کہ ہاکر ہے۔ میں نے بچوں کی طرح تالیاں بجانا شروع کردیں کہ میرا جاسوسی آگیا اب آپ لوگ میری خوشی کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ساری خوشی ایڈیٹر صاحب کی قینچی کی نذر ہو جائے۔ (یقیناً ہوشیار...... خبردار) خیر اس کے بعد فہرست کھولی تو طاہر جاوید مغل کا نام جگمگا رہا تھا فوراً دیکھا تو ایک کے بعد دوسری خوشی مطلب پہلے صفحات پر طاہر جاوید مغل کی کہانی یعنی یہ تو ٹریٹ مل گئی۔ ٹکے باز نہایت شاندار اور جاسوسی کے شایانِ شان تھی۔ تقریباً دو ماہ کے وقفے کے بعد طاہر جاوید ایک شاہکار کے ساتھ تشریف لائے۔ اس کے بعد روبینہ رشید کی کہانی کی طرف قدم بڑھائے مگر اس دفعہ اینڈ پہلے ہی دیکھ لیا باقی آئندہ کی وجہ سے اس کو بیک اپ کے لیے چھوڑ دیا۔ لہو رنگ ایک بہت گداز، جذباتی اور تقریباً حقیقت پر مبنی کہانی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا خالد شیخ نے میری فرمائش پر کہانی لکھی ہے۔ بہت اعلیٰ۔ فتنہ زر میں حامد کا کردار اس قدر گھٹیا تھا کہ مجھے بہت دیر تک مدثر کا دکھ محسوس ہوتا رہا۔ انسان کو اپنے دوست کو دھوکا نہیں دینا چاہیے، اس سے بہتر بندہ مر ہی جائے۔ کبیر عباسی نے کہانی پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ گھات میں تو نہلے پہ دہلا ہوگیا۔ 14 اگست میں منظر امام نے مختصر سی کہانی میں بہت گہرا اور اہم پیغام دیا جس کی آج کل بہت ضرورت ہے۔ نکتہ چینی میں آپ نے 14 اگست کی مبارک باد دی، خیر مبارک آپ کو بھی...... واقعی پاکستان خاص تحفہ ہے اور ہم اس کی قدر نہیں کر رہے۔ ہم غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کرن فرام جھنگ خوش آمدید، آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا اس کے لیے مشکور ہوں ورنہ مجھے تو میرا تبصرہ شکایت نامہ ہی لگتا ہے کیوں کہ ہر دفعہ کاٹا جا چکا ہوتا ہے۔ (یا اللہ فوٹو کاپی کروا کے رکھ لیا کرو...... اب چیک کرلینا کہاں قینچی چلی ہے) مجھے لگ رہا ہے کہ اس دفعہ تبصرہ کچھ لمبا ہو رہا ہے اس لیے اجازت چاہتی ہوں۔ تمام احباب اور ہم وطنوں کو آزادی مبارک اور یومِ دفاع مبارک ہو۔ دعا ہے کہ ہماری افواج سلامت رہیں اور ہمارے ملک کی حفاظت کرتی رہیں۔ آمین۔‘‘

داؤد خیل میانوالی سے ریاست خان کی حکمرانی ’’اگست 2021 کا شمارہ اس بار جلد ہی موصول ہوگیا۔ خوب صورت آنکھوں والی حسینہ ناراض نظروں سے ہمیں گھور رہی تھی کہ کچھ تعریف ہی کردو ساتھ وہ دولن اپنے اپنے انداز میں حسینہ کو پاتے کی

کوشش میں تھے۔ چینی نکتہ چینی میں اداریہ چودہ اگست کی مبارک باد دے رہا تھا۔ ہمیں آزاد ہوئے چوہتر سال ہو گئے لیکن ہمیں آزادی کی قدر کرنا نہیں آیا۔ صدارت کی کرسی پر ممتاز احمد براجمان نظر آئے، بہت اعلیٰ جناب زبردست، بہت مبارک ہو۔ مادرا عالمگیر صاحبہ جلدی سے ہاتھ ہلا کے دوڑ گئیں۔ کنول صاحبہ اپنا تبصرہ پہلے نمبر پر آنے پر خوش تھیں۔ کرن صاحبہ کو جاسوسی میں خوش آمدید۔ بینا راجپوت کا تبصرہ تشنہ تھا۔ خلیل احمد انجم کی بات میں دم ہے، تبصرہ بھی دیدار ہے جناب۔ ایمانے زارا کو مون سون سے پرابلم ہے۔ میرے خیال میں مون سون ہی سب سے اچھا موسم ہوتا ہے بارش والا آپ نے کون سا کام کرنا ہوتا ہے بس جاسوسی پڑھنا ہوتا ہے تو بارش میں تو اور بھی مزہ آتا ہوگا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے فیورٹ مغل صاحب کو پڑھا۔ کے باز ابتدائی صفحات کی شاندار اسٹوری عدیل اور تابانہ کی شاندار کہانی جس میں رومانس فائٹ اور دل سوز سب کچھ تھا۔ عدیل اور تابانہ کے ملاپ نے کہانی کو چار چاند لگا دیے ورنہ مجھے لگا تھا تابانہ کو مغل صاحب نے مار ڈالنا ہے الہام نام بہت پیارا لگا۔ کہانی میں کردار بھی شاندار تھا۔ سرور اکرام کی صنف بے نام خواجہ سرا پر لکھی شاندار تحریر تھی۔ دلیر خان جو خواجہ سرا ہوتا ہے باپ اسے گھر سے نکال دیتا ہے لیکن وہ اپنے باپ اور بھائیوں سے زیادہ مرد نکلتا ہے اور اپنی بہن کی عزت اور جان بچا لیتا ہے۔ شعلہ زن روبینہ رشید کا ایک اور شاہکار پہلی کہانی پڑھی ہے جس میں ایک لڑکی کا مرکزی کردار ہے۔ سارہ خوب صورت کردار ہے ماضی ابھی چھپا ہوا ہے آئندہ اقساط شاندار ہونے والی ہیں۔ طرفہ تماشا حسام بٹ کا ایک اور شاہکار اس کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے شاندار کہانی شاندار پلاٹ اور اینڈ تو لاجواب حسام بٹ مختصر تحریر میں منظر امام کی جگہ رکھے ہوئے ہیں۔ الاؤ کی بائیسویں قسط ہمیشہ کی طرح لاجواب رہی۔ سیف کو رومی مل گئی۔ وہ خوش تھا کہ اسے حمیرا ابھی مل گئی لیکن اس کے دشمن حمیرا کو اغوا کر کے لے گئے کہانی میں آگے بدلاؤ آتا نظر آ رہا ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

ساجد محمود فرام انگلینڈ سے لکھتے ہیں ''خوش قسمتی سے اس بار جاسوسی کا جشنِ آزادی نمبر جلدی مل گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق پر گہری نظر ڈالی تو خوبرو حسینہ کے ساتھ دو گبرو جوان بھی نظر آئے۔ سراغ رسانوں میں دو مشہور افسران، جیمز بونڈ اور انسپکٹر مورس جیگوار کمپنی کی اسپورٹس کار رکھا کرتے تھے۔ نیلے رنگ کی کلاسک کارز مجھے بھی پسند ہیں۔ گن والا بھائی کن سوچوں میں گم تھا، یہی سوچتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ محفل ہاؤ ہو میں ممتاز احمد فیروز پوری کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ کافی تفصیلی تبصرہ تھا۔ بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ جھنگ سے کرن صاحبہ کی پہلی انٹری کے لیے مبارکباد، امید ہے آئندہ بھی اچھے اچھے تبصرے پڑھنے کو ملیں گے۔ بینا راجپوت کے متواتر تبصرے اب جاسوسی کی جان بنتے جا رہے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو بھئی شاگرد کس کی ہیں۔ ایمانے زارا بھی دلچسپ تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ پرانے تبصرہ نگاروں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے جو تسلسل کے ساتھ حاضری لگاتے ہیں۔ فہرست سے پتا چل گیا تھا کہ اس بار مغل صاحب کے باز کے ساتھ ابتدائی صفحات میں براجمان ہیں۔ کرب آشنائی کے بعد یہ ان کی واحد تحریر ہے جسے ایک ہی نشست میں پڑھنے کی جسارت کی۔ کے باز اصل میں کہانی ہے ایک پروفیشنل باکسر کی جو تقدیر اور اجل کے ہاتھوں اپنی پیاری بیوی کھو دیتا ہے اور پھر اکلوتی بیٹی کو پروان چڑھانے میں جت جاتا ہے۔ کہانی اتفاقات سے بھرپور ہے، مغل صاحب لکھیں اور اس میں تھائی یا ملائی لینڈ کی لڑکیاں نہ ہوں، ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ یوں اتفاقات کے تحت ہیرو صاحب کی بیٹی کا اغوا اور پھر بازیابی کی جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ اب کہانی کئی جگہ اتنی تفصیل سے بیان ہوئی ہے کہ بندہ بور ہو جائے اور کئی باتیں جن کی وضاحت ضروری تھی ان کو skip کر دیا گیا ہے۔ تھائی رائیڈ کی جس بیماری کا ذکر کیا گیا ہے اگر اس پر مزید روشنی ڈالی جاتی تو یقیناً ایک نیکی کا کام ہوتا۔ مغرب سے درآمدہ سبق از تنویر ریاض متاثر نہ کر سکی۔ شروع میں ہی پتا چل گیا تھا کہ آرنی ہی قاتل ہے۔ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے پر لکھی گئی صنفِ بے نام از سرور اکرام بہت دلگداز تحریر ثابت ہوئی۔ حسام بٹ صاحب کی طرفہ تماشا جیسی سوچی تھی، انجام بالکل بھی پسند نہ آیا۔ بہترین اسلوب کی اس تحریر کو کوئی اور رنگ دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ مختصر کہانیوں میں چودہ اگست از منظر امام اور گھات از صائمہ کاظمی اچھی اور دلچسپ تحاریر تھیں۔ سرورق کے رنگوں میں کبیر عباسی کی کہانی فتنہ زر کسی منطقی انجام تک پہنچنے میں ناکام رہی۔ خالد شیخ طاہری کی کہانی لہو رنگ محبِ وطن لوگوں کی داستان تھی۔ اچھی کوشش اور اپنے عنوان کے حساب سے ایکشن سے بھرپور کہانی تھی۔''

جامشورو سے پرویز احمد لانگاہ کی عنایتِ خاص ''چل رہن دے رہن دے۔ اس بار تو تبصرہ رہن دے۔ پتھری نکلنے سے پہلے تک تبصرہ کرنے اور بھیجنے کے حوالے سے ایسے ہی جذبات تھے لیکن اللہ نے کرم کیا ہے کہ دردناک عید گزارنے کے بعد آہستہ آہستہ طبیعت بحال ہو گئی اور پتھری سے نجات ملی۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا فرمائے) درد سے نجات حاصل کرنے کے بعد اپنے محبوب جاسوسی کو دیکھا تو اس کی حالت بھی پتلی نظر آئی۔ ہر ماہ دیگر رسالوں کے مقابلے میں بیس تیس روپے اضافی کھانے کے باوجود اس ناگوار سرپرائز کی کہیں کوئی اطلاع نظر نہ آئی سو چل رہن دے۔ جشن آزادی کی آپ کو بھی بہت بہت مبارک ہو۔ چونیاں سے ممتاز احمد فیروز پوری چوتا لگانے کے بعد پہلی پوزیشن پر چوں چوں کرتے نظر آئے۔ پہلے تو

دل نے کہا چل رہن دے لیکن پھر سوچا کہ مجھے بھی جب پہلی پوزیشن پر بیٹھنے کا موقع ملے گا تو چونیاں والی سرکار چل رہن دے نہ کہہ دے۔ بہت بہت مبارک باد ممتاز صاحب۔ اگلے تبصرے میں ایک ماورائی مخلوق نظر آئی۔ مجھے بھی اپنی بہو ایمانے کی طرح میڈم عالمگیر کے پردے میں کوئی عالمگیر پائین نظر آتا ہے پر چل رہن دے۔ کنول کے افکار اب صرف تبصرے میں ہی نظر آتے ہیں پر چل رہن دے۔ اچھا تبصرہ تھا محترمہ۔ کرن کو پہلے خط پر خوش آمدید کہتے ہیں ورنہ سب کہیں گے چل رہن دے۔ لانگاہ کہاں گئی تیری خوش اخلاقی؟ اپنی بہو ایمانے کا تبصرہ دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ میں نہیں بتا سکتا۔ بس میرا بیٹا بڑا ہو جائے تو خود ہی بتائے گا۔ ایمانے کا دلربا، ہوشربا، خواب ربا تبصرہ بہت پسند آیا۔ یہ سب تعریفیں اور مکھن اس لیے کیونکہ ایمانے نے مجھے کہہ دیا ہے کہ چل رہن دے۔ ریاست خان نے لگتا ہے اس بار کہانیاں پڑھے بغیر تبصرہ بھیج دیا ہے کیونکہ خلاصے غائب ہیں۔ ریاست خان شکریہ چل رہن دے۔ ڈاکٹر تنویر یہاں خوشبو، تڑکا اور نسوار لگانے والے ہوا ہو گئے اب درہم برہم کر کے سانوں کی کہنے والوں کا راج ہے پر چل رہن دے۔ طاہر جاوید مغل کو ابتدائی صفحات پر دیکھ کر آپ کو مٹھائی بھیجنے کا خیال آیا پر چل رہن دے۔ (کیوں رہن دے؟) شکر ہے کہ آپ نے یہ فرمائش پوری کی، اب امید ہے کہ قسطوار کی فرمائش بھی جلد پوری ہو جائے گی۔ کمے باز میں اتفاقات تو بہت تھے لیکن مغل صاحب سے میں اتفاق نہ کروں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مغل صاحبؒ نے اپنی روایات کو توڑتے ہوئے اس بار شادی شدہ ہیروئن کے بجائے شادی شدہ ہیرو پیش کر کے سب ناقدوں کو کہہ دیا چل رہن دے۔ بہترین کہانی تھی لیکن پھر بھی کمی محسوس ہوئی۔ مغل صاحب کو ہم بار بار پڑھنا چاہتے ہیں اور بے شمار پڑھنا چاہتے ہیں پر آپ ہم سے کہتے چل رہن دے۔ الاؤ کے بارے میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں پر چل رہن دے۔ شعلہ زن کی پہلی قسط بہت اچھی تھی اور جاسوسی کی ایک پرانی کہانی خارزار یاد آ گئی جس میں کونجاں بھی ایسے ہی غیرت اور جھوٹے الزام پر موت سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ اس مماثلت پر دل نے کہا چل رہن دے لیکن کہانی نے اپنی گرفت میں لے لیا اور میں نے دوسری قسط بھی ساتھ پڑھ لی۔ مائی سیداں والے طلسمی واقعات کے علاوہ ہر چیز پسند آئی۔ سو اس اعتراض کو رہن دے۔ روبینہ رشید ایسے ہی لکھتی رہیں تو یہ کہانی پسندیدگی کے ریکارڈ توڑ دے گی۔ خالد شیخ طاہری بڑے اچھے پڑوسی ہیں کیونکہ ان سے آج تک ملاقات نہیں ہو سکی پر چل رہن دے۔ لہورنگ کو تین چار نشستوں میں مکمل کیا اور کہانی پسند آئی۔ کبیر عباسی فتنہ زر کے ساتھ آئے۔ کبیر پائین فارم میں نہیں لگے، ان کی اچھی کہانیوں میں اس کہانی کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ چھوٹی کہانیوں میں کتابوں کی چوری سب سے اچھی تھی۔ سبق اور صنف بے نام بھی بہترین رہیں۔ صائمہ کاظمی کو پہلی کہانی گھات کی اشاعت پر مبارک باد۔ حسام بٹ کی طرفہ تماشا اور ایم الیاس کی خونی محافظ پسند نہیں آئیں پر چل رہن دے۔ کم صفحات کی وجہ سے شمارہ جلدی ختم ہو گیا اس لیے تبصرہ بھیج رہا ہوں بس آپ چل رہن دے کہہ کر ردی کی ٹوکری میں نہ پھینک دیجیے گا۔" (آپ آئے بہت خوشی ہوئی پر چل رہن دے)

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کی دھمکی "سب سے پہلے آزادی مبارک ان تمام لوگوں کو جو اس وطن کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ہیں۔ ان پر افسوس جنہیں یہ آزاد نہیں لگتا۔ اسی لیے اتنی ساڑ نکالتے ہیں اسی کے سایہ میں بیٹھ کر۔ ہمارے کشمیر کے لیے بھی دعا کیجیے جلد مکمل آزاد ہو آمین۔ محرم الحرام کی وجہ سے ڈائجسٹ دیر سے ملا۔ چبھتی نکتہ چینی میں فیروز نوری کو مبارک! ویسے بہت ہی کڑوا کسیلا تبصرہ تھا۔ کریلے کم کھایا کریں۔ تھوڑی شیرینی بھی صحت کے لیے ضروری ہے۔ آپ کو کسی کے تبصرے نہیں پسند آئے تو ہمیں کونسا آپ کا آ گیا۔ (سیر کو سوا سیر) کنول میم! ہمیشہ کی طرح جاندار رائے لیے موجود تھیں۔ طلعت مسعود پھر سے غائب تھے۔ ماورا عالمگیر کے پیچھے کون انکل ہیں۔ پتا نہیں انکل والی وائبز آتی ہیں۔ کرن کو خوش آمدید! بینا راجپوت کا تبصرہ اچھا تھا مگر نکتہ چینی پر تبصرہ کرنا پھر بھول گئیں۔ وائے؟ خلیل انجم تشکر اس قدر تفصیلی جواب پر! آپ سے قطعی طور پر متفق ہوں مگر کیا کروں ایسے لوگ دل سے اترے ہیں کہ یہ دل بھی بھنا اٹھا ہے۔ سوالات تو پھر آئیں گے...... ریاست خان! ارررے...... مجھے کیا خبر تھی کہ اتنا تردد میرے لیے ہے؟ ٹھیک ہے میں ڈائجسٹ خریدنا چھوڑ دیتی ہوں...... ڈاکٹر تنویر عباس تابش صاحب! لکھاریوں کا معیار ملاحظہ فرمایا ہے آپ نے......؟ جب لکھنے والے ایسے ہوں گے تو تبصروں میں چاشنی خاک ہوگی...... دوسرا اب سوشل میڈیا کا دور ہے...... آپ بھی ہمارا گروپ جوائن کر لیجیے۔ پہلی کہانی کمے باز کے رائٹر کا نام دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مغل صاحب تو چھوٹی کہانیاں لکھ رہے تھے، یہ اچانک بڑی کہانی کیسے لکھ ڈالی۔ بہرحال خوشی ہوئی۔ کہانی میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ عدیل کا عین موقع پر ٹھیک ہو جانا، تابانہ کا مرتے مرتے بچ جانا سب کچھ ایکسپیکٹڈ تھا لیکن پھر بھی کہانی پسند آئی۔ یہی تو کمال ہے ان کا کہ جو بھی لکھتے ہیں پسند آ جاتا ہے۔ لیکن کوئی قسط وار لکھیں تو بات بنے، یہ مختصر کہانیاں ان کے وسیع کینوس پر پوری نہیں اترتیں۔ (ہم بھی اصرار کرتے ہیں، مانیں تب نا) الاؤ اتنا بور کرتی ہے کہ اب اسے دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ دوسری طرف روبینہ رشید نے شعلہ زن کی دوسری قسط میں ہی دل جیت لیا ہے۔ اس میں پرانی، قسط وار کہانیوں والی اٹریکشن بھی ہے اور نئے زمانے کی سوچ بھی۔ ایک حالات سے پریشان اکیلی لڑکی کو پاکستان میں

کتنی مشکلات ہوسکتی ہیں، وہ سب بتا دیا ہے۔ فاسٹ لوسٹوری اور دل کو چھو لینے والے واقعات ہیں کہانی میں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں زندگی کی بہترین فلاسفی سمجھائی ہے۔ مائی سیداں کا کردار بہت حیرت انگیز تھا۔ روبینہ رشید، آپ قسط وار کہانیوں میں دیر سے آگیں لیکن درست آگیں۔ منظر امام کی چودہ اگست اور سرور اکرام کی مصنف بے نام اس بار کی خاص کہانیاں لگیں۔ خالد شیخ طاہری نے پہلے رنگ کو لہو رنگ بنا دیا۔ بہت اچھے۔ حب الوطنی والی ایسی کہانیاں وقت کی ضرورت ہیں تاکہ نئی نسل کو بھی پاکستان کی اہمیت کا احساس ہوسکے اور وہ جان سکیں کہ اصل دہشت گردی کون پھیلا رہا۔ کبیر عباسی کی فتنہ زر پڑھ کر یہی لگا کہ مصنف نے ہمارے ساتھ ہی پرینک کر دیا ہے......مدثر کو دلہن بنانے کے بعد گولے سے اڑا دینا۔ پھر خود معصوم بن کر اس کی بیوہ پر احسان کر آتا؟ نہیں بھئی مائنڈ صاحب کس سیارے پر رہتے ہیں؟ میں نے اتنی بونگی کہانی زندگی میں کبھی نہیں پڑھی۔ کہانی کے مرکزی کردار کی فطرت میرے گرد موجود کچھ ایسے اشخاص کی فطرت پر مبنی ہے جو بالکل ایسی ہی سنپولی فطرت رکھتے ہیں۔ دوست بن کر چھرا گھونپنا۔ ویسے ڈیئر سنپولیے مرکزی کردار سے ایک سوال ہے، مدثر کو مار کر حاجی بننا لازمی تھا۔ ویسے احسان گناہ نہیں ہوسکتا تھا۔ عجیب؟ آپ چاہتے ہیں کہ ہم جاسوسی کو بھی خیر باد کہہ دیں اب۔" (نہ......نہ......ایسا غضب نہ کیجیے گا......آپ کا ساتھ لازمی ہے......)

بہاولپور سے مومنہ کشف کے الزامات "ہیلو۔ بہت لمبے عرصے بعد لیٹر لکھ رہی ہوں۔ پوری امید ہے کہ آپ اور سب نکتہ چینی والے مجھے بھول چکے ہوں گے۔ اتنی لیٹ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ سے ناراض ہوں۔ میں اتنی محبت سے لکھتی تھی، آپ کے لیے تبصرے اور آپ مجھے جوتیوں میں بٹھا دیتے تھے۔ (مطلب؟) یہ تبصرہ میں نے تھینک یو کہنے کے لیے لکھا ہے کیونکہ آپ نے میری سب سے فیورٹ رائٹر روبینہ رشید کی کہانی شروع کر دی ہے۔ روبینہ جی آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آپ کے لکھنے میں ایسا جادو ہے جو دل جیت لیتا ہے۔ شعلہ زن بھی لڑکیوں کو ہمت و حوصلہ دیتی ایک بہت اچھی کہانی ہے۔ مجھے تو سارہ سپر ہیرو لگتی ہے ورنہ اتنی مشکلات میں لڑکیاں کہاں سے حوصلہ کر سکتی ہیں۔ (مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں) کراچی تک جان بچا کر اکیلی ہی پہنچ گئی اور اب مائی سیداں جیسی جادوگرنی کا بھی مقابلہ کر رہی ہے۔ گندے نالے سے بچی کو بچانے والا سین تو بہت.... زیادہ اچھا تھا۔ روبینہ جی آپ میری سب سے فیورٹ رائٹر ہیں ایسے ہی اچھی اچھی قسط ہر ماہ لکھتی رہا کریں۔ اور آپ نے میرا یہ والا لیٹر بھی نہیں لگایا تو میں پھر کبھی تبصرہ نہیں لکھوں گی۔" (اب آپ کی مرضی......ہم جو کر سکتے تھے وہ کر دیا)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کا نکتہ نظر "سرورق میں اب یکسانیت سی آگئی ہے۔ اپنے مصور صاحب سے کہیں کہ اب کچھ اور چہرے بنائیں۔ خطوط کی محفل میں اس ماہ ممتاز فیروز پوری اول آئے، مبارک۔ ڈاکٹر تابش کا شکریہ کہ میرے تبصرے اچھے لگے۔ بھائی ریاست کی خدمت میں عرض ہے کہ وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ جیسے کہ اس ماہ کی طاہر مغل صاحب کی شکے باز شاندار رہی۔ عدیل کا کردار اچھا تھا مگر تابانہ بہتر رہیں۔ روبینہ رشید صاحبہ کی شعلہ زن نے مایوس کیا کہ اکیسویں صدی میں جادو ٹونے کی کہانیاں جچتیں نہیں۔ (پاکستان کے کئی علاقے ایسے ہیں جہاں یہ وبا عام ہے) سرورق کی دوسری کہانی فتنہ زر شاندار تھی۔ مغربی کہانیوں میں تنویر ریاض کی سبق اور دیسی کہانیوں میں حسام بٹ کی طرفہ تماشا اچھی تھیں۔ سالگرہ نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔"

انجم فاروق ساحلی، لاہور سے لکھتے ہیں "اس بار ٹائٹل منفرد اور خوش رنگ ہے۔ صفحات کم ہونے کا افسوس ہوا۔ نیوز پیپر فراوانی میں دستیاب نہیں۔ اُمید ہے گولڈن جوبلی نمبر بہت سی دلچسپیوں کا امتزاج لیے ہوگا۔ کتابوں کی چوری، سبق سے بہتر معلوم ہوئی۔ الاؤ اور شعلہ زن ہنگامہ خیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ 14 اگست آزادی کے حوالے سے اچھی کاوش تھی۔ خونی محافظ اچھی، سنسنی خیز اور نئے انداز کی تحریر ہے مگر نریندرا (مجرم) نے اپنی ذاتی ڈائری بالکل سامنے ہی میز کی آخری دراز میں رکھ دی۔ حالانکہ ایسی چیزیں چھپا کر رکھی جاتی ہیں۔ یہ تو اس کے خلاف ثبوت تھیں۔ لہو رنگ جذبہ حب الوطنی کے پس منظر میں خوب تحریر رہی۔ دوسرا رنگ اور شکے باز ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ گھات میں عورت کی چالاکی اور ہوشیاری خوب ہے۔ لیکن شہزادہ نے عورت کے متعلق اپنے آپ سے جو باتیں کیں، وہ منفی انداز کی ہیں۔ پھر چیختی چلاتی تو اس کی ماں تھی جس کو ہتھوڑے سے اس کے باپ نے ختم کر دیا پھر دوسری عورتوں کو ہتھوڑے سے مارنے کا کوئی منطقی جواز نہیں ہے۔ وہ تو اس کے سامنے چیخ چلا نہیں رہی تھی۔ نفسیاتی جنونی مریض عورتوں کے دشمن کہانیوں میں دکھائے جاتے ہیں مگر اس کی کوئی معقول وجہ ظاہر کرنا پڑتی ہے۔" (کہانی دوبارہ پڑھیں۔ وجہ سمجھ آجائے گی)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہوسکے۔

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ عاتکہ کامران، حیدرآباد۔ جمیل اعوان، لاہور۔ عنبرین خالد، کوٹری۔ شہباز احمد کراچی۔

Scanned By: ATA-UL-MUSTAFA 0333-4585215

**امجد رئیس** کا شمار جاسوسی کے پسندیدہ ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔ قلم ان کا پیشہ نہیں۔ ورنہ کافی پہلے کل وقتی قلم کاری کے مزے لے چکے ہوتے۔ جاسوسی میں اُن کی آمد ایک اتفاقی حادثہ تھی۔ کسی کی فرمائش پر لکھا۔ بعدازاں ایک صیّاد نے زیرِ دام کر لیا۔ قارئین کو ہر دم اُن کی تحریر کا انتظار رہتا ہے۔ ان کی اصل پہچان ناولز کی تلخیص ہے۔ ماضی بعید اور اب جاسوسی میں بھی چھپنے والی پہلی کہانی ایک ناول کی تلخیص ہی تھی۔ ترجمہ کرتے ہوئے بھٹکتے نہیں بلکہ ہر پہلو سے ان کی باریک بیں طبیعت کا ثبوت ملتا ہے۔ بلا کے حساس ہیں۔ اپنی تحریر سے آخری لمحوں تک مطمئن نہیں ہوتے... ترمیم و اضافے کے ٹانکے جڑتے رہتے ہیں۔ اب ایسے لوگ عنقا ہوتے جارہے ہیں جو اپنا کام کرتے ہوئے دیانت داری کی آخری حدوں کو چھو لیتے ہیں...

# خاموش لمحے

موت اتنی اچانک حملہ آور ہوتی ہے کہ بچنے کا کوئی موقع نہیں دیتی۔ وہ موت کے منہ سے واپس آیا تھا... اس کا بچ جانا قدرت کا کرشمہ تھا... مگر ایک موت کے بعد دوسری تباہ کن صورتِ حال موت کی صورت میں سامنے کھڑی تھی... عقل دنگ تھی... دل ریزہ ریزہ تھا... جینے کا کوئی سہارا... کوئی آسرا نہ تھا۔ بس ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید دوبارہ اپنے خاندان کو پاسکے۔ دھوکا... فریب اور ان ہونی واقعات سے لبریز ایک پُرتجسس... تیز رفتار داستانِ جنوں کے ڈرامائی موڑ

**رشتوں کی پُرسکون ہکون کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی دل خراش داستان......**

جب پہلی گولی میرے سینے پر لگی اُس وقت میں اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہایت سرعت کے ساتھ میرے ہوش و حواس رخصت ہوئے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میں یہ بھی نہ یاد رکھ سکا کہ مجھے گولی لگی تھی۔ نہیں معلوم دوسری گولی سر میں کہاں لگی...... یا سر پر سے گزر گئی۔ میں مر چکا تھا۔ شاید مجھے حرکتِ قلب بند ہونے کا احساس ہوا تھا۔ زمین بوس ہوتے ہوئے میں تارا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری ننھی بیٹی۔ وہ صرف چھ مہینے کی تھی۔ اس وقت اپنے پنگوڑے میں لیٹی تھی۔ شاید وہ روئی تھی۔ غالباً گن فائر کی وجہ سے۔

تارا جب پیدا ہوئی تھی، وہ لمحہ ناقابلِ فراموش تھا۔ اس کی ماں کا نام مونیکا تھا۔ میری بیوی۔ میں باپ بن گیا تھا۔ وہ احساسات ناقابلِ بیان تھے۔ خوشی، مسرت...... اور نئی ذمے داری۔ زندگی نیا موڑ کاٹ چکی تھی۔ وہ لمحہ دائمی تھا۔ انسان بدل جاتا ہے۔ اس کی کائنات بھی۔ میری کائنات

بھی سٹ کر چھ پاؤنڈ تک محدود ہو گئی تھی۔ میں اُلجھ گیا تھا۔ میرا نیا رول شروع ہو رہا تھا۔ اسے کیسے نبھانا تھا؟ کیا سیکھنا تھا؟ کیا کرنا تھا؟ ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔

میں مر رہا تھا۔ کچن کے فرش پر لیٹا تھا۔ میں اس وقت دلیا کھا رہا تھا، جب میں گرا۔ دھڑکن رک گئی تھی لیکن آخری احساس تھا بیٹی کو کیونکر بچاؤں۔ اندر باہر ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ جبلت تھی۔ غالباً ازلی جبلت کہ مجھے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ زندگی میں کبھی ایسی پیاس محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے بولنا چاہا۔ ناکام رہا۔ زبان خشک چمڑے کے مانند تالو سے چپک گئی تھی۔ کوئی اندر آیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اذیت کی لہر روح کی گہرائی میں اتر گئی۔ سر پیچھے گرا۔ میں چت ہو گیا۔ خاتمہ...... روشنی ختم۔ احساس ناپید...... دھڑکن نابود...... درد بھی ختم...... سازِ رگِ جاں نے گویا ہچکی لی۔ آخری سانس، آخری احساس...... احساس تارا کا تھا جو فوراً ہی دبیز تارکول جیسی گاڑھی سیاہی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو دن تھا۔ کھڑکی کے پردوں میں سورج کی روشنی جگہ بنا رہی تھی۔ میں نے پلکیں جھپکائیں۔ ذہن نے ہاتھ اٹھانے کے لیے حکم جاری کیا لیکن نقاہت آڑے آ گئی۔ حلق میں جیسے صحرا کی ریت بھری تھی۔ ایک حرکت ہوئی۔ میں نے آنکھ اٹھائی۔ نرس میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ میں حیران، گنگ تھا۔ عالم استعجاب تھا۔ جو کام میں خود کرتا آیا تھا، وہ میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ کیوں؟ میری زندگی کا بیشتر حصہ اسپتالوں میں گزرا تھا...... میں نے بولنے اور حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ تیرگی نے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو پھر دن تھا۔ میں مر چکا ہوں یا زندہ ہوں؟ ذہن نے سوال کیا۔

”ڈاکٹر مارک سینڈمین؟“ نرس میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی نرم میٹھی آواز لذیذ سیرپ کے مانند تھی۔ بدقت تمام میں نے سر کو مثبت جنبش دی۔ میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ نرس تجربہ کار تھی یا ذہن پڑھنا جانتی تھی۔ اس نے پانی کا کپ میری جانب کیا۔ کپ میں اسٹرا تھا۔ اس نے اسٹرا میرے ہونٹوں سے لگایا۔ میں نے ندیدوں کی طرح پانی کھینچا۔

”آہستہ۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

میں پوچھنا چاہتا تھا، میں کہاں ہوں۔ اگرچہ یہ واضح تھا۔ میں نے استفسار کے لیے منہ کھولا۔ تاہم نرس پھر سبقت لے گئی۔ ”میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔“ اس نے دروازے کا رخ کیا۔

میں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ ”میری...... فیملی؟“

”پریشانی کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

میں نے پتلیاں گھمائیں۔ نگاہ میں دھند تھی۔ ڈرپ اور آئی وی ٹیوبس ہی دیکھ پایا۔ بلاشبہ میں اسپتال میں تھا۔ چند منٹ بعد ادراک ہوا کہ آس پاس دو تین افراد موجود ہیں۔ میرے تجربے نے بتا دیا کہ میں آئی سی یو میں تھا۔ یعنی کوئی بہت خراب بات تھی۔ کوشش کے باوجود میں وہاں موجود افراد کو نہ دیکھ پایا۔ معاسر میں چبھن محسوس ہوئی۔ سر پہ بینڈیج تھی۔ جسم میں درد کا خفیف احساس تھا۔ درد کا منبع ماورائے فہم تھا۔ سینے پر بہت بوجھ تھا۔ گویا وزنی سل رکھی ہو۔

”ڈاکٹر سینڈمین؟“

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ عورت سرجری کے مخصوص کپڑوں میں تھی۔ وہ قریب آ گئی۔

”میں ڈاکٹر ہیلر ہوں، زوجھ ہیلر۔“ اس نے اپنا نام بتا کے پیشہ ورانہ شائستگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ کھوجنے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے نگاہ مرکوز کرنے کی سعی کی لیکن ذہن نیم خوابیدہ تھا۔

”تم سینٹ ایلزبتھ اسپتال میں ہو۔“ وہ مزید قریب آ گئی۔ اس کے عقب میں دروازہ پھر کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ میرے بیڈ کے اردگرد کھنچے پردوں کے باعث میں اسے ٹھیک طرح نہ دیکھ سکا۔ میرا دماغ بیدار ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے کمزور آواز میں ڈاکٹر سے سوال کیا۔

”تمہیں گولی ماری گئی تھی۔“ وہ بولی۔ ”دو مرتبہ۔“

میں نے ہمدردی کی جھلک دیکھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ تاہم ڈاکٹر ہیلر نے پہل کی۔

”ایک گولی نے سر کے بالائی حصے کو رگڑ دیا ہے۔“

”اور دوسری؟“

”دوسری گولی سینے میں دل کے گرد دوہری چادر کے غلاف کو چھو گئی۔ نتیجتاً دل اور غلاف کے درمیانی خلا میں خون کی بڑی مقدار لیک ہو گئی۔ بیرونی جریانِ خون بھی بہت زیادہ تھا۔ تم خود ڈاکٹر ہو۔“ اس نے کہا۔ ”ایمرجنسی میں

زندگی کی اہم ترین علامات کے لیے ہم خوف کا شکار تھے۔ صورت حال نازک تھی...... سینہ کھولنا پڑا۔''

''ڈاکٹر!'' وہ آدمی قریب آ گیا۔

ڈاکٹر ہیلر واضح طور پر برہم دکھائی دی۔

''ڈاکٹر مجھے بات کرنے دو۔'' اس نے ارادہ ظاہر کیا۔

''یہ موقع نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے خفگی سے انکار کیا۔ وہ ہچکچا کے پسپا ہو گیا۔ ڈاکٹر پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بیڈ کے قریب موجود اسٹاف کو ہدایات دے رہی تھی۔ آدمی بے قرار تھا۔ وہ دیوار کی طرف نہیں گیا۔ چند منٹ بعد پھر قریب آ گیا۔ اس کے بال کریو کٹ تھے اور سر کافی بڑا۔

''ڈاکٹر، وقت قیمتی ہے...... چند منٹ لوں گا۔'' اس نے کہا۔

ڈاکٹر ہیلر نے غصے سے اُسے دیکھا۔ ''میری موجودگی میں۔'' وہ بولی۔ اجازت ملتے ہی وہ میرے اوپر جھکا۔

''میرا تعلق پولیس سے ہے۔''

''میری فیملی......'' میں نے قطع کلامی کی۔

''میں بتاتا ہوں۔ میرا نام باب ریگن ہے۔ ڈیٹکو ریگن۔ کاسلٹون پولیس ڈپارٹمنٹ۔''

''میری فیملی......''

''میں وہیں آ رہا ہوں لیکن چند ضروری سوالات۔ اوکے؟'' اس نے رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ یہ مثبت انداز تھا۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا۔

''اوکے۔'' میں نے ذہن پر قابو پایا۔

''تمہاری یادداشت میں آخری بات کون سی ہے؟''

میں نے یادداشت کا بینک اکاؤنٹ چیک کیا۔ صبح میں بیدار ہوا۔ واش روم گیا۔ لباس تبدیل کیا۔ تارا کو دیکھا۔ نیچے کچن میں گیا۔

''دلیا کھا رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

ریگن نے یوں سر ہلایا گویا وہ اسی جواب کی توقع کر رہا تھا۔

''تم کچن میں تھے سنک کے پاس۔''

''ہاں۔''

''پھر کیا ہوا؟''

میں نے تھکے ہوئے ذہن پر زور ڈالا اور نفی میں سر ہلایا۔

''سوچو؟''

میں نے پھر کوشش کی اور نفی میں سر کو جنبش دی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے نوٹ پیڈ کو دیکھا۔

''کسی کو دیکھا؟ کوئی آواز؟ دھماکا......؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''سمجھ رہا ہوں۔'' ریگن نے کہا۔ ''میڈیکل ٹیم کے مطابق تمہارا اچھا حال تھا۔''

میرے حلق میں پھر کانٹے اُگنے لگے۔ ''تارا اور مونیکا کہاں ہیں؟''

وہ خاموش رہا۔ میرے سینے پر وزن بڑھ گیا۔

''پلیز ڈاکٹر سیڈمین...... چند منٹ۔'' اس نے کہا۔

''کیا تم نے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی تھی؟''

''نہیں۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔''

''تمہاری کسی کے ساتھ عداوت؟''

''نہیں...... ل...... ل...... میری فیملی...... مجھے بتاؤ۔''

''میں سمجھ رہا ہوں لیکن اس وقت تم بحالیِ صحت کی طرف دھیان رکھو۔ ہم تمہاری مدد کے لیے ہیں...... تمہاری بیوی کی کسی کے ساتھ دشمنی؟''

اس کی آواز میں کوئی تاثر تھا۔ جسے وہ دبا نہ سکا......

میرے پھیپھڑوں میں جیسے برف بھر گئی۔ مجھے سوال بھی پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''میری بیوی اور بیٹی کہاں ہیں؟''

اس وقت ڈاکٹر ہیلر نے مداخلت کی۔ ''بہت ہو گیا، تم باہر جاؤ۔'' اس نے ریگن کو اشارہ کیا۔

''ایک منٹ ڈاکٹر۔'' میں نے ریگن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ چند لمحے سکوت طاری رہا پھر ریگن نے کہا۔

''تمہاری بیوی ختم ہو گئی تھی۔'' میری سماعت ناکارہ ہو گئی۔ الفاظ تھے یا پگھلا ہوا فولاد......

''پولیس پہنچی تو دیر ہو چکی تھی۔ تم بھی ختم ہی تھے۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''تم دونوں کو گولی ماری گئی تھی۔'' ریگن مجھے نہیں کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ میرے تصور میں مونیکا کا عکس لہرایا۔ چکر آیا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اور تارا؟'' میں نے بند آنکھوں کے ساتھ سرگوشی کی۔

''تمہاری بیٹی...... وہ صبح گھر پر تھی؟''

''ہاں، اور کہاں ہونا چاہیے تھا۔ کہاں ہے وہ؟'' میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''گھر پر صرف تم دونوں تھے۔''

مجھے یوں لگا ہاتھی کا پیر میرے سینے پر ہے۔ آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

''شروع میں ہمارا خیال تھا کہ تمہاری بیٹی کسی دوست یا خاندان کے کسی فرد کے گھر پر ہے لیکن......'' وہ خاموش ہو گیا۔

''تم کہنا چاہ رہے ہو...... تمہیں نہیں پتا وہ کہاں ہے؟''

''ایسا ہی ہے۔''

''وہ کب سے لاپتا ہے؟''

ڈاکٹر ہیلر نے ریگن کو باہر دھکیلا۔ تاہم وہ کمرے میں رہا۔

''ڈاکٹر مارک تم خوفناک حد تک زخمی تھے۔'' ڈاکٹر ہیلر نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ''ہمیں امید نہیں تھی...... تم ریسپریٹر پر تھے۔ ایک پھیپھڑا کام نہیں کر رہا تھا۔ اہم اندرونی اعضا کا ردِعمل خطرناک تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ تم ریسپریٹر سے ہٹ کے بیدار ہو جاؤ۔''

میں چونکا۔ ''میں کب ہوش میں آیا؟''

''بارہ دن بعد۔''

☆☆☆

''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' ریگن نے کہا۔ ''میں نے بتایا تھا کہ آغاز میں ہم بچی کی گمشدگی سے لاعلم تھے۔ یوں قیمتی وقت ضائع ہو گیا۔ اس وقت تلاش عروج پر ہے۔ تارا کا فوٹو سومیل کے قطر میں ہر جگہ موجود ہے۔ ائرپورٹ پر بھی۔''

''بارہ اور اب چودہ دن۔'' میں بڑبڑایا۔

''ہم نے تمہارے گھر اور بزنس فون کے علاوہ سیل فون کالز بھی ٹریس کی ہیں۔''

''کیوں؟''

''تاوان کا مطالبہ زیرِ امکان تھا۔''

''کوئی کال؟'' لہجے میں امید امنڈ آئی۔

''نہیں، کوئی نہیں۔'' ریگن نے کہا۔

میں کلبلایا۔ میری بیٹی غائب ہے اور میں دو ہفتے سے یہاں پڑا ہوں۔ مزید یہ کہ مردہ والدین سے مطالبۂ تاوان کیونکر ممکن ہے......

ریگن نے تارا اور مونیکا کے لباس کے بارے میں سوالات کیے جو انہوں نے چودہ روز قبل پہنا ہوا تھا۔

''تفتیش کیا کہہ رہی ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''کارروائی جاری ہے۔''

ریگن نے اُلجھن سے مجھے دیکھا۔

تارا میری لائف لائن تھی۔ ''کیا وہ زندہ ہے؟''

''غالب امکان ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہتھیار مت ڈالنا۔'' میں نے کہا۔

''قطعی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''کچھ معلوم کرنا ہے۔ تمہارے دوست احباب...... تمہاری بیوی کے بارے میں اور......''

''بعد میں۔'' ڈاکٹر ہیلر نے ٹانگ اڑائی۔ ''ڈاکٹر مارک کو آرام کی ضرورت ہے۔''

☆☆☆

مونیکا کی تدفین پورٹ مین فیملی کی وسیع جائداد کے مخصوص قطعۂ اراضی پر ہو چکی تھی۔ میں اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ ہماری شادی اچانک اور روایتی قسم کی تھی۔ وہ اس وقت چند ماہ کے حمل سے تھی۔

تدفین کے بارے میں مجھے انکل کارسن پورٹ مین نے بتایا تھا۔ ملاقاتیوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ مونیکا کے خاندان میں کارسن پورٹ واحد شخص تھا جو میرے ساتھ رابطہ برقرار رکھتا تھا۔ مونیکا بھی انکل سے بہت مانوس تھی۔ میری ماں بے ہوشی کے دوران وزٹ کرتی رہی تھیں۔ ڈیڈی نے نہیں آنا تھا۔ اکتالیس برس کی عمر میں انہیں پہلی مرتبہ حملۂ قلب ہوا تھا۔ جب میں آٹھ سال کا تھا۔ میری چھوٹی بہن برینڈا شروع سے ذہنی تلوّن کا شکار رہی تھی۔ دوسرے حملۂ قلب کے بعد ڈیڈی کا زیریں بدن نیم مفلوج ہو گیا تھا۔ فیملی بُری طرح متاثر ہوئی۔ خصوصاً برینڈا...... بعدازاں انکشاف ہوا کہ وہ نشے کی علت میں گرفتار تھی۔ ڈیڈی کے بعد برینڈا کا تلوّن ذہنی بگاڑ کی طرف گیا۔ وہ کھل کر ڈرگ استعمال کرنے لگی۔ کئی مرتبہ بدمزگی ہوئی۔ پھر اس نے گھر ہی چھوڑ دیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اسپتال مجھے دیکھنے آئے گی۔ ماں نے ہمیشہ غیر معمولی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ڈیڈی کے ساتھ بھی وہی رہتی تھیں۔

میری بے ہوشی کے دوران لینی واحد آدمی تھا جو اسپتال میں وزٹ کرتا رہا۔ لینی مارکس میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔ وہ قانون کے شعبے میں گیا تھا۔ اس کا شمار قابل وکلا میں ہوتا تھا۔ کورٹ روم میں اپنے جارحانہ رویّے کے

باعث اس کی عرفیت ''بل ڈاگ'' پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

سراغ رساں ریگن اگلی بار آیا تو اس کا پہلا سوال برینڈا کے بارے میں تھا۔

''کیوں؟'' میں نے تیزی سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ نشہ کرتی تھی۔ منشیات کہاں سے آتی تھی...... قطع نظر اس کے مجرمانہ عنصر کا امکان تھا۔ ''کیا گھر میں لوٹ مار ہوئی تھی؟''

''نہیں۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔'' ریگن نے کہا۔ ''لیکن سامان بکھرا ہوا تھا۔ تمہاری کوئی رائے؟''

''نہیں، کوئی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم اپنی بہن کے بارے میں بتاؤ گے؟''

''پولیس کے پاس ریکارڈ ہونا چاہیے۔''

''ریکارڈ ہے۔''

''میں اس میں کیا اضافہ کر سکتا ہوں؟''

''تم دونوں کے درمیان فاصلے تھے؟'' ریگن کا سوال تھا۔

''میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آخری بار تم نے اسے کب دیکھا تھا؟''

''چھ ماہ قبل۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یعنی تارا کی پیدائش پر؟''

''ہاں۔''

''کہاں؟''

''وہ اسپتال آئی تھی۔''

''تارا کو دیکھنے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس وقت کیا ہوا؟''

''وہ جذباتی تھی اور تارا کو گود میں لینا چاہتی تھی۔'' میں نے یاد کرتے ہوئے بتایا۔

''تم نے انکار کر دیا؟''

''ہاں۔'' میں سوچ رہا تھا کہ وہ برینڈا کے پیچھے کیوں پڑا ہے۔''

''وہ ناراض ہوئی تھی؟''

''تھوڑا بہت ردِعمل دیا تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''میں نے کہا تھا کہ اپنی عادتیں سنوارنے کے بعد وہ تارا سے مل سکتی ہے۔''

ریگن نے توقف کے بعد سوال کیا۔ ''تم اور مونیکا نے موجودہ گھر میں کب رہائش اختیار کی؟''

''ہم نے یہ گھر چار ماہ قبل خریدا تھا۔''

''تم دونوں ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے تھے؟''

مجھے اس کا سوال عجیب معلوم ہوا۔ ''نہیں۔''

''تم نے یہاں چار ماہ قبل رہائش اختیار کی اور بہن سے ملاقات چھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ ٹھیک ہے؟''

''درست ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر مارک، ہمیں تمہارے گھر سے برینڈا کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔'' ریگن نے انکشاف کیا۔

میں خاموش تھا۔

''تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟'' وہ بولا۔

''وہ نشئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا وہ شوٹنگ میں ملوث ہے یا تارا کو اغوا کر سکتی ہے۔ کیا تم نے اس کا اپارٹمنٹ چیک کیا؟''

''شوٹنگ کے بعد سے وہ غائب ہے۔'' ریگن نے بتایا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ہمارے خیال میں وہ تن تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی ملا ہوا ہے۔ کوئی بوائے فرینڈ، ڈیلر یا کوئی اور...... کوئی ایسا آدمی جسے علم ہے تمہاری بیوی کا تعلق ایک متمول گھرانے سے تھا۔ کیا خیال ہے؟''

''اگر یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہوتا تو وہ ماں باپ کو کیوں گولیوں کا نشانہ بناتے؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''ہو سکتا ہے جوش یا جلد بازی میں وہ غلطی کر گئے...... یا پھر ان کا منصوبہ تھا کہ رقم تارا کے نانا سے وصول کریں گے۔''

''پھر اب تک انہوں نے یہ اقدام کیوں نہیں کیا؟'' میں نے پھر اعتراض جڑ دیا۔

سراغ رساں ریگن خاموش رہا۔

☆☆☆

تاوان کا مطالبہ دو دن بعد سامنے آ گیا۔

میں تیزی سے رُو بہ صحت تھا۔ غالباً تارا کی وجہ سے...... میں بستر چھوڑنے کے لیے بے قرار تھا۔ میں نے ڈاکٹر روتھ ایلر پر زور ڈالا۔ اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ مجھے ریلیز کیا۔ تاہم طے پایا کہ میری فزیکل تھراپی روزانہ ہوگی۔ نیز وقتاً فوقتاً نرس بھی دیکھتی رہے گی۔ گھر جانا

کرائم سین پر جانے کے مترادف تھا۔ تاہم میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اسپتال سے گھر تک لینی میرے ساتھ تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے یاد دلایا کہ اس کے چار بچے ہیں۔ بعدازاں اس نے سنجیدگی سے پیشکش کی کہ وہ میرے ساتھ ٹھہرے گا۔ اس کے خیال میں مجھے وہاں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے...... مام ساتھ ہیں۔ آخر اس نے اپنی بیوی شیرل کا ذکر کیا۔ شیرل ڈشز پکا کر میرے گھر کے فریزر میں رکھ دے گی۔ میں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے شیرل کا شکریہ ادا کیا...... میرے آبائی گھر پر والد کے ساتھ آنٹی رکی ہوئی تھیں۔

''ایک بات یاد رکھنا میں تمہارا لائر ہوں۔'' لینی نے کہا۔ ''میرا مشورہ بلکہ ہدایت ہے کہ اب تم کو پولیس سے کوئی بات نہیں کرنی...... ایک لفظ بھی نہیں۔ ہوسکتا ہے میرا مشورہ غیر اہم ہو لیکن میں نے ایسے معاملات دیکھے ہیں۔ اولین شک کی زد میں فیملی آتی ہے۔''

میں نے تعجب سے اُسے دیکھا۔ ''مطلب میری بہن؟''

''صرف بہن ہی نہیں......'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''تم کہہ رہے ہو پولیس مجھ پر شک کرے گی؟''

''میں نہیں جانتا۔'' وہ چند سیکنڈ کے لیے رکا۔ ''لیکن بہت ممکن ہے۔''

''مجھے گولیاں ماری گئیں۔ میری بیٹی غائب ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ تمہاری طرف متوجہ ہوں گے۔''

''کیوں؟''

''وہ اسی طرح کام کرتے ہیں۔ دیکھو جب اغوا کو چوبیس گھنٹے گزرتے ہیں...... یہ انٹراسٹیٹ کیس بن جاتا ہے، مطلب ایف بی آئی ملوث ہو جاتی ہے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ اتنے دن بعد تمہارے گرد ایجنٹس بکھرے ہوں گے۔ تمہارا ہر فون ٹیپ ہوگا۔ وہ بہت زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ اغوا پس منظر میں چلا جائے گا۔ وہ تمہاری طرف آئیں گے۔ اگر تاوان کا مطالبہ آتا بھی ہے تو وہ تمہیں ملوث سمجھیں گے۔ ممکن ہے مطالبے کی صورت میں تمہاری جانب توجہ کم ہو جائے۔ مختصر یہ کہ احتیاط کرنا۔ ممکن ہے کہ فون ٹیپ ہونا شروع ہو چکے ہوں۔''

''تم مجھے اُلجھا رہے ہو۔ میں شوہر اور باپ ہوں۔ میں مشتبہ کیسے ہوسکتا ہوں؟''

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''اور نہیں۔''

''او کے میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا اور بیڈروم میں فون کی گھنٹی بجی۔ لینی نے مجھے دیکھا۔ میں نے سر کو جنبش دی۔ لینی نے فون اٹھالیا۔ ''ڈاکٹر مارک سیڈمین روم۔'' اس نے کہا۔ اس کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔ ''ہولڈ آن۔'' اس نے فون یوں میری طرف بڑھایا گویا اس میں کانٹے اُگ آئے ہوں۔

''ہیلو۔'' میں نے ریسیور کان سے لگایا۔

''ہیلو مارک، میں ہوں، ایڈگر پورٹ مین۔''

ایڈگر، مونیکا کے باپ کا نام تھا۔ مجھے لینی کے بدلتے تاثرات کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ ایڈگر کا انداز ہمیشہ کے مانند خالص رسمی تھا۔ میں سٹپٹا گیا۔ ''ہیلو، آپ کیسے ہیں؟''

''فائن، شکریہ، میں پہلے فون نہیں کر سکا۔ کارسن نے تمہاری حالت کے بارے میں بتایا تھا۔ کیسی صحت ہے؟''

''بہتر ہوں۔''

''گڈ...... کیا تم میری طرف آسکتے ہو؟''

''آج؟'' میں نے اُلجھن سے لینی کو دیکھا۔

''ہاں، فوراً پلیز۔ میں نے گاڑی بھیجی ہے۔ ڈرائیور باہر تمہارا منتظر ہے۔''

''کیا معاملہ ہے؟''

''تمہارے آنے پر بات کرتے ہیں۔'' ایڈگر نے کہا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن فون بند ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں سیاہ رنگ کی لنکن میں روانہ ہوا۔ لینی باہر کار تک آیا تھا۔ میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایڈگر، پولیس، لینی، تارا، مونیکا، ذی لیرا......

ذی اور میں نے مل کر راپ ایڈ نامی گروپ کی بنیاد رکھی تھی۔ ہم سابق ہم جماعت تھے۔ میں پلاسٹک سرجن اور وہ بھی۔ پلاسٹک سرجن کا کام کاسمیٹک سرجری سے مختلف ہوتا ہے۔ میں نے اوپتھالمولوجی کے علاوہ ای این ٹی کو بھی اسٹڈی کیا تھا۔ ذی لیرا میکسیلو فیشل میں مضبوط تھی۔ ہم بچوں پر زیادہ کام کرتے تھے۔ خصوصاً بیرونِ ممالک۔ مثلاً سیرالیون، منگولیا، کمبوڈیا...... سفر بھی زیادہ کرنا پڑتا۔ یہ بچے آتشزنی، فسادات، غربت یا پیدائشی نقائص کے ساتھ زندگی

گزارنے پر مجبور تھے۔ کہا جاسکتا ہے۔ ہم ایک بامقصد اور اچھا کام کر رہے تھے۔

میں ضرورت سے زیادہ حساس تھا۔ عام رنجیدہ معاملات پر میں جلد آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ میرے جذبات سے کھیلنا آسان تھا۔ لیٹی، ایڈگر کو اپنے باپ کی موت کا ذمے دار سمجھتا تھا۔ لیٹی کا باپ پروینس فوڈز میں نیجر تھا۔ جو ایڈگر ہولڈنگز کا حصہ تھی۔ ایڈگر نے یونٹس کو آپس میں مدغم کیا تو لیٹی کے باپ مارکس کی چھٹی ہوگئی۔ مارکس اس وقت باون برس کا تھا اور اس نے چھبیس سال ملازمت کی تھی۔ وہ دو سال خالی بیٹھا رہا اور حملۂ قلب کا شکار ہوگیا۔

میں کاسلٹون، نیوجرسی میں پلا بڑھا تھا اور مونیکا بھی۔ اگرچہ ہم دونوں کی ملاقات شادی سے کچھ عرصہ قبل ہوئی تھی۔ ایڈگر کی امارت میں اس کی محنت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسے دولت اور زمین ورثے میں ملی تھی۔ ہم پورٹ مین خاندان کی اراضی میں داخل ہو چکے تھے۔ میری نگاہ خاندانی مدفن کی جانب تھی۔ تاہم ڈرائیور نے شاندار مرکزی مکان کے سامنے جاکے انجن بند کیا۔ اطراف میں گھاس کے قطعات فضا میں بھی سبز رنگ گھول رہے تھے۔ گلاب کا باغ شباب پر تھا۔

کار رکتے ہی میں اتر کے چل پڑا۔ یہ میرا فقط تیسرا وزٹ تھا۔ یوں تو نوجوانی میں درجنوں مرتبہ باہر سے نظارہ کیا تھا۔ مونیکا کے ساتھ میرا رشتہ بھی عجیب رہا تھا۔ شروع میں خاصا جذباتی بعد میں قدرے رکھی، میں نہیں سمجھ سکا کہ ہوا کیا تھا۔ یقیناً وہ ایک مختلف شخصیت کی حامل تھی۔ میں نے کئی بار معلوم کیا کہ آخر بات کیا ہے؟ پھر اکتا کر خاموشی اختیار کرلی۔ تاہم ایک مرتبہ اس نے کہا تھا۔ محض چند الفاظ "تم مجھ سے محبت نہیں کرتے" میں حیران تھا، اس نے یہ کیوں کہا...... حالات برائی کی طرف جا رہے تھے لیکن تارا کی آمد پر ٹھہراؤ آگیا۔ مونیکا شادی سے پہلے حاملہ ہو چکی تھی۔

میں گھر میں جانے کے بجائے مونیکا کی آخری آرام گاہ پر آگیا۔ جہاں خطاطی میں لکھا تھا۔ "ہماری مونیکا۔" میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر بلند آواز میں اسے پکارا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے قسم کھائی کہ میں تارا تک پہنچوں گا۔

☆☆☆

میں ملازم یا بٹلر کی رہنمائی میں لائبریری تک پہنچا۔ وہاں کارسن کی موجودگی خلاف توقع تھی۔ کارسن نے میری خیریت دریافت کیا۔ ایڈگر نے مصافحے کی زحمت بھی نہیں کی۔ میں اس کے سامنے ڈیسک کی دوسری جانب بیٹھ گیا۔ مونیکا باپ سے دور اور انکل کارسن سے قریب تھی۔ مونیکا کی چھوٹی بہن ایک حادثے میں ہلاک ہوئی تھی۔ مونیکا باپ کو اس کا ذمے دار ٹھہراتی تھی۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟" میں نے آغاز کیا۔

"ہاں مارک۔"

میں خاموش رہا۔ میں منتظر تھا۔

ایڈگر نے دونوں ہاتھ ڈیسک پر رکھ لیے۔ "کیا تم میری بیٹی سے محبت کرتے تھے؟" اس نے انوکھا سوال کیا۔

میں حیران رہ گیا۔

"بہت زیادہ۔"

ایڈگر کے تاثرات غیر یقینی تھے۔ میں متوازن انداز میں اسے تکتا رہا۔ "تم جانتے ہو وہ خوش نہیں تھی۔"

"مجھے یقین ہے اس کا الزام مجھے نہیں دیا جاسکتا۔" دل میں کہا کہ خوش تو وہ تم سے بھی نہیں تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔" تمہیں علم ہے کہ وہ ماہرِ نفسیات کے پاس جاتی تھی؟"

میں نے کارسن اور پھر ایڈگر کو دیکھا۔ "نہیں۔" میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے کیونکر علم ہوا۔ تاہم میں نے سوال نہیں کیا۔

"تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اوکے۔"

اس نے دراز سے پلاسٹک بیگ نکالا۔ ایک منٹ سے کم وقفے میں مجھے احساس ہوا...... میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ میرا ردِعمل دیکھ رہا تھا۔ "تم پہچان گئے ہو؟" وہ بولا۔

میں سن ہوگیا تھا۔ بیگ میں تین انچ چوڑا تین انچ لمبا کپڑے کا گلابی ٹکڑا تھا جس پر سیاہ دھبے تھے۔ وہ تارا کے لباس کا ٹکڑا تھا۔ "یہ کہاں سے ملا؟" میں نے سرگوشی کی۔

ایڈگر نے ایک خاکی لفافہ میرے حوالے کیا۔ اس نے لفافے کو بھی پلاسٹک میں ملفوف کر دیا تھا۔ بڑے سائز کا لفافہ تھا۔ پتا ایڈگر کا لکھا ہوا تھا۔ پوسٹ مارک نیویارک سٹی کا تھا۔

"آج موصول ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "کپڑا تارا کا ہے؟"

میں نے تصدیق کی۔ اس نے ایک چھوٹا بیگ نکالا۔ پلاسٹک میں۔ غالباً ضرورت کے وقت جانچ کے لیے اس

نے پلاسٹک استعمال کیا تھا۔ پہلا بیگ بھی اس نے چٹکی میں پکڑ کے نکالا تھا...... چھوٹے بیگ کو دیکھ کر میری سانس رک گئی۔ اس میں نرم بالوں کی لٹ تھی۔

''یہ تارا کے بال ہیں؟''

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ذہن پیچھے کی طرف سفر کررہا تھا۔

''مارک؟''

''ایسا معلوم ہوتا ہے۔ یقین سے کہنا مشکل ہے۔''

ایڈگر نے ایک اور پلاسٹک بیگ نکالا۔ جس میں سفید کاغذ پر لیزر پرنٹر سے کچھ لکھا تھا۔ میں نے جھک کر پڑھنا شروع کیا۔

''اگر پولیس سے رابطہ کیا، ہم غائب ہوجائیں گے۔ تمہیں کبھی پتا نہیں چلے گا بے بی کے ساتھ کیا ہوا۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ ہمارا آدمی اندر ہے جو ہمیں مطلع کردے گا۔ تمہاری کالز کی نگرانی ہورہی ہے۔ فون پر کوئی بات نہیں کرنا۔ ہمیں علم ہے کہ تمہارے سسر کے پاس کثیر دولت ہے۔ ہماری ضرورت صرف دو ملین ڈالرز کی ہے۔ رقم تم ہم تک پہنچاؤ گے۔ ہم ایک سیل فون ارسال کررہے ہیں جسے ٹریس نہیں کیا جاسکتا۔ اگر تم نے اس کا غلط استعمال کیا۔ ہمیں علم ہوجائے گا اور تم اپنی بیٹی کو کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ رقم تیار رکھو۔ گھر جاؤ اور ہدایات کا انتظار کرو۔ اگر ہدایات سے انحراف کیا تو بیٹی کو کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ تمہارے پاس دوسرا راستہ نہیں ہے۔ نو سیکنڈ چانس۔''

نوٹ میں نے تین مرتبہ پڑھا۔ خوفناک صورتِ حال تھی۔ تاہم یہ آگاہی مل گئی تھی کہ تارا زندہ ہے۔ امید بیدار ہوئی تھی۔ میں نے باری باری کارسن اور ایڈگر کی طرف دیکھا۔ ایڈگر اٹھ کے کمرے کے کونے میں گیا۔ کیبنٹ کھول کے ایک اسپورٹس بیگ نکالا۔ بیگ پر نائیکے کا لوگو بنا تھا۔ اس نے بلا کسی تمہید کے کہا۔

''رقم یہاں ہے۔ نوٹوں کے نمبر ترتیب سے نہیں ہیں۔ تاہم احتیاطاً تمام نمبروں کی لسٹ محفوظ ہے۔''

''کیا ہمیں ایف بی آئی کو نہیں بتانا چاہیے؟'' میں نے کہا۔

''تم باپ ہو۔ فیصلہ تمہارا ہے۔ میری رائے اس کے برعکس ہے۔ میرا ان سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ اپنے ایجنڈے پر کام کرتے ہیں۔ ممکن ہے میں غلط کہہ رہا ہوں لیکن اگر تارا میری بیٹی ہوتی تو میں اپنے اندازے پر بھروسا کرتا...... میرے خیال میں تمہیں پیغام کے مطابق چلنا چاہیے۔'' ایڈگر نے بیگ میرے حوالے کیا۔

☆☆☆

فیتے بغلوں سے گزررہے تھے۔ بیگ بستے کے مانند سینے پر تھا۔ میں سیاہ لنکن میں واپس ہوا تھا۔ میرے احساسات خوف اور خوشی کے درمیان جھولا جھول رہے تھے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری بیٹی کی زندگی داؤ پر لگی تھی۔ ڈرائیور ڈربی لیرس سے گھوما تو مجھے اپنا گھر نظر آیا۔ جب میں نے اسے چھ ماہ قبل خریدا تھا اس وقت لیونسکی فیملی وہاں قیام پذیر تھی، وہ لوگ وہاں چھتیس برس سے رہ رہے تھے۔ مسٹر لیونسکی ذرا کریک تھے اور بیوی بچوں کے لیے دردِ سر تھے۔ میں کالج میں تھا جب پہلی مرتبہ میں نے سنا کہ مسٹر لیونسکی اپنی بیٹی ''دینا'' پر تشدد کرتے تھے۔ دینا (Dina) اداس آنکھوں والی ایک کم گو لڑکی تھی۔ وہ کلاس میں بھی بوقتِ ضرورت آہستہ سے بات کرتی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے بات کروں۔ اس کی مدد کروں۔ تاہم میں اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

مسٹر لیونسکی کا دماغ زیادہ ہی خراب ہونے لگا تھا۔ دینا کی مظلومیت کے قصے عام ہورہے تھے۔ لہٰذا فیملی نے گھر چھوڑ دیا۔ پتا نہیں چلا کہاں گئے۔ بینک نے مکان کا قبضہ لیا...... تارا کی پیدائش سے چند ہفتے قبل مونیکا اور میں نے مکان خریدنے کی پیشکش کی۔ شروع میں مجھے راتوں میں وہم ہوتا کہ کسی کمرے سے آوازیں آتی ہیں۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی کہ دینا کس کمرے میں رہتی ہوگی۔

گھر کے سامنے میں نے دو گاڑیاں دیکھیں۔ مام دروازے میں کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بے تابی سے میری طرف بڑھیں۔ ڈالرز کا بیگ میرے ساتھ تھا۔ مام کے عقب میں ریگن نمودار ہوا۔ ریگن کے ہم قدم ایک قدآور گنجا سیاہ فام آدمی تھا۔ مام نے دھیمی آواز میں مجھے بتایا کہ وہ دونوں میرا انتظار کررہے تھے۔ میں ان دونوں کی طرف بڑھا۔

''تم کہاں تھے؟'' ریگن نے سوال کیا۔

میں خاموش رہا۔ میں جیب میں سیل فون کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈالرز کا بیگ میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

''میں اپنی بیوی کی قبر پر گیا تھا۔'' مام اندر ریگن کی طرف اور میں ان دونوں کے ساتھ لیونگ روم میں آ گیا۔

''...... یہ اسپیشل ایجنٹ لائیڈ ٹکر ہے۔'' ریگن نے تعارف کرایا۔ ''ٹکر ایف بی آئی میں ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ریگن نے مسکرانے کی کوشش کی۔
''تم بہتر لگ رہے ہو؟''
''قطعی نہیں، جب تک میری بیٹی نہیں مل جاتی۔''
''ہم سمجھتے ہیں۔ ہم ہر زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔ چند سوالات ہیں۔''
''کہو۔'' میں بولا۔
''تم اپنی شادی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''
میرے دماغ میں گھنٹی بجی۔ ''میری شادی کا کیا تعلق ہے؟''
اس نے شانے اچکائے۔ ''ایک معما ہے۔ ہم حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''
مجھے لینی کی وارننگ یاد آئی لیکن اگر میں اسے کال کرتا ہوں تو گویا ملزم بن جاؤں گا۔ میں ڈاکٹر تھا۔ میں موت کے منہ سے واپس آیا تھا۔ بیوی ختم ہو گئی تھی۔ بیٹی اغوا تھی۔ میرا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ جواب دینے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ لیکن میری یہ سوچ غلط فہمی نکلی۔ سوال چند نہیں، بہت تھے۔ دونوں مہارت سے مجھے خاص سمت میں لے جا رہے تھے۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب ریگن نے کہا کہ میں نے اسپتال میں واردات والے دن مونیکا کے لباس کے بارے میں بتایا تھا۔ جین اور سرخ بلاؤز۔ اس نے کہا نعش بے لباس تھی۔ جسم پر گولیوں کے زخم کے سوا کوئی نشان نہیں تھا۔ نیز گھر میں جین اور سرخ بلاؤز کہیں نہیں تھا۔
میری آواز گم ہو گئی پھر اس نے سوال کیا کہ میرے پاس کوئی پسٹل ہے۔ میرا سر گھوم گیا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اگلے سوال پر میں نے گن کے بارے میں بتایا۔ اعشاریہ اڑتیس اسمتھ اینڈ ویسن۔ سوالات کا سلسلہ آگے بڑھا۔ میں نے گن کی لوکیشن سے آگاہ کیا۔ اس نے انکشاف کیا اعشاریہ اڑتیس کی گولیاں ماری گئیں۔ لیکن پسٹل جدا جدا تھے۔ اگرچہ میں نے دیر کر دی تھی۔ تاہم مزید حماقت کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے جواب دینا بند کر دیے اور صاف کہہ دیا کہ میں وکیل کو کال کروں گا۔
لینی چار بلاک کے فاصلے پر تھا۔ مام بگن دور سے سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔ میرے اشارے پر انہوں نے تیزی سے لینی کا نمبر ملایا۔ لاٹیڈ نے بیگ کی طرف دیکھا۔
''اس میں کیا ہے؟''
میں خاموش رہا۔ تبھی اس کے وہ سوال دہراتا۔ میری جیب میں موجود سیل فون بول اٹھا۔ اغوا کنندگان کا فون۔

☆☆☆

میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ سیل فون نے پھر متوجہ کیا۔ میں معذرت کر کے باہر نکل گیا۔ جیب سے فون نکال کر کال وصول کی۔
''ہیلو؟''
''ہاں یا نہ میں جواب دینا ہے۔'' دوسری جانب سے حکم صادر ہوا۔ ''تمہارے پاس رقم ہے؟'' عجیب روبوٹک آواز تھی۔
''ہاں۔''
''گارڈن اسٹیٹ پلازا دیکھا ہے؟''
''ہاں۔''
''دو گھنٹے میں وہاں پیرامس پہنچو۔ نورڈسٹروم کے قریب۔ سیکشن نائن کی پارکنگ میں رہنا۔ ہمارا آدمی پہنچ جائے گا۔''
''ہاں۔''
''اکیلے نہیں آئے تو ہم غائب ہو جائیں گے۔ تمہارے پیچھے کوئی آیا۔ ہم غائب ہو جائیں۔ پولیس کی بو آئی۔ ہم غائب ہو جائیں گے...... نو سیکنڈ چانس۔ سمجھ گئے؟''
''ہاں، لیکن......''
کلک۔ فون بند ہو گیا۔ لرزیدہ ہاتھ سے فون میں نے جیب میں رکھا اور لینی کی ڈبل کیبن فورڈ رینجر طوفانی انداز میں نمودار ہوئی۔ پہیوں کی چرچراہٹ بلند ہوئی۔ فورڈ رکتے رکتے لینی گاڑی سے باہر تھا۔ وہ میری طرف لپکا۔
''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔'' میں نے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں ریگن کھڑا تھا۔ لینی کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ جبڑوں کے عضلات ابھر آئے۔ اس نے ریگن کو گھور کے دیکھا۔ لینی کے اندر چھپا ''بلڈاگ'' باہر آ گیا تھا۔ ''تم نے بات کی تھی؟''
''تھوڑی سی۔'' میں نے ندامت سے کہا۔
''منع کیا تھا میں نے۔'' لینی نے شکوہ کیا۔
میں نے سر جھکا کے تاوان کے بارے میں بتایا۔ لینی مجھے مزید فاصلے پر لے گیا۔ میں نے تیزی سے اسے ساری بات بتائی۔ ریگن نے قدم بڑھائے۔ ''کیا تم مارک کو گرفتار کر رہے ہو؟'' لینی غرایا۔
''نہیں۔'' ریگن نے انکار کیا۔
''ٹھیک ہے۔ ایک انچ آگے مت آنا۔'' ریگن تلملا

کے دو قدم پسپا ہو گیا۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پیر اس چالیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ٹریفک میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا تھا۔ وقت تھا لیکن زیادہ نہیں۔ ہم دونوں نے مختصر گفتگو کی۔ میں تذبذب کا شکار تھا۔ ایک طرف ایڈگر، دوسری طرف لینی کا مشورہ تھا۔ لینی کہہ رہا تھا کہ مجھے پولیس کو بتا دینا چاہیے...... نکتہ یہ تھا کہ تاوان کے معاملے کو ہم سے زیادہ وہ بہتر سنبھال سکتے تھے۔ میں رقم لے جاتا اور بیٹی بھی نہ ملتی تو کیا ہوتا۔ میرا دل قلابازیاں کھا رہا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک جاری تھی۔

☆☆☆

دونوں اپنا ردعمل چھپا نہ سکے۔ میں بھی بوکھلا گیا۔ منصوبہ بنانے کے لیے ان کے پاس وقت کم تھا۔ لائیڈ نے ایف بی آئی کے متعلقہ ماہرین کی مدد طلب کی۔ ریگن نے پیر اس کے قریب پولیس کو اطلاع دی۔ مجھے ان کے منصوبے سے اختلاف تھا۔ میں اکیلا جانا چاہتا تھا۔ رقم اور اغوا کنندگان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تارا واپس چاہیے تھی۔ وہ مجرموں کو دھرنے کے چکر میں تھے۔ چند منٹ بعد اصل نکتہ سامنے آیا۔ ان کے مطابق یہ اغوا کا کیس نہیں تھا۔ مجھے اور مونیکا کو ختم کرنا تھا۔ میں بچ گیا۔ اب وہ مجھے مارنا چاہتے تھے۔

میں گارڈن اسٹیٹ پلازا پہنچا تو دو گھنٹے ہونے والے تھے۔ میں مجرم کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ بظاہر پولیس اور ایف بی آئی والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کیا مجھے مار دیا جائے گا؟ کیا تارا مجھے مل جائے گی؟ دفعتاً سیل فون بول اٹھا۔ غیر انسانی آواز میں ہدایت آئی۔ جس کے مطابق میں روٹ فور سے مغرب کی طرف گیا۔ فون کان سے لگا تھا۔ مڑتا مڑاتا میں پیر اس روڈ کے ایگزٹ پر آیا۔ ہدایت کے تحت عمارت کے عقب میں گیا اور انجن بند کر دیا۔ فوراً سمجھ میں آ گیا کہ مجرموں نے وہ مقام کیوں منتخب کیا تھا۔ نظروں میں آئے بغیر وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایسی صورت میں ایف بی آئی کوئی حماقت نہیں کرے گی۔ میں نے ایک آدمی کو وین کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ اس نے اسپورٹس جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر بیس بال کیپ تھی۔ قد وقامت اوسط درجے کا تھا۔ نمایاں چیز صرف ایک تھی۔ وہ اس کی ٹیڑھی ناک تھی۔ وین پر بی اینڈ ٹی الیکٹریشن لکھا تھا۔ لائسنس پلیٹ نیوجرسی کی تھی۔ جسے میں نے ذہن نشین کر لیا۔ آدمی نے سیل فون اٹھایا۔ ''میں آ رہا ہوں۔ شیشہ نیچے کرو۔ کھڑکی سے رقم دینا۔ باہر آنے کی کوشش مت کرنا۔ منہ بند رکھنا۔ مناسب فاصلے پر جا کر کال کروں گا کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے۔''

وہ بڑھا اور کھڑکی کے قریب آ گیا۔ شیشہ نیچے کر کے میں نے بیگ پکڑا دیا۔ اس کے ہاتھ گندے تھے۔ شیو بڑھا ہوا تھا۔ بیگ لے کر وہ واپس گیا۔ وین کا عقبی دروازہ کھلا اور وہ اندر غائب ہو گیا۔ وین حرکت میں آئی اور ایک پتلی گلی میں غائب ہو گئی۔ میں تنہا رہ گیا۔

انتظار شروع ہو گیا۔ وقت کے ساتھ میری قمیص پسینے سے تر ہو گئی۔ وہاں میرے سوا اور کوئی کار نہیں تھی۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ میں سیل فون کو گھور رہا تھا۔ معاً ایک گاڑی وہاں نظر آئی۔ بیوک لی سیبر اتھی۔ وہ مجھ سے فاصلے پر تھی۔ تاہم میں نے ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر لائیڈ کو دیکھ لیا۔ نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے اس کی نظروں کو پڑھنا چاہا۔ تاہم وہ سنگی بت کے مانند بیٹھا تھا۔ دس منٹ اور گزر گئے۔ دھڑکن اندر سے سینے کو کوٹ رہی تھی۔ سیل فون نے نغمہ چھیڑا۔

''ہیلو؟''

کوئی جواب نہیں آیا۔ لائیڈ مجھے دیکھ رہا تھا۔

''ہیلو۔'' میں نے پھر کہا۔

جواب آیا۔ ''میں نے وارن کیا تھا، پولیس سے دور رہنا۔''

میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔

''نو سیکنڈ چانس۔''

فون بند ہو گیا۔

☆☆☆

خوف اور احساسِ بے بسی نے میرے اعصاب کے پرزے اُڑا دیے۔ میں ٹوٹ گیا تھا۔ دن گزر رہے تھے۔ موہوم امید کے سہارے میں ہمہ وقت فونز کے قریب رہتا تھا۔ گھر کا فون، میرا اسیل فون اور اغوا کنندگن کا سیل فون۔ نو سیکنڈ چانس...... نو سیکنڈ چانس...... راتوں کو سوتا جاگتا رہتا۔ فون نہ آیا۔ ایک رات میں نے مونیکا کے بجائے خواب میں راشیل کو دیکھا۔ راشیل میرا پہلا پیار۔

ماں میری ہمت بندھاتی رہتی تھیں۔ ریگن اور لائیڈ بھی آتے تھے۔ ان کی کارگزاریوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بی اینڈ ٹی الیکٹریشن کوئی اور کمپنی تھی جس کے ٹرک سے نشان اتار کے وین پر چپکایا گیا تھا۔ لائسنس پلیٹ سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ مجرموں نے دو پرانی پلیٹس استعمال کی

تھیں۔ دونوں کو درمیان سے کاٹ کر ویلڈنگ کے ذریعے ایک نئی پلیٹ بنائی تھی۔ ریگن اور لائیڈ کے خیال میں وہ لوگ پروفیشنل تھے۔ میں نے ان کے اس خیال کو طنزیہ انداز میں سراہا۔ دونوں کا دوسرا اندازہ تھا کہ مجرم مزید رقم کے لیے پھر رابطہ کریں گے...... ایڈگر کی کال میں برہمی اور مایوسی دونوں کا عنصر تھا۔ جسے میں نے برداشت کیا۔ بہرحال رقم اسی نے فراہم کی تھی اور میں نے اس کے مشورے پر کان نہیں دھرا۔ یہ اور بات تھی کہ میں اس کی ہدایت کے مطابق چلنا چاہتا تھا...... لیکن ابھی رابطے میں تھا۔ وہ خود سے ناراض تھا۔ کیونکہ اسی نے مجھے کہا تھا کہ پولیس کو بتا دیا جائے۔ وقت کے ساتھ پولیس اور ایف بی آئی کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ وہ دوسرے کیسز کی طرف متوجہ ہوتے گئے۔

☆☆☆

پھر اچانک نو دن بعد سب کچھ بدل گیا۔

میں دس بجے سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ سرسری نگاہ کھڑکی پر گئی۔ نظر انداز کرتے کرتے میں رک گیا۔ نیم تاریکی میں وہ کوئی عورت تھی۔ جو ساکت کھڑی گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ میں نے سڑک کو کھنگالا۔ کوئی کار کوئی نیوز وین نہیں تھی۔ کچھ غیر معمولی نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک جگہ کیوں کھڑی تھی۔ تجسس کے تحت میں کھڑکی کے قریب چلا گیا۔ اس نے غالباً مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے کھڑکی کھولی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔

''رکو۔'' میں بے ساختہ پکار اٹھا۔ اس نے چلنا شروع کر دیا۔

''پلیز رک جاؤ۔''

اُس نے رفتار پکڑ لی۔ میں پلٹ کے دروازے کی طرف بھاگا...... میں ننگے پیر ہی باہر نکل گیا۔ اندازے سے اسی سمت میں دوڑا۔ تاہم میں اسے کھو چکا تھا۔ میں واپس آ گیا۔

☆☆☆

میری آنکھ فون کی گھنٹی سے کھلی تھی۔ گھڑی چار بجا رہی تھی۔ میں نے کروٹ لے کر ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو؟''

''ریگن بول رہا ہوں۔ لائیڈ کے ساتھ آ رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟''

''آ کر بتاتا ہوں۔'' فون بند ہو گیا۔


کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے، اعصابی کمزوری دور کرنے، تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔ آپ آج ہی فون کریں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

وہ دونوں کم وقت میں پہنچ گئے۔ یقیناً کوئی خراب بات تھی۔

"کچھ دکھانا ہے تمہیں۔" لیونگ روم میں ریگن نے کہا۔ لائیڈ نے کاؤچ پر لیپ ٹاپ کھولا۔

"پہلا بریک تھرو۔" وہ بولا۔

میں قریب ہوگیا۔ نظر اسکرین پر تھی۔

"تمہارے سسر نے نوٹوں کے نمبر دیے تھے۔ سیریل نمبر۔ ان میں سے چند نوٹ کل بینک میں سامنے آئے ہیں۔" لائیڈ نے مجھے بینک کا منظر دکھایا۔ ٹیلر (کیشیئر) کے سامنے ایک گنجا آدمی کھڑا تھا۔

"میں نہیں پہچانتا۔" میں نے کہا۔

"صبر کرو۔"

گنجے کے ہٹنے کے بعد جو میں نے دیکھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ میری بہن برینڈا تھی۔ میری اپنی بہن جس سے میں محبت کرتا تھا۔ اگرچہ وہ غلط راہ پر تھی۔ فیملی سے دور تھی۔ وہ یہ کیسے کرسکتی ہے؟ میرے سر میں پٹاخے چل رہے تھے۔ اگر برینڈا ملوث تھی تو کم از کم یہ امید کی جاسکتی تھی کہ تارا خطرے سے دور ہے۔

"یہ کہاں ہے......؟"

"کیٹس کھو کا ٹاؤن ہے۔" وہ بولا۔

"مونٹیکو۔" میں نے جملہ مکمل کیا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا؟"

میں اٹھ کے باہر کی جانب لپکا۔ "میں جانتا ہوں، وہ کہاں ہے۔"

☆☆☆

میرے دادا کو شکار کا شوق تھا۔ 1956ء میں انہوں نے مونٹیکو (نیویارک) کے جنگلات میں ایک کیبن بنوایا تھا۔ یہ سڑک سے دو سو گز دور تھا۔ فیملی کے لیے وہ ایک بھولی بسری یاد کے مانند تھا۔ جب میں اور برینڈا بچے تھے۔ اس وقت ہر ہفتے دادا اور دادی کے ساتھ ایک دن وہاں گزارتے تھے۔ میں نے ریگن اور لائیڈ کو راستے میں کیبن کا محل وقوع سمجھایا۔ ہم روٹ سترہ پر تھے۔ لائیڈ نے علاقائی پولیس کو اطلاع دی۔ ساڑھے چار بجے ٹریفک برائے نام تھا۔ ریگن اُڑا جارہا تھا۔

برینڈا کی ذہنی اُلجھنوں میں اس کی پھیکی شخصیت کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ ہم نے اس کے ڈپریشن کو سمجھنے میں دیر کردی تھی۔ اب اس کا ناخوشگوار سفر ختم ہوگیا تھا۔ وہ مرچکی تھی۔

وہ اجاڑ کیبن کے فرش پر مردہ پڑی تھی۔ وہ جس پوزیشن میں لیٹی تھی۔ بچپن میں اسی طرح سوتی تھی۔ دونوں گھٹنے سینے سے لگا کے۔ لیکن اس وقت وہ سو نہیں رہی تھی۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں کھلی تھیں۔ بے جان آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں...... سوال کررہی تھیں۔ میرے دل میں ٹیس اٹھی۔ میں نے نظر ہٹالی۔ قریب ایک پائپ ڈرگ نیڈل پڑی تھی۔ ڈرگ...... زندگی میں اس کی ساتھی تھی...... موت میں بھی ہمراہ۔ کیبن کی حالت ابتر تھی۔ وہ تین دہائی سے غیر آباد تھا۔ جانوروں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ فضا میں بدبو تھی۔ میں تارا کے رونے کی آواز سننا چاہتا تھا۔ ہم تینوں تلاشی لے رہے تھے۔ ریگن اور لائیڈ کے ہاتھ میں فلیش لائٹس تھیں۔

میرا سر گھوم رہا تھا۔ اُجاڑ کیبن میں ناگوار بُو رچی بسی تھی۔ مقامی پولیس اہلکار کی آواز پر وہ دونوں متوجہ ہوئے۔ پھر میرے قریب آگئے۔ میں نے ویران نظروں سے انہیں دیکھا...... میرے ہوش اُڑ گئے۔ ریگن کے ایک ہاتھ میں تارا کے لباس کا ٹکڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں تارا کا بھالو نما چھوٹا سا کھلونا۔

☆☆☆

اٹھارہ ماہ بعد۔ کافی ہاؤس تقریباً خالی تھا۔ بیوہ شکست خوردہ انداز میں مارتھا کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ مارتھا نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ویٹر اپنی جگہ پر تھا۔ "وینڈی۔" مارتھا نے نرمی سے کہا۔ "مجھے تمہارے نقصان پر افسوس ہے۔" مارتھا کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ تھی۔ وینڈی نے کھڑکی سے نظر ہٹا کے اسے دیکھا۔ انداز ایسا تھا گویا وہ مارتھا کو پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ مارتھا کے لیے یہ تاثرات نئے نہیں تھے۔ اس نے بارہا ایسے تاثرات کا سامنا کیا تھا۔ اس نے طویل عرصہ قبل ٹی وی شو چھوڑ دیا تھا۔ کوئی اسے پہچاننے کی کوشش کرتا تو مارتھا شانے اچکا کر رہ جاتی۔

وینڈی اپنے شوہر کی بھیانک موت کے بعد شاک میں تھی۔ سامنے بیٹھی پُرکشش عورت کے اظہارِ افسوس پر اسے کوئی جواب نہیں سوجھا۔

"بے چارہ جمی۔" مارتھا نے کہا۔ "آہ، وہ کس طرح دنیا چھوڑ گیا۔"

وینڈی نے کافی کپ سنبھالنے کی کوشش کی۔
''تم یقیناً مجھے نہیں جانتی ہو؟''
''آئی ایم سوری۔'' وینڈی کے چہرے پر مدھم کمزور مسکراہٹ ابھری۔ ''تم میرے شوہر کو جانتی ہو؟''
''ہاں، مارتھا نے جواب دیا۔
''کیا تم انشورنس سے تعلق رکھتی ہو؟''
''نہیں۔'' مارتھا نے کہا۔
وینڈی کی آنکھوں میں الجھن دکھائی دی۔ تاہم وہ خاموشی سے کافی کے سپ لیتی رہی۔ جب وہ اٹھنے کی تیاری کرنے لگی تو مارتھا نے کہا۔ ''میں وہ آخری شخصیت ہوں جس نے جمی کو زندہ دیکھا تھا۔'' وینڈی پر سکتہ طاری ہو گیا۔
''کافی مزیدار ہے۔'' مارتھا نے کہا۔ ''پلیز بیٹھ جاؤ۔''
وینڈی واپس بیٹھ گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے مارتھا کو تک رہی تھی۔
''دیکھو بات یہ ہے کہ میں نے ہی تمہارے شوہر کو ہلاک کیا تھا۔'' مارتھا کے سرخ ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔
وینڈی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ''کیا بکواس ہے؟ کون ہو تم؟''
''وینڈی پرسکون رہو۔'' مارتھا نے آگے جھک کر ایک انگلی وینڈی کے ہونٹوں پر رکھ دی۔ وینڈی لرز کے رہ گئی۔
''مجھے وضاحت کرنے دو۔'' مارتھا نے کہا۔ وہ یوں باتیں کر رہی تھی گویا کسی بچی کو پریوں کی کہانی سنا رہی ہو۔ ''میں جانتی ہوں، تم پریشان ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ جمی کے سر میں گولی میں نے اتاری تھی لیکن......'' مارتھا نے کچھ فاصلے پر براجمان ریچھ نما بھاری بھرکم، ہیثی کی جانب اشارہ کیا۔ ''لیکن پہلے ہیثی نے جمی کی خاطر تواضع کی تھی۔ وہ ایسے کاموں کا ماہر ہے۔''
وینڈی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر سامنے بیٹھی عورت کو تک رہی تھی۔
''ہم عورتیں اپنے شوہروں سے خاصی واقف ہوتی ہیں۔ تم بھی بے خبر نہیں ہو گی کہ جمی جوئے کا عادی تھا اور دو ملین ڈالرز کا مقروض ہو چکا تھا۔ وہ بہت ہی خراب لوگوں کا مقروض تھا۔''
وینڈی لرز اٹھی۔
''تمہاری اُلجھن دور ہو رہی ہے۔'' مارتھا مسکرائی۔
''میں عام عورت نہیں ہوں۔ قرض خواہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ ہیثی میرا ساتھی ہے۔ وہ خالی ہاتھوں سے آدمی کو اپاہج کر دیتا ہے۔ مارنے کا فائدہ نہیں ہے۔ مردہ آدمی سے وصولی نہیں ہوتی۔ تمہارا شوہر بیمار تھا۔ اسے جوئے کی بیماری تھی۔ کیا تم نے اسے کبھی نہیں روکا؟''
وینڈی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تم قاتل ہو۔''
مارتھا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ ہمارے کاروبار میں قرض ہر صورت قابلِ ادائیگی ہوتا ہے اور جمی قلاش ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے پاس ایک بیوی اور تین بچے تھے اور وہ تمہارے باپ کی مہربانی سے انشورنس کے کاروبار میں تھا...... میرا اشارہ سمجھ رہی ہو؟''
وینڈی کی سانس رکنے لگی۔
''جمی کے پاس لائف انشورنس پالیسی تھی۔ تاہم اس نے قبول کے نہیں دیا۔ ہیثی کے سامنے مزاحمت گویا حماقت تھی۔ جمی نے بالآخر زبان کھول دی۔ بقول جمی اس کے پاس دو پالیسیاں تھیں جن کی کل مالیت تقریباً دس لاکھ ڈالرز ہے۔''
''تم نے انشورنس کی رقم کے لیے......'' وینڈی نے کمزور آواز میں کہا۔
''ششش...... شش......'' مارتھا نے اسے خاموش کرایا۔ ''جمی کے ساتھ اس کا قرضہ نہیں مرا۔ بینک تمہارے مکان کی قسطیں وصول کرتا رہے گا۔ کریڈٹ کارڈ کمپنی بھی سود وصول کرتی رہے گی۔ ہمارا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہمیں اپنے واجبات وصول کرنے ہیں۔ جب تک انشورنس کی رقم ملے گی جمی کا قرضہ دو لاکھ اسی ہزار ڈالرز تک پہنچ جائے گا۔ ہم لالچی نہیں ہیں۔ ہم اس سے زیادہ طلب نہیں کریں گے۔ تمہارے مالی معاملات سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ تم دیوالیا ظاہر کر کے کہیں اور جا سکتی ہو۔ رقم نہ بچے تو جاب کر سکتی ہو۔ آئندہ ہم شکل نہیں دکھائیں گے لیکن اگر......'' مارتھا نے وقفہ لیا۔ ''لیکن اگر تم نے ہماری مرضی کے خلاف عمل کیا یا پولیس کو بتایا تو ہیثی حرکت میں آئے گا۔ وہ پہلے تمہارے گیارہ سالہ جیک کو ختم کرے گا۔ دو دن بعد لیلیٰ اور پھر ڈارلن کو۔ جب تم آگے پیچھے تینوں کو دفنا دو گی۔ بات پھر بھی ختم نہیں ہو گی۔ ہم رقم تم سے وصول کریں گے۔'' مارتھا نے کافی کا سپ لے کر ہیثی کی طرف دیکھا۔
''تم سمجھ رہی ہو؟''
''ہاں۔''
''کیا کرو گی؟''
''ادائیگی کروں گی۔''

مارتھا مسکرا دی۔ ''میں ایک بار پھر دل سے افسوس کرتی ہوں۔''

☆☆☆

''کام ہوگیا؟'' مارتھا نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' کیشی نے کہا۔

''اور رقم؟''

''رقم بھی آئے گی۔''

مارتھا گہری سوچ میں گم ہوگئی۔

''کیا ہوگیا؟ پیچھے ہٹنا ہے؟'' کیشی نے سوال کیا۔

''ڈارلنگ، یہ کیسے ممکن ہے؟''

''پھر؟''

''میں ڈاکٹر سیڈمین کے ردِعمل کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔''

☆☆☆

غم کم ہوجاتا ہے یا تحلیل ہوجاتا ہے۔ کبھی جلدی کبھی بہت وقت لیتا ہے۔ لیکن پھر اچانک نمودار ہو کے حیران و پریشان کردیتا ہے۔ ہوش میں نہیں تو عالمِ خواب میں گرفت میں لے لیتا ہے۔ آہ وہ خوفناک منحوس دن...... ایک نہیں دو دن تھے۔ دوسرا دن وہ تھا جب میں نے پولیس کو تاوان کے بارے میں بتایا۔ ایک طرف خیال بھی آتا کہ پولیس کے بغیر بھی تارا ہاتھ نہ آتی تو میں کیا کرلیتا۔ کس کو الزام دیا جاسکتا ہے۔ شاید تارا مطالبۂ تاوان سے پہلے ہی دنیا چھوڑ گئی تھی۔ شاید ایسا حادثاتی طور پر ہوا ہو...... میں خوابوں میں تارا سے زیادہ جعلی نمبر پلیٹ والی سفید وین دیکھتا تھا۔ اگر میں تھوڑی بہادری دکھاتا تو تارا تک پہنچ جاتا...... شاید......

واردات والے دن سے قبل لینی اکثر مشورہ دیا کرتا کہ ہمیں وصیت تیار کرنی چاہیے۔ ہماری رقم کہاں جائے گی۔ بچی کی دیکھ بھال کون کرے گا اور میرے والدین کی خبر گیری؟ وغیرہ وغیرہ...... لیکن ہم سنی ان سنی کرتے رہے جیسے ہم نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ پھر وہ موضوعِ سخن تبدیل کر دیتا۔

دادا کے کیبن سے جو کچھ ملا، ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد تصدیق ہوگئی کہ کپڑے کے ٹکڑے پر لگے ہوئے چند بال تارا کے تھے۔ پتا نہیں یہ بدترین تھا یا بہترین کہ اٹھارہ ماہ بعد بھی امید کی کرن ٹمٹما رہی تھی۔ تاوان کی رقم کہاں گئی؟ میری بہن کے ساتھ کون ملا ہوا تھا؟ کسی قسم کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ جنگل بڑا اور پھیلا ہوا تھا۔ اگر تارا زندہ نہیں تھی تو جنگل میں چھوٹی سی پوشیدہ قبر تلاش کرنا ناممکن تھا۔ ایک اور خیال تھا جو مجھ تک محدود تھا۔ وہ یہ کہ تارا زندہ ہے۔ غم کے مانند امید گم ہو کے پھر ابھر آتی۔ یہ دونوں بہنیں تھیں...... غم اور امید۔

پولیس اور ایف بی آئی کی تھیوری کے مطابق میری بہن کے تعلقات جرائم پیشہ افراد کے ساتھ تھے۔ تاہم کوئی بھی پُریقین نہ تھا کہ میرے گھر پر نقب، فائرنگ اور اغوا کے اصل مقاصد کیا تھے۔ اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ مجرمان گھبراہٹ میں اصل منصوبے سے منحرف ہوگئے تھے۔ ایک رائے کے مطابق مجرم توقع نہیں کررہے تھے کہ ہم گھر پر تارا کے ساتھ ہوں گے۔ میرے خیال میں یہ رائے کمزور تھی۔

بیلسٹک ٹیسٹ (ballistic) کے مطابق مونیکا اور مجھے اعشاریہ اڑتیس کے دو مختلف ہتھیاروں سے گولیاں ماری گئی تھیں۔ تارا کو اغوا کیا، بعدازاں میری بہن کے ساتھ دھوکا کیا اور ہیروئن کے اوور ڈوز سے اسے ہلاک کردیا۔ پولیس اور ایف بی آئی کے نظریے کے تحت برینڈا کے ساتھ کم از کم دو افراد اور تھے۔ ایک ٹھنڈے دماغ کا، دوسرا اناڑی۔ جس نے گھبراہٹ میں فائرنگ کرکے اصل منصوبہ چوپٹ کردیا۔ چند لوگوں نے یہ تھیوری قبول کرلی۔ کچھ نے مسترد کردی۔

ان کی تھیوری کو ایک ڈرگ ڈیلر نے سہارا دیا۔ جس پر کسی اور جرم پر مقدمہ چل رہا تھا۔ وہ پلی بارگین کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے بتایا کہ برینڈا نے اغوا اور فائرنگ کی واردات سے ایک ہفتہ قبل اس سے اعشاریہ اڑتیس کی گن خریدی تھی۔ ایک اور بات یہ سامنے آئی تھی کہ جائے واردات سے ملنے والے نشانات اور بال برینڈا کے تھے۔

پولیس اور ایف بی آئی کے چند اہلکار دور کی کوڑی لائے تھے۔ وہ یہ کہ اس سارے کھیل تماشے کا ماسٹر مائنڈ میں تھا۔ اس انوکھے نظریے کو سہارا دینے کے لیے ان کے پاس چار پانچ دلائل تھے۔ پہلا یہ کہ اس قسم کے مرڈر میں سب سے پہلے شوہر پر شبہ کیا جاتا ہے۔ دوسرے، میرا اسمتھ اینڈ ویسن اعشاریہ اڑتیس ہوا میں تحلیل ہوگیا تھا۔ جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تیسرے یہ کہ اتنی جلدی مجھے اولاد کی خواہش نہیں تھی اور میں طلاق کے بارے میں غور کررہا تھا۔ یہ آخری بات کسی حد تک ٹھیک تھی۔ ان کی اس تھیوری کے مطابق میں نے منصوبہ بندی کی۔ اپنی بیٹی کو مارا یا مروا دیا۔ تاوان کی رقم غائب کردی۔ برینڈا کو میں نے گھر بلایا تھا...... وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس تھیوری کی سب سے بڑی اڑچن یہ آن پڑی تھی کہ میں نے خود کو گولی مار کے کیونکر

مرنے کے لیے چھوڑ دیا..... کیا میں نے برینڈا کو ہلاک کیا؟ کیا اس نے مجھ پر گولی چلائی؟ سوال در سوال..... نظریے کے پیچھے نظریہ..... تھیوری..... خیال آرائی.....

نتیجتاً حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔ ڈیڑھ برس گزر گیا تھا۔ تکنیکی اعتبار سے فائل کھلی ہوئی تھی لیکن ریگن اور لائیڈ دوسرے کیسوں میں الجھ گئے تھے۔ چھ مہینے سے مکمل خاموشی تھی۔ میڈیا پہلے ہی چند ہفتوں بعد دیگر چٹخارے دار کہانیوں کی طرف چلا گیا تھا۔

☆☆☆

میں اپنی پارٹنر ڈی لیرا کے ساتھ اس کی بی ایم ڈبلیو میں سفر کر رہا تھا۔ ہم سپر مارکیٹ پر کچھ دیر کے لیے رکے۔ ڈی نے اشیائے خورد و نوش خریدی تھیں۔ وہ متواتر باتیں کر رہی تھی۔ معاً خاموش ہو گئی۔ میں اس کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟''

اس نے ہاتھ کے بجائے آنکھوں سے میرے عقب میں اشارہ کیا۔ میں آہستگی سے ترچھا ہوا اور بائیں جانب عقب میں دیکھا۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ راشیل تھی۔ میں جذباتی ہونے لگا۔ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہم دونوں عرصہ قبل ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ راشیل میری کم عمری کا پیار تھی۔ اس وقت وہ مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر تھی۔ دل میں آرزوئیں یوں ہمکنے لگیں گویا میں ابھی تک نوجوانی کی منزل پر کھڑا تھا۔ وہ فتنہ ساماں اس وقت بھی شعلہ لرزاں کے مانند تھی۔ کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

''اس نے شادی کر لی تھی؟'' ڈی کی سرگوشی سنائی دی۔

''ہاں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اُف، اس کی انگلیوں میں رنگ نہیں ہے۔'' ڈی نے ہیجانی آواز میں کہا۔ میں نے خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی اور ڈی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

''منہ کھولے کیا کھڑے ہو، مذاق بن جائے گا۔'' وہ بولی۔ ''اور اس نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو..... مجھے ہٹ جانا چاہیے، جاؤ ہیلو کہو۔''

''ہاں، شکریہ۔'' میں نے دھیرے سے حرکت کی۔ فاصلہ کم ہوا۔ راشیل نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ ایک ساعت کے لیے ٹھٹکی اور پھر مسکرائی۔ وہی جادو بھری مسکراہٹ۔ میں ماضی کی طرح موسم بہار کی پھوار میں بھیگ سا گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں اذیت کا خفیف سا عنصر موجود تھا۔ میرا یقین ڈگمگا گیا۔ ہم روبرو تھے۔ درمیان میں ایک گز کا فاصلہ تھا۔ معانقہ نہ مصافحہ..... نہ ہونٹوں کا لمس۔ میں گھائل ہو گیا۔

''ہیلو۔''

''اچھا لگا، تم پہلے جیسے ہو..... بدلے نہیں۔'' وہ بولی۔

میں نے خوش دلی سے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''تم کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''یہاں اکثر آتی ہو؟''

''اب کہو گے کیا ہم پہلے کہیں ملے ہیں؟'' ہم دونوں ہنس دیے۔

سکوت کی اَن دیکھی چادر درمیان میں تن گئی۔ دونوں موزوں الفاظ کی تلاش میں تھے۔ راشیل کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ چند بال رخِ تاباں کی روشنی کم کرنا چاہتے تھے۔ بال رخ سے ہٹانے کے لیے میں نے ارادے کے بل پر خود کو باز رکھا۔

''میں نے تمہاری بیوی اور بیٹی کے بارے میں سنا تھا۔'' وہ بولی۔ ''مجھے دکھ ہوا۔''

''شکریہ۔''

''میں نے سوچا تھا فون کروں یا لکھوں لیکن.....''

''تم نے شادی کر لی تھی؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ ''ہاں، کی تھی۔''

''اور ایف بی آئی کے لیے کام.....''

''ہاں کرتی تھی۔'' اس کے دونوں جواب ذومعنی تھے۔

اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا۔ کوئی کھنکھارا۔

''ہیلو، میں ڈی لیرا ہوں۔''

''میں راشیل فلز۔''

''مل کر خوشی ہوئی، میں مارک کے ساتھ کام کرتی ہوں۔''

''ڈی؟'' میں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

''سوری، میں جلدی میں ہوں۔'' وہ رخصت ہو گئی۔

''راشیل ہم کہیں مل نہیں سکتے؟'' میں نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ سوال میں یاس تھی، التجا، آرزو یا کچھ اور.....

''میں واشنگٹن میں رہتی ہوں، کل واپس جانا ہے۔''

میرے اندر کچھ پگھلنے لگا۔ سینہ جلنے لگا۔ اندازِ جنوں بحال کروں یا امید پامال کروں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ

بول اٹھی۔ ”گڈ بائے مارک۔“ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ نم مژگاں سے غم پنہاں تک...... یہ محض سطح کا ارتعاش نہیں تھا۔ میں نے جرأتِ اظہار بڑھائی۔ جلوے سے لرز رہے تھے۔

”مت جاؤ۔“ میری آواز ٹوٹ گئی۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”ہمیں ساتھ رہنا چاہیے۔“

”کیا اتنا کافی ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کافی نہیں ہے۔ اس سے بہت زیادہ۔“

”مارک میں اکیس برس کی نہیں ہوں۔“

”ہاں، میں بھی نہیں ہوں۔“

”جس لڑکی سے تم پیار کرتے تھے، وہ بہت پہلے مر چکی ہے۔“

”نہیں، وہ میرے سامنے کھڑی ہے۔“

”تم مجھے نہیں جانتے۔ میں بدل گئی ہوں۔“

”مجھے جلدی نہیں ہے، میں جان جاؤں گا۔“

”واقعی؟“

”ہاں۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”میں واشنگٹن میں اور تم نیوجرسی میں رہتے ہو۔“

”میں واشنگٹن آجاؤں گا۔“ الفاظ منہ سے نکلتے ہی مجھے اپنی احمقانہ بہادری کا احساس ہوا۔ میں والدین کو کیونکر چھوڑوں گا۔ پریکٹس یا ”راپ ایڈ“ کا کیا ہوگا اور تارا......؟ الفاظ ہونٹوں سے نکل کے راشیل کے کانوں تک گئے اور جذباتیت دھواں دھواں ہوگئی۔ راشیل رخ پھیر کے چلی گئی۔ اس نے دوسری مرتبہ گڈ بائے نہیں کہا تھا۔ میری پہلی محبت دوسری بار میری زندگی سے نکل گئی۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ چہرے پر وحشت، آنکھوں سے رواں موجۂ خون...... بتا نہیں اشکوں سے قلزم کا سکوں۔ ماہ جبیں، زہرہ نگاہ...... دلربا، ماہ رخ، بدلی سے نکلی اور روپوش ہوگئی۔ میں خوابوں کے طلسم میں کھویا تھا۔ بے جان مجسمے کے مانند...... کچھ نہ کرسکا۔ ہاتھ پکڑا نہ آواز دی۔ کیسے روکتا...... بے چارگیٔ قلب ونظر، دیدۂ تر نے بے حال کردیا تھا۔

☆☆☆

راشیل، لینی کی بیوی شیرل کی دور کی رشتے دار تھی۔ وہ کالج کے دن تھے۔ راشیل کے والدین کا رشتہ طلاق کے مراحل سے گزر رہا تھا اور وہ شیرل کے گھر ٹھہری ہوئی تھی۔ وہیں ہم دونوں متعارف ہوئے۔ بہار کا موسم تھا۔ بہاروں میں بہار تھی۔ ایسی بہار پہلے نہیں آئی تھی...... آغازِ جوانی کی آرزو اور امنگ تھی۔ دل کا معاملہ تھا۔ اُدھر بھی بے قراری اِدھر بھی دھڑکنوں میں سُرور تھا۔ اس کی نگاہ کا فسوں تھا۔ وہ موجِ تند تھی۔ یہاں سرمستیِ جنوں، دیوانگیِ شوق ستاروں سے گزر رہا تھا۔ ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ حسن و عشق خلط ملط ہوگئے، ہر دن ایک نیا دن تھا۔

ایک روز راشیل نے خبر دی کہ وہ چھٹیاں فلورنس میں گزارے گی۔ اس کی غیر موجودگی میں میری بظاہر عام سی غلطی نے دنیا ہی بدل دی۔ میں ایک رات کسی اور کے ساتھ سو گیا۔ اس کا کچھ بھی مطلب نہیں تھا لیکن تعبیر بھیانک نکلی۔ پارٹی میں، میں زیادہ ہی پی گیا تھا۔ کس ذریعے سے کیونکر راشیل کو خبر ہوئی، بعد ازاں اسے سمجھانے اور منانے کی میری ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ جو رنگین باب کھلا تھا، اچانک بند ہوگیا۔ لینی اور شیرل ہماری محبت کے آغاز و انجام سے باخبر تھے۔ دن، ہفتے سے مہینوں اور سالوں میں بدلتے گئے۔ شیرل مجھے راشیل کی مصروفیات سے باخبر رکھتی تھی۔ اسی نے مجھے تین سال قبل اس کی شادی اور ایف بی آئی کے بارے میں بتایا۔ شادی کا سن کر میرے چہرے پر شیرل نے کونسا رنگ دیکھا، مجھے نہیں پتا۔ لیکن اس کے بعد راشیل کے بارے میں اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔

میری نظر گروپ فوٹو پر تھی۔ تصویر میں لینی اور شیرل کے ساتھ ہم دونوں نظر آرہے تھے۔ میں اور راشیل۔ معاً گھر کے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ لینی کے پاس چابی تھی۔ اسے دستک کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ اندر آیا اور میرے قریب کاؤچ پر ڈھیر ہوگیا...

”کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے معنی خیز انداز میں تصویر پر نگاہ ڈالی۔

”تم نے راشیل کی طلاق کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟“

لینی کی آنکھوں میں کرب تھا۔ ”مارک کیوں ماضی میں زندہ ہو۔ چودہ سال بیت گئے، دوست......“ وہ چپ ہوگیا۔

میں بھی خاموش رہا۔ کیا کہتا؟

☆☆☆

راشیل کو دیکھے ہوئے تین روز ہو چلے تھے۔ میں نے خود کو کام میں مصروف کرلیا تھا۔ چوتھی رات گھر پر میں اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ جب میں نے کتے کے بھونکنے کی آواز

سی۔ ہمارے پڑوس میں دو گھر چھوڑ کے ایک نئی فیملی آئی تھی۔ ان کے پاس ایک جسیم آئرش وُولف ہاؤنڈ تھا۔ میں نے غیرارادی طور پر کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ میں پلک جھپکائے بغیر باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر یک لخت میں نے پردہ برابر کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کھڑکی میں میری موجودگی سے آگاہ ہو جائے۔ وہی عورت تھی، جسے اٹھارہ ماہ قبل میں نے دیکھا تھا۔ وہ اسی جگہ کھڑی تھی۔ وہی لمبا کوٹ۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں۔ کوئی انوکھی بات تھی۔ میری چھٹی حس اکسا رہی تھی کہ میں اسے پکڑوں۔ میں نے احتیاط کے ساتھ معمولی جھری بنا کے جھانکا۔ وہ نہ صرف موجود تھی بلکہ میرے گھر کے فرنٹ ڈور کے قریب آگئی تھی۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ کون تھی؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میری کسی بھی حرکت پر یقیناً وہ پہلے کے مانند فرار ہو جائے گی۔ میں نے خطرہ مول لے کر پھر جھانکا۔ یہی میری غلطی تھی۔ اس نے دیکھ لیا۔ اس کی نظر کھڑکی پر تھی۔ وہ رخ پھیر کے حرکت پذیر ہوئی۔

میں ننگے پاؤں باہر کی طرف لپکا۔ میں نے فرنٹ ڈور کھولا اور عورت نے دوڑ لگا دی۔ مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ میں رات میں ایک اجنبی عورت کے پیچھے ننگے پیر بھاگ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ٹہلنے نکلی ہو اور ڈر کے بھاگ رہی ہو۔ اگر اس نے پولیس کو فون کر دیا تو کیا ہوگا۔ پہلے ہی مرڈر اور اغوا کے غیر حل شدہ کیس میں میرے اوپر شکوک وشبہات موجود تھے۔ ہر اندیشہ بالائے طاق رکھ کے میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ چند موڑ کاٹ کر ہی ایک بار پھر میں نے اسے کھو دیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور غصہ بھی آرہا تھا۔ علاقے کے خدوخال میرے دیکھے بھالے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اس طرح غائب نہیں ہوسکتی تھی۔ دو امکانات تھے۔ وہ انہی مکانات میں کہیں رہائش پذیر تھی یا پھر آس پاس چھپی ہوئی تھی۔ تیسرا امکان یہ تھا کہ وہ مکانات کے عقب میں موجود فٹ بال کے میدان اور بیس بال کورٹ سے پرے جنگلات میں نکل گئی ہے۔ میں زوکر ہاؤس کے قریب کھڑا تھا۔ زوکر ہاؤس کے بائیں جانب سے وہ راستہ قریب تھا جو جنگل کی طرف نکلتا تھا۔ میرا بچپن بھی یہیں گزرا تھا۔ زوکر ہاؤس کی بوڑھی عورت کہیں اور چلی گئی تھی۔ اب وہاں کون تھا، میرے علم میں نہیں تھا۔ مکان کی روشنیاں بند تھیں۔ میں نے فیصلہ کرنے میں وقت نہیں لیا۔ چاند کی روشنی کے سہارے میں بیک یارڈ میں گھس گیا۔ عقبی ریلنگ پار کر کے میں چالیس فٹ دور پگڈنڈی کی طرف گیا۔ مجھے یہ مبہم بے معنی لگ رہی تھی...... معاً میری نظر بیس بال کورٹ کی پارکنگ پر گئی۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ یہ اس کی کار ہے یا وہ جھاڑیوں میں چھپی ہے۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے...... میں نے مایوسی سے سر ہلایا اور شانے لٹکا کے پسپا ہو گیا۔ زوکر ہاؤس کے بیک یارڈ میں آکر میں گھاس پر لیٹ گیا۔ یہاں سے کار نظر نہیں آرہی تھی لیکن جنگل کے شروع میں جھاڑیاں نگاہ کی رسائی میں تھیں۔ ہر طرف سکوت کا عالم تھا۔ مکمل سناٹا۔ میں بے چینی دبا کے انتظار کرتا رہا۔

جب میں اٹھنے والا تھا اس وقت جھاڑیوں سے ایک ہیولا نمودار ہوا۔ وہی تھی۔ میں اندازہ نہیں لگا پایا کہ وہ کس طرف جائے گی۔ اگر کار میں جا بیٹھی تو ہاتھ نہ آئے گی۔ میں کمین گاہ سے نکل کے چیخا۔

''سنو، مجھے بات کرنی ہے۔''

وہ ٹھٹکی اور پلٹ کے جنگل میں گھس گئی۔ میں اندھا دھند بھاگا اور ایک درخت سے ٹکرا کے گرا۔ دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیے۔ ایک ہاتھ میں جھاڑی کی شاخ کے بجائے کوئی جاندار شے آئی...... وہ اس کی پنڈلی تھی۔ اس نے لاتیں چلانا شروع کر دیں۔ ناکام ہو کے وہ چلائی۔ ''مجھے جانے دو۔''

آواز اجنبی سی لگی۔ چھوڑنے کے بجائے میں نے اسے کھینچا۔ میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ دھینگا مشتی میں زلفیں اس کے چہرے پر آن گری تھیں...... اس نے مزاحمت ترک کر کے بال سمیٹے۔ میرا ذہن ماضی کی طرف سفر کرتا ہوا اسکول تک جا پہنچا۔ یادداشت کے دریچے وا ہوتے گئے۔ میں یک ٹک اسے گھور رہا تھا۔ وہ وینالیوسکی تھی۔

☆☆☆

ایڈگر پورٹ مین آبائی قبرستان کے محدود قطعۂ اراضی پر کھڑا تھا۔ متعدد قبروں میں مونیکا کی قبر بھی تھی۔ ایڈگر کا کتا ''برُونو'' اس کے ساتھ تھا۔ ایڈگر واک کے لیے اب اسٹک اور برونو کے ساتھ نکلتا تھا۔ وہ اس وقت مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیڑھ دو برس پہلے وہ زندگی اور موت کے بارے میں پریشان نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک اچھا باپ ثابت ہوا تھا یا نہیں...... وہ سوچ رہا تھا کہ خوشی اور دولت کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اوپر تلے اس کی اولاد دنیا سے منہ موڑ گئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں زندہ ہے۔ برونو کے بھونکنے پر وہ خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔

''چلو لڑکے، چلتے ہیں۔'' ایڈگر نے گھر کا رخ کیا۔ دروازے پر کارسن پورٹ مین منتظر تھا۔ پریشانی اس کے

چہرے سے ہویدا تھی۔
"مائی گاڈ۔" کارسن کے منہ سے نکلا۔
"شاید تم نے پیکیج دیکھ لیا ہے۔" ایڈگر نے کہا۔
"ہاں، کیا تم نے مارک کو کال کر دی؟"
"نہیں۔"
"اچھا کیا، پیکیج جعلی ہو سکتا ہے۔" کارسن بولا۔
ایڈگر خاموش رہا۔
"تمہیں میری بات سے اتفاق نہیں ہے؟"
"میں نہیں جانتا۔" ایڈگر نے جواب دیا۔
"تم شاید سوچ رہے ہو کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔"
"ٹیسٹ کا نتیجہ آنے دو۔" ایڈگر نے پُرسوچ انداز اختیار کیا۔

☆☆☆

ہم دونوں کچن ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے کافی کپ اسے پکڑایا۔ اس نے شکریہ ادا کیا۔ "تم ڈاکٹر بن گئے ہو؟"
"ہاں، اور تم؟"
"گرافک ڈیزائنر اور آرٹسٹ۔"
"اسکول میں بھی تمہاری ڈرائنگ اچھی تھی۔"
اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تم نے نوٹ کیا تھا؟"
"ہاں، کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔
وہ دھیرے سے مسکرائی۔ چند مکالمات کے تبادلے کے بعد اس نے استفسار کیا۔
"تم کیا جاننا چاہتے ہو؟"
"یہی کہ......"
"میں سمجھتی ہوں مارک۔" اس نے قطع کلامی کی۔ "بُرے ماضی کو کون یاد رکھنا چاہتا ہے لیکن یہ گھر مجھے ہمیشہ مقناطیس کی طرح کھینچتا ہے۔ تم نے میرے، میری فیملی اور میرے باپ کے بارے میں افواہیں سنی ہوں گی۔"
"ہاں۔"
"وہ سب سچ تھا۔ ڈیڈی کا انتقال چھ سال قبل ہوا۔ میں مریض بن گئی تھی۔ ڈاکٹر ریڈیو میری سائیکوتھراپی کرتے تھے۔ ڈاکٹر اسٹنلے ریڈیو۔ وہ ریڈیو تکنیک کی وجہ سے مشہور تھے۔ میں کئی برس ان کے زیرِ علاج رہی ہوں۔ میری شادی ہو گئی ہے۔ میرا شوہر اچھا آدمی ہے۔ میں خوش ہوں......"
"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی۔ "مارک کیا تم توہم پرست ہو؟"
"نہیں، کیوں؟"
"جب میں نے مونیکا اور تمہاری بچی کے بارے میں سنا تو اپنا ماضی یاد آ گیا۔ یوں لگا جیسے یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ تمہاری بیوی بہت اچھی تھی۔"
"تم مونیکا کو جانتی تھیں؟"
"ہم ملے تھے۔" اس نے غیر واضح جواب دیا۔
"کب؟"
وہ موضوع بدل کے نفسیات کی باتیں کرنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ ایڈگر پورٹ مین نے مونیکا کے بارے میں کیا کہا تھا۔ اگرچہ میں بھی آگاہ تھا کہ وہ ماہرِ نفسیات کے پاس جاتی تھی۔
"اٹھارہ ماہ قبل بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔ "کیا تم یہاں آتی رہتی ہو؟"
"ہر دو تین ماہ بعد آتی ہوں۔ میرا راز اس مکان میں ہے۔"
"میں سمجھا نہیں۔" میں نے اُلجھن سے اسے دیکھا۔
"مجھ پر جو بیتی وہ میں لکھتی رہتی تھی...... وہ ایک پرانا جرنل ہے۔"
"لیکن پولیس نے یہاں خوب تلاشی لی ہے۔"
"وہ انہیں ملا نہیں ہوگا۔ اگر دیکھا بھی ہوگا تو ایک فضول چیز سمجھ کے نظر انداز کر دیا ہوگا۔" وہ بولی۔
"تم نے کہاں رکھا تھا؟"
"تہ خانے میں۔" اس نے معاً گھڑی کی طرف دیکھا۔ دینا کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔
"تم ٹھیک ہو؟" میں نے سوال کیا۔
اس نے پھر گھڑی کی جانب دیکھا۔ "مجھے تاخیر ہو گئی ہے۔"
"کیا تمہیں وہ جرنل چاہیے؟"
"پتا نہیں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔
"تم کسی بھی وقت آسکتی ہو۔" میں نے نرمی سے کہا۔
یوں لگا اُسے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہو۔ وہ بدحواس نظر آ رہی تھی۔ اس نے چلنا شروع کیا۔ "دینا؟"
وہ اچانک تیزی سے مڑی۔ "کیا تم مونیکا سے محبت کرتے تھے؟"
"وہاٹ؟" میں بھونچکا رہ گیا۔
"یا کسی اور سے؟" اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' میں بھی کھڑا ہو گیا۔
''تمہیں نہیں پتا مونیکا کو گولی کس نے ماری؟''
میرا منہ کھل گیا۔ میرے ردِعمل سے پہلے ہی وہ باہر کی طرف لپکی۔ ''سوری، مجھے جانا ہے۔'' اس نے آخری بات کی۔
''رکو، رک جاؤ۔''
وہ دروازہ کھول کے ہوا ہو گئی۔ میں سناٹے میں تھا، دیکھتا رہ گیا۔ ''تمہیں نہیں پتا مونیکا کو گولی کس نے ماری؟'' اس کے یہ الفاظ آہنی میخوں کے مانند کانوں کے راستے دماغ میں اتر گئے تھے۔ اس کے پیچھے جانے کے بجائے میں تہ خانے کی طرف بھاگا۔

☆☆☆

جب گھنٹی بجی ایڈگر فون کے قریب تھا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھالیا۔
''کون ہے؟'' وہ غرایا۔
''تم نے کہا تھا کہ رزلٹ آتے ہی اطلاع دوں۔''
ایڈگر نے پیشانی مسلی۔ ''پھر؟''
''نتیجہ مثبت ہے۔'' جواب ملا۔
''کتنا یقین ہے؟''
''تقریباً پورا پورا۔ سو فیصد کے لیے مزید وقت درکار ہے۔''
چند باتیں معلوم کر کے ایڈگر نے فون رکھ دیا۔ وہ ہاتھ کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

☆☆☆

میں چکرا گیا تھا۔ دینا کا اس گھر میں ہونے والی واردات سے کیا تعلق تھا؟ وہ مونیکا کو کیسے جانتی ہے؟ کیا وہ اپنا جرنل حاصل کرنا چاہتی ہے؟ میں تہ خانے میں پریشان کھڑا تھا۔ میں دینا کے جرنل کا کیا کروں گا۔ وہ اس کا سیکرٹ ہے، مجھے نہیں دیکھنا چاہیے۔ میں گومگو کے عالم میں تھا۔ کنفیوز دماغ کے ساتھ میں نے تہ خانے کی تلاشی لینا شروع کی۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میں حیران تھا کہ جرنل کہاں چھپایا گیا ہے، پولیس کے ہاتھ بھی نہ لگا۔ دفعتاً ایک نیا خیال آیا کہ جرنل چھپایا نہیں گیا تھا۔ وہ سامنے تھا اس لیے ہاتھ نہیں آیا۔ میں نے نئے خیال کے تحت اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر پرانی میز کی طرف قدم بڑھائے۔ میز پر ایک بیکار لیمپ پڑا تھا۔ گرد آلود میز کی تینوں درازوں میں کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ آخر میں سائڈ کیبنٹ کھول کے دیکھا۔ کیبنٹ نصف کے قریب کتابوں اور رسالوں سے بھرا تھا۔ میں نے بہ آسانی پرانا رجسٹر دریافت کر لیا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر رجسٹر، کتابیں اور رسالے واپس رکھنا شروع کیے۔ معاً ایک سی ڈی نکل کے گری۔ پتا نہیں وہ رجسٹر میں تھی یا کسی میگزین میں۔ چٹکی میں پکڑ کے میں نے سی ڈی اٹھائی۔ وہ میموریکس کی اسّی منٹ کی سی ڈی تھی۔

☆☆☆

میں نے ڈسک سی ڈی ڈرائیو میں لگا کے مختلف پاس ورڈ استعمال کیے۔ مونیکا کی تاریخ پیدائش، تارا کی تاریخ پیدائش، ہماری شادی کی تاریخ، میری تاریخ پیدائش۔ اس کے علاوہ اکاؤنٹ نمبر اور اے ٹی ایم کوڈ۔ کوئی ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اب کیا کروں میں سوچ میں پڑ گیا۔ سراغ رساں ریگن کو کال کرنے کا خیال میں نے فوراً رد کر دیا۔ فرسٹریشن مزید اُلجھن کا سبب بن جاتی۔ صبر و سکون ہی قفل کی چابی تھے۔
میں نے پاس ورڈ سے دھیان ہٹا کے MVD نیورک، این جے پر غور کیا۔ نیورک، نیوجرسی کا علاقہ تھا۔ میں نے انٹرنیٹ پر آ کے MVD، نیورک ٹائپ کیا۔ فہرست نمودار ہوئی۔ MVD کا مطلب تھا، موسٹ ویلیو ایبل ڈیٹیکشن۔ ڈیٹیکشن؟ طلب سراغ یا کھوج۔ ویب سائٹ کا لنک دیکھ کر میں نے کلک کیا۔ نظریں اسکرین پر تھیں۔ ایم وی ڈی، نجی پیشہ ور تفتیش کنندگان کا گروپ تھا...... پرائیویٹ انویسٹی گیٹرز۔ یہ لوگ آن لائن خفیہ سروس فراہم کرتے تھے۔ عمومی فیس سو ڈالرز سے بھی کم تھی۔ ان کے اشتہارات کچھ اس قسم کے تھے۔ ''اپنی محبوبہ کے بارے میں جانیے، کہیں وہ آپ کو دھوکا تو نہیں دے رہی۔''
''بوائے فرینڈ کا پس منظر مجرمانہ تو نہیں؟'' وغیرہ وغیرہ۔ گہری تفتیش کے لیے گروپ کی فل سروس کی علیحدہ فیس تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ مونیکا کیسی تحقیقات کرا رہی تھی۔ میں نے ایم وی ڈی کا نمبر ملایا۔ جواب ریکارڈنگ میں آیا جس کے مطابق مجھے صبح نو بجے یا اس کے بعد کال کرنی تھی۔ یہ اچھا انکشاف نہیں تھا کہ مونیکا نے پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ تاہم ایک سرا ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ لازماً مونیکا نے ایم وی ڈی کو ایک یا ایک سے زائد ادائیگیاں کی ہوں گی۔ لیکن پولیس نے ہمارے مالی معاملات کی خوب چھان بین کی تھی۔ ایم وی ڈی کو ادائیگی ان کے علم میں ہو گی اور انہوں نے قصداً مجھے

نہیں بتا پایا تھا۔ میرے ذہن میں متعدد سوالات جنم لے رہے تھے۔ کوئی تشفی آمیز جواب نہیں مل رہا تھا۔

☆☆☆

اس مرتبہ ایڈگر نے انکل کارسن کے ذریعے بلوایا تھا......

''کیا معاملہ ہے؟'' میں نے بغیر کسی تمہید کے سوال کیا۔ اگرچہ اس مرتبہ ایڈگر پورٹ مین قدرے بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں گھر پر نہیں ایک پارک میں تھے۔

''تاوان کا ایک اور مطالبہ آیا ہے۔''

جواب میری توقعات کے قطعی برخلاف تھا۔ میں گنگ تھا۔ اس نے گود میں سے ایک پلاسٹک بیگ اٹھایا۔ بالکل ماضی قریب کی طرح۔ میں نے آنکھیں سکیڑیں۔ اس نے بیگ میرے حوالے کیا۔ میں پلکیں جھپکا رہا تھا۔ میرے پھیپھڑوں میں ازخود اضافی ہوا بھرنے لگی۔ بیگ میں بالوں کی لٹ میں نے دیکھ لی تھی۔

''اپنے ذرائع سے میں نے بالوں کا ٹیسٹ کرا لیا ہے۔'' ایڈگر نے کہا۔ ''رزلٹ ٹھیک ہے۔ بال ان بالوں سے میچ کر گئے ہیں جو اغوا کنندگان نے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے ہمیں بھیجے تھے۔ یہ تارا کے بال ہیں۔''

میں نے ایڈگر کو پھر بالوں کی طرف دیکھا۔ ''ممکن ہے انہوں نے ڈیڑھ برس قبل کچھ بال محفوظ کر......'' میں کھو کھلی آواز میں شک کا اظہار کرنا چاہ رہا تھا۔

''عمر کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ بال دو سالہ بچے کے ہیں۔'' ایڈگر نے ایک رقعہ مجھے پکڑایا۔ نوٹ کی سرخی تھی۔ ایک آخری چانس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے سینے میں گھونسا لگا۔ ایڈگر نے کھڑے ہو کے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''مارک، تارا زندہ ہے۔ کہاں اور کیسے، یہ نہیں جانتا۔''

میں بالوں کو گھور رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں بالوں کو چھونا چاہتا تھا۔

''ان کا وہی مطالبہ ہے۔ دو ملین ڈالرز۔ تحریر بھی وہی ہے۔'' ایڈگر کہہ رہا تھا: ''تم تیار رہو۔ رقم کار میں ہے۔ ہمارے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ہم شک کریں گے۔ لہٰذا وقت انہوں نے ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے دیا تھا۔''

میں نے نظر اٹھا کے ایڈگر پورٹ مین کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

سرجری کے دوران مجھے جب بھی بدتر حالات کا سامنا ہوتا میں اتنا ہی بہترین کام کرتا تھا۔ اٹھارہ ماہ بعد دوبارہ تاوان کا مطالبہ...... شاید وہ لوگ میری ٹوٹ پھوٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ میرے اندر چھپے سرجن سے واقف نہیں تھے۔ میں نے پولیس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ رقم کا ڈفل بیگ لے کر میں سیدھا لینی اور شیرل کے گھر گیا۔ لینی وہاں نہیں تھا۔ شیرل سے ہیلو، ہیلو کے بعد میں نے راشیل کا فون نمبر مانگا۔ شیرل کچھ دیر خاموش رہی۔

''کریدنا میری عادت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''لیکن شاید تم میرا ارادہ جاننا چاہتی ہو۔''

''ہاں...... شاید۔''

''تو مجھ پر بھروسا کرو۔'' میں نے کہا۔

''راشیل ابھی تک میری اچھی دوست ہے۔ میں نے تم دونوں کو کافی سمجھا ہے۔ تمہیں معلوم ہے، اس نے طلاق نہیں لی تھی۔''

میں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا۔

''اس کا شوہر زندہ نہیں ہے۔'' شیرل نے بتایا۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ ذہن نے عجیب منطق گڑھی...... یعنی راشیل اور میرے ساتھ ایک جیسا معاملہ ہے۔ یوں لگا جیسے شیرل نے میرا دماغ پڑھ لیا ہو۔ ''اس کے شوہر کو گولی ماری گئی تھی۔''

تھوڑی دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔

''میں جزئیات سے آگاہ نہیں ہوں۔'' شیرل نے بات آگے بڑھائی۔ ''اس کا شوہر بھی ایف بی آئی میں تھا۔ راشیل اس وقت بیورو میں ہائی رینک آفیسر تھی۔ شوہر کی موت پر اس نے استعفا دے دیا تھا۔ اس نے میرے فون بھی سننا بند کر دیے تھے۔ تب سے ہی وہ بہت اچھی حالت میں نہیں ہے۔ میں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ جس راشیل سے تم محبت کرتے تھے، وہ پرانی بات ہے۔''

میں نے اپنی آواز متوازن رکھی۔ ''مجھے اس کا نمبر درکار ہے۔''

شیرل نے میری آنکھوں میں دیکھا اور نمبر لکھ کے مجھے پکڑا دیا۔ میں شکریہ ادا کر کے باہر گاڑی میں آیا۔ سیل فون نکالا اور نمبر ملایا۔ راشیل کی آواز آئی۔ میرے الفاظ سادہ

تھے۔ ”مجھے تمہاری مدد چاہیے!“

☆☆☆

پانچ گھنٹے بعد راشیل کی ٹرین نیویارک اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ دل میں دھیمی سی گنگناہٹ ہوئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ میں چھتیس برس کا تھا اور راشیل پینتیس...... اسکول یا کالج کے دن نہیں تھے۔ جوانی کے کتنے ہی برس ہم نے فرقت میں گزار دیے تھے۔ راشیل نے ہلکے نیلے رنگ کی جین پہنی ہوئی تھی۔ جین پر سرخ ٹرٹل ہائی نیک۔ بیگ شانے پر جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور میری طرف بڑھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“

”فائن۔“

”کال آئی؟“

”ابھی تک نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ڈی این اے ٹیسٹ کے بارے میں بتاؤ۔“

”سو فیصد نہیں، لیکن یقین کیا جاسکتا ہے۔“

راشیل نے بیگ دائیں سے بائیں شانے پر منتقل کیا۔ اس کا لب ولہجہ پروفیشنل ایجنٹ کے مانند تھا۔ ”مارک ہمیں سخت اور جارحانہ فیصلے کرنے پڑیں گے۔ کیا تم تیار ہو؟“

”ہاں۔“

”تمہیں یقین ہے تم کو پولیس اور ایف بی آئی سے رابطہ نہیں چاہیے؟“

”ان کا کہنا ہے کہ دونوں جگہ ان کا مخبر موجود ہے۔“

”یہ افواہ یا دھوکا بھی ہوسکتا ہے۔“ راشیل نے کہا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

”پچھلی مرتبہ میں نے پولیس کو بتا دیا تھا۔“

”اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ غلط فیصلہ تھا۔“

”تاہم وہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔

راشیل نے پُرخیال انداز میں کئی امکانات ظاہر کیے اور آخر میں کہا۔ ”غالب امکان ہے کہ وہ تارا کو واپس نہیں کرنا چاہتے۔ تم سمجھ رہے ہو؟“

”ہاں، اسی لیے میں نے تمہیں کال کی۔“

”ایک اور بات۔“ اس نے کہا۔ ”اس مرتبہ وہ نہیں بڑھائیں گے۔ ہم تارا کی زندگی کا ثبوت مانگیں گے۔“

”وہ بالوں کی طرف اشارہ کریں گے۔“ میں بولا۔

”ہم کہیں گے کہ ٹیسٹ کے نتائج فیصلہ کن نہیں ہیں۔“

”کیا وہ اعتراض قبول کرلیں گے؟“

”میں نہیں جانتی۔ شاید وہ قبول نہ کریں اسی لیے میں نے جارحانہ انداز اپنانے کی بات کی تھی۔ وہ پہلے بھی رقم لے کر غائب ہوگئے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے وہ پھر ایسا نہیں کریں گے۔ تمہاری پوزیشن نازک ہے۔ وہ تمہاری کمزوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

ہم پارکنگ گیراج تک پہنچ گئے تھے۔ ”پھر کیا مشورہ ہے؟“

”ہم تبادلے کی بات کریں گے...... رقم یہ رہی، بیٹی دکھاؤ اور رقم لے جاؤ۔“

”اگر وہ رضامند نہ ہوئے؟“

”سخت فیصلے، مارک۔ سمجھ گئے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں نے مخصوص الیکٹرونک سرویلنس کا بندوبست کیا ہے۔ جس کے ذریعے میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اس خفیہ سسٹم میں فائبر آپٹک کیمرا شامل ہوگا۔ میں کوشش کروں گی کہ ان کی صورتیں دیکھ لوں۔ ہماری افرادی قوت کم ہے لیکن پھر بھی کافی کچھ کیا جاسکتا ہے۔“

”اگر سرویلنس سسٹم ان کی نظر میں آگیا؟“ میں نے پھر شبہ ظاہر کیا۔

”فرض کرو وہ پھر رقم لے کر بھاگ گئے۔“ راشیل نے جوابی وار کیا۔ ”ہم چانس لے رہے ہیں۔ کوئی گارنٹی نہیں

ہے۔ساتھ تجربے کی روشنی میں کوشش ہے کہ منفی عنصر کم سے کم رہے۔"

ہم کار میں بیٹھ کر ہائی وے پر نکل آئے تھے۔ وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ میں اس انداز سے واقف تھا۔ ماضی لوٹنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"کچھ نہیں۔"

"راشیل۔" میری آواز میں کیا بات تھی کہ اس نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

"مارک میں نے شیرل کو فون کیا تھا۔ اس نے تمہیں میرے بارے میں کافی کچھ بتا دیا ہے۔ میں اب فیڈرل ایجنٹ نہیں ہوں۔ میری طاقت محدود ہوگئی ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"تارا کی زندگی کا امکان برائے نام ہے۔"

"لیکن ڈی این اے ٹیسٹ؟" میری سانس رک گئی۔

"غلطی کا امکان ہے۔" راشیل نے کہا۔

"کیونکر؟ کیسے؟"

اس نے سکوت اختیار کیا پھر بولی۔ "موجودہ بال، ڈیڑھ سال پہلے ملنے والے بالوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ لیکن تمہیں یہ کیسے علم ہوا کہ ڈیڑھ سال پہلے جو بال ایڈگر تک پہنچے تھے...... وہ تارا کے تھے؟"

چند ساعت بعد راشیل کی بات کا مطلب میری سمجھ میں آیا۔

"تمہارا ڈی این اے چیک نہیں ہوا تھا۔ اغواکنندگان نے کسی اور بچی کے بال بھیجے تھے۔" راشیل نے کہا۔ "میں شک کا اظہار کررہی ہوں۔"

میرا ذہن دھند کی لپیٹ میں تھا۔

"لیکن انہوں نے تارا کے لباس کا ٹکڑا بھیجا تھا۔"

"استدلال بے جان ہے۔ تمہارا ڈی این اے چیک کیوں نہیں ہوا؟"

"شاید ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔" میری آواز کھوکھلی تھی۔ کار میں گہرا سکوت طاری تھا۔

"مجھے اپنی بیٹی واپس چاہیے۔" مجھے اپنی آواز اجنبی لگی۔

راشیل نے سر ہلا کے کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ نہ بولی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب تاوان کی کال آئی۔

☆☆☆

مارتھا اکثر پرانے فوٹو نکال کے دیکھتی تھی۔ پرانی یادیں۔ اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اس وقت جو فوٹو دیکھ رہی تھی، اس میں وہ آٹھ سال کی بچی تھی۔ اپنے وقت کا مقبول کلاسک مزاحیہ ٹی وی شو "فیملی لاف" تھا۔ پروگرام سات سال چلتا رہا۔ مارتھا شروع سے شو کا حصہ تھی۔ جب وہ چھ برس کی تھی۔ شو کے اختتام پر اس کی عمر تیرہ برس تھی۔ وہ چائلڈ اسٹار تھی۔ اس کا نام لاریسا ڈین تھا۔ پروگرام میں مشہور مووی اسٹار کلائیو ڈلکن شامل تھا۔ اس کے دو جڑواں بچے ٹاڈ اور راڈ نام کے تھے۔ تیسری اولاد پیاری سی چھوٹی بچی لاریسا ڈین تھی۔ شو میں اس کا نام ٹرکسی تھا۔ وہ شو کا ناگزیر حصہ تھی۔ جسے نظرانداز کرنا ناممکن تھا۔ ٹاڈ اور راڈ کا اصل نام جیراڈ اور فریک تھا۔ سات سال میں پروگرام اختتام پذیر ہوا اور دو سال بعد کلائیو ڈلکن کینسر سے شکست کھا گیا۔

بعدازاں جیراڈ اور فریک نے اپنا میوزک بینڈ بنا لیا۔ اصل پہیلی یا کہانی پیاری ٹرکسی کی تھی۔ اس کے والدین کے درمیان مستقل ناچاقی کے بعد طلاق ہوگئی۔ ٹرکسی یعنی لاریسا ڈین کے لیے دوہرا صدمہ تھا۔ شہرت نشے کے مانند ہوتی ہے۔ پروگرام ختم ہوگیا تھا۔ لاریسا کی عمر پندرہ سال تھی۔ والدین کے جھگڑوں اور طلاق نے اسے غیر متوازن کر دیا۔ وہ جنس اور منشیات کے گڑھے میں جا گری۔ کسی کے پاس درست خبر نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ ایک مرتبہ وہ منشیات کی زیادہ مقدار کے باعث مرتے مرتے بچی اور مرکز صحت جا پہنچی۔ اکثریت کو یقین تھا کہ وہ منشیات کے ہاتھوں ہلاک ہوئی۔ کہاں مری؟ کہاں گئی؟ کچھ پتا نہ چلا۔

حقیقت اس کے برعکس تھی۔ لاشی نے لاریسا ڈین عرف "طفل ٹرکسی" کو ایک سنسان گلی میں دو غنڈوں سے بچایا تھا۔ بعد میں ان کا گٹھ جوڑ ایک نئی شکل اختیار کرگیا۔ لاریسا نے خود سے انتقام لینا بند کردیا۔ دونوں نے نئے روپ بہروپ کے ساتھ آغاز کیا۔ دونوں کے پاس تین مختلف رہائش گاہیں تھیں۔ لاریسا (ٹرکسی) کا نام اب مارتھا تھا۔ وہ پھر سے ٹی وی پروگرام میں تھی۔ یہ پروگرام حقیقی زندگی کا "ہارر شو" تھا۔ ٹرکسی مشہور تھی، معصوم تھی۔ مارتھا گمنام اور سنگدل قاتل۔ لاشی بھی ایسا ہی تھا۔ مارتھا اپنے اس نئے کردار سے بھی انتہائی لطف اندوز ہوتی تھی جتنا بچپن میں ٹرکسی کے کردار سے......

اس نے دوسرا فوٹو اٹھایا۔

''مارتھا؟''

''ہاں۔''

''فون کرنا چاہیے۔'' کیشی نے کہا۔

''ہاں۔'' مارتھا نے سیل فون نکالا...... نمبر ملایا۔ ڈاکٹر مارک سیڈ مین کی آواز سن کے اس نے کہا۔ ''کیا ہم پھر سے کوشش کریں؟''

☆☆☆

میرے ردِعمل سے پہلے راشیل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ مذاکرات کے مانند ہے۔ خوف اور بزدلی سے کام خراب ہوگا۔ مضبوط رہنا۔ اگر تارا ان کے پاس ہے اور وہ اسے چھوڑنا چاہتے ہیں تو لچک دکھائیں گے۔''

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے سر ہلایا۔

میرے ''ہیلو'' کہنے پر وہی روبوٹک آواز آئی۔ ''کیا ہم پھر سے کوشش کریں؟''

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ''نہیں۔''

''کیا کہا؟''

''مجھے تارا کی زندگی کا ثبوت درکار ہے۔''

''تمہیں بالوں کا نمونہ نہیں ملا؟''

میں نے آنکھیں کھول کے راشیل کو دیکھا۔ ''وہ ناکافی ہے۔''

''فائن۔'' آواز آئی۔ ''بات ختم۔''

''رکو۔'' میں نے کہا۔

''بولو؟''

''کیا یقین ہے تم پہلے کی طرح نہیں بھاگ جاؤ گے؟''

''کیا تم نے پولیس کو بتایا ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن پہلے کی طرح نہیں چلے گا۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''جب تک بیٹی نہیں ملے گی، میں رقم نہیں دوں گا۔ بیٹی دو اور پیسے لو۔''

''تم سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔''

میں نے پھر سابقہ جملہ دہرایا۔ میرا دل بیٹھ رہا تھا۔

''ڈاکٹر سیڈ مین۔''

''سن رہا ہوں۔''

''غور سے سنو۔ فون بند ہوا تو پھر اٹھارہ مہینے بعد بات ہوگی۔''

مجھے لگا اسٹیل کی بیلٹ میرے سینے کے گرد کسی جا رہی ہے۔ سانس رک گئی۔ میں نے راشیل کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ مجھے مضبوط رہنے پر اکسا رہی تھیں۔

''میں رقم لاتا ہوں تم میری بیٹی لاؤ۔ میں اسے دیکھوں گا اور رقم تمہاری۔''

''ڈاکٹر سیڈ مین ہدایت مت دو۔''

''مجھے پروا نہیں کہ تم کون ہو؟ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ مجھے صرف اپنی بیٹی واپس چاہیے۔''

''تو پھر وہی کرو جیسا کہا جائے۔''

''نہیں۔ پہلے بیٹی کو دیکھوں گا۔''

''ڈاکٹر سیڈ مین۔''

''ہاں۔''

''گڈ بائے۔'' رابطہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

میرے ہوش و حواس رخصت ہوگئے۔ میں بے ہوش نہیں ہوا نہ چیخا چلایا۔ سمندر کی طرح ٹھنڈا اور پُرسکون تھا۔ میں نے کان سے فون ہٹا کے یوں دیکھا گویا میرے ہاتھ میں کوئی انوکھی شے تھی۔

''مارک۔'' راشیل کی آواز بہت دور سے آئی۔

''انہوں نے فون بند کردیا۔''

''وہ پھر کریں گے۔'' اس نے یقین دلایا۔

''انہوں نے کہا، اگلی کال اٹھارہ ماہ بعد آئے گی۔''

راشیل نے بغور میرا چہرہ دیکھا۔ ''مارک تم نے ٹھیک کام کیا ہے۔''

''شکریہ۔ اب میں بہتر ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سنو، میں ایسے معاملات خوب سمجھتی ہوں۔ اگر تارا زندہ ہے اور وہ واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں تو تبادلے پر راضی ہو جائیں گے۔ ہماری مرضی کے مطابق تبادلہ نہ ہونے کی صرف ایک ہی وجہ ہے۔'' وہ ٹھہر کے بولی۔ ''وہ چاہتے ہی نہیں۔ یا ان کے بس میں نہیں ہے۔''

میں سمجھ گیا تھا۔ ''اب کیا کریں؟''

''ہمارا منصوبہ وہی ہے۔ ہمیں تیاری کرنی چاہیے۔''

''اوکے۔'' میں خود کو ہوش محسوس کر رہا تھا۔

''یہ بتاؤ تم نے آواز پہچانی؟ یا کوئی اور کلیو...... اس دن کے بارے میں؟ اس آدمی کے بارے میں جس نے اٹھارہ ماہ پہلے تم سے تاوان وصول کیا تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے آواز میں سے مایوسی نکالنے کی

کوشش کی۔

’’تم نے تہ خانے سے ملنے والی سی ڈی کا ذکر کیا تھا؟‘‘

میں نے تیزی سے ایم وی ڈی کے بارے میں بتایا۔ راشیل لکھ رہی تھی۔

’’سی ڈی ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔ ہم نیا ورک میں ہیں۔ دیکھتے ہیں کیا ہوسکتا ہے۔‘‘

☆☆☆

مارتھا نے سگسار اور P226 ہوا میں بلند کیا۔ ’’ڈاکٹر کا انداز مجھے پسند نہیں آیا۔‘‘

’’تم نے فون بند کر کے ٹھیک کیا۔‘‘ ایشی بولا۔ ’’اس معاملے کو ختم کرو۔‘‘

’’ہم سوچ رہے تھے کہ دو ملین آسانی سے مل جائیں گے۔‘‘ وہ بولی۔

’’ہاں لیکن خطرہ ہے...... اس طرح ٹھیک نہیں ہے۔‘‘

’’میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔‘‘

ایشی جانتا تھا کہ یہ مارتھا کے لیے اذیت ناک ہے۔ مارتھا کے لیے رقم سے زیادہ اہم کچھ اور تھا۔ ’’ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔‘‘ وہ بولا۔

’’لیکن ہم رقم حاصل کریں گے اور......‘‘ وہ مسکرائی۔

’’اور اسے بھی ٹھکانے لگائیں گے۔‘‘ ایشی نے کہا۔

مارتھا، ایشی کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

استقبالیہ پر شیشے کے عقب میں تین خواتین موجود تھیں۔ ہیڈ فون سے لیس۔ عجیب معلوم ہو رہا تھا، دو ملین کا بیگ میرے ساتھ تھا۔ راشیل نے آئی ڈی دکھائی جس کے مطابق وہ ایکس، ایف بی آئی تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ راشیل نے کسی ذمے دار آدمی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خاتون نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔ ہیڈ فون استعمال کیا۔ چند منٹ بعد ایک اور عورت نمودار ہوئی۔ جس کی رہنمائی میں ہم کوریڈور سے گزر کر کے پرائیویٹ آفس میں داخل ہوئے۔ ڈیسک پر پیتل کی نیم پلیٹ پر کونزاڈ ڈورمین لکھا تھا۔

وہاں ایک دُبلا پتلا آدمی موجود تھا۔ ہمیں بٹھا کے اس نے اپنا تعارف کرایا۔ جس کے مطابق وہ ایم وی ڈی کا ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ تھا۔ کونزاڈ نے عورت سے چائے کا کہا اور رسمی کلمات کے بعد راشیل سے چند باتیں ایف بی آئی کے بارے میں کیں۔ راشیل نے مبہم جوابات دیے۔ چائے آنے پر راشیل نے مطلب کی بات کی۔ مونیکا اور سی ڈی کے بارے میں بتانے کے بعد پاس ورڈ مانگا۔

’’میں معذرت چاہوں گا۔ پاس ورڈ کلائنٹ منتخب کرتا ہے۔‘‘ کونزاڈ نے کہا۔

’’کلائنٹ اس دنیا میں نہیں ہے۔ سی ڈی اب شوہر کی ہے۔‘‘

’’میں بے بس ہوں۔ چاہوں بھی تو پاس ورڈ کیسے معلوم کرسکتا ہوں؟‘‘

وقفہ آیا۔ راشیل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھی نگاہ لوٹائی۔ تاہم کچھ دیر میں کونزاڈ نے پلکیں گرائیں اور چائے کا سپ لیا۔

’’تم مونیکا کے شوہر کی کیا مدد کرسکتے ہو؟ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کی بیوی نے کس سلسلے میں تمہاری خدمات حاصل کی تھیں۔‘‘

’’میرا خیال ہے کورٹ آرڈر کے بغیر میں معذور ہوں۔‘‘

’’بیک اَپ سی ڈی کہاں ہے؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’میں ایف بی آئی میں کام کرچکی ہوں مسٹر کونزاڈ۔‘‘

’’پھر۔‘‘

’’پھر یہ کہ براہِ مہربانی میری توہین مت کرو۔ میں جانتی ہوں کہ ہر کمپنی اپنا پاس ورڈ محفوظ رکھتی ہے۔ یہ بیک اپ ایمرجنسی ضرورت کے وقت سی ڈی میں رسائی فراہم کرتی ہے۔‘‘

’’میں توہین نہیں کررہا...... میں بتانا چاہ رہا ہوں کہ میں مدد نہیں کرسکتا۔‘‘

’’میں اتنی بھی بے بس نہیں۔ بیورو میں میرے دوست ہیں۔ میں بات کروں گی۔ بیورو ویسے بھی پرائیویٹ آئی کے خلاف ہے۔ میں تمہارے لیے کوئی پریشانی نہیں کھڑی کرنا چاہتی۔ یہ جاننا چاہتی ہوں کہ سی ڈی پر کیا ہے؟‘‘

کونزاڈ انگلیوں سے ڈیسک بجا رہا تھا۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل دستک ہوئی۔ اسی عورت کی شکل نظر آئی جو ہمیں وہاں لائی تھی۔ کونزاڈ تقریباً اچھل پڑا۔ ’’میں ابھی آیا۔‘‘ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

میں نے راشیل کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔

چند منٹ بعد کونراڈ واپس آیا۔ نشست سنبھالنے کے بجائے وہ کھڑا رہا۔ راشیل نے اس کی توقع کے خلاف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا۔

''ایم وی ڈی کے پریذیڈنٹ میلکم ڈیوارڈ سابقہ فیڈرل ایجنٹ ہیں۔'' کونراڈ نے اطلاع فراہم کی۔ راشیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ہماری گفتگو کے دوران پریذیڈنٹ نے بیورو میں متعدد دوستوں سے بات کی۔ مس راشیل آپ کی جارحیت بے بنیاد ہے۔''

☆☆☆

''ممکن ہے تارا کے بارے میں میری رائے معتبر نہ ہو۔'' راشیل نے کہا۔ ایم وی ڈی کے آفس میں اس نے پوری کوشش کی تھی لیکن بات نہیں بنی۔ ہم دونوں گھر پر تھے۔ راشیل بالوں کے نمونے پر مزید ٹیسٹ کرانا چاہتی تھی۔ اس کے کسی شناسا کی پرائیویٹ لیب تھی۔ راشیل کی خواہش پر میں نے ایڈگر کو فون کیا۔ اس نے بلا کسی خاص تردد کے ہامی بھرلی۔ ظاہر ہے راشیل کی حد تک میں نے اسے اندھیرے میں رکھا تھا۔ میں بھی ڈاکٹر تھا۔ میں نے ایڈگر سے یہی کہا کہ میرا ایک دوست بھی لیب میں ٹیسٹ کرے گا...... راشیل نے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ ایڈگر سے بالوں کا اور میرے خون کا نمونہ لے جائے۔ نتیجہ چوبیس سے اڑتالیس گھنٹوں میں آنا تھا۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ اغواکنندگان کی کال آئی تو جلد آئے گی۔

راشیل نے بیگ کھول کے ہائی ٹیک آلات نکالے اور مجھ سے رقم کا بیگ مانگا۔ جس میں سو ڈالرز کی گڈیاں رکھی تھیں۔ اس نے نچلی تہ سے ایک گڈی منتخب کی۔ خاص قسم کے بلیڈ سے گڈی کے مرکز کو دائرے کی شکل میں تراشا۔ دائرہ چاندی کے سکے کے مانند تھا۔ اب اس نے ایک سیاہ رنگ کا گول ڈیوائس سوراخ میں بٹھادیا۔ اوپر سے ڈالرز کی کٹنگ بوتل کے گول ڈھکن کی طرح جما کے سوراخ بند کر دیا۔ گڈیاں واپس احتیاط سے تہ در تہ رکھ دیں۔

''یہ کیو لاگر (Q-Logger) ہے۔'' وہ مجھے بتا رہی تھی۔ ''جی پی ایس ڈیوائس۔ گلوبل پوزیشنگ سسٹم۔ میں اسے بیگ میں بھی چھپا سکتی تھی لیکن بیشتر مجرم ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ بیگ پھینک کے رقم اپنے بیگ میں منتقل کر لیتے ہیں۔ اب ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ وہ ہر گڈی چیک کریں۔''

''کیو لاگر کتنا چھوٹا ہوتا ہے؟''

''یہ مزید مختصر ہو سکتا ہے لیکن بیٹری کا مسئلہ بنتا ہے۔ ٹریکنگ کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ مجھے کم سے کم آٹھ میل کی ٹریکنگ درکار ہے۔''

''تم کیسے سراغ لگاؤ گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ جدید ترین ہے۔ لہٰذا لیپ ٹاپ کے بجائے میں پام پائلٹ استعمال کروں گی۔ کار سے نکلنا پڑا تو پام پائلٹ میرے ساتھ ہوگا۔''

میں اس کی مصروفیت دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے میرا نام لیا۔ میں خاموش تھا۔ ''اگر تمہاری بیٹی زندہ ہے تو ہم اسے گھر لے کر آئیں گے۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔''

☆☆☆

پانچ منٹ پہلے تک ایجنٹ لائیڈ کے ذہن میں ڈاکٹر سیڈمین کا کیس کہیں نہیں تھا۔ اب وہ تیسری مرتبہ مختصر رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال تھا۔ پُراسرار صورت حال تھی۔ اب نے سامنے کھڑی اسٹاف ممبر کیلی کو دیکھا۔

''راشیل کو ٹریس کرو۔'' وہ بولا۔ ''ایم وی ڈی کال کر کے بتاؤ کہ میں آرہا ہوں۔''

''یس سر۔'' کیلی باہر نکل گئی۔

لائیڈ اور راشیل، ایف بی آئی کی ٹریننگ اکیڈمی میں ساتھ تھے۔ دونوں کا انسٹرکٹر بھی ایک ہی تھا۔ لائیڈ مقامی پولیس پر کم ہی اعتبار کرتا تھا۔ تاہم ریگن اسے پسند تھا۔ اس نے ریگن کا نمبر ملایا...... مختصر گپ کے بعد اس نے ڈاکٹر سیڈمین کا ذکر چھیڑ کر ایم وی ڈی کے پریذیڈنٹ کا تعارف کرایا اور بتایا کہ ڈاکٹر وہاں کس کے ساتھ پہنچا تھا۔

☆☆☆

مارتھا کا منصوبہ سادہ تھا۔

''ہم رقم کی تصدیق کریں گے۔'' اس نے ٹیشی کو بتایا۔ ''پھر میں اسے ختم کروں گی۔''

''کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اسے میں ٹھکانے لگاؤں۔ مجھے ہتھیار کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں تم میرے عقب پر دھیان رکھنا۔'' مارتھا نے کہا۔

ٹیشی نے شانے اچکائے۔ حقیقت میں مارتھا کو خود

سے زیادہ ٹوشی کو محفوظ رکھتا تھا۔ مارتھا نے کبھی اپنی پروا نہیں کی تھی۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا کلاسک کیس تھا۔

"تم نمایاں اور خطرناک نظر آتے ہو۔ مجھے وہ بے ضرر خیال کرے گا۔" مارتھا نے ٹوشی کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ "پاؤل کو تم نے اس کا رول سمجھا دیا؟"

"ہاں، وہ ہمیں وہیں ملے گا، سابقہ حلیے میں۔" ٹوشی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ شروع کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

ٹوشی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

"ایک منٹ، مجھے دیکھنے دو۔" مارتھا نے عقبی نشست پر سوئے ہوئے ننھے وجود کو دیکھا۔ "میں اس کے ساتھ بیٹھوں گی۔"

☆☆☆

ہم ریسٹورنٹ میں تھے۔ میں نے پزا منگوایا۔ فوراً غلطی کا احساس ہوا۔ رات میں اس وقت پزا کالج کے لڑکے لڑکیاں آرڈر کرتے ہیں۔ لاشعوری طور پر میں ماضی میں تھا۔

"اگر کال نہیں آئی؟" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"مارک، اس کا مطلب ہوگا کہ تارا اُن کے پاس نہیں ہے۔"

میں پزا کے بجائے راشیل کا جملہ نگلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"راشیل......"

"ہاں؟"

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

"ہیلو؟"

"اوکے، تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟" وہی روبوٹک آواز آئی۔

"ہاں۔" میرا دل حلق میں دھڑکا۔ راشیل نے چہرہ قریب کر کے کان لگائے۔

"غور سے سنو...... اگر کوئی غلط حرکت کی تو ہم غائب ہو جائیں گے، سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔"

"پولیس میں ہمارا مخبر موجود ہے۔ فی الحال تم ٹھیک جا رہے ہو۔ رقم کہاں ہے؟"

"میرے پاس۔"

"جارج واشنگٹن برج پر پہنچ کے سیل فون کا دوطرفہ فیچر آن کر دینا۔ اکیلے آنا۔ کوئی ہتھیار، کوئی وائرنگ نہیں ہو گی۔ تمہاری تلاشی لی جائے گی۔ سمجھ گئے؟"

میرے چہرے پر راشیل کی سانسیں تھیں۔ میں نے محسوس کیا اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔

"میں اپنی بیٹی کو کب دیکھوں گا؟"

"جب ہم ملیں گے۔ تمہارے پاس ایک گھنٹا ہے۔ مجھے سگنل دینا۔"

☆☆☆

کونراڈ رات کے اس پہر آفس آنے پر خوش نہیں تھا لیکن لائیڈ بے پروا تھا۔ اس کا تجسس اور بے چینی فزوں تر تھی۔ راشیل اور ڈاکٹر کا تعلق اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ لائیڈ، راشیل کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ کونراڈ کی شکل دیکھتے ہی اس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی...... تاہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ سی ڈی دیکھنا ضروری تھا۔ لائیڈ نے سوالات کا سلسلہ موقوف کر کے کسی کا نمبر ملایا۔

"کیا ملا؟"

"فون ریکارڈ اور راشیل کا اپارٹمنٹ دیکھا ہے۔ تین سال پہلے صرف ایک کال کی گئی تھی...... راشیل کی جانب سے۔" دوسری طرف ایجنٹ ڈیرک تھا۔

لائیڈ نے حساب جوڑا۔ کال قتل کی واردات سے گھنٹوں قبل کی گئی تھی۔

"کچھ اور؟"

"اپارٹمنٹ سے ایک فوٹو ملا ہے...... پندرہ، بیس سال پرانا۔ نوجوانی کی تصویر ہے۔ تصویر میں اس کے ساتھ جو لڑکا ہے، بلاشبہ ڈاکٹر سیڈمین ہے۔"

لائیڈ حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ راشیل کا تعلق ورمونٹ سے تھا اور سیڈمین نیوجرسی میں۔ "مزید معلومات حاصل کرو۔" اس نے ڈیرک کو ہدایت جاری کی اور کونراڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

"مقتولہ تمہاری موکلہ تھی۔ میڈیا میں سب گردش میں تھا۔ ایم وی ڈی میں سے کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ کیوں؟" لائیڈ اسے گھور رہا تھا۔ کونراڈ نے دائیں بائیں ہونے کی لاحاصل کوشش کی۔

"سی ڈی پر کیا ہے؟"

"تصاویر اور چند دستاویزات۔ درست یاد نہیں۔"

"بیک اپ سی ڈی کہاں ہے؟"

"دوسری منزل پر۔"

''چلو اٹھو۔'' لائیڈ کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

''اگر انہوں نے تلاشی لی تب بھی ہم کچھ کر جائیں گے۔ میں نے کیولا اگر تمہارے لباس یا جوتے میں چھپانے کی غلطی نہیں کی۔'' راشیل نے کہا۔ ''یہ بھی امکان ہے کہ یہ ایک پھندا ہو۔ تارا کو دیکھے بغیر رقم حوالے نہ کرنا۔ مارک میں آگاہ ہوں کہ یہ مشکل فیصلہ ہے۔''

''ہاں لیکن اس مرتبہ چانس لینا پڑے گا۔'' میں نے بہادری ظاہر کی۔

''میں کار کے ٹرنک میں رہوں گی۔ کوئی غلطی نہیں کرنا۔ میں سُپر وومین نہیں ہوں۔ ہوسکتا ہے تمہیں کھو دوں۔ لیکن یاد رکھو مجھے دیکھنے کی کوشش مت کرنا۔ بالکل بھی نہیں۔ یہ لوگ مکار ہیں، تاڑ جائیں گے۔''

''سمجھ گیا۔'' میں نے سر ہلایا۔ وہ سرتاپا سیاہ لباس میں تھی۔

''تیار ہو؟'' اس نے سوال کیا۔ میں نے کار انجن کی آواز پر کھڑکی سے جھانکا۔

''لعنت ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''پولیس مین ہے۔ ریگن نام ہے اُس کا۔'' میں نے راشیل کی طرف دیکھا۔ ''کیا یہ اتفاق ہے؟'' میں نے راشیل کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ بولی۔

''لیکن اس وقت وہ یہاں؟''

''ایم وی ڈی ملوث ہے۔ وضاحت کا وقت نہیں...... میں گیراج میں جا رہی ہوں۔ وہ میرے بارے میں سوال کرے گا۔ کہنا میں واشنگٹن چلی گئی۔ زیادہ تفتیش کرے تو بتانا کہ میں پرانی دوست ہوں۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ نکل گئی۔ دستک پر میں نے دروازہ کھولا۔

''چند منٹ بات کروں گا۔''

''یہ کون سا وقت ہے؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''نئی اطلاعات ملی ہیں۔'' وہ میرے قریب سے گزر گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''آج تم کہاں تھے؟''

''گیٹ آؤٹ۔'' میں نے بے دھڑک اشارہ کیا۔

''تم نے نیورک میں پرائیویٹ ایجنسی کا چکر لگایا تھا۔''

''برائے مہربانی نکلو یہاں سے۔''

''راشیل کہاں ہے؟'' اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

''واپس واشنگٹن۔'' میں نے مختصر سیدھا جواب دیا۔

''تم دونوں ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہو؟''

''گڈ نائٹ۔''

''آخری سوال ...... تمہیں علم ہے اُس کے شوہر کو کس نے گولی ماری تھی؟''

میں خاموش رہا۔

''مارک، راشیل نے اس کے سر میں گولی ماری تھی۔''

''اسی لیے وہ جیل سے باہر ہے؟''

''اچھا سوال ہے۔'' وہ پلٹا۔ ''بہتر ہے اُسی سے پوچھ لینا۔''

ریگن کی روانگی پر میں گیراج میں آیا۔

مجھے وہم ہوا کہ راشیل کے چہرے پر پریشانی ہے۔ اس کے استفسار پر میں نے بتا دیا تاہم ریگن کا آخری مکالمہ گول کر گیا۔ اگرچہ مجھے یقین نہیں تھا کہ ریگن سچ کہہ رہا تھا۔ تاہم اس نے میرے دماغ میں خاردار جھاڑی کا بیج بو دیا تھا۔ میں نے گاڑی باہر نکالی۔ وہ ٹرنک میں روپوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

لائیڈ، ایم وی ڈی آفس میں پرنٹر سے نکلنے والی تصاویر دیکھ رہا تھا۔ کل اٹھارہ تصاویر تھیں۔ ہر عکس میں ایک ہی شخصیت تھی۔ وہ شخصیت بے خبر تھی کہ زوم لینس کی مدد سے کیا کارروائی کی گئی تھی۔ مونیکا کو اٹھارہ ماہ قبل ختم کیا گیا تھا۔ اس کے قاتل لاپتا تھے۔ کیس پر گرد پڑ گئی تھی۔ امیدیں دم توڑ چکی تھیں اور اب گویا مردہ اچانک زندہ ہو گیا تھا۔ وہ اشارہ کر رہا تھا۔ افسانوی صورت حال تھی۔ لائیڈ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا مونیکا کا اشارہ راشیل کی جانب تھا۔ تصاویر راشیل کی تھیں۔

☆☆☆

جارج واشنگٹن برج پر اس وقت ٹریفک کم تھا۔ ''ای زی پاس'' E-Zpass (الیکٹرونک ٹول کلیکشن سسٹم) استعمال کر کے میں آگے بڑھتا گیا۔ کچھ دیر بعد اغوا کنندگان کا بھیجا ہوا سیل فون نکالا اور دو طرفہ فیچر آن کر کے سگنل دیا۔ فوراً ہدایت آئی۔ ''ہنری ہڈسن کے شمال میں آؤ۔ وہاں سے کال کرنا۔''

علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے کال کی۔

''میں ہڈسن پر ہوں۔''

''اب فورٹ ٹرائن پارک۔''

''او کے۔'' میں نیوجرسی اور اطراف کے چپے چپے سے واقف تھا۔ فورٹ ٹرائن دریائے ہڈسن کے اوپر بادل کے مانند تھا۔ ایک بڑی پہاڑی...... خاموش آرام گاہ۔ نیوجرسی اس کے مغرب میں تھا اور ریورڈیل برونکس مشرق میں۔ خطے کے خدوخال کھچڑی کی طرح تھے۔ کہیں ہموار کہیں ڈھلوان اور چڑھائی...... گھنی جھاڑیاں، گھاس، پتھریلے راستے، دراڑیں...... پارک رات میں بند رہتا تھا لیکن یہاں سے گزرنے والی راہیں کھلی رہتی تھیں۔ میری کار سڑک پر بلندی کی طرف جارہی تھی۔ میں قدیم خانقاہ کے قریب تھا۔ جواَب میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ کا حصہ تھی۔ پارک کی بھول بھلیاں تاوان وصول کرنے کے لیے بے مثال جگہ تھی۔ یہاں کوئی بھی شخص کچھ عرصے کے لیے بہ آسانی چھپ سکتا تھا۔

''میں پہنچ گیا ہوں۔''

''کینے کے قریب پارک کر کے باہر نکلو اور سرکل (Circle) پر آؤ۔''

☆☆☆

راشیل کے پاس فلیش لائٹ تھی۔ تاہم تاریکی اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ جب وہ روانہ ہوئے تو اس نے مارک کے رویّے میں خفیف تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ پولیس مین نے گھر میں مارک سے کوئی بات کی تھی۔ جس نے مارک کو ہلا دیا تھا۔ کیا پولیس نے خود اس کے بارے میں کچھ کہا تھا؟ راشیل نے ذہن ہٹایا اور ماضی کے بارے میں سوچنے لگی۔

دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کار بلندی کی طرف جارہی ہے۔ اس نے توجہ موجودہ ٹاسک پر مرکوز کر دی۔ کھیل شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

یشی ٹاور نما بلندی سے نگرانی کر رہا تھا۔ وہ دریائے ہڈسن سے تقریباً ڈھائی سو فٹ بلندی پر تھا۔ جارج واشنگٹن برج کا سحر انگیز منظر اس کے سامنے تھا لیکن اس کی توجہ اپنے مشن پر تھی۔ اس نے سیڈمین کی کار دیکھ لی تھی۔ جس کے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ کار میں وہ اکیلا تھا۔ ممکن ہے عقبی نشست پر کوئی نیچے جھکا ہو۔ لیکن یہ آغاز تھا اور یشی بیدار تھا۔ خوفناک ڈرامے کا اسٹیج تیار ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر سیڈمین گاڑی بند کر کے باہر نکلا۔ یشی نے مائیکروفون منہ سے لگایا۔

''پاؤل، تیار ہو؟''

''ہاں۔''

''شروع ہو جاؤ۔''

☆☆☆

سرکل سے مراد ''مارگریٹ کوربن سرکل'' تھا۔ میرے پہنچتے ہی سیل فون کے ذریعے روبوٹک آواز آئی۔

''بائیں جانب سب وے اسٹیشن ہے۔ نیچے جاؤ۔''

اگر مجھے نیچے ٹرین ''اے'' پر جانے کے لیے کہا گیا تو راشیل کا میرے قریب رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ میں سوچتا ہوا نیچے گیا۔

''دائیں جانب گیٹ کھول کے اندر جاؤ۔ گیٹ بند کر دینا۔''

نیچے آنے کے بعد روشنی بہت کم رہ گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق گیٹ بند ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ سال خوردہ آہنی گیٹ چوں چراں کر کے کھل گیا۔ اندر روشنی محدود اور برائے نام تھی۔ میں تاریکی میں کھڑا تھا۔

☆☆☆

کار رکی، ڈور کھل کے بند ہوا۔ راشیل نے بدقت ایک منٹ انتظار کیا اور ٹرنک ایک انچ کے قریب کھولا۔ اس نے جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس سیمی آٹومیٹک گلوک اعشاریہ بائیس، چالیس کیلیبر تھا۔ پام پائلٹ کے علاوہ نائٹ ویژن گوگلز بھی تھے۔ دیکھے جانے کا خطرہ اپنی جگہ پر لیکن اسے باہر نکلنا تھا۔ کم سے کم جگہ بنا کے وہ باہر آئی اور وہیل کے ساتھ چپک کے بیٹھ گئی۔ فیلڈ آپریشن اسے ہمیشہ سے پسند تھے لیکن یہ ایف بی آئی کے فیلڈ آپریشن سے مختلف صورتِ حال تھی۔ فاصلے پر وہ مارک کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ گن اس نے ہولسٹر میں لگائی اور بیلٹ کے ساتھ وہ جھکی ہوئی حالت میں گھاس میں چلی گئی۔ پہاڑی علاقہ تھا۔ موزوں جگہ منتخب کی گئی تھی۔ جب وہ رکی تو مارک پارک سے نکل رہا تھا۔ راشیل کو پھر حرکت میں آنا پڑا۔ اس نے ڈھلوان پر رینگنا شروع کیا۔ مارک نظر نہیں آرہا تھا۔ راشیل نے خطرہ مول لے کر تیزی دکھائی۔ پارک گیٹ کے قریب وہ ایک ستون کی آڑ میں آگئی۔ مارک کی جھلک نظر آئی۔ فون والا ہاتھ کان کے قریب تھا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے کی جانب گیا پھر غائب ہو گیا۔ راشیل نے ایک مرد اور عورت کو کتے کے ساتھ دیکھا۔

کون تھے؟ عام جوڑا یا......؟ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ انہیں نظر انداز کر کے عام سے انداز میں اسٹیشن کی سیڑھیوں کی طرف گئی۔

☆☆☆

ایڈگر نے پاجامہ اور نیلا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ اس کے بھائی کارسن کا پاجامہ شکن آلود، بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ دونوں تصاویر کو دیکھ رہے تھے۔

''ایڈگر نتیجہ اخذ کرنے میں جلدی مت کرنا۔'' کارسن نے کہا۔

ایڈگر نے گویا سنا ہی نہیں۔ ''میں نے اسے رقم دی تھی۔''

''یس سر، پرانی بات ہے۔'' لائیڈ نے کہا۔

''پرانی نہیں، آج کی بات ہے۔'' ایڈگر نے کہا۔

''کیا؟ کتنی؟''

''دو ملین ڈالرز۔'' ایڈگر نے مختصر کہانی بیان کی۔

''تم نے ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

''خوب، تم نے ماضی میں بھی کمال کیا تھا۔'' ایڈگر نے ٹکا سا جواب دیا۔ لائیڈ کسمسا کر رہ گیا۔ کارسن تصاویر دیکھ رہا تھا۔

''کیا میری بیٹی کی موت کا ذمے دار مارک ہے؟''

''تم نے بتایا کہ صبح تم مارک سے پارک میں ملے تھے۔'' لائیڈ نے ایک تصویر اٹھائی۔ ''کیا یہ عورت اس کے ساتھ تھی؟''

''نہیں۔''

''تم دونوں میں سے کسی نے اس عورت کو پہلے دیکھا ہے؟''

ایڈگر اور کارسن نے انکار کیا۔

''یہ کون ہے؟ اور میری بیٹی نے ایم وی ڈی سے مدد کیوں لی؟''

لائیڈ نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ ''تم نے یہ کیسے اندازہ لگایا کہ تاوان کا مطالبہ دھوکا نہیں، حقیقت ہے؟''

کارسن نے بالوں کے ٹیسٹ کے بارے میں بتایا۔ یہ بھی کہا کہ مارک نے مزید جانچ کے لیے بالوں کا نمونہ لے لیا ہے۔ ایڈگر تصاویر میں کھویا ہوا تھا۔

''کیا مارک اور اس عورت کا افیئر چل رہا تھا؟'' ایڈگر نے سوال کیا۔

## افسوس

دو آدمی اجرت پر خط لکھنے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے دونوں ہی اتنے بدخط تھے کہ اپنا لکھا خود ہی پڑھ سکتے تھے۔ ایک دن دونوں کی سرِراہ ملاقات ہوگئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ ''کہو بھائی! کیسی کٹ رہی ہے؟''

دوسرے نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ ''بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ چونکہ میرا لکھا کوئی اور نہیں پڑھ سکتا اس لیے خط پڑھنے کے لیے بھی مجھ ہی کو جانا پڑتا ہے جس سے مجھے اجرت دگنی مل جاتی ہے۔''

پہلے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دوسرے نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم نے سرد آہ کیوں بھری؟''

پہلے نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں اب اس نوبت کو پہنچ چکا ہوں کہ اپنا لکھا خود بھی نہیں پڑھ سکتا، چنانچہ میں بدقسمتی سے اس دوسری اجرت سے محروم ہوگیا ہوں۔''

اوکاڑہ سے ثنا کا تعاون

''فی الحال میرے پاس جواب نہیں ہے۔''

''میری بیٹی کو ان تصاویر کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

جواب میں سیل فون نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ لائیڈ نے کال وصول کی۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''یس سر۔'' دوسری طرف ڈیرک تھا۔ ''پانچ منٹ قبل اس نے ای زی پاس استعمال کیا ہے۔ وہ جارج واشنگٹن برج سے گزر رہا ہے۔''

☆☆☆

میں نگاہ کو تاریکی سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

''آگے بڑھو۔'' سیل فون میں آواز آئی۔ میں نے اندھوں کے مانند قدم اٹھائے اور گھبراہٹ محسوس کی۔ مجھے قوی احساس تھا کہ راشیل آس پاس نہیں ہے۔ زیادہ پیش قدمی نہیں کرنی پڑی۔ ڈالرز کا بیگ نیچے رکھنے کا حکم آیا۔

''نہیں، میں اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے خوف محسوس کیا۔

''بیگ نیچے رکھ دو۔''

''نہیں، معاہدے پر عمل کرو۔'' خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ میرا دل کر رہا تھا، شور مچاتا ہوا بھاگ جاؤں۔

''ڈاکٹر؟''

''ہاں؟''

اسی وقت فلیش لائٹ میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے پیشانی پر ہتھیلی کی آڑ بنائی۔ نظر چندھیا گئی تھی۔ روشنی پھینکنے والے نے لائٹ کچھ نیچے کی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کے دیکھا۔ بلاشبہ اوسط قدوقامت کا وہی ہیولا نظر آیا۔ اگرچہ کپڑوں کا رنگ نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم سر پر بیس بال کیپ تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سایہ تھا جس نے کیپ والے کے گھٹنے سے اوپر ہاتھ رکھا ہوا تھا...... چائلڈ۔

☆☆☆

راشیل کو اندازہ تھا کہ سب وے پر جانے کے لیے خود کو پوشیدہ رکھنا تقریباً ناممکن ہے لیکن بہرحال اسے جانا تھا۔ وہ نیچے گئی۔ تاریکی بڑھ گئی تھی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ نہ تھا۔ دائیں جانب لوہے کا گیٹ تھا۔ وہ نظر ہٹانے والی تھی جب اس نے دوسری جانب تاریکی میں روشنی کی موٹی لکیر دیکھی۔ روشنی اچانک غائب ہوگئی۔ راشیل نے گیٹ کے قریب باڑ کے ساتھ دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اگلی ساعت میں اس نے نائٹ ویژن گاگلز آنکھوں پر چڑھائے اور جائزہ لیا۔ ایک جھاڑی کے پیچھے اس نے عورت نما ہیولا دیکھ لیا۔ راشیل گیٹ سے اندر ہوئی تو جھاڑی کے عقب میں عورت کو نہ دیکھ پاتی۔ یہاں سے بھی اسے دشواری کا سامنا تھا۔ اندر روشنی کی دھار ایک بار پھر دوسرے زاویے سے نظر آئی۔ راشیل نے عورت والی جھاڑی کے دائیں جانب دیکھا۔ مارک نظر آیا۔ وہ بیگ نیچے رکھ رہا تھا۔ راشیل نے روپوش عورت اور پھر مارک کی طرف دیکھا۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ روشنی غائب تھی۔ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اُلجھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ مارک عورت کی موجودگی سے بے خبر ہے۔ راشیل نے عورت کے ہیولے کو غور سے دیکھا۔ وہ مارک کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ دفعتاً راشیل پر انکشاف ہوا وہ اشارہ نہیں تھا۔ ہیولے کی جسامت اور اشارے میں تناسب نہیں تھا۔ عورت کے ہاتھ میں گن تھی۔ راشیل نے مارک کو خبردار کرنے کے لیے منہ کھولنا چاہا...... عین اسی وقت ایک وزنی ہاتھ راشیل کے منہ پر جم گیا۔ ہاتھ تھا یا بیس بال کا دستانہ۔

☆☆☆

لائیڈ ڈرائیونگ کررہا تھا۔ ریگن ساتھ بیٹھا تھا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' ریگن نے کہا۔

''بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ تارا زندہ ہے۔''

''عجیب اسرار ہے۔''

''ہاں۔'' لائیڈ نے کہا۔ ''لیکن کچھ وضاحت بھی ہورہی ہے۔ سوچو معذور بچی کو کون زندہ رکھ سکتا ہے؟''

''اس کا باپ۔ زیادہ امکان یہی ہے۔''

''درست۔''

''لیکن اتنا عرصہ بچی کہاں رہی؟''

''گرل فرینڈ کے پاس جو جانتی ہے، کام کیسے کیا جاتا ہے۔''

ریگن نے پُرسوچ انداز اختیار کیا۔ ''فرض کرو ایسا ہی تھا۔ دولمین کے ساتھ وہ بچی بھی لے گئے لیکن اٹھارہ ماہ انتظار کی کیا تُک تھی۔ اٹھارہ ماہ بعد دونوں نے فیصلہ کیا کہ دولمین مزید لیے جائیں؟''

''انتظار شکوک وشبہات تحلیل کرنے کے لیے تھا اور ہو سکتا ہے فرار سے پہلے انہوں نے سوچا کہ دولمین مزید حاصل کیے جائیں۔''

ریگن کی پیشانی پر شکن نمودار ہوئی۔ ''اب بھی ایک سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔''

''کیا؟''

''اگر مارک سیڈمین ہی منصوبہ ساز تھا پھر وہ خود کو یا اس کا ساتھی اسے گولی کیسے مار سکتا ہے۔ یہ ڈراما نہیں تھا۔ وہ مردہ تھا۔ اس کا بچنا معجزہ تھا۔'' ریگن نے کہا۔

لائیڈ نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ ''کیا وہ دولمین کے ساتھ فرار نہیں ہورہا ہے؟''

''ایسا ہوتا تو وہ ای زی پاس استعمال کرنے کی حماقت کیوں کرتا۔''

''پھر ہو کیا رہا ہے؟''

''یہی معلوم کرنا ہے۔'' ریگن نے کہا۔

سیل فون نے توجہ مبذول کرائی۔ ''ہاں؟''

''سر آپ کہاں ہیں؟''

''جارج واشنگٹن برج کے قریب۔'' لائیڈ نے جواب دیا۔

''جلدی کریں۔''

''کیا ہوا؟''

''نیاورک سٹی پولیس ڈپارٹمنٹ نے ڈاکٹر سیڈمین کی کار فورٹ ٹرائن پارک پر دیکھی ہے۔''

''بس پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' لائیڈ نے فون بند کر کے ریگن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

☆☆☆

ہیشی کے لیے آج کا مشن آسان تھا۔ وہ ٹاور نما مقام سے نیچے آرہا تھا جب اس نے ایک عورت کو سب وے اسٹیشن کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ مشکوک تھی یا نہیں، ہیشی نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے دماغ کی وائرنگ میں نقص تھا۔ اس نقص کی اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے جسیم بدن میں شیطانی روح موجود تھی۔ ظاہری وجود سے زیادہ اس کا اندرون خطرناک تھا۔ وہ اب تک سولہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ ان میں سے چودہ سسک سسک کر مرے تھے۔ اس کے علاوہ چھ افراد کو اس نے زندہ چھوڑ دیا تھا لیکن کس حال میں؟ وہ آج بھی اس آرزو میں جھلس رہے تھے کہ کاش انہیں زندہ نہ چھوڑا جاتا۔ ساتویں نے موقع ملتے ہی خودکشی کرلی تھی۔ وہ مارتھا کے لیے مارتا تھا اور خود مارتھا پر مرتا تھا۔

اب وہ عورت کے پیچھے تھا۔ ہیشی نے نائٹ ویژن گاگلز بھی دیکھ لیے تھے۔ اسے مرنا تھا۔ ہیشی قریب ہوتا چلا گیا۔ قدوقامت کے حساب سے اس کی پھرتی اور خاموشی حیرت انگیز تھی۔ وہ عورت کے عقب میں دو گز دور تھا جب اسے ادراک ہوا کہ عورت نے گڑبڑ محسوس کرلی ہے۔ تاہم ہیشی نے موقع نہیں دیا۔ اس کا بڑا سا ہاتھ یوں عورت کے منہ پر جما کہ اس کی ناک بھی ہاتھ کے نیچے آگئی اور سانس کی آمدورفت منقطع ہوگئی۔ ہیشی نے دوسرا ہاتھ کھوپڑی کے عقب میں جمایا۔ اس نے بہ آسانی عورت کو زمین سے اوپر اٹھالیا تھا۔

☆☆☆

میں آہستہ آہستہ اس سمت میں جارہا تھا جہاں فلیش لائٹ چمکی تھی۔ تارا کو وہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا کہ ڈفل بیگ کے ساتھ کیا ہوا۔ میری بیٹی سب سے اہم تھی۔ سیکنڈ چانس، مجھے دوسرا موقع مل گیا تھا اور میں نے تارا کو لے جانا تھا۔ میں قدم بہ قدم بڑھتا رہا۔

☆☆☆

ایف بی آئی کی تربیت گاہ میں ہتھیاروں کے علاوہ دست بدست مقابلے کے گر بھی سکھائے جاتے ہیں۔ راشیل نے کوانٹیکو میں چار ماہ تربیت کے دوران بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ بہ خوبی آگاہ تھی کہ حقیقی لڑائی ٹی وی یا فلموں کی طرح نہیں ہوتی۔ اسے نازک مقامات کو نشانہ بنانا تھا۔ ناک، گھٹنا، رانوں کے درمیان، معدے کا بالائی منہ (ناف سے تقریباً ایک بالشت اوپر) رانوں کے درمیان مشکل پیش آتی ہے کیونکہ مرد جبلی طور پر دفاع کے لیے ہوشیار ہوتے ہیں۔ البتہ آپ ناف کے نیچے کا جھانسا دے کر دوسرے حساس مقام کو ٹارگٹ کرسکتے ہیں۔ یوں فلموں کے مانند حقیقت میں بھی خود سے بڑے مدمقابل کو شکست سے دوچار کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں صورتِ حال کافی مخدوش تھی۔ امکانات راشیل کے خلاف تھے۔ حریف ریچھ کے مانند اور وہ گڑیا جیسی تھی۔ اگر وہ حریف کو گرا بھی دیتی، جس کا امکان نہیں تھا، تب بھی اس کے ساتھ ہاتھا پائی نہیں کرسکتی تھی۔ کوانٹیکو میں اسے خطرناک حالات سے نمٹنے کی تربیت دی گئی تھی لیکن ایسی بدتر صورتِ حال کا اس نے پہلے سامنا نہیں کیا تھا۔ وہ سانس نہیں لے سکتی تھی۔ عقب میں اس کی لاتیں اور مُکے گویا چٹان سے ٹکرا رہے تھے۔ منہ اور ناک سے ہاتھ ہٹانے کی کوشش مکمل طور پر رائگاں ثابت ہوئی۔ وہ ہوا میں معلق تھی۔ لگ رہا تھا کہ گردن شانوں سے اکھڑ جائے گی۔ دیوزاد حریف کی طاقت راشیل کے سر کو انڈے کے مانند چٹخانے کے درپے تھی۔ گردن کا کھنچاؤ کم کرنے کے لیے راشیل نے دونوں ہاتھوں سے حریف کی موٹی کلائیاں تھام لیں۔

وہ زندگی اور موت کے درمیان جھول رہی تھی اور بدحواسی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ پینک (Panic) اس کی بچی کھچی توانائی کو تیزی سے چوس لیتا۔ پھیپھڑے جل رہے تھے۔ سر میں بگولے چکرا رہے تھے۔ اسے سانس کی ضرورت تھی۔ اس کی حالت کانٹے میں پھنسی ماہیِ بے آب کے مانند تھی۔ پینک نے جگہ بنانی شروع کی۔ ڈوبتے ذہن میں گن کا خیال آیا۔ گن تک پہنچنے کے لیے مزید ہمت درکار تھی جبکہ پھیپھڑے آکسیجن کے لیے بلک رہے تھے۔ حواس رخصت ہوا چاہتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ سر ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ وحشی زور لگا رہا تھا۔ راشیل نے ایک ہاتھ نیچے کیا۔ گردن پر تناؤ بڑھ گیا۔ انگلیاں گن کو چھو رہی تھیں۔ وحشی نے گردے کے مقام پر گھٹنے سے چوٹ لگائی۔ راشیل تڑپ اٹھی لیکن باز نہ آئی۔ گن اس کی آخری امید تھی۔ حریف اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ راشیل کے پھیپھڑوں نے ہوا کھینچی۔ مہلت عارضی ثابت ہوئی۔

حملہ آور نے ایک ہاتھ کے ذریعے اسے گن کھینچنے سے باز رکھا اور دوسرا ہاتھ راشیل کے حلق پر مارا۔ وہ زمین بوس ہوگئی۔ سانس پھر رک گئی تھی۔ حریف نے گن پر قبضہ کیا اور اسے ایک طرف اچھال دیا۔ اگلی ساعت میں وہ راشیل کے

اوپر تھا اور دونوں ہاتھ راشیل کی گردن پر۔ اس کی سانس ایک بار پھر رک گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب پولیس کار کے سائرن اور روشنی دونوں نے سب اسٹیشن پر موجودگی کا احساس دلایا۔ وفشار پیچھے نما آدمی نے راشیل کو آزاد کر دیا۔ وہ اچھلا اور سیل فون نکال کر غرایا۔

''نکل جاؤ، پولیس۔ آپریشن ازاوور۔''

راشیل لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن جسم بے جان تھا۔ اس نے وحشی کے گھونسے سے بچنا چاہا تاہم ناکام رہی۔ طاقتور گھونسے نے اسے تاریکی میں ڈبو دیا۔

☆☆☆

مارتھا گن بدست جھاڑی کی اوٹ سے باہر آ گئی۔ وہ مارک کے عقب میں تھی۔ مارک بے خبر تھا۔ مارتھا نے ٹریگر پر انگلی رکھ کے ہاتھ سیدھا کیا۔ ''نکل جاؤ، پولیس......'' ائرپیس میں وحشی کی آواز آئی۔ سائرن کی مدھم آواز مارتھا نے بھی سن لی۔ وہ حیران تھی۔ دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اس نے فی الفور ہتھیار ایک طرف اچھال دیا۔ ہتھیار اس کے قبضے میں نہ رہا۔ کوئی ثبوت نہیں تھا۔ دستانوں کی وجہ سے گن پر انگلیوں کے نشان بھی نہ تھے۔ سوال تھا کہ رقم کا بیگ کیوں نہ اٹھایا جائے؟ وہ ایک عام شہری نظر آ رہی تھی۔ اگر بیگ کے ساتھ پکڑی گئی تو ایک اعلیٰ مثال قائم کرے گی۔ بیگ پولیس کے حوالے کر دے گی۔ یہی کہے گی کہ اسے نہیں معلوم اس میں کیا ہے اور وہ اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتی تھی...... کوئی جرم نہ کوئی خطرہ۔ اس نے نہایت تیزی سے امکانات کا جائزہ لیا، سیل فون سے بھی جان چھڑائی۔ اگر گن اور فون برآمد ہوئے تب بھی دونوں اشیا کا تعلق اس کے ساتھ یا وحشی سے جوڑنا ناممکن تھا۔ وحشی کی جھلک نظر آئی۔ مارتھا نے مارک کی جانب سے رخ پھیرا اور بیگ اُچک لیا۔ بعدازاں دونوں تاریکی میں غائب ہو گئے۔

☆☆☆

روشنی برائے نام تھی۔ میری نگاہ اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھی۔ میرے قدم ڈھلوان پر تھے۔ کوشش تھی کہ ٹھوکر نہ لگے۔ معاً کسی بچے کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں تھم گیا۔ آواز پھر آئی لیکن آواز دور ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی قدموں کی آواز ابھری۔ کوئی بھاگ رہا تھا۔ بچے کو لے کر بھاگ رہا تھا۔ نہیں! میرے اندر کوئی چلایا۔ مجھے وہم ہوا۔ کہیں پولیس کار کا سائرن گونجا ہے لیکن میری توجہ بیٹی کی طرف تھی۔ کس سمت میں جانا چاہیے؟ میں نے بے قراری سے اندازہ لگانے کی کوشش کی پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ اچانک مجھے دوراہے کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے بے چینی سے دونوں طرف دیکھا۔ میرا انحصار بینائی سے زیادہ سماعت پر تھا۔ میں دائیں سمت میں جانے والا تھا جب جھاڑیوں میں ہلچل ہوئی۔ میں رک گیا۔ دو سائے نظر آئے۔ میں نے غور کیا، دونوں مرد تھے۔

''تم نے کوئی آدمی دیکھا ہے؟ چھوٹی لڑکی کے ساتھ؟''

''جہنم میں جاؤ۔'' لمبے قد والے نے جواب دیا۔ میں نے بے دھڑک آگے بڑھ کے تھپڑ رسید کیا۔ وہ تکلیف سے زیادہ شاک میں نظر آیا۔

''کہاں گئے ہیں وہ دونوں؟''

دوسرے نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ میں اچھل کے بے تحاشا دوڑا۔ راہ میں پھر دو نفوس دکھائی دیے۔ مرد اور عورت۔ میں نے وہی سوال دہرایا۔

''اس طرف۔'' جواب آیا۔ میں رکے بغیر دوڑتا رہا۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں بیس بال کیپ والے کی جھلک نظر آئی۔

''روکو۔'' میں چیخا۔ ''کوئی اِن کو روکو۔''

ٹوپی والا غائب ہو گیا۔ میں چیختا چلّاتا دوڑ رہا تھا۔ وہ درختوں کی طرف نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ میں نے رخ بدلا۔ وہ چھوٹی سی دیوار پھاندر ہا تھا۔ میں تعاقب میں تھا۔

''رک جاؤ۔''

میں نے مڑ کے پولیس مین کو دیکھا۔ گن اُس کے ہاتھ میں تھی۔

''میری بیٹی اس کے پاس ہے۔ وہ اُدھر گیا ہے۔''

''ڈاکٹر سیڈ مین؟''

میری حیرت دوچند ہو گئی۔ وہ ریگن کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ ایجنٹ لائیڈ۔ ''رقم کہاں ہے؟''

اظہارِ حیرت کا وقت نہیں تھا۔ ''وہ میری بیٹی لے گیا ہے۔''

''میں کہہ رہا ہوں، رک جاؤ۔''

رکنا ناممکن تھا۔ میں بھاگا، وہ بھی دوڑے۔ وہ جوان تھے۔ فٹ تھے لیکن داؤ پر میری بیٹی تھی۔ میں جنونی کیفیت میں تھا۔ میں نے بہ آسانی آرائشی دیوار پھاندی۔ تاہم دوسری جانب ڈھلوان پر لڑھک گیا۔ گرد و غبار، کچرا۔ شیشے کے ٹکڑے...... میں درخت سے ٹکرایا۔ پسلیوں میں درد کی لہر اٹھی۔ سانس رک سی گئی۔ عقب میں پولیس کی فلیش لائٹس

چکرا رہی تھیں۔ کسی نے رکنے کی وارننگ دی۔ مجھے پروا نہیں تھی۔ ففٹی ففٹی امکان تھا کہ گولی چل جائے۔ اذیت برداشت کرتے ہوئے میں نے تعاقب جاری رکھا۔ میرے اور اس کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ میں نے زیادہ تیزی دکھائی تھی۔ تارا کی موجودگی بھی اس کی رفتار میں حائل تھی۔ وہ تاریکی بہت پیچھے رہ گئی تھی جہاں میں نے بیگ چھوڑا تھا۔ راشیل کا کہیں پتا نہ تھا۔

''ہالٹ۔'' کوئی چلایا۔

''وہ میری بیٹی کے ساتھ اس طرف ہے۔'' میں نے پھر تنبیہہ نظرانداز کی۔ مجھے امید تھی کہ گولی نہیں چلے گی۔ ہم گھومتے چکراتے واپس مارگریٹ کوربن سرکل پر تھے۔ میں نے کھیل کے میدان پر نظر ڈالی۔ کوئی نہیں تھا پھر چیپل کے قریب مددکار بیتی ہائی اسکول کی طرف حرکت نظر آئی۔ میں پھر شور مچاتا ہوا بھاگا۔ میری ٹانگیں وزنی ہو رہی تھیں اور سینہ جل رہا تھا۔ چیپل کا دروازہ بند تھا۔ آس پاس کوئی ذی نفس نہیں تھا۔ مجھ پر بدحواسی طاری تھی۔ میں نے بیٹی کو کھو دیا تھا۔ دل ڈوب گیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ راشیل کہاں ہے۔ اچانک کسی گاڑی کا انجن بیدار ہوا۔ میں اچھل پڑا۔ سڑک کی طرف دیکھا۔ دس گز کے فاصلے پر...... وہ ہونڈا اکارڈ تھی۔ میں دیوانوں کی طرح بھاگا۔ اسی دوران لائسنس پلیٹ کو ذہن نشین کیا۔ اگرچہ میں آگاہ تھا کہ یہ کاوش بے معنی ثابت ہوگی۔ ڈرائیور گاڑی پارکنگ سے نکالنے کے لیے گھما رہا تھا۔ میرے پاس وقت تھا۔ میں نے موقع پر ڈرائیور کی سائڈ والے ڈور پر ہاتھ ڈالا۔ میں دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ بند کرنا چاہ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ میرے مقابلے میں بہتر حالت میں تھا۔ وہ اندر، میں باہر تھا اور گاڑی حرکت میں......

اس نے ایکسلیریٹر دبایا۔ مجھے ہر قیمت پر گاڑی کے ساتھ رہنا تھا۔ دوسرا ہاتھ میں نے کھلے دروازے کے خلا میں ڈال دیا۔ بھاگتی کار کے ساتھ میں زیادہ دور نہیں دوڑ سکا۔ میں تارا سے چند فٹ دور تھا۔ ہاتھ ناکارہ ہو جائے...... مجھے کار کے ساتھ چپکے رہنا تھا۔ دماغ ہر شے سے بیگانہ ایک نکتے پر مرکوز تھا۔ یہ میرا آخری موقع تھا۔ جسم کار کے متوازی لہرا رہا تھا۔ ٹانگیں سڑک پر تھیں۔ شدید تکلیف تھی۔ بلاشبہ ٹخنوں پر سے کھال اتر گئی تھی۔ مجھے ادراک تھا کہ جلد ہی میں زخمی حالت میں کار سے جدا ہو جاؤں گا۔ اگر ڈرائیور کے پاس گن ہے تو وہ مجھے شوٹ کر دے گا یا پھر میں کار کے نیچے روندا جاؤں گا۔

مجھے کسی طرح کار کے اندر جانا تھا۔ میرا چہرہ عقبی کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عقبی نشست خالی تھی۔ میری دھڑکن رک گئی۔ ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ فرنٹ سیٹ پر ائربیگ اتنے چھوٹے بچے کے لیے نہیں ہوتا۔ بارہ سال سے چھوٹا بچہ فرنٹ سیٹ پر نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوگا تو اس کے لیے مخصوص نشست ہونی چاہیے، یہی قانون تھا۔ کار کی رفتار کے ساتھ میرا جسم اب ہوا میں تھا۔ ایک ہاتھ کار ڈور اور باڈی کے درمیان مجروح ہو رہا تھا۔ میں نے عالم وحشت میں فرنٹ سیٹ پر نظر ماری۔ بچہ وہاں تھا۔ یہ خطرناک تھا، قطعی غیرقانونی۔ ڈرائیور نے معاً اسٹیئرنگ کاٹا۔ وہ لمحاتی جھلک تھی لیکن بہت کافی تھی۔ میری جنگ، ہمت، ارادہ سب کچھ پل بھر میں تحلیل ہو گیا۔ گاڑی پر میری مخدوش گرفت ختم ہو گئی۔ عقب میں پولیس کار کا سائرن بول رہا تھا۔ وہ ہونڈا اکارڈ کے پیچھے تھے لیکن میرے لیے بے معنی تھا۔ کار ڈور پر میری گرفت ختم ہو گئی۔ میں نے جو دیکھا، اس کے بعد یہی ہونا تھا۔ میرا جسم چند سیکنڈ کے لیے ہوا میں رہا پھر وزنی پتھر کے مانند نیچے گرا۔ بعدازاں میرے بدن کے ساتھ کیا ہوا مجھے احساس نہ تھا۔ کیونکہ ہوش و حواس بہ سرعت رخصت ہوئے تھے۔

فرنٹ سیٹ پر لڑکی نہیں، لڑکا تھا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی...... ایک بار پھر میں اسپتال میں تھا۔ ایکسرے نہیں ہوا تھا۔ تاہم امکان تھا کہ ایک آدھ پسلی کریک ہو گئی ہے۔ جگہ جگہ سے کھال اتر گئی تھی۔ دائیں ٹانگ کا گھاؤ ایسا تھا گویا شارک نے چبایا ہو۔

لینی ریکارڈ ٹائم میں پہنچا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ شاید میں پھر غلطی کر گیا تھا۔ درحقیقت تارا کو آخری بار میں نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ محض چھ ماہ کی تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ پولیس اور ایف بی آئی کیونکر وہاں پہنچے تھے۔ کیا انہوں نے ہونڈا اکارڈ والے کو پکڑ لیا تھا۔

لینی آندھی طوفان کے مانند وارد ہوا اور نرس کو کمرے سے نکال دیا۔ ''کیا تماشا ہے؟'' اس کا پہلا سوال تھا۔ یقیناً شیرل نے اسے بتایا تھا کہ میں نے راشیل کا فون نمبر لیا تھا۔

میں نے تمام کہانی بلاکم و کاست الف سے ی تک گوش گزار کر دی۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا لیکن وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لایا۔

''یہ ایڈگر کا کھیل تو نہیں ہے؟''

''کیسے؟'' میں نے اعتراض کیا۔ ''وہ چار ملین گنوا چکا

ہے۔"

"راشیل کہاں ہے؟"

"نہیں جانتا۔ شاید واپس میری اقامت گاہ پر۔"

لینی نے بے اعتباری سے مجھے دیکھا۔ اس کے اگلے سوال سے پہلے دروازہ کھلا۔ لائیڈ اور اس کے عقب میں ریگن نمودار ہوا۔ ذرا دیر بعد ہی سوالات کی بارش شروع ہو گئی۔ زیادہ تر سوالات کا محور تاوان کی رقم اور راشیل تھی۔ میرے پاس چھپانے یا کذب گوئی کے لیے کچھ نہ تھا۔ گاہے گاہے لینی ٹانگ اڑاتا رہا۔ ہونڈا اکارڈ اڑتالیس گھنٹے قبل چرائی گئی تھی۔ پولیس کو گاڑی براڈوے پر ایک سو پینتالیس اسٹریٹ کے قریب ملی تھی۔ لائیڈ مجھے جھوٹا ثابت کرنے پر تلا تھا لیکن وہ دلیل سے تہی دست تھا۔ لینی بھی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ریگن گومگو کی کیفیت میں تھا۔ دو باتوں کا میرے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا اور دونوں اطلاعات میرے لیے انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں۔ میں نے کہا تھا کہ راشیل سے میرا ہر قسم کا رابطہ پندرہ سال سے منقطع تھا۔ البتہ چند ہفتے قبل اتفاقی مڈبھیڑ سپر مارکیٹ میں ہوئی تھی جبکہ لائیڈ کا دعویٰ تھا کہ راشیل نے مونیکا کے مرڈر سے تین ماہ قبل مجھے گھر پر فون کیا تھا۔

دورانِ سوال و جواب ریگن نے دوبارہ راشیل کے مقتول شوہر کا ذکر کیا۔ میں نے پھر اعتراض کیا کہ راشیل جیل میں کیوں نہیں ہے؟

دوسرے انکشاف نے مجھے ششدر کر دیا۔ جب انہوں نے سوال کیا کہ مونیکا نے ایم وی ڈی کی خدمات کیوں حاصل کی تھیں۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہی سچ تھا۔ اس موقع پر لائیڈ نے ایک فولڈر نکالا۔ فولڈر میں سے ایک تصویر برآمد کی۔ فوٹو رج ووڈ میں ویلی اسپتال کے باہر لیا گیا تھا۔ فوٹو کے زیریں حصے پر جو تاریخ تھی، وہ اس امر کی عکاس تھی کہ فوٹو مونیکا کے مرڈر سے دو ماہ قبل لیا گیا تھا۔ ویلی اسپتال میں ذی لیرا اور میرا آفس تھا۔ تصویر میں شناخت نہیں کر سکا۔ لائیڈ نے دوسری تصویر نکالی جو کافی واضح تھی۔ بلاشبہ وہ راشیل تھی۔ لائیڈ نے اوپر تلے پانچ تصاویر اور میرے حوالے کیں۔ سب راشیل کی تصاویر تھیں۔ ویلی اسپتال کے باہر...... آٹھویں تصویر میں وہ عمارت کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ نویں تصویر میں، میں اکیلا باہر آ رہا تھا۔ وقت اور تاریخ کے مطابق چھ منٹ بعد دسویں تصویر میں راشیل باہر آ رہی تھی۔

لینی بھی حیرت کا شکار نظر آ رہا تھا۔ تاہم میرے مقابلے میں وہ جلد سنبھل گیا۔ "گیٹ آؤٹ۔" وہ بولا۔

"تم میں سے کوئی وضاحت کرے گا۔" لائیڈ نے کہا۔

"گیٹ آؤٹ ناؤ۔" لینی نے درشت لہجہ اختیار کیا۔

☆☆☆

میں اسپتال کے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ لینی میرے ساتھ تھا۔

"وہ تمہیں، بلکہ تم اور راشیل کو منصوبہ ساز گردان رہے ہیں۔" لینی نے کہا۔ "لیکن ان کی تھیوری کھوکھلی ہے۔ ان کے پاس کئی سوالات کا جواب نہیں ہے۔ مثلاً تمہاری اور ایڈگر کی میٹنگ پارک میں کیونکر طے پائی۔ تمہیں اس گورکھ دھندے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ لوگ فورٹ ٹرائن پارک تک خود پہنچ سکتے تھے۔ اس میں تمہاری کوئی فنکاری نہیں تھی۔ تمہیں ہونڈا اکارڈ والے کو ہائر کرنے کی کیا ضرورت تھی...... وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑھ کے اکارڈ پر چھلانگ لگا کر تم نے اپنی زندگی کو خطرے میں کیوں ڈالا؟"

"مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"لیکن تم اپنا منہ بند رکھو گے۔" لینی نے تنبیہ کی۔ "ان کے پاس دو شواہد ہیں، پہلا تصاویر کی شکل میں...... دوسرے فون ریکارڈ کہہ رہا ہے راشیل نے واردات سے تین ماہ قبل تمہیں کال کی تھی۔"

"یہ سچ ہے کہ یہ دونوں باتیں میرے لیے انکشاف سے کم نہیں۔"

"کیا تم اب بھی راشیل سے پیار کرتے ہو؟"

"لینی میں کہہ سکتا ہوں کہ میں مونیکا کے ساتھ مخلص تھا۔ مجھے اپنی بیوی اور بیٹی سے محبت تھی۔"

"مارک مطلب یہ ہوا کہ اس کی کال تم تک نہیں پہنچی اور تصاویر سے بھی تم بے خبر ہو۔ کیا میں یہ فرض کر لوں کہ تم اُس کے دل میں اب بھی بستے ہو؟"

میں خاموش رہا۔ دل کا پنچھی قفس میں پھڑپھڑایا۔ میں نے زخمی نگاہ لینی پر ڈالی۔ وہ گہری سانس لے کے رہ گیا۔

"سی ڈی کی خبر تمہیں کیسے ہوئی تھی؟" معاً اسے خیال آیا۔

میں نے اسے دینا لیونسکی کے بارے میں بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''یہ جاسوسی ناول مصنف نے واقعی نئے انداز میں لکھا ہے۔ اس میں قاتل آخر میں وہی نکلتا ہے جس پر آپ کو شروع سے شک ہوتا ہے۔''

''اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ خوش ہے اور شادی کر چکی ہے؟''
''ہاں۔''
''بکواس۔''
میں نے تعجب سے لینی کو دیکھا۔
''میں نے اس کی آنٹی کے لیے کچھ قانونی کام کیا تھا۔ میں آگاہ ہوں کہ دینا اٹھارہ برس کی عمر سے نفسیاتی علاج کے لیے بارہا کلینک آتی جاتی رہی ہے۔ چند برس پہلے اس کا رویہ متشدد ہو گیا تھا اور اس نے کبھی شادی نہیں کی۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ آرٹ سے اس کا کوئی تعلق ہے۔'' لینی نے نئی اطلاعات فراہم کیں۔
''اس نے ڈاکٹر اسٹنلے ریڈیو کی بات کی تھی۔ وہ مونیکا سے کم از کم ایک بار تو ملی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے راشیل سے محبت کے بارے میں استفسار کیا۔ دینا نے سوال کیا تھا، کیا میں مونیکا سے محبت کرتا ہوں یا کسی اور سے...... اس نے فائرنگ کی بات کیوں کی۔ کیا وہ جانتی ہے مونیکا کو گولی کس نے ماری؟ اس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ہم دونوں کو گولی کس نے ماری تھی؟'' میری آنکھوں میں اُلجھن ہی اُلجھن تھی۔
''میں اپنے ذرائع سے کوشش کرتا ہوں۔ اس تمام معاملے میں دینا کا کیا کردار ہے۔'' لینی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم وعدہ کرو میری غیر موجودگی میں پولیس کے سامنے اپنا منہ بند رکھو گے۔ اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے۔ ان کو تمہیں گرفتار کرنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔''
میں نے ہامی بھری۔ وہ مجھے خیالات کے دریا میں غوطہ زن چھوڑ گیا۔ اسپتال کے باہر راشیل کی تصاویر نے مجھے سن کر دیا تھا۔ میں ان کا کوئی جواز تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ کیا تصاویر جعلی ہو سکتی ہیں...... پریشان کن سوچوں کا رخ دینا لیونسکی کی طرف مڑ گیا۔
''یہ کمرا کس مریض کا ہے؟'' ایک نسوانی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے باہر کھینچ لی۔ وہ ڈی لیرا تھی۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ ''کیا کرتے پھر رہے ہو؟''
میں نے مختصر احوال سنایا۔ مجھے اچھا لگا، اس نے کوئی سوال نہیں اچھالا تھا۔ اس کے آنے کے کچھ دیر بعد ہی سیل فون بول اٹھا۔
''مارک؟''
میں چونک اٹھا۔ ''کہاں ہو تم؟''
''تاوان کے پیچھے...... انہوں نے وہی کیا بیگ تبدیل کر دیا۔ لیکن کیولا گراپنی جگہ پر ہے۔ میں ہارلم ریور ڈرائیو کی طرف جا رہی ہوں۔ وہ ایک میل آگے ہیں۔''
''ہمیں بات کرنی چاہیے۔'' میں نے خواہش ظاہر کی۔
''تارا کا کیا ہوا؟''
''وہ دھوکا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔
''راشیل؟''
''مارک میری حالت ٹھیک نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''وہاں مارا ماری ہو گئی تھی۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''
''ایک سیکنڈ، میری کار وہاں ہونی چاہیے۔ تم کیسے تعاقب کر رہی ہو؟''
''کوربن سرکل پر پارک ڈپارٹمنٹ کی وین تھی۔ وہ چوری کی ہے لیکن میں زیادہ دیر اسے استعمال نہیں کر سکتی۔ یہ ٹریک ہو جائے گی۔''
''راشیل انہوں نے سی ڈی سے تصاویر حاصل کی ہیں۔ تصاویر میرے دفتر کے سامنے کی ہیں۔ وہ اسے ہمارے افیئر کی شکل دے رہے ہیں۔ انہیں سی ڈی سے تمہاری تصاویر ملی ہیں۔''
دوسری جانب سکوت رہا۔

''راشیل؟''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''نیاورک پریسبٹرین اسپتال۔''

''تم ٹھیک ہو؟''

''شاید۔''

''پولیس وہاں ہے؟''

''پولیس اور ایف بی آئی۔'' میں نے لائیڈ کا نام لیا۔

''تم جانتی ہو لائیڈ کو؟''

''ہاں۔'' جواب آیا۔ ''کیا تم چاہتے ہو معاملہ ان کے سپرد کیا جائے؟''

''نہیں۔'' میں نے انکار کیا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے کسی اور بچّے کے بال روانہ کیے تھے۔''

''ابھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔'' راشیل نے کہا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ریگن اور لائیڈ پر بھروسا کرنا بے معنی تھا۔ میں نے تیزی سے جمع تفریق کے بعد راشیل کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ ''تم بہت زخمی ہو؟''

''مارک ہم کرسکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے فون بند کر کے ذی لیرا کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔'' میں نے ذی لیرا سے کہا۔

☆☆☆

لائیڈ اور ریگن، ڈاکٹرز لاؤنج میں تھے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اسے زیرِحراست رکھنا چاہیے۔'' لائیڈ کی بات پر ریگن خاموش رہا۔

''کیا بات ہے؟ تم اس کے کمرے میں بھی خاموش تھے؟''

''کیا ڈاکٹر کی باتوں میں وزن نہیں ہے؟''

''تم اس کے جھانسے میں آرہے ہو۔'' لائیڈ نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے۔ انوکھا پزل بنانے کی اسے کیا ضرورت تھی۔ منطق نہیں بنتی۔'' ریگن نے کہا۔ ''وہ اور راشیل سی ڈی کی حقیقت سے ناواقف تھے لیکن ہم جان گئے اور کڑی سے کڑی ملا کے وہاں پہنچے۔ انہوں نے پارک میں ہمیں نہیں بلایا تھا نہ ان کو توقع تھی۔ ڈاکٹر نے گاڑی پر چھلانگ کیوں لگائی۔ اس کی قسمت تھی کہ ایک بار پھر زندہ بچ گیا۔ میری عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اور راشیل ملے ہوئے ہیں، اس تھیوری میں کافی سے زیادہ چھید ہیں۔ اس نے ای ذی پاس کیوں استعمال کیا۔ پندرہ سال میں ان دونوں کے درمیان رابطے کا صرف ایک ثبوت۔ محض ایک فون کال یا پھر سپر مارکیٹ پر مڈبھیڑ۔ جس کا ذکر خود ڈاکٹر نے کیا۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''ہم کیوں نہیں سوچتے کہ ڈاکٹر سیڈمن سچ بول رہا ہے۔''

''راشیل کی تصاویر؟'' لائیڈ نے اعتراض کیا۔

''دوست پرائیویٹ آئی کسی بھی تصویر میں دونوں کو اکٹھا دکھانے میں ناکام رہی ہے۔ اور تم تصاویر پر ڈاکٹر کا ردِعمل بھول رہے ہو۔ وہ ڈاکٹر ہے، اداکار نہیں۔ وہ بھی اتنا بڑا اداکار؟ مزید یہ کہ ڈاکٹر کی بیٹی گئی۔ اس کی بیوی ماری گئی۔ معجزہ تھا کہ وہ خود بچ گیا۔''

''ڈاکٹر کی غائب شدہ گن کے بارے میں کیا کہو گے؟'' لائیڈ ڈھیلا پڑ گیا۔ ''قریبی شناسا کو ہی پتا تھا کہ گن کہاں تھی۔''

''لیکن اعشاریہ اڑتیس کے دو ہتھیار استعمال ہوئے تھے۔ فرض کرو راشیل شامل تھی اور اس کے پاس اپنی گن تھی۔ دو ہتھیاروں کی کیا ضرورت تھی؟''

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ ''دو ہتھیار اور دونوں کا غیاب نئے سوالات اٹھاتا ہے۔ جن کے جوابات درکار ہیں۔'' لائیڈ نے کہا۔

''اور چارلین کہاں ہیں؟''

''راشیل کے پاس۔'' لائیڈ نے کہا۔

''اوکے، اوکے...... یونہی سہی۔ پھر ایک آدمی ڈاکٹر کے سر پر بٹھاؤ۔'' ریگن نے ہاتھ اٹھائے۔ ''میرا مطلب ہے ڈاکٹر کی حفاظت کے لیے۔''

☆☆☆

کلوزٹ میں میرا خون آلود لباس رکھا تھا۔ ذی لیرا نے اسپتال میں موجود اپنے دوست ڈاکٹر ڈیولی بیک کی مدد سے میرے لیے کپڑوں کا بندوبست کیا۔ میں ان دونوں کی مدد سے اسپتال سے نکلا۔ ہارکنیس پویلین سے ہوتا ہوا فورڈ واشنگٹن ایونیو کے شمالی کورٹ یارڈ میں آیا۔ وہاں ذی لیرا کی گاڑی موجود تھی۔ ادویات کے اثرات نے جسم کی دکھن خاطر خواہ حد تک کم کردی تھی۔ تاہم میں فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ پسلی کی کیا صورتِ حال ہے۔ ذی لیرا نے دردکش دوا وِیاکس کی بوتل میری جیب میں ڈال دی۔ یہ دوا غنودگی کے اثرات سے پاک ہوتی ہے۔ میں نے سیل فون بھی تبدیل کرلیا۔

''تم جانتے ہو یہ پاگل پن ہے؟''

''جانتا ہوں لیکن شاید تارا زندہ ہو...... شاید۔''

''ضرورت کے وقت مجھے پیج کر دینا۔'' وہ بولی۔

میں نے شکریہ کہہ کے اسے گلے لگایا۔ گاڑی کی چابیاں اس نے میرے حوالے کیں۔

☆☆☆

میں شمال میں ہنری ہڈسن کی طرف جا رہا تھا۔ ڈی لیرا کے فون سے میں نے راشیل کا نمبر ملایا۔ راشیل نے ذرا دیر سے کال وصول کی۔ وہ خاموش تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ کالر آئی ڈی کی وجہ سے وہ خاموش ہے۔ ''میں ڈی لیرا کے فون سے بات کر رہا ہوں۔''

راشیل نے سوال کیا۔ ''کہاں ہو تم؟''

''ہڈسن کے قریب۔''

''شمال کی سمت چلتے رہو۔ ٹپان ذی سے گزر کے مغرب کی طرف بڑھو۔''

''تم کہاں ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''پہلا سیڈ مال۔ نائیک (Nyack)...... رابطے میں رہنا۔ جلد ملیں گے۔''

''او کے، میں آ رہا ہوں۔''

☆☆☆

لائیڈ فون پر ڈیرک سے بات کر رہا تھا۔ ریگن عجلت میں لاؤنج میں داخل ہوا۔ ''ڈاکٹر سیڈمین کمرے میں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب ہے؟'' لائیڈ کا منہ بن گیا۔ ''سیکیورٹی کیمرے اور باہر جانے کے راستے......؟''

''درجنوں راستے ہیں اور کیمرے ہر کمرے پر نہیں ہیں۔ جتنی دیر میں ہم ٹیپ وغیرہ دیکھیں گے، تاخیر ہو چکی ہو گی۔''

''ہاں، ہاں...... ہاں۔'' لائیڈ نے چند سیکنڈ سوچ کر فون پھر کان سے لگایا۔ ''ڈیرک تم نے سن لیا؟''

''یس۔''

''کمرے کا فون اور ڈاکٹر کے سیل فون کا کال لاگ چیک کرو۔''

لائیڈ نے فون بند کر کے ریگن کو دیکھا۔ ''اس کا وکیل کہاں ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی نکل گیا تھا۔'' ریگن نے جواب دیا۔

''رابطہ کرو۔''

''میرا نہیں خیال وہ تعاون کرے گا۔'' ریگن نے کہا۔

''کوشش کرنی چاہیے۔ اس مرتبہ صورت حال مختلف ہے۔''

☆☆☆

ہم دونوں نیو جرسی شمالی اور نیویارک جنوبی کی سرحد پر واقع ریمسی (Ramsey) نامی ٹاؤن میں ملے۔ مقام فیئر موٹیل کی پارکنگ تھی۔ راشیل سے سیکڑوں سوال کرنے تھے اور میں خوف زدہ تھا۔ پارکنگ لاٹ کا بیشتر حصہ تاریکی میں تھا۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی وہ کب کس جانب سے آئی تھی...... وہ خاموشی سے دروازہ کھول کے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ''نکلو۔'' اس نے کہا۔

اس کا چہرہ دیکھ کر میرے ذہن میں کلبلانے والے سوالات نابود ہو گئے۔

''کیا ہوا تمہیں؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔

راشیل کی دائیں آنکھ سوج کے تقریباً بند ہو گئی تھی۔ چہرے اور گردن پر نشان اور خراشیں تھیں۔ یہ محض ظاہری علامات تھیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اسے خوفناک آزمائش سے گزرنا پڑا ہے۔ حیران کن امر تھا نہ صرف اس کے حواس کام کر رہے تھے بلکہ وہ سیدھی بیٹھی تھی۔

''آخر کیا ہوا تھا؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ پام پائلٹ کے اسکرین کو تک رہی تھی۔ ''جلدی کرو۔ روٹ سترہ، جنوب کی طرف۔''

میں نے کار ریورس کی اور ہائی وے کا رخ کیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے دیا کس کی بوتل نکالی۔ ''یہ درد کم کرے گی۔''

''کتنی لوں؟''

''ایک۔'' میں نے کہا۔

''شکریہ۔''

''بتاؤ کیا ہوا تھا؟''

''پہلے تم۔'' راشیل نے کہا۔

میں نے ہر ممکن صراحت کے ساتھ کہانی سنائی۔ سب ہی کچھ شامل تھا۔ راشیل کی تصاویر اور اس کے شوہر کے قتل کا ذکر بھی کر دیا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ذہنی کرب کے آثار تھے۔

''تمہیں یقین ہے کہ گاڑی میں تارا نہیں تھی؟''

''سو فیصد۔''

''میرے دوست نے جو ٹیسٹ کیے ہیں، ان کے مطابق تمہاری ڈی این اے کا نتیجہ اور بالوں کے ٹیسٹ ہم آہنگ ہیں۔ میں اُلجھن کا شکار ہوں۔''

میں نے سکوت اختیار کیا پھر بولا۔ ''تمہارا یہ حال کیسے ہوا؟''

''میں نائٹ ویژن میں تمہیں دیکھ رہی تھی جب کسی نے عقب سے حملہ کیا۔ میں نے تمہیں بیگ رکھ کے آگے بڑھتے دیکھا تھا۔ وہاں جھاڑیوں میں ایک عورت تھی۔ تم بے خبر تھے۔ عورت کے پاس گن تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں ختم کرنے والی تھی۔ جب میں تمہیں خبردار کرنے والی تھی اسی وقت عفریت نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وحشی کسی ریچھ کے مانند تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں میرا سر جکڑا اور گڑیا کے مانند اوپر اٹھالیا۔ اس کی حیوانی طاقت میری کھوپڑی کو انڈے کے مانند توڑنے والی تھی۔ جب پولیس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس نے بوکھلا کے مجھے چھوڑ دیا...... جاتے جاتے یہاں گھونسا مارا۔'' راشیل نے انگلی سے آنکھ کے قریب اشارہ کیا۔ ''پتا نہیں کتنے منٹ بے ہوش رہی۔ آنکھ کھلی تو ہر طرف پولیس تھی۔ میں سیاہ لباس میں تھی، مزید اوٹ میں چلی گئی۔ بے ہوشی کے دوران اگر کسی کی نظر پڑی بھی ہوگی تو مجھے بے خانماں خیال کیا ہوگا۔ وہ جگہ بے گھر، آوارہ اور نشئی مرد وزن کا مسکن ہے...... بہرحال میں نے پام پائلٹ چیک کیا۔ وہ حرکت میں تھے۔ ان کا رخ ایک ساؤتھ اسٹریٹ پر جنوب کی سمت میں تھا۔ پھر وہ اچانک رک گئے۔ دوبارہ متحرک ہوئے تو بہت تیز تھے۔ اس وقت اندازاً روٹ ستر پر وہ ہم سے چھ میل آگے ہیں۔'' وہ خاموش ہوگئی۔

روٹ فور انٹر چینج پر ہم نے رفتار کم کرلی۔ میں نے اس کے مجروح چہرے کی طرف دیکھا۔ اسی ساعت راشیل نے مجھ پر نظر ڈالی۔ بے ساختہ میرا ہاتھ اٹھا۔ انگلیوں نے نرمی سے اس کے چہرے کو چھوا۔ راشیل نے آنکھیں موند لیں۔ دور گہرائی میں میرے اندر پرانا کالج بوائے اٹھ رہا تھا۔ بیدار ہو رہا تھا۔ میں نے بالوں کی لٹ اس کے چہرے سے ہٹائی۔ موتی آبدار آنکھ سے فرار ہو کے اس کے رخسار پر پھسلا۔ راشیل نے ایک ہاتھ میری کلائی پر رکھ دیا۔ اس کی انگلیوں میں موہوم لرزش تھی۔ لمس کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ انگلیوں کی لرزش میں تشنگی تھی...... سوگواری۔

اغوا اور تاوان دھوکا تھا...... فریب۔ میں بیوی اور بیٹی کو کھو چکا تھا۔ کسی نے میرا قصہ پاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ زندگی نئے سرے سے شروع کرنے کا وقت تھا۔ میرے دل نے کہا، گاڑی موڑو اور سمت تبدیل کرلو۔ راشیل سے بھی تصاویر اور اس کے شوہر کے بارے میں نہ پوچھنا۔ بھول جاؤ سب...... راشیل نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔

اچانک وہ جیسے خواب سے بیدار ہوئی۔

''وہ رک گئے ہیں۔'' اس نے پام پائلٹ کی طرف دیکھا۔ ''وہ دو میل کے فاصلے پر ہیں۔''

☆☆☆

اسٹیون بیکارڈ نے فون ریسیور واپس رکھ دیا۔ وہ آئینے میں اپنے عکس کو گھور رہا تھا۔ خیالات میں غرق۔ سرخ لکیر کراس ہو چکی تھی۔ حفاظتی اقدام اٹھانے کا وقت تھا۔ اصل منصوبہ اس کا نہیں تھا۔ پہلے بھی لغزش ہوئی تھی۔ اس مرتبہ غلطی بڑی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ کیا کر سکے گا۔ بیکارڈ ہراساں ہو چلا تھا۔

ہر میدان میں اس کی زندگی اوسط درجے کی رہی تھی۔ اسکول میں، لاء اسکول اور بار اسکور...... جہاں وہ تیسری کوشش میں پاس ہوا تھا۔ کھیل کا میدان ہو یا غیر نصابی سرگرمیاں، اس کی کارکردگی غیر نمایاں رہتی تھی۔ بیکارڈ کو اوسط درجہ قبول نہیں تھا۔ اس نے وکیل بننے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ آگے جاسکے۔ وہ بزعم خود اس میدان کو اپنے لیے موزوں خیال کرتا تھا۔ تاہم اس کی یہ خوش فہمی بہت جلد کافور ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد وہ ڈان نامی عورت سے شادی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جو گاہے بگاہے اس کی ناکامیوں پر طعنہ زن رہتی تھی۔ مزید بُرا ہوا جب وہ ڈان کو حاملہ کرنے میں ناکام رہا۔ وہ ڈان کو قائل نہ کر سکا کہ وہ اپنے ٹیسٹ کرائے۔ بالآخر چار سال بعد انہوں نے بچہ گود لینے کا فیصلہ کیا۔ اسے ایک بار پھر دشواری کا سامنا تھا کیونکہ ڈان سفید چمڑی اور نیلی آنکھوں والے بچے کے لیے مری جارہی تھی۔ مجبوراً وہ بیوی کے ہمراہ رومانیہ کے سفر پر گیا۔ شومئ قسمت اڈاپٹ کرنے کے لیے جو مطلوبہ بچے دستیاب تھے، ان کی عمر زیادہ تھی یا پھر وہ دماغی طور پر متوازن نہیں تھے لیکن سمندر پار بچے دستیاب تھے۔ یہ حقیقت جان کر بیکارڈ کے اوسط درجے کے ذہن میں اڑتیس برس بعد ایک نادر آئیڈیا پرورش پانے لگا۔ جس کو عملی جامہ پہنا کے وہ بھیڑ سے الگ ہوگیا اور یوں اس کی ترقی کا سفر شروع ہوا۔ رومانیہ میں اسے خیال سوجھا تھا کہ اوپر جانے کے لیے سسٹم سے ہٹ کر چلنا پڑے گا۔ بیکارڈ کے

سنئے بدلے ہوئے کردار نے ڈان کی مسکراہٹ بھی لوٹا دی۔
اب وہ کام نہیں بلکہ کام اس کے پیچھے تھا۔ اسے فنڈ ریزنگ کی تقریبات میں مدعو کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ جب نیوجرسی کے کیبل اسٹیشن کو مخصوص قانونی ماہر کی رائے کی ضرورت پیش آئی۔ اس وقت بیکارڈ ''نیوز 12'' کے پروگرام میں شامل تھا۔ سمندر پار سے خطرے کی نشاندہی پر بیکارڈ نے شہرت و مقبولیت سے گریز کا آغاز کر دیا۔ وہ پبلک سے دور ہوتا چلا گیا۔ اسے شہرت کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ ضرورت مند والدین اس تک پہنچ جاتے تھے۔

''بیکارڈ کوئی مسئلہ ہے؟''

وہ چونکا اور سر گھمایا۔ وہاں مارتھا کھڑی تھی۔ وہ پہلے ہی فون کال کی وجہ سے پریشان تھا۔ مارتھا کو دیکھ کے اندر سے لرز اٹھا۔ مارتھا کے دوبدو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تفصیل جاننا چاہتا تھا لیکن وقت نہیں تھا۔

''ہاں واقعی ایک مسئلہ ہے۔'' بیکارڈ نے جواب دیا۔

''بتاؤ۔'' مارتھا نے پلک نہیں جھپکائی۔ اس کی پتلیاں ساکت تھیں۔

''ابھی ابھی میں نے ایک کال وصول کی ہے۔''

''کیسی کال؟''

''تاوان کی رقم میں 'بگ ڈیوائس' موجود ہے۔''

''ہم نے بیگ تبدیل کر لیے تھے۔'' مارتھا نے اطمینان سے کہا۔

''میری سورس کے مطابق ڈیوائس نوٹوں کے بنڈل میں ہے۔''

مارتھا کے چہرے پر سایہ آ کے گزر گیا۔ ''تمہاری سورس کو اس سے پہلے علم نہیں تھا؟''

''نہیں۔ اطلاع ملتے ہی فون آیا تھا۔''

''مطلب، پولیس ہمارے سر پر ہے؟''

''یہ پولیس یا ایف بی آئی کا کام نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر سیڈ مین؟''

''اس کے ساتھ جو عورت ہے۔ راشیل طرنام ہے اس کا۔ وہ ایف بی آئی میں رہ چکی ہے۔'' بیکارڈ نے کہا۔

مارتھا کے سنجیدہ تاثرات تبدیل ہوئے۔ مسکراہٹ ابھری۔ ''وہ عورت اس وقت ہمارے پیچھے ہے؟''

''کوئی نہیں جانتا وہ اور ڈاکٹر اس وقت کہاں ہیں...... بہر حال پولیس راشیل کو ملوث سمجھ رہی ہے۔''

''ملوث؟ اغوا میں؟''

''اغوا اور قتل میں۔'' بیکارڈ نے کہا۔

مارتھا کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''وہ گن ہے تمہارے پاس؟''

بیکارڈ کے اعصاب پھر کشیدہ ہو گئے۔ وہ آگاہ تھا کہ مارتھا ڈاکٹر کی گن کے بارے میں معلوم کر رہی ہے۔ اس نے جھوٹ بولنا چاہا۔ مارتھا کی چبھتی ہوئی نظریں برمے کی طرح اس کے دماغ کو چھید رہی تھیں۔ ''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لاؤ۔'' وہ بولی۔ ''پاؤل کے بارے میں بھی بتاؤ۔''

''وہ خوش نہیں ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر ہو کیا رہا ہے؟''

''ہم کار میں جا کے اس سے بات کریں گے۔'' مارتھا نے کہا۔

''ہم؟''

''ہاں، تم اور میں۔''

''تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟''

''شش...... ش......'' مارتھا نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

''میرے پاس ایک منصوبہ ہے۔''

☆☆☆

''وہ پانچ منٹ رکنے کے بعد پھر حرکت میں آئے ہیں۔'' راشیل نے کہا۔ ''شاید فیول کے لیے رکے ہوں۔''

ہم روٹ نمبر تین سے ہٹ کے سینٹیپیڈ روڈ پر آ گئے۔
ایک میل جانے کے بعد راشیل نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔

''انہیں وہاں کہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے میٹرو وسٹا کا نشان دیکھا۔ پارکنگ کی حدود لامتناہی تھیں۔ میٹرو وسٹا، نیوجرسی کا آفس کمپلیکس تھا۔ دفاتر کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔

''کیا کرنا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ فیول کے لیے نہیں رکے تھے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''ہم تعاقب جاری رکھیں گے...... فی الحال یہی کیا جا سکتا ہے۔''

☆☆☆

لیشی، مارتھا کے ساتھ تھا۔ اُن کے پیچھے دوسری کار میں بیکارڈ آ رہا تھا۔ مارتھا نے بہ آسانی نوٹوں کے بنڈل میں ڈیوائس تلاش کر لیا۔ ایک جگہ وہ رقم کے ساتھ بیکارڈ کی کار میں منتقل ہو گئی۔ لیشی ڈیوائس کے ساتھ اکیلا تھا۔ راشیل ڈیوائس کے مطابق لیشی کے پیچھے جاتی۔ اگر پولیس آتی تو

ٹیشی کو ڈیوائس چیپک دیتا تھا۔ ٹریکنگ ڈیوائس کا تعلق پولیس ٹیشی سے جوڑنہیں سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ ٹیشی کو مشکوک سمجھ کے اس کی تلاشی لیتے تو انہیں کچھ نہ ملتا۔ بچہ نہ رقم ...... کچھ نہیں۔

''پاؤل سے رابطہ ہوا؟'' وہ بیکارڈ کے برابر بیٹھ گئی۔

''ہاں۔'' بیکارڈ نے فون مارتھا کے حوالے کیا۔ دوسری طرف سے پاؤل نے اپنی مادری زبان میں چلانا شروع کر دیا۔ مارتھا نے خاص ردعمل نہیں پیش کیا اور پاؤل کو سمجھایا کس مقام پر ملنا ہے۔ ایڈریس سن کے بیکارڈ نے جھٹکا کھایا۔ مارتھا پر نظر ڈالی وہ مسکرا رہی تھی۔ پاؤل کو ٹھنڈا کر کے مارتھا نے فون بند کر دیا۔

''تم پاگل ہوگئی ہو۔'' بیکارڈ فوراً بولا۔

''شش......ش......'' مارتھا نے اسے خاموش کرا دیا۔

بیس منٹ بعد وہ طے شدہ مقام پر تھے۔ مارتھا نے پاؤل کو دیکھا۔ وہ ایک چوری شدہ ٹویوٹا سلیکا میں تھا۔ مارتھا نے بیکارڈ پر نظر ڈالی جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا جو کچھ ہو رہا تھا، بیکارڈ اس میدان کا کھلاڑی نہیں تھا۔ اس کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی۔

''بس مجھے ڈراپ کر دو۔'' مارتھا نے بے پروائی سے کہا۔

''مجھے بتاؤ یہاں تمہارا کیا کام ہے؟''

''بے فکر رہو، خون نہیں بہے گا۔'' وہ بولی۔

''مونیکا سیڈ مین کی طرح؟''

''وہ اور سیڈ مین کی بہن...... ہمارا قصور نہیں تھا۔''

بیکارڈ نے منہ کھولا اور کچھ کہے بغیر بند کر لیا۔ سیڈ مین کی بہن پہلے ہی نشے کی لت کے باعث موت کی شاہراہ پر تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ذرا پہلے اجل رفتہ ہوگئی۔ سیڈ مین کی بہن کو خاموش کرنا ناگزیر تھا۔ جہاں تک مونیکا کا معاملہ تھا، مارتھا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔

مارتھا کو بیکارڈ کے زاویۂ فکر کی پروا نہیں تھی۔ بیکارڈ کے خیال میں وہ بچوں کی خرید و فروخت میں ملوث نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ دوسروں کی مدد کر رہا ہے۔ وہ کسی حد تک قانون شکنی کر کے خوب کما رہا تھا۔ تاہم اس میں اتنا دم نہیں تھا کہ قانون کے خلاف بہت دور نکل جائے۔

اس نے مارتھا کی خدمات حاصل کی تھیں۔ مارتھا نے رقم کا نصف اس کی گاڑی میں چھوڑا اور اتر گئی۔ بیکارڈ اسے آواز دے کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس معاملے سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ برابر کی نشست پر ملین ڈالرز پڑے تھے۔ ڈالرز نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ الپائن میں اس کی فیملی ایک شاندار گھر میں مقیم تھی۔ بچے مہنگے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

اس کے جانے پر مارتھا نے پاؤل کو کال کی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسپورٹس جیکٹ اور بیس بال کیپ میں تھا۔ متعدد فائٹس میں اس کی ناک ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ بے تحاشا سگریٹ نوشی اور بے پروائی کے باعث دانتوں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ بلقان (مشرقی یورپ کا جزیرہ نما۔ خطے میں رومانیہ اور دیگر ممالک شامل ہیں) کے علاقے خصوصاً کوسووو میں گھناؤنی سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا۔ جسم فروشی کے اڈوں اور کلبس کے علاوہ عورتوں کی اسمگلنگ...... وہ جب دو سال پہلے ایک حاملہ عورت کو لے کر امریکا پہنچا تو مارتھا نے اسے تاوان وصولی کے لیے ہائر کیا۔ وہ برسوں سے بلقانی خطے سے امریکا آتا تھا۔

پاؤل کو چند ہزار ڈالرز دے کر مختصر ہدایات دی گئی تھیں۔ کہاں مخصوص کار کا انتظار کرنا ہے۔ کار ڈرائیور سے بیگ لے کر واپس وین میں آنا ہے۔

وہ اصلیت سے بے خبر تھا، مارک سیڈ مین کو نہیں جانتا تھا۔ اغوا برائے تاوان سے لاعلم تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بیگ میں کیا تھا۔ کام سرانجام دے کر اس نے معاوضہ وصول کیا۔ صرف دو ہزار ڈالرز اور واپس کوسووو چلا گیا۔ امریکا میں اس کا مجرمانہ ریکارڈ نہیں تھا۔ پولیس، مارک سیڈ مین کے بتائے گئے حلیے کے مطابق اسکیچ بنا کے اسے ڈھونڈتی رہی۔ وقت کے ساتھ ان کی سرگرمیاں سرد خانے کی نذر ہوگئیں۔

دوسرے تاوان کے موقع پر پاؤل ہی بہترین انتخاب تھا۔ پاؤل بھولا نہیں تھا۔ اس مرتبہ اس کا رول قدرے بدل چکا تھا۔ اس نے شور مچایا لیکن مارتھا نے ڈالرز سے اس کا منہ بند کر دیا۔ مارتھا نے گن اسے دی، کام بتایا اور دونوں گھر میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ پندرہ منٹ بعد ٹیشی قریب سے گزرا۔ اس نے ٹریکنگ ڈیوائس لان میں اچھال دی۔ مارتھا نے ڈیوائس اٹھائی اور بیک یارڈ میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد صبح ہو جاتی۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔

☆☆☆

''کچھ بہت غلط ہے یہاں پر۔'' راشیل پام پائلٹ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے ڈی لیرا کی کار میں موجود سڑکوں کا نقشہ نکالا۔ علاقہ اور سڑکیں شناسا معلوم ہو رہی تھیں۔

زیادہ ہی جانی پہچانی لیکن میرا دھیان کہیں اور تھا۔ پسلیوں کا درد اپنی جگہ پر تھا۔

''راشیل۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ان کو سی ڈی سے تمہاری جو تصاویر ملی ہیں، کیا وہ اصلی ہیں۔ میرا مطلب کوئی ڈیجیٹل الٹریشن تو نہیں......؟''

اس نے لمحہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا۔ ''نہیں، وہ اصلی ہیں۔ دایاں موڑ۔''

دائیں جانب مڑ کے ہم گلین ایونیو پر آ گئے۔ ماحول مجھے پُراسرار لگا۔ میرے لڑکپن کا اسکول قریب تھا۔

''کیا تم وضاحت کرو گی۔'' میرا اشارہ اس کی تصاویر کی طرف تھا۔

''ہاں، لیکن اس وقت توجہ ٹاسک پر مرکوز رکھو۔''

ہم کاسلٹن ایونیو کی سمت جا رہے تھے۔

''دائیں۔'' راشیل نے کہا۔

نجانے کیوں رگوں میں لہو جمنے لگا۔

''وہ ٹھہر گئے ہیں۔''

''کہاں؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہارے گھر پر۔''

میں نے اُسے، اُس نے مجھے دیکھا۔

''میرا گھر؟ مطلب میرے والدین کا گھر......''

☆☆☆

راشیل کو اب بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود موڑ کاٹ رہا تھا۔ ہم گھر سے نصف میل دور تھے۔ میں یہیں پلا بڑھا تھا۔ موٹر وے سے ہو کر میں ڈربی ٹیرس پر آیا۔ میں گھر سے قریب تر ہو رہا تھا۔

''سگنل ابھی تک تمہارے گھر سے آ رہے ہیں۔'' وہ بولی۔

''وہ ڈائریکٹ روٹ سے نہیں آئے ہیں۔''

''جانتی ہوں۔''

''شاید انہیں کیولا گرل گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، مارک یہ جال ہے۔''

میں گھر کے ڈرائیو وے سے قریب تھا۔ میں پوچھنے والا تھا کہ رکوں یا آگے جاؤں یا پھر پولیس کو کال کروں؟ نوبت ہی نہیں آئی۔ پہلی گولی نے ونڈ شیلڈ کے پرخچے اُڑا دیے۔ شیشے کے ٹکڑے میرے چہرے پر لگے۔ میری سماعت سے مدھم نسوانی چیخ ٹکرائی۔ میں نے بازو سامنے کرتے ہوئے اضطراری طور پر سر جھکایا تھا۔ آنکھوں نے سرخی کی جھلک دیکھی۔

''راشیل۔'' پسلیوں کا درد جیسے نابود ہو گیا۔

دوسری گولی گویا میرے بالوں میں سے گزری۔ دوبارہ حرکت اضطراری تھی لیکن اس بار ارادہ شامل تھا۔ میں نے ایکسلیریٹر دبایا۔ انسانی دماغ غیر معمولی طور پر حیرت انگیز چیز ہے۔ کوئی کمپیوٹر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دماغ سیکنڈ کے قلیل ترین حصے میں ملین معلومات کو پروسیس کر لیتا ہے۔ اس وقت بھی ہوا تھا۔ کوئی ہم پر گولیاں برسا رہا تھا۔ دماغ میں فرار کا خیال برق کے مانند کوندا اور چلا گیا۔ ذہن نے تیزی سے تجزیہ کیا کہ بہتر راستہ بھی ہے۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں تجزیہ مکمل ہوا اور دماغ نے فیصلہ صادر کیا۔ میں ایکسلیریٹر دباتا گیا۔ ٹائر چیخ اٹھے۔ وہ میرا علاقہ میرا گھر تھا۔ اس کی اینٹ اینٹ سے میں واقف تھا۔ میں کسی کار کی آمد پر گھات لگا کے فائرنگ کرتا تو کہاں سے کرتا۔ ڈرائیو وے کی تین گھنی جھاڑیاں ہمارے گھر کو پڑوس کے گھر سے تقسیم کر رہی تھیں۔ پڑوس میں کرسٹی رہتی تھی۔ میں فائر کرتا تو مجھے جھاڑیوں کے عقب میں ہونا چاہیے تھا۔ شوٹر کی توقع تھی کہ وہ کامیاب نہ ہوا تو ہم بھاگیں گے۔ اس صورت میں اسے ہمارا صفایا کرنے کے لیے گاڑی کا پہلو ملتا۔ میں نے توقع کے برخلاف اسٹیئرنگ کاٹا اور گاڑی طوفانی رفتار سے جھاڑیوں کی طرف گئی۔ تیسری گولی دھات سے ٹکرائی۔ غالباً فرنٹ گرل سے۔ مجھے اندازہ تھا کہ راشیل کو گولی لگی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کان کے اوپر تھا۔ میں نے گھبراہٹ کے باوجود مشن جاری رکھا۔ نشانہ خطا کرنے کے لیے میں سر دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ جھاڑیاں ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نہا گئی تھیں۔ چوتھی گولی کی نوبت نہیں آئی۔ شوٹر بوکھلایا اور جھاڑیوں سے نکل کے بھاگا۔ وہی اسپورٹس جیکٹ اور بیس بال کیپ۔ راشیل کا خون دیکھ کے میں بپھر گیا تھا۔ میں نے گاڑی اُس کے پیچھے جھاڑیوں پر چڑھا دی۔ وہ یقیناً بمپر سے ٹکرایا تھا۔ تاہم نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے کار ڈور کھولنا چاہا۔

''نہیں۔'' راشیل کی آواز نے مجھے تھام لیا۔ مطلب گولی نے اسے شدید نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ''پیچھے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

میں نے گاڑی ریورس کی۔ حملہ آور مسلح تھا، میں نہیں...... میں لاعلم تھا کہ تصادم کے بعد وہ کس حال میں ہے۔ ڈربی ٹیرس پر گھروں کی روشنیاں جل اٹھیں۔ میرے گھر میں بھی روشنی نظر آئی۔ مکین بیدار ہونا شروع ہوئے۔

بلاشبہ 911 سے رابطہ کیا جا رہا تھا۔

”گولی میرے کان کو چھو گئی تھی۔“ راشیل نے خون آلود ہاتھ کان سے ہٹایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گن نظر آئی۔ ”وہ اُدھر۔“ راشیل نے اشارہ کیا۔ شوز لڑکھڑاتا ہوا بیک یارڈ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے راشیل کو دیکھا۔

”بیک اَپ۔“ وہ بولی۔ ”مجھے شک ہے کہ وہ کہاں اکیلا ہے۔ تم گاڑی میں رہو۔ انجن کو ریس اور گاڑی کو متحرک رکھو وہ سمجھیں کے ہم گاڑی میں ہیں۔ میں دیکھتی ہوں۔“ وہ کار ڈور کھول کے باہر پھسل گئی۔ خطرہ تھا لیکن میں اسے روک نہ سکا...... میں کنفیوز انداز میں ریس دیتے ہوئے گاڑی آگے پیچھے کر رہا تھا۔ وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد گن فائرز کی آواز آئی...... دو عدد۔

☆☆☆

مارتھا بیک یارڈ میں لکڑیوں کے ڈھیر کے عقب سے نگرانی کر رہی تھی۔ پاؤل نے غلطی کی تھی۔ اس نے پہلی گولی چند سیکنڈ قبل پہلے چلا دی تھی۔ مارتھا جہاں روپوش تھی وہاں سے کار ڈرائیور کو نہ دیکھ سکی لیکن وہ متاثر ضرور ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے نہ صرف پاؤل کو حیران کیا تھا بلکہ اسے زخمی بھی کر دیا تھا۔ پاؤل لنگڑاتا ہوا مارتھا کی نظروں میں آیا۔ مارتھا نے ہاتھ لہرا کے اسے متوجہ کیا۔ وہ گرا اور مارتھا کی جانب رینگنے لگا۔ مارتھا نے یارڈ کی جانب آنے والے راستوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔

بوقتِ ضرورت فرار کے لیے اس کے عقب میں پڑوسی کا وکٹ گیٹ تھا۔ مارتھا، راشیل نامی عورت کی جانب سے بھی پریشان تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پڑوسی بیدار ہو رہے تھے۔ پولیس روانہ ہو چکی ہو گی۔ مارتھا نے پھرتی سے کام کرنا تھا۔ پاؤل نزدیک آ کے لیٹ گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ ”ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔“ پاؤل نے کہا۔

”گھبراؤ مت، گن کہاں ہے؟“

”وہیں گر گئی۔“

کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مارتھا نے سوچا۔ ”میرے پاس تمہارے لیے اضافی گن ہے۔“

پاؤل کراہتا ہوا گھٹنے کے بل بیٹھ گیا۔ نظریں نیم تاریکی میں ڈرائیووے کی طرف تھیں۔ مارتھا نے اضافی گن کی بیرل اس کی کھوپڑی پر رکھ کے دو فائر کیے۔ پاؤل دوسری سانس لیے بغیر زمیں بوس ہو گیا۔ پلان بی، پلان اسے سے بہتر تھا۔ مارتھا نے گن بائیں جانب پڑوس کے سبزہ زار میں اچھال دی۔ پاؤل کا خاکہ پولیس کے پاس تھا جو ڈاکٹر نے بتایا تھا اور پاؤل یہاں مردہ حالت میں پڑا تھا۔ گن جو اصل کرائم سین پر اٹھارہ ماہ قبل استعمال ہوئی تھی، اسی گن سے پاؤل ہلاک ہوا۔ مطلوبہ آدمی اور گمشدہ گن برآمد ہو رہی تھی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ مونیکا مرڈر اور پاؤل کے قتل میں ڈاکٹر سیڈمین یا راشیل یا دونوں کا ہاتھ ہے۔ یہاں کیس کلوز ہو جاتا۔ آگے مقدمے میں کیا ہوتا وہ مارتھا کا دردِ سر نہیں تھا۔

مارتھا نے ڈرائیووے کی طرف سے ٹائروں کی چیخ سنی۔ اس نے پھرتی سے پاؤل کی جیبوں کی تلاشی لی۔ حسبِ توقع جیبوں میں کچھ نہ تھا۔ چند ہزار ڈالرز جو پاؤل کو دیے گئے تھے وہ ایک جیب میں موجود تھے۔ مارتھا کھڑی ہو گئی۔

”ایف بی آئی ہتھیار پھینک دو۔“

”لعنت ہے۔ آواز نسوانی تھی۔ مارتھا نے بے دھڑک آواز کی سمت فائر کیا۔ جوابی گولیاں اس کی پناہ گاہ پر برسیں۔ وہ زمین سے چپک گئی۔ کیا کرنا چاہیے؟ ہاتھ دراز کر کے اس نے وکٹ گیٹ کا بولٹ گرایا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ چیخی۔ ”میں باہر آ رہی ہوں۔“ وہ اچھلی۔ ساتھ ہی سیمی آٹومیٹک سے گولیاں برسائیں۔ دھماکوں کی گونج میں اسے اپنے خلاف کارروائی کا پتا نہیں چلا۔ وہ وکٹ گیٹ سے گزر کے بے تحاشا بھاگی۔ سو گز کے فاصلے پر ٹیشی اس کا منتظر تھا۔ ٹیشی کی کار دو بلاک دور تھی۔ جب وہ ہائی وے کے قریب پہنچے تو مارتھا کو پاؤل کے سیل فون کا خیال آیا۔

☆☆☆

مزید گولیاں چلنے پر میں بدحواسی میں گاڑی سے نکلا۔ پھر خود پر قابو پا کے واپس بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کر کے کار آگے بڑھائی۔ گھر کے فرنٹ لان کی کیاریاں روندتا ہوا میں کرشی فیملی کے لان میں چلا گیا۔ ہیڈ لائٹس اور گھروں کی روشنیوں نے کافی اُجالا کر دیا تھا لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اوپر تلے پھر گولیاں برسیں۔ گاڑی ریورس کر کے میں اپنے گھر کے بیک یارڈ کی طرف آیا۔ راشیل گن بدست تنہا کھڑی تھی۔ اس کے قدموں میں اسپورٹس جیکٹ والا لیٹا تھا۔ راشیل کے اشارے پر میں گاڑی سے باہر آیا۔ جیکٹ والے کی ٹوپی نظر نہیں آ رہی تھی۔

”تم نے......؟“

''نہیں میں نے نہیں مارا۔ اس کے ساتھی اسے ختم کر کے نکل گئے۔'' راشیل نے جواب دیا۔ میں حالت اشتعال میں لاش کو گھور رہا تھا۔

''کون ہے یہ؟ دونوں مرتبہ یہی تاوان وصول کرنے آیا تھا۔''

''کوئی شناخت نہیں ہے۔ اس کی جیبوں میں ڈالرز کے سوا کچھ نہیں۔'' راشیل نے جواب دیا۔

میں لاش کو لات مارنا چاہتا تھا۔ اسے جھنجوڑ کے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میری بیٹی کے ساتھ کیا کیا گیا؟ میرا اور اس کا کیا واسطہ تھا؟ میں اس کے خون آلود چہرے کو گھور رہا تھا۔ اس کا آدھا سر اڑ گیا تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑیں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں نے انگلیاں اس کے جبڑے پر رکھ کے منہ مزید کھول دیا۔

''مارک کیا کر رہے ہو؟''

''یہ لوگ ہمیشہ ہر معاملے میں ازحد محتاط رہے تھے۔ میں متعجب تھا کہ اس آدمی نے اپنی اصل شکل کیوں دکھائی۔ پہلے خیال تھا کہ اس نے میک اپ کیا ہوگا لیکن ثابت ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔'' میں نے راشیل کو دیکھا۔ ''یہ غفلت کیونکر ممکن ہے؟''

راشیل کے تاثرات بدل گئے۔ ''اس لیے کہ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔''

''اس کے دانت دیکھو۔''

''کیا مطلب؟'' راشیل نے ایک گھٹنا میرے قریب ٹکایا۔

''دانتوں کے کراؤن سونے کے نہیں ہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''یہ دائیں جانب بالائی ڈاڑھ اور یہ زیریں دانت دیکھو...... المونیم کیپ ہے۔ دانت پر چڑھاؤ اور پلاس سے دبا دو۔ یہاں امریکا میں ڈینٹسٹ ایسا نہیں کرتے۔ اور سیز دوران سرجری اس طرح کا کام میں نے بہت دیکھا ہے۔''

''تم کہنا چاہ رہے ہو کہ یہ غیر ملکی ہے؟''

''ہاں، شرطیہ اس کا تعلق سابقہ سویت بلاک سے ہے۔ غالباً بلقانی خطے سے...... شاید رومانیہ، سربیا، البانیہ، کوسوو......'' میں نے کہا۔

''یعنی، NCIC (نیشنل کرائم انفارمیشن سینٹر) میں چہرے کی شناخت ہو گی نہ انگلیوں کے نشانات ملیں گے۔ فائلز اور کمپیوٹرز خالی ہوں گے۔ جب تک کوئی خود سامنے آ کے نہ بتائے اس آدمی کی شناخت ممکن نہیں اسی لیے انہوں نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔''

دور سے پولیس سائرن کی آواز ابھری۔

''مارک یہ فیصلے کا وقت ہے۔ ہم یہاں پائے گئے تو جیل میں ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ شوٹ کرنے والے ابھی یہ جانتے ہیں۔ میں نہیں کہتی کہ ہم وضاحت نہیں کر سکیں گے لیکن اس میں وقت لگے گا اور کافی دھول اڑے گی۔''

''کیا کریں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہمیں پھنسایا گیا ہے۔ کیولاگر دریافت ہو گیا تھا لیکن اول اول انہوں نے ہمیں ختم کرنے کی کوشش اور ناکامی پر پلان بی پر عمل کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ کیولاگر انہیں کیسے ملا؟''

''انہوں نے دونوں مرتبہ اپنے مخبر کی بات کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''پہلی مرتبہ پولیس کو میں نے بتایا تھا لیکن دوسری مرتبہ......؟''

''اب اس پر یقین کرنا پڑے گا۔ کوئی اندرون خانہ ہے۔'' راشیل نے کہا۔

ہم مضروب کار کی طرف بڑھے۔ میں نے ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ اس کے کان کے قریب ابھی تک خون رس رہا تھا۔ آنکھ بھی بری طرح متورم تھی۔ میرا دل پھڑ پھڑایا۔ میں نے اسے جان لیوا خطرات سے دوچار کیا تھا۔

''اگر ہم بھاگتے ہیں تو مجرم کہلائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے پروا نہیں ہے۔ میرے پاس کھونے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا ہے۔''

اس نے نرمی سے کہا۔ ''بچا میرے پاس بھی کچھ نہیں......''

''تمہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔'' میری آواز میں تفکر تھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''تمہیں ضرورت نہیں ہے؟''

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ میں خاموش رہا۔ حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ ہم کار میں بیٹھ گئے۔ میں نے نکلنے کے لیے ووڈ لینڈ روڈ کا راستہ چنا۔ میرے خیالات منتشر ہونے لگے۔ تارا کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ معلوم کرنے کے لیے ایک امکان پیدا ہوا تھا لیکن غیر ملکی شوٹر کی موت نے ہمیں بند گلی میں پہنچا دیا تھا۔ مزید برآں ہم مشکوک بھی ہو گئے تھے۔

''کیا ہم فرار ہو رہے ہیں؟'' راشیل نے سوال کیا۔

''میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ ہمارے پاس کوئی کلیو نہیں ہے۔''

راشیل کے چہرے پر شرارت نمودار ہوئی۔ اس کا ہاتھ جیب میں گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں سیل فون تھا۔ وہ میرا تھا نہ اس کا۔

''شاید یہ کلیو ہے۔'' راشیل نے جواب دیا۔

تارا کہاں پر تھی۔ زندہ تھی یا مردہ۔ ایک باپ کی تلاش و جدوجہد کی داستان اگلے ماہ پڑھیں

**عمر عبداللہ** کا شمار نوآموز لکھاریوں میں ہوتا ہے... مگر اپنے انداز فکر... اور گہرائی کی بدولت بہت جلد اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں... ان کی تحریریں قارئین کو متاثر کرتی ہیں... اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے...

# گواہی

کچھ باتیں... کچھ واقعات وقت کے ساتھ سمٹ کر کہیں کھو جاتے ہیں... یہ کچھ یادیں اور باتیں بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں... ان کو بھلائے نہ رکھنے میں ہی بھلائی ہوتی ہے...

اس کردار کا معما جس کی گواہی کے لیے غیب سے انتظام ہو چکا تھا......

چاند سے خالی آسمان کی سیاہ چادر پر ٹکے گنے چُنے چند تاروں میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ اپنی روشنی سے گھور تاریکی کا سینہ چاک کر سکتے۔ اس کامل تاریکی میں ایک شخص قبروں کے درمیان موجود خالی جگہ پر آسن جمائے موٹے موٹے منکوں والی مالا کو اپنی بھدی انگلیوں کے درمیان جنبش دیتا منہ ہی منہ میں تیز تیز کچھ پڑھ رہا تھا۔ سرد موسم کے باوجود اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا اور وہ اطمینان سے اکیلے بیٹھا تھا جیسے موسم کی سختی سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور ماحول سے اس کا رابطہ صرف اس حد تک تھا کہ وہ وقفے وقفے سے اپنے سامنے پڑی نامعلوم شے کی ڈھیری میں سے چند دانے اٹھا کر اس گڑوی میں جھونک دیتا تھا جس کے پیندے میں انگارے دہک رہے تھے۔ دانے انگاروں پر گرتے تھے تو فضا میں ایک تیز ناگوار بُو اٹھتی تھی لیکن اسے اس بُو سے بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ پوری مستقل مزاجی سے اپنے عمل میں مصروف تھا۔

حقیقتاً ڈھانچے نما جسم رکھنے والے اس ننگ دھڑنگ شخص کو اس تاریکی اور بُو کے ساتھ دیکھنا ایک خوفناک تجربہ ہوتا لیکن اس ویران قبرستان میں یہ تجربہ کرنے کے لیے کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ آوارہ کتے جو سردی سے بچنے کے لیے کسی ٹوٹی قبر میں پناہ لینے کے لیے آبیٹھتے تھے۔ آج انہوں نے بھی وہاں سے دور رہنا مناسب سمجھا تھا۔ وہ قبرستان کے احاطے سے دور کہیں نہ کہیں دبکے کبھی کبھار بھونکتے تھے اور پھر یوں خاموش ہوجاتے جیسے کسی انجان طاقت کے اپنی طرف متوجہ ہوجانے کے اندیشے میں مبتلا ہوں۔

قبرستان کے لیے کوئی گورکن نہیں تھا۔ ڈیڑھ پونے دو ہزار کی آبادی والے اس گاؤں میں پیشہ ور گورکن کی کبھی حاجت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ جب کبھی گاؤں کا کوئی مکین فوت ہوتا، گاؤں کے محنتی اور چست جوان پھاوڑے اور بیلچے اٹھائے قبرستان میں پہنچ جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے مرحوم کے لیے قبر تیار ہوجاتی تھی یوں اس سادہ طرز زندگی والے گاؤں میں جہاں آج بھی رات دیر گئے تک جاگنے کا رواج نہیں پڑا تھا۔ مرنے پر کم از کم اس ایک خرچے سے نجات حاصل تھی۔

''آرہی ہے، وہ آرہی ہے۔'' مالا جپتے لنگوٹی پوش نے ہونٹوں پر جاری وِرد کو روکے بغیر دل ہی دل میں خود سے کہا اور سماعت چھن چھن کی اس آواز پر مرکوز کرلی جو تھی تو بہت مدھم لیکن وہ آہستہ آہستہ اسے قریب آتا محسوس کرسکتا تھا۔

''تیرے لیے میں نے کتنے کشٹ اٹھائے ہیں جانِ من۔ نگری نگری پھرا ہوں۔ سادھوؤں، جوگیوں اور پروہتوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ فاقے کاٹ کاٹ کر اپنے جسم کو ہڈیوں کا پنجر بناڈالا ہے۔ صرف اور صرف تیری دید کی چاہت میں، میں نے خود کو کیا سے کیا کرلیا ہے۔ میری اس تپسیا کو یاد رکھنا اور آج مجھے اس کا صلہ دے جانا۔'' اس

کے ہونٹ چند مخصوص الفاظ کی مستقل ادائیگی سے غافل نہیں تھے لیکن دماغ کا ایک حصہ مسلسل سوچنے میں معروف تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ساتھ چھن چھن کی آوازیں تیز ہوتی جارہی تھیں اور یہ تیز ہوتی آوازیں اس کے فاقہ زدہ بدن میں سُرور کی لہریں دوڑا رہی تھیں۔

''کہتے ہیں جب کسی کو پوری لگن سے چاہو تو وہ پھر ایک دن اپنا ہو ہی جاتا ہے۔ تو بھی آج میری ہونے آرہی ہے۔'' وہ محسوس کرسکتا تھا کہ ہوا اب پہلے جتنی سرد نہیں رہی ہے اور اب وہ اس کے عریاں بدن سے ٹکراتی ہے تو ایک تمازت سی اس کے اندر منتقل ہونے لگتی ہے۔ یہ گرمی، یہ حدت اس کی آمد کی ایک اور نشانی تھی۔ اس کی چھن چھن، اس کی گرمی...... زمانے میں کون تھا جو اِن دونشانیوں سے انکار کر سکتا تھا اور کون تھا جسے اس کا آنا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن گاؤں کے آوارہ کتّوں کو جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اس کی وہاں موجودگی کو محسوس کر کے اتنی بُری طرح سہم گئے تھے کہ کبھی کبھی کا بھونکنا بھی موقوف کردیا تھا۔

''میں آگئی ہوں میرے آقا۔'' چھنچھناہٹ اتنی تیز ہو گئی تھی کہ اسے اپنی سماعتیں جواب دیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ قریب تھا کہ وہ بوکھلا کر دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر ہی رکھ لیتا کہ ایک رسیلی آواز نے سماعتوں میں اتر کر پچھلی ساری اذیت سمیٹ لی اور اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر خودبخود ہی ایک مسکراہٹ نمودار ہوگئی لیکن اس مسکراہٹ کے باوجود وہ ان مخصوص الفاظ کے جاپ سے نہیں رکا تھا جو اسے اپنے پاس بلانے کے لیے نجانے کتنے دنوں سے پڑھتا چلا آرہا تھا۔ جاپ کے دوران گڑوی میں دانے جھونکنے کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا جس کے باعث بُو نہایت ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی لیکن وہ یوں خوش باش بیٹھا تھا کہ گویا کسی پھولوں سے مہکتے باغ میں بیٹھا ہو۔

''آپ کی تپسیّا سَپھل ہوئی میرے آقا۔ آنکھیں کھولیے اور اپنی چاہت کا دیدار کیجیے۔'' شیریں لہجے میں کی جانے والی اس درخواست پر اس نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ اسے بتایا اور ڈرایا گیا تھا کہ آنکھیں کھولنے پر کوئی بہت ہی بھیانک اور دل کو دہلا دینے والا منظر اس کے سامنے آسکتا ہے اس لیے وہ پکارے جانے پر دل کو مضبوط کر کے آنکھیں کھولے لیکن یہاں تو سب کچھ خلافِ توقع تھا۔ اس کے سامنے سنہری روشنیوں میں لپٹا ایک ایسا حسین وجود کھڑا تھا جس کے نقوش اس کی خیرہ کن روشنی کے باعث نظر نہیں آتے تھے لیکن جس کے حُسن سے انکار ممکن ہی نہیں تھا۔

''مجھے اپنی بانہوں میں لے لیجیے میرے آقا۔'' اس سنہری روشنیوں میں لپٹے وجود نے دونوں بازو وا کر کے ایسی چاہت اور وارفتگی سے پکارا کہ اس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا ممکن نہیں رہا۔

''ایک، دو، تین......'' اور تیسرا قدم اسے اس حصار سے باہر لے گیا جس کے بارے میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ قیامت بھی آجائے تو اسے پار نہ کرنا۔ وہ جو قیامت کے بھیانک روپ میں آنے کی توقع رکھتا تھا، اسے حسین فتنے کی شکل میں شناخت نہ کرسکا اور سپردگی کے عالم میں اس کی بانہوں میں سما گیا۔ اگلا لمحہ سچ مچ اس کے لیے قیامت کا تھا۔ اس کا پورا جسم اس طرح جل اٹھا تھا جیسے اسے تیزاب سے بھرے ڈرم میں پھینک دیا گیا ہو لیکن اتنی اذیت کے باوجود وہ چیخنے سے قاصر تھا۔ جاپ کے دوران مسلسل متحرک رہنے والے اس کے ہونٹ ایک دوسرے میں بُری طرح سے پیوست ہو کر بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ اب وہ زمین پر پڑا اذیت سے لوٹیں لگا رہا تھا۔

☆☆☆

قورمہ بھونے جانے کی تیز بُو اس چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں یوں رچ بس گئی تھی کہ کمرے کا دروازہ بند ہونے کے باوجود چارپائی پر پڑی اس تیرہ چودہ سالہ لڑکی کے دماغ میں گھسی جارہی تھی اور وہ اپنی ابکائیاں روکنے کی کوشش میں بُری طرح نڈھال تھی۔ بیالیس سالہ فیروزہ دروازہ کھول کر کسی کام سے اندر آئی تو لڑکی کی حالت اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''وہ کچی املی پڑی ہے تیرے سرہانے۔ تھوڑی سی منہ میں ڈال کر چوس لے تو متلی رک جائے گی۔'' تیز لہجے میں ہدایت دے کر وہ کمرے میں رکھی لکڑی کی بوسیدہ الماری کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

''کم بخت کی حالت بھی تو ایسی ہے۔ اب ایسی حالت میں گوشت کی بُو سے جی تو متلائے گا نا۔'' الماری میں سے مطلوبہ شے نکالتے ہوئے اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر گویا خود کو اطلاع دی اور الماری کا پٹ بند کر کے لڑکی پر نظر ڈالے بغیر باہر نکل گئی۔ لڑکی نے چاہا کہ اس کی ہدایت پر عمل کر سکے لیکن اس کے اندر اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ منہ میں کچھ ڈال سکے چنانچہ یونہی نڈھال سی تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ دو تین ماہ سے اس کا کھانا پینا یونہی حرام ہو گیا تھا اور وہ مشکل

سے ہی چند لقمے اپنے حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب رہی تھی جنہوں نے اس کے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھا ہوا تھا لیکن کل رات سے تو ایک کھیل بھی اُڑ کر اس کے منہ میں نہیں گئی تھی۔ صرف چند گھونٹ پانی ہی تھا جو ان پندرہ سولہ گھنٹوں میں وہ پی سکی تھی اور وہ پانی بھی الٹیوں کی شکل میں اس کے جسم سے باہر نکل گیا تھا۔ غذا اور پانی سے محروم اس کے جسم میں اب اُگلنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا اس لیے صبح سے وہ بس خالی ابکائیاں لے رہی تھی۔

''شوکت...... اوئے شوکے...... باہر آ یار۔''

دروازے پر ہونے والی دستک کے ساتھ لگائی جانے والی پکار نے اسے اتنا متاثر کیا کہ وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔

''نہیں ہے شوکت گھر میں۔ چل دفع ہو یہاں سے۔'' اس نے وہیں چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اپنی ماں فیروزہ بی بی کی آواز سنی اور قدموں کی چاپ سن کر اندازہ لگایا کہ وہ دروازے کی طرف جارہی ہے۔

''کچھ پتا ہے بھرجائی کہ کدھر گیا ہے؟ بچ بڑا ضروری کام تھا اُس سے۔'' فیروزہ سے لجاجت سے سوال کرنے والے کی آواز کو وہ اس گھر کے ایک مکین کی حیثیت سے شناخت کرسکتی تھی۔ وہ شوکت کا قریبی دوست فدا حسین تھا۔

''کیا ہوگا تیرے ہی جیسے کسی آوارہ کے پاس بیٹھ کر سوٹے لگانے۔ جا کراچی میں ڈھونڈ۔ یہاں آکر دروازہ بجانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' فیروزہ نے سخت دل جلے لہجے میں اسے جواب دیا اور سرپٹر چلتی ایک بار پھر باورچی خانے میں گھس گئی۔ برتنوں کے کھٹکنے اور ڈوئی کے چلنے کی آوازیں سنتی وہ اپنی ماں کے متعلق سوچتی ہوئی ایک بار پھر بستر پر لیٹ گئی۔

اس کی ماں فیروزہ بی بی نے زندگی میں خوشی کے بہت کم دن دیکھے تھے۔ ان کے طبقے کے لوگوں کی زندگیوں میں یوں بھی خوشیاں بس اتنی تعداد میں ہوتی ہیں کہ وہ چاہیں تو انہیں انگلی کی پوروں پر آرام سے گن لیں۔ فیروزہ کی قسمت میں خوشیوں کی تعداد اس لیے مزید محدود ہوگئی تھی کہ اس نے شادی کے پہلے ہی برس بیٹی کو جنم دے کر اپنی ساس کو ناراض کردیا تھا۔ ساس کی ناراضی کے نتیجے میں اپنے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کو اگر فیروزہ نے اپنی زندگی کا کڑوا ترین وقت سمجھا تھا تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ زندگی کا آنے والا ہر دن اس کے لیے ایک نئی آزمائش لے کر آرہا ہے۔ بیٹی کے بعد دو سال کے عرصے میں ضائع ہونے والے تین حمل جہاں ایک طرف اسے جسمانی طور پر کمزور کر گئے تو دوسری طرف اس کی ساس کا رویہ بھی اس سے سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ میاں جو ابتدا میں اس کا دم بھرتا تھا، وہ بھی بیزار بیزار سا رہنے لگا۔ فیروزہ کس کے سامنے شکایت کرتی سو تقدیر کا لکھا جان کر سب کچھ سہتی رہی لیکن اس کی تقدیر میں اس سے بھی زیادہ سختی لکھی تھی۔

وہ اس کی اکلوتی بیٹی مہرالنسا کی چھٹی سالگرہ کا دن تھا جب صبح کام پر جانے والا اس کا شوہر زندہ گھر واپس نہ آسکا۔ ساس نے غم سے نڈھال بے آسرا فیروزہ اور اس کی بیٹی کو منحوس قرار دیتے ہوئے عدت کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی گھر سے نکال دیا۔ میکے کے نام پر دو شادی شدہ بھائی تھے جو ایک چھوٹے سے گھر میں تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔ دنیاداری کی خاطر انہیں فیروزہ اور اس کی بیٹی کو اپنے گھر میں جگہ دینی پڑی لیکن دل میں کسی کے بھی جگہ نہیں تھی۔ بیوگی کے وہ تین برس اپنے بھائیوں کے آنگن میں فیروزہ نے کس کڑی دھوپ کو سہتے ہوئے گزارے وہ بس خود ہی جانتی تھی۔ تب ہی تو ایک ہمسائی کی وساطت سے آنے والے شوکت عرف شوکے کے رشتے کو نعمت جان کر قبول کرلیا۔

یہ نعمت کتنی بڑی زحمت تھی اس حقیقت کا علم فیروزہ کو نکاح کے ڈھائی تین ماہ میں ہی ہوگیا۔ نشئی اور آوارہ مزاج شوکے کے گھر وہ روکھی سوکھی کے آسرے سے بھی گئی لیکن گلے میں ڈالا گیا ڈھول اتارنے کی گنجائش نہ پاکر گھر سی اور میدان عمل میں اتر گئی۔ امراء کے گھروں میں جھاڑو برتن اور کپڑے دھونے کا کام آسان نہیں تھا لیکن جب ان کی جھوٹن سے پیٹ بھرنے اور اترن سے تن ڈھانپنے کا سامان ہونے کے ساتھ ساتھ چند نوٹوں کا بھی آسرا ہوا تو اس نے اس زندگی سے سمجھوتا کرلیا۔ سمجھوتے کی اس زندگی میں شوکے کا گاہے گاہے رقم چھین کرلے جانا اور وقت بے وقت گالیاں دینا بھی شامل تھا لیکن فیروزہ کو لگتا تھا کہ اب وہ بے حس ہوچکی ہے۔ ایک چھت اور مرد کے نام کے آسرے پر اس ذلت کو سہتے ہوئے آرام سے زندگی گزار سکتی ہے۔

''میں جارہی ہوں مہرو! باہر سے دروازے کو تالا مار کر جاؤں گی۔ تو چپ کرکے پڑی رہنا۔ کسی کو پتا نہ لگے کہ تو گھر میں ہے۔ میں عشا سے پہلے پہلے لوٹ کر آجاؤں گی۔'' ماں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ اردگرد کے ماحول سے بےخبر ہوگئی تھی جب ہی اس کی آواز سن کر چونک گئی۔ فیروزہ صاف ستھرے لباس میں جسم کے گرد چادر لپیٹے ایک بڑا سا

کپڑے کا تھیلا اٹھائے دروازے میں کھڑی تھی۔ تھیلے میں رکھی شے نظر نہ آتی تھی لیکن اس میں سے آتی قورمے کی بُو خود اپنا تعارف کروانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے یونہی ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر ماں کی ہدایات پر عمل کی یقین دہانی کروائی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ محض تیرہ چودہ سال کی عمر میں اس نے زندگی کے وہ رنگ دیکھ لیے تھے کہ اب ان آنکھوں کو کچھ بھی دیکھنے کی چاہ نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

''کہا بھی تھا کہ مایا دیوی کو بس میں کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے لیکن اس پر ایک ہی ضد سوار تھی کہ اسے اپنا بنانا ہے۔ دیکھ لیا نا انجام۔ کر بیٹھا خود کو برباد۔ مجھے تو حیرت ہے کہ زندہ کیسے بچ گیا بدبخت۔'' لمبی جٹاؤں اور سرخ انگارا آنکھوں والا وہ شخص اپنے سامنے سر جھکائے بیٹھی چادر میں لپٹی دُبلی پتلی عورت کی آمد کا مقصد جان کر بھڑک گیا تھا اور غصے سے بولتا جا رہا تھا۔

''وہ بہت تکلیف میں ہے۔ اُسے اس تکلیف سے نکالنے کے لیے کوئی حل بتائیں۔'' عورت کے تصور میں اپنے شوہر کا زخموں اور چھالوں سے بھرا بدن گھوم رہا تھا اس لیے وہ اس شخص کو سخت ناپسند کرنے کے باوجود اس سے ملتجی لہجے میں مخاطب تھی۔ یہاں آنے سے قبل اس نے مولوی صاحب کو مدد کے لیے بلایا تھا لیکن مولوی صاحب نے نادر کی حالت دیکھ کر کان پکڑ لیے تھے۔

''نہ بی بی نہ، یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ میں اللہ کا معمولی بندہ اس کے عذاب میں جکڑے بندے کے لیے کچھ کرنے کی جرأت نہیں رکھتا۔'' وہ نادر کے زخموں اور چھالوں سے بہتی پیپ کی بُو سے نجات حاصل کرنے کے لیے ناک پر کپڑا رکھتے ہوئے بولے تھے اور جاتے جاتے اسے ایک مشورہ دے گئے تھے۔

''اس کے علاج کے لیے اس کے گرو سے ہی رابطہ کرو۔ اس کا عمل الٹ گیا ہے اب اس کا گرو ہی اس کا کوئی توڑ کر سکتا ہے۔''

وہ اس مشورے پر عمل نہ کرتی لیکن نادر کی تکلیف نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ اب بھی وہ اس کے گرو کے سامنے کھڑی دل ہی دل میں نادر سے شکوہ کناں تھی کہ اس نے اس کی کیوں نہ سنی اور لالچ میں اندھا ہو کر ایک ایسے خطرناک کام میں پڑ گیا جس کے انجام سے وہ پہلے ہی لرزتی رہی تھی۔

''حل ہے تو سہی پر بہت مشکل ہے۔ کیا تو اس کی خاطر اتنا مشکل کام کر سکے گی؟'' گرو نے اپنی انگارا آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''کرلوں گی۔ کیوں نہیں کروں گی؟ آخر وہ میرے سر کا تاج ہے۔'' اس نے سسکی لیتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

نادر سے اس کی محبت ہر شک سے بالاتر تھی۔ وہ بھی اس پر جان چھڑکتا تھا۔ یہاں تک کہ شادی کے پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی اولاد نہ ہونے کے باوجود اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن سال ڈیڑھ سال سے وہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا اور کچھ مشکوک سی حرکتیں کرنے لگا تھا۔ اس کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر پہلے پہل تو اسے شک ہوا تھا کہ کہیں وہ نشے کی لت میں تو مبتلا نہیں ہو گیا لیکن پھر ٹوہ لینے پر جو انکشاف ہوا تھا، اس نے اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔

''تیرے گھر والے کی زندگی بچنے کی بس ایک ہی راہ ہے۔ تجھے تین دن تک......'' سرخ آنکھوں والے نے اسے جو عمل بتایا اسے سن کر اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔

''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ ہکلاتی ہوئی بمشکل کچھ بولنے کے لائق ہو سکی۔

''یہ نہیں ہو سکتا تو تیرا گھر والا بھی نہیں بچ سکتا۔'' اس نے بے نیازی دکھائی۔

''کچھ اور...... کوئی اور حل......؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں التجا کی۔

''کہہ دیا نا کہ بس یہی ایک حل ہے۔ بچانا چاہتی ہے تو بچا لے اپنے گھر والے کو۔ وہ جو مایا دیوی کے وار سے خوش قسمتی سے بچ گیا ہے، تیرے انکار کے بعد مر جائے گا۔ بس تین دن...... صرف تین دن کی مہلت ہے اُس کے پاس۔ ان تین دنوں کے اندر علاج نہ ہوا تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔''

گھر لوٹتے سمے اس کے کانوں میں مسلسل نادر کے گرو کی آواز گونج رہی تھی لیکن دل وہ بھی ماننے پر راضی نہیں تھا جو اس سے کہا گیا تھا۔

''تو نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا نادر! تجھے بچانا اوکھا کام ہے اور تجھے مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی میں۔'' وہ مسلسل روتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی تھی۔

نادر کی سرگرمیوں کا علم ہونے کے بعد رونا اس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ نادر پر امیر بننے کا جو جنون سوار ہوا تھا، اس نے اسے اچھے بُرے اور حلال حرام کی تمیز بھلا دی تھی۔ اس کی ہر بات سننے اور ماننے والا، یہ ایک بات کسی طور

مانے کو راضی نہیں تھا۔ اس کی ہٹ دھرمی سے خوف زدہ اور مایوس ہو کر وہ اپنے رب کی طرف ملتفت ہو گئی تھی اور اسی سے کوئی بہتر راہ نکالنے کی دعا مانگتی رہتی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے تو اس کا دل بہت ہی بے قرار تھا۔ نادر کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر گھر سے غائب تھا اور وہ ساری، ساری رات اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے کاٹتی تھی۔ گزری ہوئی شب بھی اس نے بنا پلک جھپکائے جانماز پر گزاری تھی لیکن صبح دم جب گاؤں کے کچھ لوگوں نے کمبل میں لپٹے زخم زخم نادر کو گھر کی دہلیز پر لا کر چھوڑا تو اسے لگا تھا اس کی ساری دعائیں رائگاں چلی گئی ہیں۔

"تو نے مجھے مار ڈالا نادر...... کیا تھا جو تھوڑی میں گزارا کر لیتا۔ کب مانگے تھے میں نے تجھ سے سونے چاندی کے ڈھیر......" گھر پہنچ کر اس کی نظریں نادر کی منتظر نظروں سے ٹکرائیں تو وہ وہیں گھٹنوں کے بل گر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"کیا کہا گرو نے؟" جب وہ رو، رو کر تھکنے کے بعد خود ہی چپ ہو گئی تو نادر نے اپنی کراہ کو دباتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ تیرا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ......" اس نے گرو کا بتایا ہوا حل اس کے گوش گزار کیا۔ سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ اپنے جنون میں اس نے اب تک کئی غلط کام کیے تھے لیکن مجوزہ حل سن کر وہ بھی ساکت رہ گیا تھا۔

"میں مانتی ہوں کہ میں بہت نیک عورت نہیں ہوں۔ عبادتوں میں بھی بھول چوک کر جاتی ہوں لیکن میں اتنی بری عورت بھی نہیں ہوں نادر کہ تجھے بچانے کے لیے اتنا بڑا گناہ کر جاؤں۔" اس کے سامنے اپنی معذوری ظاہر کرنے کے بعد وہ یوں گھٹنوں میں منہ دے کر رونے لگی جیسے ابھی سے اس کی موت کا سوگ منانا شروع کر دیا ہو۔ درد سے بے حال نادر کے لیے یہ منظر دیکھنا مزید اذیت ناک تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی پیار کرنے والی بیوی اسے بچانے کی کوشش نہ کر سکنے کے باعث شدید دکھ میں جلتا ہے۔ اندرونی اور بیرونی درد میں جلتا وہ اپنی جگہ پڑا خاموشی سے اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ پچھلی پوری شب کی جاگی ہوئی تھی اور اس سے پہلے بھی اسے ہفتہ بھر سکون نصیب نہیں ہوا تھا چنانچہ اب تھکی ہاری اور نڈھال سی روتے روتے بستر پر گری تو کب اور کیسے آنکھ لگ گئی خود اسے بھی خبر نہیں ہو سکی۔ اس کی طرف متوجہ نادر نے اس کے سوتے میں مزید معصوم اور بے ریا نظر آنے والے چہرے کو دیکھا تو اسے اس پر شدت سے ترس آیا اور وہ کچھ سوچ کر اپنی کراہوں کو دباتا ہوا آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ کچھ دیر میں وہ اسے ہر امتحان سے آزاد کر کے وہاں سے جا رہا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے جسم کو مکمل طور پر ڈھانپ لینے والے کمبل کے سوا کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔

☆☆☆

"بس یہیں روک دو۔" فیروزہ نے تیزی سے گہری ہوتی شام پر ایک نظر ڈالی اور تحکم بھرے لہجے میں رکشا ڈرائیور سے بولی۔

"منت کی روٹی دینے آئی ہو اماں؟" رکشا ڈرائیور نے مزار کے احاطے کے باہر دور تک پھیلے سائلین کی طرف ایک نظر ڈالی اور فیروزہ کو رکشے سے دونوں تھیلے اتار کر نیچے رکھتا دیکھ کر بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھا۔ فیروزہ نے نانوں سے بھرا ایک تھیلا اس کے سامنے ہی ایک تندور سے خرید کر رکشے میں رکھا تھا جبکہ قورمے کی خوشبو کا پتا دیتا تھیلا وہ پہلے ہی سے اپنے ساتھ لیے اسے اسٹاپ پر کھڑی ملی تھی۔

"صدقے کی روٹی ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کا صدقہ اتارا ہے۔" فیروزہ نے سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔

"آپ کہیں تو میں آپ کی مدد کر دوں۔ اکیلے یہ کھانا تقسیم کرنے میں آپ کو مشکل پیش آسکتی ہے۔" رکشے والے نے اسے خلوص سے پیشکش کی جسے سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر گہری ہوتی شام کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اپنے پھرتیلے پن کے باوجود اسے اتنا بہت سا کام سمیٹنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا اس لیے وہ اپنے حساب سے قدرے تاخیر سے یہاں پہنچی تھی اور اسے امید نہیں تھی کہ وہ مہرو کو دیے ہوئے وقت کے مطابق گھر واپس پہنچ سکے گی۔

"اگر واپسی کے لیے رکشے کی ضرورت ہو تو بتا دو اماں۔ میں کوئی اور سواری نہیں پکڑوں گا۔" اس کے ہاتھوں سے وہ دونوں تھیلے لیتے ہوئے رکشے والے نے ایک اور پیشکش کی۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" فیروزہ نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا۔ آتے وقت وزن کے باعث اسے رکشا کرنا پڑا تھا لیکن واپسی میں وہ بس سے واپس جا کر چار پیسے بچانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" رکشے والے نے

اصرار نہیں کیا اور قطار میں بیٹھے سائلین کی طرف قدم بڑھائے۔

"ذرا رکو۔" فیروزہ نے اسے آواز دی اور اس کے قدم رک جانے پر ایک تھیلے میں سے پلاسٹک کی تھیلی میں پیک قورمے کا پیکٹ اور دوسری سے نان نکال کر اس فقیر کی طرف بڑھی جو خود کو کمبل میں لپیٹے باقی سب سے الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ لو بابا! کھانا لے لو۔" اس کے قریب کھڑے ہونے پر بدبو کا ایک بھبکا فیروزہ کے نتھنوں سے ٹکرایا لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹی اور اس کمبل پوش کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے رکھا۔ کمبل پوش نے بنا اپنا چہرہ ظاہر کیے بغیر ایک ہاتھ کمبل سے باہر نکالا، نان اور قورمے کا پیکٹ پکڑ کر ہاتھ پھرتی سے کمبل کے اندر واپس لے گیا لیکن اس مختصر سے عرصے میں بھی فیروزہ اس کے زخموں سے رستا پیپ اور خون دیکھ چکی تھی۔ اگر اب سے ایک دن قبل اس نے یہ کریہہ منظر دیکھا ہوتا تو اسے ابکائی آجاتی لیکن اب اس کی اپنی یادداشت میں اتنے کریہہ مناظر جمع ہو چکے تھے کہ اس ایک منظر سے زیادہ فرق نہیں پڑا اور وہ پلٹ کر اطمینان سے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔

☆☆☆

"جان سے پیاری فاخرہ! میں جانتا ہوں کہ میں نے تجھے بڑے دکھ دیے ہیں اس لیے تجھے میری اس بات پر اعتبار نہ آئے گا کہ میں نے ہمیشہ تجھ سے بہت محبت کی ہے اتنی محبت کہ میرا دل چاہتا تھا تجھے کسی شہزادی کی طرح عیش و آرام کی زندگی دوں۔ میری یہ خواہش کب جنون بنی مجھے خود بھی پتا نہیں چلا اور یہی جنون مجھے کھینچ کر گروجی تک لے گیا۔ گروجی نے مجھے جو دنیا دکھائی وہ بڑی انوکھی تھی۔ اس دنیا کے رنگوں میں کھو کر میں سب بُرا بھلا بھول گیا اور وہ کچھ کرتا چلا گیا جس کی مذہب اور معاشرہ دونوں اجازت نہیں دیتے۔ میں سوچتا تھا کہ بس ایک بار دولت مند ہو جاؤں تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے خود کو جس شیطانی چکر میں پھنسا لیا تھا، اس سے انسان کبھی نہیں نکل سکتا اور ساری زندگی شیطان کا پجاری بنا رہتا ہے۔

میں جس خطرناک عمل کے ذریعے مایا دیوی کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ بالکل آخری مرحلے میں ناکام ہو گیا اور مایا دیوی مجھے جل دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے میرا جو حال کیا، وہ تیرے سامنے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری تکلیف تجھے دکھ دے رہی ہے اور تو ایک امتحان میں مبتلا ہو چکی ہے۔ تجھے اس دکھ اور امتحان سے بچانے کے لیے میں گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس صرف تین دن کی مہلت ہے اور یہ تین دن میں اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔ تو بھی میرے لیے دعا کرنا اور تین دن بعد مجھے مرا ہوا مان کر اپنی عدت شروع کر دینا۔ میں دعا کروں گا کہ میرے بعد تجھے سہارا دینے والا کوئی اچھا آدمی مل جائے۔

تیرا گناہ گار، نادر

آخری جملے پڑھتے ہوئے اس کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ اسے تو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ تھک ہار کر سو گئی تھی یا غم سے نڈھال مدہوشی میں چلی گئی تھی کہ اسے نادر کے وہاں سے جانے کی خبر ہی نہیں ہو سکی۔ خبر تھی تو بس اتنی کہ آنکھ کھلی تو نادر اپنی چارپائی پر نہیں تھا اور ایک خط اس کے تکیے پر پڑا تھا۔

"تو نے ایسا کیوں کیا نادر؟ تو ایسے کیوں مجھے چھوڑ گیا؟" وہ ایسے چیخ چیخ کر روئی کہ دیوار پار سے ہمسائیاں گھبرا کر چلی آئیں۔

"چل اچھا ہوا تیری جان چھوٹی۔ کیسے خدمت کرتی تُو اس بدبو کی پوٹ کی اور مر جاتا تو اس کے کفن دفن کا انتظام کیسے کرتی۔ مولوی صاحب نے سب کو صاف بتا دیا ہے کہ کالا جادو کرنے والا کافر ہو جاتا ہے اور کافر کی نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جا سکتا ہے۔" نادر کے جانے کا احوال جاننے کے بعد ایک ہمسائی نے اس پر جو انکشاف کیا اس نے اسے سن کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد بھی ہمسائیاں جانے اس سے کیا کچھ کہتی رہیں لیکن اسے ایسی چپ لگی کہ پھر ایک لفظ نہ کہا۔ ہمسائیاں بیزار ہو کر خود ہی واپس لوٹ گئیں۔

"تو نے میری چاہت میں خود کو برباد کر کے مجھ پر بڑا قرض چڑھا دیا ہے نادر۔ مانا کہ میں تیری زندگی بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکی پر تجھے لاوارث مرنے کے لیے چھوڑنے والی بھی نہیں ہوں میں۔ تو جہاں بھی گیا ہے، میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گی۔" ایک عزم تھا جو اس دُبلی پتلی عورت کے اندر جاگا اور وہ ہر بات بھول کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ کچھ ضروری سامان کے ساتھ سر تا پیر چادر میں ڈھکی اس نادر کی تلاش میں روانہ ہو چکی تھی جو مولوی صاحب کے فتوے کے مطابق کافر ہو چکا تھا لیکن اس کا دل، اس کی محبت سے

کہیں ٹرین نہ نکل جائے!

انکاری ہونے کو تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

"جب بیاہ کر میرے گھر آئی تو کتنی سوہنی لگتی تھی۔ غربت میں بھی کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔ جو ملا شکر کر کے کھایا، جو پہنایا ہنس کر پہنا پھر بھی جانے کیوں میری خواہش تھی کہ اس کے لیے آسمان کے چاند تارے توڑ لاؤں اور اس خواہش میں، میں نے اسے پاتال میں دھکیل دیا۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میری پھول جیسی فاخرہ میرے کالے کرتوتوں پہ جلتی کڑھتی سال بھر میں کیسے کملا گئی ہے۔ میں یہی سوچتا رہا کہ جب اسے سر سے پیر تک سونے میں تول دوں گا اور دنیا کا ہر عیش و آرام اس کے پاس ہوگا تو وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح حسین ہو جائے گی لیکن میں غلط تھا۔ اس نمانی کی اصل دولت تو میں اور میری محبت تھی جس سے میں نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔" سر سے پیر تک کمبل اوڑھے وہ آج تیسرے دن بھی باقی فقیروں سے ہٹ کر اپنی مخصوص جگہ پر ڈیرا جمائے ہوئے تھا۔ اس کے بدن سے اٹھتی بُو کے باعث دیگر فقراء کو اس کا اپنے قریب بیٹھنا گوارا نہیں تھا اس لیے وہ سب سے الگ تھلگ مزار کے احاطے سے ذرا ہٹ کر پڑا رہتا تھا۔ یہاں پڑے پڑے وہ دن رات صرف دو کام کرتا تھا۔ ایک اپنے گناہ پر رب سے معافی مانگنے کا اور دوسرا فاخرہ کو یاد کر کے پچھتانے کا۔ توبہ اور پچھتاووں کے بیچ اس کے ہونٹوں سے نکلتی آہیں اس کے درد و اذیت کی غمازی کرتی تھیں۔ رحم دل زائرین اس پر ترس کھا کر اس کے سامنے سکے اور نوٹ ڈال جاتے تھے۔

وہ جو کبھی دولت کی چاہ میں اتنا اندھا ہو رہا تھا کہ رب کی ناراضی مول لینے سے بھی باز نہ آیا تھا اب اس کے لیے ان سکوں اور نوٹوں کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ موت کی دہلیز پر پڑا وہ اپنی ہر چاہ سے دست بردار ہو چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ دنیا کا کوئی ڈاکٹر، کوئی حکیم اس کے مرض کا علاج نہیں کر سکتا، اب اس کے لیے پیسا نام کی شے بے وقعت ہو چکی تھی۔ اپنے سامنے جمع ہوتی پیسوں کی اس چھوٹی سی ڈھیری کو دیکھ کر کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا کہ شاید یہ اس کے کفن دفن میں کام آجائے۔

"کیا کیا ہوگا اس نے میری چٹھی پڑھنے کے بعد؟ یقیناً بہت روئی ہوگی۔ بے چاری کا میرے سوا آگے پیچھے کوئی ہے بھی نہیں کہ میرے بعد اسے سہارا دے دے۔" مسلسل فاخرہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے دائیں پہلو پر کروٹ لی اور محسوس کیا کہ آج کروٹ بدلنے پر پچھلے دو دنوں کے مقابلے میں کم تکلیف محسوس ہوئی ہے۔

"شاید میں درد کا عادی ہو گیا ہوں یا پھر کوڑھیوں کی طرح میرا جسم بھی سن ہونے لگا ہے جب ہی تو مجھ سے اپنے گلتے سڑتے جسم کی اذیت محسوس کرنے کی حس بھی چھننے لگی ہے۔" ایک سوچ اس کے ذہن میں آئی اور ساتھ ہی یہ خیال بھی دل میں ابھرا کہ گرو جی کی پیش گوئی کے مطابق آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔

"مجھے موت کی سزا قبول ہے میرے مالک! بس تو مجھ پر اتنا رحم کرنا کہ میرے گناہوں کی سزا میں، میری فاخرہ کو حصے دار نہ بنانا اور اس کے لیے زندگی کو آسان رکھنا۔ میں

جانتا ہوں کہ میرا گناہ بڑا ہے اور اس گناہ کے باعث مجھے تیرے حضور توبہ کرتے ہوئے بھی لاج آتی ہے لیکن تین دن سے بس اس امید پر تجھ سے التجائیں کررہا ہوں کہ میرا گناہ کتنا بھی بڑا سہی تیرے رحم سے بڑھ کر بڑا نہیں ہوسکتا۔ اپنے حبیب پاکؐ کے صدقے میرے مالک...... مجھ پر بس اتنا رحم کرنا کہ مجھے ان کے امتیوں کی فہرست میں سے نہ نکالنا۔ اس فہرست میں شامل رہوں گا تو دل کو یہ امید رہے گی کہ کبھی نہ کبھی تو بخشا ہی جاؤں گا۔'' اب وہ بے آواز اپنے رب کو پکارتا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

''یہ کھانا لے لو بابا!'' رونے کے دوران ہی اس نے اس عورت کی آواز سنی جو اس کے الگ تھلگ بیٹھنے کے باوجود روزانہ اسے کھانے کا پیکٹ پکڑا جاتی تھی۔ وہ ایک پیکٹ کھانا زیادہ نہ ہونے کے باوجود اسے دن بھر کے لیے کافی ہو جاتا تھا کہ اسے زیادہ اشتہا ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بس زندگی کی ایک ضرورت تھی جو وہاں پڑے پڑے پوری ہو جاتی تھی۔

''تیرے رحم سے آس لگانا غلط تو نہیں میرے مولا! تو جو اتنا رحم والا ہے کہ ایک دن بھی مجھے بھوکا نہیں رہنے دیا اور بن مانگے بیٹھی جگہ کھانے کو دیتا رہا، کیا میری تڑپ تڑپ کر مانگی گئی دعائیں نہ سنے گا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھا اور عورت کے ہاتھ سے پیکٹ لے لیا۔ عورت جو کہ فیروزہ تھی اسے پیکٹ پکڑا کر آگے بڑھ گئی اور دوسرے فقراء میں کھانا تقسیم کرنے لگی۔

''شاید یہ میرا آخری کھانا ہو۔'' اس نے پیکٹ کھول کر پلاؤ کا ایک لقمہ اپنے منہ میں ڈالا اور سوچا۔

''کتنا بیزار رہتا تھا میں اپنی غربت زدہ زندگی سے۔ مجھے لگتا تھا کہ سسک سسک کر جینے سے مر جانا ہی بہتر ہے لیکن آج جبکہ میں موت سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑا ہوں، مجھے احساس ہو رہا ہے کہ سب سے بڑی نعمت تو زندگی تھی جس کی میں نے کبھی قدر ہی نہیں کی۔'' مسلسل سوچتے ہوئے وہ میکانکی انداز میں پلاؤ کے لقمے اپنے حلق سے نیچے اتارتا جارہا تھا۔ وہ جس ذہنی کیفیت میں تھا اس میں انسان کے ذائقے کی حس کام نہیں کرتی چنانچہ جس طرح اسے پچھلے دو دن ملنے والے قورمے اور کڑاہی گوشت کا ذائقہ محسوس نہیں ہوا تھا آج اس پلاؤ کا ذائقہ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے کھائے چلا جارہا تھا کہ اب اسے رب کی نعمتوں کو ٹھکرانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

''لگتا ہے یہ بے چاری دنیا میں اکیلی ہے جب ہی تو خود اکیلی کھانا لے کر یہاں آتی ہے اور مغرب ہوتے ہوتے واپس بھی لوٹ جاتی ہے۔'' پلاؤ کا آخری لقمہ حلق سے اتار کر اس نے عورت کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ حسبِ معمول رکشے میں آئی تھی اور اپنے ساتھ لائے ہوئے کھانے کے پیکٹ تقسیم کرنے کے بعد بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ آج اس کے روٹ کی بس شاید کچھ تاخیر کا شکار ہوگئی تھی اور وہ بار بار جسم کا بوجھ ایک سے دوسرے پیر پر منتقل کرتی ہوئی بے چین دکھائی دے رہی تھی۔

''رب سوہنا سب کی مشکلیں آسان کرے۔'' اس نے اپنی جلتی پیٹھ کی تکلیف کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی بے غرضی سے دعا مانگی لیکن پھر یوں ساکت ہوگیا جیسے اسے کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہاں اسے اس عورت کو دیکھ کر سانپ ہی سونگھ گیا تھا جو ابھی ابھی فیروزہ کے قریب بس اسٹاپ پر اتری تھی اور یوں اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ سرتاپا چادر میں چھپی عورت کو وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکنے کے باوجود اس کی پھول دار چادر سے بھی شناخت کرسکتا تھا اور قدوقامت اور چال ڈھال سے بھی۔ وہ فاخرہ تھی...... جو یقیناً گھر بیٹھ کر اس کے مرنے کا انتظار نہیں کرسکی تھی اور اسے ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں تک آپہنچی تھی۔ اس کی چادر پر جمی گرد اور پیروں میں اتری تھکن گواہی دے رہی تھی کہ وہ تین دن سے سفر میں ہے اور جگہ جگہ اس کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی ہے۔ وہ فاخرہ کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ایک قطار میں بیٹھے فقیروں کے درمیان کس بات پر ہنگامہ اٹھا ہے اور کیوں انہوں نے دوڑ کر اس عورت کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے جو اپنے روٹ کی بس نہ آنے پر پہلے ہی پریشان کھڑی ہے۔

''تو میری سوچ سے بھی زیادہ ظالم ہے نادر! تین دن بعد عدت شروع کردینے کا مشورہ دے کر آتے تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ فاخرہ تیرے بن تین دن اس گھر میں سانس کیسے لے گی؟ فاخرہ کو تو تین دن میں خود مٹی میں مل جانا تھا پھر کون سی عدت اور کیسی نئی زندگی کی خوشیاں۔'' جیسے اسے فاخرہ کو پہچاننے میں لمحہ نہیں لگا تھا۔ ویسے ہی وہ بھی اس پر پہلی نظر پڑتے ہی سیدھی اس کی جانب آگئی تھی اور اب اس کے رُوبرو بیٹھی اس سے شکوہ کررہی تھی۔

''میں بھی تجھے کچھ نہ دے سکا تھا، سوچا اور کچھ نہیں تو تیری مشکل ہی آسان کردوں جب ہی اپنا بدبودار وجود لے کر وہاں سے نکل آیا تھا۔'' اس میں فاخرہ سے نظر ملانے کا یارا نہیں تھا اس لیے جھکی نظروں کے ساتھ اس کے شکوے کا

جواب دے رہا تھا۔

''تو ہمیشہ وہ کیوں سوچتا ہے نادر جو میں نے چاہا نہیں ہوتا۔'' فاخرہ کا سسکیوں میں ڈوبا شکوہ قطعی غلط نہ تھا۔

''آج تیسرا دن ہے، میں پاگلوں کی طرح تجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ جہاں سے ذرا سا اشارہ ملا دوڑی گئی۔ دیکھ تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔'' اس نے چپلیں اتار کر اسے اپنے پاؤں دکھائے۔ ورم زدہ پیروں پر بیچ بیچ کئی چھالے موجود تھے۔

''مجھے یاد نہیں فاخرہ کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسی کوئی بڑی نیکی کی ہو جس کے بدلے میں میرے رب نے مجھے تجھ جیسی نعمت سے نوازا اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اس رحیم وکریم نے اپنی شان کے اظہار کے لیے مجھے تیرا ساتھ عطا کیا تھا لیکن میں اس نعمت کی قدر نہیں کر سکا۔'' آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں کے ساتھ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، پورے صدقِ دل سے کہہ رہا تھا۔ فاخرہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے رو پڑی۔ ان ہاتھوں کی پشت پر زخم تھے اور ان زخموں سے بدبو اٹھ رہی تھی لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

''توبہ میرے مالک توبہ...... فقیروں سے اتنا بڑا دھوکا۔ ظالم انسانی گوشت سے تیار کردہ کھانا فقیروں مسکینوں کو کھلاتی رہی۔'' وہ دونوں ایک دوسرے میں یوں گم تھے کہ اطراف میں مچے ہنگامے پر دھیان دینے کی فرصت نہیں ملی تھی لیکن قریب سے گزرتے آدمیوں میں سے ایک کا بہ آواز بلند ادا کردہ یہ جملہ دونوں ہی کو چونکا گیا تھا۔ خصوصاً نادر نے بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اپنی گردن اِدھر اُدھر گھما کر اطراف کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اسے تین دن تک مسلسل کھانا فراہم کرنے والی عورت کو ایک پولیس موبائل میں بٹھایا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''ہاں مارا ہے میں نے اُسے۔ کیوں نہ مارتی اُسے؟ کیوں اس بھیڑیے کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کرتی جو میری معصوم بچی کی معصومیت کو کھا گیا۔ اعتبار کا خون کرنے والے کے خون سے ہاتھ رنگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا میرے پاس۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو بار بار اسے زندہ کرتی اور ہر بار اس سے زیادہ اذیت ناک موت دیتی۔'' تھانے پہنچ کر پولیس والوں کی تفتیش کے جواب میں زبان کھولنے میں فیروزہ نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی اور آنکھوں میں وحشت لیے بپھرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا تو پھر بولتی ہی چلی گئی تھی۔

''کماتا نہیں تھا، نشہ کرتا تھا، میری کمائی چھین کر لے جاتا تھا۔ پر میں نے سر پر ایک مرد کے سائے کے آسرے میں سب کچھ سہہ لیا۔ میں روٹی روزی کمانے کی خاطر دن بھر گھر سے باہر رہتی تھی تو خود کو دلاسا دیتی تھی کہ گھر پر میری بچی کی نگرانی کے لیے سوتیلا ہی سہی باپ موجود ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ذلیل آدمی رشتے کا لحاظ بھلا کے میری پھول جیسی بچی کو اتنی چالاکی سے پامال کر رہا ہے کہ اس غریب کے اندر شکوہ کرنے کی بھی ہمت نہیں۔'' وہ ایک بار بولنا شروع ہوئی تو انسپکٹر خاور کو اس سے مزید سوال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

''کچھ عرصے سے مجھے مہرو کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اور میں دیکھ رہی تھی کہ وہ...... روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے اس لیے اس روز یہ سوچ کر کہ اسے کسی ڈاکٹر کو دکھانے سرکاری اسپتال لے جاؤں گی۔ کام سے جلدی چھٹی لے کر گھر آ گئی۔ گھر کے صحن میں قدم رکھتے ہی میں نے مہرو کے بلکنے کی آوازیں سنیں۔ وہ کسی سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میں گھبرا کر کمرے کی طرف بڑھی اور اندر کا منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سل کا بٹا اٹھا کر اس خبیث کے سر پر دے مارا۔''

''تو کیا وہ تمہارے پہلے ہی وار میں جان سے چلا گیا تھا؟'' اس نکتے پر آ کر انسپکٹر نے دخل اندازی کی اور سوال اٹھایا۔

''نہیں، وہ مرا نہیں تھا۔ چوٹ کھا کر صرف بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے اس کی بے ہوشی کا فائدہ اٹھا کر اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھ دیے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر مہرو سے ساری تفصیل پوچھی۔ اس نے روتے بلکتے مجھے بتایا کہ شوکت پچھلے پانچ ماہ سے اس کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیل رہا ہے اور ہر بار اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر ماں کو کچھ بتایا تو سب سے پہلے تیری ماں کو ہی قتل کروں گا اور پھر تجھے لے جا کر ایسے کسی اڈے پر بیچ دوں گا جہاں ایک وقت میں کئی کئی کتے تیرا جسم بھنبھوڑیں گے۔ چودہ سال کی بچی میں حوصلہ ہی کتنا تھا، وہ شوکت کی دھمکیوں سے ڈر کر چپ سادھ گئی۔ اسے تو اتنا بھی شعور نہیں تھا کہ یہ جان سکتی کہ کتنے مہینوں سے شوکت کے گناہ کا پھل اپنی کوکھ میں پال رہی ہے۔ دن بھر کولہو کے بیل کی

طرح محنت کرنے کے بعد رات کو مُردوں کی نیند سو جانے والی اس کی ماں اس کے ساتھ ایک چھت تلے رہ کر بھی اس کا غم نہ سمجھ سکی اور میری بچی اذیت کی چکی میں پستی رہی۔'' یہ پہلا موقع تھا جب فیروزہ کی وحشت بھری آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔ ایک سپاہی نے انسپکٹر کے اشارے پر اسے پانی سے بھرا گلاس تھمایا۔ بے شک وہ نہایت سنگین جرم میں گرفتار ہوئی تھی لیکن جو داستان وہ سنا رہی تھی، اس سے ظاہر تھا کہ جرم کے پیچھے موجود وجہ بھی کم سنگین نہیں تھی۔

''یقیناً تم نے بیٹی سے معلومات حاصل ہونے کے بعد شوکت کو غصے میں قتل کر دیا ہوگا اور پھر لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے یہ ترکیب لڑائی ہوگی کہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس سے نجات حاصل کر لو۔'' انسپکٹر نے گویا سارا قصہ سمجھ لیا تھا۔

''نہیں، میں نے مہرو کی زبانی سب کچھ سن کر شوکے کو قتل نہیں کیا تھا۔ قتل کر دیتی تو یہ اس کے جرم کے مقابلے میں بہت ہلکی سزا ہوتی۔'' فیروزہ نے عجیب سے لہجے میں انسپکٹر کے اندازے کی تردید کی اور خاموش ہوگئی۔

''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا فیروزہ بی بی؟'' انسپکٹر نے سرسراتے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''میں نے فیصلہ کیا کہ اسے بھی اتنی ہی اذیت دوں گی جتنی اذیت اس نے میری مہرو کو دی تھی۔ وہ پورے پانچ ماہ میری بچی کی بوٹیاں نوچتا رہا تھا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ یہی کیا اور اس کے بدن سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کر علیحدہ کرتی رہی۔''

''زندہ حالت میں؟'' انسپکٹر جس نے اپنے کیریئر میں جانے کیا کچھ نہ دیکھا تھا، اس سوال کو کرتے ہوئے خود بھی کانپ گیا۔

''ہاں زندہ حالت میں۔ وہ بھی تو میری بچی کے زندہ جسم کو نوچتا کھسوٹتا رہا تھا۔'' اس کے پاس اپنی سفاکی کے لیے ٹھوس دلیل موجود تھی۔

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔

''پھر کیا ہونا تھا۔ وہ اذیت سے تڑپتا پھڑکتا رہا لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسے ہونے کے باعث اس کی ہر چیخ کا گلا بالکل ویسے ہی گھٹ گیا جیسے اس نے اپنی دھمکیوں سے میری بچی کی چیخوں کا گلا گھونٹا تھا۔''

''شوکت کی جان کب نکلی؟'' انسپکٹر کو اپنی رپورٹ میں درج کرنے کے لیے ہر بات کی تفصیل درکار تھی۔

''مجھے خبر نہیں ہوئی۔ مجھے کم وقت میں اکیلے ہی سارا کام نمٹانا تھا اس لیے ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلانے پڑے۔ شوکت جیسے سانڈ کے گوشت اور ہڈیوں کے ٹکڑے کر کے تین حصوں میں تقسیم کرنا اور پھر گوشت کو دھو کر محفوظ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔'' فیروزہ نے اتنی سنجیدگی اور متانت سے بتایا جیسے انسان کے بجائے کسی بکرے کے حصے بخرے کرنے کا ذکر کر رہی ہو۔

''تم شوکت کے جسم کے ٹکڑوں کو کہیں لے جا کر پھینک بھی سکتی تھیں۔ تم نے اس کے گوشت کا کھانا پکا کر مزار کے فقراء میں کیوں تقسیم کیا؟'' انسپکٹر اس عورت کی جی داری پر حیران تھا۔

''میں نے سوچا شوکا اپنے جیتے جی تو کبھی کسی کے کام نہیں آیا، چلو اس کی لاش ہی غریبوں کا پیٹ بھرنے کے کام آجائے۔'' فیروزہ کے بے نیازی سے دیے جواب نے انسپکٹر کو ہلا کر رکھ دیا۔

بعد کے دنوں میں انسپکٹر نے شوکت قتل کیس کی گہرائی سے تفتیش و تحقیق کی تو فیروزہ کے حالاتِ زندگی جان کر کسی حد تک اس کی ذہنی کیفیت سمجھ گیا۔ زندگی میں کبھی سکھ نہ دیکھنے والی اس عورت کا صبر قسمت کی اس آخری ستم ظریفی پر یقیناً جواب دے گیا تھا اور وہ جو کچھ اپنے اندر جمع کرتی رہی تھی، وہ ایک ہی بار میں پوری شدت سے باہر آ گیا تھا۔ یہ ایک ایسا کیس تھا جس میں ایک طرف فیروزہ کے حالاتِ زندگی انسپکٹر کا دل نرم کرتے تھے تو دوسری طرف اس کی سفاکی اسے اس کے ساتھ کوئی نرمی برتنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

اس داستان کا مظلوم ترین کردار مہرو بھی اپنی ماں کی گرفتاری والی رات دم توڑ گئی تھی۔ شوکت کے ظلم کے بعد اپنی ماں کی سفاکی دیکھنا اس نوعمر لڑکی کے لیے بہت اعصاب شکن صدمہ ثابت ہوا تھا۔ تیسرے دن ماں کے گھر سے روانہ ہونے کے بعد اس نے چھری سے اپنے ہاتھوں کی رگیں کاٹ لی تھیں۔ فیروزہ کی گرفتاری اور بیان کے بعد اس کے گھر چھاپا مارنے جانے والی پولیس پارٹی کو وہاں مہرو کی لاش کے علاوہ فریزر میں رکھی شوکت کی کھوپڑی بھی مل گئی تھی لیکن سچ یہ تھا کہ تمام بیانات اور ثبوتوں کے باوجود اس کیس میں منصفی کا حق ادا کرنا آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

''تجھے یقین ہے نا فاخرہ کہ اللہ نے مجھے معاف کر دیا ہے؟'' نادرا اپنے جسم کے مختلف حصوں کو چھوتے ہوئے عجیب

بے یقینی کی کیفیت میں فاخرہ سے پوچھ رہا تھا۔
''بالکل معاف کر دیا ہے۔ اگر معاف نہ کرتا تو تجھے دوبارہ زندگی کیوں دیتا۔'' فاخرہ نے اسے تسلی دی۔
''کبھی کبھی وہ گناہ گاروں کی رسی دراز بھی تو کر دیتا ہے۔'' وہ اب بھی بے یقین سا تھا۔
''سچے دل سے تائب ہو جانے والوں کے لیے اس کی رحمت کے در کھلے رہتے ہیں۔ اس رب نے میری التجا اور تیری توبہ سن کر تجھے موقع دیا ہے۔'' وہ پوری طرح مطمئن تھی اور لحاف میں ڈورے ڈالتے ہوئے اسے بھی مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''تیری ہی سنی ہوگی۔ میں تو بڑا گناہ گار ہوں، مجھ جیسے کی بھلا وہ کیا سنتا۔'' اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ ہاتھوں اور جسم کے دیگر حصوں پر موجود سارے زخم دھیرے دھیرے بغیر کسی علاج کے خود ہی ٹھیک ہو گئے تھے اور بس ہلکے سے داغ ہی باقی رہ گئے تھے جو صرف بغور دیکھنے پر ہی دکھائی دیتے تھے۔
''چل یوں ہی سہی پر یاد رکھنا میری دعاؤں سے ملی یہ زندگی اب میرے مشورے کے مطابق ہی گزارے گا اور کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو رب کی مرضی کے خلاف ہو۔'' وہ یقین دہانی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس اذیت اور کرب سے میں گزرا ہوں، اسے مرتے دم تک نہیں بھلا سکتا۔'' نادر نے وہ وقت یاد کر کے ایک جھرجھری لی اور فوراً ہی کانوں کو ہاتھ لگائے۔
''کچھ یادیں اذیت ناک ہوتی ہیں لیکن ان کو ہمیشہ یاد رکھنے میں ہی بھلائی ہوتی ہے اس لیے میں دعا کروں گی کہ تو واقعی مرتے دم تک اس اذیت کو نہ بھولے۔'' وہ دھاگے کو دانتوں کی مدد سے توڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔
نادر کے مل جانے کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس لوٹ کر نہیں گئے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت وہ اپنی تھوڑی بہت جمع پونجی اور جہیز میں ملنے والی واحد سونے کی انگوٹھی اپنے ساتھ لے کر نکلی تھی چنانچہ ایک نئے شہر میں کرائے کا چھوٹا سا مکان لے کر رہنے کا آسرا ہو گیا تھا۔ سر چھپانے کو چھت کا آسرا ملتے ہی اس نے آس پڑوس میں کہہ سن کر چھوٹے موٹے کام حاصل کرنا شروع کر دیے تھے جنہوں نے دال روٹی کا آسرا بنا دیا تھا اور اب تو نادر بھی صحت یاب ہونے کے بعد کام پر جانے لگا تھا۔ تنخواہ گو زیادہ نہیں تھی لیکن خواہشات محدود ہو جانے کے بعد کافی محسوس ہوتی تھی۔
''کبھی کبھی میں اپنے انسانی گوشت کھانے کا سوچتا ہوں تو کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ صحت یابی کے حصول کی واحد شرط کے باوجود میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں انسانی گوشت کھاؤں گا، وہ بھی لگاتار تین دن تک......'' سوچتے ہوئے فیروزہ کا چہرہ اس کے تصور میں لہرا رہا تھا۔
''میں بھی اس بندوبست پر حیران رہ جاتی ہوں۔ تجھے بے پناہ چاہنے کے باوجود میں تیرے لیے یہ کام نہیں کر سکتی تھی لیکن دیکھ لے تیرے لیے کس ڈھنگ سے سارا انتظام ہوا اور ساتھ ہی گواہی بھی تیار کی گئی۔''
''گواہی......؟'' اسے فاخرہ کی بات نے اُلجھایا۔
''تیسرے دن آئی تھی نا وہ عورت کھانا بانٹنے؟ ذرا سوچ کہ کیا تھا کہ دو دن کی طرح تیسرے دن بھی کسی کو کچھ معلوم نہ ہوتا۔ تیسرے دن عین اس وقت جب میں تیرے سامنے بیٹھی تھی کسی فقیر کے کھانے میں انسانی انگلی کا نکلنا اور شور اٹھنا تیرے لیے گواہی کے انتظام کے سوا کچھ نہیں تھا۔'' فاخرہ نے اسے سمجھایا۔
''اگر اُس دن ایسا نہیں ہوتا اور میں یونہی صحت یاب ہو جاتا تو، تو گمان کرتی کہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے خود جان بوجھ کر انسانی گوشت کھایا ہے۔'' نادر ساری بات سمجھ کر بولا لیکن اس نے سر اوپر نہیں اٹھایا اور پھرتی سے لحاف میں ڈورے ڈالتی رہی۔ اسے آج شام تک یہ لحاف مکمل کر کے دینا تھا۔
''تو ایسا سمجھتی تو غلط نہ ہوتا۔ جو شخص خواہشات کے حصول کے لیے کالے جادو کے چکر تک میں پڑنے سے باز نہ آیا ہو اس کا بھلا اعتبار بھی کیا تھا۔'' وہ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ گیا اور اداسی سے بولا۔
''اعتبار کردار سے قائم ہوتا ہے نادر! جو ہوا سو ہوا بس آگے کی زندگی کا سوچ اور مجھ سمیت سب پر اپنے کردار کا وہ رنگ جما کہ اعتبار خود ہی قائم ہو جائے۔ یاد رکھ ہر بار کردار کی گواہی دینے کو غیب سے انتظام نہیں ہوتا۔ بس یہ اعتبار ہوتا ہے جو کردار کی گواہی دلواتا ہے۔'' رسان سے اسے سمجھاتے ہوئے اس نے دھاگے کو سوئی کے گرد بل دیتے ہوئے ٹانکا پکا کیا تو نادر نے اپنے دل میں اس ٹانکے سے بھی پکا عہد کر ڈالا۔ اب اسے زندگی میں کبھی ایسا کوئی کام نہیں کرنا تھا جو اعتبار کو توڑ کر اس کے کردار کو ہلکا کر دے......

❖❖❖

گمشدہ محبت کی تلاش

**طاہر جاوید مغل** محبت... انسیت... رواداری اور گمشدہ محبت کرنے والے کرداروں کے خالق ہیں... وہ نڈر... بے باک اور دبنگ حیثیت سے سامنے آتے ہیں... ان کا ہیرو محبت کو دل پھینک عاشق کا جذبہ نہیں سمجھتا... بلکہ معاملاتِ زیست اور اس کے مسائل میں... الجھنے کے بجائے سلجھانے کا ہنر جانتا ہے... سچائی اور واقفیت کے زینے بڑے جرأت مندانہ انداز میں چڑھتا ہے...

# قانونی حد

وقت بڑی ظالم شے ہے... ارادوں اور عزائم کے راستوں میں بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دیتا ہے... ایک کے بعد دوسری رکاوٹ راستہ روکے کھڑی ہوتی ہے... اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ الائو کی صورت اختیار کر چکا تھا...

پچاس سال گزرنے کے بعد بھی نہ ختم ہونے والی دشمنی کا پُراسرار ماجرا......

منظر بڑا رومانی تھا۔ وسیع و عریض پبلک پارک کا وہ گوشہ سرسبز درختوں اور پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ اُس پارک کی پارکنگ تھی جہاں درجنوں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ دونوں بھی ایک ایسی ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ہلکی پھوار نے نہ صرف موسم کی دلکشی میں اضافہ کر دیا تھا بلکہ ٹویوٹا کار کے شیشوں کو بھی یوں دُھندلا دیا تھا کہ باہر سے اندر کچھ بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ حماد اور دُعا ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے جیسے یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔ اردگرد کے ماحول سے یکسر لاتعلق حماد کے ہونٹ نوخیز دعا کے ریشمی بالوں پر تھے اور دعا کی مرمریں بانہوں نے حماد کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس رم جھم میں انہیں کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ اس خوشبودار گاڑی کے اندر دو بے تاب دلوں کے لیے یہ ملاپ کی گھڑیاں ہیں لیکن یہ ملاپ کی نہیں، جدائی کی گھڑیاں تھیں۔ پارک کے اس سنسان گوشے میں یہ حماد اور دُعا کی آخری ملاقات تھی۔ دُعا بہت دیر سے رو رہی تھی۔

اب تو شاید اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ حماد کا چہرہ بھی زرد تھا۔ دکھ کی شدت سے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئی تھیں۔

حماد نے اسے آہستگی سے پیچھے ہٹانا چاہا لیکن وہ جدا نہیں ہو رہی تھی۔ حماد آزردہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے اب جانا ہوگا دعا! چچا جمشید میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ بار بار میرے موبائل پر کال کر رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے وہ وقت کے کتنے پابند ہیں۔''

وہ ایک سسکی سی لے کر پیچھے ہٹی۔ اس کی عمر بہ مشکل سولہ سترہ سال رہی ہوگی۔ وہ اچھی شکل کی تھی۔ لباس اور حلیے سے ایک پڑھے لکھے متوسط گھرانے کی لڑکی لگتی تھی۔ حماد کی اپنی عمر بھی سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ڈیل ڈول کا اچھا تھا۔ جھلکتے ہوئے گندمی رنگ اور لمبے سیاہ بالوں نے اس کی شخصیت کو جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ آنسو اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں ٹھہر سے گئے تھے۔ دوسری طرف دعا کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ عجیب عاجز لہجے میں بولی۔ حماد! کیا کوئی راستہ نہیں؟''

''نہیں دعا!'' وہ بہت گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میرے کندھوں پر جو بوجھ ہے، وہ اتنا بھاری ہے کہ میری ہر ہر ہڈی کو توڑ رہا ہے۔ میں اس بوجھ کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا اور تمہیں بتا چکا ہوں اس بوجھ کو اتاروں گا تو قانون کے شکنجے میں جکڑا جاؤں گا۔ پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں میری زندگی تباہ ہے دعا۔ میں اس تباہی میں تمہیں کسی صورت شریک نہیں کر سکتا...... کسی صورت بھی نہیں۔'' اس نے آخری جملے کے ہر ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرنا جانتا ہے۔

وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامے سسکی۔ ''کیا...... اب ہم کبھی نہیں ملیں گے؟''

''نہیں دعا...... ! ہمیں یہ زہر پینا ہی پڑے گا۔''

''اتنی بڑی زندگی تمہارے بغیر کیسے گزرے گی

حماد؟''

وہ بھی درد کے دھارے میں بہہ سا گیا۔ ''جیسے ہم جیسے لوگوں کی گزرتی ہے دعا! تم دل سے کبھی نہ جاؤ گی۔ ہر موسم میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ سردیوں کی اداس شاموں میں اور گرمیوں کی سنسان دوپہروں میں تمہیں سوچوں گا۔ برساتوں میں تمہاری یادیں دل کا درد بڑھائیں گی اور چاندنی راتوں میں تمہاری باتیں یاد کروں گا...... ہاں دعا! تم کبھی دل سے نہیں جاؤ گی۔ آخری دم تک نہیں۔ یہ وعدہ ہے میرا۔''

''مگر میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کروں گی۔ میں امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑوں گی۔'' اس نے کہا اور ڈیش بورڈ پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

اور پھر اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہہ دیا۔

☆☆☆

حماد لودھی کا تعلق ایک درمیانے درجے کی صنعت کار فیملی سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی آخری اولاد تھی۔ اس سے بڑی تین بہنیں تھیں جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ والدہ اس وقت فوت ہو گئی تھیں جب حماد ابھی دس سال کا تھا۔ پانچ سال قبل والد عثمان لودھی بھی اسے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ اب وہ لودھی ہاؤس میں اپنے مہربان چچا جمشید اور چچی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس لودھی فیملی کے گلے میں ایک زہریلی دشمنی کا طوق تقریباً پچاس برس سے پڑا ہوا تھا۔ پچاس برس کچھ کم تو نہیں ہوتے...... نصف صدی ہوتی ہے...... ہاں نصف صدی چلنے کے بعد یہ دشمنی ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوتی تھی اور اب حماد کے سینے میں آکر ایک ایسی آگ بن چکی تھی جو اسے کسی صورت چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ اس آگ کو ایک ظالم و طاقتور شخص کے خون سے بجھانا چاہتا تھا اور اکثر اسے لگتا تھا کہ اب بس یہی اس کی زندگی کا مقصد رہ گیا ہے۔

وہ ظالم شخص کون تھا؟ وہ ایک جاگیردار تھا جو اب پھلتے پھولتے ایک طاقتور سیاست داں بن چکا تھا۔ اس کا نام بختیار فیروز تھا۔ اس کی عمر اب ستر برس سے کم نہیں تھی لیکن بالوں اور مونچھوں وغیرہ کو رنگ کر وہ اب بھی پچپن ساٹھ کا ہی نظر آتا تھا۔ وہ کئی بار ایم پی اے رہ چکا تھا اور اب ایم این اے کے لیے پر تول رہا تھا۔ تقریباً پچاس سال پہلے یہی بختیار فیروز اکیس بائیس سال کا ایک بدقماش امیر زادہ تھا۔ وہ کسی الاٹمنٹ کے سلسلے میں رحیم یار خان سے راولپنڈی آیا ہوا تھا۔ یہیں پر اس کی نگاہ کالج سے نکلتی ہوئی ایک نہایت خوبرو لڑکی پر پڑ گئی اور وہ اپنی تمام تر رنگین مزاجی کے ساتھ اس پر مر مٹا۔ یہ شکیلہ نامہ لڑکی لودھی فیملی کی عزت تھی اور رشتے میں حماد کی پھپو تھی۔ بختیار فیروز نے طاقت اور آن بان کے زور سے شکیلہ کو حاصل کرنا چاہا اور لودھی فیملی کی طرف اپنا رشتہ بھیجا۔ وہاں سے صاف انکار ہوا تو بختیار فیروز بتدریج اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا...... اور پھر ایک موقع ایسا آیا جب کالج کی لڑکیوں کے ساتھ پکنک پر مری گئی ہوئی شکیلہ اچانک غائب ہو گئی۔ یہ ایک روح فرسا واقعہ تھا۔ پہلا شک تو بختیار پر ہی جاتا تھا مگر کہاں رحیم یار خان اور کہاں مری۔ پھر وقوعے کے وقت موقع سے بختیار کی غیر موجودگی بھی ثابت ہوتی تھی۔

سات آٹھ روز زور و شور سے شکیلہ کی تلاش جاری رہی پھر ایک صبح اس کی لاش ایبٹ آباد کی ایک سڑک پر ملی۔ کئی روز تک ہوس کا شکار ہونے کے بعد اس نے ایک بنگلے کی تیسری منزل سے چھلانگ لگائی اور سر کے بل گرنے کے سبب جانبر نہ ہو سکی تھی۔ اس المناک موت کے بعد اس بات کے واضح اشارے مل گئے کہ یہ بنگلا بختیار کے ایک دوست کے دوست کا تھا اور بختیار خود بھی اس بنگلے میں موجود رہا تھا۔ بختیار گرفتار ہوا مگر ہمارے نظام عدل میں ہمیشہ سے جو سقم رہے ہیں، ان کے سبب اس قتل کا کیس کمزور ہو گیا۔ ویسے بھی اثر و رسوخ اور طاقت کے اعتبار سے یہ جاگیردار فیملی، لودھی فیملی سے کافی آگے تھی۔ تین چار سال بعد شکیلہ کی عزت کا لٹیرا اور اس کا قاتل بختیار فیروز جیل سے باہر آ گیا۔ اس بہیمانہ قتل کے بعد حماد کے تایا نے ایک سخت قانونی جنگ لڑی تاہم بعد ازاں وہ ایک تاریخ پر جاتے ہوئے کار حادثے کا شکار ہوئے اور چل بسے۔ ان کے بعد حماد کے مرحوم والد عثمان لودھی نے انصاف کے حصول کی اس گاڑی کو کھینچنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر بھی بہ مشکل 21 سال رہی ہو گی۔ انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ اپنی مظلوم بہن کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ اگر قانون نے مدد نہ کی تو وہ کوئی اور راستہ ڈھونڈ لیں گے مگر بہن کے قاتل کو زمین پر دندناتا نہیں چھوڑیں گے۔ مگر وقت بھی ایک بڑی ظالم شے ہے۔ ارادوں اور عزائم کے راستے پر بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دیتا ہے۔ اپنی مظلوم بہن کو انصاف دلانے کے لیے حماد کے والد عثمان لودھی اور چچا جمشید لودھی کی کوششیں رکی تو نہیں مگر کسی کسی مرحلے پر ماند ضرور پڑیں۔ اسی ناانصافی

کے ردعمل کے طور پر حماد کے چچا جمشید نے قانون کی ڈگری بھی لی اور درجنوں مرتبہ وکیل کی حیثیت سے خود عدالت میں پیش ہوئے۔ پھر ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب ہر طرف سے مایوس ہو کر حماد کے والد نے بختیار فیروز پر قاتلانہ حملہ کرانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بھی ایک مخبری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ دیواروں پر نئے کیلنڈر سجتے رہے اور اترتے رہے اور پھر وہ موقع آیا جب بختیار سے بدلے کی حسرت لیے حماد کے والد عثمان بھی دنیا سے چلے گئے۔

پشاور میں دعا سے آخری ملاقات کرنے کے بعد حماد کوئی پانچ گھنٹے میں واپس راولپنڈی پہنچ گیا۔ اسے چچا جمشید کے سخت اصولوں کا پتا تھا۔ وہ رات بارہ بجے سے پہلے پہلے لودھی ہاؤس کے دروازے بند کرا دیتے تھے اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ گھر کے مکین گھر کے اندر ہی ہوں۔ وہ گھر پہنچا تو چچا جمشید پورچ میں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بے شک اب وہ وکالت چھوڑ کر پراپرٹی کے کاروبار سے منسلک ہو چکے تھے لیکن قانون سے انہوں نے اپنا ناتا ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ اپنے دونوں بچوں کے علاوہ وہ حماد کے حوالے سے بھی یہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ کسی بھی حوالے سے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے۔

"کہاں گئے تھے حماد؟" انہوں نے پہلا سوال ہی یہ پوچھا۔

"ایک دوست سے ملنے روات تک۔" حماد نے مختصر جواب دیا۔ "بس باتوں میں دیر ہو گئی۔"

وہ ٹویوٹا کار کے بونٹ کو چھوتے ہوئے بولے۔ "یہ تو کافی گرم لگ رہا ہے پھر تمہارا موبائل بھی بند تھا۔"

"وہ...... وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں کبھی کبھی بند کر دیتا ہوں۔ بند کیا پھر شاید آن کرنا بھول گیا۔"

وہ ہولے سے مسکرائے۔ "ڈرائیونگ کے دوران فون استعمال نہ کرنا اچھی بات ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اچھی بات ڈرائیونگ لائسنس بنوانا ہے اور وہ ابھی تمہارا بن نہیں سکتا۔"

"اوہ سوری چچا...... سوری!" حماد نے بے تکلف انداز میں کہا۔ "زیادہ دور تھوڑی گیا تھا میں۔" حماد نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے دل کی جو کیفیت ہو رہی تھی وہ خود کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا تھا کہ چچا سے زیادہ گفتگو کر سکے۔

قصور مت پوچھو۔
ہمارا ایک قیدی بھاگ گیا ہے۔ تم آ گئے تو اب گنتی پوری ہو جائے گی

چچی اور حماد کی دونوں کزنز سمیت گھر کے افراد اپنے اپنے کمروں میں پہنچ چکے تھے۔ حماد اپنے کمرے میں پہنچا۔ اپنی پی کیپ اتار کر میز پر پٹخی اور اوندھے منہ بستر پر گر گیا۔ آنکھیں جل رہی تھیں، گلے میں آنسوؤں کا آبشار سا گر رہا تھا پھر اس "آبشار" کے کچھ پانی کا رخ خود بخود آنکھوں کی طرف ہو گیا۔ وہ بے پناہ کرب کے گھیرے میں پڑا رہا اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپنی دلدوز کیفیت کے زیرِ اثر وہ اپنے کمرے کو اندر سے لاک کرنا بھی بھول گیا تھا۔

آٹھ دس منٹ بعد اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے بالکل قریب موجود ہے۔ وہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ چونک کر سیدھا ہوا اور اپنے سامنے چچا جمشید کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ درمیانے قد کے تھے۔ بال نیم سفید تھے۔ پچھلے چند برسوں میں جسم تھوڑا سا فربہ اور پیشانی بال اُڑنے کے سبب چوڑی ہو گئی تھی۔

حماد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ "دعا کی طرف گئے تھے نا...... اس سے آخری ملاقات کرنے کے لیے؟"

حماد نے سر جھکا لیا۔ اپنی سرخ، متورم آنکھوں کی موجودگی میں وہ کیا حجت پیش کرتا۔

وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ ”تو...... یہ طے ہے کہ تم اپنے ارادے سے باز نہیں آؤ گے؟“

حماد نے چچا کی آنکھوں میں دیکھا اور ایک لمبے توقف کے بعد انکار میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں چچا! پچاس سال کم نہیں ہوتے۔ آپ لوگ قانون کا ہر دروازہ کھٹکھٹا کر دیکھ چکے، ہر دیوار سے سر پھوڑ لیا۔ اپنی پوری پوری زندگی لگا دی لیکن وہ شخص اب بھی زمین پر دندنا رہا ہے۔ پچاس سال پہلے جو کچھ ہوا تھا، اس کے بارے میں بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ عورت جو میری پھوپھی تھی، اس کے ہاتھوں تاراج ہوئی۔ اس کی وجہ سے مری اور 20 سال کی عمر میں قبر کی مٹی اوڑھ کر سو گئی اور وہ ستر سال کی عمر میں بھی زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ ترقی کی منزلیں طے کرنا چاہتا ہے۔ میں اُسے جیتا نہیں چھوڑنا چاہتا، خود مرنا ہے یا اسے مارنا ہے۔“

نوعمر بھتیجے کے تاثرات ادھیڑ عمر جمشید کو بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ جمشید کی جہاندیدہ آنکھوں میں دبا دبا ہراس نظر آنے لگا تھا۔ انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”مگر حماد! اس سب میں دعا کا کیا قصور؟ جو تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ جس نے ہوش سنبھالنے کے بعد شاید تمہارے سوا کچھ سوچا ہی نہیں۔ بے شک وہ دور کی رشتے دار ہے لیکن میں جانتا ہوں جو رشتہ تم دونوں کے بیچ ہے، وہ بہت قریب کا ہے۔“

”قریب کا ہے نہیں چچا...... قریب کا تھا۔ میں سب کچھ ختم کر چکا ہوں۔ میرا اب بس ایک ہی مقصد ہے، اپنی فیملی پر ہونے والے ظلم کا بدلہ...... اور آپ دیکھ لینا چچا، ایک آدھ سال میں یہ بدلہ لے لوں گا۔ میں قتل کر دوں گا اُس جانور کو۔“

جمشید لودھی نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں ایک جانب چھوڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم بہت جلدی کر رہے ہو حماد! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی مت سوچو ایسی باتیں۔“

”چچا! ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔“ وہ جیسے سینہ تان کر بولا۔ ”آپ کو پتا ہی ہے پہلے تایا جان اور پھر ابا جان نے کتنی سر توڑ کوششیں کی تھیں۔ تایا کی وفات کے بعد ابا جان نے عہد کیا تھا کہ وہ قانونی یا غیر قانونی جس طرح بھی ہوا، بختیار فیروز کو کیفر کردار تک پہنچا کر چھوڑیں گے۔ انہوں نے باقاعدہ پلاننگ بھی کی تھی اسے قتل کرنے کی لیکن پھر کیا ہوا؟ وقت گزرتا گیا۔ زندگی کے اور چھوٹے بڑے مسائل بھی سامنے آتے گئے...... ابا جان اور آپ کی کوششیں بھی اس مقام تک نہ پہنچ سکیں کہ ان کو کامیابی ملتی...... لیکن اب میں ہوں اور میں نے قسم کھالی ہے چچا! بہت بڑی قسم کھالی ہے۔ میری زندگی کا پہلا مقصد یہی ہے کہ میں اس بڈھے شیطان کو جہنم واصل کروں گا...... اور بہت جلد کروں گا......“

حماد کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کے لہجے میں بھوری چٹانوں کی سی سختی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ نہ صرف ڈیل ڈول کے اعتبار سے بلکہ بول چال کے انداز سے بھی ایک جوان مرد دکھائی دیتا تھا۔ اس کا لب و لہجہ جہاندیدہ جمشید لودھی کو سمجھا چکا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، کر گزرے گا۔ اب شاید کوئی وزنی سے وزنی دلیل اور منطق بھی اس کے راستے پر بند نہ باندھ سکے گی۔

کمرے کی کھڑکیوں سے باہر ہوا چل رہی تھی۔ گارڈن لائٹس میں سفیدے اور سرو کے بلند درخت ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ رات کا سناٹا ہر طرف پر پھیلائے ہوئے تھا۔ حماد نے دیکھا کہ چچا جمشید کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک سی نمودار ہوئی ہے۔ کوئی انوکھی سوچ اُن کے ذہن میں آئی تھی اور اس سوچ کے زیرِ اثر وہ کئی سیکنڈ تک اپنی جگہ منجمد سے بیٹھے رہے۔

وہ بے قراری سے کمرے کے اندر چکرانے لگے۔ ان کے کلین شیو چہرے پر ہیجانی سی کیفیت تھی۔ نیم سفید بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر جھول رہی تھی۔ وہ ٹہلتے ہوئے گاہے بہ گاہے اپنے سامنے تن کر کھڑے حماد کو گھورنے لگتے تھے۔ آخر وہ حماد کے عین سامنے رک گئے۔ انہوں نے عجیب لہجے میں کہا۔ ”حماد! اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے...... اور تمہیں بختیار فیروز کو جہنم واصل کرنا ہی ہے...... تو پھر...... دیر نہ کرو...... یہ کام ابھی کرو...... ابھی دو تین دن کے اندر......“

حماد نے ذرا حیرت سے چچا کی طرف دیکھا۔ وہ اب اپنی عینک درست کر کے دیوار پر آویزاں کیلنڈر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں چچا؟“

انہوں نے ایک بار پھر ہیجانی انداز میں کمرے کے اندر ہی دو چکر لگائے۔ ان کی آنکھوں میں چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

لرزاں ہاتھوں سے نیا سگریٹ سلگا کر انہوں نے حماد کو اپنے سامنے بٹھایا اور گویا ہوئے۔ ”میں سمجھ گیا ہوں حماد!

اب تمہیں باز نہیں آنا ہے...... اور اگر تم نے باز نہیں آنا تو پھر کیوں نا ہم یہ کام اس ٹائمنگ کے مطابق کریں جو ہمیں سوٹ کرتی ہے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا چچا جان!''

انہوں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''شاید تمہیں بھی تھوڑا بہت علم ہو۔ قاتل کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو تو اسے پھانسی نہیں ہوتی اور تمہاری عمر ابھی پوری اٹھارہ سال نہیں ہوئی۔''

حماد نے کانپتے ہاتھوں سے کارڈ اٹھالیا۔ اُس کے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگی تھی۔ اپنے چچا کی بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ ان کی آواز جیسے کہیں دور سے حماد کے کانوں تک پہنچی۔ ''تمہاری عمر اٹھارہ سال نہیں ہوئی حماد...... ! لیکن...... تمہارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے، بلکہ شاید بہت کم وقت ہے۔ صرف چار دن بعد تم پورے اٹھارہ کے ہوجاؤ گے۔ اگر تم نے یہ کام کرنا ہی ہے تو پھر ابھی کرو۔''

کمرے کے اندر ایک ہیجانی سی فضا قائم ہوگئی تھی۔ حماد کے چچا نے دیوار پر آویزاں کیلنڈر کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھو، آج پچیس تاریخ ہے۔ صرف چار روز بعد ..... ہاں صرف چار روز بعد...... تم پورے اٹھارہ سال کے ہوجاؤ گے، اس کے بعد کیا ہوگا؟ اگر تم قتل کرو گے تو پھانسی کا راستہ تمہارے لیے کھل جائے گا لیکن ابھی یہ راستہ بند ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

حماد نے مبہوت انداز سے اثبات میں سر ہلایا۔ انہوں نے سرسراتے لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''میرے اندازے کے مطابق اس قتل پر تمہیں زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کی سزا ہوگی اور میں جانتا ہوں ایسی سزاؤں میں مختلف موقعوں پر رعایتیں بھی ملتی رہتی ہیں۔ تمہیں زیادہ عرصہ جیل میں نہیں رہنا پڑے گا۔''

حماد کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ ہمیشہ سے چچا جمشید کی فہم و فراست کا قائل تھا اور آج بھی انہوں نے ایک ایسی ہی بات کی تھی۔ رات کے اس پہر لودھی ہاؤس کے اس خاموش کمرے میں سنسنی کی ایک نادیدہ لہر دوڑنے لگی تھی۔

چچا جمشید نے بے تابی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''حماد! ایک اور بات بھی ہمارے حق میں جاتی ہے۔ وہ بدذات بختیار فیروز آج کل الیکشن کے چکر میں ہے اور اپنے علاقے میں آزادانہ گھوم رہا ہے۔ اس کی کھوپڑی میں ایک دو سوراخ کرنے کے لیے یہ موقع اچھا ہے۔''

چچا اور بھتیجے میں یہ نہایت اہم نوعیت کی گفتگو دبے دبے جوش کے ساتھ جاری رہی۔ ایک دو گھنٹے کے اندر ہی وہ اس پلاننگ کو حتمی شکل دینے میں مصروف ہوگئے۔ چچا جمشید نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس 29 اگست رات بارہ بجے تک کا وقت ہے لیکن ہمیں مناسب گنجائش رکھنا چاہیے اور ٹائم ختم ہونے سے کافی پہلے ہی اپنا کام کرگزرنا چاہیے۔''

حماد اپنے چچا کی کشادہ پیشانی پر اُبھرنے والی سلوٹوں کو دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا اس کے چچا کو افراتفری میں کوئی بھی کام کرنا پسند نہیں۔ وہ ہمیشہ مناسب مارجن رکھتے تھے۔ دفتری امور کو ڈیڈ لائن سے پہلے ہی انجام دے لیتے تھے۔ یوٹیلیٹی بلز بھی آخری تاریخ سے دو چار دن پہلے ہی جمع کرواتے تھے۔ کسی تقریب میں جانا ہوتا تو بھی مقررہ وقت سے آدھ پون گھنٹا پہلے پہنچنا انہیں پسند تھا۔ اب ان کے اہلِ خانہ بھی ان کی اس عادت کو فالو کرنے لگے تھے۔ آج رات جو بھی منصوبہ بندی ہوئی تھی اس میں چچا جمشید نے پہلی شرط یہی رکھی تھی کہ حماد جس طرح دعا کو مایوس کرکے اور دکھ دے کر آیا ہے، اسی طرح اس کے پاس واپس جائے اور اس کے آنسو پونچھے۔ اس سے کہے کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ مستقبل میں امید کی کرنیں موجود ہیں۔ چچا کے اصرار پر بالآخر حماد نے دعا سے دوبارہ ملنے کا عندیہ دے دیا تھا۔

مکمل پلاننگ کے خدوخال واضح کرتے ہوئے چچا نے اس کے سامنے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔ ''کل کا دن تو دعا سے ملاقات کے لیے وقف ہوگیا۔ تم اس سے ملنے پشاور جاؤ گے، اس سے ملو گے اور پھر میرے اندازے کے مطابق رات گیارہ بجے تک واپس یہاں راولپنڈی پہنچو گے۔ اب بچے ہمارے پاس تین دن یعنی تقریباً 72 گھنٹے۔''

حماد نے اثبات میں سر ہلایا۔ چچا جمشید نے بات آگے بڑھائی۔ ''رحیم یار خان کے لیے فلائٹ تمہیں پرسوں شام آٹھ بجے سے پہلے نہیں مل سکتی اس لیے بہتر ہے کہ یہ سفر ٹرین یا پھر اپنی کار کے ذریعے کرلیا جائے۔ ٹرین سے اپنی کار بہتر رہے گی۔ اگر ہم پرسوں صبح سویرے سڑک کے ذریعے رحیم یار خان کے لیے نکلیں اور سب ٹھیک ٹھاک رہے تو دوپہر تک ہم لاہور پہنچ جائیں گے۔ لاہور سے آگے

رحیم یار خان تقریباً 600 کلومیٹر ہے۔ ایک رف سے اندازے کے مطابق ہمیں رحیم یار خان پہنچتے پہنچتے کافی رات ہوجائے گی۔"

حماد نے اثبات میں سر ہلایا۔"رحیم یار خان سے اس بڑھے شیطان کا علاقہ کتنی دور ہے؟"

"وہ تمہاری توقع سے زیادہ ہے۔ سفر زیادہ نہیں ہے لیکن جتنا بھی ہے، مشکل ہے اور رات کے وقت تو بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں رحیم یار خان کے کسی چھوٹے موٹے ہوٹل میں قیام کرنا پڑے گا اور صبح سویرے نکلنا ہوگا...... بلکہ فجر کے ٹائم۔ تمہیں پتا چل گیا ہے کہ ہمارے پاس ٹائم پورا پورا ہے۔ سفر کے دوران میں کئی طرح کی رکاوٹیں آسکتی ہیں۔ ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم شام سے پہلے ہی کوٹھ فاضل (بختیار کے علاقے میں) پہنچ جائیں لیکن جلدی پہنچنا دیر سے پہنچنے سے بہتر ہے۔ کوٹھ فاضل پہنچنے کے بعد تمہارے پاس تقریباً 30 گھنٹے ہوں گے بختیار پر حملہ کرنے کے لیے۔"

"مگر کوٹھ پہنچ کر ہم رکیں گے کہاں؟"

"وہاں اللہ بخشے عثمان بھائی کا ایک پرانا دوست بیلدار صدیق احمد ہے۔ ہم پہلے بھی وہاں آتے جاتے رہے ہیں۔ وہ ہمیں چند گھنٹوں کے لیے ضرور سپورٹ کرے گا۔"

رات بھیگتی چلی گئی اور معصوم شکیلہ کے سفاک مجرم کو انجام تک پہنچانے کا منصوبہ واضح ہوتا چلا گیا۔

حماد صبح ناشتے کے بعد دعا سے ملنے کے لیے روانہ ہونا چاہتا تھا مگر چچا جمشید نے نشیب و فراز سمجھا کر اسے آمادہ کرلیا کہ وہ ابھی نکلے تاکہ رات دس گیارہ بجے سے پہلے پنڈی واپس آسکے۔

☆☆☆

تقریباً چوبیس گھنٹے بعد حماد اور دعا پھر اسی پبلک پارک میں موجود تھے جہاں کل اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ تاہم آج بارش نہیں تھی بس ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اگست کی اس شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ حماد نے پشاور پہنچنے سے دو گھنٹے پہلے ہی دعا کو فون کردیا تھا اور اسے بتادیا تھا کہ وہ پشاور پہنچ رہا ہے اور اس سے ایک بار پھر ملنا چاہتا ہے۔ وہ اس پارک میں پہنچ گئی تھی اور اب دونوں ٹویوٹا گاڑی میں اے سی آن کیے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ دعا کا رنگ ہلدی ہورہا تھا۔ ایک ہی دن میں وہ مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ حماد کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چچا کے مجبور کرنے پر آج یہاں پشاور میں دعا کے پاس نہ پہنچتا تو شاید وہ ایک دو روز میں اسپتال پہنچ جاتی۔

دونوں کی گفتگو آج پھر جذباتی موڑ پر آچکی تھی۔

وہ سسک کر بولی۔"آج تم آٹھ دس سال کی بات کیوں کررہے ہو۔ آٹھ دس سال کی جدائی بھی کچھ کم تو نہیں ہوگی لیکن......" وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

"بولو...... بولو دعا!"

"لیکن تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو اور تم ہی نے کہا تھا کہ یہ قتل تمہیں عمر قید یا پھانسی کے پھندے تک پہنچادے گا اور زیادہ امکان پھانسی کے پھندے کا ہی ہے کیونکہ وہ بڑی طاقت ور فیملی ہے۔ کئی نامی گرامی وکیل ہیں اُن میں اور......"

"پلیز دعا...... پلیز! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے چچا جمشید ٹائم کے کتنے پابند ہیں۔ مجھے ہر صورت دس بجے تک پنڈی واپس پہنچنا ہے۔ میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے، میرے خیال میں وہ تمہاری تسلی کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ فیوچر کے بارے میں کوئی بھی پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا...... لیکن مجھے پوری امید ہے کہ ہماری یہ جدائی آٹھ دس سال سے زیادہ نہیں ہوگی...... اور اگر تم نے تب تک میرا انتظار کرلیا، تو میں...... اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے حماد کی آواز تھوڑی سی بھرّا گئی۔

دعا نے بھی جذباتی ہوکر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے پھر اس کے ایک ہاتھ کی پشت پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے بولی۔"حماد! تم آٹھ دس سال کی بات کرتے ہو۔ میں ساری عمر تمہارا انتظار کرسکتی ہوں۔ تمہارے لیے ساری دنیا سے لڑسکتی ہوں لیکن اگر......"

"بس...... بس۔ اس سے آگے کچھ نہ کہنا دعا۔ مجھے پتا ہے تمہارے ابو تم سے بہت...... بہت زیادہ پیار کرتے ہیں۔ تم اُن سے ہر بات منوا سکتی ہو۔ یہ آٹھ دس سال والی بات بھی منوالو گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے حماد!" وہ روہانسی ہوگئی۔ "لیکن...... میرے منہ میں خاک...... اگر تمہیں پھانسی ہوگئی...... یا پھر...... اس خبیث کو مارتے مارتے تمہیں خود کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا؟"

حماد نے اُس کی پیشانی چومی۔"اگر دعا کی دعا میرے ساتھ ہے تو دیکھنا...... مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

وہ اس کے کندھے سے لگ کر سسکنے لگی۔ حماد نے اس کے نرم ریشمی بالوں پر اپنا رخسار رکھ دیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح چار بجے کے قریب حماد، چچا جمشید کے ساتھ سوزوکی گاڑی میں پنڈی سے رحیم یار خان کے سفر پر روانہ ہوا۔ ان کے زادِ راہ میں ایک سی 96 سی آٹو میٹک ماؤزر بھی موجود تھا۔ اس کے فالتو راؤنڈز کا انتظام بھی حماد نے کر رکھا تھا۔

حماد نے یہ ماؤزر کار کی ڈکی کی پوشش اُدھیڑ کر اس میں بڑے اچھے طریقے سے چھپالیا تھا۔ چند اضافی راؤنڈز بھی موجود تھے۔ گاڑی چچا جمشید خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ حماد ان کے پہلو میں بیٹھا موبائل فون دیکھ رہا تھا۔ اسکرین دیکھتے ہوئے بولا۔

''چچا! آپ کے حساب کے مطابق آج 27 تاریخ ہے لیکن میرے موبائل پر 26 آ رہی ہے۔''

چچا جمشید نے اپنا موبائل چیک کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بھئی، 27 ہی ہے۔ تمہارے موبائل پر غلط ہوگی۔'' پھر انہوں نے ڈیش بورڈ سے تازہ انگریزی اخبار نکالا۔ ''یہ دیکھو، اس پر بھی 27 ہی ہے۔'' اور اخبار پھر ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔ حماد جانتا تھا کہ چچا کو اخبار سے عشق ہے۔ سخت مصروفیت کے دنوں میں بھی وہ ایک دو گھنٹے تو اخبار کے لیے نکال ہی لیتے تھے۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ وہ دوپہر تک بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔ باغوں کے شہر لاہور میں کالے سیاہ بادلوں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو چچا بھتیجا لاہور کے اس موسم سے لطف اندوز ہوتے لیکن اصل بات تو دل کے موسم کی ہوتی ہے۔ دل کے موسم میں بے چینی تھی، اضطراب تھا اور آمدہ لمحوں کی سنسنی تھی۔ خاص طور سے حماد کے سینے میں تو اس کی دھڑکن مسلسل کسی نقارے کی طرح گونج رہی تھی۔ اس نقارے کے ساتھ ساتھ کچھ شعلے بھی پھنکار رہے تھے۔ یہ اُس آگ کے شعلے تھے جو پچھلے پچاس سال سے بھڑک رہی تھی۔ اس نیلی آگ کا پھول مختلف سینوں میں سفر کرتا ہوا اب اس کے نوخیز سینے میں کھلا ہوا تھا...... اور پچاس سال کچھ کم نہیں ہوتے۔ اتنے عرصے میں تو آگ خود کندن بن جاتی ہے۔ اس پچاس سالہ آگ کو اپنے سینے میں محسوس کر کے حماد کو یوں لگتا تھا جیسے اپنی سوچوں اور اپنے ارادوں کے اعتبار سے وہ خود بھی پچاس

سال کا ہو چکا ہے۔ ایک توانا، پختہ کار مرد۔

لاہور میں لنچ کرنے کے بعد وہ دونوں پھر گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ فیول وغیرہ لینے کے بعد انہوں نے اپنا رخ رحیم یار خان کی طرف کرلیا۔ وہی رحیم یار خان جس کے مضافات میں کہیں وہ بدبخت شخص رہتا تھا جس نے معصوم شکیلہ کو تاراج کیا تھا۔ وہ بدبخت اس لحاظ سے خوش قسمت بھی تھا کہ ثابت شدہ قاتل اور ریپسٹ ہونے کے باوجود ابھی تک زندگی کی بہاریں دیکھ رہا تھا۔

ان کا اندازہ تھا کہ رات نو بجے تک رحیم یار خان پہنچ جائیں گے۔ اس میں تھوڑی سی تاخیر ہوئی اور وہ دس بجے شہر کے ایک متوسط ہوٹل میں پہنچ گئے۔ اب تک سب ٹھیک جارہا تھا۔ کل صبح انہوں نے رحیم یار خان سے بختیار فیروز کی جاگیر تک سفر کرنا تھا۔ تقریباً بیس کلومیٹر تو پختہ سڑک تھی۔ اس کے بعد نیم پختہ اور دشوار راستہ شروع ہوتا تھا۔ بہرحال انہیں امید تھی کہ شام تک بیلدار صدیق احمد کے ٹھکانے تک پہنچ جائیں گے۔ اگر ٹائم لائن دیکھی جاتی تو یہ بڑی ڈرامائی صورتِ حال تھی۔ حماد کی عمر اٹھارہ سال مکمل ہونے میں اب صرف دو دن باقی تھے۔ 29 اگست کو رات کے بارہ بجتے ہی اس نے قانونی طور پر بالغ ہوجانا تھا اور پھر اس کے لیے تعزیرات پاکستان کے سارے پیمانے بدل جانے تھے۔

☆☆☆

اگلے روز صبح سویرے اس کہانی نے ایک نیا موڑ لے لیا۔ پروگرام تو یہی تھا کہ حماد اور چچا جمشید اپنی شناخت خفیہ رکھتے ہوئے پوری رازداری کے ساتھ بختیار فیروز کے علاقے میں پہنچیں گے۔ وہاں چچا جمشید تو بیلدار صدیق کے ڈیرے پر روپوش رہیں گے اور حماد پرسوں دوپہر ہونے والی دو تین کارنر میٹنگز میں سے کسی ایک میٹنگ میں بختیار فیروز پر حملہ آور ہوگا...... لیکن جواں سال حماد کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ وہ چچا کو اس سارے معاملے میں مزید گھسیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چچا جمشید بھی کسی طرح اس قتل میں ملوث پائے جائیں اور قانون کی گرفت میں آئیں۔ اس کی گرفتاری کے بعد چچا جمشید ہی وہ شخص تھے جنہوں نے فیملی کی دیکھ بھال کرنا تھی اور خود حماد کے لیے قانونی چارہ جوئی کرنے کی ذمّے داری بھی ان پر ہی آنا تھی۔ لہٰذا حماد نے ایک کام کیا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب جب ہوٹل کے کمرے میں حماد اور چچا جمشید سونے لگے تو چچا نے حسبِ معمول کھانسی کا سیرپ لیا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس سیرپ میں آج چند قطرے ایک ہائی پوٹینسی دوا کے بھی ملے ہوئے ہیں۔ یہ نشہ آور دوا چچا جمشید کو دوپہر تک سُلانے کے لیے کافی تھی۔

صبح سات بجے کے لگ بھگ حماد نے ایک چھوٹی سی پرچی چچا کے سرہانے رکھ کر انہیں دل ہی دل میں الوداع کہا اور ہوٹل سے نکل آیا۔ اس نے پارکنگ سے گاڑی لی اور اس کا رخ شہر کے مضافات کی طرف کردیا۔ فیس ماسک، پی کیپ اور سن گلاسز کے ساتھ حماد، بختیار کی جاگیر تو کیا، اس کے گھر پر بھی چلا جاتا تو کوئی اسے پہچان نہ پاتا۔

جلد ہی وہ پختہ سڑک پر سفر کرتا ہوا شہر سے دس پندرہ کلومیٹر آگے چلا آیا۔ اسے پتا تھا کہ دشوار سفر کا آغاز پختہ سڑک کے بعد ہوگا۔ اس نے گاڑی کا تیل پانی اور اضافی ٹائر وغیرہ اچھی طرح چیک کرلیے تھے۔ جونہی اس نے ایک موڑ کاٹا، اسے ٹریفک جام نظر آیا۔ گاڑیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں اور ٹرک وغیرہ بھی رکے ہوئے تھے۔ زیادہ ٹرک وہ تھے جو قریبی فیکٹریوں کے لیے سامان وغیرہ لے کر آتے جاتے تھے۔ پندرہ بیس منٹ تک حماد نے صبر سے ٹریفک کھلنے کا انتظار کیا۔ اس دوران پیچھے بھی گاڑیوں کی قطار لگ چکی تھی۔ حماد نے مخالف سمت سے آنے والے ایک موٹر سائیکل سوار سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے بھائی صاحب؟“

اس شخص نے مقامی لہجے میں بتایا۔ ”رات کو تیز بارش کے بعد نالے میں زیادہ پانی آیا ہے اور پُل ٹوٹ گیا ہے۔ بہت لمبی لائن لگی ہوئی ہے بلکہ لائنیں لگی ہوئی ہیں...... پہلے موٹر سائیکل اور چھوٹی گاڑیاں ایک ایک کرکے گزر رہی تھیں، اب وہ بھی نہیں گزر رہیں۔ ٹریفک بالکل پھنس گیا ہے۔“

کئی دوسرے لوگوں کی طرح حماد بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر اب بھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ دونوں طرف دور تک کھیتوں میں فصلیں لہلہاتی نظر آرہی تھیں۔ حماد نے ایک نسبتاً اونچی جگہ پر کھڑے ہوکر دیکھا اور ٹھٹکا گیا۔ یہ کوئی دو کلومیٹر لمبی قطار تھی۔ حماد کے عقب میں بھی بے شمار گاڑیاں پھنس چکی تھیں۔ کچھ جلد باز ڈرائیوروں نے ٹرک اور ٹرالیاں وغیرہ ریورس کرنے کی کوشش کی تھی اور ٹریفک جام کو مزید بدتر کردیا تھا۔

ایک مقامی شخص نے بتایا۔ ”پُل کے ٹوٹے ہوئے حصے پر مٹی اور ریت وغیرہ ڈالی جارہی ہے۔ ٹریفک پولیس والے بھی آگئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے تک گاڑیاں

حرکت میں آجائیں۔"

انتظار کٹھن ہوتا ہے اور حماد کا انتظار تو کہیں زیادہ کٹھن تھا۔ وہ ایک نہایت شدید اور سنگین قسم کے شیڈول میں پھنسا ہوا تھا۔ اس شیڈول میں دنوں کی نہیں، گھنٹوں کی گنتی تھی۔ مقامی شخص نے ایک دو گھنٹے کا کہا تھا مگر پورے چھ گھنٹے گزر گئے، صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ حماد کو پچھتاوا محسوس ہونے لگا۔ چچا جمشید کا پروگرام یہ تھا کہ صبح پانچ بجے ہوٹل سے نکلا جائے لیکن حماد ضروریات سے فارغ ہو کر سات بجے کے قریب نکلا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اگر وہ جلدی نکل آتا تو اس منحوس ٹریفک جام سے پالا ہی نہ پڑتا۔

اب شام کے سائے طویل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لوگوں کا صبر جواب دیتا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے ساتھ خواتین اور بچے تھے۔ وہ گاڑیاں جوں کی توں چھوڑ کر نکل گئے تھے۔ کچھ لوگ اپنی گاڑیوں کو کھیتوں کے اندر سے نکالنے کی ناکام اور کامیاب کوششیں کر رہے تھے۔ یہ زیادہ تر جیپیں ہی تھیں۔ ان کے مالکان یقیناً قریبی فیکٹریوں سے تعلق رکھتے ہوں گے یا پھر کھاتے پیتے زمیندار۔ حماد کے سامنے ہی ایسی کم و بیش چار جیپیں کھیتوں کے اندر سے گزر کر اور فصل کو روند کر اوجھل ہو گئیں۔ یقیناً اس جانب کوئی چھوٹی موٹی سڑک تھی جہاں پہنچ کر وہ لوگ اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہوں گے لیکن کھیتوں کے اندر سے یوں گزرنا آسان نہیں تھا۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ حماد جیپ پر نہیں، کار پر تھا۔

وہ کافی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے سینے میں فروزاں پچاس سالہ آگ کی تپش اس کے پورے جسم میں انگارے بھر رہی تھی...... اب یا کبھی نہیں...... اس کے دل سے بار بار یہی آواز آتی تھی۔ رات کوئی نو بجے کا وقت تھا جب اس نے اندرونی طیش کے سبب اپنے دانت پیسے اور اپنی کار کو اسٹارٹ کر کے اسے مکئی کے کھیت میں گھسا دیا۔ گاڑی اچھلتی کودتی، لہراتی آگے بڑھنے لگی۔ حماد کے لیے تھوڑی سی آسانی اس لیے موجود تھی کہ اس سے پہلے جو چار پانچ وزنی جیپیں یہاں سے گزری تھیں، انہوں نے اس راستے کو قدرے کم مشکل کر دیا تھا۔ ہیجانی کیفیت میں وہ مختلف کھیتوں کو پار کرتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ دو مقامی افراد نے بتایا تھا کہ اسے کم و بیش دو کلومیٹر طے کرنا پڑیں گے۔ ابھی اس نے بہ مشکل ایک ڈیڑھ کلومیٹر ہی سفر کیا تھا کہ ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں داخل ہوتے وقت اس کی کار ایک پگڈنڈی پر بری طرح اچھلی اور اس کے دونوں اگلے پہیے ایک کیچڑ آلود کھڈے میں گھوم کر رہ گئے۔ حماد نے گاڑی آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ وہ بے طرح جھلاہٹ کا شکار تھا جب اسے کچھ دور ٹارچوں کی روشنی اور شور سنائی دیا۔ صاف محسوس ہوا کہ کچھ لوگ لپکتے ہوئے اس کی طرف آ رہے ہیں۔ حماد کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے باہر نکل کر جلدی سے گاڑی کی ڈِگی کھولی اور خفیہ خانے میں رکھا ہوا سی 96 نکال کر اپنی پنڈلی سے لگے ہوئے ربر بینڈ میں پھنسا لیا۔ پینٹ برابر ہونے کے بعد بالکل اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ ٹانگ کے ساتھ کوئی ہتھیار موجود ہے۔

آنے والے سات آٹھ دیہاتی افراد تھے۔ دو کے ہاتھ میں رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک دو کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ایک تنومند شخص جو حلیے سے کسی زمیندار کا کارندہ لگتا تھا، اسے دیکھ کر گرجا۔ "اوئے! یہ تمہاری خالہ جی کا واڑا ہے جہاں اپنی اس ماں کو لے کر گھس آئے ہو؟" اس کا اشارہ حماد کی آلٹو کار کی طرف تھا۔

"بھائی جان! تمیز سے بات کرو۔ میری مجبوری تھی جو میں نے......"

"اوئے تیری مجبوری کی ایسی کی تیسی۔ شہر سے آجاتے ہو یہاں مستیاں کرنے کے لیے۔ ہماری فصل کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔ لاکھوں کا نقصان ہے۔ کون بھرے گا اسے؟ ہم سب کارستانی دیکھتے ہوئے آ رہے ہیں۔"

"بھائی جان! یہ جو کچھ ہے، پہلے سے ہو چکا ہے۔ کئی جیپیں گزری ہیں یہاں سے۔ میں نے تو بس......"

"اوئے بکواس بند کر۔" ایک رائفل بردار نے اسے رائفل سے ٹہوکا دیا پھر ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "استاد جی! اسے لے چلیں ڈیرے پر۔ سویرے مالک آ کر اور سارا نقصان دیکھ کر خود ہی فیصلہ کریں گے۔"

باقیوں نے بھی اس بات کی تائید کی۔ ایک لمحے کے لیے حماد کے جوان خون نے جوش مارا اور اس کا دل چاہا کہ بھڑ جائے ان لوگوں سے لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ایک چھوٹی سی چنگاری کے لیے وہ اس پچاس سالہ الاؤ کو کیسے فراموش کر دیتا جو ہر آنے جانے والی سانس کے ساتھ اسے اپنی موجودگی اور بے پناہ تپش کا احساس دلاتا تھا۔ دو رائفلیں خطرناک انداز میں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

اس نے بات اور دلیل سے کام چلانا چاہا مگر ان لوگوں کی غضب ناکی بڑھتی جارہی تھی۔ انہوں نے گاڑی کی چابی اپنے قبضے میں لی اور اسے دھکیلتے ہوئے اپنے ڈیرے کی طرف لے چلے۔

☆☆☆

یہ ڈیرے کا چھوٹا سا گودام تھا۔ اس نیم پختہ گودام میں گڑ، چاول اور چنے وغیرہ کی بوریاں پڑی تھیں۔ حماد کو بندوق کی نوک پر یہاں لاکر بند کردیا گیا تھا۔ استاد نے کہا تھا کہ زمیندار خدا بخش صاحب آئیں گے تو اس کا فیصلہ کریں گے۔ حماد نے ان لوگوں کو سمجھانے بجھانے کی بڑی کوشش کی تھی مگر انہوں نے اسے دھکیل کر پھاٹک نما دروازہ باہر سے بند کردیا تھا۔ انہوں نے اس کی تلاشی لے کر نقدی اور موبائل وغیرہ نکال لیے تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ تلاشی لینے والا اس کی دائیں پنڈلی تک نہیں پہنچ پایا تھا اور ماؤزر ابھی تک حماد کے پاس ہی تھا۔ اس کے علاوہ رسٹ واچ بھی بچ گئی تھی۔

گودام سے باہر گرج چمک کے ساتھ ایک بار پھر بارش شروع ہوچکی تھی۔ حماد اضطراب کے عالم میں دیر تک دروازہ پیٹتا رہا اور ڈیرے کے ملازموں کو پکارتا رہا بالآخر کوئی دو گھنٹے بعد اس کی فریاد پر ردِعمل ظاہر ہوا۔ استاد نامی شخص نے دروازے کے قریب آ کر غنودہ لہجے میں کہا۔

''اوئے انسان کا بچہ بن۔ اس طرح رولا مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بے شک ساری رات گلا پھاڑتا رہ۔ سویرے دس بجے کے قریب چودھری خدا بخش صاحب آئیں گے تو تیرا فیصلہ کریں گے۔''

''میرا...... بہت اہم مسئلہ ہے...... مجھے ہر صورت کہیں پہنچنا ہے۔'' وہ آہنی دروازے سے منہ لگا کر چلایا۔

''کاکا جی! مسئلہ تو ہمارا بھی چھوٹا نہیں ہے۔ آٹھ پیلیوں (کھیتوں) میں فصل برباد ہوئی ہے ہماری۔ اب تیرے لیے چنگا یہی ہے کہ رات گزار لے۔ اگر بھوک شوک لگی ہے تو اندر ہی بھنے ہوئے چنے بھی ہیں اور گڑ بھی ہے۔ گزارا مزارا کرلے۔''

وہ پکارتا ہی رہ گیا مگر استاد واپس جاچکا تھا۔

وہ رات بڑی تکلیف دہ تھی۔ کل کا دن حماد کے پاس آخری تھا۔ بقول چچا جمشید، کل رات بارہ بجے کے بعد حماد کے لیے سارے قانون بدل جانے تھے۔ اندھے قانون کے قاعدے ضابطے ایسے ہی بے لچک ہوتے ہیں۔ اسے خیال آیا کہ چچا جمشید کہاں اور کس حال میں ہوں گے؟ وہ لکھ کر آیا تھا کہ اپنی مرضی سے جارہا ہے، کہاں جارہا ہے؟ یہ بھی اس نے واضح نہیں کیا تھا۔ جان بوجھ کر بات کو گول مول رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب تک اسے رحیم یار خان میں ہی ڈھونڈ رہے ہوں۔

حماد نے صبح تک اس گودام سے نکلنے کی بہت کوششیں کیں لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ دوسری طرف اگست کی بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے ذرا دھیمی پڑتی تھی پھر آسمان سے چھاجوں پانی برسنے لگتا تھا۔ بقول استاد چودھری خدا بخش کو صبح دس بجے آنا تھا مگر تابڑتوڑ بارش کی وجہ سے وہ دس بجے بھی نہ آسکے۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کو حرکت کرتی رہیں۔ دن گزرتا چلا گیا۔ اس کی ''نابالغی'' کا دورانیہ کم ہوتا چلا گیا۔ سہ پہر تک اس کی شپٹاہٹ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ ماؤزر نکالے اور دروازے پر اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کردے لیکن مضبوط آہنی دروازے پر یہ چاند ماری بھی بے کار ہی نظر آتی تھی۔

شام کے آثار گہرے ہونے لگے تو حماد پر جیسے جنون طاری ہوگیا۔ اس نے ڈیرے کے ملازموں کو گالیاں دیں اور پھاٹک نما آہنی دروازے کو بُری طرح جھنجوڑنا شروع کردیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس منحوس عمارت میں اب کوئی موجود ہی نہیں۔ بارش کا شور مسلسل سنائی دے رہا تھا۔ جب وہ دیوانہ وار دروازے کو جھنجوڑ رہا تھا کہ اچانک ایک کھٹکا سنائی دیا...... اور دروازے کے چوڑے پٹ کھل گئے۔ وہ دنگ رہ گیا...... نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ دروازے کو مسلسل جھنجوڑتے رہنے سے اس کے باہر لگی ہوئی آہنی کنڈی نیچے گرگئی تھی۔

ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر حماد نے ماؤزر ہاتھ میں لیا اور باہر نکل آیا۔ اسے کہیں مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اسے برآمدے میں بھینسوں کے پاس صرف ایک فرد نظر آیا اور وہ وہی لمبا تڑنگا استاد تھا۔ وہ کسی نشے کی ترنگ میں چارپائی پر مدہوش پڑا تھا۔ حماد نے اس کے سرہانے سے پلاسٹک کا ایک شاپر اٹھایا اور اپنے ماؤزر کو اس میں لپیٹ لیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ برستی بارش میں ڈیرے سے باہر تھا۔

اب شام گہری ہوچکی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کررہی تھیں۔

☆☆☆

ڈیرے سے آگے آنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی کی سمت جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر چلتا اور کبھی بھاگتا ہوا اس سمت جا رہا تھا جہاں کل ایک سخت قسم کا ٹریفک جام ہوا تھا اور وہ پھنس کر رہ گیا تھا۔ اب چچا جمشید کے دیے ہوئے شیڈول کے مطابق اس کے پاس صرف اور صرف چار گھنٹے باقی تھے۔ کیا وہ ان چار گھنٹوں میں کچھ کر پائے گا؟

وہ پختہ سڑک پر پہنچا تو وہاں اب ٹریفک جام کا نام و نشان نہیں تھا۔ اکا دکا چھوٹی بڑی گاڑیاں روانی سے آ جا رہی تھیں۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور پھر اسے ایک ایسی پک اَپ میں لفٹ مل گئی جو ایک قریبی گاؤں کی طرف ہی جا رہی تھی۔ پک اَپ والے کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ اسے کوٹھ فاضل تک لے جائے، حماد کو کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ پک اَپ والے کو معاوضہ دینے کے لیے حماد کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ اس نے اپنی رسٹ واچ اتار کر پک اَپ والے کے ہاتھ پر رکھ دی جو اس نے رسمی انکار کے بعد قبول کر لی۔ حماد نے اس سے درخواست کی کہ وہ ایک ایمرجنسی میں ہے اور وہ اسے جلد از جلد منزل تک پہنچانے کی کوشش کرے۔

وہ ایک نہایت کٹھن اور تناؤ بھرا سفر تھا۔ بارش نے راستے کی دشواری میں اضافہ کر رکھا تھا۔ پک اَپ والے نے جب بختیار فیروز کی شاندار حویلی سے تقریباً نصف کلومیٹر کے فاصلے پر حماد کو اتارا تو رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔

مایوسی کی ایک لہر نے ...... ایک بلند و بالا لہر نے حماد کو ڈھانپ لیا...... ایک گھنٹے میں کیا ہو سکتا تھا؟ وہ تاریکی میں کھڑا حویلی کی بلند و بالا دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ ان لمحوں میں اسے چچا جمشید شدت سے یاد آئے۔ وہ ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ دوڑ میں خود کو ہمیشہ تھوڑا آگے رکھنا چاہیے۔ وقت سے پہلے نکلنا اور وقت سے پہلے پہنچنا ہر لحاظ سے سودمند ہوتا ہے۔

برستی بارش میں وہ بختیار فیروز کی حویلی سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر دو خراب، زنگ آلود تریشر مشینوں کے عقب میں چھپا رہا اور حویلی کی طرف دیکھتا رہا۔ مین دروازے پر اور یقیناً اندرونی حصے میں بھی مسلح پہرے دار موجود تھے اور وہ خودکشی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں، ایک گھنٹے میں کیا ہو سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں ہوا۔ وقت 29 تاریخ کو پھلانگ کر 30 تاریخ میں داخل ہو گیا...... اب اس کا اسٹیٹس ایک نابالغ قاتل کا نہیں تھا۔

☆☆☆

ابھی دن کا اُجالا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ وہ انہی تریشر مشینوں کے عقب میں موجود تھا۔ بارش رک چکی تھی۔ آسمان پر تارے جھلک دکھا رہے تھے۔ وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا لیکن کیا اب وہ ایسے ہی پلٹ جائے گا؟ لودھی فیملی کے بدترین دشمن کے قریب آ کر ایسے ہی نامراد لوٹ جائے گا؟ یہ ایک نہایت سنگین دوراہا تھا۔ اس دوراہے کی ایک طرف اسے اپنا دشمن بختیار فیروز کھڑا نظر آیا اور دوسری طرف اپنی محبت دعا۔ وہ اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ اگر اس کے ساتھ خدانخواستہ موقع پر ہی کچھ نہ ہو گیا تو وہ واپس پلٹے گا۔ اسے چند سال انتظار کی زحمت ضرور ہو گی لیکن وہ اسے مایوس نہیں کرے گا مگر یہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ راستے میں ہو جانے والی تاخیر کے سبب وہ سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا جو اس کے معاملہ فہم چچا نے اس کے لیے بنایا تھا۔ اب وہ قاتل بنتا تو اس بات کا امکان ننانوے فیصد سے

## چانس

ایک آدمی سمندر میں غوطے لگانے لگا۔ ایک نوجوان نے اسے بچا لیا۔ اس شخص نے خوش ہو کر کہا۔ ”جی چاہتا ہے تمہیں پچاس روپے انعام دوں لیکن میرے پاس سو روپے کا نوٹ ہے۔“

”کوئی بات نہیں، میں آپ کو ایک بار پھر ڈوبنے سے بچا سکتا ہوں۔“

## پڑوسی

دو بے وقوفوں پر عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ جج نے ایک بے وقوف سے پوچھا۔ ”کہاں رہتے ہو؟“

بے وقوف سر ہلاتے ہوئے۔ ”کہیں بھی نہیں۔“

جج نے یہی سوال دوسرے بے وقوف سے کیا۔

وہ پہلے بے وقوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کے پڑوس میں۔“

محمد اسحاق انجم، کنگن پور قصور

زائد تھا کہ بختیار جاگیردار کی فیملی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچادے گی...... یا پھر ایک بہت لمبی سزا اس کے مقدر میں لکھ دی جائے گی۔ ہاں، اب اس کا ایک "عاقل بالغ" قاتل میں شمار ہوتا تھا۔

وہ شدید ترین تذبذب کے عالم میں سوچتا رہا اور اُلجھتا رہا۔ وہ زیادہ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتا تھا۔ اچانک وہ بے طرح چونک گیا۔ اسے حویلی کے پھاٹک میں ہلکی سی حرکت محسوس ہوئی۔ دونوں گارڈز الرٹ نظر آئے پھر پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھلا اور لحیم شحیم بختیار فیروز باہر نکلتا دکھائی دیا۔ صبح کے ملگجے میں اس کی سفید مونچھیں اور نیم سفید گھنی بھویں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا اور اس کے منہ میں مسواک دبی ہوئی تھی۔ ایک فربہ اندام ملازم مؤدب انداز میں اس کے پیچھے آرہا تھا۔ حماد کو اندازہ ہوا کہ بختیار فیروز علی الصباح چہل قدمی کے لیے نکلا ہے۔ اسے دیکھ کر مسلسل سلگتی ہوئی پچاس سالہ آگ، الاؤ بن گئی۔ نیلے پھول کی زہریلی رنگت حماد کے رگ وپے میں پھیل گئی۔

بختیار فیروز آرام سے ٹہلتا ہوا اس کے سامنے سے گزرا اور قریبی باغ کی طرف چل پڑا۔ حماد دیواروں کی اوٹ لیتا ہوا اس کے عقب میں گیا۔ بختیار کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ پچاس سال پہلے اس نے ایک بے گناہ لڑکی پر جو ظلم ڈھایا تھا، اس کا ردِعمل آج ایک سراپا شعلہ لڑکے کی صورت میں اس کے سر پر پہنچ چکا ہے۔ دوسری طرف حماد کو بھی توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اپنے شکار تک پہنچ جائے گا اور اتنی سہولت سے وار کرسکے گا۔ وہ اپنا ماؤزر نکال چکا تھا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی کی اوٹ میں پہنچ کر اس نے ماؤزر سیدھا کیا۔ درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ان لمحوں میں اسے یوں لگا جیسے کسی تاریک گوشے سے نکل کر نازک اندام دعا اچانک اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔

"نہیں حماد! پلیز رک جاؤ۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم واپس آؤ گے۔ تم زیادہ دیر مجھ سے دور نہیں رہو گے۔ اب کیوں ایسے راستے پر جارہے ہو جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔"

وہ دونوں بازو پھیلا کر اس کے سامنے کھڑی تھی مگر اب حماد کو یوں لگ رہا تھا کہ کچھ بھی اس کے بس میں نہیں رہا۔ دعا کے تصوراتی ہیولے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بختیار فیروز پر تین فائر کیے۔ ایک اس کے پہلو، اور دوسر میں لگے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ چکرا کر گرا۔ اس کے ساتھ چلنے والے فربہ اندام شخص نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی لمبی قمیص کے نیچے سے پسٹل نکال لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فائرنگ چارے سے لدی ہوئی ٹرالی کے پیچھے سے ہوئی ہے۔ وہ تیر کی طرح حماد کی طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حماد کو نشانہ بناتا، حماد نے اس کے سینے میں بھی گولی اتار دی۔

پھر وہ پلٹا اور نیم تاریک گلیوں میں بھاگتا ہوا کھیتوں میں داخل ہوگیا۔ اس کے عقب میں بھاگو، دوڑو، پکڑو کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے نوخیز جسم میں چیتے جیسی تیزی طراری تھی۔ شاید وہ نکل ہی جاتا لیکن پھر پولیس موبائل کے سائرن بھی سنائی دینے لگے۔ وہ اندھا دھند بھاگتے ہوئے کوئی نصف کلومیٹر مزید آگے گیا تھا جب ہوا میں سنسناتی ہوئی ایک گولی اس کے کندھے میں لگی۔ وہ دھپ سے کیچڑ آلود زمین پر گرا۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں بالکل قریب پہنچ چکی تھیں...... اس نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

یہ تقریباً پانچ ہفتے بعد کی بات ہے۔ دس پندرہ روز تک تو حماد اسپتال میں رہا تھا پھر ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں چلا گیا تھا۔ اب جوڈیشل ہوکر جیل میں آگیا تھا۔ اس نے گوٹھ فاضل میں جو فائرنگ کی تھی، اس میں بختیار فیروز تو موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ اس کا کارندہ فرمان اسپتال پہنچنے کے بعد دم توڑ گیا۔ اب حماد پر دہرے قتل کا کیس بن چکا تھا۔

وہ گم صم سا بیرک کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ سینے میں جیسے جدائی کا دکھ ٹھہر سا گیا تھا۔ دعا کا معصوم چہرہ اُس کی نگاہ میں تھا۔ دکھ میں ڈوبا ہوا، آنسو بہاتا چہرہ۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے کہتی رہتی تھی۔ "مجھے پتا ہے حماد! اب تم نہیں آؤ گے...... مجھے پتا ہے، ہماری کہانی ختم ہوچکی ہے۔"

حماد نے ایک طویل آہ بھری اور سوچنے لگا کہ قانون توڑنے والا کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو، اس نے کتنی ہی مکمل پلاننگ کیوں نہ کی ہو لیکن کہیں نہ کہیں کوئی خامی رہ ہی جاتی ہے جو اسے سزا کے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔ اس نے ایسے اَن گنت واقعات سن رکھے تھے جب کسی ایسے ہی کام کے

لیے بڑی منصوبہ بندی سے قدم اٹھایا گیا لیکن کہیں نہ کہیں کوئی خامی رہ گئی۔

”تمہاری ملاقات آئی ہے۔“ ایک سخت آواز نے اسے چونکایا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے پتا تھا کہ آج چچا آرہے ہیں۔ وہ ملاقات والے حصے میں پہنچا۔ سلاخوں کی دوسری طرف وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک اسٹول پر بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ جیل کے ایک مقدم نے کہا۔ ”نہیں جی، نہیں۔ آپ بیٹھے رہو۔ میں اس کے لیے بھی اسٹول رکھوا دیتا ہوں۔“

جیل میں یہ تھوڑی سی عزت شاید اس لیے تھی کہ اس کے چچا ایک قانون داں بھی تھے۔ وہ دیر تک گہری نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اسے اس بات کی بھی ندامت تھی کہ وہ اس رات رحیم یار خان کے ہوٹل میں اپنے چچا کو نشہ آور دوا کھلا کر نکل گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آج شاید وہ اس بات کا تذکرہ بھی کریں گے لیکن انہوں نے اس قسم کا کوئی موضوع نہیں چھیڑا۔ اپنی پیشانی پر جھولنے والے نیم سفید بالوں کی لٹوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے بولے۔ ”اب کیا ارادہ ہے بھتیجے؟“

وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”اب میرا کیا ارادہ ہونا ہے؟ ارادہ تو ان لوگوں کا ہونا ہے جنہوں نے مجھے پکڑا ہے...... چار چھ ماہ کے اندر کال کوٹھری اور پھر شاید پھانسی......“

وہ اطمینان سے بولے۔ ”پھانسی تو تمہیں نہیں ہوگی۔“

حماد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے دیوار سے ٹیک لگالی تھی۔

”کیا مطلب؟ پھانسی کیوں نہیں ہوگی......؟ دہرا قتل کیا ہے میں نے...... اور جو منظر نامہ آپ نے بتایا تھا چچا...... وہ اُس رات ناکام ہوگیا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں واردات کے وقت میں عمر کی وہ حد پار کر چکا تھا جو مجھے پھانسی سے بچا سکتی تھی۔“

وہ ہولے سے مسکرائے۔ ان کی فراخ پیشانی پہ چمک سی نمودار ہوئی۔ ”تم نے وہ حد پار نہیں کی تھی۔ تم قانونی طور پر اس وقت اٹھارہ سال کے نہیں ہوئے تھے۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ وہ حیرت زدہ نظر آیا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔ ”تمہیں یاد ہوگا حماد! جب ہم گاڑی پر رحیم یار خان کے لیے روانہ ہو رہے تھے تم نے اپنا موبائل دیکھتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ آج 27 اگست نہیں 26 اگست ہے۔ میں نے تمہاری بات رد کی تھی اور کہا تھا کہ نہیں آج 27 ہی ہے، تمہارا موبائل غلط بتا رہا ہے۔“

حماد نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ چچا جمشید نے بات جاری رکھی۔ ”میں نے تمہیں ڈیش بورڈ سے اخبار بھی نکال کر دکھایا تھا اور بتایا تھا کہ آج 27 تاریخ ہی ہے۔“ حماد نے پھر ہاں میں جواب دیا۔ وہ اطمینان سے بولے۔ ”تم نے اخبار کو دھیان سے نہیں دیکھا تھا۔ اس پر بھی 26 تاریخ ہی تھی...... اور تمہارا موبائل فون بھی درست تاریخ ہی بتا رہا تھا......“

حماد کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ جس ڈیٹ کو اپنی ”نابالغی“ کی لاسٹ ڈیٹ سمجھ رہا تھا، وہ لاسٹ نہیں تھی، وہ سیکنڈ لاسٹ تھی...... مطلب یہ کہ جس تاریخ کو علی الصباح اس نے اپنی پھپھو کے قاتل بختیار کو جہنم واصل کیا، اس تاریخ کو ابھی اس نے اٹھارہ سال کی حد پار نہیں کی تھی...... کیا واقعی ایسا تھا؟

چچا جمشید نے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔ دیوار سے ٹیک لگائے بولے۔ ”تمہیں پتا ہے حماد! میں اپنے ہر قسم کے پروگرامز میں ہمیشہ وقت کا مارجن رکھتا ہوں۔ میں نے یہاں بھی احتیاطاً ایک دن کا مارجن رکھ چھوڑا تھا۔ مجھے پتا تھا ہمارا شیڈول طویل ہے۔ یہاں کہیں بھی، کسی موقع پر کوئی رکاوٹ، کوئی تاخیر ہوسکتی ہے۔ میرا خیال ہے...... میری یہ احتیاط کام کر گئی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

حماد یک ٹک انہیں دیکھتا رہ گیا۔ وہ مجسم حیرت تھا۔ چچا جمشید کی جس عادت سے ہمیشہ اسے چڑ رہی تھی، اس عادت نے اسے قانونی طور پر ایک ناقابلِ بیان فائدہ پہنچا دیا تھا۔ اب جو کچھ بھی تھا وہ پھانسی گھاٹ کا مسافر نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی جاگ گئی۔ اس نے سلاخوں سے آگے، دور بہت دور دعا کو دیکھا...... اور دل ہی دل میں پکار اٹھا...... میں آؤں گا دعا! ایک دن ضرور آؤں گا۔ وعدے کے مطابق میرا انتظار کرنا۔

پھر وہ اشک بار نگاہوں سے اپنے محسن چچا کی طرف دیکھنے لگا۔

❖ ❖ ❖

یادوں کی اوٹ سے جھانکتی کہانیاں

**محی الدین نواب**........ کو ہم سے جدا ہوئے کافی سال بیت چکے ہیں... مگر کچھ لوگ اس عالمِ فانی سے گزر جانے کے باوجود زندہ رہتے ہیں... نواب صاحب آج بھی اپنے پرستاروں کے دلوں میں اپنی تحریروں کی صورت میں زندہ ہیں... وہ لفظوں کے کھلاڑی تھے... انہوں نے اَن گنت موضوعات پر یادگار کہانیاں لکھیں... جیتی جاگتی زندگی سے منفرد کہانیاں قلم بند کیں... دیوتا ان کی زندگی کی ناقابلِ فراموش تخلیق تھی... جے۔ڈی۔پی کے ساتھ ان کا دیرینہ اور دیرپا تعلق تھا... جو تا زندگی قائم رہا...

# گل بانو

زیرِ نظر کہانی غیر مطبوعہ ہے... جو ہمارے خزانے سے دریافت ہوئی ہے... اب نواب صاحب ہیں... نہ ان کی تازہ تحریریں... ان کے ہنر اور کمال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی غیر مطبوعہ کہانی کو نذرِ قارئین کرتے ہیں... جو یقیناً ان کے لیے گولڈن جوبلی کا بہترین تحفہ ثابت ہوگی...

دوستی، دشمنی، محبت اور نفرت کی فضاؤں میں ڈوبی گل بانو کی کتھا......

دنیا میں سب ہی محبت کرتے ہیں۔ کوئی ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہے۔ کوئی پردے کی اوٹ میں کرتا ہے۔ دل میں کھوٹ نہ ہو تو آخری دم تک پریت کی ریت نبھاتا ہے۔ جوانی کی مستی ہو، دل میں کوئی ہستی بستی ہو تو اس کے لیے جان پر کھیل جانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ پیار کے متوالے دنیا سے نہیں ڈرتے۔ بھری بندوق کے سامنے بھی سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔

رات کے سناٹے میں ٹھائیں کی آواز دور تک گرجتی اور گونجتی ہوئی گئی۔ وہ دونوں سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ایک دوسرے سے ایسے چمٹ گئے کہ ان کے درمیان سے بندوق کی گولی نہیں گزر سکتی تھی۔ وہ دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ”ہائے ماہ نور! تمہارے بابا سائیں آگئے ہیں۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی فائر کی دوسری آواز اُن کے کانوں میں آئی۔ ماہ نور نے بُری طرح سہم کر کہا۔ ”ہائے نادر! تمہارے بابا سائیں بھی آرہے ہیں۔“

وہ ایک بہت بڑی عالیشان کوٹھی کے بیڈ روم میں چھپے ہوئے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ ان پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس بیڈ روم سے باہر وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں ہلچل سی پیدا ہوگئی تھی۔ دو زینے دو اطراف سے اوپری منزل تک گئے تھے۔ زینے کے ایک اوپری حصے پر عظمت شاہ ہاتھ میں بندوق لیے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی صاعقہ تھی۔ زینے کے دوسرے اوپری حصے پر رحمت شاہ بندوق لیے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی سکینہ تھی۔

وہ دونوں بندوق بردار بھائی تھے مگر ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔ سکینہ نے رحمت شاہ کے پیچھے سے صائقہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''شام سے رات ہوگئی ہے اور میری بیٹی نظر نہیں آرہی ہے۔''

رحمت شاہ نے کہا۔ ''نظر کیسے آئے گی؟ انہوں نے اپنے بیٹے کو اچھی طرح سکھایا پڑھایا ہے اور وہ ہماری بیٹی کو کہیں لے جا کر محبت کے سبز باغ دکھا رہا ہے۔''

صائقہ نے چیخ کر کہا۔ ''میرے بیٹے کو الزام نہ دینا تم نے اپنی بیٹی کو سکھایا پڑھایا ہے۔ وہ بھری بہار بن کر میرے بیٹے کا قرار لوٹتی رہتی ہے۔ اسے اُلو بناتی رہتی ہے۔''

عظمت شاہ نے کہا۔ ''میں اپنے اُلو کو تمہارے چُلّو میں نہیں آنے دوں گا۔''

صائقہ نے اپنے میاں کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''آپ غصے میں اپنے بیٹے کو اُلو تسلیم کر رہے ہیں؟''

عظمت شاہ نے کہا۔ ''وہ ہے۔ تب ہی میں تسلیم کر رہا ہوں۔ اگر ان کی بیٹی ڈورے ڈال رہی ہے تو وہ اس ڈور میں اُلجھتا کیوں ہے؟ میں اسے گولی ماردوں گا مگر ان لوگوں کا داماد بننے نہیں دوں گا۔''

رحمت شاہ نے کہا۔ ''ارے جاؤ...... تمہاری حیثیت کیا ہے؟ دو کوڑی کے بھی نہیں ہو۔ میں اور تمہارے بیٹے کو داماد بناؤں گا؟ تھو ہے اُس پر...... اگر وہ میری بیٹی کو بھگا کر لے جائے گا تو میں دونوں کو گولی ماردوں گا۔''

سکینہ نے کہا۔ ''میری بیٹی ایسی گئی گزری نہیں ہے کہ ان کے بیٹے کے ساتھ بھاگ جائے گی۔ ہم خواہ مخواہ اپنی بیٹی کے چال چلن کو کمزور بنا رہے ہیں۔ غصے میں عقل کام نہیں کرتی چلیں، اپنے کمرے میں چلیں۔''

صائقہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''تمہاری بیٹی بھاگ کر نہیں گئی ہے۔ کیا کسی فرشتے کے ساتھ باغ میں جھولا جھول رہی ہے؟''

پھر اُس نے اپنے میاں سے کہا۔ ''میں نے کئی بار سمجھایا ہے' ان کے منہ نہ لگیں۔ وہ ہمارا بیٹا ہے۔ ذرا اُسے آنے دو۔ ہم ایسی لگام ڈالیں گے کہ وہ......''

سکینہ نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''کہ وہ گھوڑے کی طرح ہنہنانے لگے گا۔ ایسی مائیں بھی ہوتی ہیں' جو بیٹے کو انسان سے گھوڑا بنا دیتی ہیں اونہہ......''

وہ اپنے میاں کو کھینچتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ ماہ نور اور نادر کھڑکی کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر اپنے بزرگوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کوٹھی اس قدر وسیع و عریض تھی کہ اس میں بارہ عدد بیڈ رومز' باتھ رومز' اسٹور روم' کچن' کوریڈور' ٹی وی لاؤنج اور ایک بہت ہی بڑا ڈرائنگ روم تھا۔ ان دونوں کو کسی بھی کمرے میں چھپ کر ملنے کی آسانی تھی۔ ماں باپ انہیں ایک طرف ڈھونڈنے جاتے تھے تو وہ دوسری طرف کے کمرے میں چھپنے پہنچ جاتے تھے۔ پھر ایک دوسرے سے رخصت ہو کر ماں باپ کے سامنے سر جھکائے یوں معصومیت سے آتے تھے' جیسے پیار کرنا جانتے ہی نہ ہوں اور ندی کے دو کناروں کی طرح الگ الگ' دور دور رہتے ہوں۔

ماہ نور نے کہا۔ ''اب مجھے جانا چاہیے۔''

''تم کیوں خواہ مخواہ جاؤ گی۔ وہ سمجھ رہے ہیں' میں تمہیں بھگا کر لے گیا ہوں۔ فی الحال انہیں یہی سمجھنے دو۔''

''مذاق نہ کرو۔ وہ غصے میں کہہ رہے ہیں۔ اگر انہیں سچ مچ یقین ہوجائے کہ میں تمہارے ساتھ کہیں گئی تھی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''ٹھیک ہے چلی جانا ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ تھوڑی دیر میں ان کے کھانے کا وقت ہوگا۔ اس وقت جاؤ گی تو وہ زیادہ غصہ نہیں دکھائیں گے۔ دکھائیں گے تو کھاتے پیتے وقت ٹھسکا لگے گا۔''

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ ''نہیں، میں ابھی جاؤں گی۔''

نادر نے اُسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا پھر کہا۔ ''اب جاؤ۔''

وہ گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''زنجیریں پہنا کر کہتے ہو جا تجھے آزاد کیا......''

ایک جانب نفرت کا لاوا ایک رہا تھا۔ دوسری جانب محبت کے پھول کھل رہے تھے۔ یہی دستور ہے کیچڑ میں کنول اور کانٹوں میں گلاب کھلتے ہیں۔ تب کہیں جا کر دو دل ملتے ہیں۔

زمین جائداد کے لیے سگے بھائیوں میں خون خرابا ہوتا رہتا ہے۔ جائداد برابر تقسیم ہو جائے تو عداوت قائم نہیں رہتی۔ بھائی چارہ جاری رہتا ہے۔ عظمت شاہ اور رحمت شاہ کے باپ نے یہی غلطی کی تھی۔ تمام زمینیں برابر بانٹ دی تھیں لیکن وہ وسیع و عریض عالیشان کوٹھی کسی ایک بیٹے کے نام نہیں لکھی تھی۔

باپ نے وصیت کی تھی کہ دونوں بھائی اس کوٹھی میں مل جل کر رہیں گے۔ تمام دولت اور زمینیں برابر تقسیم کرنے کے بعد یہ شرط لگا دی تھی کہ دونوں بھائیوں کو ایک ہی چھت کے نیچے رہنا ہوگا۔ وصیت میں یہ صاف طور پر درج کیا گیا تھا کہ وہ اس کوٹھی کو کسی حال میں بھی فروخت نہیں کریں گے۔ شدید عداوت کے باوجود بیچ میں دیوار اٹھا کر اس کوٹھی کو تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ اگر اس کو فروخت کر کے اس کی رقم آپس میں تقسیم کرنا چاہیں گے تو قانوناً اس بات کی اجازت نہیں ہوگی۔ ان دونوں میں سے کوئی اسے فروخت کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔

اگر ان میں سے کوئی ایک بھائی رشتہ توڑ کر جائے گا تو وہ کوٹھی وہاں رہ جانے والے بھائی کے نام رہ جائے گی اور وہ دونوں عظمت شاہ اور رحمت شاہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ نفرت سے منہ پھیر کر کوٹھی سے باہر جائیں اور پھر کبھی اندر نہ آسکیں۔ ایسی حماقت کے نتیجے میں کوئی ایک بھائی اس کوٹھی کا مالک بن جاتا۔ ان کے بابا سائیں نے مرتے وقت کہا تھا۔ "ہم اپنے باپ دادا کے زمانے سے ایک ہی چھت کے نیچے رہتے آئے ہیں۔ ایک ہی چولھا جلتا ہے اور ایک ہی ہانڈی کا پکا ہوا ہم سارے رشتے دار کھاتے ہیں۔ ہماری یہ روایت قائم رہنی چاہیے۔"

باپ کی موت کے بعد یہ روایت نفرت اور فساد کا باعث بن گئی تھی۔ دونوں بھائی خود غرض اور لالچی تھے۔ عظمت شاہ اپنے بیٹے نادر کی شادی ایک ایسے وڈیرے کے گھر کرنا چاہتا تھا جس کی ایک ہی بیٹی تھی اور وہ اپنے جہیز میں باپ کی تمام جائداد اور تمام زمینیں لے کر آنے والی تھی۔

دوسری طرف رحمت شاہ بھی ایک ایسے شخص کو داماد بنانا چاہتا تھا جو اپنے علاقے کا بہت بڑا وڈیرا تھا۔ کروڑوں کی زمین جائداد کا مالک تھا اور ماہ نور کے جہیز میں رحمت شاہ کی زمینوں کا مطالبہ نہیں کر رہا تھا۔ پھر یہ کہ جو عالیشان کوٹھی ان بھائیوں کی مشترکہ جائداد تھی اس کی موجودہ قیمت پچاس کروڑ سے کچھ اوپر تھی۔ ان حالات میں وہ دونوں اس کوٹھی سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔

عظمت شاہ ہاتھوں میں گن لیے ہوئے تھا۔ صائقہ اسے پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے میں لے آئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے یہاں نہ لاتیں تو دنیا دیکھتی اور کہتی کہ بڑے بھائی نے اپنی آن کی خاطر چھوٹے بھائی کو گولی مار دی ہے۔"

صائقہ نے کہا۔ "تو پھر جائیں رحمت کو گولی مار کر آئیں۔"

اس نے جھجکتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا پھر صائقہ سے نظریں چرانے لگا۔ وہ اس سے گن چھین کر اسٹور روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "دونوں بھائی گرجتے ہیں مگر برستے نہیں ہیں۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک قتل ہوگا تو دوسرا سولی پر چڑھے گا۔"

عظمت شاہ نے کہا۔ "کچھ نہ کر کے بھی جان سولی پر لٹکی رہتی ہے۔ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کی بیٹی ہمارے بیٹے کو بھگا کر لے جائے گی۔"

صائقہ نے اس گن کے میگزین کو اسٹور روم کے اندر پھینکتے ہوئے کہا۔ "لڑکیاں بھگاتی نہیں ہیں بھاگتی ہیں مگر یہاں تو بات الٹی ہو رہی ہے۔"

پھر وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "ہمارا بیٹا معصوم ہے نادان ہے۔ حد سے زیادہ شرمیلا ہے۔ وہی اسے بھگا کر لے جائے گی اور نکاح پڑھوا کر لے آئے گی پھر ہم کیا کریں گے؟"

وہ بولا۔ "اپنا ہی سکہ کھوٹا ہوگا تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

"میں تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ اس لڑکی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔"

"کیا مصیبت ہے؟ ہم یہاں سے جا بھی نہیں سکتے۔ بابا سائیں تو مر گئے مگر ہم بھائیوں کو اس کوٹھی میں قیدی بنا کر چلے گئے۔ یہ کوٹھی آدھی میرے نام ہے، آدھی رحمت شاہ کے نام ہے۔"

"وصیت لکھتے وقت بابا سائیں کی عقل گھاس چرنے گئی تھی۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ دونوں بھائیوں میں جو بھی

یہاں سے جائے گا، وہ اپنے آدھے حصے سے محروم ہوجائے گا۔"

"میں جاؤں گا تو رحمت شاہ اس پچاس کروڑ کی کوٹھی کا تنہا مالک بن جائے گا۔"

"اسی لیے اس نے اپنی بیٹی کو ہمارے بیٹے کے پیچھے لگایا ہوا ہے تاکہ ہم اپنے بیٹے کو لے کر یہاں سے بھاگ جائیں۔"

"میں بھی میدان چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اُسے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہاں سے جانے پر مجبور کردوں گا۔"

پھر وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔"وہ شرافت سے نہیں جائے گا۔ دہشت گردی سے دم دبا کر یہاں سے بھاگے گا۔"

صائقہ نے تعجب سے پوچھا۔"دہشت گردی......؟"

وہ بندوق کو دیوار سے لٹکاتے ہوئے بولا۔"ایک شخص نے مجھ سے ایک لاکھ روپے قرض لیے تھے اور وہ رقم واپس نہیں کررہا تھا۔ جبار دادا نے اس کی گردن دبوچی' چاقو دکھایا تو اس نے رقم لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں.... جبار دادا کو دس ہزار روپے دوں گا — وہ یہاں آکر رحمت شاہ کی بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دے گا۔ ان کے پیچھے پڑ جائے گا تو وہ بیوی اور بیٹی کو لے کر یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوجائے گا۔"

وہ اپنا موبائل فون نکال کر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔"وہ ابھی آئے گا۔ تعجب ہے اتنا زبردست آئیڈیا میرے دماغ میں پہلے کیوں نہیں آیا؟"

وہ جبار نامی قاتل بدمعاش سے رابطہ کرنے لگا۔

دوسری طرف دوسرا بھائی رحمت شاہ اپنے کمرے میں فون کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔"ہاں تو تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو' ہاں' ہاں۔ ٹھیک ہے۔ تمام ثبوت کے ساتھ یہاں چلی آؤ۔ اصل نوٹنکی تو اب شروع ہوگی۔"

رحمت شاہ نے فون بند کرتے ہوئے سکینہ سے کہا۔"اب تم دیکھوگی۔ یہاں کیا ہونے والا ہے؟"

سکینہ نے ناگواری سے کہا۔"ابھی کچھ ہونے کو باقی رہ گیا ہے؟ جب تک دونوں بھائی ایک چھت کے نیچے رہیں گے، تب تک روز کوئی نہ کوئی نیا ہنگامہ ہوتا رہے گا۔ میں اپنی ماہ نور کو دلہن بنا کر اس گھر سے رخصت نہیں کرسکوں گی۔ ہمارا ہونے والا داماد بار بار شادی کی تاریخ مانگ رہا ہے اور ہم اسے ٹال رہے ہیں۔"

رحمت شاہ نے کہا۔"تاریخ کیسے دیں؟ ہماری ماہ نور کو ان کا بیٹا بہکا رہا ہے۔ مگر آج کے بعد ہماری بیٹی اس کے فریب میں نہیں آئے گی۔ اس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اسے معلوم ہوجائے گا کہ وہ جس نادر شاہ کی دیوانی ہے، وہ اپنے باپ کی طرح خودغرض' مطلب پرست اور فراڈ ہے۔"

سکینہ نے کہا۔"یہی بات تو ہماری ماہ نور کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

"آجائے گی۔ آج اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی۔ آج کے بعد وہ نادر شاہ سے نفرت کرنے لگے گی۔"

سکینہ نے تعجب سے پوچھا۔"کیا آپ کوئی کرشمہ دکھانے والے ہیں؟"

وہ بڑے فخر سے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

"کچھ دکھانے والا نہیں ہوں۔ دھماکا کرنے والا ہوں۔"

ان بھائیوں کا ایک بوڑھا چاچا دروازے پر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے اندر آکر بولا۔

"دھماکے کب نہیں کرتے ہو؟ کبھی تم کرتے ہو' کبھی عظمت شاہ کرتا ہے۔ ادا سائیں اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں مگر مجھے تم دونوں کے درمیان پسنے کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔"ادا سائیں نے کہا تھا، دونوں بھتیجوں کو لگام دیتا رہوں۔ خون کے رشتوں کو ٹوٹنے نہ دوں۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر خلا میں تکتے ہوئے بولا۔"ادا سائیں کی کیا بات تھی؟ بہت ہی ذہین تھے۔ تم دونوں کو جوڑ کر رکھنے کے لیے انہوں نے اس کوٹھی کے ساتھ تمہیں جکڑ دیا ہے۔ تم میں سے کوئی اسے فروخت نہیں کرسکتا۔ تم دونوں ہی یہاں کے مالک رہو گے۔ لیکن کوئی بھی اپنے بیوی بچوں سمیت یہاں سے جائے گا تو دوسرا بھائی پوری کوٹھی کا مالک بن جائے گا۔"

رحمت شاہ نے کہا۔"بابا سائیں نے یہ نہیں سوچا کہ ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر لڑتے رہیں گے۔"

"کب تک لڑتے رہوگے؟ تم دونوں کے بعد ماہ نور اور نادر شاہ یہاں کے مالک ہوں گے۔ انہیں ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے لیے آپس میں شادی کرنی ہوگی۔"

سکینہ نے کہا۔"کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ دونوں شادی کریں۔ ماہ نور کی شادی ہم نے بہت اچھی جگہ طے کی

ہے اور تاریخ پکی کرنے والے ہیں۔''

چاچا سائیں نے کہا۔''یہی ضد عظمت شاہ کی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی ایک بہت وڈیرے کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔ اس اکلوتی بیٹی کی تمام جائیداد اور زمینیں اس رشتے داری کے بہانے حاصل کر لینا چاہتا ہے۔''

وہ بڑی مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔''اگر ایسا ہو گیا تو وہ باہر سے بہو لائے گا اور تم یہاں داماد لاؤ گے۔ آج تم دو بھائی لڑ رہے ہو۔ کل بھی جنگ اس کے بیٹے اور تمہارے داماد کے درمیان جاری رہے گی۔ وہ بھی اس کوٹھی کے آدھے حصے سے محروم ہونا نہیں چاہیں گے۔''

وہ چھڑی ٹیک کر وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔''اللہ سائیں تم دونوں کو عقل دے۔ میں تو صرف دعا ہی دے سکتا ہوں۔''

وہ کمرے سے چلا گیا۔ رحمت شاہ نے سکینہ سے پوچھا۔''ماہ نور کہاں ہے؟''

''فکر نہ کرو۔ وہ اسی کوٹھی کے کسی کمرے میں ہوگی۔ باہر نہیں گئی ہوگی۔ ہم تو خواہ مخواہ اس کے بیٹے کو الزام دینے کے لیے کہہ رہے تھے کہ وہ کم بخت اسے بھگا کر لے گیا ہے۔''

وہ بولا۔''اب ہمیں ڈرائنگ روم میں چلنا چاہیے۔ وہ بازار والیاں آتی ہی ہوں گی۔''

سکینہ نے حیرانی سے پوچھا۔''بازار والیاں......؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔''ہاں۔ میں ایک زبردست چال چل رہا ہوں۔ ڈرائنگ روم میں چلو۔ تھوڑی دیر بعد صرف تمہیں ہی نہیں ان دشمنوں کو بھی بہت کچھ معلوم ہونے والا ہے۔''

وہ کمرے سے نکل کر زینے کے اوپری حصے پر آئے تو اس وقت دوسرے کمرے سے عظمت شاہ، صائقہ کے ساتھ باہر آ رہا تھا۔ دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا تو یوں غرانے لگے، جیسے ابھی ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں گے لیکن دونوں کی بیویاں جانتی تھیں کہ وہ صرف گرجنے والے بادل ہیں۔

عظمت شاہ نے زینے سے اترتے ہوئے کہا۔''جو کنگال ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کوئی گری پڑی بہو نہیں لائیں گے۔''

صائقہ نے کہا۔''اور نہیں تو کیا...... ہم تو وڈیرے

## عربی حکایت

اہلِ عرب جب شادی بیاہ کرتے تھے تو قدیم رواج کے مطابق دعوت کی تقریب میں شامل مہمانوں کی تواضع کے لیے بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کو روٹی کے اندر لپیٹ کر پیش کرتے تھے۔

اگر کسی تقریب میں گھر کے سربراہ کو پتا چلتا کہ اس شادی میں شریک افراد کی تعداد دعوت میں تیار کیے گوشت کے ٹکڑوں کی تعداد سے زیادہ ہے، یا زیادہ ہو سکتی ہے، تو وہ کھانے کے وقت دو روٹیاں (گوشت کے بغیر) ایک دوسرے کے ساتھ لپیٹ کر اپنے اہلِ خانہ، رشتے داروں اور انتہائی قریبی دوستوں میں تقسیم کرتے جبکہ گوشت روٹی کے اندر لپیٹ کر صرف باہر سے آئے ہوئے اجنبیوں کو پیش کیا جاتا تھا۔

ایسی ہی ایک بار غریب شخص کے ہاں شادی کی تقریب تھی جس میں اس شخص نے دعوت کے دن احتیاطاً بغیر گوشت کے روٹی کے اندر روٹی لپیٹ کر اپنے گھر والوں، رشتے داروں اور متعدد قریبی قابلِ بھروسا دوستوں کو کھانے میں پیش کی، تاکہ اجنبیوں کو کھانے میں روٹی کے ساتھ گوشت مل سکے اور کسی بھی قسم کی شرمندگی سے بچا جا سکے۔

جنہیں صرف روٹی ملی تھی تو انہوں نے ایسے کھانا شروع کر دیا گویا اس میں گوشت موجود ہے، سوائے اس کے ایک انتہائی قریبی رشتے دار کے، اس نے روٹی کھولی گھر کے سربراہ کو بلایا اور غصے سے بلند آواز میں اس سے کہا۔

''اے عبداللہ کے باپ یہ کیا مذاق ہے، یہ تو روٹی گوشت کے بغیر ہے، میں تو آج کے دن ہرگز یہ نہیں کھاؤں گا۔''

غریب شخص نے تحمل سے سنا اور مسکرا کر جواب دیا۔

''اجنبیوں کا مجھ پر حق ہے کہ میرے دسترخوان پر انہیں ہر حال میں گوشت پیش کیا جائے۔ یہ لیجیے گوشت کا ٹکڑا اور معافی چاہتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی میں آپ کو اپنے اہلِ خانہ میں شمار کر رہا تھا۔''

چھ موڑ مری سے اسد عباسی کا تحفہ

حشمت علی کی بیٹی کو سونے میں تول کر لانے والے ہیں۔"

رحمت اپنی بیوی سکینہ کے ساتھ زینے سے اترتے ہوئے بولا۔ "سکینہ...... اچھو لوگ بہو نہیں لاتے۔ سونے کا انڈا دینے والی بطخ لاتے ہیں۔ پھر اس کا پیٹ چاک کرتے ہیں اور سر پکڑ کر روتے ہیں۔"

ماہ نور اور نادر شاہ ابھی تک اسی بیڈ روم میں چھپے ہوئے پیار بھرے لمحات گزار رہے تھے۔ اپنے بزرگوں کی آوازیں سن کر چونک گئے۔ پھر کھڑکی کے پاس آکر پردے کو ہٹا کر دیکھنے لگے۔ صائقہ اس وقت عظمت شاہ کے ساتھ زینے سے اترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "روئیں گے ہمارے دشمن...... ابھی کچھ ہی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ روتا کون ہے اور ہنستا کون ہے؟"

سکینہ نے کہا۔ "زیادہ بولنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مقدر ہنساتا ہے، مقدر رُلاتا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں جو ہونے والا ہے، اس کے بعد دشمنوں کو ایمبولینس کی ضرورت پڑے گی۔"

بیڈ روم کے اندر نادر شاہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے ماہ نور کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کچھ دیر میں کیا ہونے والا ہے؟"

ماہ نور نے کہا۔ "پتا نہیں۔ ممی بھی یہی چیلنج کر رہی ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

"ابھی نہیں۔ یہیں رہو۔ دیکھتے ہیں، کیا ہونے والا ہے؟"

اُس کی بات ختم ہوتے ہی ڈرائنگ روم کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ جبار دادا ہاتھ میں بُغدا اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اور بڑی بڑی سرخ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ بہت ہی خطرناک قاتل ہے۔ وہ بڑے غرور سے ایک ایک قدم چلتا ہوا...... قہقہے لگاتا ہوا ڈرائنگ روم کے وسط میں آ رہا تھا۔

ماہ نور نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "وہاں کون آیا ہے؟"

نادر شاہ نے کہا۔ "پتا نہیں......؟ اس کی ہنسی بتا رہی ہے کہ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

عظمت اُسے دیکھتے ہی خوش ہو گیا تھا۔ رحمت نے ذرا سہم کر پوچھا۔ "کون ہو تم......؟ شریفوں کے گھروں میں آنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

جبار دادا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "موت کا فرشتہ اور جبار دادا کبھی دستک دے کر نہیں آتا۔ میں کسی بھی گھر کا دروازہ ہاتھوں سے نہیں لاتوں سے مار کر کھولتا ہوں۔"

پھر اس نے سر گھما کر صائقہ سے پوچھا۔ "کیا ماہ نور تو ہے؟"

صائقہ سہم کر اپنے شوہر کے پیچھے چلی گئی۔ پھر بولی۔ "نہیں۔ میں صائقہ ہوں ان کی شریکِ حیات......"

بیڈ روم کے اندر ماہ نور نے سہم کر کہا۔ "یہ تو مجھے پوچھ رہا ہے؟"

نادر نے حیرانی سے کہا۔ "ہاں، تمہارا نام بھی جانتا ہے۔"

دوسری طرف جبار دادا سکینہ کی طرف گھوم کر کہہ رہا تھا۔ "پھر تو ماہ نور تو ہے؟"

سکینہ نے سہم کر کہا۔ "نہیں، میں نہیں ہوں۔ وہ...... وہ میری بیٹی ہے۔ تم اس کا نام کیوں لے رہے ہو؟"

جبار دادا نے کہا۔ "میرے ہاتھ میں دیکھ۔ یہ بُغدا ہے جا...... اپنی بیٹی کو یہاں لے کر آ......"

ماہ نور نے نادر سے پوچھا۔ "یہ بُغدا کیا ہوتا ہے؟"

وہ بولا۔ "بہت بڑا اور بھاری چھرا ہوتا ہے۔ قصائی اس سے گوشت اور ہڈیاں الگ کرتے ہیں۔"

وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ "میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتی، وہ مجھے بلا رہا ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

نادر شاہ نہیں جانتا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ماہ نور کو الگ کرتے ہوئے بولا۔ "ہمیں کھڑکی سے جھانک کر دیکھنا چاہیے۔"

وہ دونوں وہاں آ گئے، پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھنے لگے۔ ڈرائنگ روم میں رحمت ڈرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "تم کون ہو؟ میری بیٹی کو یہاں کیوں بلا رہے ہو؟"

جبار دادا نے کہا۔ "وہ تمہاری بیٹی ہے؟"

"ہاں......"

وہ فضا میں بُغدا لہراتے ہوئے بولا۔ "تو پھر سن لو۔ وہ میری بیٹی ہے۔ میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔ باہر کسی چھوکرے کو پکڑ کر اس کی شادی کراؤں گا۔ پھر داماد کے ساتھ یہاں پہنچا دوں گا۔"

ماہ نور بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ "یہ کون ہے نادر......؟ کس سے میری شادی کرانے آیا ہے؟"

نادر نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "میں اس کا خون

پی جاؤں گا۔''

وہ بولی۔ ''اس کے ہاتھ میں بغدا ہے۔''

''ہا ئیں......'' نادر شاہ کی مٹھیاں کھل گئیں۔

ادھر نادر شاہ کا باپ عظمت شاہ اس بدمعاش سے کہہ رہا تھا۔ ''آپ تو بہت ہی شریف بدمعاش ہیں۔ لڑکیوں کی شادیاں کراتے ہیں۔ نیکیاں کماتے ہیں۔''

جبار دادا نے کہا۔ ''نیکی نہیں کماتا' نوٹ کماتا ہوں۔ اپنا وعدہ پورا کرو۔ نوٹ نکالو۔ میں اس کی بیٹی کو لے کر جاؤں گا پھر ان کے داماد کے ساتھ اسے واپس بھیج دوں گا۔''

عظمت شاہ نے پریشان ہو کر رحمت کو دیکھا۔ وہ غصے سے بولا۔ ''اچھا...... تو آپ اپنے بیٹے سے میری بیٹی کو دور کرنے کے لیے یہ سازش کر رہے ہیں؟''

یہ بڑے شرم کی بات تھی۔ ماہ نور نے بڑے دکھ سے نادر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تایا ابو سے ایسی امید نہیں تھی۔''

نادر نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔ ''بابا سائیں نے میرا سر جھکا دیا ہے۔''

ادھر عظمت اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ ''میں......؟ میں کیوں سازش کروں گا؟ مجھے کیا پڑی ہے بابا کہ تمہاری بیٹی کی شادی کراتا پھروں؟''

وہ جبار دادا سے بولا۔ ''اے بھائی! ہم کو آپس میں نہ لڑاؤ۔ جو کرنے آئے ہو، وہ کرو اور جاؤ۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی ڈرائنگ روم کا دروازہ پھر ایک بار کھلا۔ وہاں دو عورتیں کھڑی دکھائی دیں۔ ایک بہت ہی نوجوان نوخیز حسینہ تھی۔ دوسری کچھ ادھیڑ عمر کی تھی۔ دونوں ہی گہرے میک اپ میں تھیں۔ جب وہ بڑے ناز و انداز سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آنے لگیں تو ان کی چال نے بتا دیا کہ ان کا چال چلن کیا ہے؟ وہ دونوں ہی بازاری تھیں۔

اس نوخیز حسینہ نے عظمت کے سامنے پہنچ کر کہا۔ ''میرا نام کنول ہے۔ کنول کا پھول دیکھا ہے نا؟ وہ کیچڑ میں کھلتا ہے مگر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ تیرا بیٹا نادر شاہ ہے نا...... وہ اس خوبصورتی پر مرمٹا ہے۔ کدھر ہے میرا وہ عاشق نامراد......؟''

نادر پردے کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے زیرلب کہا۔ ''یہ کون ہے؟ مجھے کیوں پوچھ رہی ہے؟''

ماہ نور اُسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ ادھر عظمت نے کہا۔ ''کون ہو تم......؟ میرا بیٹا کبھی کیچڑ دلدل میں نہیں جاتا۔''

اس ادھیڑ عمر کی عورت نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میرا نام گلاب جان ہے۔ اور یہ میری چھوٹی بہن کنول ہے۔ تمہارے بیٹے کی گھر والی......''

اس بات پر سب ہی چونک کر کنول کو دیکھنے لگے۔ ماہ نور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ عظمت غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو؟''

ماہ نور نے نادر کو دیکھا پھر بڑے دکھ سے پوچھا۔ ''تم نے اس سے شادی کی ہے؟''

نادر نے اپنے دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں' یہ جھوٹ ہے۔ میں...... میں نے آج سے پہلے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔''

ماہ نور نے پھر پردے کی آڑ سے کنول کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ بہت خوبصورت ہے۔ اتنی خوبصورت لڑکی تم سے خواہ مخواہ کا رشتہ کیوں جوڑے گی؟ کوئی تو بات ضرور ہے؟''

''پلیز ماہ نور! اپنے نادر پر شبہ نہ کرو۔ میں صرف تمہارا ہوں۔ آج تک میں نے کسی لڑکی کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ جس طرح وہ بدمعاش بغدا لے کر آیا ہے اور تمہیں مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح یہ لڑکی کوئی فراڈ کرنے آئی ہے اور مجھے تم سے جدا کر دینا چاہتی ہے۔ ضرور ہمارے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ پلیز مجھ پر بھروسا کرو۔''

ادھر گلاب جان اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے عظمت سے کہہ رہی تھی۔ ''ہم کو پتا تھا' تم کو یقین نہیں ہوگا۔ اپنے بیٹے کو بلاؤ اور یہ پکا ثبوت دیکھو۔''

اس نے لفافے سے تصویریں نکالیں۔ بڑے یقین سے عظمت شاہ، صائقہ، رحمت شاہ، سکینہ اور جبار دادا کو دیکھا۔ پھر ان کی طرف ایک ایک تصویر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو...... یہ دیکھو...... تمہارے سپوت کے کارنامے...... وہ کارنامے دکھا کر یہ پیار نامے چھوڑ گیا ہے۔''

وہ سب...... جھک کر تصویریں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ہر تصویر میں نادر شاہ اس نوخیز حسینہ کنول کے ساتھ رومانی انداز میں دکھائی دے رہا تھا۔ رحمت نے بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے عظمت سے کہا۔ ''مبارک ہو دادا سائیں! آپ کے بیٹے نے تو عشق کا تصویری ڈپلوما حاصل

کیا ہے۔"

نادر پردے کے پیچھے سے پریشان ہو کر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور کہہ رہی تھی۔ "تم نے اس کے ساتھ تصویریں اتاری ہیں۔ وہ پکے ثبوت پیش کر رہی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میری امی اور بابا سائیں بھی پریشان ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر وہ کچھ کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ مجھے جا کر دیکھنا ہوگا۔"

عظمت شاہ اگرچہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ بیٹے کے خلاف بڑا پکا ثبوت تھا۔ پھر بھی اس نے تصویروں کو گلاب جان کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں مانتا۔ میرا بیٹا ایسا نہیں کر سکتا۔"

رحمت نے کہا۔ "ان تصویروں کو عدالت مان لے گی مگر آپ نہیں مانیں گے۔ کیونکہ آپ کی ناک کٹنے والی ہے اداسائیں......!"

گلاب جان نے کہا۔ "آپس میں کیوں لڑتے ہو؟ برات کے دولہے کو تو بلاؤ۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

نادر شاہ اپنی ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا اور بولتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ "میں خالص دودھ ہوں۔ میرے اندر جھوٹ فریب اور پانی کی ملاوٹ نہیں ہے۔"

ماں باپ نے ان دونوں کو ایک ساتھ ایک کمرے سے نکلتے دیکھا تو غصے سے بپھر گئے۔ رحمت شاہ نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "میری بیٹی کا ہاتھ چھوڑ دو۔"

نادر نے کہا۔ "نہیں چھوڑوں گا۔ مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہے تو پھر الزام سچا ہونا چاہیے اور سچ یہ ہے کہ میں اپنی ماہ نور کو بچپن سے چاہتا آیا ہوں۔ میں اسی سے شادی کروں گا اور اسی کے ساتھ زندگی گزاروں گا۔"

عظمت نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "بکواس نہ کر۔ اس کا ہاتھ چھوڑ دے۔ میں اسے اپنی بہو نہیں بناؤں گا۔"

صائقہ نے بیٹے سے کہا۔ "پہلے ان تصویروں کو دیکھ...... ہماری گردنیں شرم سے جھک گئی ہیں۔"

نادر شاہ نے ماہ نور کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے ماں باپ سے وہ تصویریں لیں۔ پھر انہیں دیکھ کر پریشان ہونے لگا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوچنے لگا کہ جس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا، اس کے ساتھ ایسی تصویریں کیسے اتر گئیں؟

رحمت نے جبار دادا سے کہا۔ "اے بھائی بلند سے والے! تم میری بیٹی کو لے جا کر اس کی شادی کرا سکتے ہو تو ادا سائیں کے بیٹے کی بھی کرا سکتے ہو۔ ان کی ہونے والی بہو تصویریں لے کر آ گئی ہے۔ سارے ثبوت موجود ہیں۔ بس نکاح پڑھوانے کی دیر ہے۔"

رحمت نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "بولو بابا! کتنے نوٹ تم نے اداسائیں سے لیے ہیں اور کتنے نوٹ مجھ سے لو گے؟ جتنا تم کہو گے اتنا دوں گا مگر ابھی اس لڑکی سے اس لڑکے کی شادی کرا دو۔"

نادر پیچھے ہٹ کر بولا۔ "میں نہیں کروں گا شادی......"

کنول نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میں کروں گی شادی۔ ہائے نادر! میرے پیارے دل کے سہارے! مجھ سے دور کیوں جا رہے ہو؟"

سکینہ اپنی بیٹی ماہ نور کو تصویریں دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ کھلا ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ کیا اب بھی دھوکا کھاؤ گی؟ مان لو...... یہ باپ بیٹے سب ہی خود غرض اور مطلب پرست ہیں۔"

نادر نے سکینہ کے ہاتھوں سے تصویریں چھین کر کہا۔ "دیکھو ماہ نور! ان تصویروں کو دھیان سے دیکھو۔ یہ تمام تصویریں میری اور تمہاری ہیں۔"

وہ چونک کر بولی۔ "میری اور تمہاری کیسے ہو سکتی ہیں؟"

"ہاں۔ ذرا غور سے دیکھو۔ تمہاری گردن کاٹ کر اس کنول کی گردن لگائی گئی ہے۔ یہ کمپیوٹر کا کمال ہے...... لو ذرا غور سے دیکھو۔ ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے۔"

ماہ نور تصویروں کو بڑی توجہ سے دیکھنے لگی۔ "ارے ہاں یہ تصویر ہم نے گارڈن میں اتاری تھی۔ میں نے تمہاری پسند کے مطابق آتشی گلابی رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ یہ وہی سوٹ ہے...... اور یہ...... یہ تصویر دیکھو یہ ہم فنکشن میں چاٹ کھا رہے ہیں۔"

گلاب جان نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "ارے تو کیا یہ میری بیٹی اس کے ساتھ چاٹ نہیں کھا سکتی؟"

نادر نے کہا۔ "وہاں کھاتے وقت چاٹ کا مصالحہ ماہ نور کے لباس پر گر گیا تھا۔ یہاں دھبا پڑا تھا۔ دیکھو وہ دھبا وہیں دکھائی دے رہا ہے۔"

ماہ نور نے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ

ساری تصویریں ہماری ہیں اور اس تصویر کو تو میں اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ہم نے کوٹھی کے پیچھے اتاری تھی۔"

سکینہ نے بیٹی کی پیٹھ پر ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم اس سے باہر جا کر ملتی رہی ہو؟ اور ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہو؟"

پھر وہ نادر سے بولی۔ "اور تم... تم بھونرے ہو، کبھی شریف زادیوں پر اور کبھی بازار والیوں پر منڈلاتے ہو۔ تم پکے بے شرم ہو۔"

عظمت شاہ نے کہا۔ "جب تمہاری بیٹی کو میرے بیٹے کے ساتھ تصویریں اتارتے ہوئے شرم نہیں آئی تو پھر اسے کیوں آئے گی؟"

پھر وہ اپنے بیٹے کی طرف پلٹ کر بولا۔ "مگر آنی چاہیے۔ شرم آنی چاہیے۔ تم نے ہمارا سر جھکا دیا ہے۔"

کنول نے ان کے درمیان آکر کہا۔ "آپ سب اپنی کھچڑی پکا رہے ہیں۔ میری بات کریں۔ میرا کیا بنے گا؟ اس نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ ہائے! میں کیا بتاؤں...... کس منہ سے کہوں کہ میں ماں بننے والی ہوں سائیں! یہ میرے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ اسے خوشخبری سنانے آئی ہوں۔"

نادر نے غصے سے دہاڑتے ہوئے کہا۔ "یو شٹ اَپ...... میری شادی نہیں ہوئی۔ میں باپ کیسے بن سکتا ہوں؟"

کنول نے کہا۔ "نہ سائیں نہ! بھولے نہ بنو۔ تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا کہ ہمارے بازار میں شادی بیاہ کا دستور نہیں ہے۔ جو ہونا ہوتا ہے، وہ شادی کے بغیر ہی ہو جاتا ہے۔"

سکینہ اور رحمت شاہ خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عظمت شاہ سے کہا۔ "مبارک ہو ادا سائیں! تم دادا بننے والے ہو۔"

وہ... گرجتے ہوئے بولا۔ "چپ رہو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم اِن عورتوں کو کرائے پر لائے ہو۔"

رحمت نے کہا۔ "جس طرح آپ اس غنڈے والے کو کرائے پر لائے ہیں۔"

وہ دونوں غصے میں ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے اور اپنی زبان سے سچ اُگل رہے تھے۔ گلاب جان نے کہا۔ "تم لوگ اپنا بھید خود ہی کھول رہے ہو تو ہمارا کیا کام رہ گیا ہے؟"

رحمت نے کہا۔ "کام رہ گیا ہے۔ کوئی ثابت نہیں کر سکے گا کہ تصویریں کمپیوٹر کا کمال ہیں۔ میں مانتا ہوں۔ عدالت بھی مانے گی کہ تمہاری بیٹی نادر کے ہونے والے بچے کی ماں ہے۔ اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو اب ہو جائے گی۔"

اس نے کنول کے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! میں تمہارا باپ بن کر شادی کراؤں گا۔ تمہارا حق تمہیں ضرور ملے گا۔"

نادر شاہ نے کہا۔ "چاچا سائیں! آپ پٹری کیوں بدل رہے ہیں؟ یہ بازاری عورت آپ کی بیٹی نہیں ہے۔ ماہ نور بیٹی ہے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ اس کی شادی کی بات کریں۔"

ماہ نور نے کہا۔ "ہاں بابا سائیں! آپ کو میرے سر پر ہاتھ رکھنا چاہیے۔"

وہ غصے سے جھڑک کر بولا۔ "تم خاموش رہو۔ بے شرم...... بے حیا! شریف گھرانے میں پیدا ہوئی ہو اور باپ کی ناک کٹوا رہی ہو۔ اس بازاری عورت کو دیکھو، یہ میری ناک سلامت رکھنے آئی ہے۔ میرے دشمن کے بیٹے کو یہاں سے دولہا بنا کر لے جائے گی۔"

عظمت نے جبار دادا سے کہا۔ "جب بھید کھل ہی گیا ہے تو میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ تم میرا کام کرنے آئے ہو لیکن اب کام ذرا بدل گیا ہے۔ یہ لوگ جھوٹے ثبوت پیش کر کے میرے بیٹے کو یہاں سے اس بازاری عورت کے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ انہیں جانے نہ دو...... بندوق اٹھاؤ اور ان کا قیمہ بنا دو۔"

کنول اور گلاب جان سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ عظمت نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے رحمت سے کہا۔ "سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکل رہا تھا، اب ٹیڑھی انگلی سے نکلے گا۔ تم میرے بیٹے کو اغوا نہ کرا سکے۔ اب دیکھو تمہاری بیٹی یہاں سے جائے گی۔ جبار دادا اسے لے جائے گا۔"

نادر نے فوراً ہی ماہ نور کے آگے ڈھال بنتے ہوئے کہا۔ "بابا سائیں! ماہ نور تک پہنچنے کے لیے اس غنڈے والے کو میری لاش سے گزرنا ہوگا۔"

عظمت نے آگے بڑھ کر بیٹے کو ایک طمانچہ رسید کیا پھر کہا۔ "تو مرنا چاہتا ہے تو میں تجھے مار ڈالوں گا مگر اس لڑکی کو کبھی اپنی بہو نہیں بناؤں گا۔"

رحمت نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے کہا۔ ”تم میری ناک کٹوانے پر تل گئی ہو۔“

عظمت شاہ نے بیٹے کو دوسرا طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ اگر تو میرا خون ہے تو میری زبان سے بول' جو میرے دشمن ہیں وہ تیرے بھی دشمن ہیں۔“

رحمت نے اپنی بیٹی کو طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ ”میں تو دشمنوں پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تو جس کے لیے بے شرمی دکھا رہی ہے۔ میں اسے کبھی اپنا داماد نہیں بناؤں گا۔“

وہ دونوں بھائی اپنے بیٹے اور بیٹی کو طمانچے مارتے جا رہے تھے اور کچھ نہ کچھ کہتے جا رہے تھے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف ایسی سازشیں کرتے رہیں گے۔ لڑتے لڑتے اس دنیا سے گزر جائیں گے لیکن شاید مرنے کے بعد بھی بھوت بن کر آئیں گے اور ان دو پیار کرنے والوں کو کبھی ایک نہیں ہونے دیں گے۔

ایسے ہی وقت جیسے ایک دھما کا سا ہوا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ پھر ایک دھڑاکے سے کھل گیا۔ سب ہی کی نظریں اُدھر جم گئیں۔ وہاں منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے ڈاکو دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے قالین پر چلتے ہوئے ان کی طرف آرہے تھے۔ صرف وہی نہیں ان کی رائفلیں بھی ان سب کی طرف رخ کیے ہوئے تھیں۔ ان کا سرغنہ گرجتی ہوئی' گونجتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”خبردار! کوئی چیخنا چاہے گا' چلانا چاہے گا' منہ سے آواز نکالے گا تو ہم اس کو گولی مار دے گا۔ ہمارا نام زردار خان ہے۔ جب ہمارا دماغ چلتا ہے تو ہم زبان نہیں چلاتا...... گولی چلاتا ہے۔“

وہ سب بُری طرح سہم گئے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ زردار خان نے کہا۔ ”جس کے پاس جو ہتھیار ہے' وہ ادھر سامنے پھینک دے۔“

جبار دادا فوراً ہی دو ہتھیلیوں کی تھال پر بُغدا سجا کر جھکتا ہوا زردار خان کے پاس آیا پھر اس بُغدے کو اس کے قدموں میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”مائی باپ! تمہارے آگے ہماری کیا چلے گی؟ میرا ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مجھے جانے دو۔“

زردار خان نے رائفل کا دستہ اس کے شانے پر مارتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے کوئی زندہ باہر نہیں جائے گا۔ کیا تو اپنی لاش یہاں سے لے جانا چاہتا ہے؟“

زردار خان نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے اس کا نشانہ لیا۔ وہ فوراً ہی زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ”نہیں نہیں' میں باہر نہیں جاؤں گا۔ تمہارے قدموں میں رہوں گا۔“

کنول اور گلاب جان اپنا تماشا بھول گئی تھیں۔ ایک دوسرے سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ”ہم کہاں آکر پھنس گئے ہیں؟“

زردار خان کے چار مسلح ساتھی تھے۔ وہ انہیں حکم دے رہا تھا۔ ”تم اوپر جاکر دیکھو اور تم اُدھر جاؤ۔ گھر کے تمام افراد کو پکڑ کے لے آؤ۔ سب سے پہلے ٹیلی فون کے تار کاٹ دو۔“

سب نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ دو گن مین زینے کے اوپری حصے کی طرف گئے اور باقی دو گراؤنڈ فلور کے اندرونی حصوں کی طرف چلے گئے۔ زردار خان نے ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنا اپنا موبائل فون اِدھر سامنے لا کر رکھ دو۔“

وہ سب بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ سکینہ اور صائقہ دل ہی دل میں آیتیں پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے اپنے موبائل فون سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے۔ گلاب جان نے تصویروں والا لفافہ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

گلاب جان نے کہا۔ ”یہ ہمارا نہیں ہے۔ کمپیوٹر کا کمال ہے۔ ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ تم سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتے ہیں۔ ہم کو جانے دو۔“

اس نے گلاب جان کا نشانہ لیتے ہوئے سیفٹی کیچ کو ہٹایا۔ وہ چیخ مارتی ہوئی کنول سے لپٹ گئی۔ وہ غرانے کے انداز میں بولا۔ ”ہمارا زبان ایک۔ ہمارا بات ایک...... ہم نے ایک بار بول دیا جو اِدھر سے جانا چاہے گا' وہ مرے گا۔ پھر اس کی لاش کو باہر پھینک دیا جائے گا۔“

کنول نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نہ سائیں! ہم نہیں جائیں گے۔ بیٹھ جا ادی! بیٹھ جا۔ نہیں تو میں بھی تیرے ساتھ ماری جاؤں گی۔“

وہ فرش پر یوں بیٹھ گئیں' جیسے گر پڑی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ایک گن مین اوپری حصے سے آکر بولا۔ ”خان جی! اوپر کوئی نہیں ہے۔ ٹیلی فون کی لائنیں کاٹ دی ہیں۔“

دوسرا گن مین چاچا سائیں کو پکڑ کر لے آیا۔ اسے

زردار خان کے آگے دھکا دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ اُدھر سوتا پڑا تھا اور کوئی نہیں ہے۔“

زردار خان نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پوچھا۔ ”اس کوٹھی کا مالک کون ہے؟“

عظمت شاہ نے کہا۔ ”میں ہوں۔“

رحمت شاہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میں ہوں۔“

زردار خان نے دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک کوٹھی اور دو مالک......؟ ایک نیام میں دو تلواریں......؟“

چاچا سائیں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ دو تلواریں لڑتی رہتی ہیں۔ میں ان کا چاچا ہوں۔ یہ اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی ہونے نہیں دیتے۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے چپ چاپ ایک کونے میں پڑا رہتا ہوں۔“

زردار خان نے اپنا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اے! زیادہ نہ بول۔ ان کا شادی نہیں ہوتا تو نہ ہو۔ ان کو جہنم میں جانے دو۔ پولیس ہمارے تعاقب میں ہے۔ ہم اِدھر چھپنے آیا ہے۔ جب خطرہ ٹل جائے گا ام چلا جائے گا۔“

وہ سر اٹھا کر چاروں طرف گھومتے ہوئے پوری کوٹھی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں یہاں کا مالک ہے۔ تمہارے پاس مال و دولت خوب ہوگا۔ ہمارا آدمی کے ساتھ جاؤ اور سارا مال لے کر اِدھر آؤ۔“

دو رائفل برداروں نے عظمت شاہ اور رحمت شاہ کو نشانے پر لیا پھر انہیں آگے چلنے کو کہا۔ وہ دونوں سر جھکا کر زینے کے اوپری حصے میں اپنے اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ ایک گن مین نے زردار خان کے قریب جھک کر کان میں کچھ کہا۔ وہ کنول کو دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ”اے......! اٹھ کر کھڑا ہو جا۔“

وہ گلاب جان کے ساتھ قالین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم مجرا کرتا ہے؟“

وہ جلدی سے بولی۔ ”ہاں سائیں! ابھی کروں؟“

اس نے اپنی کمر ذرا لچکائی۔ وہ ڈپٹ کر بولا۔ ”اے بے غیرت بے حیا! پردہ کرو۔ گناہ مت کرو۔“

گلاب جان اٹھ کر کنول کے پاس آ کر بولی۔ ”چپ چاپ بیٹھ جا۔ یہ مجرے سے بہکنے والا بندہ نہیں ہے۔“

زردار خان نے پوچھا۔ ”کیا تم اِدھر مجرا کرنے آیا تھا؟“

کنول نے ماہ نور اور نادر شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لڑکی اس نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کے باپ نے اس نوجوان کو پھانسنے کے لیے مجھے بلایا ہے۔“

جبار دادا نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ نوجوان بھی اس لڑکی کو چاہتا ہے مگر اس کا باپ نہیں چاہتا۔ اس نے مجھے دس ہزار روپے ہیں۔ میں ان دونوں کو الگ کرنے آیا تھا مگر اب نہیں کروں گا۔ میں نے تیرے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“

زردار خان سوچتی ہوئی نظروں سے ماہ نور کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنے عاشق نادر شاہ کو ایسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اندر ہی اندر اس کے لیے تڑپ رہی ہو۔ ایسے وقت زردار خان کے دل و دماغ میں رباب کے تار محبت سے گنگنا رہے تھے۔ اسے پیار بھری سرحدی روایتی موسیقی سنائی دے رہی تھی۔

کنول کہہ رہی تھی۔ ”میں اس جوان پر جھوٹا الزام لگا کر انہیں الگ کرنے آئی تھی۔ رحمت شاہ نے مجھے پچیس ہزار دیے ہیں۔“

اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ان تصویروں کے ذریعے نادر شاہ پر جھوٹا الزام لگانا چاہا لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔ میں نے یہ لفافہ تمہارے آگے رکھ دیا ہے۔“

نادر شاہ نے کہا۔ ”ہمارے والدین ہمارے پیار کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ ہم بزرگوں کا ظلم برداشت کرتے رہیں گے مگر ایک دوسرے کی محبت سے باز نہیں آئیں گے۔“

زردار خان کے اندر پشتو شاعری کی رومانیت گونجنے لگی۔

”یا قربان......! یا قربان......!“

زردار خان بڑی لگن سے بڑے جذبے سے ماہ نور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر آواز گونج رہی تھی۔ ”یا قربان!...... یا قربان......!“

اس وقت ماہ نور اپنے نادر کا بازو تھام کر کہہ رہی تھی۔ ”میں چپ رہوں گی۔ بزرگوں سے گستاخی نہیں کروں گی اگر تجھ سے جدا کیا گیا تو اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔“

زردار خان کے ذہن کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس

کے سامنے گل بانو اس کی طرف آتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''میرا ہر سانس تیرے نام سے آتا ہے زردار خان! کوئی ہم کو جدا نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو خدا قسم! یہ گل بانو اپنی جان پر کھیل جائے گی۔''
زردار خان کا دل اور دماغ ماہ نور کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں اسے وہاں ماہ نور نہیں اپنی گل بانو دکھائی دے رہی تھی۔
ایسے ہی وقت وہ خیالات سے چونک گیا۔ اس کے دو گن مین عظمت شاہ اور رحمت شاہ کے ساتھ بڑے بڑے تھیلے اٹھائے آگئے۔ انہوں نے زردار خان کے آگے انہیں رکھتے ہوئے کہا۔ ''خان جی! بہت مال ہے۔ لاکھوں روپے نقد اور زیورات ہی زیورات ہیں۔''
زردار خان نے مال و دولت کی طرف نہیں دیکھا۔ عظمت شاہ اور رحمت شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس لڑکی کا باپ ہے؟''
رحمت نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا پھر اس نے عظمت شاہ سے پوچھا۔ ''تم اس لڑکے کا باپ ہے؟''
عظمت شاہ نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ زردار نے کہا۔ ''تم ان کا شادی کیوں نہیں کرتا؟ تمہارا کم بختی کیا ہے؟''
عظمت نے کہا۔ ''یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔''
زردار خان نے کہا۔ ''اوئے خانہ خراب! میری بات کا جواب دو؟''
عظمت نے کہا۔ ''سب ہی کو دولت کمانے کا حق ہے۔ تم دولت لوٹ کر جا رہے ہو۔ میں اس سے زیادہ کمانا چاہتا ہوں۔ اپنے بیٹے کی شادی ایک بہت بڑے وڈیرے کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم مالا مال ہو جائیں گے۔''
سکینہ نے کہا۔ 'میں بھی ماہ نور کی شادی ایسی جگہ کر رہی ہوں جہاں وہ راج کرے گی۔ ایسے رشتے دار دشمنوں کے سائے میں کنیز بن کر نہیں رہے گی۔''
رحمت نے کہا۔ ''خان! تم اس گھر کو لوٹنے آئے تھے۔ تمہارا معاملہ ختم ہو گیا۔ اب ہمارے بچوں کے مسئلے میں نہ پڑو۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔''
زردار نے کہا۔ ''تمہارا معاملہ دولت ہے اور ہمارا معاملہ محبت ہے۔ میرا گل بانو بولتا تھا...... اوئے زردار خان......!''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اسے اپنے چاروں طرف گل بانو کی گونجتی ہوئی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اوئے زردار خان! میں تیرے لیے اپنا قبیلہ چھوڑ کر آئی ہوں۔ مجھ سے وعدہ کر۔ آئندہ تو لوٹ مار نہیں کرے گا۔ ڈاکو نہیں بنے گا۔ میں ایک غیرت مند کی جانِ جاناں بن کر رہنا چاہتی ہوں۔''
زردار خان اس کے ساتھ ساتھ کہہ رہا تھا۔ ''ہاں...... میں نے تیرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ آئندہ لوٹ مار نہیں کرے گا۔ ڈاکو بن کر نہیں رہے گا مگر ہائے جانِ جاناں! میں ڈاکو بن کر رہ گیا۔''
اس نے عظمت شاہ اور رحمت شاہ سے کہا۔ ''جانتے ہو ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا؟ میری گل جاناں اپنے قبیلے کو چھوڑ کر میرے ساتھ فرار ہونا چاہتی تھی اور دشمن ہمارا تعاقب کر رہے تھے...... محبت کے دشمن کہاں نہیں ہوتے؟ یہاں بھی تم دونوں بھائی محبت کے دشمن ہو۔ وہاں بھی دشمن ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا...... آہ! ہماری بدبختی ایک گولی میری گل جاناں کو لگ گئی۔ میں نے اسے بازو میں اٹھا کر بھاگنا چاہا تو وہ تڑپ کر نیچے گر گئی۔ وہ بہت جذباتی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ پہلے وعدہ کر حلال کی روزی کمائے گا اور مجھے ایک باعزت زندگی دے گا۔
ہم نے اس سے وعدہ کیا۔ ہاں میری جان! ہاں۔ تو جو بولے گی وہی کروں گا مگر یہاں سے چل۔''
وہ بولی۔ ''کیا میرے مرنے سے تیرا وعدہ بھی مر جائے گا؟''
''نہیں۔ پٹھان اپنی جان سے جاتا ہے اپنی زبان سے نہیں جاتا۔ ہم لوٹ مار اور یہ ڈکیتی چھوڑ دے گا۔ حلال کی روزی کمائے گا۔ اب یہاں سے چل۔
ہائے گل جانو...... وہ میرے ساتھ کیسے چلتی؟ وہ تو چل بسی ہمیشہ کے لیے چل بسی......''
وہ خالی خالی نظروں سے عظمت اور رحمت کو دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''تم اور تم...... اپنے سینے میں دل نہیں پتھر رکھتا ہے۔ تم نہیں جانتا محبت کیا ہے؟ وہ پتھر میں پھول کھلاتا ہے اور ڈاکو کو ایک عاشق جانباز بنا دیتا ہے۔''
وہ ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''جیسے تم لوگ ہو ویسے ہی وہ لوگ بھی تھے محبت کے دشمن...... انہوں نے میری گل بانو کو مار ڈالا۔ پھر میں کیسے انہیں زندہ چھوڑ

دیتا؟ میں نے ایک ایک کو چن چن کر قتل کر دیا۔ ان کی دولت لوٹ لی اور لٹیرا بنتا چلا گیا۔''

وہ سر اٹھا کر جیسے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''او خدایا! وہ میرے لیے اپنا قبیلہ چھوڑ کر آئی۔ میری خاطر اپنی جان دے دی۔''

پھر اس نے ماہ نور کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہیں دے گی۔ یہ اپنے نادر شاہ کا امانت ہے۔ تم لوگ امانت میں خیانت مت کرو۔ ابھی اللہ کا نام لے کر قبول کراؤ اور اسے اس جوان کے حوالے کردو۔''

رحمت نے کہا۔ ''یہ نہیں ہوگا۔ تم ایسا حکم نہ دو۔ یہ میری بیٹی ہے۔ اس کی شادی کا فیصلہ میں کروں گا۔''

زردار خان نے ڈپٹ کر کہا۔ ''یہ تمہارا بیٹی ہے مگر ہمارا گل بانو ہے۔ اُدھر قبیلے کا فساد تھا' اِدھر بھائیوں کا فساد ہے۔ ہم اسے مرنے نہیں دے گا۔ اپنا گل بانو کو نئی زندگی دے گا۔''

عظمت نے کہا۔ ''ہمارے معاملے میں نہ پڑو۔ میں اپنے بیٹے کو اس کا داماد نہیں بننے دوں گا۔''

وہ رائفل سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک گولی اِدھر......''

پھر اس نے رحمت شاہ کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور ایک گولی اِدھر...... خس کم جہاں پاک...... محبت کے دشمن مریں گے پھر کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔''

صائقہ نے کہا۔ ''خدا کے لیے گولی نہ چلانا۔ یہ جتنی دولت لے جارہے ہو، ہم اس سے زیادہ دیں گے۔''

زردار خان نے وہ بڑے بڑے تھیلے اٹھا کر صائقہ اور عظمت کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا گل بانو کا جہیز ہے۔ اس کو قبول کرو یا پھر گولی کھاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے گن کا سیفٹی کیچ ہٹا کر عظمت کا نشانہ لیا۔ ماہ نور اور نادر دوڑتے ہوئے آکر عظمت سے لپٹ گئے۔ نادر نے کہا۔ ''پہلے ہمیں مارو...... پہلے ہم مریں گے۔''

ماہ نور نے کہا۔ ''چلاؤ گولی...... پہلے تمہاری گل بانو مرے گی۔''

زردار خان نے پریشان ہو کر ماہ نور کو دیکھا۔ ایسے ہی وقت کہیں دور سے پولیس موبائل وین کا سائرن سنائی دینے لگا۔ وہ اور اس کے ساتھی ایکدم سے چونک گئے۔ فوراً دوڑتے ہوئے دروازے اور کھڑکیوں کی طرف جا کر


جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کرسکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پوزیشن لینے لگے۔ عظمت، رحمت، صائقہ اور سکینہ کو قانونی تحفظ حاصل ہونے والا تھا۔ اب وہ ذرا مطمئن ہو گئے تھے۔ اندر سے خوش ہو رہے تھے۔

باہر سے گاڑیوں اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں پھر میگا فون کے ذریعے آواز گونجتی ہوئی اندر آئی۔ ''زردار خان...... ! ہم نے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ٹریس کر لیا ہے۔ اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ فرار ہونا چاہو گے تو حرام موت مرو گے۔''

زردار خان وہ باتیں سن رہا تھا اور اشارے سے اپنے ساتھیوں کو اوپر جانے کا حکم دے رہا تھا۔ دو گن مین دوڑتے ہوئے اوپر جانے لگے۔ میگا فون سے آواز ابھر رہی تھی۔ ''اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔ عقل سے کام لو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔''

زردار خان نے ایک دیوار سے لگ کر کھڑکی کے پٹ کو ایک ذرا سا کھول دیا۔ پھر بلند آواز میں کہا۔ ''آفیسر! اپنا مغز کو کام میں لاؤ۔ ادھر پورا خاندان ہمارے نشانے پر ہے۔ ادھر سے کوئی باہر نہیں جائے گا۔ باہر سے کوئی اندر نہیں آئے گا...... تم کوئی نادانی نہیں کرے گا۔ اگر اُدھر سے ایک گولی چلے گا تو اِدھر خاندان کا ایک بندہ مرے گا۔ تم ہمارا سلامتی نہیں، ان کا سلامتی چاہو۔''

میگا فون سے ابھرتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تم کب تک انہیں گن پوائنٹ پر رکھو گے؟ کب تک چھپے رہو گے؟ آج نہیں تو کل تمہیں ہتھیار ڈالنا ہوگا۔''

زردار خان نے کہا۔ ''ہمارے سر میں مغز ہے۔ ہم جانتا ہے ہم کو کیا کرنا ہے؟''

اس نے عظمت اور رحمت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ادھر خاندان کا دو سرپرست ہے۔ ہم دونوں کو نشانے پر رکھ کر یہاں سے جائے گا۔ تم روکے گا، گولی چلائے گا تو ہم ان دونوں کو گولی مار دے گا۔''

عظمت اور رحمت سہم کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی بیویاں رونے لگیں۔ صائقہ نے کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں آپ کو ان ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں جانے دوں گی۔''

سکینہ بھی رحمت کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ پھر بولی۔ ''مجھے مار ڈالو۔ میں مر جاؤں گی یا پھر ان کے ساتھ جاؤں گی۔''

زردار خان نے کہا۔ ''اپنا اپنا بیوی کو سمجھاؤ۔ نہیں تو ہم ان کو گولی مارے گا اور تم دونوں کو ساتھ لے جائے گا۔ محبت کے دشمن نہیں رہیں گے تو یہ دونوں بچے آپس میں شادی کر کے خوشحال زندگی گزاریں گے۔''

صائقہ نے جلدی سے کہا۔ ''مرنے مارنے کی بات نہ کرو۔ ہم تمہارا مطالبہ مان لیتے ہیں۔ تم جب کہو گے، ہم اپنے بچوں کی شادی کرا دیں گے۔''

عظمت شاہ نے ذرا اٹکتے ہوئے کہا۔ ''ہم آج سے ماہ نور کو ہونے والی بہو تسلیم کرتے ہیں۔''

رحمت شاہ نے بھی بے دلی سے نادر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اسے اپنا ہونے والا داماد تسلیم کرتا ہوں۔''

زردار خان نے کہا۔ ''یا خدایا! کیا مقدر کا تماشا ہے؟ کبھی تولہ ہے، کبھی ماشہ ہے۔ موت کو سامنے دیکھ کر آپس کی دشمنی بھول گئے ہو۔''

پھر اس نے ماہ نور اور نادر شاہ سے کہا۔ ''بچہ لوگ! تیار ہو جاؤ۔ ہم تم کو یرغمال بنا کر اپنے علاقے میں لے جائے گا۔ اُدھر تمہاری شادی کرائے گا۔ تم میاں بیوی بن کر واپس آئے گا۔''

ماہ نور نے کہا۔ ''نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

نادر نے کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ہم نے سوچا تھا' یہاں سے کہیں دور جا کر شادی کریں گے اور یہ موقع ہمیں مل رہا ہے۔''

ماہ نور زردار کے پاس آکر بولی۔ ''تم گل بانو کو بہت چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''یہ کیسا سوال کرتا ہے؟ یہ سوال اپنے نادر شاہ سے پوچھو۔ وہ تم کو کتنا چاہتا ہے؟ گل بانو تو میری جانِ جاناں تھی۔ پر افسوس...... وہ نامراد اس دنیا سے چلی گئی۔''

ماہ نور نے پوچھا۔ ''تم اپنی گل بانو کی خاطر میری مرادیں پوری کرنا چاہتے ہو؟ میں پوچھتی ہوں' تم گل بانو کی خاطر کیا کر سکتے ہو؟ کیا اپنی جان دے سکتے ہو؟''

زردار خان نے سینہ تان کر کہا۔ ''بے شک' ہم اپنا جان دے سکتا ہے۔ ہزار بار اس کے لیے جان دے سکتا ہے۔''

ماہ نور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے اس کی چھوٹی سی خواہش' چھوٹا سا مطالبہ پورا نہیں کیا۔ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ حلال روزی کماؤ گے اور

اسے عزت کی زندگی دو گے۔ کیا تم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے؟"

زردار کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے گل بانو دکھائی دینے لگی۔ وہ بولا۔ "ہاں ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ ہم اس کے لیے حلال کماتا۔ اسے عزت کی زندگی دیتا اگر وہ زندہ ہوتا۔"

ماہ نور نے کہا۔ "وہ زندہ ہے زردار خان! دل کی آنکھوں سے دیکھو..... گل بانو تمہارے سامنے کھڑی ہے۔"

زردار خان بڑے جذبے سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر وہی رومانی گیت ابھر رہا تھا۔

گل بانو کہہ رہی تھی۔ "محبوب کے مرجانے سے محبت نہیں مرتی۔ اس سے کیا ہوا وعدہ نہیں مرتا۔ اسے ہر حال میں پورا کرنا پڑتا ہے۔ اپنا وعدہ پورا کرو زردار خان! مرد جان دے دیتا ہے مگر زبان نہیں ہارتا۔ تم نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ اس کی تلافی کرو۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولی۔ "ہتھیار پھینک دو۔ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ دیکھو! میں زندہ ہوں...... تمہاری گل بانو زندہ ہے۔ محبت کبھی نہیں مرتی۔ جب بھی کسی ماہ نور پر ظلم ہوگا تو تمہاری گل بانو اس کی صورت میں تمہارے سامنے آجائے گی...... بولو...... حلال کماؤ گے؟ ہتھیار پھینکو گے؟ گل بانو کے دل کو آرام پہنچاؤ گے؟"

وہ جو رائفل اٹھائے ہوئے تھا۔ اس پر آہستہ آہستہ گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ ان لمحات میں ماہ نور اس کے سامنے نہیں تھی۔ گل بانو اس سے بول رہی تھی۔ "سوچو زردار خان! اچھی طرح سوچو..... تم نے خود کو قانون کے حوالے نہ کیا تو یہ ماہ نور بھی نادر شاہ سے شادی نہیں کرے گی۔ اپنی جان دے دے گی۔ ایک بار پھر تمہاری گل بانو مر جائے گی۔"

زردار خان نے چیخ کر کہا۔ "نہیں...... ہم تم کو مرنے نہیں دے گا۔ ابھی ہمارا گل بانو پکار رہا ہے۔ محبت مانگ رہا ہے پھر ایک بار زندگانی مانگ رہا ہے۔ اے ماہ نور! تم ابھی نادر سے نکاح قبول کرے گا اور ابھی ہم قانون کا ہتھکڑی پہنے گا۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر بلند آواز میں بولا۔ "آفیسر! ہم ہتھیار پھینکے گا' باہر آئے گا مگر پہلے ہمارا ایک مطالبہ پورا کرو۔"

میگا فون سے کہا گیا۔ "تم قانون کے سامنے جھک رہے ہو۔ ہم تمہارا مطالبہ پورا کریں گے۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

اس نے دور کھڑی ہوئی ماہ نور کو بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر کھڑکی کے باہر منہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر گل بانو کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ ایک قاضی صاحب کو بلاؤ تم بھی آؤ اور بچہ لوگ کو دعائیں دو۔"

وہاں پولیس کے کئی اعلیٰ افسر تھے' جو اس کوٹھی کا محاصرہ کرنے آئے تھے۔ وہاں زردار خان بڑی آسانی سے گرفت میں آسکتا تھا۔ لیکن اس نے دھمکی دی تھی کہ اس کوٹھی کے مالکان کو یرغمال بنا کر لے جائے گا۔ اگر کسی نے اسے گولی مارنے یا گرفتار کرنے کی کوشش کی تو وہ ان مالکان کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ایسے میں اسے گرفتار کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔

ان افسران نے فیصلہ کیا کہ جلد سے جلد قاضی صاحب کو بلا کر وہاں کسی گل بانو کا نکاح پڑھانے کے فرائض ادا کیے جائیں۔ وہ پٹھان اپنی زبان کا دھنی ہے۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہا ہے اور ہمیں بھی نکاح میں شریک ہونے کے لیے بلا رہا ہے۔

زردار خان کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ایک قاضی صاحب کے ساتھ چند پولیس افسران کوٹھی کے اندر آگئے۔ عظمت، رحمت، صائقہ اور سکینہ سب ہی گم صم تھے۔ اب تو قانون کے محافظ بھی ماہ نور اور نادر کی حمایت کر رہے تھے۔ ان کا نکاح پڑھایا جا رہا تھا۔ طویل عرصے سے دو بھائیوں کے درمیان جو جھگڑا چلا آرہا تھا، اسے ایک گل بانو کی محبت نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ دو دل ایک ہو رہے تھے۔ پولیس، قانون، ڈاکوؤں اور ہتھیاروں کے درمیان محبت کے پھول کھل رہے تھے۔

نکاح ہونے کے بعد سب ہی دولہا دُلہن کے ماں باپ کو مبارک باد دینے لگے۔ زردار خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنے ہتھیار ان افسران کے قدموں میں لا کر رکھ دیے۔ انہیں ہتھکڑیاں پہنائی جانے لگیں۔ ماہ نور اور نادر شاہ دوڑتے ہوئے آکر زردار خان سے لپٹ گئے۔ نادر شاہ کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ماہ نور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

زردار نے بڑے جذبے سے اسے دیکھا۔ گل بانو روتے روتے مسکرا رہی تھی۔ دور کہیں سرحدی پہاڑوں میں آوازیں گونج رہی تھیں۔ "یا قربان...... ایا قربان......!"

❖❖❖

تیئیسویں قسط

# الائو

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الائو... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے سے قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دست قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الائو کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الائو ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھنائونے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے

ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ
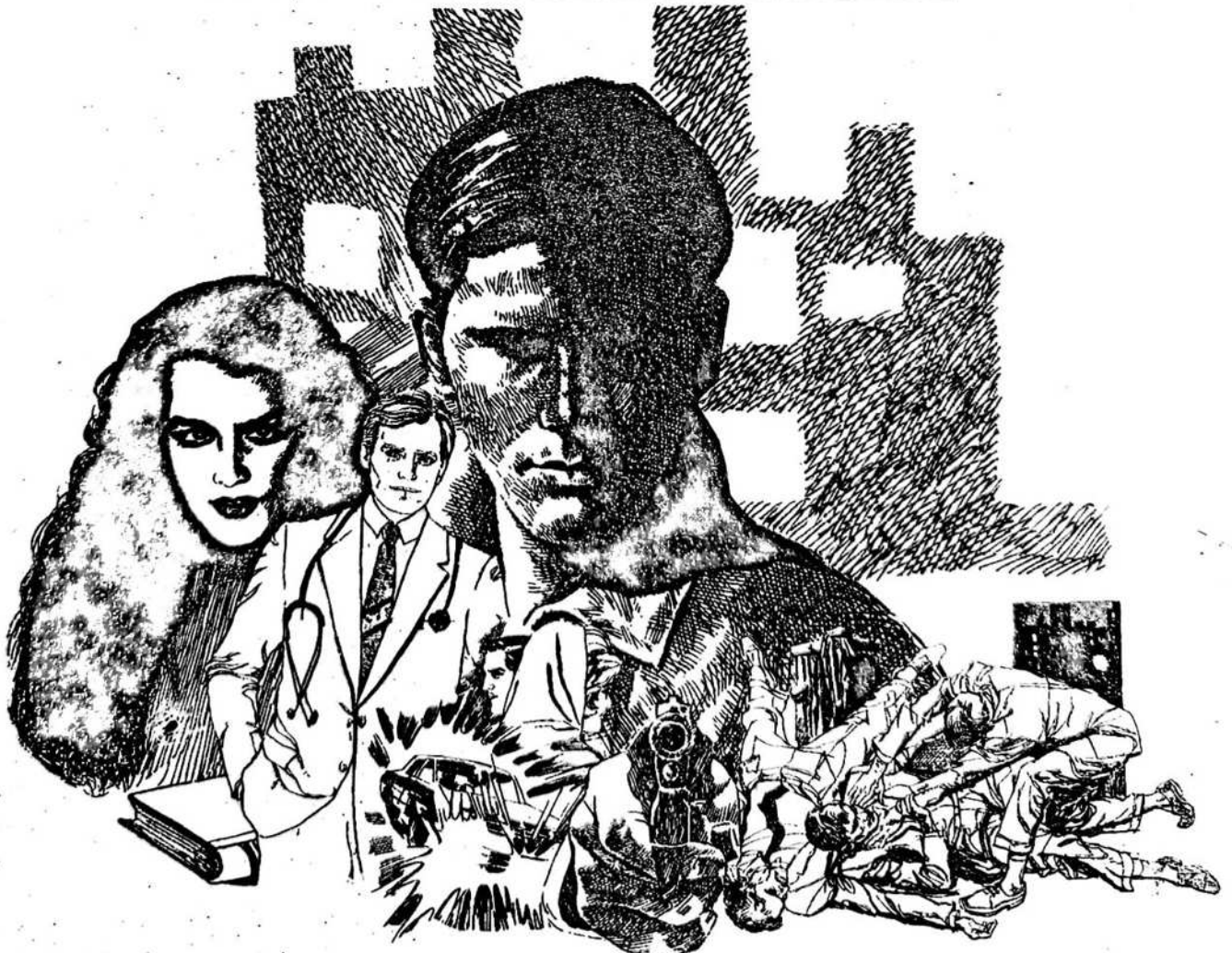
پاکستانی ڈاکٹر سیف الدین، امارات کے ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہا ہے، یوں دیگر ممالک سے آئے ہوئے ٹاپ پروفیشنل افراد میں بھارت سے تعلق رکھنے والے دو ڈاکٹرز رمیش اگروال اور رنبیر سنگھ بھی ہیں۔ کھلے دل کا مالک اور دوست نواز رنبیر سنگھ، ڈاکٹر سیف کا ایک اچھا دوست ہے لیکن ڈاکٹر رمیش اگروال ایک کینہ پرور آدمی ہے۔ پاکستان کے خلاف اس کے دل میں شدید نفرت بھری ہوئی ہے اور وہ ڈاکٹر سیف سے بھی اسی لیے عداوت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یوں رمیش جان بوجھ کر سیف کے سامنے اس کے ملک پاکستان کی برائیاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والے ایک کرکٹ میچ کے دوران جب بھارت کے ہاتھوں پاکستان کو شکست ہوئی تو بغض ڈاکٹر رمیش اگروال کو پاکستان کے خلاف زہر اُگلنے کا خوب موقع ملا اور تب ہی ڈاکٹر سیف یہ برداشت نہ کر سکا اور زبانی کلامی اسے منہ توڑ جواب دے دیا۔ نوبت ہاتھا پائی تک آتی اگر دیگر کولیگز ان کے درمیان نہ آتے، اُنہوں نے بھی رمیش کو ہی اس کی بداخلاقی اور بدزبانی پر کوسا تھا جن میں رنبیر سنگھ سرفہرست تھا۔ بہ ظاہر بات آئی گئی ہوگئی لیکن رمیش نے دل میں رکھ لی۔ انہی دنوں سیف پر ایک بھیانک انکشاف ہوا کہ اسپتال میں چند جرائم پیشہ خفیہ طور پر انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری میں ملوث تھے۔ اسپتال کے تیرہویں چودہویں فلور میں غلطی سے جانے پر سیف کو رمیش دانستہ کچھ باکسز کی جھلک دکھاتا ہے اور ساتھ ہی اسے بڑی کینہ توز اور منتقمانہ نظروں سے گھورتا ہے، سیف نہیں جانتا کہ اس باکسز میں اس کے چھوٹے معصوم بھائی عادل کو رمیش نے اپنی دشمنی کے غبار تلے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے فروخت کر دیا ہے۔ اس دوران سیف پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں، مگر قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کی جگہ اسی کا ہم وطن احسان نارا جاتا ہے، دوسرے حملے میں اس کا بھارتی دوست رنبیر سنگھ ہلاک ہو جاتا ہے۔ سیف پاکستان لوٹتا ہے اور اسے بھائی کی گمشدگی کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر سیف پنجاب (پاکستان) کے ایک سرحدی گاؤں کا باشندہ ہے۔ باپ زمین کے کچھ ٹکڑوں کا مالک ہے۔ بعد میں وہ پھیپھڑوں کی بیماری کی وجہ سے کوچ کر جاتا ہے۔ سیف کا چھوٹا بھائی عادل، ماجد کا دوست ہے اور ماجد، سیف کی کلاس فیلو ڈاکٹر حمیرا کا بھائی ہے۔ حمیرا کے باپ امجد کا لاہور میں کاروبار ہے۔ حمیرا اور سیف آپس میں ملتے ہیں اور ان کے درمیان پسندیدگی، پھر اُنسیت اور اس کے بعد تعلقِ خاطر محبت میں بدل جاتا ہے۔ وطن لوٹنے پر عادل کی گمشدگی پر سیف اس کی تلاش میں لگ جاتا ہے اس دوران اسے عادل کی لاش دیکھنا پڑتی ہے۔ ایسی لاش جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اندر سے خالی تھی۔ بدنصیب عادل کو لاش میں بدلنے سے پہلے مکروہ تیس کے دوران اسے اہم اندرونی جسمانی اعضا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ سیف بھائی کی قبر کی مٹی اُٹھا کر قسم کھاتا ہے کہ جن لوگوں نے ایسا بے رحمانہ کھیل کھیلا ہے، وہ انہیں تصویرِ عبرت بنا کے چھوڑے گا۔ اس کے بعد سیف کی زندگی کا ڈھب بدل کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں طارق مجید نامی ایک کرائم رپورٹر جو بیک وقت لڑائی بھڑائی میں بھی طاق ہے اور اس کی پارٹنر رومانہ عرف رومی، جس نے کرمنالوجی میں ماسٹر کیا اور انٹرپول سے متعلق تھی، آج کل یہ دونوں آرگن پائریسی اور انسانی اعضا کی اسمگلنگ کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ سیف جیسے عام مسیحا کو ان دونوں "ٹاپ پروفیشنل" کی ہم راہی مل جاتی ہے تو وہ کندن بننے لگتا ہے۔ تاہم حالات کی تلخیاں اور زہرناکیاں اس کی نفسیات پر عجیب اثر بھی ڈالتی ہیں جہاں وہ ایک طارق اور رومی جیسے ٹاپ پروفیشنلو ساتھیوں کی سنگت داری میں جنگجو بننے لگتا ہے وہیں اس میں بدلہ نجی بھی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اب ان تینوں اور انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری کرنے والے بین الاقوامی خونی سوداگروں کے بیچ ایک دھواں دھار رن پڑ چکا ہے۔ ان تینوں ساتھیوں کی مضبوط تگڈم...... ان خونی بیوپاریوں کو تگنی کا ناچ نچاتی ہے، جن کا نیٹ ورک پاکستان میں بھی اس گھناؤنے کالازار میں معروف کار ہے۔ پاکستان میں ان کا سرغنہ فیروز شاہ المعروف گوہر شاہ اور اس کے خاص کارپرداز تاج کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ سیف کو پتا لگتا ہے کہ ڈاکٹر رمیش نے اپنی بھیانک دشمنی نکالنے کے لیے انہی دونوں مذکورہ افراد کو عادل کا پتا دیا تھا۔ ڈاکٹر رمیش اگروال خونی سوداگروں کی "ہائیر اتھارٹیز" سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اس کا باس سرجن امرناگ بھی شامل ہے۔ یہی لوگ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے نیٹ ورک کو چلا رہے ہیں اور ان خونی بیوپاریوں میں...... شنکر چانکیہ، سہراب مجوٹہ، بنکاک اور دیگر چند ممالک کے ز تل چیف احکامات دیتے اور انسانی اعضا کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر خصوصی چارٹرڈ طیارے ہائر کرنے اور مذکورہ بیمار افراد کو کروڑوں روپوں کے عوض اعضا لگانے کے پابند ہیں۔ پاکستان میں گوہر شاہ کے ساتھ جنگ کے دوران یہ لوگ حمیرا کے گھر والوں کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ سیف کا دوست ایس پی شاداب اس کی مدد میں شامل ہے۔ حمیرا اور اس کا باپ ان کے ڈر سے یوکے شفٹ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سیف اور حمیرا کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ان تینوں ساتھیوں کی کوششوں کے سبب...... پاکستان میں ان خونی بیوپاریوں کے نیٹ ورک کا قلع قمع ہونے لگتا ہے لیکن سیف کو ابھی اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ رومی اور سیف امارات کا رخ کرتے ہیں، یہاں اپنے بھائی کے ایک دشمن سرجن امرناگ کو سیف عبرت ناک موت سے ہمکنار کرتا ہے لیکن اصل دشمن ڈاکٹر رمیش اگروال فرار ہو کے بھارت جا کر اپنے گرو گھنٹال شنکر چانکیہ کے چرنوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا

ہے۔ اس کے تعاقب میں رومی اور سیف بھارت کا رخ کرنے والے ہیں لیکن بدقسمتی سے رومی تو بھارت چلی جاتی ہے لیکن سیف نہیں جاسکتا۔ طارق اور رومی کے مشورے اور ہدایات کے مطابق ناچار سیف امارت سے پاکستان کا رخ کرتا ہے کہ طیارے کو کچھ نامعلوم دہشت گرد ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ اندر کچھ ناخوش گوار واقعات کی وجہ سے طیارے کو کریش لینڈنگ کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ راجستھان کے صحرا میں تباہ ہو جاتا ہے۔ سیف اور اس کی دو بدنصیب مسافر ساتھی مالا اور شکنتلا زندہ بچتے ہیں مگر وائے نصیب کہ یہ تینوں صحرائی لٹیروں کے چنگل میں جا پھنستے ہیں۔ قبیلے میں آتے ہی ان تینوں کے ساتھ زیادہ برا سلوک نہیں ہوتا۔ سیف کیونکہ ڈاکٹر تھا اس لیے سہارا کی خصوصی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ مالا سے یہاں کا ماحول اور حالات برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ موقع دیکھ کر وہ فرار ہو جاتی ہے اور عبرت ناک انجام سے دوچار ہو کے ہلاک ہو جاتی ہے۔ سیف اور شکنتلا بھی یہاں سے جلد نکل جانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے ہی مہاراجا کا دیہانت ہو جاتا ہے۔ سیف گل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ قدرت اسے ان خونی سوداگروں کے پاس پہنچا دیتی ہے جو جسونت رائے کے بھتیجے کے اعضا کو آئس باکسز میں رتلام اسپتال پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ سیف کو کملیش کا آدمی سمجھتے ہیں۔ راستے میں پولیس ریڈ کے نتیجے میں سیف دھر لیا جاتا ہے۔ سیف کے بارے میں معلومات حاصل کر کے جسونت اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ سیف کی مدد سے کملیش اور اس کے ساتھی پکڑے جاتے ہیں پھر کمشنر جسونت کو اطلاع دیتا ہے کہ سیف پڑوسی ملک کا خطرناک جاسوس ہے اسے ہمارے حوالے کیا جائے۔ یہ سن کر سیف چونک پڑتا ہے۔ جسونت رائے نے کمشنر سے اس کی جان چھڑا دی تھی۔ کملیش نے بتایا کہ اس گھناؤنے کاروبار کے پیچھے شنکر چانکیہ تھا۔ وہ لوگ اسپتال کا رخ کرتے ہیں اور مریضوں کے بھیس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے وہ مرتے مرتے بچے۔ انہوں نے جسونت رائے کو آگے کے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ رچنا جو سیف کی ساتھی تھی۔ اب انہیں ممبئی کا رخ کرنا تھا۔ آج کل حمیرا کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ممبئی کے مقامی ہوٹل میں مقیم تھی۔ سیف کی بالآخر طارق سے ملاقات ہوگئی مگر اس کی حالت بے حد دگرگوں تھی۔ سیف اور طارق شنکر کو اغوا کر کے طارق کی کھولی میں لے آئے تھے۔ اس قدر بھاگ دوڑ نے دونوں کو تھکا دیا تھا۔ شنکر کی نگرانی پر رچنا کو مامور کر کے سیف بھی گہری نیند سو گیا۔ حمیرا ممبئی کے ایک ہوٹل میں مقیم تھی۔ سیف کی اس سے طویل جذباتی ملاقات ہوتی ہے۔ رومی کی تلاش جاری تھی۔ مسلسل گھومتے ہوئے سیف کو دشمنوں کے ٹھکانے سے رومی مل جاتی ہے۔ رومی کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ تاج نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی حد کر دی تھی۔ سیف نے اس کا پورا بدلہ لیا۔ اب سیف نے حمیرا سے ملنے کی ٹھان لی تھی۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

**کالی بھٹ**...... تاریکی میں چند لمحے ہی میں اور رومی ایسی ”حالت“ میں رہے تھے، اس کے فوراً بعد ہم الگ ہو گئے۔

”ٹارچ ڈھونڈنے کی کوشش کرو، جلدی......“ رومی کی لرزتی آواز ابھری۔

”ٹارچ نہیں مل سکتی، یہاں سے بھاگنے کی کرو رومی!“ میں نے بھی چلا کر کہا۔ بھلا ایک ذرا سی پنسل ٹارچ کو کیسے ڈھونڈا جا سکتا تھا جو بجھ بھی چکی ہو۔

تھوڑی دیر پہلے ٹارچ کی محدود روشنی کے ہالے میں رومی اور میں نے جو بھیانک صورت دیکھی تھی، وہ کسی شیطان سے کم نہ تھی۔

نو عمر لڑکے سندر لال نے بھی اسے کسی شیطانی جادوگری سے تعبیر کیا تھا۔ اب وہی کچھ میرے دل و دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

رومی سے یہ کہتے ہی میں اندازے سے اسی مختصر قدمچوں والے زینے کی سمت بھاگا جہاں سے ہم یہاں داخل ہوئے تھے۔

اسی وقت شیطانی قہقہہ گونجا۔ جیسے کوئی بدروح چلّائی ہو۔ میرا دل پھر دہل کر رہ گیا۔ ظاہر ہے میں پہلے بھی ایسے پراسرار حالات سے نہیں گزرا تھا — ان مندروں اور ہندو پجاریوں کے جادو ٹونوں سے بھلا کون واقف نہ تھا۔ وہی کچھ میرے ذہن میں بھی گردش کر رہا تھا۔

رومی نے ٹارچ تلاش کر لی تھی، کیونکہ اسی وقت وہ اس نے جلا لی تھی۔ وہ میرے قریب ہی کھڑی تھی۔

شکر تھا کہ اس نے بھی ٹارچ کی روشنی میں میری تقلید کی تھی۔ یعنی مختصر زینے کی جانب دوڑے۔

ہم گرتے پڑتے نیچے آ گئے۔ ہماری سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔

یہاں ہال میں مدھم روشنی تھی اور رومی مجھے لیے اس کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ میں سمجھا وہ شاید ستانے کے لیے رکی ہے۔

”تم نے کیا دیکھا تھا سیف؟“ کچھ سانسیں بحال

ہونے کے بعد اس نے سرسراتی سرگوشی میں پوچھا۔

"وہی جو تم نے دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ شیطانی مسکراہٹ والی کوئی کالی سیاہ خوف ناک شکل تھی۔" رومی جیسے تصدیق کرنا چاہ رہی تھی۔

"بالکل۔" میں نے مختصر کہا اور اسے اس نوعمر لڑکے سندر لال کی نصیحت یاد دلائی۔ "اس لڑکے نے غلط نہیں کہا تھا ہم سے......"

"میرا خیال ہے یہ ہمارا واہمہ ہے۔ ماحول اور حالات کے زیر اثر ہم نے اس خوف ناک شے کا غلط مطلب لیا ہے۔" رومی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ کچھ میرا ذہن بھی کام کرنے لگا تھا۔

"ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے، نہیں...... یقیناً۔ وہ کوئی پتھر کی بے جان مورتی بھی ہوسکتی ہے۔" رومی نے اپنے طور پر اندازہ لگایا۔ مجھے اس کی بات سے متفق ہونا پڑا۔

"ہم مسلمان ہیں، سیف! اور اِن باتوں پر ہمیں یقین نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو...... ہم اللہ کے ماننے والوں میں سے ہیں، جن کا شیطان کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بے شک۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کیا خیال ہے، دوبارہ چلا جائے اوپر؟" وہ بولی۔

"میں تیار ہوں۔" اس کی باتوں نے میرے اندر قدرتی۔۔ جوش پیدا کر دیا تھا، جیرا کا کھوج لگانا بھی ضروری تھا۔

ابھی ہم دوبارہ اس قدِ آدم الماری والے زینے کی جانب قدم اٹھانے ہی والے تھے، جس کے دونوں پٹ ہنوز وا تھے کہ اچانک وہاں سے ایک سائے کی ہمیں جھلک نظر آئی۔

میں نے تو فوراً دل ہی دل میں آیاتِ کریمہ کا وِرد شروع کر دیا تھا، کہ کہیں یہ اوپر بنے خفیہ مندر کی واقعی وہی چڑیل نہ ہو، جس کی بھیانک سیاہ شکل ہم دیکھ چکے تھے۔ اس نے شیطانی قہقہہ بھی بلند کیا تھا۔

ہم ٹھٹک کر وہیں رک گئے اور بہ غور آنکھیں سکیڑ کر اس پُراسرار سائے کی جانب تکنے لگے۔ رومی نے پنسل ٹارچ بجھا دی تھی۔

ہال سے کمرے کی مدھم روشنی میں وہ سایہ ہمیں نظر آتا تھا۔ شاید اُسے بھی ہماری ابھی تک یہاں موجودگی کا علم ہو چکا تھا کیونکہ اس کا رخ اسی سمت تھا جہاں میں اور رومی گویا دبکے کھڑے تھے۔

وہ سایہ ایسا ہی تھا جیسے کسی انسان نے سیاہ رنگ کی پوری چادر اپنے اوپر اوڑھ رکھی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا ہماری جانب آرہا تھا۔

معلوم نہیں اس میں کیا اسرار تھا کہ اس پُراسرار سائے کو اپنی جانب دھیرے دھیرے بڑھتا دیکھ کر ہم پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔

پھر اچانک ہی وہ سایہ ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر رک کر ٹھہر گیا۔ تب ہی اس نے ایک کریہہ انگیز چیخ خارج کی۔ میں اور رومی ایک بار پھر بُری طرح دہل گئے۔

"تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟" اچانک وہ سایہ خرخراتی ہوئی آواز میں ہم سے مخاطب ہو کے بولا۔ اس کے لب و لہجے سے قہر و غضب جھلکتا محسوس ہوا۔

"کون ہو تم؟ ختم کرو یہ بہروپ......"

شاید یہ پاک آیاتِ کریمہ کا وِرد ہی تھا جس نے میرے اندر ایک حوصلہ پیدا کر دیا تھا اور میں درانہ وار اس پُراسرار سیاہ پوش سائے کو للکار بیٹھا تھا۔

"خاموش......" سایہ بھی گرجا۔ "تم نے کالی دیوی کے استھان کا اپمان کیا ہے۔ زندگی چاہتے ہو تو اسی وقت واپس لوٹ جاؤ۔" سائے نے دھمکی دی۔

سائے کی آواز کسی عورت سے ہی مشابہ تھی اور ابھی میں اس آواز کی "شناسائی" پر غور کر رہا تھا کہ اچانک میرے ساتھ کھڑی رومی حرکت میں آئی اور اچھل کر اس نے سائے پر چھلانگ لگا دی۔

میں رومی کی اس درانہ وار حرکت پر ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گیا۔

☆☆☆

رومی سائے سمیت فرش پر آرہی۔ میں نے بھی اپنے حواس پوری طرح مجتمع کر لیے تھے اور جلدی سے سوئچ بورڈ، جسے میں پہلے ہی نظروں میں لے چکا تھا، کی طرف پھرتی سے بڑھا اور ہال کمرے کی لائٹ آن کر دی۔

اسی روشنی میں مجھے چونکا دینے والا منظر نظر آیا۔ رومی سائے سمیت فرش پر گری تھی اور اس نے بہ سرعت سنبھالا .... لیتے ہی سائے کے اوپر سیاہ چادر کھینچ لی تھی۔

اندر سے جو شے برآمد ہوئی تھی، اسے رومی نے ہی

نہیں بلکہ میں نے بھی بڑی نفرت انگیز نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ...... بہروپن سوشیلا تھی، مگر اس بھیانک شکل والی نہیں جو ہم نے اوپر مندری والے گوشے میں دیکھی تھی، رومی کے خیال کے مطابق وہ یقیناً کسی مورتی ''کالی دیوی'' ہی کی شکل تھی اور چیخ بھی ضرور سوشیلا ہی نے ہمیں ڈرانے کے لیے ماری ہوگی۔

سوشیلا کو دیکھتے ہی میں نفرت تلے ہونٹ سکیڑتا اس کی جانب لپکا تھا مگر رومی مجھ سے پہلے ہی اس حرافہ پر قابو پا چکی تھی۔

اس نے سوشیلا کو کھڑا کر کے اس کی گردن کے گرد اپنے بازو کا ایسا شکنجہ کس ڈالا تھا کہ وہ ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھی۔

''چھ...... چھوڑ دو مجھے، تم یہ سب ٹھیک نہیں کر رہے۔ میں پولیس......'' سوشیلا زخمی ناگن کی طرف غرائی تھی کہ رومی نے اس کی گردن کو ہلکا جھٹکا دیا۔ نتیجے میں سوشیلا کے منہ سے مارے درد کے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی۔

''بکواس بند کر اپنی...... سیدھی طرح سے بتا حمیرا کو کہاں قید کر رکھا ہے تو نے؟'' رومی شیرنی کی طرح غرائی تھی۔ سوشیلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

حمیرا سے متعلق اس کا جواب نہ پا کر میں طیش میں آ گیا اور اپنے دانت پیستے ہوئے اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک ایک نسوانی چیخ سن کر میرے قدم وہیں رک گئے۔ رومی بھی اس چیخ کو سن کر چونکے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

چیخ کی آواز اوپر مندر سے ہی آئی تھی مگر یہ چیخ پہلے والی بھیانک یا خوف ناک نہ تھی بلکہ یہ ایک خوف زدہ سی چیخ تھی، یوں جیسے کوئی مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں چیخ کی اس آواز کو پہچان چکا تھا۔ یہ حمیرا کی چیخ تھی۔

''اسے اوپر لے چلو، حمیرا اوپر کہیں قید ہے۔'' میں نے رومی سے کہا۔

رومی پستول نکالنا نہیں چاہتی تھی، نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ میں اور رومی، سوشیلا کو بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے اسی مختصر زینے سے اوپر لے جانے لگے۔

''جل کر بھسم ہو جاؤ تم دونوں...... یاد رکھو میری بات...... یہ کالی دیوی کا استھان ہے۔'' وہ ہمیں دھمکیاں دینے لگی۔ جادو ٹونے والی اس سیاہ کار عورت سے مجھے نفرت ہو رہی تھی۔

میں نے باوجود کوشش ضبط کے اُس کے چہرے پر

ایک تھپڑ رسید کر دیا اور اسے خوف ناک نظروں سے گھور کر بولا۔

''اپنی زبان بند رکھ کتیا اور نہ ادھر ہی تیری گردن دبا دوں گا۔'' حمیرا کی چیخ سنتے ہی مجھے جوش سا آ گیا تھا۔ سارا ڈر اور خوف لمحوں میں جاتا رہا۔

ہم اوپر ایک چھوٹے سے مخروطی چھت والے مندر میں دوبارہ آ چکے تھے۔ میں نے سوئچ بورڈ تلاش کر کے کمرا روشن کر دیا۔

کمرے کے وسط میں واقعی ایک بھیانک شکل اور آٹھ ہاتھوں والی ایک سیاہ رُو پتھر کی مورتی ایستادہ تھی۔ اس کے چہرے پر وہی شیطانی مسکراہٹ تھی جو میں اور روی تاریکی میں پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔

اب ہمیں اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ یہ ایک بے جان پتھر کی مورتی تھی۔ اسے کھڑی حالت میں ہی بنایا گیا تھا اور اس کی چوڑائی ڈھائی سے تین فٹ تھی۔ مختلف رنگ اس پر نظر آ رہے تھے، مگر چہرہ سیاہ ہی تھا، یہی نہیں اس کی سرخ رنگ کی زبان بھی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ سیاہ چہرے پر سرخ زبان بڑی ہی کراہیت آمیز محسوس ہوتی تھی۔ آٹھ ہاتھ تھے اور ہر ہاتھ میں زمانہ قدیم کے ہتھیار پکڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ بائیں والے ایک اوپری ہاتھ میں جو اس کی پشت سے نکلتا دکھائی دیتا تھا، اس میں ایک ترشول بھی تھا۔

میری متلاشی نظریں حمیرا کو تلاشنے لگیں اور ساتھ ہی میں کمرے کا جائزہ بھی لینے لگا۔ اس کی چھت مخروطی تھی اور اوپر مینارہ تھا۔ دیواروں کے زاویے بھی اسی کے مطابق قدرے گولائی میں تھے۔

''حمیرا......!'' میں نے اُسے آواز دی۔

''سس......سیف!'' لرزتی آواز نے مجھے چونکا دیا جو مورتی کے عقب سے آئی تھی۔ میں تیزی سے مورتی کے عقب میں گیا، تو میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

مورتی کی عقبی والی جگہ......یعنی یوں سمجھا جائے کہ اس کی پشت پر لوہے کا گول شکنجہ نصب تھا اور حمیرا اسی میں بُری طرح جکڑی ہوئی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح آزاد کروں؟

اچانک میرے کانوں سے سوشیلا کی غراہٹ اور روی کی کراہ ٹکرائی۔ مورتی کے عقب میں آنے کی وجہ سے...... ......میں ان دونوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ یہ آوازیں سنتے ہی میں چونک کر اس طرف متوجہ ہوا تو دیکھا، سوشیلا نجانے اچانک کون سا داؤ روی پر آزمانے کے بعد یک دم دوڑتی ہوئی......زینے کی طرف دوڑی تھی۔

روی رکوع کے بل جھکی ہوئی تھی، یقیناً کوئی موقع تاک کر سوشیلا نے اس کے پیٹ پر ضرب رسید کی تھی۔

روی چونکہ میری اور حمیرا کی چیخ کی طرف متوجہ تھی شاید اسی لیے وہ مار کھا گئی۔

سوشیلا کو راہِ فرار اختیار کرتے دیکھ کر میں نے حمیرا کو اسی حال میں چھوڑا اور اس کی جانب وحشیانہ غراہٹ...... خارج کرتا ہوا لپکا۔ روی بھی خود کو سنبھال چکی تھی اور میرے پیچھے اس نے لپکنے کی کوشش چاہی تھی کہ اچانک سوشیلا کی نیچے زینے پر مجھے لرزتی چیخ سنائی دی۔

اس کا پاؤں پھسل گیا تھا اور وہ نیچے جا پڑی تھی۔

میں اور روی جب نیچے آئے تو سوشیلا جان کنی کے عالم میں تڑپ رہی تھی۔ اس کے سر میں پیشانی کی طرف کوئی سخت چوٹ لگ گئی تھی۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گردن ایک طرف ڈھلکا دی۔

میں نے اس کی شہ رگ دیکھی پھر نبض چیک کی۔

''یہ مر چکی ہے۔'' میں نے اس نابکار عورت کی موت کا اعلان کر ڈالا۔

''اوہو......'' روی کے منہ سے بے اختیار نکلا مگر مجھے اس سوشیلا کی موت کی پروا نہ تھی۔ میں دوبارہ اوپر کو دوڑا۔

حمیرا کے پاس پہنچا۔ وہ شکنجے میں قابلِ رحم حالت میں جکڑی ہوئی میری طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''حوصلہ......رکھو حمیرا! حوصلہ رکھو۔'' میں نے اس سے کہا۔

میں نے شکنجے کا جائزہ لیا، مجھے دراصل اس کی چال سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کیونکہ اس کی ہر چال میں کئی ''واسطے'' تھے۔ تب ہی میں نے ایک اندازے سے حمیرا کو اس سے آزاد کرانے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ حمیرا اچانک لرزتی آواز میں بولی۔

''نن......نہیں، سیف! شکنجے کو ہاتھ مت لگانا ورنہ یہ خودکار انداز میں مجھے کسنا شروع کر دے گا۔''

میں کانپ اٹھا اور میرا بڑھا ہوا ہاتھ بھی وہیں رک گیا۔ روی بھی آ چکی تھی۔

اُس کے چہرے پر بھی تشویش اور پریشانی کے آثار تھے۔ میں نے دیکھا شکنجے میں جکڑی ہوئی حمیرا کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی، کیوں......؟ ایک لرزا دینے والا سوال میرے ذہن میں ابھرا تو میں نے حمیرا کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر بہ غور شکنجے کا جائزہ لینا شروع کردیا اور اگلے ہی پل میں سرتاپا لرز اٹھا۔

یہ موت کا شکنجہ تھا جو بہت دھیرے دھیرے سہی مگر اس کی جالیں اور خودکار واسطے تنگ ہوتے جارہے تھے، باالفاظ دیگر وہ حمیرا کو جکڑتے جارہے تھے، یہاں تک کہ جکڑے جانے والے کی ہڈیاں ٹوٹ کر رہ جاتیں اور......

اس سے آگے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔

''میرے خدا......! رومی، کچھ کرو یہ خودکار شکنجہ ہے۔'' فکر و تشویش تلے میں نے چلّا کر بت بنی کھڑی رومی سے کہا، یہ خیال بھی مجھے نہ رہا کہ میرے اس طرح کہنے سے حمیرا کے حوصلے جواب بھی دے سکتے ہیں۔

رومی بھی قریب آکے اور جھک کر شکنجے کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ سیدھی ہوگئی۔

''یہ واقعی ایک خودکار شکنجہ ہے۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر اسے بے کار کیسے کیا جائے؟'' میں نے تفکر آمیز بے چینی سے کہا۔ حمیرا بھی ہم دونوں کو اس قدر تشویش زدہ دیکھ کر اور بھی متوحش دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ اس وقت بھی شکنجے کی فولادی جکڑ بندیوں میں اذیت محسوس کررہی تھی۔

''میں غور کررہی ہوں۔'' رومی نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔ پھر لحہ توقف کے بعد دوبارہ بولی۔

''ہمیں کسی ایسے اوزار کو تلاش کرنا ہوگا جس سے کم از کم ایک کڑی کو توڑا جاسکے، اس طرح کم از کم شکنجے کا خودکار نظام رک جائے گا۔''

''کہاں سے ملے گا یہ اوزار......؟'' میں نے کہا۔

''کچھ بھی ہو ایسا اوزار تلاشنا ہوگا۔ جلدی کرو، حمیرا کی جان خطرے میں ہے۔''

ہم اوزار کی تلاش میں مشغول ہوگئے۔

ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی تھی کہ آخر اس جہنم واصل سوشیلا کو حمیرا سے دشمنی کیا تھی؟ اس نے کیوں اس کا یہ حشر کیا تھا؟ اپنا قیدی کس لیے بنایا تھا۔ حالانکہ بقول حمیرا کے ہی سوشیلا تو اس کی اچھی دوست تھی، ظاہر ہے یہ سب باتیں اب حمیرا ہی بتا سکتی تھی، جبکہ ابھی اس سے یہ سب باتیں پوچھنے کا وقت بھی نہ تھا۔

میں اور رومی الگ الگ سمتوں پر کوئی ایسا آہنی اوزار ڈھونڈنے لگ گئے جس سے اس خودکار شکنجے کو توڑا جاسکے۔

ہم نے سب سے پہلے اوپر ہی اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں تلاش کیا، پھر مجبوراً نیچے چلے گئے۔ ورنہ ایسی حالت میں میرا دل نہیں کرتا تھا کہ حمیرا کو تنہا چھوڑ کر جاتا، یوں بھی کوشش ہم اسی کی جان بچانے کے لیے کررہے تھے۔

یہاں نیچے آکر بھی رومی اور میں الگ الگ سمتوں میں بٹ گئے۔ میں نے مختلف کمروں کی تلاشی لے ڈالی۔

اس وقت میرے دل و دماغ کی جو حالت ---- ہو رہی تھی، وہ میں ہی سمجھ سکتا تھا۔ حمیرا لحہ بہ لحہ موت کے منہ میں جارہی تھی اور میں اس کی زندگی بچانے سے خود کو قاصر و مجبور سمجھ رہا تھا۔

میری حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی، کبھی سوچتا تلاش چھوڑ دوں اور اوپر دوڑ کر حمیرا کے پاس چلا جاؤں مگر اس کا کیا فائدہ ہوتا۔

اچانک میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال آیا، اور میں باہر کو لپکا۔

میرے اندازے کے عین مطابق کارپورچ کی جانب ایک چھوٹا سا گیراج تھا۔ وہاں گھستے ہی میں نے اوزار کی تلاش شروع کردی۔

ایک رینچ میرے ہاتھ لگا لیکن میرے خیال میں یہ ناکافی تھا۔ مزید تلاشی پر مجھے ایک زنبور کی نظر آگئی، جو چھوٹی سہی مگر کام دے سکتی تھی۔ ایک پائپ پانا بھی مل گیا جو خاصا وزنی اور بڑا تھا۔

امید جاگی اور میرے حوصلے بڑھے۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا، مجھے رومی کی لرزا دینے والی چیخ سنائی دی۔ میں سرتاپا کانپ گیا۔

چیخ کی سمت کا اندازہ مجھے داہنی جانب کی راہداری پر ہوا تھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے اس کی وجہ کا بھی اندازہ ہوا اور...... میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔

کیونکہ یہاں وہ کمرا تھا جہاں ہم نے اس جہنم واصل سوشیلا کے سفاک اور گرانڈیل محافظ داس ...... کو قابو کرکے

رسن بستہ حالت میں ڈال کر بند کر دیا تھا۔

"کہیں یہ بدبخت درندہ آزاد تو نہیں ہو گیا؟"

میرے اندر لرزتا ہوا خدشہ ابھرا۔ اگر ایسا تھا تو اس نازک وقت میں یہ ایک نئی مصیبت بن سکتی تھی ہمارے لیے......

میں اسی طرف دوڑا۔ روبی کو بھی بچانا ضروری تھا۔

جلد ہی میرے بدترین اندازے کی تصدیق ہو گئی جب میں نے کمروں کے اس مختصر سے کوریڈور میں جلنے والی ہلکی روشنی میں داس کو غیظ وغضب کی حالت میں دیکھا۔

اس مردود نے روبی کو گردن سے بُری طرح دبوچا ہوا تھا اور وہ اس کی آہنی گرفت سے خود کو چھڑانے کے لیے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ روبی کو اس سفاک درندے کے شکنجے میں کسا دیکھ کر میں اپنے جوشِ غیظ پر قابو نہ پا سکا اور...... حلق کے بل چیختا ہوا اس کی جانب لپکا۔ جبکہ آہنی اوزار میرے ہاتھوں میں ہی تھے۔

جب تک گرانڈیل داس...... کی نظر مجھ پر پڑتی، میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ اب پتا نہیں یہ میرے جوش کی طاقت کا نتیجہ تھا یا پھر کوئی ایسا دلیرانہ جذبہ کہ میں داس سے ٹکرایا تو اس کے قدم کوریڈور کے چکنے فرش پر جمے نہ رہ سکے، وہ روبی اور مجھ سمیت ہی نیچے آ رہا۔

ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ روبی اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی، میں تو گرتے ہی سنبھلنے اور اپنے حواس مجتمع کرنے کی ہی کوشش کرتا رہا تھا مگر روبی نے اپنے حواس قائم رکھے تھے اور آزاد ہوتے ہی اس نے اپنے حلق سے ایسی مخصوص چیخ خارج کی جو عموماً فائٹر مدِمقابل پر بڑا حملہ کرتے وقت اپنے منہ سے نکالتے ہیں۔

دوسری چیخ داس کے حلق سے خارج ہوئی تھی، کیونکہ روبی نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کھڑے ہوتے ہی اپنی ایک ٹانگ پر خود کو پھرکی کی طرح گھمایا تھا اور فرش بوس داس کی پشت پر اس کی ضرب رسید کر دی تھی۔

کسی لیٹے ہوئے مدِمقابل کو کھڑے ہونے کی حالت میں ٹانگ کی ایک ایسی ضرب کوئی ماہر لڑاکا ہی لگا سکتا تھا۔ میں نے دیکھا اس ضرب شدید تلے داس کے منہ سے خون کی پھوار پھوٹ نکلی تھی اور وہ بے حس وحرکت ہو چکا تھا۔

"اوپر آؤ جلدی......" کہتے ہوئے میں نے فرش پر بکھرے اوزار جلدی سے سمیٹے اور دوڑا۔ روبی نے میری تقلید کی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد ہم اوپر مندر...... میں تھے۔ حمیرا کو دیکھا تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اعصاب جواب دینے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا اور حمیرا کو پکارنے لگا۔

"اوزار آزماؤ جلدی۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔"

روبی چیخی۔ ساتھ ہی اس نے بھی ایک اوزار اٹھالیا۔

پہلے غور سے ہم نے شکنجے کی واسطے دار کڑیوں اور جالوں کو دیکھا، پھر روبی اور میں نے بیک وقت ان پر اوزار آزمانا شروع کر دیے۔

میں نے ایک کڑی پر رینچ کو پھنسانے کی کوشش چاہی اور پھر اسے موڑنے لگا تو دوسرے ہی لمحے حمیرا کے حلق سے تیز کراہ خارج ہو گئی اور وہ جان کنی میں نظر آنے لگی۔ میں نے ہاتھ روک دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اوزار ہاتھ میں پکڑا رہ گیا تھا اور میں بے بس تھا۔

دل چاہ رہا تھا کہ اس منحوس شکنجے پر اپنا سر مار مار کے لہولہان کر دوں۔ کہ اچانک ہلکی سی کڑک دار آواز ابھری۔ دیکھا تو روبی زنبوری سے شکنجے کی ایک کڑی نکالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"حوصلہ رکھو سیف! ایک ایک کڑی کو اس کے جوڑ سے پکڑو۔" روبی نے کہا۔ میں نے اپنے حواس قائم کیے اور ایسا ہی کیا۔ یوں میں نے بھی ایک کڑی توڑ مروڑ کر کاٹ ڈالی۔

شکنجہ کچھ ڈھیلا پڑتا محسوس ہونے لگا۔ اس نے ہمت جگائی اور ہم صبر وتحمل کے ساتھ ایسا ہی کرتے رہے یہاں تک کہ ہمارے اعصاب شل ہو گئے اور بالآخر حمیرا کو ہم نے شکنجے سے آزاد کرا دیا۔

وہ آزاد ہوتے ہی بے ہوشی کے عالم میں فرش پر ہی لڑھک گئی اور ہم اسے اٹھائے نیچے ایک آرام دہ بیڈروم میں لے آئے۔ یہاں ہر قسم کی سہولیات موجود تھیں۔ اے سی بھی آن تھا۔ ہم نے بے ہوش حمیرا کو نرم بستر پر لٹا دیا۔ روبی فریج کی جانب لپکی اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لائی۔ اس کے چھینٹے حمیرا کے چہرے پر ڈالے اور اس کے ہونٹوں سے بھی پانی کی بوتل لگا کر تھوڑا پانی پلایا تو حمیرا کو ہوش آنے لگا۔

اُسے ہوش میں آتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آئی تو اس نے پانی پیا۔

"حمیرا...... اتم ٹھیک ہونا اب......؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ

بیٹھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اب بھی اس کے سُتے ہوئے چہرے سے خوف جھلک رہا تھا۔

''اب ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس خبیث عورت کو جہنم واصل کر دیا گیا ہے۔'' میں نے کہا تو حمیرا کے چہرے پر سکون پھیل گیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ میرا بازو تھام کر متوحش سے لہجے میں بولی۔

''یہاں سے نکل چلو، یہ بڑی خوف ناک جگہ ہے۔''

''ابھی نکلتے ہیں، تمہاری حالت ذرا سنبھل جائے۔'' رومی نے کہا۔ ''اب ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس دوران رومی نے تھوڑی اور محنت کی اور کھانے پینے کی چیزیں بھی فریج سے نکال لائی۔ وہ کھا کے ہم سیر ہوئے اور کھوئی ہوئی طاقت ذرا بحال کی۔ جب حمیرا کی حالت پوری طرح سنبھل گئی تو ہم نے وہاں سے نکلنے کا پروگرام بنایا۔

''باہر پورچ میں گاڑی موجود ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، اسے ہم استعمال نہیں کر سکتے۔ پولیس کا مسئلہ تو ہوگا ہی مگر ہم جان بوجھ کر انہیں اپنے پیچھے کیوں لگائیں۔'' رومی نے کہا۔

''تو کیا پیدل......؟''

''ہاں! احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔'' رومی بولی۔

مجھے حمیرا کی فکر تھی، پتا نہیں وہ پیدل چل سکتی تھی کہ نہیں۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم وہ گاڑی مین شاہراہ تک لے جائیں اور پھر اسے چھوڑ دیں۔ پولیس تو یوں بھی ہمارے پیچھے پڑنے ہی والی ہے۔ کم از کم تھوڑا سفر تو طے ہو جائے، پھر آگے کوئی بندوبست ہو جائے گا، ٹیکسی تو مل ہی جائے گی، کیونکہ یہ لنک روڈ بہت طویل ہے۔''

میری بات پر رومی نے تھوڑا غور کیا پھر بولی۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر مین شاہراہ تک کیوں، پورا ہی سفر کیوں نہ کر لیا جائے اور ہوٹل سے تھوڑی دور گاڑی کو کھڑی کر کے آگے نکل جائیں گے اور وہ ہوٹل بھی چھوڑ دیں گے۔''

''یہ بھی تم نے ٹھیک سوچا۔ اس طرح وقت بھی بچ جائے گا۔'' میں نے تائید کی۔

اگلے چند منٹوں بعد ہم پورچ میں کھڑی کار میں آ بیٹھے۔ بغیر چابی کے اسے اسٹارٹ کرنا رومی کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ذرا ہی دیر بعد کار اس منحوس جگہ سے نکلی اور لنک روڈ پر فراٹے بھرنے لگی۔ کار رومی چلا رہی تھی۔ حمیرا کو عقبی سیٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں رومی کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

☆☆☆

ہوٹل پہنچ کر ہم نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ گاڑی ہم نے ہوٹل سے دور...... کسی ویران مقام پر چھوڑ دی تھی اور وہاں سے ایک ٹیکسی میں سوار ہو کے ہوٹل آ گئے تھے۔

طارق ہمیں کامیاب لوٹتے پا کر بے حد خوش ہوا تھا۔ اس کے پاس بھی ہمیں بتانے کے لیے کچھ خبریں تھیں لیکن اس وقت ہمیں یہ ہوٹل چھوڑنے کی پڑی ہوئی تھی اسی لیے ہمارے درمیان زیادہ تفصیلی بات نہ ہو پائی۔

ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ایک ٹیکسی کروائی، ایک مین مارکیٹ میں ہم اتر گئے۔ حمیرا سنبھل چکی تھی، طارق بھی اب کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا تھا۔

یہاں سے ہم نے دوسری ٹیکسی لی۔ ایسا ہم نے احتیاط کے پیشِ نظر کیا تھا۔

اس دوسری ٹیکسی میں سوار ہو کے ہم ایک نسبتاً درمیانے درجے کے ہوٹل میں آ گئے، یہاں ہمیں.... غیر متوقع طور پر ایک ''فیملی روم'' مل گیا۔ حالانکہ یہ ہوٹل اتنا ہائی فائی نہ تھا، تاہم شکر بجا لائے کہ یہاں یہ سہولت ہمیں مل گئی تھی۔ ہم اکٹھے ہی رہنا چاہتے تھے۔ ایک مہربانی ہوٹل والوں نے اور ہم پر کر دی تھی کہ ایک اضافی میٹرس بھی ہمیں دے دیا تھا۔

وہ رات ہم نے سو کر گزاری۔ صبح دس بجے جاگے۔ ناشتے وغیرہ کے بعد ہم نے طارق کو سوشیلا سے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت حیران ہوا۔

''کیا وہ کوئی جادو ٹونے کی ماہر تھی؟'' اس نے پوچھا۔ تب حمیرا نے ہمیں سوشیلا کے متعلق بتانا شروع کیا۔

''سوشیلا بظاہر انسانی روپ میں ایک شیطان عورت تھی۔ اس نے مجھ سے دوستی تو کر لی تھی، اور میں اس کے حسنِ اخلاق سے متاثر بھی تھی۔ ہوٹل میں بھی اس کے اخلاق اور دوست نوازی سے سب متاثر تھے۔ وہ ایک دن کسی طرح مجھے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ گھر لے آئی۔ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ میں بھی انکار نہ کر سکی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے میرے ہوٹل چھوڑنے پر کیا چکر چلایا تھا، تاہم جیسا کہ آپ لوگوں کو بھی معلوم ہو چکا ہے۔

اس کے گھر آئی تو...... سب سے پہلے میں اس کے لمبے چوڑے کارڈواس کو دیکھ ہی بے چین ہو گئی۔ کیونکہ وہ

مجھے صورت سے ہی کوئی چھٹا ہوا بدمعاش نظر آ رہا تھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا تھا مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے کھانے میں کچھ ملا کر بے ہوش کر دیا اور جب ہوش آیا تو میں رسیوں سے بندھی ہوئی تھی اور سوشیلا اپنے شیطانی روپ میں میرے سامنے تھی۔

میں نے خود کو اسی مندر والی جگہ پر پایا تھا مگر اس طرح ... کے رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ خود سامنے کالی دیوی کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھی آنکھیں موندیں جانے کیا بڑبڑائے جا رہی تھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئی اور شیطانی مسکراہٹ سے بتانے لگی کہ وہ مجھ پر ایک خاص جاپ کر کے مجھے... پورن ماشی کی رات کو اس دیوی کے سامنے شکنجے میں جکڑ کر دھیرے دھیرے ہلاک کرے گی، اس کے بعد اس کے پچھلے جنم کا پریمی جسے ایک اوشا نامی عورت نے اس سے چھین لیا تھا، اور وہ میں ہی تھی۔ میرے مرنے کے بعد وہ ایک طرح سے اپنی سوکن اوشا سے بھی انتقام لے لے گی اور اس کا پریمی بھی اس جنم میں لوٹ آئے گا۔ مجھے تو یہ سب خرافات کے سوا کچھ نہیں لگا تاہم اتنا ضرور جانتی تھی کہ ہندومت کے لوگ آواگون پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ میں بُری پھنسی تھی اور اسے سمجھانے کی بھی بہت کوشش کی تھی مگر اس پر شیطان سوار تھا، وہ مجھے ذہنی مریضہ ہی لگ رہی تھی، ہوسکتا ہے اس نے ماضی میں کسی سے پیار کیا ہو اور وہ کسی حادثے کا شکار ہو کے اچانک مر گیا ہو، یوں انسان ایسے اچانک حادثے کو قبول نہیں کر پاتا اور اول فولیات اور خرافات میں پڑ جاتا ہے یہی حال اس کا ہوا تھا۔''

حمیرا نے اپنی کہانی ختم کی تو ہم سب حیرت کے مارے ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئے۔

''تمہارے پاس کیا خبریں ہیں؟''

حمیرا کی کتھا سننے کے بعد میں نے طارق سے پوچھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس دوران خبریں سنتا رہا ہوگا۔ جو وہ ہم سے بھی شیئر کرنے کے لیے بے چین تھا۔ بولا۔

''میں کہیں آنے جانے کے قابل تو ہوں نہیں، لیپ ٹاپ پر خبریں ہی سن سکتا تھا۔ مجھے ان تینوں مُرداروں، بھولا ناتھ، گوہر شاہ اور تاج جی کی طرف سے بے چینی تھی کہ آخر پتا چلے وہ زندہ ہیں یا اسپتال میں ہی مرکھپ گئے ہیں۔''

اتنا کہہ کر اس نے ایک لمحے کو توقف کیا۔ روبی، حمیرا اور میں بہ غور اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

طارق نے کہا۔ ''خبروں میں تو ایسا کچھ نہیں بتایا جا رہا تھا البتہ...... ممبئی کے بڑے ڈان جسونت رائے کے بارے میں یہ ضرور خبریں آ رہی تھیں کہ...... اس کے خلاف رانی شوبھا دیوی نے پولیس مقدمہ کر رکھا ہے۔ مزید انکشافات پر معلوم ہوا کہ رانی شوبھا دیوی، شنکر چانکیہ کی بیوی ہے، جو واقعی ریاست دیناج گڑھ کے ایک راجہ ہری داس سنگھ کی بیٹی ہے۔ اگرچہ اب وہ راج دھانی نہ رہی تھی، نہ ہی رانی شوبھا کے خاندان کا کوئی شخص باقی بچا تھا۔ خود شوبھا کی ایک ہی جوان بیٹی تھی۔ تاہم وہ بہت دولت مند تھی۔ ظاہر ہے اس کا شوہر شنکر بھی کم دولت مند نہ تھا۔''

''لیکن شوبھا کو کیسے پتا چلا کہ اس کا شوہر جسونت رائے کی قید میں ہے؟'' میں نے طارق سے سوال کیا۔

''سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ رانی شوبھا بھی آخر کو شنکر چانکیہ کی ہی بیوی ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''اسے اپنے شوہر کے کچے چٹھے سمیت سب خبر ہوگی کہ جسونت رائے کے ساتھ شنکر کی کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟''

''بات سمجھ میں آنے والی پھر بھی نہیں ہے۔'' روبی نے جیسے طارق سے میرا ادھار اتارا۔ ہم اس کی طرف دیکھنے لگے۔ چونکہ اس سارے گورکھ دھندے کی لامحالہ حمیرا کو بھی خبر تھی اسی لیے وہ بھی اس موضوع میں دلچسپی لے رہی تھی۔

''کیا مطلب......؟'' طارق نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کہا جاسکتا ہے کہ شوبھا اس کی بیوی ہے تو اُسے اپنے شوہر کے کالے دھندے کے بارے میں پتا ہوگا، مگر جسونت رائے کا بھتیجا وجے چونکہ ایک ذاتی دشمنی کی صورت میں ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا، اسی لیے ہوسکتا ہے یہ بات شنکر چانکیہ نے بیوی کو بتانا ضروری نہ سمجھا ہو۔'' وہ سانس لینے کو رکی۔

''کھل کر کہو کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں بے چینی سے بولا۔

''ابھی کر رہی ہوں میں بات۔'' اس نے مجھے گھورا۔

حمیرا تھوڑا سا مسکرائی۔ طارق نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

روبی بولی۔ ''ہوسکتا ہے شوہر کی اچانک گمشدگی کے بارے میں اسے شنکر کے کسی ساتھی نے ہی...... آگاہ کیا ہو۔''

''یہ کوئی اتنی خاص بات تو نہیں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''اس کا اندازہ تو ویسے ہی ہو رہا ہے مجھے بھی۔''

"اس کے در پردہ جو خطرہ منڈلا رہا ہے، میں اس طرف تم سب کی توجہ مبذول کروانا چاہتی ہوں۔" رومی نے اسرار بھرے لہجے میں کہا تو طارق مسکرا کر بولا۔

"میں سمجھ گیا ہوں تم کس خطرے کی بات کر رہی ہو۔"

"بتاؤ۔" رومی اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔

"جسونت رائے کے ہاں یا تو پہلے ہی سے شنکر کا چھوڑا ہوا کوئی جاسوس ہوگا، یا پھر اسی کے ہی کسی خاص آدمی نے پتا چلایا ہوگا کہ شنکر کے غیاب میں جسونت رائے کا ہاتھ ہے۔ جب یہ بات کنفرم ہوگی تو ہمارے بارے میں بھی ضرور اس کا تذکرہ ہوا ہوگا اور ہماری بھی تلاش کی جا رہی ہوگی۔ کوئی بعید نہیں کہ پولیس کو ہمارے بارے میں بھی شوبھا دیوی نے انفارم کر دیا ہو۔"

"ایگزیکٹلی یہی کہنا چاہتی تھی میں....." رومی جوش سے بولی۔

"اس خطرے سے آگاہی دینے کا شکریہ مس رومی!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تاہم یہ بعد کی باتیں ہیں، محتاط تو ہمیں ہر وقت ہی اور ہر کسی سے رہنا ہی پڑے گا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سی ڈی سے متعلق ہمیں جلد از جلد لائن آف ایکشن لینا ہوگا۔ جس پر ہم پہلے بھی بہت بحث کر چکے ہیں۔"

میرے اصل معاملے کی طرف توجہ دلانے پر طارق اور رومی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ میں نے مزید کہا۔

"جسونت رائے اور شنکر چانکیہ کے معاملات سے یوں بھی ہمارا کوئی واسطہ نہیں، بجز اس کے کہ..... گوہر شاہ، تاج اور بھولا ناتھ کے بارے میں آگاہی لینا ضروری ہے کہ ان کا کیا بنا؟ آیا وہ زندہ بچ گئے ہیں یا واصل جہنم ہو چکے۔ سردست ان دونوں اہم معاملات پر ہمیں اپنی توجہ مرکوز رکھنی ہوگی۔"

"ٹی تھری اور ٹی فور سی ڈیز سے متعلق میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اسے انٹرپول کے کسی ذمے دار آفیسر کے حوالے کر دیا جائے اور انہیں ان سے متعلق بریف بھی کر دیا جائے۔" رومی بولی۔ "لیکن تمہاری اور طارق کی مرضی اسے کسی اور طرح استعمال میں لانے کی ہے، لیکن اس کی ابھی تک تم دونوں نے ہی کوئی وضاحت نہیں کی یا کوئی جامع منصوبہ بندی بھی سامنے نہیں آئی ہے ابھی تک۔"

"ہمیں اس کا وقت ہی کب ملا؟" میں نے کہا۔

"اب سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو کوئی مربوط لائحہ عمل ہم تینوں ہی مل کے سوچ لیتے ہیں، بشرطیکہ کہ تمہاری سوئی انٹرپول سے ہٹ کر بات کرے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے رومی پر طنز کا تیر چلا ہی دیا تھا۔

"طنز مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔" رومی نے میری طرف گھور کے کہا۔ "انٹرپول کا ایک ذمے دار ادارہ "ٹیکنیکل سینٹرل بیورو" موجود ہے۔ جو مقامی طریقے سے اس طرح کے ٹاسک کو بخوبی ڈیل کر سکتا ہے۔ انٹرپول ایک سو چورانوے ممالک کی مشترکہ پولیس ہے، کوئی مذاق نہیں ہے۔"

"یقیناً۔" طارق نے سر ہلایا۔ "لیکن اگر ہم ایک لمحہ وہ اہم سی ڈیز اس ادارے کے حوالے کرنے کا سوچ بھی لیتے ہیں تو ہمارا مشن ختم تو پھر بھی نہ ہو سکے گا۔ جب تک کہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ان تینوں مذکورہ شیطانوں کا کیا بنا؟ یوں بھی میں تمہاری رائے سے متفق ہی ہوں رومی۔"

طارق نے میری توقع کے عین مطابق بہرحال رومی کے حق میں اپنا عندیہ دے ہی دیا تھا۔

"یہ ایک طرح سے رومی کا اچھا ہی مشورہ ہے، کہ اس خطرناک مہم کو انٹرپول جیسے ادارے کو ہی سونپ دیا جائے۔" حمیرا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ رومی نے خوشی سے تالی بجائی اور میری طرف دیکھ کر شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

"لو دیکھ لو ڈاکٹر صاحب! آپ کی ہونے والی بیگم بھی متفق ہیں۔ اب کیا کہتے ہو؟" اس کی "بیگم" والی بات پر بے چاری حمیرا کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔

"ہمیں لڑانے کی کوشش مت کرو، رومی!" میں نے اسے گھور کر کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ حمیرا بھی انہی خونی سوداگروں کا خمیازہ میرے ساتھ ہی بھگت چکی ہے، اور اسے بھی صورت حالات کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ سی ڈیز کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ سی ڈیز اپنے ہاتھ میں ہوگی تو سمجھو ان خونی سوداگروں کے خلاف ترپ کا پتا ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور ہم ایک شارٹ کٹ طریقے سے ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، جبکہ کسی ادارے کو یہ سونپنے کی صورت میں یہ کسی طویل المدتی آپریشن کی بھینٹ چڑھ جائیں گی اور تب تک خونی سوداگر اپنے بچاؤ کے سو طریقے ایجاد کر چکے ہوں گے۔"

''جوتم چاہ رہے ہو وہ ہم سمجھ رہے ہیں۔'' رومی بولی۔ اس کا لہجہ نارمل تھا۔ ''انٹرپول بھی انہی خطوط پر کام کرے گا۔''

میں اس کی بات پر مطمئن نہیں تھا، تاہم خاموش رہا۔

''تم ایسا کیوں نہیں کر لیتے کہ اس کی ڈپلی کیٹ بنالو، وہ اپنے پاس رکھو، دوسری انٹرپول کے حوالے کر دو، یوں ایک طرف ایک بڑا انٹرنیشنل قانونی ادارہ خفیہ طور پر ان کی بیخ کنی میں لگا رہے گا اور دوسری جانب ہم بھی مصروف کار رہیں گے۔''

حمیرا نے تجویز دی اور طارق اور رومی ہی نہیں میں بھی اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

''شاندار......'' طارق کے منہ سے نکلا۔

''بہترین۔'' رومی نے بھی کہا۔

''تجویز بُری نہیں ہے۔'' میں نے بھی تائید کر دی۔

گویا حمیرا نے ایک اہم تنازع جو بالخصوص میرے اور رومی کے درمیان وجۂ تنازعہ بنا ہوا تھا، اپنی ذہانت کے بل بوتے پر بہ احسن خوبی نمٹا دیا۔

سی ڈیز کی اصل ہمارے پاس رہی، طارق نے اس کی ڈپلی کیٹ کاپی بنوا کر رومی کے حوالے کر دی۔

رومی ... لیپ ٹاپ لے کر ایک کونے میں جا بیٹھی۔ اسے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق انٹرپول کے کسی ذمے دار اور اعلیٰ عہدے دار افسر سے رابطہ کرنا تھا۔

جیسا کہ مذکورہ ہو چکا کہ مجھ سے پہلے ہی طارق اور رومی ان خونی سوداگروں کے اس بلیڈی سینڈیکیٹ کے خلاف کام کر رہے تھے۔ یوں رومی اپنے مشن سے متعلق انٹرپول کو ساری رپورٹ اور بریفنگ دیتی رہتی تھی۔ گویا وہ مشن کے حوالے سے پہلے ہی ان کے ایک خاص ونگ سے رابطے میں رہتی تھی۔

رومی کا کام اس کے لیے چھوڑ کر ہم تینوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ رومی اس بڑے سے فیملی روم کے آخری کونے میں جا کر میز کرسی سنبھال چکی تھی۔

جبکہ میں اور طارق اپنے طور پر لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ حمیرا بھی ہمارے ساتھ شریک تھی۔ البتہ ایک موقع پا کر حمیرا نے میرے کان میں مسکراتا ہوا چٹکلا ضرور چھوڑا تھا۔

''لگتا ہے رومی سے تمہاری نوک جھوک چلتی رہتی ہے۔'' میں اس کی بات پر مسکرا کر رہ گیا تھا۔ اس کا یہ بھانپ جانا کوئی اچنبھے کی بات بھی نہ تھی۔ رومی اور میرے درمیان اکثر باتوں پر اختلافات رہتے تھے۔

اب تک کے حالات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ایک تو سی ڈیز کے حوالے سے خونی سوداگروں کی پوری مشینری ہمارے خلاف حرکت میں آسکتی تھی (بشرطیکہ، اس کے چار بڑوں کے علم میں یہ بات آجاتی، جو ابھی چھپائی جارہی تھی، اگرچہ جلد یا بدیر انہوں نے اس حقیقت سے آگاہ ہو ہی جانا تھا) دوسرے ششکر چانکیہ کی بیوی رانی شو بھا دیوی ہمارے لیے مسئلہ بن سکتی تھی۔

رومی اور طارق کا مشترکہ تجزیہ تھا کہ شو بھا کے کسی موجود یا بعد میں ''متلاشی'' مخبر یا (ششکر چانکیہ) کے آدمی نے جہاں بالآخر اس بات کا کھوج لگا لیا تھا تو یقیناً اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ ششکر چانکیہ ہماری وجہ سے ہی جسونت رائے کی گرفت میں جانے کا سبب بنا تھا۔

مقامی خبروں سے ہم روزانہ ہی اَپ ڈیٹ رہنے لگے تھے۔ ابھی تک ہمارے سلسلے میں بھارتی میڈیا میں کوئی ذرا سی بھی ''گونج'' سنائی نہیں دی تھی۔

تین گھنٹے مسلسل لیپ ٹاپ پر بیٹھے رہنے، اور چائے اور کافی کی چار پیالیاں چڑھا لینے کے بعد رومی اپنی میز سے فارغ ہو کے ہمارے پاس آگئی اور ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''میں نے اپنا کام بہ احسن خوبی نمٹا دیا۔''

''گڈ۔'' طارق نے کہا۔ میں نے بھی توصیف کی۔

''اب آگے کا لائحہ عمل ڈاکٹر سیف ہی بتائے گا۔''

رومی نے طارق کو چھوڑ کر گیند میری جھولی میں پھینکی۔ یوں جیسے طارق اس کی بات پر متفق ہو مگر میں نہیں۔

میں نے بھی محتاط لہجے میں کہا۔ ''سب سے پہلے تو ان تینوں یعنی بھولا ناتھ وغیرہ کے بارے میں پتا چلانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اب کون سے اسپتال میں اور کس حال میں ہیں؟ میرا نہیں خیال کہ ان کی زندگی یا موت سے متعلق کوئی خبر اخبارات یا بھارتی میڈیا میں آئے گی۔ اپنی ایسی گندگی کو بھارتی میڈیا چھپانے کا ماہر ہے۔ یوں بھی وہ ان کی نظروں میں میرا خیال ہے کوئی عام انسان ہیں۔''

''اور اس میں کتنے دن لگ جائیں گے؟'' رومی کے سوال میں ہلکا سا طنز تھا جس کی وجہ میں جان سکتا تھا۔

''دو ایک روز سے زیادہ کا کام نہیں ہے یہ۔''

''لیکن مجھے حیرت اس بات کی ہو رہی ہے کہ آخر ابھی تک ہمارے اس حملے کی خبر میڈیا پر کیوں نہ آسکی ہے؟'' طارق نے حیرت سے کہا۔

''ان تینوں میں سے کوئی ہوش میں ہوگا تو بیان دے گا نا...... پولیس کو۔'' رومی بولی۔

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ تینوں خبیث اس خوں ریز واقعے کو چھپانے کی کوشش کریں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ ممکن ہے۔'' طارق نے میری بات کی تائید کی پھر وہ رومی سے بولا۔

''تم نے نیٹ پر کوئی تازہ ہیڈ لائنز دیکھیں؟''

رومی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کمال ہے۔'' حمیرا کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ چند ثانیے کمرے میں خاموشی چھائی رہی، ایک طرف تمام معاملات سلجھتے دکھائی دے رہے تھے اور دوسری جانب سب کچھ ابھی اُلجھا ہوا ہی نظر آنے لگا تھا۔

اس مختصر سے خاموش سکوت کو رومی نے توڑا اور وہ ایک نگاہ حمیرا کے چہرے پر ڈالتے ہوئے اور اسی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ان محترمہ کا کیا سوچا تم نے سیف؟''

رومی نے جیسے خاموشی کے اس قلیل وقفے میں دھماکا سا کیا۔ اس قدر کہ طارق بھی حیران نظروں سے رومی کا چہرہ تکتا رہ گیا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے رومی کی طرف سرد نظروں سے گھورا۔ ''یہ تم نے محترمہ کس کو کہا ابھی......؟''

''سوری! تمہیں بُرا لگا۔'' رومی نے ہولے سے کہا۔

''ظاہر ہے بُرا تو مجھے ہی نہیں حمیرا کو بھی لگا ہوگا۔'' میں نے تلخی سے رومی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم تو یوں حمیرا سے ایک دم اجنبیت دکھانے لگیں جیسے یہ......''

''سیف!'' حمیرا نے درمیان میں مجھے ٹوک دیا۔

''کوئی بات نہیں، رومی نے یونہی کہہ دیا ہوگا۔''

''یونہی کیسے کہہ دیا ہوگا۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''کہا نا چھوڑو، اس نے سوری کہہ تو دیا ہے۔'' حمیرا بولی۔ ''لیکن پلیز اس کے سوال کا جواب تو دے دو۔ اس نے پوچھا کیا ہے تم سے؟''

اس دوران میں طارق کان دبائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اب میری اور رومی کی نوک جھوک میں کم ہی کودنے لگا تھا۔ پھر یہاں معاملہ اُسے کچھ ''حساس'' بھی محسوس ہوا تھا شاید۔

''یہ کہیں نہیں جائے گی اور ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔''

''بصد شوق'' رومی نے کندھے اُچکائے۔ ''میں نے تو اس لیے پوچھا تھا کہ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے اس کی جان بھی بلاوجہ خطرے میں رہے گی اور...... ممکن ہے کسی وقت یہ ہماری کمزوری یا ہمارے پاؤں کی زنجیر بھی بن سکتی ہے۔''

''تمہیں اِس کی فکر میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے رومی!'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے رومی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اچھا چلو، ختم کرو اس بحث کو، سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی تم سے حمیرا کے متعلق اسی نیت سے ہی پوچھنے والا تھا، کیونکہ اس بے چاری کو ہمارے حالات کا کوئی اندازہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس کی عادی بھی ہے۔'' طارق نے بالآخر چپ مار ہی دی۔

''حمیرا مشن کے آخر تک ہمارے ساتھ رہے گی۔'' میں نے جیسے اعلان کر دیا۔

مجھے یاد تھا ایک دن روبی نے... حمیرا کے خلاف یہ بات کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ حمیرا کو اگر مجھ سے سچی محبت تھی تو اسے مجھے چھوڑ کر اپنے باپ کے ساتھ یوکے نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگرچہ اس کا میں روبی کو کرارا جواب دے چکا تھا، لیکن جانے کیوں روبی کو حمیرا سے کیا چڑ ہونے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں نے جو اسے جواب دیا تھا، وہ حقیقت اب تمام تر سچائیوں کے ساتھ سامنے آ چکی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے پھر، ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں، بات ختم کرو۔'' طارق نے کہا۔

روبی خاموش تھی، میں بھی چپ کر گیا۔ حمیرا سے متعلق مجھے روبی کے اس رویے پر افسوس ہوا تھا۔ روبی بُری نہیں تھی، وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ کئی خطرناک اور جان لیوا مواقع پر ہم ایک دوسرے کے لیے اپنی جانوں پر بھی کھیل چکے تھے اس لیے ہمارے دلوں اور نیتوں میں بغض یا کسی قسم کی عداوت پیدا ہونے کا سوال ہی نہ تھا، لیکن روبی ایک عورت بھی تھی۔

روبی پھر کونے میں جا کر اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ حمیرا واش روم کا کہہ کر چلی گئی۔ میں کھڑا رہا تو طارق میرے کندھے کو دھیرے سے تھپتھپا کر بولا۔

''مائی ڈیئر! روبی کی بات کا بُرا مت منانا، وہ بُری نہیں ہے، نہ ہی اس کے دل میں کوئی میل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری اور اس کی اب تک کی سنگت داری میں خود بخود کوئی اَن دیکھا جذبہ پنپنے ضرور لگا ہے جس کی بدولت روبی کچھ تلخ ہو رہی ہوگی۔''

اس نے یہ بات بہت آہستگی سے اور اپنا منہ میرے کندھے کے قریب لا کر کہی تھی۔

''ہم......'' میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ وہ بھی ہنس دیا پھر دبی آواز میں بولا۔

''اب روبی کو تم ہی ڈیل کرنا مگر تلخی سے نہیں، بالکل ویسے ہی جیسا کہ تمہارے مزاج کا خاصہ ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔'' میں ہولے سے مسکرا کر بولا۔

ہم دونوں بیٹھ گئے۔

اب منصوبے کے مطابق ہم نے بھولا ناتھ وغیرہ کا پتا چلانا تھا۔ اس کے لیے روبی نے طارق کے مشورے پر باندرا اسٹیٹ کے ان قریبی اسپتالوں کا اتا پتا سرچ کیا جو مقابلتاً اپنی جدید طبی سہولیات کے سبب مشہور سمجھے جاتے تھے۔

ان کی تعداد تھی تو بیس پچیس سے زیادہ ہی مگر قابلِ ذکر اور ''مہنگی سہولیات'' والے تین ہی تھے جہاں متمول افراد ہی رخ کرتے تھے۔

''میں اور تم چلیں گے، ان تینوں اسپتالوں کی تلاش لینے۔'' طارق نے کہا۔ ''روبی ہوٹل میں ہی رہے گی، حمیرا کے پاس......''

''تمہاری طبیعت......'' میں نے کہنا چاہا مگر اس نے بڑی سنجیدگی سے بات کاٹ دی۔

''میں اب بالکل ٹھیک ہوں، زیادہ دیر بستر پر پڑا رہا تو...... واقعی ناکارہ ہو کر رہ جاؤں گا۔''

القصہ...... ہم دونوں مذکورہ تینوں اسپتالوں کا پتا معلوم کر کے ہوٹل سے روانہ ہوئے۔

ٹیکسی کروا کے ہم نے سب سے پہلے گاندھی شاہراہ پر واقع ایک اسپتال کو چیک کیا، جو ذرا نزدیک بھی تھا مگر وہاں ان تینوں کا پتا نہ چلا، یعنی وہ وہاں ایڈمٹ نہیں تھے۔

دوسرے اسپتال کو چیک کرنے پر ہمارے کان یک دم... کھڑے ہو گئے کیونکہ یہاں سے بھولا ناتھ، گوہر شاہ اور تاج کو زخمی حالت میں لانے کی خبر ملی لیکن دوسرے ہی لمحے استقبالیہ پر یہ بھی معلوم ہوا کہ ان تینوں کی کنڈیشن کو دیکھتے ہوئے کیس رام سنگھ اسپتال کو ریفر کر دیا گیا تھا۔

رام سنگھ وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں اور طارق ٹیکسی کر کے وہاں جا پہنچے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ ان تینوں مردودوں کا پتا کیا۔ استقبالیہ پر ایک اسمارٹ سی نوجوان لڑکی اسپتال کے مخصوص مونوگرام والے یونیفارم میں موجود تھی۔

''جی ہاں! وہ تینوں دلارام ہاسپٹل سے ریفر ہو کے یہاں لائے گئے تھے۔'' نوجوان لڑکی نے بتاتے ہوئے کہا۔ طارق اور میری گویا دھڑکتی ہوئی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"لیکن آپ...... ان کے کیا لگتے ہیں؟"
ایک اعصاب شکن تجسس پیدا کرنے کے بعد لڑکی نے اچانک غیر متعلقہ سوال کر کے ہماری طبیعت مکدر کر دی، پھر طارق نے ہی بندی سے اور چہرے پر تشویش طاری کرتے ہوئے کہا۔

"ہم ان کے دوست ہیں، دہلی سے آئے ہیں ان کا حال پوچھنے۔"

لڑکی نے جواب میں پہلے میری پھر طارق کی جانب پہلی بار غور سے دیکھا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"افسوس کہ ان تینوں میں سے ایک زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ایکسپائر ہو گیا تھا۔"

"کک...... کون؟ اُس کا نام......؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"بھولا ناتھ نام تھا اُس کا......" لڑکی نے بتایا۔ "اگر کنفرم کرنا ہے تو آپ ایمرجنسی جا کر کر سکتے ہیں۔"

"اوہو...... جی نہیں، ٹھیک ہے۔" طارق نے کہا۔

"اور باقی دو کا کیا ہوا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ان دونوں کی حالت بھی کچھ خاص بہتر نہ تھی، تاہم وہ بچ گئے تھے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"تو وہ دونوں اب اِدھر ہی ایڈمٹ ہیں؟" طارق نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو کیا وہ یہاں سے ڈسچارج کر دیے گئے؟" طارق نے پوچھا۔

"ابھی ڈسچارج کرنے کی اُن کی حالت کہاں تھی۔" لڑکی بولی۔ "البتہ ان کی طبیعت قدرے بہتر ہونے کے بعد ان دونوں کو یہاں سے گنگا رام ہاسپٹل شفٹ کر دیا گیا تھا، چونکہ یہ پولیس کیس بن گیا تھا اسی لیے ان دونوں کی کنڈیشن بہتر ہوتے ہی انہیں گنگا رام اسپتال شفٹ کر دیا گیا جو ایک سرکاری اسپتال ہے۔"

لڑکی نے آخر میں یہ بتاتے ہوئے "ایکسکیوزمی" بھی کہہ دیا اور دوسری جانب متوجہ ہو گئی۔

وہ ہمارے مطلب کے سوالوں کے جوابات دے چکی تھی، لہٰذا ہم نے بھی اسے زیادہ تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور باہر آ گئے۔

اسپتال سے باہر آ کر میں اور طارق ذرا دیر پیدل ہی فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔

"بھولا ناتھ جہنم واصل ہو گیا۔" طارق بولا۔

"لیکن وہ دونوں بچ گئے۔" میں نے دانت پیسنے کے انداز میں کہا۔ میرا اشارہ گوہر شاہ اور تاج کی طرف تھا۔

"مگر گنگا رام میں اب وہ دونوں خبیث پولیس کی نگرانی میں ہوں گے۔" طارق نے پُرسوچ انداز میں یہ کہتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کچھ بھی سہی، چل کر اُن کا حال تو معلوم کریں، موقع ملا تو دونوں کو بھولا ناتھ کی طرح وہیں جہنم واصل کر ڈالیں گے۔" طارق پورے جوش سے بولا۔ اس کی بات سن کر میرا خون سیروں بڑھ گیا۔ روحی کے مقابلے میں طارق کی یہ بات مجھے پسند تھی، وہ لوہے کو لوہے سے ہی کاٹنے کا عادی تھا، روحی کی طرح قانونی الجھنوں میں نہیں پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بات پر میں نے فوراً کہا۔

"پھر دیر کس بات کی ہے، میں ٹیکسی کو ہاتھ دینے لگا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ٹیکسی میں گنگا رام سرکاری اسپتال کی جانب رواں دواں تھے۔

☆☆☆

یہ حقیقت تھی کہ گوہر شاہ اور تاج کے زندہ بچ جانے کا سن کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ ممکن تھا کہ اب بھی ان کی حالت "ادھ مرے" جیسی ہو، ایسی حالت یوں بھی موت سے بدتر ہی تصور کی جاتی ہے۔

ہم آدھے گھنٹے بعد مطلوبہ ہاسپٹل جا پہنچے۔ شہر کا ایک

سرکاری اسپتال ہونے کے سبب وہاں مریضوں اور ان کے لواحقین کا بہت رش تھا۔

ہم نے کرایہ دے کر ٹیکسی والے کو فارغ کیا تو اچانک طارق گیٹ کا رخ کرنے کے بجائے ایک طرف کو ہولیا۔ اس طرف پان سگریٹ کے کیبن اور چائے خانے بنے نظر آتے تھے۔

میں سمجھا شاید طارق کا چائے وغیرہ کا موڈ ہونے لگا ہے، یا پھر کیبن کا رخ کرے گا، وہاں اس نے دو سگریٹ خریدے، ایک مجھے دیا اور دوسرا خود ہونٹوں میں داب کر لائٹ دیتا رہا۔

''خیریت؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس سے سرگوشی کی۔

''خیریت نہیں ہے۔'' طارق نے ہولے سے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے ایک کش لیتے ہوئے دھواں اُگل کر ایک بار پھر اپنے گردوپیش میں غور سے دیکھا۔

''ایک کار رام سنگھ اسپتال سے ہمارے تعاقب میں تھی۔'' طارق نے انکشاف کیا۔

''او...... کون سی؟''

''جہاں میں اشارہ کروں، اس طرف فوراً مت دیکھنا۔ اب سگریٹ کی ایش جھٹکنے کے بہانے اپنے بائیں جانب ذرا سا گھوم جاؤ، اور ایمرجنسی کی ریڈ لائٹ والی جگہ پر جہاں اسپتال کا دوسرا گیٹ ہے، دیکھو۔''

میں نے ایسا ہی کیا اور ساتھ ہی اپنے چونکنے پن کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور طارق سے بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

''ایک نیلے رنگ کی کار ہے، فراری ٹائپ کی۔''

''ہاں! اور اس کے اندر مجھے مارٹی بیٹھا نظر آیا تھا، اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ'' طارق کی آواز میری سماعتوں میں زہریلے سانپ کی طرح سرسرائی تھی، کیونکہ مارٹی کا نام سنتے ہی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سانپ رینگتے محسوس ہوئے تھے۔

''اب کیا کریں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم ٹریس کر لیے گئے ہیں، ان سے بھڑنا تو پڑے گا ہی۔'' طارق سگریٹ کا کش لیتا رہا اور میں بھی اس کا ساتھ دیتا رہا۔

ذرا دیر بعد طارق نے دو سادہ پان بنوائے اور ایک مجھے دیتے ہوئے نچی آواز میں بولا۔

''بظاہر بے پروا، لیکن اپنے گردوپیش سے محتاط ہو کر میرے ساتھ آتے رہو۔'' میں نے ایسا ہی کیا۔

طارق نے اسپتال کے مین گیٹ کی طرف بڑھنے کے بجائے ایک قریبی محلے کی تنگ سی گلی کا رخ کیا تھا اور اس میں داخل ہو گیا۔ اس سرکاری اسپتال کے اردگرد اوسط درجے اور اس سے نچلے درجے کے محلے آباد تھے، دن کا وقت تھا اسی لیے یہاں آنے جانے والے افراد دکھائی دیتے تھے۔

''مارٹی بہت چالاک ثابت ہوا ہے...... چرن اور اس نے مل کر ہمیں پھانسنے کی بڑی جامع اور مربوط منصوبہ بندی کی ہے۔'' طارق تیز تیز چلتے ہوئے بڑبڑایا۔

''ان دونوں کو یقین تھا کہ ہم اپنی تسلی کی خاطر رام سنگھ یا دلارام اسپتالوں کا رخ کر سکتے ہیں۔'' میں نے بھی خیال ظاہر کیا۔

''بالکل۔'' طارق نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بولا۔ ''کوئی بعید نہیں کہ چرن بھی یہیں کہیں موجود ہو۔''

''وہ اپنے گرو گھنتال کی موت کا ہم سے بدلہ لینے کے لیے بے چین ہوگا۔'' میں نے بھی لقمہ دیا۔

''اس طرف......'' طارق نے گلی کا ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا اور پھر رک گیا۔

''کیا وہ پیچھے آرہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ طارق نے کوئی جواب دیے بغیر گلی کی دیوار کی آڑ سے عقب میں ذرا سر نکال کے جھانکا۔ پھر پیچھے ہو کر مجھ سے بولا۔

''وہ تینوں اِدھر ہی آرہے ہیں۔ ہوشیار...... ان پر ہلّا بولنا ہے۔'' طارق نے کہا اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔

ہم دونوں نہتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ طارق اپنی ''حالت'' کے پیش نظر ان سے کس طرح نبرد آزما ہوگا، تاہم میں ان سے بھڑ جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔

جس گلی میں ہم مڑے تھے، یہ بند گلی تھی۔ یہاں چند ایک ہی افراد کھڑے یا آتے جاتے دکھائی دیے۔

''میرا خیال ہے یہاں آنے کے بجائے ہم اسپتال کے اندر ہی چلے جاتے۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں یہ لوگ ہم پر حملہ کرنے سے قاصر رہتے۔''

''اسپتال کے اندر وہ ہمارے خلاف فوراً پولیس کی

مدد لینے کی کوشش کرتے۔" طارق موڑ پر دھیان دیتے ہوئے بولا۔ "مت بھولو کہ اس وقت ہم انڈین پولیس کی نظروں میں قاتل اور مجرم ہیں۔"

"اوہ......" اس کی بات سمجھ کر میرے منہ سے نکلا۔

"شش...... وہ قریب آگئے ہیں۔" طارق نے سرگوشی کی۔ میں مستعد تھا۔

قدموں کی آواز بھی قریب آتی محسوس ہونے لگی، میں جانتا تھا کہ یہاں لڑائی ہوئی تو پورے محلے میں اودھم مچ جائے گا، لیکن ہوا اس کے برعکس، وہ تینوں تیز تیز قدموں سے آگے نکلتے چلے گئے۔

"یہ بھی اچھا ہوا، جلدی پلٹ کر گلی سے نکل چلو، آؤ......" طارق جوشیلے لہجے میں بولا اور ہم نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی۔

"میں بھی چاہتا تھا۔" طارق تیز تیز چلتے ہوئے بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس محلے کی بھول بھلیوں والی گلی سے نکل کر اسپتال کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

ہم مارٹی اور اس کے دونوں ساتھیوں کو بغیر کسی ہنگامے کے ڈاج دینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ایک سرکاری اسپتال کے استقبالیہ کی اس وقت وہی حالت تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔

طارق نے نجانے کیا چکر چلا کر کسی نہ کسی طرح گوہر شاہ اور تاج کے وارڈ کا پتا لگا ہی لیا کہ وہ کہاں داخل تھے۔ البتہ اس کوشش میں اُسے نصف گھنٹا ضرور لگ گیا تھا۔

ہم گندی میلی اور پان کی پیکوں سے رنگین سیڑھیاں چڑھتے پہلی منزل پر آگئے۔ وہاں سے دو طویل کوریڈور تیز تیز قدموں سے طے کرتے ہوئے، ایک اور زینے سے دوسری منزل پر پہنچ گئے۔

ہمارے دم پھولنے لگے تھے۔ ہم نے ایک جگہ رک کر ذرا سانسیں بحال کیں اور پھر آگے بڑھے۔

یہاں بھی لوگوں کا رش تھا۔ گارڈ بھی موجود تھے مگر برائے نام......

مطلوبہ وارڈ...... وی آئی پی رومز کے پاس ہی تھا۔ وہاں لوہے کی گرل کا جنگلا نما دروازہ تھا۔

یہاں کچھ سیکیورٹی کے مناسب انتظامات نظر آتے تھے۔

قریب پہنچنے پر ہم دونوں ٹھٹک گئے ـــ پولیس کی وردی میں افراد چوکس کھڑے نظر آئے۔

ہم دو سیکنڈ وہاں کھڑے رہنے کے بعد دوسری جانب کی راہداری میں گھوم گئے اور ایک جگہ لوگوں سے ذرا ہٹ کر دیوار سے پشت لگائے کھڑے ہو گئے۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ بھرے پُرے سرکاری اسپتال میں سیکیورٹی کے ایسے انتظامات بھی ہو سکتے ہیں۔" طارق ہولے سے بڑبڑایا۔ وہ کچھ جھلایا ہوا سا تھا۔

"عمومی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "چند ایک وارڈ ایسے ہوتے ہیں جہاں سیکیورٹی کے خصوصی انتظامات ہوتے ہیں، مثلاً وی آئی پیز...... اور یہ دونوں مردود بھی...... کم وی آئی پیز نہیں ہیں۔"

"یہ مارٹی اور چرن کا کام ہو سکتا ہے۔" طارق میری بات پر صاد کرتے ہوئے بولا۔

"اب کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

"اندر تو کسی طرح داخل ہو ہی جائیں گے لیکن...... کمرے کے سامنے دو پولیس والوں کو کیسے رام کیا جائے؟" طارق نے کہتے ہوئے ہونٹ بھینچے۔

"پرانا حربہ کیسا رہے گا؟" میں نے کہا۔ "ہم کسی اسٹاف کے بھیس میں اندر جا سکتے ہیں۔"

"یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔" طارق بولا۔ "مگر تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں پر سارے اسٹاف کے لوگ ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح پہچان رہے ہیں۔ یہ ایک بڑی اُلجھن ہے۔"

"دن کو ویسے بھی سرکاری اسپتالوں میں بہت رش ہوتا ہے، ہمیں رات کو آنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی تمہاری بات صحیح ہے۔" طارق تائید میں بولا۔

"ارے...... وہ دیکھو، کہیں چرن تو نہیں یہ......؟" میں ایک دم اس شخص کو دیکھ کر چونکا جو گرل والے دروازے کی جانب بڑھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کھانے پینے کی چیزوں کے شاپرز تھے۔

سیکیورٹی گارڈ نے اُسے اندر وارڈ یا وی آئی پی رومز میں جانے کی اجازت دے دی۔

ابھی میں اور طارق وہیں دیگر لواحقین کے ساتھ ملے جلے کھڑے تھے کہ ذرا ہی دیر بعد چرن باہر نکلا اور وہاں موجود لوگوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

اس کے انداز و اطوار سے جوش اور بوکھلاہٹ کے تاثرات ظاہر ہوتے تھے۔

''ایک طرف ہو جاؤ، اسے مارٹی نے فون پر یا کسی خفیہ ٹرانسمیٹر پر ہمارے بارے میں مطلع کر دیا ہے۔'' طارق نے میرے کان میں سرگوشی کی اور ہم دونوں بیک وقت ایک قریبی راہداری میں گھوم گئے۔

''میرا خیال ہے، رات میں آنا چاہیے، اس وقت لوگوں کا رش بھی زیادہ نہیں ہوتا اور اسٹاف بھی محدود ہوتا ہے۔'' میں نے پھر اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے طارق سے کہا۔

''چلو۔'' طارق نے کہا۔

ہم اسپتال کے مین گیٹ کے بجائے اس کے عقبی گیٹ سے باہر آگئے، اس دوران ہم اپنے گرد و پیش سے بھی انتہائی محتاط رہے تھے۔

کافی آگے جا کر اپنے تعاقب سے تسلی ہونے کے بعد ہم نے ٹیکسی کروائی اور اپنے ہوٹل آگئے۔

روبی اور حمیرا آپس میں مصروف گفتگو تھے۔ شاید ان دونوں میں اب دوستی ہو گئی تھی، اگرچہ لڑائی بھی ان میں نہیں تھی لیکن روبی نے کچھ سرد جنگ کی سی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ جو میں نے اسی وقت ٹھنڈی کر دی تھی۔

''واپس لوٹ کر تم دونوں نے بالکل ٹھیک کیا۔'' روبی بولی۔ ''بعض اہم کام ایک مرحلے میں نہیں ہوتے۔'' پھر تھوڑے توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔

''میرا خیال ہے کہ اب رات میں، طارق کے بجائے مجھے سیف کے ساتھ جانا چاہیے۔ ممکن ہے سیکیورٹی گارڈ ایک عورت کو دیکھ کر اندر جانے کی اجازت دے ڈالے۔''

اس کی تجویز قابلِ غور تھی مگر طارق بھی ساتھ چلنا چاہتا تھا، حمیرا کا مسئلہ تھا کہ آیا اسے اکیلا یہاں چھوڑ کر جایا جا سکتا تھا۔ یہ بات اور ہمارا تذبذب بھانپتے ہی وہ بول پڑی۔

''طارق بھائی بھی جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں، اچھا ہے دو سے تین بھلے۔''

''ایک سے دو بھلے صحیح محاورہ ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

''تو یہ ہے، حمیرا کو بھی نہیں بخش رہے۔'' روبی ہنس کر بولی۔ ''میں سمجھتی تھی کہ سیف میری ہی تصحیح کرتا ہے، یہ تو سب کو کھنڈے لگاتا ہے۔''

''یہ اس کی عادت ہے۔'' حمیرا بھی مسکرا کر بولی۔

''لیکن آپ اکیلی یہاں رہ... لیں گی؟'' طارق نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اس میں کوئی قباحت تو نہیں؟'' حمیرا نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ ''دیکھو نا، وہ لوگ سب وہاں موجود ہیں۔ پھر مارٹی اور چرن کے بارے میں بھی تم لوگ بتا چکے ہو کہ وہ کس قدر چالاک اور خطرناک لوگ ہیں۔''

میرا ارادہ بھی تھا کہ روبی ساتھ نہ چلے، صرف طارق اور میں کافی تھے، لیکن میں ہی نہیں بلکہ طارق بھی یہی چاہتا تھا کہ حمیرا کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ کر جانا چاہیے، کوئی اس کے ساتھ موجود رہتا۔

مگر روبی نے اپنی بچ چھوڑی تھی۔ ممکن تھا وہاں خطرناک دشمنوں کی موجودگی (مارٹی اور چرن) کے سبب وہ ایسا کہہ رہی ہو۔

''تمہیں کم از کم گوہر شاہ اور تاج کی کنڈیشن کے بارے میں تو کسی اسٹاف وغیرہ سے پوچھ ہی لینا چاہیے تھا، آخر پتا تو چلتا وہ دونوں بدبخت شیطان اور چیلے کس حال میں ہیں؟ ادھ مرے ہیں یا بھلے چنگے ہو رہے ہیں؟'' روبی نے آخر میں کہا۔

''ہمیں یہ خیال بہت بعد میں آیا تھا۔'' طارق خفت سے بولا۔

''درحقیقت ہم وہاں مارٹی اور چرن وغیرہ میں اُلجھ گئے تھے، اس لیے ہم دونوں کو ان کا دھیان نہ رہا۔'' میں بھی بولا۔

''اب کیا طے پایا ہے؟'' روبی بے چینی سے بولی۔

''لنچ کا وقت ہو چلا ہے۔ پھر تھوڑا قیلولہ اس کے بعد...... حتمی فیصلہ کریں گے۔ ابھی ہمارے ذہن اُلجھے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا اور حمیرا کو روم سروس فون کرنے کا کہا۔

☆☆☆

شام پانچ بجے ہم چاروں فریش ہو چکے تھے اور چائے پی رہے تھے۔

جب روبی کے جانے نہ جانے کی بحث پھر شروع ہوئی تو حمیرا نے اچانک کہا۔ ''تب پھر میری یہی تجویز ہو گی کہ میں بھی ساتھ چلوں۔''

ہم تینوں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''دو مرد

اور دو خواتین الگ الگ انداز میں بھی معرکہ سر کر سکتے ہیں۔ اس میں بہت سی آسانیاں ہو سکتی ہیں ہمارے لیے۔''

''نہیں حمیرا.....! تمہیں اُن خطرات سے دور رہنا چاہیے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ یوں میں نے ہی نہیں بلکہ طارق اور روبی نے بھی اسی بات کا اظہار کیا تھا۔ اس پر مجھے خوشی تھی، طارق اور روبی بہر حال میرے جاں نثار اور سچے دوست تھے۔ حمیرا اور میرے جذباتی رشتے کا وہ اب احترام کرنے لگے تھے۔

''کس خطرے کی بات کر رہے ہو تم سیف؟'' حمیرا نے میری جانب دیکھ کر کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں، کیا بھول گئے تم لاہور کے معرکے میں جب تاج اور اس کے غنڈوں کے ساتھ ہم دونوں دھاچوکڑیاں مچایا کرتے تھے؟ خاطر جمع رکھو، یو کے میں.....سول ڈیفنس کی تربیت ہر شہری کو دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ میں شوٹنگ کلب کی ممبر بھی رہ چکی ہوں اور پھر مت بھولو کہ میرا بھائی ماجد بھی انہی درندوں کا شکار ہوا تھا، انہی کی وجہ سے ہماری ہنستی بستی اور پُرسکون فیملی برباد ہوئی، میں بھی ان خونی سوداگروں کے خلاف اپنے دل و دماغ میں ویسا ہی جذبہ رکھتی ہوں جیسا کہ تم تینوں کے دلوں میں آتش فشاں بن کے اُبلتا رہتا ہے۔''

حمیرا یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ عام حالات میں ایسی گفتگو میں اس کی دلنشیں آنکھیں نمناک سی ہو جایا کرتی تھیں لیکن اس بار میں نے دیکھا اس کی کشادہ آنکھوں اور دلکش چہرے پر بُردباری اور جوش کے سائے لہرا رہے تھے۔

حمیرا کی بات میں شاید کچھ ایسی اثر پذیری تھی کہ جس نے ہم تینوں کو تاثر انگیز سی خاموشی میں مبتلا کر دیا۔

مختصر تیاری کے بعد ہم چاروں ہوٹل سے نکلے اور.....ٹیکسی میں بیٹھ کر گنگا رام ہاسپٹل روانہ ہو گئے۔

شام ڈھل رہی تھی۔ مطلوبہ منزل پر پہنچتے ہمیں رات ہو گئی، وجہ ٹریفک کا غیر معمولی اژدہام تھا۔

اس بار ہم ہاسپٹل کے گیٹ کے بجائے تھوڑا دور ہی اتر گئے۔ ٹیکسی والے کو فارغ کرنے کے بعد ہم پیدل ہاسپٹل کی طرف چل دیے، تاہم گرد و پیش سے چوکنا ضرور تھے۔

ذرا قریب پہنچے تو اس بار ہم نے اندر داخل ہونے کا منصوبہ مختلف طے کیا تھا۔ عقبی گیٹ سے مجھے اور..... طارق کو داخل ہونا تھا، جبکہ مین گیٹ سے روبی اور حمیرا داخل ہوتیں۔

اس بار ہم نے ٹھیلے والے سے فروٹ اور کچھ کھانے پینے کی اشیا خرید لی تھیں۔ روبی اور حمیرا نے بھی یہی کیا تھا۔ یوں جیسے ہم اندر اپنے کسی مریض کی عیادت کے لیے آئے ہوں۔

باقی روبی اور حمیرا کے ایک ساتھ ہونے کی کیا منطق تھی، یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔

اب یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں تھی کہ ہوٹل سے نکلتے وقت ہم نے ہلکا پھلکا ریڈی میک اپ بھی کر لیا تھا، کیونکہ اب صورت حال اور تھی۔

میں اور طارق عقبی گیٹ کے قریب پہنچے اور اندر داخل ہو گئے۔ وہاں.... کوئی خاص روک ٹوک نظر نہیں آ رہی تھی، رات میں مریضوں کا رش بھی دن کے مقابلے میں کم ہی نظر آ رہا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہونے پر طارق بھی حیران تھا اور اب اسے بھی امید پیدا ہونے لگی تھی کہ..... میدان آگے بھی سہل ہو سکتا ہے۔

ہم گرد و پیش سے چوکنا، اندر داخل ہو چکے تھے۔ اگرچہ ریڈی میڈ میک اپ میں تھے لیکن پھر بھی احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ ہارلی، چرن اور اس کے دونوں ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔

ہمارا پلان یہی تھا کہ پہلے مطلوبہ وارڈ کے طور پر ہمیں پہنچ کر دور دور رہتے ہوئے ملنا تھا، اس کے بعد پہلے حمیرا اور روبی کو جانا تھا، پھر مجھے اور طارق کو۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر ہم ٹھہر گئے۔ حمیرا اور روبی بھی پہنچ چکی تھیں۔ وہ ہم سے تھوڑے فاصلے پر تھیں اور پھر ہمارے اشارے پر وہ لوہے کے جنگلے والے دروازے کی جانب بڑھیں۔

گرد و پیش کا جائزہ لینے پر ہمیں بیرونی طرف کوئی دشمن یا اُن کا کوئی ساتھی کھڑا نظر نہ آیا، ممکن تھا ان میں سے کوئی ایک یا دو اندر کوریڈور یا وارڈ روم میں موجود ہو سکتے تھے۔

البتہ دور سے ہمیں دو پولیس والے اندر کوریڈور میں ضرور کھڑے نظر آ گئے تھے۔

یہ تشویش والی بات تھی۔ ہم بغیر کسی ہنگامے کے صورت حال کا اپنی آنکھوں سے جائزہ لینا چاہتے تھے۔

اگرچہ گوہر شاہ اور تاج کے بارے میں معلومات ہمیں محلے کے کسی بھی شخص سے مل سکتی تھیں لیکن اپنی آنکھوں

سے ان دونوں ملعونوں کا حال دیکھنا اور بات تھی۔
البتہ صرف میرے اور طارق کے درمیان یہ بات طے تھی کہ موقع ملتے ہی ہم ان دونوں کو جہنم واصل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ اگر مارٹی یا چرن سامنے آئے تو انہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔
ہم نے ایک کونے کی آڑ سے حمیرا اور روبی کو دیکھا۔ وہ دونوں بنگلے والے دروازے پر کھڑی گارڈ کی منت سماجت کرنے میں لگی ہوئی تھیں، مگر گارڈ نہیں مان رہا تھا۔
یہ دیکھ کر میں نے ہونٹ بھینچ لیے، طارق بھی متفکر نظر آنے لگا۔ تاہم ہم دونوں نے ابھی تک کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی۔
تھوڑی دیر بعد شاید وہ اُسے منانے میں کامیاب ہو گئیں لیکن تب بھی متعین گارڈ نے صرف ایک کو ہی اندر جانے کی اجازت دی اور روبی اندر چلی گئی۔
''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' طارق نے ہولے سے کہا۔ پھر روبی کے اندر جاتے ہی، میں اور طارق حرکت میں آئے اور بنگلے کی طرف بڑھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کے شاپرز ہمارے ہاتھوں میں تھے۔
حمیرا وہیں قریب ہی کھڑی تھی، وہ ہم سے اور ہم اُس سے انجان بن گئے۔
''اندر ہمارا مریض داخل ہے۔ یہ کھانے پینے کی چیزیں پہنچانی ہیں۔'' میں نے گارڈ سے مسکرا کر کہا۔ وہ درمیانے قد اور درمیانی عمر کا سانولا آدمی تھا۔ اس نے گہرے سرخ رنگ کی وردی پہن رکھی تھی۔
''سوری جناب! ایم ایس صاحب کا حکم ہے کہ وی آئی پی رومز میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''بھائی! مہربانی ہوگی، زیادہ دیر اندر نہیں لگائیں گے۔'' میں نے اس کی منت سماجت شروع کردی۔
''ہرگز نہیں۔'' اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔ ''یہ چیزیں کہو تو میں اندر آپ کے مریض تک پہنچا دیتا ہوں۔''
''آپ کی مہربانی، لیکن میں ایک نظر دیکھ کر اپنے مریض کی حالت کی تسلی کرنا چاہتا ہوں، اس کے گھر والے پریشان ہیں، ان کی بھی مجھ سے تسلی ہو جائے گی، میں انہیں بتادوں گا۔'' میں نے کہا۔
وہ پھر بھی نہیں مانا تو طارق نے کہا کہ خواہ ایک کو ہی اندر جانے دیا جائے، وہ نیم رضامند نظر آنے لگا تو طارق نے ایک بڑا نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
''ٹھیک ہے مگر صرف ایک.....'' بالآخر اس نے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ یہی بہت تھا۔ ہم میں طے تھا کہ اندر میں جاؤں گا۔
میں اندر چلا گیا۔
دائیں بائیں رومز بنے ہوئے تھے۔ چند ایک اسٹاف کے لوگ آتے جاتے دکھائی دیے۔ دائیں جانب دو پولیس والے ایک کمرے کے دروازے پر بیٹھے نظر آئے، میں یونہی کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔
روبی مجھے نظر نہیں آرہی تھی، جانے وہ کہاں اور کس طرف کھچڑی پکا رہی تھی۔ بہرحال مجھے اپنا ''کام'' کرنا تھا۔
طارق اور حمیرا باہر موجود تھے، اب جو اندر تھے انہوں نے اپنا کام نمٹانا تھا، اگرچہ میرا کام روبی سے مختلف تھا، کیونکہ طارق نے مجھے ''گرین سگنل'' دے دیا تھا کہ موقع ملتے ہی گوہر شاہ اور تاج کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔
روبی کا معاملہ اور سہی لیکن میرے اور طارق کے درمیان بہرحال یہ انڈر اسٹینڈنگ ابتدا میں ہی ہو چکی تھی کہ خونی سوداگروں کے کسی بھی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔
میں اسی جوش تلے آگے بڑھتا چلا گیا۔ پولیس والے جس کمرے کے سامنے موجود آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میری طرف انہوں نے صرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔
تاہم اچانک میں ان میں سے ایک کی بات پر چونکا اور رک گیا۔ ایک اپنے ساتھی سے بیزاری سے کہہ رہا تھا۔
''یار! یہاں کی کیسی خشک ڈیوٹی ہے، آدمی ایک سگریٹ تک نہیں پی سکتا۔''
''اب اتو باہر چلا جانا، یا پھر کوریڈور کے کونے میں کھڑکی کی طرف کھڑا ہو کر لگا لے دم......'' دوسرے نے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا۔
''باہر تو نہیں جا سکتا، چلو کھڑکی والا آئٹم کر لیتے ہیں۔'' پہلے والے نے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ اب وہاں ایک ہی پولیس والا کھڑا تھا۔ میں کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس کی جانب آیا اور بولا۔
''بھائی صاحب! یہاں پولیس کا پہرا کیوں ہے؟ خیریت تو ہے؟''
اُس نے سخت نظروں سے میری جانب گھورا اور

خالص پولیس والے انداز میں اکھڑ مزاجی سے بولا۔ "تمہارا کیا کام ہے؟ جاؤ یہاں سے۔"

"بھائی! غصہ کیوں کرتے ہو، میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے عقب میں ایک نسوانی ہاتھ نمودار ہوتے دیکھا جو پولیس والے کے کندھے پر دھرا نظر آیا، پھر اگلے ہی لمحے میں نے اسے لڑھکتے دیکھا، میری آنکھیں ایک لمحے کو پھیل گئیں۔

اس کے عقب سے روحی نمودار ہوئی۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"میں اسی بات کی منتظر تھی کہ یہ اکیلا ہو اور اس کا دھیان بھی دوسری جانب ہو، تم نے میری یہ مشکل آسان کر دی۔"

روحی اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسی ہوئی شاید کوئی بے ہوش کر دینے والی سُوئی کو بالوں میں پھنسانے لگی۔

"زبردست!" میں نے چہک کر کہا۔

"اب جلدی سے اندر چلو، اس کا دوسرا ساتھی آنے میں دیر نہیں لگائے گا۔"

ہم دونوں نے مل کر پہلے پولیس والے کے بے سدھ وجود کو گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈالا اور اندر داخل ہو گئے۔

سامنے ہی دو بیڈ پر سرخ چادر میں مریض لیٹے نظر آئے۔ انہیں دیکھتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔

اپنے شکار کو سامنے دیکھ کر روحی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور پھر فوراً ہی ہم دونوں آگے بڑھے۔

بیڈ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اچانک دونوں مریض ایک دم یوں اٹھ بیٹھے جیسے سامنے رکھے دو جنازوں سے دو لاشیں ایک دم اٹھ بیٹھی ہوں، لیکن ان "لاشوں" کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے خوف ناک پستول دبے ہوئے تھے، جن کی لمبی نالیں بہ زبانِ نال بتاتی تھیں کہ وہ شور نہیں مچاتیں۔

دوسرا جھٹکا ہمیں یہ دیکھ کر لگا تھا کہ وہ دونوں "لاشیں" گوہر شاہ اور تاج کی نہیں بلکہ مارٹی اور چرن کی تھیں۔ وہ دونوں مریضوں کی جگہ پر لیٹے ہوئے تھے۔ چال ہماری اُلٹی گلے آن پڑی تھی۔

ہم بھول گئے تھے کہ ان لوگوں نے آج دوپہر ہمیں

## انٹرویو

ایک شخص انٹرویو کے لیے گیا۔ دروازے ہی پر چوکیدار نے اسے اچھی طرح سمجھا بجھا دیا۔

"ہمارا صاب تین سوال کرے گا۔ پہلا سوال یہ کرے گا کہ آپ کی عمر؟ تم جواب دینا تیس سال۔ پھر پوچھے گا کہ تجربہ کتنا ہے۔ تم جواب دینا پانچ سال۔ پھر پوچھے گا کہ اردو آتی ہے یا انگلش۔ تم جواب دینا دونوں۔"

جب وہ اندر گیا تو صاحب نے اس سے سوال کیا۔

"تمہارا تجربہ کتنا ہے؟"

"جواب ملا۔ "تیس سال۔"

"عمر کتنی ہے؟"

جواب ملا۔ "پانچ سال۔"

صاحب (غصے سے)۔ "تم پاگل ہو یا میں؟"

جواب ملا۔ "دونوں۔"

## لیلیٰ مجنوں

دو انٹرویو لینے والوں نے ایک سفارشی لڑکے سے نوکری کے لیے سوال کیا۔

"لیلیٰ مجنوں کون تھے؟"

لڑکے نے جواب دیا تو اسے پاس کر دیا گیا۔ دوسرا لڑکا قابل تھا لیکن سفارشی نہیں۔ اس نے انٹرویو لینے والوں سے کہا۔

"مجھ سے بھی کوئی اس قسم کا آسان سوال پوچھ لیجیے۔"

انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔ "ٹھیک ہے اچھا تم بتاؤ لیلیٰ مجنوں کے گھر کا فون نمبر کیا تھا؟"

حیدرآباد سے کاشف کا سوال

## "موضوعِ سخن"

ریاضی کے ٹیچر نے کلاس روم میں نیا سوال شروع کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ایک کار کی لمبائی دس فٹ ہو اور ایک سڑک پر ایک لاکھ کاریں آگے پیچھے ایک دوسرے سے جڑی کھڑی ہوں..."

ایک لڑکا بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "اچھا... اچھا... آپ روزانہ شام کو چھٹی کے وقت بندر روڈ پر ٹریفک جام کی بات کر رہے ہیں۔"

دیکھ لیا تھا اور یہ بھی کہ ہم دوبارہ یہاں آسکتے تھے۔

"چز...... چز......" کی یک بیک دو سنسناتی ہوئی سرگوشیاں اُبھریں۔ میں تو ہکا بکا ہی رہ گیا تھا، البتہ روبی نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کہ میں...... شاید اس مہلک وار سے خود کو نہ بچا پاؤں اس نے ایک پنتھ دو کاج کر دکھایا یعنی، سائلنسر لگے پستولوں کی گولیوں سے نہ صرف خود کو بلکہ مجھے بھی یوں بچایا کہ مجھے دھکا دیتی ہوئی سائڈ پر دیوار سے جا لگی۔

دونوں گولیاں "زٹ...... زٹ" کی آوازوں سے دیوار میں پیوست ہوگئیں۔

مارٹی اور چرن کے پستولوں والے ہاتھ یک دم ہماری جانب گھومے، میں ابھی بچنے کی کوشش میں تھا ہی کہ روبی نے اچانک معرکہ دے مارا۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے کوئی ٹرے اٹھا کر ان کی جانب اچھال دی۔ ہماری جانب مارٹی تھا، ٹرے اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی، وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بستر سے فرش پر آن گرا۔

چرن کو صحیح طور پر ہمارا نشانہ لینے کے لیے اپنی پوزیشن بنانا پڑی اور جیسے ہی اس نے رخ بدلا، روبی کا ہاتھ پھر حرکت میں آیا۔

اُس نے نجانے اور کیا شے اٹھا کر اس کی جانب اچھال دی، جو چرن کے پستول والے ہاتھ پر تو نہ لگی البتہ...... اس کی پیشانی کی تواضع ضرور کر ڈالی، اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی۔

ادھر تب تک میں اپنی کارروائی مکمل کر چکا تھا، یعنی روبی کے دوسرے وار کرنے تک میں خود کو فرش پر گرا چکا تھا اور دو تین تیزی سے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے مارٹی کا پستول اُچک لیا، جس پر اپنے بستر سے چھلانگ لگاتے ہوئے مارٹی نے بھی یک بیک جھپٹ لگائی تھی۔

پستول میرے ہاتھ سے نکلتے نکلتے رہ گیا، تاہم مارٹی مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کی حتی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنا پستول میری گرفت سے چھڑا کر اس پر خود قابض ہو جائے۔ اس کا مطلب ظاہر ہے میری موت بھی ہو سکتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی پوری جان صرف کر دی مگر مارٹی بھی کم بخت ڈھیٹ اور سخت جان تھا، کسی طرح بھی وہ پستول چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ تب ہی ایک موقع پاتے ہی میں نے اپنے سر کی ٹکر بڑے زور سے گھما کر اس کی ناک پر ٹھوک دی۔

اس کے حلق سے کریہہ ناک چیخ خارج ہوئی، شکر تھا کہ دروازہ وائر ٹائٹ بند تھا، تاہم یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کی چیخ کی آواز کمرے سے باہر کوریڈور میں گونجی ہو، کچھ تسلی تو تھی کہ وہاں کوئی نہیں تھا، البتہ...... سگریٹ پینے گئے پولیسیے کی طرف سے خطرہ ضرور تھا۔

ضرب شدید لگتے ہی مارٹی کی گرفت پستول پر ڈھیلی پڑ گئی اور میں نے باقی کا کام بھی نمٹا دیا، یعنی اسی پستول کے ٹھوس دستے کا وار اس کی کنپٹی پر کر کے اسے انٹا غفیل کر ڈالا۔

مارٹی کی حالت میں نے ناگفتہ بہ کر دی تھی۔ میرے سر کی ٹکر نے اس کی ناک پچکا دی تھی اور وہاں سے اب بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا، تب تک روبی بھی چرن کو ڈھا چکی تھی۔ وہ بیڈ سے نصف نیچے اور آدھا اوپر پڑا تھا۔

"پہلا پولیسا ادھر ہی کہیں ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے روبی کو ہوشیار کرنا چاہا تو وہ بڑی تسلی سے بولی۔

"میں اسے پہلے ہی کھڑکی کی طرف ڈھا چکی ہوں۔" پھر ایک لحہ توقف سے بولی۔

"جلدی نکلنے کی کرو، مشن ہمارا فیل ہو گیا ہے، ورنہ مصیبت میں پڑ جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہم چاروں اسپتال کی بلڈنگ سے باہر تھے۔

کافی آگے جا کر ہم نے ٹیکسی کی اور اس پر سوار ہو کے ہوٹل آگئے۔

گوہر شاہ اور تاج کے پُراسرار غیاب پر تبادلۂ خیال کرنے سے پہلے...... احتیاط کے پیش نظر ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور...... کائمی اسٹریٹ کے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں دو کمرے لے لیے۔

"مجھے خدشہ تو تھا لیکن...... اُن سے اتنی مستعدی اور بیدار مغزی کی توقع بالکل نہ تھی۔" طارق جیسے کف افسوس ملتے ہوئے بولا۔

"ہم...... مجھے تو بالکل ہی اس کی امید نہ تھی۔" روبی نے بھی کہا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں مریضوں کو فوراً سے کدھر غائب کر دیا گیا؟" میں نے اصل موضوع چھیڑا۔

"کسی دوسرے اسپتال شفٹ کر دیا ہوگا۔" طارق

نے سر جھٹک کر کہا۔ مہم کی ناکامی نے اُسے بھی کچھ اعصاب زدہ سا کر ڈالا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ یہ پولیس کیس کے زمرے میں آتے ہیں۔"

"سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ پھر پولیس نے مارٹی اور چرن کو یہ جال پھیلانے کی کیونکر اجازت دی؟"

"پیسہ چلایا ہوگا انہوں نے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ممکن ہے۔" طارق سر ہلا کر رہ گیا۔

"مجھے لگتا ہے دونوں مریضوں کو اسپتال سے نہیں بلکہ اُن کے کمرے سے شفٹ کر دیا گیا ہوگا۔" روبی بولی۔

اس کی بات قابلِ غور تھی، لیکن اب معاملہ بگڑ گیا تھا، وہاں پولیس کی نفری پہنچ چکی ہوگی، افراتفری کا بھی عالم ہو گا۔

"ہم نے شاید یہاں پھر غلطی کر ڈالی۔" حمیرا بولی۔

"ہم میں سے ایک کو وہاں موجود رہنا چاہیے تھا۔ میک اَپ میں ہی تو تھے ہم...... اطمینان سے وہاں ہم میں سے ایک موجود رہتے ہوئے اس سارے چکر کا پتا چلانے کی کوشش کرتا۔"

"یہ کام تو اب بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے یک دم کہا۔

"چلو پھر میں اور تم ابھی چل کر یہ کام نمٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔" روبی ایک دم مجھ سے بولی۔ حمیرا نے ترچھی نگاہوں سے روبی کی طرف دیکھا تھا۔

حمیرا میں اگرچہ روبی والی رقابت جیسی بات ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی تاہم...... دونوں آخر کار عورتیں ہی تھیں اور روبی کا بار بار ہر مہم میں میرے ساتھ جانے کا ذکر شاید حمیرا کو بھی کھٹکنے لگا ہو۔

"چلو۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ گنگا رام ہاسپٹل جانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھے ہی تھے کہ روبی نے وہی موضوع چھیڑ دیا جس سے میری طبیعت مکدر رہی نہیں بلکہ منغض بھی ہونے لگی تھی۔

"حمیرا کی یہ مجبوری تھی کہ اس نے ابھی یوکے جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ اب شاید ہی یوکے جائے۔"

"وہ کیوں؟"

"ظاہر ہے اب اس بے چاری کا دنیا میں تمہارے سوا اور کون رہ گیا ہے؟" روبی تلخی آمیز طنز سے بولی۔ "بھائی پہلے ہی مر چکا، باپ بھی یوکے جاکے انتقال فرما گئے۔ اب اسے بچھڑی ہوئی وہ محبت یاد آ گئی تمہاری جب وہ تمہیں تنہا چھوڑ کر یوکے چلی گئی تھی۔"

"تمہاری حمیرا کے ساتھ پرابلم کیا ہے آخر؟" میں نے گھور کر پوچھا۔ اس دوران میں مجھے طارق کی نصیحت بھی یاد آنے لگی۔ میں خود پر قابو پانے لگا۔

"میرا بھلا کیا پرابلم ہو سکتا ہے اُس کے ساتھ۔" روبی طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"نہیں، کچھ تو ہے۔ بھلا حمیرا اور میرے ذاتی معاملے میں تمہارا بار بار انٹرفیئر ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"یہی کہ تم تو اُس سے کس قدر محبت کرتے ہو لیکن وہ......" روبی نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا۔

"وہ بھی مجھ سے کرتی ہے۔"

"میرا یہی پرابلم ہے۔" روبی ایک دم بولی۔ "تم تو اس سے سچی محبت کرتے ہو لیکن وہ تم سے صرف غرض کی محبت رکھتی ہے۔ آخر کو تم میرے اچھے بُرے دنوں کے دوست رہے ہو۔ میرا فرض بنتا ہے کہ تمہیں...... اصل نقل، فریب سچائی کے بارے میں بتاتی رہوں۔"

"او کے تمہارا فرض پورا ہوا، اب ختم کرو، ڈرائیور ہماری جانب بار بار بیک ویو میں دیکھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

حسبِ سابق اسپتال سے کافی دور ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ پیدل ہی باقی چند گام کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ہم گنگا رام پہنچے تو وہاں کافی تعداد میں پولیس کی نفری موجود تھی۔ لوگوں کی آوک جاوک بھی تھی۔ رات کافی بیت چلی تھی۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ نجانے مارٹی اور چرن نے ہوش میں آنے کے بعد پولیس کو ہمارے متعلق کیا بیان دیا ہو گا، یہ ہمیں نہیں پتا تھا، تاہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ ابھی شاید ان لوگوں کے مفاد میں یہ نہ تھا کہ وہ ہمارے بارے میں پولیس کو آگاہ کرتے۔ انہوں نے جو کرنا تھا، وہ کر چکے تھے۔

میں اور روبی جیسے تیسے اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ہم دونوں ریڈی میڈ میک اَپ میں ہی تھے۔

اندر داخل ہو کر ہم نے اسی گوشے کا رخ کیا جو ہمارا مطلوبہ تھا اور وہیں سب سے زیادہ پولیس اور لوگوں کی نفری

''تماشا'' دیکھنے کے لیے اکٹھی تھی، پولیس انہیں دور ہٹانے کی کوشش میں جتی ہوئی تھی، مگر تماش بین کہاں باز آتے ہیں، ہم بھی انہیں میں شامل ہو گئے اور سن گن لینے کی کوشش کرنے لگے۔

ابھی تک یہی معلوم ہو سکا کہ کسی دشمنی کے نتیجے میں اندر داخل دو مریضوں پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور ہم انہی کے درمیان موجود تھے۔

''میں ریسیپشن کی طرف جا کر کچھ دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ تم وی آئی پی روم کی طرف جانے کی کوشش کرو۔'' روبی نے مجھ سے کہا اور آگے نکل گئی۔

وی آئی پی روم والے کوریڈور میں پولیس موجود تھی اور وہاں کسی کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی، البتہ کچھ میڈیا کے لوگ موجود تھے، جو اندر رپورٹنگ کے لیے آتے جاتے مجھے نظر آئے۔ میڈیا کے لوگوں کو روبی اور میں نے باہر بھی دیکھا تھا۔

میں نے بہت کوشش کی، کچھ نئی معلومات حاصل کر سکوں مگر یہ نہ ہو سکا۔ ناچار کافی دیر کی ناکام کوشش کے بعد پلٹ آیا کہ شاید روبی نے کچھ پتا چلانے کی کوشش کر رکھی ہو۔

اس سے ملا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ مجھ سے ملتے ہی عجلت میں بولی۔

''کام ہو گیا، نکل چلو۔'' اس کے لہجے سے جوش مترشح تھا۔ میں فوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔

ہم باہر آ گئے اور ٹیکسی کروا کے ہوٹل آن پہنچے۔ طارق اور حمیرا لیپ ٹاپ کے نیٹ پر ہیڈ لائنز سننے میں محو تھے۔

روبی نے بتایا کہ گنگا رام اسپتال میں ایک صحافی لائیو کوریج کرتے ہوئے اپنے چینل کو جو کچھ بتا رہا تھا، اس کے مطابق یہی خبر یہ تھی کہ اصل مریض بیڈ پر موجود ہی نہیں تھے، گویا انہیں دشمنوں کے (ہمارے) حملے کا پہلے ہی سے اندازہ ہو چکا تھا، لہٰذا پولیس کے ساتھ ساز باز کر کے اصل مریضوں کو غائب کر کے ان کی جگہ ان کے دو جنگجو ساتھیوں کو لٹا دیا گیا، مگر وہ پھر بھی اپنے دشمنوں پر حاوی ہونے میں ناکام رہے اور الٹا خود زخمی ہو گئے۔ وغیرہ۔

نیز آخر میں پولیس پر تنقید کرتے ہوئے، وہ صحافی اپنے چینل کو یہ بھی بتانے لگا کہ...... اصل مریضوں کو حملے سے چند گھنٹے پہلے ہی کوئی خوش پوش سی خاتون اپنے دو آدمیوں کے ہمراہ اپنے ساتھ لے جا چکی تھی اور سب نہایت خفیہ طریقے پر ہوا تھا۔ خاتون کے بارے میں پولیس اور اسپتال کے عملے سے پوچھ گچھ جاری ہے۔

''یہ خاتون رانی شوبھا دیوی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔'' میں یک دم ایک جوش تلے بولا۔

''اور...... ہمارا یہ شبہ بھی درست ثابت ہوا کہ شنکر چانکیہ کی بیوی اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے میدان میں اتر آئی ہے، اس نے اور اس کے وفاداروں نے مارلی اور چرن کی بھی پشت پناہی شروع کر دی ہو گی۔'' روبی بولی۔

''مزید یہ کہ شوبھا دیوی بھی اپنے شوہر کی طرح ایک چلتا پرزہ ہے اور وہ بھی انہی خونی سوداگروں کے ٹولے سے تعلق رکھتی ہو گی۔ وہ رانی شوبھا دیوی کو یہ حقیقت بھی بتا چکے ہوں گے کہ اس کا شوہر ہماری وجہ ہی سے اپنے جانی دشمن جسونت رائے کی قید میں گیا تھا۔''

''لیکن کیا اب تک...... جسونت رائے کی قید میں موجود شنکر چانکیہ زندہ بھی بچا ہو گا؟'' میں نے کہا۔

''اس کے امکانات بہت کم ہیں۔'' طارق نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''اور اگر وہ جسونت رائے کی قید میں بھیانک موت سے دوچار ہو چکا ہو گا تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں رانی شوبھا دیوی کے انتقام کی زد میں آنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔'' روبی نے دور اندیشی سے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

''شوبھا دیوی کیا انتقام لے گی، پہلے تو اسے ممبئی کے ایک بڑے ڈان سے نمٹنا ہو گا۔'' طارق سر جھٹک کر بولا۔

''لگے ہاتھوں یہ مہارانی ہمارا کھاتا بھی کھولے رکھے گی۔'' میں نے ہوشیار کرنا چاہا۔

''ہم تیار ہیں اس کے لیے۔'' روبی بولی۔ ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں مردودوں کا کیا کیا جائے؟''

اس کا اشارہ...... گوہر شاہ اور تاج کی طرف تھا۔

''سردست چوبیس گھنٹے آرام سے کمرے میں ہی گزارو اور خبریں سنتے رہو۔'' طارق نے صائب مشورہ دیا۔

ہم نے ایسا ہی کیا۔ چوبیس گھنٹوں کے دوران میں ہمیں بھارت کے مختلف ٹی وی نیوز چینلز سے بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں، جو ہمارے آئندہ کے لائحہ عمل کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

یہاں تک کہ گوہر شاہ اور تاج کی فزیکل اینڈ ہیلتھ کنڈیشن کا بھی اندازہ ہوا۔

مختلف خبریں سننے کے بعد معلوم ہوا کہ...... گوہر شاہ اور

تاج پرانی کے دشمنوں (ہم) نے پہلے مٹوی ٹھکر چانکیہ کے بار بر ہاؤس والے ٹھکانے پر ہلا بولا، جہاں ان کا تیسرا ساتھی بھولا ناتھ بھی موجود تھا۔ جو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک پرائیویٹ ایمرجنسی اسپتال میں دم توڑ گیا، جبکہ گوہر شاہ اور تاج شدید زخمی ہوئے۔ انہیں دو پرائیویٹ اسپتالوں میں ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد سرکاری اسپتال گنگا رام میں شفٹ کر دیا گیا، جہاں ان دونوں کی کنڈیشن کچھ بہتر معلوم ہوتی تھی، لیکن تاج نامی شخص......کو زیادہ گھاؤ آیا تھا، جس سبب وہ اپنی ''مردانگی'' ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھا ہے۔ اس امر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمنی پرانی اور خاندانی ہے۔

اینکر لائیو بولے جا رہا تھا اور ہم بیٹھے اپنا سر دھن رہے تھے۔

''ڈاکٹر سیف کے حوالے سے اگر دشمنی کی بات کی جائے تو واقعی تاج اور گوہر شاہ سے اس کی دشمنی خاندانی ہی ہوئی۔'' رومی نے جیسے ہولے سے مسکرا کر کہا۔

''دونوں زندہ ہیں اور اب رانی شوبھا دیوی ان کی دیکھ بھال کر رہی ہوگی۔'' طارق نے رومی کے مذاق کو صرف نظر کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''تب ہمیں شوبھا دیوی کے گھر ریڈ کرنا چاہیے۔'' میں بولا۔

''تم کیا پولیس والے ہو؟'' رومی نے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ریڈ سے مراد ہلا بولنا ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ایک ہی بات ہے، لیکن قانون کو بہرحال ہمیں ہاتھ میں نہیں لینا ہے جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی سے ان کے خلاف.... ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔''

''تو پھر تم ایسا کرو کہ این سی بی کے اس آفیسر سے بات کرو اور اسے تازہ صورت حالات سے آگاہ کر دو۔'' طارق نے کہا۔

''میں بھی کروں گی، مگر سیف......'' کہتے ہوئے رومی نے میری جانب دیکھتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ حمیرا اس دوران مسلسل رومی کے چہرے کی طرف تکے جا رہی تھی۔

''میرا کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے اس کی جانب چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ جب سے حمیرا ہمارے ساتھ شامل ہوئی تھی، رومی میرے حوالے سے کچھ زیادہ ہی تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ اسے رقابت کی آگ کچھ زیادہ ہی جھلسانے لگی تھی، پتا نہیں وہ ایسی کیوں ہوتی جا رہی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے بھی اس سچائی کا صدقِ نیت اور دل کے ساتھ اظہار کر چکا ہوں کہ رومی فطرتاً ایک اچھی لڑکی ہے، پر نجانے کیوں حمیرا کے معاملے میں وہ تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ میں بھی آخر کب تک برداشت کر سکتا تھا۔ تاہم طارق کے مشورے پر میں ضبط سے ہی کام لیے ہوئے تھا۔

''نیشنل سینٹرل بیورو کے آفیسر سے تو ہم معاملہ پہلے ہی طے کر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ انہیں اپنے خطوط پر کام کرنے دیا جائے، جیسا کہ ہمارے بیچ پہلے ہی یہ بات طے ہو چکی تھی کہ انہیں اپنے طور پر اور ہمیں اپنے راستے پر کام کرنا ہوگا۔''

''اب اگر محنت ہم کریں اور تیار حلوہ پولیس کے سپرد کرتے رہیں تو اس میں محنت کے ضائع جانے کا بھی اتنا ہی خطرہ ہے، جتنا کہ پولیس کی لمبی چوڑی تفتیش میں ہوتا ہے، یعنی مجرم تب تک اپنی نکاسی کی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ جبکہ اب رانی شوبھا دیوی بھی میدان میں اتر آئی ہے اور ان دونوں کو اس کی آشیرباد بھی حاصل ہو چکی ہے۔''

''مگر این سی بی والوں کے پاس ان کے خلاف ٹھوس ثبوت ہیں۔'' رومی نے اختلاف کرنا چاہا۔

''بے شک، اس سے کیا ہو جاتا ہے؟'' میں نے کہا تو طارق نے کسی متوقع بدمزگی سے بچنے کے لیے درمیان میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ این سی بی والوں کے لیے ہم نے جو کرنا تھا وہ کر چکے، بار بار انہیں چھیڑنا ان سے مدد لینا، جو یقیناً سردست ہمارے کام کی بھی نہ ہوگی، فضول ہی ہے۔ گوہر شاہ اور تاج اس ....وقت زخمی ہیں، حملے کی زد میں ہیں، وہ بڑی صفائی کے ساتھ ''معصومیت'' کا فائدہ اٹھالیں گے، آخر کو ان پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔''

''یہاں ایک بات اور بھی ہے۔'' حمیرا نے کچھ سوچتے ہوئے فوراً کہا۔

''ابھی تک ان لوگوں نے بہ شمول رانی شوبھا دیوی کے ہمارے خلاف پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ یعنی وہ لوگ بھی ہماری طرح پولیس کو اس جنگ میں شامل نہ کرنے کا ارادہ.... رکھے ہوئے ہیں۔''

''میں امکانات سے انکاری نہیں ہوں۔'' رومی نے مسکرا کر کہا۔ مجھے اس کی یہ مسکراہٹ اخلاقاً کم اور طنزیہ زیادہ

محسوس ہوئی۔ وہ حمیرا ہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”لیکن اگر ان لوگوں نے پولیس کو ہمارے پیچھے پہلے لگا دیا تو ہم......“

”یہ بعد کی بات ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اتنا انہیں بھی معلوم ہے کہ پٹی تھری اور ٹی فور جیسی کی ڈیز ہمارے قبضے میں ہیں۔ یہی ترپ کے پتے انہیں قانون سے مدد لینے سے روکے رکھیں گے۔“

”خوش فہمی ہی ہے تمہاری۔“ رومی نے منہ بنایا۔

”دیکھا جائے گا۔“ طارق نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ”ابھی جس بات کا امکان نہیں اس پر بحث فضول ہے۔ میں اور رومی آج ہی شوبھا دیوی کے ٹھکانے پر ایک گوریلا طرز کا آپریشن کریں گے۔“

”میں بھی ساتھ ہوں گا۔“ میں نے کہا۔ طارق نے رضامندی کے انداز میں اپنے کندھے اچکائے۔

”تو حمیرا اکیلی یہاں رہے گی؟“ رومی بولی۔

”یہ بھی ساتھ ہوگی ہمارے۔“ میں نے کہا۔

شوبھا دیوی کی اپنی ذاتی رہائش گاہ کے بارے میں پتا لگانا چنداں مشکل ثابت نہ ہوا۔ میڈیا اور اخباری تبصروں نے اس کی ذاتی عالیشان رہائش گاہ کے بارے میں ذکر کر دیا تھا۔

جس کے مطابق رانی شوبھا دیوی ہاربر ہاؤس کے بجائے اپنی ذاتی رہائش گاہ میں ہی رہنا پسند کرتی تھی، اس کی وجہ یہی بتائی جاتی تھی کہ جب ٹھاکر چانکیہ دوسری شادی کسی سیکنڈ رول بھارتی ایکٹریس سے کرنے والا تھا، (جب ہم نے اس کے شادی والے دن رنگ میں بھنگ ڈالا تھا) تو شوبھا دیوی نے اپنا ٹھکانا مستقل طور پر اپنی ذاتی رہائش گاہ میں ہی بنائے رکھا تھا، جو اس کے ماں باپ کی ملکیت تھی۔

یہ رہائش گاہ جوہو کے گنجان ساحلی علاقے پام ہاؤسز میں واقع تھی۔ ممبئی کا یہ مہنگا علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔

ٹھاکر چانکیہ نے اگرچہ شوبھا دیوی پر سوتن لانے کی غلطی کی تھی، لیکن باوجود اس کے شوبھا دیوی، اپنے ٹھاکر چانکیہ کی زندگی بچانے کے لیے کوشاں تھی، اندر کی بات کیا تھی ان دونوں میاں بیوی کے درمیان یہ تو بعد میں پتا چلتا تاہم اندازہ تھا کہ یہ بھی اپنے شوہر کے اس گھناؤنے کاروبار میں کسی نہ کسی طرح شریک کار رہی ہے۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، شوبھا دیوی کے متعلق رومی نے جو معلومات حاصل کی تھیں، اس کے مطابق...... وہ کسی راجے مہاراجے کی اولاد تھی، لیکن وہ اب قصۂ پارینہ بن چکی، راجدھانی بھی تمام ہوئی اور شوبھا بس نام کی رانی رہ گئی تھی۔ ممکن تھا کہ ٹھاکر چانکیہ سے شادی کے بعد وہ خوش حالی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گوہر شاہ اور تاج کی پشت پناہ کیوں بنتی۔ گویا ہمارے نزدیک اب گوہر شاہ اور تاج یہاں ایک بار پھر تیموں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ یہ ان کے لیے بڑا ذلت کا مقام تھا۔

پاکستان سے راہِ فرار ہونے کے بعد اگرچہ یہاں وہ شاہانہ زندگی گزارنے لگے تھے، لیکن ہم نے یہاں آ کر بھی ان کی زندگی اجیرن کر ڈالی تھی۔ دونوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا اور یہی میرے ان سے دیرینہ انتقام کا شاخسانہ تھا کہ ٹھاکر چانکیہ اور بھولا ناتھ کے بعد ”یتیم“ سے ہو کر رہ گئے تھے۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ شوبھا، ان کے ذریعے جسونت رائے کی قید سے کس طرح اپنے شوہر کو چھڑواتی ہے، بشرطیکہ وہ زندہ ہوتا۔

حاصل کردہ اخباری اطلاعات کے مطابق شوبھا نے جسونت رائے جیسے ایک بڑے ڈان سے ٹکر لے لی تھی اور اس پر اپنے شوہر کے اغوا اور اندیشۂ قتل وغیرہ کا مقدمہ دائر کر رکھا تھا مگر اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھے۔

شوبھا دیوی کی کہانی کچھ گمبھیر معلوم ہوتی تھی، تاہم اب تک امکانات سے جو قیاسات ہم نے قائم کیے تھے، وہ ابھی سیدھے سبھاؤ ہی نظر آتے تھے۔

تھوڑی بحث کے بعد ایک بار پھر اس مہم کے لیے رومی اور مجھے ہی نکلنا پڑا۔ یہ مہم دو ہی افراد کی متقاضی تھی۔

روانہ ہوتے وقت طارق نے ہم دونوں کو آپس میں اُلجھنے اور لڑنے سے باز رکھنے کی یوں تاکید کی تھی جیسے کوئی ماں اپنے دو بچوں کو اسکول بھیجتے وقت...... انہیں آپس میں نہ لڑنے کی نصیحت کرتی ہے۔

ہم ہوٹل سے نکلے اور ٹیکسی کر کے۔ بہادر شاستری روڈ سے ہم جوہو شاہراہ پر آ گئے۔

کوئی لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد ہم پام ہاؤسز پہنچ گئے۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور...... پیدل آگے کی راہ لی۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ خنک ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ٹھنڈ کا احساس غالب تھا۔

ہم دونوں نے موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے پہن

رکھے تھے۔ سردیوں کی آمد ہو چکی تھی۔ موسم البتہ صاف تھا۔ ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے خنک اور قدرے سرد ہوا چل رہی تھی۔

میں نے بلو کلر کی سیاہ ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی اور شرٹ پر براؤن جیکٹ تھی۔ روبی نے ہائی نیک موٹا سوئیٹر اور نیچے سیاہ چست پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر کیپ بھی تھی اُس کے۔

ہم دونوں نے ابھی ریڈی میڈ میک اَپ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی تاہم روبی کی اسپائی کٹ میں سب کچھ ہر وقت موجود رہتا تھا۔

جوہو کے اس علاقے کا پورا نام جوہو چوپاٹی تھا۔ بہت گنجان ہونے کے باوصف پُرسکون محسوس ہوتا تھا، جبکہ پام ہاؤسز ساحل سے کافی ہٹ کر الگ تھلگ گوشے میں واقع تھا۔

اگرچہ یہاں بھی اچھی خاصی چہل پہل، بار، کلب اور ریسٹورنٹس کے علاوہ بینک اور دیگر ہائی اسکائی کاروباری بلڈنگز بھی دیکھنے آتی تھیں۔

ہم دونوں فٹ پاتھ پر جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلے جارہے تھے۔ مارٹی، چمن اور ان کے باقی ماندہ دو ساتھیوں سے ہمیں اب بھی مڈبھیڑ ہونے کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے ہم بظاہر بے پروا انداز میں چلنے کے باوجود اپنے گردوپیش سے بھی چوکنا تھے۔

پام ہاؤسز میں داخل ہونے کے بعد ہم بلاک ڈی کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ یہاں چار کیٹگریز تھیں۔ اے سے لے کر ڈی تک۔ اے اور بی میں چھوٹی بڑی کوٹھیاں دیکھنے میں آتی تھیں مگر سی کا سیکٹر بہتر تھا، وہاں گراؤنڈ پلس کوٹھیاں تھیں۔ اے اور بی کی طرح ساتھ ساتھ بھی نہیں ملی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور اس "فاصلے" میں پارک اور کہیں کلب بنے نظر آتے تھے۔ ڈی اس سے بھی زیادہ شہنشاہی سیکٹر معلوم ہوا۔

وہ سی سے زیادہ کھلا ڈلا اور پُرسکون سیکٹر نظر آیا۔ پام ہاؤسز کا یہ آخری سرا ہونے کی وجہ سے یہاں سے ذرا دور ساحل کا منظر دکھتا تھا۔

"کوٹھی نمبر تیرہ، سیون اسٹریٹ میں ہے۔ ہم اس کے قریب پہنچ چکے ہیں"۔

اردگرد کا بڑے غور سے جائزہ لینے کے دوران چلتے چلتے روبی کی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہم......" میرے منہ سے نکلا پھر بولا۔ "یہاں سکیورٹی کا کوئی خاص نظام دیکھنے میں نہیں آرہا۔ مجھے کھٹک سی ہورہی ہے۔"

"سکیورٹی بس مین گیٹ پر ہی دکھائی دی تھی اور وہ بھی برائے نام۔" وہ بولی۔ "کچھ لوگ اس بلے گلے کو پسند نہیں کرتے۔"

"بہت بچوں والی بات کرنے لگی ہو تم آج کل۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"بھلا ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟ اتنے امیر کبیر لوگ یہاں رہائش پذیر ہیں اور سکیورٹی ہلکی پھلکی رکھیں گے؟ لوگوں کے پاس جتنی دولت ہوتی ہے، انہیں اور زیادہ تحفظ کا احساس ستاتا ہے۔"

"خاصے عقل مند ہو، میں تو تمہارا امتحان لے رہی تھی۔" روبی ہنسی۔ اس وقت وہ بالکل بھی تلخ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"میں نے چند کوٹھیوں میں لگے سی سی کیمرے ہی نہیں بلکہ گدھوں جتنے شکاری کتے بھی دیکھے ہیں۔"

یہ بتاتے ہوئے میری آواز... نجانے ٹھنڈ کے سبب یا پھر اندیشہ ہائے دوردراز کے باعث کانپنے لگی۔

"ہاں! میں بھی یہ دیکھ چکی ہوں۔"

"تو پھر کوٹھی نمبر تیرہ کے ہی نہیں بلکہ اس کے آس پاس کے لوگ بھی سکیورٹی کیمراز میں ہماری مہم جوئی کی ایک ایک جھلک کی مسلسل حرکت پذیری کو دیکھ سکتے ہیں۔"

اس صاحب ثروت لوگوں کی کالونی میں سرگشت کرنے کے لیے ایک پلس پوائنٹ ہمارے پاس تھا کہ یہاں، سب کچھ وہی تھا جو باہر ہوتا ہے۔ یعنی بار، کلب اور ریسٹورنٹ، اسی لیے ہماری "سرگشت" کوئی شک وشبے کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اسٹریٹ سیون کی کوٹھی نمبر تیرہ کا بھی اچھی طرح جائزہ لے ڈالا تھا۔

شام اتر آئی تھی۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں اور بھی لوگ موجود تھے۔ ہم نے گرما گرم کافی کا آرڈر دیا۔

ہم نے دانستہ کونے والی میز کا انتخاب کیا تھا تاکہ نیچی آواز میں باتیں کرسکیں۔

"حیرت ہے، ایسا پوش علاقہ مگر یہاں پارک، کلب، بار، ریسٹورنٹس سب موجود ہیں۔" میں ہولے سے بڑبڑایا۔

"یہ جدید اور ہائی سوسائٹیز کا نیا ٹرینڈ ہے۔" روبی

بولی۔ ''اور انہی کی خواہش پر اس طرز کو اپنایا گیا ہے، تمہیں یہ بھی سن کر حیرت ہوگی کہ یہ سب انہی لوگوں کی ملکیت ہے جو یہاں کے رہائشی ہیں۔''

میں نے اس کی بات پر بھویں اچکا کر تعجبی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ روبی اور طارق انٹرنیٹ کا کیڑا تھے جانے کہاں کہاں سے معلومات کھودا کرتے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ نیٹ پر بیٹھنے والا ہر کوئی اس قدر گہرائی میں جا کر ''کھدائی'' (سرچ) کر سکے۔ یہ کام کچھ ماہر ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ نیٹ پر.... سرچ کر کے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنا بھی ایک فن ہے۔

''اندر کیسے داخل ہوا جائے؟'' میں نے مطلب کی بات کر ڈالی۔ اس دوران ویٹر کافی رکھ چکا تھا۔

''ششش......'' روبی نے ہولے سے کہا۔ کیونکہ اس وقت ایک بڑے سائز کا ویٹر ہمارے قریب سے گزرتے ایک دوسرے ویٹر کو ہدایات دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میڈم۔کی کال آئی تھی، سامان لے کر فوراً ان کی کوٹھی کی تیرہ پہنچو۔ تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔''

وہ موٹا سا آدمی شاید ہیڈ ویٹر تھا۔ چھوٹے ویٹر نے فدویانہ انداز میں سر کو جنبش دی تھی۔ یہ وہی ویٹر تھا جو ہمیں سرو کر رہا تھا۔

میڈم اور کوٹھی کے نمبر پر ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ روبی اور میں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

وہ ویٹر کافی کے خالی برتن اٹھانے کے لیے جب دوبارہ ہماری میز پر آیا تو...... روبی نے اس سے نرم مسکراہٹ تلے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''جی، شنکر نام ہے میرا۔'' اس نے بھی خوش اخلاقی سے بتایا۔ روبی نے بل کے علاوہ اسے ایک بھاری ٹپ سے نوازدیا۔ نرم میٹھی مسکراہٹ اور بھاری ٹپ نے اس کی باچھیں ہی نہیں بلکہ منہ بھی کھول دیا۔

''کیا آج رات میڈم شوبھا دیوی کے ہاں کوئی ڈنر پارٹی ہے؟''

''پارٹی شارٹی تو نہیں ہے۔ البتہ ہر روز رات میں کھانے پینے کا سامان انہی کے ریسٹورنٹ سے ہی جاتا ہے۔ شاید وہاں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''کیا یہ ریسٹورنٹ میڈم کی ملکیت ہے؟'' روبی نے پوچھا۔

''جی ہاں!''

''اچھا، مہمان زیادہ ہوں گے نا۔'' روبی نے چالاکی سے کہا۔ تاکہ اس کا جواب ویٹر اپنی مرضی سے دے اور اسے کسی قسم کا شک بھی نہ ہو۔

''ہاں جی، بس دو ہی ہوں گے، جو مستقل آباد ہیں، باقی چند لوگ تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔''

''او......آئی سی۔'' روبی نے مسکرا کر کہا اور خاموش ہو گئی۔ ویٹر سلام کر کے چلا گیا۔

''رانی شوبھا شاید اپنے ذاتی باورچی پر زیادہ بوجھ نہیں دینا چاہتی ہوگی، مگر وہ مہمان گوہر شاہ اور تاج کے سوا کوئی نہیں ہو سکتے۔'' میں نے کہا۔

''اور چند آتے جاتے لوگوں میں مارٹی اور چرن ہی ہو سکتے ہیں۔'' روبی بولی۔

''شنکر کو تختۂ مشق بنا کر اندر داخل ہونا آسان ہو سکتا ہے ہمارے لیے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''ہم......'' روبی سوچنے لگی۔ بل دے چکے تھے، زیادہ دیر بیٹھے رہنا مناسب نہ تھا، کوئی بھی شک میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

جب..... ہم جان بوجھ کر سست روی سے اٹھ کر ریسٹورنٹ سے باہر نکلنے لگے۔ شنکر کو ہم نے دو بڑے ڈبل باکس اٹھائے، ایک اسکوٹر ٹائپ بائیک پر سوار ہوتے دیکھا، اس کے جسم پر مخصوص ویٹروں والی وردی تھی۔

''مجھے پتا ہے یہ کہاں سے گھوم کر کوٹھی نمبر تیرہ کی طرف جائے گا، جلدی آؤ۔'' روبی بولی اور دائیں جانب بنے ایک گلی نما راستے میں داخل ہوگئی۔

''تم اِدھر کھڑے رہو......'' گلی کے اگلے سرے پر رک کر روبی نے مجھے روکا اور خود محتاط ہو کے سرے والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی ہوگئی۔ یہ کام اسی کے اکیلے کرنے کا تھا اور مجھے گرد و پیش پر کڑی نظر رکھنے کے لیے یہاں کھڑے رہنے کی ہدایت کی۔

روبی نے اپنے چہرے پر ماسک چڑھا لیا تھا، اب وہ ایک اسٹریٹ اسنیچر معلوم ہو رہی تھی۔ بائیک کی آواز قریب آ رہی تھی۔ گلی سنسان تھی۔

بائیک جیسے ہی اس کے بیچ میں آئی، اس نے ام چھل کر اس پر جست بھری، شنکر بائیک سمیت گلی کی اندرونی سمت گرا،

روبی نے اس کے سر پر ایک اور کرانے کا مخصوص وار کیا۔ شکر بے ہوش ہوگیا۔

میں تیزی سے قریب پہنچا۔

''جلدی کرو، اس کی وردی اتار کر پہنو۔'' روبی نے مجھ سے کہا اور دوسری جانب منہ کر کے کھڑی ہوگئی۔ میں نے چند منٹوں میں ہی یہ کام کر ڈالا۔

وردی کیا تھی، بس ایک واسکٹ اور ٹوپی ہی تھی۔ وہ پہن لی، تب تک روبی نائلون کی ڈوری سے اس کی مشکیں کس چکی تھی اور منہ میں کپڑے کا ایک گولا بھی بنا کر ٹھونس دیا۔

''کیا مجھے اکیلا جانا ہوگا اندر؟'' میں نے روبی سے پوچھا۔

''جان کیوں نکل رہی ہے تمہاری؟ میں بھی ہوں گی تمہارے ساتھ۔'' روبی چڑ کر بولی۔ ''مگر بعد میں......''

''یونہی پوچھا ہے کاٹ کیوں رہی ہو۔'' میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''چلو اب...... آگے بڑھو۔'' وہ بولی۔

ہم گلی سے باہر آگئے۔ کوٹھی سی تیرہ قریب تھی، بائیک بھی ہم نے شکر دیٹر کی ہی اٹھائی تھی۔ اگلے تین بلاک چھوڑ کر مطلوبہ کوٹھی سے ایک گلی پہلے میں نے روبی کو اس کے کہنے کے مطابق اتار دیا۔

بائیک سے مین گیٹ پر پہنچا تو وہاں ایک مسلح دربان نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔

اس نے بائیک روکنے کا اشارہ دیا، ورنہ میں سمجھا تھا شاید میری بائیک اور جسم پر پہنی ہوئی وردی دیکھ کر وہ فوراً گیٹ کھول دے گا۔

''کون ہو تم؟ شکر کیوں نہیں آیا۔'' بڑی مونچھوں اور اچھے خاصے ڈیل ڈول والے محافظ نے یوں کڑک دار لہجے میں پوچھا جیسے...... یہاں چوکیداری پر مامور نہ ہو بلکہ تھانیدار ہو۔

''شکر کی آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس کی جگہ میں آ گیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میڈم کے ریسٹورنٹ میں تو میں بھی آتا جاتا ہوں، کبھی تمہیں تو وہاں میں نے نہیں دیکھا؟'' اس نے بہ غور میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ مجھے چوکیدار کے ان ''عقلمندانہ'' سوالات کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''وہ تو اس نہیں آتا تو...... یہ سامان تم ہی اندر لے جاؤ، مجھے ویسے بھی واپس جانے کی جلدی ہے۔ اندر گیا تو میڈم نجانے کتنے کاموں سے لگا دیں۔'' کہتے ہوئے آخر میں، میں نے لہجے میں بیزاری سمونے کی کوشش چاہی تھی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔'' چوکیدار نے ایک ہاتھ سے اپنی مونچھ کو تاؤ دیا، جیسے میری چالاکی پکڑ کر اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔

''بائیک یہیں کھڑی کرو اور اندر یہ باکس لے جاؤ۔''

''اچھا۔'' میں نے دانستہ مرے مرے لہجے میں کہا اور اسکوٹر سے اتر کر اسے سائڈ اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور کیریئر سے باکس اتار کے ہاتھ میں پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔

دل ہی دل میں اپنی چالاکی پر خوش بھی ہو رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک اور تگڑا سا اور کرخت چہرے والا آدمی مجھ سے ٹکرایا۔

شکر تھا کہ اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور مجھے ایک جانب جانے کا اشارہ کر دیا۔ وسیع و عریض لاؤنج سے گزر کر میں اشارے سے بتائی ہوئی راہداری کی جانب بڑھنے لگا۔

میرے دائیں جانب خوب صورت ڈیزائن کا زینہ بھی اوپری منزل کو جاتا نظر آیا۔

راہداری میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک چست پینٹ شرٹ میں ملبوس درمیانی عمر کی لڑکی میرے سامنے راستہ روک کے کھڑی ہوگئی۔ اس نے بھی مجھے کچھ ایسی ہی نگاہوں سے دیکھا جیسے معمول کے آئے ہوئے شخص کے بجائے کسی اجنبی کو دیکھ لیا جائے۔

''شکر نہیں آیا؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ آواز البتہ مترنم سی تھی۔

''جی نہیں، اس کی طبیعت آج خراب تھی۔''

''تمہارا کیا نام ہے؟''

''پپو۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور پلٹی، میں اس کے پیچھے ہولیا۔ چند قدموں کے بعد ہی وہ ایک دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوگئی اور میں بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

ٹھیک اسی وقت میری گردن سے سرد نال آن لگی اور ساتھ ہی ایک بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔

''خبردار......! باکس رکھ دو اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔''

**ان دیکھی دشمنی کے جال میں جکڑے**
**نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں**

**ہر رنگ میں وا ہو جانا**

**روبینہ رشید** ایک بہترین قلم کار ہیں... کرداروں کی بنت... مکالمہ نگاری اور داستان گوئی میں مہارت رکھتی ہیں۔ ان کا دلچسپ انداز قاری کو ان کی تحریر سے جوڑے رکھتا ہے... انسانی نفسیات کو بھی خوب سمجھتی ہیں... خصوصاً نسائی شعور ان کے اندر پورے رچاؤ کے ساتھ موجود ہے۔ رونما ہونے والی صورت حال پر اپنی ایک رائے رکھتی ہیں... احتجاج کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں گردوپیش کا گہرا مشاہدہ اور ذاتی تجربے کی شدت بھی بخوبی محسوس ہوتی ہے...

# پلینٹ ڈبلیو

موت کا سیارہ... دو سورج والی بستی... جہاں ایک پُراسرار طاقت کی حکمرانی تھی... وہاں جانے والے اگلے دن کا سویرا نہیں دیکھ پاتے تھے... ناگہانی اور خوفناک اموات کا سلسلہ جاری تھا... جن کے بارے میں جاننا اور سمجھنا نہایت مشکل تھا... ایک پُرتحیر... تیز رفتار اور حیران کن ایڈونچر... ایک دلچسپ سائنس فکشن مستقبل کی کہانی... جب نئی زمینوں کی تلاش زندگی کے لیے ناگزیر ٹھہرے گی...

*گولڈن جوبلی کے خاص شمارے کے لیے ایک انوکھی اور منفرد کہانی......*

20 جنوری 2035ء

وقت شام 5 بجے...

انہیں اس نئے سیارے میں قدم رکھے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔

وہ اسپیس شپ ہیڈ کوارٹر کے تجربے کار سائنس داں تھے۔ نئے سیاروں کی کھوج اور ریسرچ ان کا شعبہ تھا۔ انہیں یہاں اسی کام کے لیے اتارا گیا تھا۔ اب تک وہ کئی حیران کن جانوروں، مٹی، پانی اور مختلف چیزوں کو اپنے جدید ایکمرز میں ریکارڈ کر چکے تھے۔ یہاں کے بارے میں ڈرونز اور روبوٹس کی ابتدائی معلومات بالکل صحیح ثابت ہو رہی تھیں۔ سیارے کی آب و ہوا انسانوں کے لیے موافق تھی۔ تازہ آکسیجن جس کے لیے خلا کے باسی ترستے تھے یہاں وافر مقدار میں موجود تھی۔ جھیلیں، پہاڑ اور جنگلوں سے بھرا یہ سیارہ انہیں جنت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

"بیٹر، پشا، جوزف، کچھ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں

یہاں رک کر کچھ آرام کرلینا چاہیے۔'' ڈاکٹر اجمل احمد جوان سب میں سینئر تھا اس نے چاروں جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ اس وقت درختوں کے قریب ایک میدان نما جگہ پر کھڑے تھے۔

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا سر۔'' سنہرے بالوں والے پیٹر نے جواب دیا۔

اجمل نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس کی ڈبیا جیسی ایک ڈبی نکالی اور اس میں موجود چپ کو دبایا...... یہ ان کے خیمے تھے جوان سب کی جیبوں میں موجود تھے، اسے کھولنے اور اس میں موجود چپ کو دبانے سے یہ ایک شخص کے لیے موزوں خیمے میں بدل جاتے تھے۔ انہیں خیمے کھڑے کرنے اور اپنا بیڈ پیک تیار کرنے میں چند لمحے ہی لگے تھے۔ اس کے بعد وہ باہر آگئے۔ چاروں جانب اب اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔

''یہ درخت نہ جانے کتنے سو سال پرانے ہیں، ان کے تنے ہی اس قدر چوڑے ہیں بالکل گارڈ زیلا درخت لگتے ہیں۔'' یوشا نے قریب موجود درخت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے اور اس کی بلندی بھی بیس منزلہ عمارت سے کم محسوس نہیں ہو رہی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اس سیارے کو ہمارے ریڈار پر آنے میں اتنی دیر کیسے لگی؟'' جوزف نے سرہلایا۔

''یہ جگہ بہترین ہے...... بغیر آکوسیٹر (سانس لینے میں مددگار آکسیجن ماسک) کے، ایسی ہوا میں سانس لینا میرا خواب تھا۔

''ارے یہ پیٹر کہاں گیا؟'' یوشا نے اچانک پوچھا۔

''کہاں ہے پیٹر......'' اجمل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چیکنگ میٹر کا استعمال کرتے انہیں وہ جنگل سے باہر آتا نظر آیا...... اس کے ہاتھوں میں سوکھی لکڑیوں کا گٹھا تھا۔

''کہاں گئے تھے تم؟'' اجمل نے اسے سختی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''اور وہ بھی بغیر رپورٹ کیے...... کیا تم اصول بھول گئے ہو؟''

''میری معذرت۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔ ''میں اصل میں

یہ لکڑیاں جمع کر رہا تھا۔" وہ تمام لکڑیاں زمین پر رکھتے ہوئے بولا۔ "فضا میں خنکی بڑھتی جا رہی ہے کیوں نہ یوں فائر کا مزہ لیا جائے، گرمائش اور حفاظت دونوں کے لیے ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

"ناٹ اے بیڈ آئیڈیا۔" اجمل نے جواب دیا۔ "مگر قواعد پر پورا عمل درآمد ہونا چاہیے۔"

"یس سر...... میری غلطی ہے خیال رکھوں گا۔" اس نے لکڑیوں کو ایک ترتیب میں رکھا۔ لیزر لائٹر کی پہلی کلچ کے بعد ہی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

وہ پانچوں اس کے اردگرد نیم دراز ہوئے ہی تھے کہ دھمک کی کان پھاڑ دینے والی تیز آواز نے انہیں دہلا دیا۔ یہ ایک عجیب دہشت زدہ کر دینے والی آواز تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا مگر انہیں حرکت کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ ان پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

☆☆☆

قدرت کے پاس سرپرائز کی بھرمار ہوتی ہے۔

جب آپ یہ سمجھ کر مطمئن ہوتے ہیں کہ اب آپ کافی کچھ جان گئے ہیں تب ہی کچھ ایسا ہوتا ہے جو آپ کو یہ احساس دلاتا ہے کہ پکچر ابھی ختم نہیں ہوئی میرے دوست......

ڈاکٹر شہباز عمران اس وقت ٹیری اریم میں تھا۔ یہ اسپیس شپ ہیڈ کوارٹر کا واحد حصہ تھا جہاں درخت، پودے، جھرنا گویا قدرت کا لینڈ اسکیپ تیار کیا گیا تھا، یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ایک چھوٹے سے پودے کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ پودا ایک ہفتہ قبل تقریباً مر گیا تھا۔ کسی احمق نے اس پر ایک کیمیکل گرا دیا تھا جس سے وہ جل گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دوبارہ ہرا بھرا ہونا ناممکن ہے پھر بھی وہ ہفتہ بھر سے اس کی نگہداشت کر رہا تھا۔ اب جبکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسے اس گملے میں کچھ اور لگا دینا چاہیے اس جلے ہوئے پودے میں سے ایک ننھا منا سا نیا پتا پھوٹ پڑا تھا۔ وہ قدرت کے اس کرشمے پر مسکرایا۔

اسی وقت اسے اپنے عقب میں دروازہ کھسکنے اور پھر سرسراہٹ کی آواز محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا ایک خوبصورت خاتون اپنی نیلی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"ہیلو مارتھا! کیسی ہو تم؟ میری یاد کیسے آ گئی......؟"

"ڈاکٹر شہباز عمران...... پلیز میٹنگ روم اے میں رپورٹ کریں۔" اس کے خوب صورت لب ہلے اور برآمد ہونے والی مشینی آواز شہباز کی سماعت سے ٹکرائی۔ مارتھا رابطاتی روبوٹ تھی۔

"اوکے۔" شہباز نے جواب دیا اور اپنے ایکوپمنٹ سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ "مارتھا میں آ رہا ہوں، تم جا سکتی ہو۔" اس کے جواب پر مارتھا مڑی اور ٹیری اریم سے باہر نکل گئی۔

شہباز نے سامان اپنے ورکنگ اسٹیشن پر رکھا، ہلکی سی انگڑائی لی اور ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ ٹیری اریم سے نکلتے ہی فضا کی تبدیلی کا احساس ہوتا تھا۔ اسپیس شپ ہیڈ آفس میں وہ واحد جگہ تھی جہاں آکسیجن کا تناسب سب سے زیادہ تھا۔

"اسپیس شپ ہیڈ آفس کسی چھوٹے شہر سے زیادہ طویل و عریض تھا، وقت اور ضرورت کے مطابق اس میں مزید وسعت ہوتی رہتی تھی۔ یہیں سے تمام سیاروں پر نظر رکھی جاتی اور ان پر تحقیق کا کام کیا جاتا تھا۔ یوں ابتدا ہی سے زمین سے خلا میں جانے والے رؤسا، اعلیٰ ترین حکومتی عہدے دار، پہلی صف کے سائنس دان، تاجر حکمران سیارے ٹائی ٹن کے باسی تھے۔ وہ سیارہ امیر ترین اور طاقتور افراد کے لیے مخصوص تھا۔ اسپیس شپ کی ہائی کمان کی رہائش گاہ بھی وہی تھی مگر ہیڈ آفس گویا خلا میں زندگی کا دارالخلافہ تھا۔

شہباز کوریڈور سے نکل کر آگے بڑھا اور میٹنگ روم اے میں داخل ہو گیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میٹنگ روم بالکل خالی تھا۔ مختلف مشینوں کی ہلکی سی بیپ کے علاوہ وہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ درمیان میں موجود لمبی سی میز کے گرد بارہ کرسیاں موجود تھیں۔ اس کا بیٹھنے کا موڈ نہیں تھا۔ اس لیے وہ ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلا۔ اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر شہباز مسکرایا۔ وہ لیلیٰ تھی۔ لیلیٰ اس اسپیس شپ ہیڈ آفس میں اس کی واحد دوست تھی۔ اس کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی شہباز کی طرح سیارہ زمین میں ایشیا کے مقام سے تھا۔ زمین پر وسائل کی کمی اور تباہی کے بعد جب سائنس دانوں نے خلا میں انسانوں کے لیے پناہ اور گھر ڈھونڈنے شروع کیے تب سے لوگوں کی پہچان ہی بدلتی چلی گئی۔ زمین پر زندگی برسوں پہلے معدوم ہو چکی تھی۔ وہاں موجود تابکاری کو ختم ہونے کے لیے ابھی بہت وقت درکار تھا۔ اس وقت خلا میں سو سے زائد سیارے دریافت ہو چکے تھے۔ جہاں زندگی ممکن تھی، ان میں سے ستر میں انسان بس رہے تھے۔ باقی میں وہاں کی مقامی آبادی موجود تھی جن میں سے اکثر کو وہاں انسان کی آمد نہایت ناگوار گزری تھی اور وہ انہیں روکنے کے لیے کچھ بھی

کرنے کو تیار تھے۔ یوں زمین والی داستان کاری میک یہاں بھی شروع ہو چکا تھا مگر فی الحال سب کچھ قابو میں تھا۔ اب سب لوگ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ویسے بھی پیدائش سے قبل ہی جینیٹک انجینئرنگ اور پھر ایک چپ کے ذریعے انسانی دماغ کو اس قابل بنا دیا گیا تھا کہ وہ ہر زبان کو نہ صرف سمجھ سکتے تھے بلکہ بول بھی سکتے تھے اس کے علاوہ بغیر بولے بھی دماغی طاقت کے ذریعے پیغام بھیج سکتے تھے۔

لیلیٰ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک لمبا چوڑا شخص بھی موجود تھا۔ اس کی رنگت گہری سیاہ تھی اور سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں ذہانت سے بھرپور تھیں۔ وہ شہباز کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ لیلیٰ کے مانند اس نے بھی سرخ یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس کے سینے پر موجود ستارے اس کے رینک کو واضح کر رہے تھے۔ شہباز کے سامنے ایک ایڈمرل کھڑا تھا۔ اس نے سیلیوٹ کے لیے ہاتھ بلند کیا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایڈمرل نے مسکرا کر اسے روک دیا۔

شہباز بھی جواباً مسکرایا، اسے یہ شخص پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔

''ڈاکٹر شہباز عمران......'' لیلیٰ نے تعارف کی رسم انجام دی۔ ''میں تمھیں ایڈمرل سکندر شاہ سے ملوانا چاہ رہی تھی۔''

''مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی سر......'' شہباز نے مصافحہ کے بعد کہا۔ ''کیا میں جان سکتا ہوں کہ میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟''

''میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکرایا تو اس کے سفید دانت چمک اٹھے۔ ''لیلیٰ کو صورتِ حال کے بارے میں معلومات دی گئی تھیں اور اس نے اس اہم کام کے لیے تمہارا نام تجویز کیا ہے، تم سے ملنے کے بعد مجھے بھی لگ رہا ہے کہ تم اس کام کے لیے موزوں ہو۔''

''اگر مس لیلیٰ نے مجھے ری کمنڈ (سفارش) کیا ہے تو یقیناً کچھ سوچ کر کیا ہوگا، میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔'' شہباز، لیلیٰ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''گڈ...... کیوں نا ہم بیٹھ کر بات کریں۔'' ایڈمرل نے کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔

''جی بالکل۔'' شہباز نے قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ دو لمحوں بعد وہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''ڈاکٹر شہباز...... ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، اصل میں ایک نیا سیارہ کلاسیفائی کیا گیا ہے اور ہماری ٹیم قاعدے کے مطابق وہاں موجود زندگی، آب و ہوا وغیرہ کو کیٹلاگ کرنے کے لیے سیارے پر بھیجی گئی تھی۔''

''تو کیا وہ کامیاب نہیں ہوئے؟'' شہباز نے توجہ سے پوچھا۔

''ایک طرح سے کہہ سکتے ہیں۔'' ایڈمرل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے دن بھر میں کافی کام کیا مگر شام تک وہ سب مارے گئے۔''

''پوری ٹیم......؟'' شہباز نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں پانچوں افراد مارے گئے۔ کوئی بھی بچ نہیں پایا۔'' وہ بولا۔ ''اس طرح ایک ساتھ پوری ٹیم کا مارا جانا پریشانی اور دکھ کی بات ہے مگر جس طرح ان کی موت واقع ہوئی ہے وہ اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات ہے۔''

شہباز نے ایک نظر لیلیٰ کے چہرے پر ڈالی، اس کی آنکھوں میں بھی پریشانی اور الجھن ہویدا تھی۔ ''ان کی موت کیسے ہوئی؟ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں؟''

ایڈمرل نے اس کے جواب میں لیلیٰ کی جانب دیکھا۔ اس نے سامنے موجود ٹیبلیٹ کے کچھ بٹن دبائے اور پھر اسے شہباز کی جانب سرکا دیا۔

''وہ پانچوں کچلے گئے تھے۔'' ایڈمرل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ان کی موت فوری طور پر واقع ہو گئی تھی۔''

شہباز نے ٹیبلیٹ میں موجود تصاویر پر نظر ڈالی۔ ایک لمحے کو وہ بھی لرز سا گیا۔ لاشوں کا کچومر سا نکلا ہوا تھا۔ ان سب کی آنکھیں اوپر کی جانب اور دہشت سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ شہباز نے زوم کر کے منظر پر دوبارہ نظر ڈالی۔ ان کے پاس ہتھیار تیار حالت میں موجود تھے۔ انہیں غالباً ہتھیار اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

''یہ کیسے ہوا؟'' اس نے ایڈمرل کی جانب دیکھا۔

''ہمیں اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔'' ایڈمرل نے جواب دیا۔

''یعنی...... اس کا مطلب ہے کہ اس معاملے میں انوسٹی گیشن نہیں کی گئی؟'' شہباز نے حیرت سے پوچھا۔

''ہوئی تھی......'' ایڈمرل نے جواب دیا اور لیلیٰ کی جانب دیکھا جس نے دوسرا ٹیبلیٹ شہباز کی جانب سرکا دیا

تھا۔

"یعنی انہیں کچھ نہیں مل سکا۔" شہباز نے ٹیبلٹ کو اٹھائے بغیر پوچھا۔

ایڈمرل اس سوال پر چند لمحے خاموش رہا پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس معاملے کی جانچ پڑتال کے لیے دس سپاہیوں کی ٹیم بھیجی تھی مگر وہ سب بھی اگلی صبح مردہ پائے گئے۔ انہیں بھی اسی طرح مارا گیا تھا، تم ان تصویروں میں دیکھ سکتے ہو۔"

شہباز کو اندازہ تھا کہ ٹیبلٹ میں موجود تصاویر میں کیا ہوگا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے اس پر نظر دوڑائی مگر گہری سانس لیتے ہوئے ٹیبلٹ میز پر رکھ دیا۔

"دوبارہ؟ بالکل اسی طرح...... حالانکہ انہیں حالات کا علم تھا یعنی وہ الرٹ تھے...... میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔" وہ بولا۔

"یہی مسئلہ ہے، ہم بھی سمجھ نہیں پا رہے مگر یقیناً اس کی کچھ نہ کچھ تفصیل اور تاویل موجود ہوگی...... ہمیں اس معمے کا حل چاہیے اور میرا خیال ہے کہ اس کے لیے بہترین انتخاب میرے سامنے ہے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹکائے، اس کی آنکھیں شہباز پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا مطلب......" شہباز ٹپٹا کر بولا۔ "کیا آپ میرے متعلق سوچ رہے ہیں؟"

"ہاں...... بالکل......" ایڈمرل نے سادگی سے کہا۔ "جب لیفٹیننٹ لیلیٰ نے تمہارا ذکر کیا تھا، میں اس وقت اس انتخاب پر مکمل طور پر مطمئن نہیں تھا مگر جب میں نے تمہاری کوالی فکیشن دیکھی تو میرے دل نے کہا کہ تم کر سکتے ہو اور تم سے ملاقات کے بعد مجھے یقین ہے کہ تم ہی بہتر انتخاب ہو۔"

"میں نے زولوجی اور بوٹنی میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔"

"میں جانتا ہوں، مجھے لیلیٰ نے تمہاری خصوصی صلاحیتوں کے بارے میں بتایا ہے، تم جینیاتی طور پر نہ صرف بہت تیز دوڑ سکتے ہو بلکہ تمہاری قوتِ سماعت عام افراد کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے تمہاری قوتِ فیصلہ چیزوں اور حالات کو سمجھنے کی طاقت سپر سے اوپر ہے۔ ڈاکٹر شہباز عمران ہم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ تمہاری صلاحیتیں، علم اور ذہانت اس نئے سیارے کے حوالے سے اس معمے کو حل کر سکتی ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہاں وہ کیا چیز ہے جو ہمارے لوگوں کو اس بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ میں ایک زندگی بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"میں آپ دونوں کا مشکور ہوں۔" شہباز نے 'ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو' والے تاثرات آنکھوں میں بھر کر لیلیٰ کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "میں زولوجی اور بوٹنی کا ماہر ہوں سراغ رساں نہیں ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے شہباز، مجھے یقین ہے کہ کوئی مجرم اتنے سارے افراد کو بیک وقت اس طرح نہیں مار سکتا۔"

"یہ تو درست ہے، مجھے بھی یقین ہے کہ یہ کسی جانور وغیرہ کی کارروائی بھی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" ایڈمرل نے اسے گھورا۔

"بڑے جانور اپنے شکار سے پیٹ بھرتے ہیں۔ ان تصویروں میں زخم ہیں مگر کہیں بھی کوئی ایسے شواہد نظر نہیں آئے جس سے یہ اندازہ ہو کہ انہیں کھانے کی کوشش کی گئی ہے...... کیا ایسا کوئی ثبوت ملا ہے؟"

"نہیں۔" ایڈمرل نے جواب دیا۔

"کیا کسی نے اس حوالے سے کششِ ثقل کی اینوملی پر غور کیا ہے؟"

"یہ ممکن نہیں، وہاں اس دائرے میں اوپر ایک شٹل مستقل موجود رہی تھی اگر کششِ ثقل کا مسئلہ ہوتا تو اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ وہاں موجود سینسرز اس حوالے سے پورا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ وہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" شہباز نے بالآخر پوچھا۔

"ہم وہاں ایک اور ٹیم بھیجنا چاہتے ہیں جن میں کچھ سپاہی اور کچھ سائنس داں شامل ہوں گے۔ تم اس ٹیم کو لیڈ کرو گے...... کیا کہتے ہو تم؟"

شہباز نے پہلے لیلیٰ کی طرف دیکھا پھر ایڈمرل کی جانب مڑا۔ یہ ایک بہت بڑا موقع تھا۔ ٹیم کی سربراہی ایک بڑی ذمے داری اور اعزاز تھا۔ شہباز نے تشکر بھرے انداز میں ایڈمرل کو دیکھا اور پھر متانت سے بولا۔

"مجھے افسوس ہے مگر میں اس مشن کی ذمے داری نہیں لے سکتا۔"

میٹنگ روم میں چند لمحوں کے لیے سکوت سا طاری ہو گیا تھا۔ ایڈمرل نے لیلیٰ کو دیکھا جس نے مایوسی سے گردن ہلا دی، پھر وہ شہباز کی جانب متوجہ ہوا۔

"کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں ڈاکٹر؟"

"اس کی کئی وجوہات ہیں، کچھ تو سادہ سی ہیں اور کچھ سمجھنا مشکل ہے۔"

"تم کوشش کرو میں سمجھ لوں گا۔"
"پہلی وجہ تو میری یہاں کی ذمے داریاں ہیں، ٹیری اریم میں بہت ساری زندگیوں کو بھرپور توجہ درکار ہوتی ہے۔"
"تم اس طرف سے فکرمند نہ ہو، تم اپنی ٹیم پر مکمل بھروسا کرسکتے ہو۔" لیلیٰ مسکرائی۔
"دوسری وجہ زیادہ توجہ مانگتی ہے، ہوسکتا ہے کہ میری بات آپ کو پسند نہ آئے۔" وہ ہچکچا کر بولا۔
"تم کھل کر بات کرو شہباز......" ایڈمرل کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"آپ پہلے ہی ایک ٹیم بھیج چکے ہیں۔ انہیں خطرے کا علم تھا مگر پھر بھی وہ خود کو نہیں بچا سکے۔ اب دوبارہ ویسی ہی ایک اور ٹیم بھیجنا غلطی کو دہرانے کے مترادف ہوگا۔ اب آپ کو ایک بالکل مختلف طریقے کار اختیار کرنا چاہیے۔"
"دلچسپ......" ایڈمرل ایک لمحے بعد بولا۔ "تمہارے خیال میں وہ طریقہ کار کیا ہونا چاہیے، اس ٹیم کے پاس کیا صلاحیتیں ہونی چاہئیں؟"
"مجھے ٹیم پر اعتراض ہے......" شہباز بولا۔ "میں کسی ٹیم کی سربراہی نہیں کرنا چاہتا، میں آپ کے لیے کام کرسکتا ہوں مگر میں وہاں اکیلا جاؤں گا۔"
شہباز کے اس جملے پر ایڈمرل اور لیلیٰ دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئیں، مسکراہٹ ان کے چہرے سے غائب ہوگئی۔
"اکیلے......تم مذاق کررہے ہو؟" بالآخر ایڈمرل نے پوچھا۔
"نہیں...... میں سنجیدہ ہوں، میں اپنے طریقے سے کام کرنا پسند کروں گا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں دوسروں کو سنبھالنا یا بچانا بھی خودکشی کے مترادف ہوتا ہے۔" شہباز نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو میری یہ بات ماننا ہوگی۔ میں یہ کرسکتا ہوں اور میرے پروفائل سے آپ نے یہ سمجھ بھی لیا ہوگا۔ میری جینیاتی صلاحیتیں مجھے خبردار کرسکتی ہیں مگر میں دوسروں تک وہ سگنل پہنچا پاؤں اس کا وقت وہاں ملنا ممکن نہیں ہے۔"
"اوکے ڈاکٹر شہباز......" ایڈمرل چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد بولا۔ "میں ہائی کمان سے اس حوالے سے بات کروں گا۔"
"اوکے سر......کیا میں جاسکتا ہوں؟"
"ہاں ابھی کے لیے تم جاسکتے ہو...... ہائی کمان کے فیصلے کے بعد تم سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔" وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔
شہباز دروازے تک پہنچا اس دوران ان دونوں نے اس کے پروپوزل پر گفتگو کرنا شروع کردی تھی۔ وہ اگرچہ سرگوشی میں بات کررہے تھے مگر شہباز ان کی گفتگو کو مکمل طور پر سن پارہا تھا۔ اپنے نام کی گردان سن کر وہ مسکرایا اور پھر تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

شہباز ٹیری اریم میں پودوں کو اپنا خصوصی فرٹیلائزر بیث ڈال رہا تھا۔ کیمیکل سے متاثرہ پودے میں دو دن میں ایک اور پتا نکل آیا تھا۔
"واہ تم تو بہت اچھا پرفارم کررہے ہو یار......کیمیکل باتھ کے بعد خود کو بچالینا ہی ہمت ہے، میں تمہیں اپنا بہترین فرٹیلائزر دے رہا ہوں مگر اصل کام تو تمہیں خود ہی کرنا ہے یعنی بڑھنا......" وہ پودے کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔
وہاں موجود تمام ہی پودے، درخت اس کے دل کے قریب تھے مگر یہ ننھا پودا اسے خاص پیارا تھا۔ اس کے لیے یہ سب اس کا شوق بھی تھا اور اس کا خاندان بھی، ماں باپ سے وہ کم سنی میں ہی محروم ہوگیا تھا۔ اس کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا یوں تنہائی اس کی مجبوری اور پھر عادت بنتی چلی گئی۔
"چلو بھئی اب اجازت، آج کافی کام نمٹانے ہیں۔"
وہ گملے کو اس کی مخصوص جگہ پر رکھ کر ہاتھ جھٹکتا ہوا اٹھا اور پھر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔
ٹیری اریم کے شیشے کی دیوار کی دوسری جانب قدرے دور اسے ایڈمرل اور لیلیٰ آتے نظر آرہے تھے۔ وہ ان کے استقبال کے لیے ٹیری اریم سے باہر نکل آیا۔ ایڈمرل اسے منتظر دیکھ کر مسکرایا۔
"نیوز فار یو ینگ مین......" وہ مصافحہ کرتے ہوئے پُرجوش لہجے میں بولا۔ "تمہیں مشن مل گیا ہے اور وہ بھی تمہاری اپنی شرائط پر...... اب تم بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"
"میں نے ان تمام چیزوں کی لسٹ تیار کرلی ہے جو مجھے وہاں درکار ہوسکتی ہیں اور یہ تمام چیزیں دو بیگز میں آجائیں گی۔"
"بہت خوب، تم یہ لسٹ لیلیٰ کو دے دینا......تمہیں سب سامان مل جائے گا۔ میں تمہارے لیے وہ ڈیٹا بھی تیار کروا رہا ہوں جو بدقسمت ٹیموں نے موت سے پہلے اکٹھا کیا

تھا۔ ہم تقریباً تیس گھنٹوں میں سیارے پر پہنچ جائیں گے اور تمہارے پاس اس پُراسرار معمے کو حل کرنے کے لیے تین دن ہوں گے۔'' وہ اتنا کہہ کر واپسی کے لیے مڑا۔

''سر ایکسکیوزمی، اس سیارے کا نام کیا ہے؟'' شہباز نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ ابھی ابھی دریافت ہوا ہے فی الحال اس کا نام نہیں ہے۔ اسے ہم 'پلینیٹ ڈبلیو' کے نام سے پکار رہے ہیں۔ تم اس معمے کو حل کرو گے اور تم اس سیارے کا نام دو گے......ٹھیک ہے؟''

''زبردست ہے سر۔'' شہباز مسکرایا۔

''گڈ لک ڈاکٹر شہباز...... مجھے یقین ہے کہ تمہارا انجام دوسروں کی طرح نہیں ہوگا۔''

ان کے جانے کے بعد وہ پھر ٹیری اریم میں داخل ہوا۔

''یوں لگ رہا ہے کہ ہم دونوں کو اپنی بقا کے لیے جنگ لڑنا پڑے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ میری واپسی تک تم اپنا یہ دوسرا پتا بھی مکمل کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔''

اس کے بعد وہ اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ اسے 'پلینیٹ ڈبلیو' کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شہباز اپنے کمرے میں موجود تھا۔ ایڈمرل کی جانب سے بھیجا گیا سامان اور آلات اس کے سامنے رکھے تھے۔ وہ ایک ایک چیز کا باقاعدہ جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں موت کے اس بے نامی سیارے پر وہ کسی آلے یا ضروری چیز کے اچانک داغِ مفارقت دے جانے کے صدمے کو جھیلنے کے ہرگز قابل نہیں تھا۔ ہر چیز کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے سامان کے دو حصے کیے۔ ضروری ہتھیار، روزمرہ کے استعمال کی لازمی اشیا وغیرہ کو بیگ پیک میں ڈالا جبکہ دوسرے تھوڑے بڑے بیگ میں سائنسی آلات اور ڈیوائسز وغیرہ رکھیں جن کی وہاں ضرورت ناگزیر تھی۔ وہ پیکنگ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کمرے میں ایک نرم مشینی آواز گونجی۔

''مہمان......'' اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔

''آنے دو۔'' اس نے دروازے کے خودکار سسٹم کو آپریٹ کرنے والے کمپیوٹر کو حکم دیا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور لیلیٰ اندر داخل ہوئی۔ وہ اس وقت بھی یونیفارم میں ملبوس تھی۔ اس کا رینک لیفٹیننٹ کا تھا۔

''ہیلو ڈاکٹر...... لگتا ہے کہ تیاری مکمل ہوگئی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''تقریباً۔'' وہ بھی جواب میں مسکرایا۔ ''مجھے کہنا پڑے گا کہ اتنے کم وقت میں ایڈمرل نے میری لسٹ کے مطابق تمام چیزیں فراہم کر کے مجھے حیران کیا ہے۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں تو میں مشکوک تھا کہ شاید وہ یہاں دستیاب نہ ہوں گی مگر مجھے سب کچھ بالکل میری ضرورت کے مطابق مل گیا ہے۔''

''میں حیران نہیں ہوں...... ایڈمرل زبان کے پکے ہیں۔ ویسے بھی وہ ان ہلاکتوں اور وہاں کیا ہوا ہے اس بات کو لے کر بہت پریشان ہیں...... اور میں......'' وہ ایک لمحے کو رکی۔ ''میں بھی پریشان ہوں۔''

''کیوں...... ان ہلاکتوں کی وجہ سے؟''

''وہ تو ہے ہی، اس کا بہت افسوس ہے مگر تم وہاں اکیلے جا رہے ہو...... یہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' اس نے اُداسی سے کہا۔

''یعنی تمہیں میری صلاحیتوں پر یقین نہیں ہے؟'' شہباز نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

''نہیں، یہ بات نہیں مگر وہاں کوئی بھی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہوگا اور وہاں کیا ہو سکتا ہے ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس بار وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''واقعی محسوس تو یہ ہو رہا ہے کہ میں زیادہ خطرے میں ہوں گا مگر تم یقین کرو کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مجھے اپنے آپ کو بچانا ہوگا مگر مجھے کسی دوسرے کی فکر نہیں ہوگی۔ یہ بہترین رہے گا۔ ویسے بھی ہم پہلے بڑی ٹیم بھیج چکے ہیں، ان میں سے کوئی بھی کسی کو تو کیا خود کو بچانے میں کامیاب ہو سکا؟ نہیں نا......؟''

''ہاں جانتی ہوں۔ ایڈمرل اور ہائی کمان کو بھی تمہاری یہ بات مناسب لگی ہے تب ہی تو تمہیں تنہا بھیجا جا رہا ہے۔ کاش میں تمہارے ساتھ جا سکتی۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''تم تو رہو گی ہی میرے ساتھ......'' وہ شرارت سے بولا۔

''وہ کیسے......؟'' لیلیٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہاں...... اس دل میں......'' شہباز اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔

''سچ میں......'' لیلیٰ کی آنکھیں جگمگائیں۔

''بالکل! اب یہ اور بات ہے کہ وہاں اس 'پلینیٹ

ڈبلیو' پر کوئی ساحرہ یا ملکہ حسن مجھے آ ٹکرے اور میرے عشق میں مبتلا ہو جائے اور میں بھی اس کی محبت پر مجبور ہو جاؤں...... یوں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" شہباز مصنوعی سنجیدگی سے تجزیاتی انداز میں بولا۔

"یہ مت بھولنا کہ میں آربٹ (مدار) میں ہی گھوم رہی ہوں گی......" لیلیٰ نے آنکھیں نکالیں۔

"واقعی؟"

"ہاں، ہائی کمان نے مجھے تمہیں وہاں پہنچانے اور واپس لانے کی اجازت دی ہے۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے، تم اچھی پائلٹ ہو۔" وہ مسکرایا۔

"صرف اچھی......؟"

"نہیں، بہت اچھی، جب ہی تو میں نے اپنی زندگی کا شٹل تمہارے سپرد کیا ہے۔" شہباز نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں چلتی ہوں۔ تم تھوڑی دیر سو لو...... چار گھنٹے بعد ہینگر میں ملاقات ہوگی۔ موسم بھی بہت اچھا ہے، ہم آسانی سے لینڈ کر سکیں گے۔"

"میں نے نقشہ دیکھا ہے اور لینڈ کرنے کے لیے ایک جگہ منتخب کی ہے، میں تمہیں وہ دکھا دوں گا، میں وہیں اترنا چاہوں گا۔"

"جو تم چاہو......" وہ شرارت سے بولی۔

"اس جملے میں کچھ زیادہ ہی وسعت ہے...... ایسا نہ ہو کہ میں جو جو چاہتا ہوں، اس کی الگ سے ایک لسٹ بنا کر تمہارے حوالے کر دوں...... یا پھر عملی تجربہ......"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ متانت سے بولی۔ "لسٹ تم دے چکے ہو اور تمہارا سامان تمہیں مل چکا ہے، اب کوئی ڈیمانڈ نہیں...... میری ایک ڈیمانڈ ہے جو تمہیں پوری کرنا ہوگی ہر صورت۔"

"وہ کیا؟"

"محتاط رہنا اور خود کو میرے لیے بچا کر لانا......" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"مطمئن رہو...... میرا نام شہباز ہے، وہ جو کوئی بھی ہے جو ان دونوں ٹیموں کی موت کی وجہ بنا ہے محتاط اسے رہنا ہوگا۔ میں آسان شکار نہیں ہوں۔" وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں بولا۔

وہ جواب میں سر ہلا کر مسکرا دی۔

☆☆☆

ٹھیک پانچ گھنٹے بعد وہ لمبے چوڑے ہینگر میں ایڈمرل اور لیلیٰ کے سامنے کھڑا تھا۔

"ڈاکٹر شہباز عمران...... مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب واپس آؤ گے۔" ایڈمرل نے اس کے سلیوٹ کے جواب میں مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ یہ مشن کامیاب ہو۔" شہباز نے کہا۔

"مجھے اس مشن کی کامیابی کی فکر ہے مگر تمہیں بھی دن چیں میں واپس آنا ہے، خود کو محفوظ رکھنا ڈاکٹر۔"

"شکریہ سر......" شہباز مسکرایا۔ "لیفٹیننٹ کیا ہم چلنے کے لیے تیار ہیں۔" اس نے لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بالکل۔" وہ مسکرائی۔

"بیسٹ آف لک ڈاکٹر......" ایڈمرل نے کہا اور وہ دونوں شٹل میں داخل ہو گئے۔

"شہباز مجھے اپنی مطلوبہ لینڈنگ زون دکھاؤ تاکہ ہم سفر شروع کر سکیں۔" لیلیٰ نے نشست سنبھالنے کے بعد پائلٹ سیٹ کے ساتھ موجود اسکرین پر نقشہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

اس دوران شہباز اپنے بیگ اتار کر کو پائلٹ کی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ خوش تھا کہ لیلیٰ اس کے ساتھ تھی۔

"اس نقشے کو اس جگہ پر فوکس کرو جہاں ان دونوں ٹیموں کا کیمپ سائٹ تھا۔" وہ بولا۔

"اچھا۔" لیلیٰ نے نقشے کو ایڈجسٹ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں۔" نقشے کا چند لمحوں تک جائزہ لینے کے بعد شہباز نے ان دونوں سائٹس سے ذرا پہلے ایک پوائنٹ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ چھوٹی سی پہاڑی جو کہ اس دریا کے بالکل قریب ہے میں یہاں اترنا چاہتا ہوں۔"

"پتھروں پر......؟ اور دریا کے اتنے قریب؟" لیلیٰ نے ابرو چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... مجھے اپنی آسانی اور آرام نہیں دیکھنا ہے لیلیٰ جس کسی نے ان ٹیموں کو قتل کیا ہے، اسے میری اس جگہ آمد اور موجودگی کی فوراً خبر ہو جائے گی اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

چند لمحوں میں وہ خلا میں تھے۔ انہیں 'ہلیئٹ ڈبلیو' کے مدار میں داخل ہونے میں پچاس منٹ لگے تھے۔ اس کا ہوائی نظارہ بہت خوب صورت تھا۔ سیارہ بہت زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اوپر سے بادلوں اور دھند میں لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سیارہ ہرے رنگ میں لپٹا ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں گھنے جنگلات موجود تھے۔

"بہت خوب صورت۔" لیلیٰ نے کہا۔ "یہاں کا موسم سیارہ زمین سے تھوڑا سا سرد ہے۔"

"ہاں اور اب مجھے سمجھ آرہا ہے کہ سائنس داں اور ہائی کمان اس سیارے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔" شہباز نے نیچے بڑے پرندوں کو اڑتے دیکھ کر کہا۔ "یہ رہائش کے لیے انتہائی موافق ہے...... پودے، جنگلات، فضا، آب و ہوا اور جانور...... پرندے، یہ بہت دلچسپ جگہ محسوس ہو رہی ہے۔"

"بالکل دلچسپ ہے مگر تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس خوب صورت جگہ پر کوئی ایسی انجانی چیز ہے جو جان لیوا ہے۔ کچھ ایسا جس نے ہمارے لوگوں کو مار ڈالا اور وہ اسے اپنی جانب آتا ہوا محسوس بھی نہیں کر سکے۔"

"ہاں تم فکر مت کرو...... میں اس معمے کو حل کروں گا اور اب اس سیارے پر کسی کی اس طرح موت نہیں ہوگی۔" شہباز دانت بھینچ کر بولا۔

"ہم لینڈ کر رہے ہیں۔" لیلیٰ کچھ دیر بعد بولی۔

چند لمحوں بعد وہ "پلینٹ ڈبلیو" کی زمین پر اتر چکے تھے۔ لیلیٰ نے انجن بند کیے اور دروازہ کھولا جس کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے نیچے اتر آئے۔ شہباز نے اپنا سامان زمین پر رکھا۔ ان کے سامنے ایک نہایت خوش کن منظر تھا۔ سامنے گھنے جنگلات تھے جہاں نہایت اونچے درخت لہرا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سے سیارے کے دو سورج نمودار ہو رہے تھے۔ چڑیوں اور پرندوں کے چہچہانے کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی جبکہ قدموں کے قریب بہتے دریا کی لہریں پتھروں سے ٹکرا کر اپنی الگ موسیقی پیش کر رہی تھی۔

"واؤ......" لیلیٰ بے اختیار بولی۔

"اور یہ فضا...... " شہباز نے تازہ آکسیجن پھیپھڑوں میں بھرنے کے لیے گہری سانس لی، پھر لیلیٰ کی جانب دیکھا۔ "میں تمہیں یہاں نہیں لاؤں گا مگر تب جب یہاں موجود ان دیکھا خطرہ دور ہو چکا ہو۔ اب تمہیں اسٹار شپ کی محفوظ دنیا میں لوٹ جانا چاہیے۔"

"تمہارا مشن شروع ہو چکا...... میں تین دن کے بعد یہاں پھر لینڈ کروں گی ڈارلنگ...... مجھے یقین ہے کہ تم مجھے یہاں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہو گے۔"

"یقین رکھو...... میں اس گتھی کو سلجھا لوں گا اور پھر یہ زمین انسانوں کی رہائش گاہ بنے گی...... اور......"

"اور کیا؟" لیلیٰ نے شٹل کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے مڑ کر پوچھا۔

"اور ہم دونوں اپنا ہنی مون یہیں منائیں گے۔" شہباز نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"وعدہ......" لیلیٰ نے پوچھا۔

"وعدہ......" وہ بولا۔ لیلیٰ شٹل میں داخل ہو گئی اور چند لمحوں بعد شٹل ہوا میں بلند ہو کر اوپر اور اوپر کی جانب اٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

شٹل کے بادلوں میں غائب ہو جانے کے بعد شہباز اپنے بیگ کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے ایک چھوٹی سیٹلائٹ ڈش کو بڑے بیگ سے نکالا اور ٹرائی پوڈ لگا کر اس پر سیٹ کر دیا۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے سکے جتنا سولر سیل اس میں فٹ کیا۔ دو لمحوں بعد ہی بیپ کی باریک سی آواز نے اس کی کامیابی کا اعلان کیا۔ وہ اسٹار شپ سے اپنا رابطہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ ان کی معلومات کے مطابق چھ گھنٹے قبل یہاں طوفان آیا تھا مگر اب ہر طرف شانتی تھی۔ شہباز کا دوسرا اہم کام اپنے لیے محفوظ پناہ کا انتظام تھا۔ اس کی جیب میں خیمے کی ڈبیا موجود تھی مگر وہ اسے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے زیادہ قدرتی اور محفوظ قیام گاہ درکار تھی۔ وہ چند لمحے چاروں طرف دیکھتا رہا پھر اس کی نگاہ دریا کے قریب موجود چٹانوں پر پڑی، وہاں چند چھوٹی چٹانیں جنہیں بڑے پتھر بھی کہا جا سکتا تھا اس انداز میں موجود تھیں کہ تھوڑی سی محنت پر وہ غار نما جگہ بن سکتی تھی۔ شہباز نے بڑے پتھروں کو ہلکے ہلکے سرکا کر ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش شروع کی۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی کوشش کامیاب ہونا شروع ہو گئی۔ پتھر اپنی جگہ سے سرک رہے تھے۔ آدھے گھنٹے کی محنت سے اس نے پتھروں کو جوڑ کر ان کے نیچے اتنی جگہ بنا لی تھی جہاں وہ اور اس کے بیگز بہ آسانی جگہ بنا سکتے تھے۔ مشقت کے دوران اسے اپنے اردگرد حرکت کا احساس ہوا مگر جب بھی وہ مڑ کر دیکھتا کوئی بھی اردگرد نظر نہیں آتا تھا۔

"یقیناً وہاں کوئی ہے۔" اس نے سوچا مگر جب تک وہ اس کے قریب نہ آتا اس وقت تک شہباز کی پہلی ترجیح پناہ گاہ ہی تھی۔ وہ کام مکمل کر کے پیچھے ہٹا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ اسے نظر آگئے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بلیوں کے مانند کوئی مخلوق تھی۔ ان کی شکل بلی کے مانند تھی مگر ان کی چھ ٹانگیں تھیں۔ ان کے کئی رنگ تھے اور وہ ان میں بہت دیدہ

زیب لگ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت، دلچسپی اور خوف تھا۔ انہوں نے شاید کبھی کوئی انسان نہیں دیکھا تھا اور اب اس بڑے سے نئے جانور کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔
شہباز اس سے ملتی جلتی مخلوق کے بارے میں پڑھ چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ ضرر رساں نہیں ہیں۔ وہ تعداد میں پندرہ بیس تھیں۔ شہباز کی حرکت پر ڈر کر پیچھے ہٹ جاتیں اور پھر اگلے ہی لمحے آگے بڑھ آتیں۔
"ہیلو..... ننھے دوستو۔" شہباز نے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے جیسا جانور پہلے نہیں دیکھا ہوگا نا؟ ڈرو مت..... میں دوست ہوں۔" وہ اس کی آواز سن کر چھپ گئیں۔
شہباز نے اب چھوٹے پتھر لے کر جڑی ہوئی چٹانوں پر بچھانے شروع کیے۔ اسے اس قیام گاہ کو اس طرح محفوظ کرنا تھا کہ اگر پانی اس پر سے گزر بھی جائے تب بھی وہ گیلا ہونے سے بچا رہے۔ تھوڑی دیر میں اس کا مطلوبہ اسٹرکچر کامیابی سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"ہم..... گڈ ڈاکٹر شہباز! اب ہمیں انٹیریئر ڈیکوریشن کے بارے میں سوچنا ہوگا۔" وہ اپنے آپ سے بولا پھر اس نے اپنے بیک پیک سے ایک تھیلا نکالا۔ یہ تھیلا ایک انگلی کے برابر تھا مگر اس کے دباتے ہی وہ بڑا ہوتا چلا گیا۔ وہ اس تھیلے کو لے کر دریا کے قریب پہنچا۔ اس کی سوچ کے عین مطابق وہاں ایک جگہ سفید ریت موجود تھی۔ شہباز نے اس ریت کو تھیلے میں بھرنا شروع کیا۔ تھیلا بھر گیا تو وہ اسے کندھے پر لاد کر اس قیام گاہ تک آیا۔ ننھی رنگین بلیاں اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔
شہباز نے اس غار نما جگہ میں ایک کونے میں اس ریت کو بچھایا اور پھر اپنے بیک پیک سے تھرمل کمبل نکالے۔ یہ کمبل جسم کی ضرورت کے مطابق گرمی و حرارت کو کم یا زیادہ کر کے بہم پہنچاتے تھے۔ اس نے اسے دہرا کیا اور ریت پر بچھا دیا۔ ان کے درمیان سونے کے بعد وہ سرد سے سرد موسم کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اپنے دونوں بیگز اس نے دوسرے کونے کے ساتھ لگائے۔ جب وہ مڑا تو ایک عجیب منظر اس کا منتظر تھا۔ دس کے قریب ننھی ننھی بلیاں اس کے کمبل پر کیٹ واک کر رہی تھیں۔ شاید اس کی گرمائش انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ شہباز کو اپنی جانب دیکھتے پا کر وہ چند لمحوں کو ساکت سی ہو گئیں۔
"کوئی بات نہیں دوستو..... مزے کرو مگر صرف شام تک..... رات کو یہ بستر میرا ہوگا..... ٹھیک ہے۔" وہ مسکرا کر بولا تو بلیوں نے پھر بستر پر چلنا اور کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ شہباز کی طرف سے مطمئن نظر آ رہی تھیں بلکہ ان میں سے ایک دو جرأت مند بلیوں نے اس کے پیروں کو چھوا بھی..... شہباز نے جھک کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
وہ اس نئی جگہ پر پہلے دوست بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے دو اہم ترین ٹاسک "سیٹلائٹ" اور "پناہ گاہ" مکمل کر لیے تھے۔ اب اسے اپنا اصل کام شروع کرنا تھا۔

☆☆☆

باہر نکلنے سے قبل اس نے بیک پیک سے ایک پتلی اور لمبی سی اسکرین نکالی اور اسے اپنے بائیں بازو پر اسٹریپس کی مدد سے باندھ لیا۔ اس کا ایک اسٹریپ اس کے گلے سے بھی گزرتا تھا تاکہ وہ کسی بھی مشکل وقت میں گرنے پائے۔ یہ جدید اسکینر تھا اس کی مدد سے وہ جو کچھ دیکھتا یا جو کچھ اس کے اردگرد ہوتا نہ صرف ریکارڈ ہو کر محفوظ ہو جاتا بلکہ لمحوں میں وہ معلومات آربٹ (مدار) میں موجود اسپیس شپ تک پہنچ جاتیں جہاں اپنی شٹل کے ساتھ لیلیٰ اس کی منتظر تھی۔ اس کے علاوہ متعلقہ چیز کے بارے میں موجود معلومات بھی شہباز کو بھیج دی جاتیں۔ یوں یہ "ایکسپرٹ آن لائن" کا بہتر اور جدید چہرہ تھا۔ اس نے بیک پیک میں دوبارہ ہاتھ ڈالا اور ڈبل ہولسٹر نکال کر پہن لیا۔ پھر ایک لیزر گن اور ایک اسٹین گن نکال کر ہولسٹر میں لگائیں۔ اسے لیزر کے مقابلے میں اسٹن گن (الیکٹرک شاک سے سامنے والے کو بے ہوش کر دینے والی گن) زیادہ پسند تھی کیونکہ اس سے کسی کی جان لیے بغیر اپنی جان بچائی جا سکتی تھی۔ اس نے پنڈلی پر چمڑے کے فولڈر میں موجود تیز دھار چاقو کو تھپتھپایا۔ اپنا بیک پیک اٹھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پناہ گاہ سے باہر نکلا۔ نکلتے ہوئے اس نے مڑ کر اپنے تیار کردہ بستر پر بلیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور مسکرایا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھیں۔
وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک ساکت سا ہو کر کھڑا ہو گیا، اس کی چھٹی حس خطرے کے الارم کے مانند اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ کوئی یقیناً اسے دیکھ رہا تھا پھر چند لمحوں بعد وہ اسے نظر آ گیا۔
وہ دریا کی دوسری جانب موجود جنگل سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے غرانے کی آواز اتنی تیز اور شدید تھی کہ دریا کے اس جانب بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک لمبا چوڑا جانور تھا، اس کی رنگت سیاہ تھی جبکہ جسم پر ہرے رنگ کی دھاریاں تھیں۔ اس کی چھ ٹانگیں تھیں جن میں یقیناً چاقوؤں سے تیز ناخن موجود تھے۔ وہ اپنی لمبی دُم کو غصے میں بار بار زمین پر مار

رہا تھا۔ وہ جب دہاڑنے کے لیے منہ کھولتا تو اس کے لیے خطرناک دانت دور سے بھی صاف نظر آرہے تھے۔ وہ دانت یہ بتارہے تھے کہ وہ گوشت خور تھا۔

''باپ رے باپ......'' وہ بڑبڑایا۔ ''ڈاکٹر صاحب یہ گوشت خور ہے اور آپ گوشت کے ہی بنے ہوئے ہیں۔''

اس کی نگاہیں شہباز پر ہی جمی ہوئی تھیں مگر یقیناً وہ پانی کو ناپسند کرتا تھا۔ یوں فی الحال یہ دریا درمیان میں حائل تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر شہباز نے گہری سانس لی اور بازو پر موجود اسکینر کو آن کردیا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی اسکرین پر اس جانور کا نام ابھر آیا۔ اسے پہلی والی ٹیموں کی معلومات کے مطابق چنگبریا کا نام دیا گیا تھا۔ یہ خطرناک تھا مگر فی الحال وہ اس کی دسترس سے باہر تھا۔

''کیا وہ ان دونوں ٹیموں کو مار سکتا تھا؟'' شہباز کے ذہن میں سوال گونج رہا تھا مگر ساتھ ہی اس کا جواب بھی گویا نیون سائن کے مانند چمکا۔

''نہیں، وہ لمبا چوڑا جانور تھا یقیناً زمینی ہاتھی سے بھی بڑا، بھاری بھرکم بھی تھا مگر وہ یکلخت اتنے سارے لوگوں کو اس طرح موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا تھا پھر اگر یہ جانور کسی کو مارتے تو جسم پر دانتوں یا پنجوں کے نشان ہوتے اور وہ ان کی غذا بھی بنتے......'' اس نے خود ہی اپنے شک کو ذہن سے نکال پھینکا۔ ''مجھے اس قاتل کو ڈھونڈنا ہے۔'' وہ بولا اور گھنے جنگل کی جانب بڑھ گیا۔ اس جنگل کی خاص بات اس کے درختوں کا سائز تھا۔ وہ بہت بڑے بہت گھنے اور بہت اونچے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہزاروں سالوں سے یہاں موجود ہوں۔ یہ شہباز کا پسندیدہ موضوع تھا۔ درخت، پودے، پھول، جانور اس کی تعلیم ہی نہیں زندگی کا حصہ تھے۔ جنگل میں کچھ اندر جاکر وہ پھر ٹھٹک گیا۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا درخت تھا، وہ جنگل میں موجود تمام درختوں سے بہت بڑا تھا۔ بالکل ایسے جیسے وہ سب اس کی اولاد ہوں۔ مگر شہباز کے ٹھٹکنے کی وجہ اس کا بڑا ہونا نہیں تھا۔ درخت کے چوڑے تنے کے درمیان میں ایک خاصا لمبا اور گہرا زخم موجود تھا۔ اس لکیر کا رنگ پیلا نما تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر جھکا اور اس نشان پر آہستگی سے ہاتھ پھیرا۔ شاید چند گھنٹوں پہلے والا طوفان اس کی وجہ بنا تھا یا پھر جو بھی وجہ تھی مگر وہ زخم خاصا گہرا تھا۔

''فکر نہ کریں دادا جان...... میں نے آپ کی چوٹ دیکھ لی ہے، اب ہم مل کر اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کریں گے۔'' وہ عادت کے مطابق درخت سے باتیں کرنا شروع کر چکا تھا۔ اسے اس بڑے درخت کی یہ چوٹ دیکھ کر اپنا چھوٹا سا پودا یاد آگیا تھا جس پر کیمیکل گر گیا تھا اور جس میں اب دوبارہ پتے نکلنے لگے تھے۔

''آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے تنے کو تھپتھپا کر تسلی دی اور اپنا بیگ پیک اتار کر کھولا اس میں وہ تھیلا موجود تھا جس میں وہ ریت بھر کر پناہ گاہ میں لایا تھا، اس نے وہ تھیلا نکالا اور دریا کی طرف بڑھا۔ دریا کی دوسری جانب اب سکون تھا۔ چنگبریا وہاں سے جا چکا تھا شاید وہ کسی آسان شکار کی تلاش میں تھا۔

اسے دریا کے کنارے کے اندر موجود گیلی مٹی درکار تھی جو تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے مل گئی۔ اس مٹی کو پتھر کی مدد سے کھود کھود کر نکالنے میں اسے خاصا ٹائم لگا۔ بیگ بھر جانے کے بعد وہ اسے جنگل کی جانب لے گیا۔ گیلی مٹی کے اس بیگ نے شہباز کی حالت تباہ کردی تھی۔ وہ خاصا وزنی تھا مگر اب وہ اسے بھر چکا تھا اور اس کے اندازے کے مطابق دادا جان درخت کے تنے کے علاج کے لیے کم از کم اتنی مٹی درکار تھی۔ وہ اسے بمشکل درخت تک لے ہی آیا۔ اسے درخت کے تنے کے زخم میں مٹی بھرنے میں مزید آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔ مٹی زخم میں بھر جانے کے بعد اب خشک ہو رہی تھی۔ یہ شہباز کی خاص تکنیک تھی۔ اس طرح درختوں کے تنوں میں موجود زخم کے نشانات بھی بھر جاتے اور ان کی توانائی بھی بحال ہو جاتی۔ وہ چند لمحے اپنی کارگزاری کو دیکھتا رہا پھر ہاتھوں پر لگی مٹی کو جھاڑا۔

''یہ مٹی جادوئی اثر رکھتی ہے۔'' وہ درخت سے بولا۔ ''یہ آپ کی تکلیف ختم کر کے طاقت دے گی اور پھر آپ مزید ہزار سال اور اسی طرح کھڑے رہ سکیں گے۔'' وہ اپنا جملہ مکمل کر کے مسکرایا۔ اسے یہ کر کے واقعی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا پھر اپنا بیگ پیک وہیں چھوڑ کر تھوڑا آگے بڑھ گیا۔ اسے بچپن سے درختوں سے محبت تھی اور اسی لیے جب اس کا کیریئر ٹیسٹ لیا گیا تو اسے اسی شعبے میں آگے بڑھایا گیا۔ اسپیس شپ ہیڈ آفس آنے کے بعد اسے جنگلوں میں جانے کے کم مواقع ملے تھے۔ اس جنگل میں موجود درخت اسے بہت متاثر کر رہے تھے جیسے وہ اسے اپنی جانب بلا رہے ہوں۔

''یوں بھی اوپر چڑھ کر شاید مجھے اردگرد کا بہتر جائزہ لینے کا موقع مل جائے۔'' وہ بڑبڑایا اور پھر ایک قریبی درخت پر چڑھ گیا۔ ان درختوں کے تنے اور شاخیں اتنی چوڑی تھیں

کہ ان پر چڑھنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ وہ شاخوں سے ہوتا ہوا کافی اوپر پہنچ گیا۔ وہاں اسے ہر طرف درختوں کی شاخیں ہی نظر آرہی تھیں۔ وہ سانس درست کر رہا تھا کہ ایک ہلکی سی چیخ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ چونک اٹھا۔ یہاں اس چیخ کا مطلب کسی کی موجودگی ہی تھی مگر یہ آواز تھوڑی دور سے آئی تھی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور ساتھ موجود درخت کی شاخ کو پکڑ کر اس پر چڑھا اور شاخوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس درخت سے ایک درخت دور موجود درخت پر چار پانچ بندر اچھل کود کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جامنی رنگ کے پھل تھے جنہیں وہ کھا بھی رہے تھے اور ایک دوسرے پر پھینک بھی رہے تھے۔ اسی کے دوران ان کے ہونٹوں سے انسانی آواز سے ملتی جلتی چیخیں بھی برآمد ہورہی تھیں۔

وہ شاخ پر بیٹھ گیا اور دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر مصروف تھے کہ انہیں اس کی آمد کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بندر قد میں قدرے لمبے تھے مگر جسامت میں عام بندروں جیسے ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کا چہرہ سرخ رنگ کا تھا جس پر ابھری ہوئی سیاہ آنکھیں انہیں تھوڑا بہت خوفناک بنا رہی تھیں۔ وہ ان کی نگاہوں میں آئے بغیر نیچے اترنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی چھٹی حس فائر بریگیڈ کی مسلسل گھنٹی کے مانند دیوانہ وار چلانے لگی۔ وہ قریب آتا خطرہ نہایت جلد اور تیزی سے بھانپ سکتا تھا۔ اس کی جینز میں یہ صفات ڈالی گئی تھیں۔ اس وقت اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی جان لیوا خطرہ سو میل فی منٹ کے حساب سے اس کے قریب آرہا ہو۔ وہ دو لمحے ساکت رہا پھر برق رفتاری سے اچھل کر دوسرے درخت کی شاخ پر جا پہنچا۔ وہاں سے دوسری شاخ پر جا کر اس نے گہری سانس لی اور خطرے کے اس شدید احساس کی وجہ جاننے کے لیے مڑ کر دیکھا۔ درخت کی اس شاخ کو جہاں وہ چند لمحے قبل بیٹھا ہوا تھا دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے گہری سانس نکل گئی۔ اس کا دل گویا اس کے کانوں میں دھڑکنے لگا اور سردی کے موسم میں بھی ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ عین اس جگہ پر ایک بڑے سے سانپ کا پھن موجود تھا۔ جس میں سے شاید شکار کے آخری لمحے میں ہاتھ سے نکل جانے کے صدمے کی وجہ سے سرخ پتلی سی زبان لپک رہی تھی۔

اس کا منہ اور جسم اتنا بڑا تھا کہ وہ سالم اس کو نگل سکتا تھا۔ اس خیال نے اس میں بجلی سی بھر دی۔ اس نے تیزی سے دوسری شاخ پر چھلانگ لگائی وہ اس ناگ سے دور ہو جانا چاہتا تھا اور اس درخت پر آنے کے بعد ان دونوں کے درمیان وہ محفوظ فاصلہ قائم ہو گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اسکینر کا رخ ناگ کی جانب کر دیا۔ اسپیس شپ سے آنے والی تفصیل کے مطابق یہ انتہائی زہریلا ناگ تھا جو ڈسنے، نگلنے اور دبوچ کر مار ڈالنے کی تمام صلاحیتیں رکھتا تھا۔ اس کی لمبائی بارہ فٹ سے زیادہ تھی جبکہ وزن پانچ سو سے چھ سو کلوگرام کے درمیان تھا۔ اس وزن کی وجہ سے ہی وہ سرعت کے ساتھ شہباز کا تعاقب نہیں کر پایا تھا۔

وہ ناگ اب اسی طرح بے آواز انداز میں پھسلتا ہوا درخت پر موجود لوٹتے ہوئے بندروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔ شہباز کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ کر بندروں کو اس کی طرف سے ہوشیار کر دے۔ شاید وہ چیخ بھی پڑتا مگر آخری لمحے میں اس کے دماغ نے جذبات پر فتح پائی اور اسے یہ نہ کرنے کا حکم صادر کیا۔

سب سے پہلے تو جنگل کی قدرتی زندگی تھی۔ وہ اسے تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں ہر جاندار کو اپنی بھوک مٹانے کے لیے شکار کرنا تھا۔ یہی یہاں کا نظام تھا۔ ان کے پاس فوڈ بارز یا ریسٹورنٹس کا انتظام نہیں تھا اور نہ ہی آن کال ڈلیوری کی سہولت میسر تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس کی ایک چیخ جنگل کے باقی باسیوں کو بھی اس کی جانب متوجہ کر سکتی تھی اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔

اس کی نظروں کے عین سامنے ناگ نے منہ کھولا اور ایک بندر کو سالم نگل گیا۔ باقی بندر شور مچاتے ہوئے وہاں سے بھاگے جبکہ ایک دوسرا بندر ناگ کے شکنجے سے نہیں نکل پایا۔ اپنے شکار کو نگل کر وہ سرسراتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

شہباز اب اپنی پناہ گاہ کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ سیارے کے دونوں سورج غروب ہونے کے قریب تھے اور وہ تھک بھی چکا تھا۔ وہ شاخ در شاخ ہوتا ہوا دادا جان درخت کے پاس اتر گیا۔ وہاں اس کا بیک پیک موجود تھا اس نے اسے کمر پر چڑھایا اور ایک نظر درخت میں موجود نشان پر ڈالی، اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دریا کی زرخیز مٹی اپنا کام دکھا رہی تھی اور درخت کے تنے کی حالت قدرے بہتر ہو رہی تھی۔

اچانک ہوا کا تیز جھونکا آیا اور جنگل کی فضا میں عجیب سی چیختی ہوئی آواز گونجنے لگی۔ شہباز ممکنہ خطرے کے پیش نظر لپک کر دادا جان درخت پر چڑھ گیا۔ اس نے یہ خیال ضرور رکھا تھا کہ اس کا پیر درخت میں موجود لکیر پر نہ پڑے۔ یہ ایک

عجیب سی آواز تھی جیسے کوئی بڑی سی سیٹی بج رہی ہو۔ وہ قدرے اوپر پہنچ کر رکا اور پھر چاروں جانب نظر ڈالی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے عجیب سا منظر تھا۔ جس کی اس کے علم کے مطابق کوئی وضاحت ممکن نہیں تھی۔ اردگرد موجود درختوں کے پتوں نے خود اپنے اندر مڑ کر لمبی لمبی ٹیوبوں جیسی شکل بنالی تھی۔ جوں ہی ہوا تیز چلتی اور ان ٹیوبوں سے گزرتی، ایک چیختی ہوئی سیٹی کی آواز بلند ہو جاتی۔ عجیب بات یہ تھی کہ دادا جان درخت کے پتے اپنی نارمل حالت میں ہی تھے۔

''شاید یہ موسم کی تبدیلی کا اعلان ہو؟'' اس نے سوچا اور پھر آسمان کی جانب دیکھا، گہرے سیاہ بادل تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر اس نے اسکینر پر نظر دوڑائی وہاں موسم کے سیکشن میں وہی کچھ تھا جو وہ خود محسوس کر رہا تھا۔ طوفان آنے والا تھا۔

☆☆☆

شہباز چٹانوں اور پتھروں سے بنی پناہ گاہ میں داخل ہوا تو یہاں ایک حیران کن منظر اس کا منتظر تھا۔ درجنوں کی تعداد میں ننھی منی رنگین بلیاں اس کے تھرمل کمبل پر گھوم رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو اپنے پسندیدہ مقام کے لیے پہلے سے قابض بلیوں سے لڑ بھی رہی تھیں۔

شہباز کے بستر پر بیٹھتے ہی وہ سب چند لمحوں کے لیے اِدھر اُدھر ہو گئیں مگر پھر اس کے قریب سمٹ آئیں۔ شہباز نے پہلے اپنے بیگ سے ایٹنگ پلو (کھانے کی گولیاں) نکالیں۔ دو گولیاں کھا کر پانی کے فلاسک کو منہ سے لگا لیا۔ یہ دو گولیاں اس کی دن بھر کی غذائیت اور کیلوریز کے لیے کافی تھیں۔ بلیاں آنکھیں ٹمٹماتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''ننھے دوستو، تم اگر طوفان سے بچنے کے لیے یہاں رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو مگر مجھے تنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے اگر ایسا کیا تو میں تم سب کو اٹھا کر دریا میں پھینک دوں گا۔'' وہ جواب میں اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تھیں۔

شہباز اپنی تقریر سے فراغت پا کر کمبل میں لیٹ گیا۔ اس کے حساس کان طوفان، بجلی کے کڑکنے اور بارش کو قریب آتا محسوس کر رہے تھے مگر وہ مطمئن تھا، اس کی پناہ گاہ اس طرز کی تھی کہ بارش یا طوفان اس پر سے پھسل جاتا۔ یہاں کسی بھی چیز کو اسے نقصان پہنچانے سے قبل چٹانی پتھروں کو توڑنا پڑتا یعنی اسے بے خبری میں نقصان پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی تیز حسیات نیند کے عالم میں بھی اسے ہوشیار رکھتی تھیں۔ اسی وجہ سے اسے یقین تھا کہ وہ سیارے پر اپنی پہلی رات کی صبح دیکھ پائے گا جو کہ اب تک بھیجی جانے والی ٹیمز میں سے کوئی بھی نہیں کر پایا تھا۔

اس کا ذہن آج کے دن کے گرد گھوم رہا تھا۔ وہ زہریلا ناگ دونوں ٹیموں کو نقصان پہنچا سکتا تھا مگر وہاں زہر کے کوئی آثار نہیں ملے تھے، اسی طرح وہ بھاری بھرکم گوشت خور جانور بھی شک کی زد سے باہر تھا کیونکہ مارے جانے والے افراد کی لاشیں مسخ تھیں مگر انہیں کھایا نہیں گیا تھا اور نہ ہی ان پر ناخنوں کے نشان تھے۔

''اوہ، مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے؟'' شہباز نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ مسلسل ایک ہی رخ سے سوچ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کارنیورس (گوشت خور بڑے جانور) کی کارروائی نہ ہو وہ کوئی ہربی وور (بہت بڑے ڈائنوسار سائز کے سبزی خور جانور) بھی تو ہوسکتا ہے جو غصے میں ان سب پر چڑھ دوڑا ہے۔

اس خیال کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بازو پر موجود اسکینر کو آن کیا۔ کئی ننھی بلیاں روشنی کی وجہ کو جاننے کے لیے اس کے کندھوں تک چڑھ آئیں۔ ''شش......'' اس نے انہیں دور بھگایا اور اپنے تاثرات اسپیس شپ کو روانہ کر دیے۔ میسج ریسیو کے نشان کے بعد اس نے اسکینر بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

اتنی دیر میں بارش تیز ہو چکی تھی مگر اس کی پناہ گاہ محفوظ تھی۔ وہ ننھی منی بلیاں بھی اطمینان سے اس کے بستر پر جہاں جس کو جگہ ملی سونے کے لیے دبک گئیں۔ شہباز کو سونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اگلی صبح اس کے لیے اہم تھی۔ نتائج حاصل کرنے کے لیے اس کا تروتازہ ہونا ضروری تھا اور وہ اپنے اس محاذ پر مکمل تیاری سے جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح نہایت روشن تھی۔ رات کی تیز بارش کے بعد سب کچھ دھل دھلا کر... خوب صورت اور تروتازہ ہو گیا تھا۔ درختوں کے پتوں میں نئی چمک آ گئی تھی۔

شہباز جاگتے ہی جنگل کی طرف نکل پڑا تھا کیونکہ آج اسے زیادہ شواہدات جمع کرنے تھے۔ یہاں موجود مخلوق اور چیزوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنا تھی اور ٹیم ممبران کی ہلاکت کے حوالے سے تفتیش بھی کرنا تھی۔

دادا جان درخت بھی جھوم رہا تھا۔ اس پر موجود نشان قدرے بھر گیا تھا یعنی اب وہ زخم کافی حد تک ختم ہو چکا تھا۔

"واؤ......" شہباز نے تنے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بہترین، آپ نے کر دکھایا، میں خوش ہوں کہ زخم بھر گیا ہے کل تک یہ نشان بھی مٹ جائیں گے۔"

وہ درختوں کی شاخوں پر سفر کر رہا تھا اسے اس دوران کئی ناگ نظر آئے جو اپنے شکار کی تلاش میں سرسرا رہے تھے۔ درختوں پر بندروں کے جھنڈ بھی تھے مگر اس نے ان سے دور رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اس طرح کے جانور بڑے گوشت خور جانوروں کی خوراک ہونے کی وجہ سے ان کی نظر میں ہوتے ہیں۔ ان کی طاقت ان کی تعداد میں ہوتی ہے جبکہ وہ اکیلا تھا۔

وہ ہر نئی چیز کو اسکینر میں ریکارڈ کر کے اسپیس شپ پر بھیجتا جا رہا تھا۔ اسی دوران اسے ایک خوب صورت تتلی نما جانور نظر آیا۔ اس کا سائز ڈنر پلیٹ سے تھوڑا بڑا تھا۔ اور وہ سرخ اور نیلے رنگوں میں رنگا ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ تتلی چھوٹی ہوتی ہے اور اس کے دو پر ہوتے ہیں جبکہ اس کے چار پر تھے۔ شہباز صبر سے اس کے اڑنے کا منتظر تھا۔ اسی صورت میں وہ اسے بہتر طور پر ریکارڈ کر سکتا تھا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا نما آواز نے اسے چونکا دیا۔ تتلیوں کا جھنڈ بھی اس آواز کی وجہ سے ایک ساتھ اڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا اسکینر چونکہ ان پر فوکس تھا اس لیے وہ منظر دھماکے سمیت ریکارڈ ہو گیا تھا۔ شہباز بھی شاخوں پر پھلانگتا ہوا اوپر چڑھتا چلا گیا۔ ایک بڑی اور محفوظ شاخ پر پہنچ کر اس نے آنکھیں بند کیں اور دور کی آوازوں کو سننے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش کامیاب رہی۔ دور سے کوئی نہایت بھاری بھرکم مخلوق اس طرف آ رہی تھی۔ اس کے چلنے کی دھماکا دار آواز اب جنگل میں گونجنے لگی تھی۔

شہباز اسے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا، اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اسے اپنے سوالات کے جواب ملنے والے تھے۔ وہ مزید اونچائی سے اس جانور کے سامنے آنے کا منتظر تھا۔

کچھ ہی دیر بعد عجیب و غریب دیو ہیکل جانوروں کا ایک ریوڑ سامنے سے آتا نظر آیا۔ سب سے آگے چلنے والے دو جانور ان میں نہایت بڑے تھے۔ ان میں سے ایک دو تو اسپیس شٹل جتنی جسامت تو ضرور رکھتے ہیں۔ شہباز نے سوچا۔ وہ اپنے بڑے بڑے کھروں سے زمین کو کرید رہے تھے جس سے زوردار آواز پیدا ہو رہی تھی۔ ان کے سروں پر بارہ سینگوں کے مانند جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا اور اس کے علاوہ دو مضبوط اور بڑے سینگ بھی تھے جن کے کونے نہایت تیز دھار نظر آ رہے تھے۔ وہ سبزی خور تھے اور ارد گرد اگی اونچی گھاس کو کھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک ان کے پیچھے سے عجیب سی آواز بلند ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان میں سے کوئی کسی تکلیف میں ہو یا پھر اسے کوئی خطرہ لاحق ہو۔ ان آوازوں کے آتے ہی سب سے آگے چلتے وہ دیو ہیکل جانور رک گئے اور پھر دھاڑتے ہوئے پلٹے تھے۔ چند قدم پیچھے مڑ کر وہ دونوں زمین پر کسی چیز کو اپنے کھروں سے مارنے اور رگڑنے لگے تھے۔ ان کے بھاری بھرکم وجود اور پھر اڑتی ہوئی گرد کے طوفان کی وجہ سے شہباز کو کچھ خاص نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کر کے غصے کے اس عالم میں ان دیو ہیکل جانوروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا اس لیے دم سادھے یہ سارا منظر دیکھتا رہا۔ اس کا اسکینر مسلسل کام کر رہا تھا اور اسپیس شپ کی جانب سے اسے محتاط رہنے کا پیغام بھی مل گیا تھا۔

اسے جو سمجھ میں آ رہا تھا وہ یہی تھا کہ غالباً ان کا کوئی بچہ ریوڑ سے الگ ہو کر کہیں پھنس گیا تھا اور اب وہ اس ستانے والے کو اس کے انجام تک پہنچا رہے ہیں۔ چھوٹا جانور پھر اپنے ریوڑ کی طرف چلا گیا مگر دونوں بڑے دیو ہیکل اب بھی اس طرح کھر چلا رہے تھے جس کی بازگشت سے پورا جنگل گونج رہا تھا پھر بالآخر وہ تھک گئے اور وہ پورا ریوڑ آگے بڑھتا چلا گیا۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد شہباز درخت سے نیچے اترا اور گھاس سے گزرتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں وہ دونوں دھاڑ رہے تھے۔ وہاں کیچڑ اور خون کا جوہڑ سا بنا ہوا تھا اس کے باہر ایک ویسا ہی بڑا سا ناگ مرا پڑا تھا جس نے شہباز کو کھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر تھیں۔ اس کا پورا جسم مسخ ہو چکا تھا اور ہر طرف کھروں کے بڑے بڑے نشان ہویدا تھے۔ یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑے روڈ رولر کے نیچے آ کر کچل گیا ہو۔ اسے قریب سے دیکھ کر اور اسکینر پر ریکارڈ کرتے ہوئے شہباز کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس کے بھاری بھرکم جسم پر موجود چوٹوں کے نشان دونوں ٹیموں کے جسموں پر پائے جانے والے نشانات جیسے ہی تھے۔ شہباز کو لمحہ بھر کے لیے لگا کہ جیسے اس نے یہ معما حل کر لیا ہو۔

اس کے پاس دونوں ٹیموں کی تمام تصاویر موجود تھیں مگر ان میں ارد گرد کی تصویریں نہیں تھیں۔ شہباز جاننا چاہتا تھا کہ وہاں کھروں کے نشانات تو موجود نہیں تھے اور اس کے لیے

اس کا ان دونوں کیمپ سائٹ تک جانا لازمی تھا۔ اس نے تمام ریکارڈنگ فوری طور پر اسپیشل شپ پر روانہ کی اور خود دونوں ٹیموں کے کیمپ سائٹ کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس کا ذہن سوالات میں الجھا ہوا تھا۔

''کیا یہ دیوہیکل جانور دونوں ٹیموں کی موت کے ذمے دار تھے؟ وہ یہ کر سکتے تھے۔ ان کا وزن کسی بھی چیز کو مسخ کرنے کی طاقت رکھتا تھا اور اگر وہ غصے میں ہوں تو کچھ بھی کر سکتے تھے پھر وہ سبزی خور تھے لہٰذا شکار کو کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ خیال بالکل فٹ تھا جو چیز اسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ ہوسکتا تھا کہ پہلی ٹیم نے انہیں ناراض کیا ہو مگر پھر دوسری ٹیم کا اسی طرح مارا جانا کیا معنی رکھتا تھا؟ سوالات گویا اس کے ذہن میں تا تا تھیا پر مصر تھے اس نے ان سب کے جوابات کو کیمپ سائٹز کے جائزے تک کے لیے معطل کر رکھا تھا۔

پہلی ٹیم کے کیمپ سائٹ پر ابھی بھی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ دوسری ٹیم نے یہاں اپنی تفتیش کی تھی مگر انہیں یہاں سے چیزیں ہٹانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس نے ایک ایک چیز اور جگہ کا معائنہ کیا۔ ٹیم کی مسخ شدہ لاشوں اور بھاری بھرکم ناگ کے جسم پر موجود چوٹوں کا انداز بالکل ایک جیسا تھا مگر ایک بہت بڑا فرق موجود تھا۔ وہاں کہیں کہیں زمین تھوڑی سی متاثر لگ رہی تھی مگر کہیں بھی ان کے کھروں کے نشان نہیں تھے جبکہ ناگ کے جسم اور اردگرد ہر طرف ان کے کھروں کے واضح نشانات موجود تھے۔

وہ گہری سانس لیتا ہوا کیمپ سے باہر نکلا اور دوسری ٹیم کے کیمپ کی جانب بڑھا۔ باہر اسے پتھروں سے بنے چولھے میں وہاں جلی ہوئی لکڑیوں کے آثار ملے جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ پہلی ٹیم نے وہاں کسی قسم کا بون فائر کا انتظام کیا تھا۔

''حماقت، نری حماقت......'' وہ بڑبڑایا۔ ''اس سے نہ صرف انہوں نے اپنا نائٹ وژن تباہ کر ڈالا بلکہ میلوں کے فاصلے پر بھی ہر خونخوار کو اپنی آمد کی خود خبر بھیج دی۔ آخر ایسا کرنے کی وجہ کیا تھی؟ کیا وہ خطرے کو دعوت دینے کی کوشش کر رہے تھے؟ انہیں اس کا سامنا کرنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔'' اس نے افسوس سے سوچا۔

دوسرا کیمپ اسے بہت آسانی سے مل گیا۔ وہ پہلے کیمپ سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ وہاں سب کچھ بکھرا ہوا تھا۔ ٹیم کے افراد کی ہلاکت کے بعد کسی نے بھی وہاں صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہاں ٹیم کے افراد کے علاوہ اس عملے کے ہیروں کے نشانات موجود تھے جو ان کی لاشوں کو وہاں سے اٹھانے کے لیے گیا تھا۔ یہاں بھی زمین پر خاص قسم کے کوئی نشانات موجود نہیں تھے۔

شہباز نے الجھ کر آسمان کی جانب دیکھا۔ دونوں ٹیموں کی ہلاکت میں یہ چیز بھی قدرِ مشترک تھی کہ ان کی آنکھیں اوپر کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ شاید کسی اڑنے والی مخلوق نے انہیں مارا ہو مگر پھر اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ جس طرح ان لاشوں کو مسخ کیا گیا تھا اس کے لیے کسی نہایت بھاری بھرکم وجود کی ضرورت تھی اور اتنا بھاری وجود اڑ پائے یہ ناممکن ہی تھا۔

وہ جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اسے اپنا پہلا خیال غلط محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دیوہیکل جانور دونوں ٹیموں کو آخر کیوں ماریں گے؟ انہوں نے اس ناگ کو اس لیے مارا کیونکہ وہ ان کے بچے پر حملہ کر رہا تھا۔ ان ٹیموں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ایسا ہونا ناممکن تھا کہ اتنے بھاری بھرکم جانوروں کی آمد سے ٹیم ممبران بے خبر رہ پاتے۔ پہلی ٹیم تو پھر بھی شکار بن سکتی تھی مگر دوسری ٹیم خطرے سے باخبر تھی۔ اس کے باوجود وہ بالکل اسی طرح موت کا شکار بنی جبکہ یہ بھی سچ تھا کہ یہ دیوہیکل جانور غصے کی حالت میں بھی خاموشی سے شکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کا پہلا تجزیہ بالکل غلط تھا۔ شہباز نے اسکینر پر ریکارڈ دونوں کیمپوں کی تفصیل کے ساتھ اپنے تاثرات تحریر کیے۔ پیغام کے پہنچ جانے کی تصدیق کے بعد وہ اپنی پناہ گاہ کی جانب چل پڑا۔

اگر کوئی اس سے آج کے دن کی ٹوٹل کارگزاری کو ایک لفظ میں بیان کرنے کو کہتا تو وہ یقیناً کیپٹل حروف میں ایک ہی لفظ لکھتا ''مایوسی'' وہ اس وقت بہت مایوس تھا اور اس حوالے سے فی الحال کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

پناہ گاہ میں پہنچ کر اس نے اپنا بیگ پیک اتار کر ایک طرف رکھا، ہولسٹر کو گلے سے نکال کر بیگ پیک پر ڈالا اور دریا کی جانب چل دیا۔ اس وقت وہاں ننھی منی بلیاں بھی موجود نہیں تھیں۔

دریا کے قریب پہنچ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر ٹھنڈے پانی کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ پانی تیزی سے اس کی جانب آتا اور پھر اسے چھو کر واپس لوٹ جاتا۔ بالکل اسی طرح اس کے ذہن میں خیالات بھی آ اور جا رہے تھے۔

''کیا وہ یہاں سے ناکام واپس جائے گا؟

''کیا اس کا مشن ادھورا رہ جائے گا؟
''کیا وہ دونوں ٹیموں کے قتل کی وجہ اور قاتل کے بارے میں بھی کچھ نہیں جان پائے گا؟
کیا وہ ایڈمرل اور لیلی کے اعتماد پر پورا نہیں اتر سکے گا؟
یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ کام پورا کیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو یہ ناکامی اس کے اعصاب پر سوار ہو جائے گی۔ اس نے سوچا۔ اگر اس کے لیے اسے مقررہ مدت سے کچھ دن زیادہ رکنا بھی پڑے تو وہ رکے گا۔ اگر اسے زندہ اور ایڈمرل کے الفاظ میں دن چیس میں واپس جانا ہے تو اس کے لیے اسے اپنا کام مکمل کرنا ہی ہوگا۔ وہ اس ناکامی کو مایوسی بنا کر خود پر طاری نہیں ہونے دے گا اور جیت کے لیے مستقل مزاج محنت لازم ہے۔

''میں ہار نہیں مانوں گا...... میں ہار نہیں مان سکتا اور نہ ہی مجھے ہار ماننا چاہیے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ ناکامی نے جو مایوسی کی دھند اس کے ذہن پر جما دی تھی وہ یک دم تحلیل ہو گئی اور دوسرے خطرے کے شدید احساس نے اسے جکڑ سا لیا۔ اسی وقت زمین پر پڑنے والی دھمک اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ذہن میں آنے والے پہلے خیال کو اس نے ''ناممکن'' کہہ کر جھٹکا اور تیزی سے مڑا تو اس کا وہی اندیشہ اس سے کچھ فاصلے پر مجسم کھڑا نظر آیا۔

وہ ایک بڑا ہری دھاریوں والا چنگبریا تھا۔ شہباز نے اسے سیارے پر اپنی آمد والے روز ہی دریا کے دوسری جانب دیکھا تھا۔ وہ اتنی دور سے بھی انتہائی خطرناک محسوس ہوا تھا مگر اب وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی خونخوار سرخ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے شہباز کی طرف دیکھ کر پنجے اٹھائے اور زور سے غرایا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا، اس کے پنجے نما پیر جس پتھر پر پڑتے تھے وہ چورا ہو گیا تھا۔ شاید وہ ننھی بلیاں بھی اسی خطرے کو بھانپ کر یہاں سے غائب ہو گئی تھیں۔ شہباز نے سوچا۔

وہ اس پر کسی بھی لمحے حملہ آور ہو سکتا تھا۔ شہباز ہتھیاروں کے استعمال کو پسند نہیں کرتا تھا مگر اس وقت معاملہ اس کی اپنی بقا کا تھا۔ اس نے ہولسٹر سے گن نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر گن وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ اپنا ہولسٹر پناہ گاہ میں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ وہ بہت برا پھنسا تھا۔ وہ جانتا تھا اور یہ انہیں ان کی ٹریننگ کے دوران سکھایا جاتا تھا کہ مشن کے دوران اپنے ہتھیار اور اسکینر کو خود سے ایک لمحے کے لیے بھی دور نہیں رکھنا چاہیے بلکہ ان سے یہ تک کہا گیا تھا کہ سوتے وقت بھی ان چیزوں کو ان کے جسم پر رہنا چاہیے۔

''مگر سر انسان ایک بھی سی اسکرین اور ہتھیاروں کے ساتھ کیسے سو سکتا ہے؟'' اسے اپنا کیا گیا سوال بھی آج تک یاد تھا۔

''اچھی نیند کی خاطر ہمیشہ کی نیند سو جانا اچھا انتخاب نہیں ہو سکتا۔ دشمن کبھی بھی حملہ آور ہو سکتا ہے اس لیے حالتِ جنگ میں ہمیشہ تیار رہنا ہی عقل مندی ہے۔'' اس کے استاد کے جواب کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ اس سے بڑی غلطی ہو گئی تھی اور اب اس کے پاس پچھتانے کا بھی وقت باقی نہیں بچا تھا۔ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس صرف ایک چاقو تھا، اس نے جھک کر پنڈلی سے چاقو کو کھینچا اور ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا ذہن کمپیوٹر کی سی تیزی سے اپنے بچاؤ کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ کسی بھی لمحے اس پر حملہ کر سکتا تھا اور وہ صرف ایک چاقو کی مدد سے اپنی جان نہیں بچا سکتا تھا۔

اس نے دریا میں چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ جانور پانی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی اس کے علاوہ دریا میں مزید کون سا خطرہ اس کا منتظر ہو وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ تیراکی جانتا تھا مگر اسے اس کام میں کچھ خاص مہارت نہیں تھی جس کی وجہ سے یہ آپشن اس کے لیے ''خودکشی'' اور ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' والا ورژن بن سکتا تھا۔ یہ اس کی رفتار میں نہایت کمی کر سکتا تھا جبکہ اب تیز رفتاری اور اسپیڈ ہی اسے اس دیوہیکل درندے سے بچا سکتی تھی۔

اس وقت جان بچانے کا بہتر نسخہ کسی طرح جنگل میں گھس جانا تھا۔ وہ اس قدر دیوہیکل تھا کہ بہت سی جگہوں پر وہ اس کا پیچھا نہیں کر پاتا۔ اس کے مقابلے میں شہباز کہیں بھی چھپ کر جان بچا سکتا تھا۔ اس کے پنجوں کو دیکھ کر اس کا اندازہ تھا کہ وہ درخت پر بھی چڑھ سکتا تھا مگر اس وزن کے ساتھ وہ یہ کام شہباز جیسی تیز رفتاری کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا اور بہت ساری شاخیں بھی اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں۔ شہباز کو کسی بھی طرح جنگل میں جانے کا راستہ بنانا تھا کیونکہ وہ مخلوق جنگل اور اس کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اب

بھی کھڑا غرا رہا تھا شاید وہ شہباز کے حرکت کرنے کا منتظر تھا یا پھر اسے اس چوہے بلی کے کھیل میں لطف آرہا تھا۔

بچت کا اب ایک ہی ممکنہ راستہ نظر آرہا تھا اور اس کے لیے اسے اس خطرناک جانور کو مزید طیش دلانا تھا۔ شہباز نے جھک کر زمین سے چند پتھر اٹھائے اور انہیں ایک ایک کر کے چنگبریا کے اوپر اچھالنے لگا۔ اس کی اس جرأت پر چنگبریا اس کے اندازے کے عین مطابق زور سے غرایا اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ شہباز بھی اس کی جانب بڑھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس کچھ بھی کر پانے کا یہ واحد موقع تھا اگر وہ اس میں ناکام ہو جاتا تو پھر اس کا زندہ بچ پانا قطعی ناممکن تھا۔ اس کھیل میں ایک طرف اس کی زندگی تھی اور دوسری جانب دردناک موت...... مگر کوشش نہ کرنے کی صورت میں صرف ایک ہی نتیجہ نکلنا تھا اور وہ موت ہی تھی۔ وہ دونوں تیز رفتاری سے ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب وہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر رہ گیا تب شہباز نے ہاتھ میں پکڑے خنجر کو پوری طاقت سے اس کی آنکھ کی جانب اچھالا۔ خنجر اڑ کر اس کی آنکھ کے بالکل برابر میں پیوست ہو گیا۔ چنگبریا تکلیف اور غصے سے پاگل ہو کر ناچ اٹھا۔ آنکھ کے زخم نے اسے سٹپٹا دیا تھا۔ شہباز کو اسی ایک لمحے کا انتظار تھا۔ وہ جسم و جان کی پوری طاقت سے اچھلا اور درندے کے برابر سے ہوتا ہوا جنگل میں گھس گیا۔ وہ انتہائی تیز دوڑ رہا تھا۔ اسے اپنے عقب میں درندے کے دہاڑنے کی آواز آرہی تھی۔ اس کے بھاری قدموں سے اٹھنے والی دھمک اس کے دل کو لرزا رہی تھی۔ وہ اس کے بالکل پیچھے آرہا تھا۔ وہ بھاری بھر کم تھا اور اس کی رفتار کم تھی مگر اس کا ایک قدم شہباز کے چار قدموں کے برابر تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے بالکل عقب میں تھا۔ زخم کی تکلیف اور غصے کی وجہ سے وہ راستے میں آنے والے درختوں سے ٹکراتا بھی جا رہا تھا مگر اس سے بھی اس کی رفتار یا توجہ میں کمی نہیں آرہی تھی۔

شہباز تیزی سے دوڑتا ہوا اس بڑے درخت تک پہنچ گیا جس پر اس نے مٹی لگائی تھی۔ اپنی جھونک میں وہ اس کے تنے سے ٹکرا گیا۔

''سوری......'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''دادا جان آج تو میں پھنس گیا ہوں۔'' اتنا کہہ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ چنگبریا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ شہباز کے پاس اب آگے دوڑنے کا موقع نہیں تھا اس نے درخت کے تنے پر پیر جمایا اور تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اس کے اوپر چڑھتے ہی چنگبریا بھی درخت تک آپہنچا تھا۔ اس نے پہلے پنجہ مار کر شہباز کو گرانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی دسترس سے باہر نکل گیا تو اس نے بھی درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔

شہباز اوپر اور اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ موت کا خوف اس پر غالب تھا مگر اس سے بھی زیادہ خطرے اور کسی عجیب و غریب بات کے وقوع پذیر ہونے جیسا احساس اسے اپنی گرفت میں لینے لگا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی انہونی کی خبر دے رہی تھی۔

''اب اس سے برا کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔

مگر اسی وقت ایک عجیب سی بات ہوئی...... اسے اپنے ذہن اور آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ناممکن تھا مگر اس کے باوجود وہ اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے تھا۔

اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وسیع و عریض دیوہیکل درخت حرکت کر رہا ہو۔ سب کچھ یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ سیارہ مدار سے باہر نکل گیا ہو۔ اسے یہ سب خواب کے مانند لگ رہا تھا، اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔

درخت کی ایک، بہت بڑی شاخ عین اس کے کان کے پاس سے گزری اور اس نے چنگبریا پر اس شدت سے وار کیا کہ وہ زمین پر جا گرا۔ وہ زمین پر پڑا تکلیف کے مارے غرا رہا تھا اسی وقت درخت کی ایک اور موٹی شاخ نے اس پر وار کیا۔ بڑے درخت کی دو شاخیں اس پر برس رہی تھیں جبکہ شہباز کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک درخت اپنی جگہ سے ہلا اور چنگبرے پر سے گزرتا چلا گیا جس کے بعد وہاں خاموشی طاری ہو گئی۔ چنگبرے کی لاش بری طرح مسل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور اوپر کی جانب جمی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے [illegible] والے حصے پر دہشت جمی ہوئی تھی۔

شہباز [illegible] درخت کی اونچی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے اس درخت نے اس درندے کو ہلاک کر دیا تھا اور اسے بچا لیا تھا۔

اس بہت بڑے، قدیم درخت نے جسے اس نے ''دادا جان'' کا نام دیا تھا، با[illegible] حرکت کی تھی اور اس کی شاخوں نے اس دیوہیکل درندے کو چند لمحوں سے زیادہ کی مہلت نہیں دی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔

اچانک سب کچھ اس کے سامنے واضح اور روشن ہو گیا۔ وہ اب جان گیا تھا کہ ان سائنس دانوں اور دوسری ٹیم

کے ممبران کو کس نے مارا تھا اور شاید کسی حد تک اس کی وجہ بھی......

☆☆☆

وہ ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ یہ احساس کہ وہ جس درخت کی شاخوں میں دبکا ہوا تھا اس نے چند لمحوں قبل اسے بچانے کے لیے ایک بہت بڑے دیوہیکل اور خونخوار جانور کو بہ آسانی چیر ڈالا تھا۔ اس صدیوں پرانے درخت نے نہ صرف اپنی جگہ سے حرکت کی تھی بلکہ اس کی شاخوں نے خود کو ہتھیار کے طور پر استعمال بھی کیا۔ یہ سوچنا جہاں ایک طرف انتہائی خوف زدہ کر دینے والا تھا وہیں یہ احساس کہ اس نے یہ قدم اس کی بقا کے لیے اٹھایا اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔ وہ اس بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ درخت نے جو کچھ کیا وہ کیسے ممکن ہوا؟ اگر وہ کسی سے بھی یہ کہتا تو شاید کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرتا۔ کسی دوسرے سے زیادہ اسے خود بھی ہر بات کی وضاحت درکار تھی۔ یہ اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔

اس نے دھیرے سے اسکینر کا رخ اپنی جانب کیا۔ اسے آن کیا اور اس پر مطلوبہ پروگرام کی تلاش شروع کی۔ تھوڑی دیر میں اسے وہ مل گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے اس پروگرام کو اسکینر پر سیٹ کیا، اسے یقین تھا کہ ابھی اور بھی بہت کچھ ایسا تھا جسے جاننا اس کے لیے ضروری تھا۔

اپنی تیاری کرنے کے بعد وہ دھیرے دھیرے پھسلتا ہوا درخت سے نیچے اتر آیا۔ درخت کے انتہائی موٹے تنے پر کئی لمبے لمبے زخم نشان کی صورت میں بنے ہوئے تھے جو اس خونخوار درندے کے خطرناک پنجوں کی وجہ سے لگے تھے جب وہ اسے پکڑنے کے لیے درخت پر چڑھ رہا تھا اور جب درخت نے اسے نیچے پھینکا اور اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی۔ ان نشانات سے پیلی رنگ کا مواد رس رہا تھا اور ان میں سے کچھ قدرے گہرے تھے۔ اس نے ہمدردی اور تشکر بھرے انداز میں ان چوٹوں کو سہلایا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا تھا۔ پھر اس نے اپنا اسکینر درخت کے تنے کے پاس رکھ دیا تاکہ وہ اپنا کام کر سکے اور خود اپنی پناہ گاہ کی جانب پلٹ آیا...... وہاں آ کر اس نے بیگ پیک سے وہ تھیلا نکالا جس میں اس نے دریا کی مٹی بھری تھی۔

تھیلا لے کر اس نے دریا کا رخ کیا، اس میں کنارے کی تازہ مٹی بھری اور دوبارہ درخت کے پاس پہنچا۔ اس کے تنے پر موجود بڑے زخم میں آہستگی سے مٹی بھرنے سے اس نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ وہ مٹی لگاتے ہوئے چند نظروں سے درخت کو دیکھتا جا رہا تھا مگر وہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس کی نظریں بار بار زمین پر پڑے کچلے ہوئے چکبریا پر پڑ رہی تھی اور ہر بار وہ جھرجھری سی لے کر رہ جاتا۔ وہ اپنا یہ انجام کسی صورت نہیں چاہتا تھا۔

درخت کے زخموں پر اچھی طرح مٹی کا لیپ کرنے کے بعد اس نے تنے کو تھپتھپایا اور ہاتھوں کو رگڑ کر خشک مٹی کو جھاڑا۔ اس کے بعد غیر محسوس طور پر اس نے درخت کے قریب رکھے اسکینر کو اٹھایا، اسے اپنے بازو پر باندھا اور پھر اس میں موجود ڈیٹا کا جائزہ لیا۔ اس نے اسکینر کو دو ٹاسک دیے تھے اور اس پر موجود ڈیٹا شہباز کے شکوک کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اسکینر پر موجود کمیونیکیٹ کے بٹن کو دبایا اور اس وقت تک اسے دباتا رہا جب تک اس کا اسٹارشپ سے براہ راست رابطہ نہ ہو گیا۔

"ڈاکٹر شہباز...... تم بخیر ہونا؟" لیلیٰ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بولا۔ "مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے ٹیموں کی ہلاکت کے معمے کو حل کر لیا ہے اور یہ بھی کہ میں زندہ سلامت ہوں۔"

"اوہ، یہ بہت اچھی خبر ہے، میں ایڈمرل تک یہ خبر پہنچا دیتی ہوں کہ تم نے اپنا مشن مکمل کر لیا ہے۔ کیا میں شٹل لے کر وہاں آ جاؤں؟ یقیناً تم واپس آنا چاہتے ہو گے۔" وہ چہکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں، ابھی نہیں۔" وہ اسکرین پر بٹن دباتے ہوئے بولا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ ایڈمرل یہاں آ جائیں تاکہ میں انہیں رپورٹ بھی کر سکوں اور جو کچھ میں نے دریافت کیا ہے وہ انہیں دکھا بھی سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں ان سے رابطہ کر رہی ہوں۔" لیلیٰ کی آواز آئی۔ "کیا ہمیں وہیں چٹانوں کے پاس لینڈ کرنا ہے جہاں میں نے تمہیں اتارا تھا؟"

"بالکل...... یہ بہت لازمی ہے، تمہیں وہیں لینڈ کرنا ہے کسی اور جگہ لینڈنگ سب کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ یاد رکھنا تمہیں وہیں لینڈنگ کرنی ہے جہاں تم نے مجھے اتارا تھا۔"

"شہباز......" وہ ایک لمحے کو رکی پھر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ ان دونوں ٹیموں کو اس طرح کس نے موت کے گھاٹ اتارا تھا؟"

شہباز نے اس کے سوال کے جواب میں گہری سانس لی، اپنی آنکھیں مسلیں اور پھر بولا۔ ''ایک خطرناک جان لیوا غلط فہمی نے لیلیٰ، اس وقت میں اس سے زیادہ نہیں بتا پاؤں گا اور نہ ہی تم سمجھ پاؤ گی۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

اسے اندازہ تھا کہ ایڈمرل اور لیفٹیننٹ لیلیٰ جلد وہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے آنے سے قبل اسے ایک اہم کام نمٹانا تھا۔ وہ اس وقت اپنی پناہ گاہ میں تھرل کمبل کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ ننھی منی رنگین بلیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ شہباز نے اسکینر کو پروگرام موڈ پر لا کر نئی معلومات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بٹن دبتے ہی اس کے کانوں میں سیٹی کی وہی آواز گونجی جو درختوں کے پتوں کے اپنے اندر گھوم کر ٹیوب بنانے اور ہوا گزرنے کی وجہ سے سنائی دیتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار یہ آوازیں صرف وہی سن رہا تھا کیونکہ اس نے کانوں میں ائر پلگ لگائے ہوئے تھے۔ اسکینر اس کے لیے سیٹی کی اس آواز کا ترجمہ کر رہا تھا۔ موسیقی کی اپنی ابجد ہوتی ہے اور اس کو ڈی کوڈ کر کے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اسکینر میں چلنے والے دوسرے پروگرام کے کامیابی سے لوڈ ہو جانے پر اس نے ہرا کا نعرہ لگایا۔ اب یہ اسکینر اس کی گفتگو کو سیٹی سے ملتی جلتی اس زبان میں ڈی کوڈ کر کے نشر کر سکتا تھا۔ یعنی اب وہ دادا جان درخت تک اپنی بات پہنچا سکتا تھا بلکہ صرف یہ چیز ہی اس سیارے پر انسانی زندگی کو ممکن بنا سکتی تھی۔

اسے اب لیلیٰ اور ایڈمرل کا انتظار تھا۔ آخرکار اسے شٹل اترتی نظر آئی۔ لیلیٰ نے کمال مہارت سے پتھروں پر لینڈ کیا تھا، وہ ایک بہترین پائلٹ تھی۔ شہباز نے تحسین کے انداز میں سر ہلایا۔ شٹل کے لینڈ ہوتے ہی اس کا بڑا سا دروازہ کھلا اور ایڈمرل باہر آتا نظر آیا۔ اس کی سرخ یونیفارم روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس کی گہری سیاہ رنگت اس سرخ رنگت کو مزید ابھار رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ نگاہیں ملتے ہی شہباز نے اسے سلیوٹ کیا۔ وہ زمین پر قدم رکھتے ہوئے ایک لمحے کو رکا، اسے دیکھ کر مسکرایا اور اس کے سلیوٹ کا جواب سلیوٹ سے دیا۔

''تمہیں ایک پیس میں دیکھ کر دلی خوشی ہوئی ڈاکٹر۔'' وہ قریب آ کر بولا۔

''مجھے بھی اپنے ثابت و سالم رہنے پر خوشی ہے سر، اگرچہ کر دیا اتنا آسان نہیں تھا۔'' شہباز نے جواب دیا۔

لیفٹیننٹ لیلیٰ بھی اتنی دیر میں ان کے قریب پہنچ گئی تھی۔

''ڈاکٹر شہباز آپ کی رپورٹ تیار ہے؟'' اس نے ہیلو ہائے کے بعد پوچھا۔ صاف طور پر وہ سب کچھ جاننے کے لیے بے تاب تھی۔

''بالکل لیفٹیننٹ، رپورٹ تیار ہے... اگر آپ دونوں اجازت دیں تو میں یہ رپورٹ چلتے ہوئے دینا چاہتا ہوں۔''

''ہم کہیں جا رہے ہیں ڈاکٹر؟''

''جی سر، میں آپ کو ثبوت تک لے کر جانا چاہ رہا ہوں۔''

''اوکے...... بالکل ٹھیک ہے، میں چلنا پسند کرتا ہوں اور یہاں پلینٹ ڈبلیو پر یہ ایک خوب صورت دن ہے۔'' ایڈمرل مسکرایا اور چل پڑا۔

''پلیز ایڈمرل۔'' اس نے اسے روکا۔ ''مجھے آگے چلنے دیں، آپ کا اکیلے آگے جانا محفوظ نہیں ہے، پلیز مجھے فالو (پیچھا) کریں۔'' وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔ اسے اپنے عقب میں ان کے بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چلتے چلتے اس نے اسکینر کو مطلوبہ پروگرام آن کرنے کی ہدایت بھی جاری کر دی تھی۔

''ہماری پہلی ٹیم یہاں آئی تھی۔ انہوں نے اپنے آلات لگائے اور ڈیٹا جمع کرنا شروع کیا۔ رات تک وہ مصروف اور محفوظ رہے۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر انہوں نے ایک جان لیوا غلطی کی۔'' شہباز نے ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا۔ وہ دادا جان درخت تک پہنچنے سے قبل اب تک کی معلومات کی رپورٹ ان دونوں تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

''کیسی غلطی؟''

''انہوں نے کیمپ کے باہر ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا، اس کے گرد پتھر لگائے اس میں لکڑیاں ڈالیں......''

''کیمپ فائر...... انہوں نے رات کو حرارت اور حفاظت کے خیال سے کیمپ فائر کا انتظام کیا ہو گا...... تو اس سے کیا ہوا؟''

''بدقسمتی سے وہ اس سے حرارت یا حفاظت حاصل نہیں کر سکے۔ عین اس لمحے جب انہوں نے ''کیمپ فائر'' کو جلایا اسی وقت دردناک موت ان کا مقدر بن گئی۔''

''کیا یہ سب نہایت تیزی سے ہوا تھا۔ انہیں کسی ہتھیار کو چھونے یا مقابلہ کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی؟''

''بالکل......'' شہباز نے سر ہلایا۔ ''دوسری ٹیم ان کی

موت کے دو مشتوں بعد آئی اور وہ بہت محتاط تھے۔ انہوں نے تمام دن یہاں گزارا، پہلی ٹیم کے کیمپ کا جائزہ لیا، نمونے جمع کیے اور مجھے یقین ہے کہ ان تحقیقات نے انہیں بہت الجھا دیا ہوگا۔"

"یہ درست ہے، ان کی جانب سے آنے والے پیغامات اس کا ثبوت ہیں۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔ "پھر ان کے ساتھ کیا ہوا؟"

"وہی...... مجھے افسوس ہے مگر سب کچھ اسی طرح ہوا تھا۔ جوں جوں رات گہری ہوتی گئی، انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ انہیں کیمپ فائر کا اہتمام کرنا چاہیے۔ انہوں نے بھی گڑھا کھودا، پتھر رکھے اور لکڑیاں جمع کر کے اس کے اندر بچھائیں۔"

"اور وہ بھی فوری طور پر اندوہناک موت کا شکار بن گئے۔" ایڈمرل نے اس کی بات مکمل کی۔

وہ اس دوران اس بڑے دیوہیکل درخت کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دادا جان درخت کے زخموں پر لگائی گئی تازہ مٹی سوکھ رہی تھی۔ شہباز وہاں پہنچ کر رک گیا۔

"بالکل درست، انہوں نے جیسے ہی آگ جلانے کی کوشش کی اسی وقت موت اپنے بھیانک پنجے لے کر ان پر حملہ آور ہوگئی۔" شہباز نے افسوسناک انداز میں کہا۔

"اور تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب کس نے کیا ہے؟" ایڈمرل نے پوچھا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" شہباز نے سنجیدگی سے کہا۔ "دونوں ٹیمیں اس وقت ہلاک کی گئیں جب انہوں نے آگ جلانے کی کوشش کی۔ اسے قتل کہنا غلط ہوگا کیونکہ یہ حرکت خوف اور ذاتی دفاع کی وجہ سے کی گئی۔"

"ذاتی دفاع؟...... یہ کس نے کیا ہے ڈاکٹر......"

"ان حساس جانداروں نے جو اس سیارے کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں۔" شہباز نے دادا جان درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" ایڈمرل نے ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "درختوں نے......؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "یہ ہم سے رابطے کی کوشش کر رہے تھے مگر ہمیں اس بارے میں علم نہیں ہو سکا اور ہم دیگر آپشنز پر کام کرتے رہے۔"

"اور تم جو کہہ رہے ہو تم اسے ثابت بھی کر سکتے ہو؟" لیلیٰ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ اس کا تیز ذہن یقیناً اس کیس کے تانے بانے جوڑ رہا تھا۔

"جی ہاں...... میں اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے آپ دونوں کو یہاں لایا ہوں۔ آپ دونوں یہیں اسی طرح کھڑے رہیے گا اور کوئی بھی حرکت نہ کیجیے گا۔ میں مزید کسی جان کا زیاں نہیں چاہتا۔" وہ اتنا کہہ کر بڑے درخت کی جانب گیا۔

"اوکے مطمئن رہو۔" ایڈمرل نے جواب دیا۔

شہباز نے ایک گہری سانس لی۔ تنے کے زخموں کو بچاتے ہوئے وہ اس بے حد بڑے درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ کافی اونچائی پر پہنچ کر وہ ایک چوڑی شاخ پر بیٹھ گیا۔ اسپیکر پر موجود خاص پروگرام کو ری اسٹارٹ کیا اور اس میں بولا۔

"دادا جان درخت میں دوبارہ تنگ کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ میرے دو دوست میرے ساتھ آئے ہیں۔ وہ میری طرح اوپر نہیں چڑھ سکتے، کیا آپ مہربانی کر کے اپنی شاخوں کو نیچے جھکا کر ان کی مدد کریں گے؟"

اسپیکر میں موجود پروگرام کو اس کا یہ جملہ نشر کرنے میں دو لمحے لگے تھے۔ اسپیکر سے برآمد ہونے والی آواز اس سیٹی کے مانند تھی جو درختوں کے پتوں سے بنی ٹیوبوں میں ہوا کے گزرنے سے پیدا ہوتی تھی۔ چند لمحوں بعد اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی تھی مگر اس بار وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب کیا ہونے والا تھا۔

دادا جان درخت کی دو چوڑی اور بہت بڑی شاخیں میرے اردگرد سے نیچے جھک کر ان دونوں کے سامنے آگئیں۔ ایڈمرل اور لیلیٰ دونوں کے چہروں کا رنگ لمحے بھر کو فق ہو گیا تھا، ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر شاخوں کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اس کے بعد ایڈمرل نے پہلا قدم بڑھایا، شاخ کی جانب دیکھ کر مسکرایا اور اس پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد لیلیٰ نے بھی دوسری شاخ پر قدم رکھا۔

"شکریہ دادا جان درخت، کیا آپ انہیں میرے پاس اونچائی پر لا سکتے ہیں۔ آپ کو اس میں احتیاط کرنی پڑے گی کیونکہ میرے دوستوں کے لیے یہ نیا تجربہ ہے اور ہمیں کسی کو گرانا نہیں ہے۔"

اسپیکر کے پروگرام نے ایک بار پھر اس کی درخواست کو سیٹی والی زبان میں ترجمہ کیا اور درخت کی وہ دونوں شاخیں جس پہ ایڈمرل اور لیلیٰ تھے بلندی پر میرے قریب آگئیں۔

وہاں سے جنگل کا دور تک نظارہ ممکن تھا۔ سامنے درخت ہی درخت نظر آرہے تھے۔ وہ سب اونچے اور چوڑے تھے اگرچہ کہ ان میں سے کوئی بھی دادا جان درخت جتنا بڑا نہیں تھا مگر پھر بھی انہیں دیوہیکل ہی کہا جاسکتا تھا۔ اس وقت وہ سب انہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان کی شاخیں بازوؤں کے مانند لہرا رہی تھیں۔ جو کچھ شہباز نے کہا تھا وہ ان سب کی سماعت تک بھی پہنچا تھا اور جنگل نے انہیں اپنا ہم جنس اور دوست تسلیم کرلیا تھا۔

"ایڈمرل، لیفٹیننٹ، میں آپ کو 'پلینٹ ڈبلیو' کے حساس حکمرانوں کی جانب سے خوش آمدید کہتا ہوں۔" شہباز ان دونوں کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔

☆☆☆

"یہ...... یہ ناممکن تھا...... ناقابلِ یقین......" ایڈمرل اب تک نہایت حیرت زدہ تھا۔ وہ تینوں اب دریا کے سامنے شہباز کی پناہ گاہ سے کچھ فاصلے پر موجود چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ "میں اب تک سو سے زیادہ سیاروں یعنی دنیاؤں میں گھوم چکا ہوں، میں نے نہایت عجیب و غریب چیزیں اور مخلوقات دیکھی ہیں مگر آج کے تجربے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا۔"

"واقعی...... یہ سوچ میں آنے والی بات نہیں ہے۔" لیفٹیننٹ لیلیٰ نے کہا۔ "مگر انہوں نے پہلی والی ٹیمز کے سامنے خود کو ظاہر کیوں نہیں کیا؟ انہیں کیوں مار ڈالا؟"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب مجھے بھی معلوم نہیں......" شہباز نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ یہ کسی بہت ہی خاص وجہ کے بغیر حرکت نہ کرتے ہوں۔ ان کے ہاں کمیونیکیشن (رابطے) کے لیے سیٹی والا طریقہ رائج ہے اور ٹیمز کو اس کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔"

"کیمپ فائر نے ان کی جان لی۔ کیونکہ آگ جلتے ہی درختوں کے لیے اپنی بقا کا سوال پیدا ہوگیا۔ وہ یہ تو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ آگ انہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔" ایڈمرل نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بالکل یہی بات تھی۔ انہوں نے آگ لگانے والوں کو اپنا اور اپنی دنیا کا دشمن سمجھا اور حرکت میں آگئے۔"

"کیمپ کی ٹیمز کے لیے یہ انتہائی حیرت زدہ کردینے والا لمحہ ہوگا جب انہوں نے درختوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور ان کی حرکت اتنی تیز تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی جان بچانے کا موقع نہیں مل سکا۔" لیلیٰ نے کہا۔

"بالکل ان کا بھی قصور نہیں تھا، وہ یہ سب نہیں جانتے تھے اور یوں سمجھے کہ میری خوش قسمتی کہ میں نے اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔ میں نے یہاں اسٹنر کے علاوہ کچھ استعمال نہیں کیا۔"

"تو پھر تم نے سردی کا مقابلہ کیسے کیا؟" ایڈمرل نے پوچھا۔

"میں نے چٹانی پتھروں سے ایک پناہ گاہ بنائی تھی۔" شہباز نے پناہ گاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا اور میں اپنے تھرمل کمبل میں سو رہا تھا جس کی گرمی میرے لیے کافی تھی۔"

"بہت عمدہ ڈاکٹر...... تم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔" ایڈمرل مسکرایا۔ "اپنا اسٹنر مجھے دو۔"

ایڈمرل کے اس حکم پر شہباز نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور پھر اپنا اسٹنر اس کی جانب بڑھا دیا۔ ایڈمرل نے اتنی دیر میں اسپیس شپ سے رابطہ کرلیا تھا۔

"ہماری ٹیم مشن "اسپیشل پلینٹ ڈبلیو" سے واپس آرہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شپ پر ڈاکٹر ون گارڈ ڈاکٹر شہباز کے لیے تیار رہیں ان کا مکمل چیک اپ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ انہیں لے جانے کے لیے فوری طور پر دوسری شٹل روانہ کی جائے۔" اس نے یہ کہہ کر رابطہ کاٹ دیا۔

"مگر سر...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" شہباز نے کہنا چاہا۔

"مجھے معلوم ہے مگر تم دو دن سے اس خطرناک سیارے پر تنہا ہو، ڈاکٹر تمہارا چیک اپ کریں گے، میں نہیں چاہتا کہ کوئی چھپا ہوا انفیکشن یا پیراسائٹ میرے بہترین افسر کو کوئی نقصان پہنچائے۔" وہ مسکرایا۔

"شکریہ۔" اس کے ان الفاظ پر شہباز بھی مسکرایا۔ "مگر کیا آپ لوگ میرے ساتھ نہیں چلیں گے؟"

"نہیں، ہمیں کچھ دیر لگے گی۔ مجھے تمہارے اسٹنر کے ذریعے تمہارے گرینڈ پا درخت سے کچھ مذاکرات کرنے ہیں اور ہائی کمان سے بھی بات کروانی ہے۔ وہ اس دنیا کے حکمران ہیں اور اگر ہمیں جگہ بنانی ہے تو ان کے ساتھ ہاتھ ملانا ہوگا۔"

"میں اس کام میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔" شہباز نے آخری چانس لیا۔

"نہیں...... ہمیں تم سے ابھی اور بھی کام لینے ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تم آرام کرکے تازہ دم ہوجاؤ۔" وہ

مسکرایا اور لیلیٰ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

شہباز کو میڈیکل یونٹ کے اس تنہا کمرے میں آج دوسرا دن تھا۔ پہلا دن اور رات تو اس نے سوتے ہوئے گزاری تھی۔ مگر آج صبح سے وہ خاصی بوریت محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے تین دنوں تک تنہائی میں انتظار کرنے کی "سزا" تحریر کی تھی اور اس میں ابھی ایک پورا دن باقی تھا۔ اس کا اسکینر بھی ایڈمرل کے پاس تھا جس کی وجہ سے وہ کسی سے رابطہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

وہ پلینٹ ڈبلیو کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازہ بے آواز انداز میں کھلا۔ وہاں ایڈمرل کو کھڑا دیکھ کر وہ اپنے بستر سے کھڑا ہو گیا۔

"لیٹے رہو ڈاکٹر۔" وہ اندر آ کر بستر کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا حال ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی پچھلی ڈیوٹی پر جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں اس کا فیصلہ ڈاکٹر کرے گا اور اس نے تمہارے لیے مزید ایک دن کا انتظار لکھا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

"نہیں۔"

"ایک تو مجھے تمہارا یہ اسکینر واپس کرنا تھا۔" اس نے اسکینر اس کی جانب بڑھایا۔ "اس کے علاوہ میں تمہارا آفیشلی اپنا اور ہائی کمان کی جانب سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری بہادری کے صلے میں تمہیں ایک میڈل سے بھی نوازا جا رہا ہے۔"

"اوہ...... بہت شکریہ۔" شہباز کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ "میں نے جو کیا تھا وہ میرا فرض تھا سر......"

"اس کے علاوہ تمہیں یہ بتانا ہے کہ ہمارے اور تمہارے اس دادا جان درخت کے درمیان مذاکرات کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس نے ہمیں فی الحال ایک دو لوگوں کو وہاں تجرباتی طور پر رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ ہم نے اس مشن کے لیے اپنے ایک لیفٹیننٹ کا انتخاب کیا ہے جو ایک مخصوص مدت تک وہاں رہے گا۔ ان سب سے تعلقات بہترین بنائے گا اور اس سیارے پر انسانی آبادی کے لیے راہ ہموار کرے گا۔" وہ بات مکمل کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، اس کی نظریں شہباز پر جمی ہوئی تھیں جس کے چہرے پر قدرے مایوسی اور افسردگی نظر آ رہی تھی۔

"کیوں تمہیں اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی؟" ایڈمرل نے پوچھا۔

"میں بہت خوش ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ دادا جان درخت نے وہاں رہنے کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے مگر تم جانتے ہو کہ ہائی کمان اس کے لیے کم از کم لیفٹیننٹ کے رینک کے شخص کا انتخاب کرنے پر مجبور تھی۔"

"انہوں نے کہا تھا......" شہباز کی آنکھیں چمکیں۔ پھر وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا اور بولا۔ "مگر اصول قاعدے بھی درست ہیں۔"

"اس سب کے بعد ہائی کمان نے ایک اور فیصلہ کیا۔" ایڈمرل نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"وہ کیا......؟" شہباز نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ کہ ہم آج سے ڈاکٹر شہباز عمران کو لیفٹیننٹ ڈاکٹر شہباز عمران بنا رہے ہیں۔" وہ زور سے بولا۔ شہباز یقین نہ آنے والے انداز میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

"آ جاؤ بھئی لیلیٰ......" ایڈمرل کی بلند آواز پر دروازہ کھلا اور لیلیٰ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"بہت مبارک شہباز...... تمہیں ترقی، نیا رینک اور پلینٹ ڈبلیو تینوں مبارک ہوں۔"

شہباز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے ایک بار پھر ایڈمرل کو سیلوٹ مارا۔ "میں بہت مشکور ہوں سر، آپ کو اپنے انتخاب پر فخر رہے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔" ایڈمرل مسکرایا۔ "بیسٹ آف لک لیفٹیننٹ۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں اگلے ہفتے اپنی ڈیوٹی سنبھالنا ہے۔ ہاں ہائی کمان نے لیفٹیننٹ لیلیٰ کو اس مشن کا کیئر ٹیکر (منتظم) بنایا ہے، وہ ایک بہترین پائلٹ بھی ہے اور آرگنائزر بھی۔ وہ ہر ہفتے وہاں پہنچ کر انتظامات کی نگرانی کرے گی۔ تمہیں وہاں سے جلد سے جلد انسانی کالونی کی راہ ہموار کرنا ہوگی۔" ایڈمرل یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

لیلیٰ اور شہباز اس کے جانے کے بعد چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر وہ دونوں مسکرائے تھے اور یہ مسکراہٹ خوشی سے بھرپور قہقہے پر ختم ہوئی تھی۔

❖❖❖

## تیرے ٹھکانے عجیب تھے

کہتے ہیں کہ اصل تخلیق کار وہی ہے جو اپنی ذات کی نفی کرکے سماج کو اپنی سانسوں میں پرو لیتا ہے... **غلام قادر** کا شمار بھی ایسے ہی عجیب تخلیق کار میں ہوتا ہے... سماجی ناہمواریوں کے کڑوے گھونٹ بڑی آسانی سے پی لیتے ہیں... سیاست کے خارزاروں اور قید و بند کی صعوبتوں کا بھی مزہ چکھ چکے ہیں... اظہار کے لیے ان کی بے چین روح نے ہمیشہ سیاست کو ہی چُنا ہے... یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں حقیقتوں کا ادراک بہت اور قطع نظر آتا ہے... کہانی لکھنے کا سلسلہ تاحال جاری ہے... آفس جب بھی آنا ہوتا ہے... بیڑی کا ایک بنڈل... میرا مطلب ہے کہانی کا ایک بنڈل میری میز پر لیٹا پڑا ہوتا ہے... اُمید ہے کہ لکھنے کا یہ موڈ طویل عرصے تک برقرار رہے گا...

# رجعت

ہر درد کا علاج فراموشی میں ہے
کب تلک دلِ اداس کو وقفِ الم کریں

انسان اگر گھر سے باہر قدم نکالتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے وہ کب واپس آئے گا... کیونکہ وہ یہ کام ارادتاً کرتا ہے... مگر کسی کسی کی قسمت میں اس کے برعکس لکھا ہوتا ہے... اس کے قدم بھی گھر سے باہر نکلنے کے لیے اٹھے تھے اس کی مرضی اور منشا کے بغیر... ایک سیدھی سادی لڑکی کا قصہ... حالات نے اسے گھر بدر کردیا تھا...

ایک دولت مند اور بے حال کی اندھی رفاقت کا فسانۂ عبرت......

بیس برس بعد میں ایک بار پھر اُس پگڈنڈی پر چل رہی تھی جو کھیتوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی میرے گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ ان بیس برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا...... نہیں بدلے تھے تو یہ کھیت نہیں بدلے تھے اور ان کی ہریالی نہیں بدلی تھی۔ جب میں نے گاؤں چھوڑا تھا یا یوں کہیے کہ جب مجھے گاؤں سے اٹھایا گیا تھا تو میں سترہ برس کی تھی۔ میری شادی پندرہ برس میں ہوچکی تھی اور ایک بچے کو بھی جنم دے چکی تھی جس کا نام ہم نے مل کر اکبر رکھا تھا۔

"نہ جانے اب اکبر کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا؟" میں نے سوچا لیکن پھر فوراً ہی میرا ذہن مجھے اکبر کے باپ یعنی میرے شوہر کی طرف لے گیا۔

سائیں ڈنو سے جب میری شادی ہوئی تھی تو وہ اٹھارہ سال کا تھا۔ وہ وڈیرے کا ملازم تھا بلکہ وڈیرے کا اصل آدمی تھا اور یہی وجہ تھی ہماری شادی کی۔ سائیں ڈنو کارندہ تھا لیکن اس کے خواب بہت بڑے تھے پھر یہی خواب اُسے جرم کی

طرف لے گئے تھے۔ میں اسے منع کرتی تھی لیکن پھر خود بھی آہستہ آہستہ اس کے خوابوں میں اترتی چلی گئی۔ میرا نام شمع تھا ایسی شمع جس کا ایک ہی پروانہ تھا لیکن کہانیوں اور روایتوں میں تو شمع کے گرد پروانہ جل جاتا ہے لیکن یہ پروانہ کچھ مختلف تھا۔ اس نے خود کو جلانے کے بجائے مجھے ایسے جہنم میں جھونک دیا تھا جس سے میں پچاس برس بعد نکل سکی تھی۔

اُس روز میں گھر میں اکیلی سائیں ڈنو کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے لکڑی کے چولھے پر پانی گرم کرنے رکھ دیا تھا کیونکہ گھر میں کچھ تھا بھی نہیں تو کیا پکاتی۔ ایک روز پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سائیں ڈنو رات دیر سے گھر آیا تھا اور آتے ہی کھانے کی فرمائش کی تھی۔

''کچھ دے کر گیا تھا جو میں پکاتی۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''تو کیا بھوکا مارے گی مجھے؟'' اس نے کہا

''تجھ سے پہلے تو میں مرجاؤں گی اور مجھ سے پہلے ہمارا بیٹا اللہ کو پیارا ہوجائے گا۔'' میں نے کہا۔

''ایسا کیا ہوگیا؟'' سائیں ڈنو کے لہجے میں تاسف تھا۔

''صبح میں نے کہا تھا کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے اور تو نے کہا تھا شام میں لیتے ہوئے آؤں گا اور اب اتنی رات کو آیا ہے، وہ بھی خالی ہاتھ......'' میں نے کہا۔

''تو صبح سے بھوکی ہے؟'' سائیں ڈنو نے کہا۔

''آدھے گلاس دودھ پر ہوں صبح سے۔ وہ بکری جسے تو بکرا عید پر بیچنے جا رہا تھا، اس میں سے ایک گلاس دودھ نکلا تھا آدھا اکبر کو دیا اور آدھا میں نے پی لیا۔'' میں نے کہا اور میرا فقرہ مکمل ہوتے ہی ڈنو تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ ''میں آتا ہوں کچھ لے کر۔'' وہ یہ کہتا ہوا نکل گیا تھا اور میں سوچنے لگی کہ گاؤں میں کون سے ہوٹل کھلے ہیں کہ یہ وہاں سے کھانا لائے گا لیکن جب وہ واپس آیا تو اس کے پاس دو روٹیاں اور اس پر موجود اچار دیکھ کر میری بھوک اور بڑھ گئی تھی۔ روٹی اور اچار کے ساتھ وہ ایک مگ میں دودھ بھی لایا جو اس نے یقینی طور پر

کسی کی گائے سے نکالا تھا۔
میں نے اور سائیں ڈنو نے ایک ایک روٹی کھائی اور کچھ دودھ میں نے بیٹے کو پلایا تھا۔ باقی کا دودھ میں نے اگلے دن کے لیے رکھ دیا تھا۔
''چائے نہیں پلائے گی؟'' سائیں ڈنو نے فرمائش کی تھی۔
''پتی میں اپنے میکے لینے جاؤں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
''تیرے گھر والوں نے تجھے دے دیا یہی بہت ہے۔'' سائیں ڈنو نے کہا اور اس کے ساتھ ہی چارپائی پر ڈھے گیا اور تھوڑی دیر میں اس کے خراٹے گونجنے لگے تھے۔ اگلی صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہوا اور گھر سے نکل گیا پھر جب واپس آیا تو اس کے پاس چائے کی پتی کا ڈبا تھا۔
''رات تو نہیں بنائی اب صبح تو چائے بنا دے تاکہ میں وڈیرے کے گھر جا کر کام پورا کر سکوں۔'' ڈنو نے کہا۔
''جو مزدوری ملے اسے جوئے میں ہارنے مت چلے جانا۔'' میں نے اس وقت کہا جب وہ گھر سے نکل رہا تھا۔
''کل تیری حالت دیکھ کر رات ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جُوا نہیں کھیلوں گا۔'' ڈنو نے گھر سے نکلتے ہوئے کہا لیکن میں جانتی تھی کہ اس طرح کی بات وہ دس بار پہلے بھی کر چکا ہے لیکن جیسے ہی اس کے پاس کچھ پیسے آتے ہیں وہ جوا کھیلنے بیٹھ جاتا ہے۔
وہ اُس روز سویرے ہی نکل گیا تھا لیکن دو گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا کہ سائیں آرہے ہیں اس کے لیے اچھی سی چائے بنا دے۔
پانی تو کھول ہی چکا تھا۔ میں نے جلدی سے اس میں پتی ڈالی اور گھر کے ٹوٹے ہوئے مگوں میں جو بہترین مگ تھے ان میں چائے نکالی۔ اتنے میں سائیں پردہ ہٹا کر گھر میں داخل ہو چکے تھے اور ڈنو وہ جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں وڈیرا سائیں کو بٹھائے پھر اس نے اس چارپائی جس پر وہ رات سویا تھا۔ چادر بچھائی اور سائیں سے کہا۔ ''سائیں آپ کے لائق تو نہیں مگر اس پر بیٹھ جائیں۔ شمع چائے لاتی ہی ہوگی۔'' اس کے لہجے میں ایک عجیب سی مسکینیت تھی۔
میں نے کم ٹوٹا ہوا مگ وڈیرے کی طرف بڑھایا اور دوسرا مگ اپنے شوہر کو دے دیا۔
''یار ڈنو تیری بیوی تو بڑی سوہنی ہے کسی جوہری کی دکان سے چُرایا ہے یہ ہیرا؟'' سائیں نے میرے شوہر سے کہا اور میرا شوہر ہی ہی کرکے رہ گیا تھا۔
مجھے پہلی نظر میں وہ اچھے لگے تھے۔ ان کا رنگ بھی کچھ صاف تھا۔ سائیں ڈنو کی طرح کالا بھجنگ نہیں تھا اور اس کے چہرے پر ڈنو کی طرح سے بے ہنگم سی داڑھی بھی نہیں تھی لیکن نہ ہی مجھے اس کا یہ تعریفی فقرہ پسند آیا اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں جو تھا، وہ پسند آیا اور جب اس نے میرے ہاتھ سے مگ لیتے ہوئے جس انداز سے میرا ہاتھ دبایا تھا وہ تو انتہا تھی۔ اب مجھے اس کے خلاف اپنے دل میں نفرت سی ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔
''ڈنو تیری بیوی تو چائے بہت ہی عمدہ بناتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''تو نے سچ کہا تھا کہ ایک کپ میری بیوی کے ہاتھ کی چائے پی لیں تو سارا سر درد ختم ہو جائے گا لیکن سر درد تو پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی غائب ہو گیا تھا۔''
''جی سائیں یہ ایسی ہی چائے بناتی ہے۔'' میرے شوہر نے میری تعریف کی۔
''صرف چائے اچھی بنا لیتی ہو یا کچھ کھانا بنانا بھی آتا ہے؟''
کہنا تو میں یہ چاہتی تھی کہ گھر میں کچھ ہو تو پکاؤں لیکن میں ''جی'' سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔
''ڈنو تیری اتنی سوہنی بیوی ہے اور تو نے اسے اِس حال میں رکھا ہوا ہے؟'' انہوں نے جاتے ہوئے کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے لیکن اس سے پہلے انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ میری طرف بڑھا دیے۔
میں نے انکار کیا تو میرے شوہر نے کہا۔ ''رکھ لے' سائیں اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔'' میں نے نوٹ لے اور مٹھی میں بھینچ لیے۔
نوٹ دیتے ہوئے بھی انہوں نے جس انداز سے میرے ہاتھ کو دبایا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ میں برداشت کر لیتی...... کوئی اور یہ حرکت کرتا تو میں اسے چانٹا بھی مار دیتی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ کون ہے اور اگر میں نے ایسی کوئی حرکت کی تو میرا شوہر میرا کیا حشر کر دے گا۔
سائیں اور میرے شوہر اس کے بعد وہاں رکے نہیں۔ ان کے جاتے ہی میں نے مٹھی سے وہ نوٹ نکالے۔ وہ ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ تھے۔ اتنی دولت ایک ساتھ میں نے تو کیا میرے باپ نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر پرچون کی دکان کا رخ کیا۔ وہاں سے پانچ کلو آٹا اور ایک کلو تیل کے ساتھ دال وغیرہ بھی لیں۔ شام میں جب سائیں ڈنو

گھر آیا تو میں نے کھانا اس کے سامنے رکھا۔

"کہاں سے لائی اس کے لیے رقم؟" ڈنو نے سوال کیا۔

"صبح تمہارے صاحب نے ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ دیے تھے، ان میں سے ہی لائی ہوں۔" میں نے کہا تھا۔

"سب خرچ کر دیے؟" سائیں ڈنو کی آواز میں غصہ تھا۔

"دو ہزار میں آ گیا سب، اکبر کے لیے ایک کلو دودھ بھی اسی دو ہزار میں آ گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے چھ ہزار ابھی تیرے پاس ہیں؟" اس نے کہا۔

"ہیں میرے پاس مگر میں تجھے دوں گی نہیں ورنہ تو جوئے میں ہار جائے گا۔" میں نے کہا اور وہ ہنس دیا۔

"تو واقعی بہت شکی عورت ہے۔ جب ایک بار وعدہ کر لیا کہ اب جُوا نہیں کھیلوں گا تو تجھے اعتبار کیوں نہیں آتا؟" اس نے کہا۔

"جُوا نہ کھیلنے کا وعدہ تو اس سے پہلے بھی دس بار کر چکا ہے لیکن ہر بار وعدہ بھول جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھ سائیں ڈنو بڑے بوڑھے کہہ چکے ہیں کہ جُوا کسی کا نہ ہوا جب کسی کا نہیں ہوا تو تیرا کیسے ہوگا؟ تو کاریگر آدمی ہے محنت اور ایمان داری سے کام کر، اللہ اسی میں ترقی دے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"تو جھلی ہوئی ہے کیا، محنت اور ایمان داری سے کبھی کوئی امیر نہیں بن سکتا بس ایک بار میرا داؤ لگ جائے پھر تیرے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈیاں ہوں گی۔" اس نے مجھے بھی خواب دکھانے شروع کر دیے اور یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے اپنے قریب کھینچنے کی کوشش کی تھی۔

"یہاں نہیں۔" میں نے اس سے دور ہوتے ہوئے کہا۔ "اندر چلو۔" میں نے کہا اور وہ میرے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہوا مگر اندر کمرے میں جا کر میں نے اس سے کہا۔ "پہلے نہا لو تمہارے جسم سے بدبو آ رہی ہے پتا نہیں گرمی میں کہاں کہاں گھومتے رہے ہو۔" میں نے کہا اور اس نے میری بات مان لی۔ اس کے بعد مجھے خود سے قریب کر لیا اور میں نے اعتراض نہیں کیا۔ بہر حال میں اس کی منکوحہ تھی اسی دوران اکبر نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اٹھ کے اسے دودھ دیا۔

میں صبح بیدار ہونے کے بعد باورچی خانے میں گئی اور چائے بنائی اور اس کے ساتھ ہی روٹیاں بنانے لگی۔ اس دوران ڈنو بھی اٹھ گیا اور باورچی خانے میں آ گیا۔ میں نے اسے ناشتا دیا، وہ ناشتے کے بعد چلا گیا اور میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ ڈنو کو گئے ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ وڈیرے سائیں کا بندہ آ گیا اور کہا۔ "سائیں نے تمہیں بلایا ہے۔"

میں اس کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے میں نے پوچھ لیا کہ "کیوں بلایا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "سائیں نے چائے پینی ہے اس لیے بلوایا ہے۔"

"کیا مالکن نہیں ہے وہاں؟" میں نے کہا۔ مالکن سے میری مراد وڈیرے کی بیوی کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔ اس پر وہ مسکرا دیا۔ "انہوں نے اگر ان سے چائے بنوانی ہوتی تو تمہیں کیوں بلواتے؟" اس کا جواب تھا۔

"اگر ان سے نہیں بنوانی تو کیا وہاں کے درجنوں ملازمین بھی نہیں رہے جو انہیں میں یاد آ گئی۔" میں نے کہا۔

اس پر وہ کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے میں جا کر کہہ دیتا ہوں کہ شمع نے آنے سے انکار کر دیا۔" اس نے کہا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟" میں بولی۔

اور وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"میں تو اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر جانا چاہتی تھی۔" میں نے کہا تو سائیں کے بندے نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"سائیں نے صرف تمہیں بلایا ہے۔"

"تو کیا میں اتنے چھوٹے بچے کو گھر میں اکیلا چھوڑ دوں؟" میں نے سوال کیا۔

"کون سی بہت دیر کی بات ہے، بس جانا ہے اور واپس آنا ہے آدھا گھنٹا بھی نہیں لگے گا۔" اس نے مجھے اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کی بات کا اعتبار کیا اور پردہ ہٹا کر باہر نکل آئی۔ باہر وڈیرا سائیں کی کار کھڑی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ پھر جو شخص مجھے لینے آیا تھا، اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی تو وہاں سائیں کا گارڈ موجود تھا۔ وہ کالے رنگ کا دیوہیکل آدمی تھا جسے گاؤں کے سب لوگ "جن" کہتے تھے۔

میرے بیٹھتے ہی کار چل پڑی لیکن اس کا رخ سائیں کی حویلی کی جانب نہیں تھا۔ مجھے شبہ ہوا تو میں نے کہا۔ "یہ کہاں جا رہے ہو؟" لیکن ابھی میرا فقرہ ادھورا ہی تھا کہ جن کا ہاتھ آگے آیا اس کے ہاتھ میری ناک پر جم گئے۔ اس کے ہاتھ میں جو کپڑا تھا، اس میں عجیب طرح کی بو تھی اور میں ہوش سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔

میں نہ جانے کتنی دیر ہوش سے بیگانہ رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کسی بیڈ پر ہوں اور میرے جسم پر کپڑے نہیں ہیں صرف ایک چادر سے مجھے ڈھانپا ہوا تھا۔ پہلا چہرہ جو مجھے نظر آیا، وہ سائیں کا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''میں کہاں ہوں؟'' میری زبان پر آیا تھا۔ میرا مخاطب وہ تھا جو مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''ہم اس وقت کراچی میں ہیں۔'' سائیں نے اپنی مسکراہٹ کو وسعت دی۔

''میں یہاں کیسے آئی؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''تم بیس گھنٹے بے ہوش رہی ہو اس دوران ہم کراچی پہنچ گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''شمع تم اتنی خوب صورت ہو اور وہ گھر تمہارے قابل تھا نہ وہ جواری تمہارے قابل تھا۔'' سائیں نے کہا۔

''وہ جیسا بھی تھا، میرا شوہر ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں۔'' میں نے تڑپ کر جواب دیا۔

''تمہاری خوب صورتی کا تقاضا ہے کہ تم آرام کی زندگی بلکہ عیش کی زندگی گزارو۔'' سائیں نے جتلایا۔

کمرے میں ٹھنڈک تھی اور یہ ٹھنڈک اس مشین سے آرہی تھی جو کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو جسم کے اوپری حصے سے چادر گر گئی اور مجھے زیادہ ٹھنڈک لگی۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا اور سائیں کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

''تم اے سی کی عادی نہیں ہو نا اس لیے ٹھنڈک لگ رہی ہے۔'' سائیں نے کہا۔

''میرے کپڑے کہاں ہیں؟'' میں نے کہا اور سائیں مجھے مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''مل جائیں گے کپڑے بھی بلکہ نئے کپڑے مل جائیں گے صرف کچھ دیر صبر کرو۔'' سائیں نے کہا اور میں اسے دیکھتی رہی وہ یکدم میرے قریب بیڈ پر چڑھ آیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' میں نے روہانسی آواز میں کہا۔

''ڈرامے نہ کرو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا اور جسم سے چادر الگ کردی۔ میں شرم سے دوہری ہوگئی۔ ''میں شور مچا دوں گی۔''

میں نے کہا۔

''اپنا یہ شوق بھی پورا کرلو۔ اس بلڈنگ میں کوئی نہیں ہے جو تمہاری آواز سن کر تمہاری مدد کو آئے گا۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

اس کے بعد وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ مجھے نوچتا اور بھنبھوڑتا رہا تھا اور میں آنسوؤں سے اپنا چہرہ بھگوتی رہی۔ یہ کھیل دو گھنٹے جاری رہا پھر اس نے الماری سے میرے کپڑے نکال کر دیے۔ یہ وہی کپڑے تھے جس میں مجھے گاؤں سے اغوا کیا گیا تھا۔

''جاؤ نہالو۔'' اس نے حکمیہ لہجے میں کہا اور میں فوراً باتھ روم میں چلی گئی۔

میں نے خوب رگڑ رگڑ کر اپنے آپ کو دھویا تھا۔ ایک عجیب سی کراہیت تھی جو میرے ذہن پر چھا گئی تھی۔ میں نے ہر اُس جگہ پر صابن خوب رگڑا تھا جہاں جہاں اس نے مجھے چھوا تھا۔

نہاتے ہوئے میں مستقل روتی رہی تھی۔ سائیں ڈنو مجھے شدت سے یاد آرہا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اس نے مجھے جس حال میں بھی رکھا تھا بہرحال میرا شوہر تھا۔

غسل کے بعد... میں نے کپڑے پہنے اور باہر آگئی۔ وہ جس نے میری عزت کو تار تار کیا تھا، بیڈ پر پیچھے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا مگر اس کی مسکراہٹ مکروہ مسکراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''اسے بند کردیں۔'' میں نے اے سی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ ہنس دیا۔

''میری جان اب تمہیں اس کی عادت ڈالنی ہوگی۔'' پھر کہا۔ ''چلو چائے پلا دو۔'' اور یہ کہہ کر اس طرف بڑھ گیا جہاں کچن تھا۔ میں اس کے پیچھے گئی تھی۔ میرے اپنے سر میں بھی درد ہو رہا تھا اس لیے میں نے اپنے لیے بھی چائے بنائی تھی۔ میں کچن سے نکلی تو وہ ٹیرس میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک اور کرسی تھی جو خالی تھی۔ میں نے چائے اس ٹیبل پر رکھی جو دونوں کرسیوں کے درمیان رکھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے چائے پی لیکن ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میری تمام تر توجہ ان لہروں کی جانب تھی جو سمندر سے اٹھ رہی تھیں۔ مجھے یقین آگیا تھا کہ میں واقعی کراچی میں ہوں۔ چائے ختم کرکے وہ اٹھا اور میں نے وہ ٹرے اٹھالی جس میں چائے لائی تھی۔

اس چائے کے بہانے تم نے مجھے اغوا کروایا تھا اب جو کرنا تھا، کرلیا اور چائے بھی پی لی ہے اب مجھے واپس گاؤں لے جاؤ۔'' میں نے کہا اور وہ ہنسنے لگا۔

''ابھی تو ابتدا ہے جانِ من۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلی جانا گاؤں بھی ابھی تمہیں تمہاری خوب صورتی کا نذرانہ پیش کردوں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ پھر کچھ دیر ہمارے درمیان گفتگو نہیں ہوئی۔ اس کے بعد وہ اچانک اٹھ گیا۔

''چلو تمہیں شاپنگ کرواتا ہوں۔''

میں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ ''چلو۔'' اس نے مجھے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

فلیٹ کے نیچے وہ کار موجود تھی جس میں مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر گھوم کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کردی۔ کار آگے بڑھی تھی لیکن میں ان وسیع سڑکوں کو دیکھ رہی تھی جس پر آگے پیچھے گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ وہ مجھے مختلف راستوں سے لے کر ایک مال میں لایا۔ اتنی بڑی دکانیں میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں پھر ہم ایک ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان میں داخل ہوئے۔ ''جو پسند آئے لے لو۔'' اس نے مجھ سے کہا' اس دوران سیلز گرل ہماری طرف آگئی تھی۔

''آیئے میڈم میں آپ کی مدد کرتی ہوں۔'' اس نے مجھ سے کہا اور میں اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ وہ مجھے لے کر اس طرف گئی جہاں ہر قسم کے تیار لباس موجود تھے لیکن ان پر جو قیمتیں درج تھیں میں انہیں دیکھ کر مسترد کرتی رہی تھی۔ کچھ دیر اسی طرح گزر گئی اور میں نے دیکھا کہ سائیں ہماری طرف آرہا ہے۔

''سر میں نے میڈم کو بہت کپڑے دکھائے ہیں لیکن انہیں کوئی پسند ہی نہیں آرہا۔'' سیلز گرل نے کہا۔

''شمع یہ کیا ہے؟'' اس نے مجھے مخاطب کیا اور پھر سیلز گرل سے کہا۔ ''مجھے دکھاؤ، میں پسند کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور سیلز گرل انہیں لے کر ایک طرف بڑھ گئی تھی۔ میں ان دونوں کے پیچھے تھی پھر سیلز گرل نے ان کپڑوں سے ابتدا کی جو میں مسترد کرچکی تھی۔ سب سے پہلے سائیں نے وہ جوڑا پسند کیا تھا جس پر دس ہزار کا ٹیگ لگا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن سائیں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کچھ کہنے سے روک دیا اور میں خاموش ہوگئی۔

پھر میرے لیے اس نے چھ جوڑے پسند کیے تھے اور


بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

**فتنہ**

مسلمانوں کا پرچم آدھی دنیا پر لہرا رہا تھا کہ اس فتنے نے مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا

**سلام عقیدت**

سو سالہ معمر شخص نے کورونا کے خلاف انوکھے انداز کی جنگ چھیڑی تھی

**قابل ذکر**

جنگ ستمبر میں شعرا، گیت نگاروں اور گلوکاروں نے کس طرح محاذ سنبھالا تھا

**قلمکار**

سری ادب کو پروان چڑھانے والے ایک قلمکار کا مختصر سا تذکرہ اس کے ناول ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے

**فریب محبت**

معصوم لڑکیوں کی زندگی سے کھیلنے والے ایک درندے کی سچ بیانی

اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔

کوئی بھی سوٹ آٹھ ہزار سے کم مالیت کا نہیں تھا۔ ہم وہاں سے نکلے تو وہ مجھے ۔لے۔ ایک بیوٹی پارلر پر لے گیا تھا۔

''سروس دینے پارلر کے باہر جولڑکی آئی تھی، سائیں نے اس سے کہا۔

''سر بالوں کو بھی ٹریٹ کرنا ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''جو کرنا ہے کرو، میں باہر انتظار کروں گا۔'' سائیں نے کہا۔

''سر دو گھنٹے تو لگ جائیں گے۔'' لڑکی نے کہا اور سائیں نے جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں، میں انتظار کرلوں گا۔'' وہ لڑکی مجھے لے کر پارلر میں چلی گئی۔ اس کے ساتھ اس نے مختلف لڑکیوں کو آواز دی۔ اب تین لڑکیاں مجھ پر اپنا فن آزمانے لگی تھیں۔ میرے پیروں اور ہاتھوں سے لے کر میرا چہرہ بھی ان کے نشانے پر تھا۔ وقت لمحہ لمحہ گزر رہا تھا اور پھر اس لڑکی نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ آج تو صاحب آپ کے دیوانے ہو جائیں گے۔'' اس نے کہا اور میں خاموش رہی۔ یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ وہ میرا صاحب نہیں ہے۔ اس نے مجھے اغوا کیا ہوا ہے۔

میں باہر نکلی تو سائیں وہیں موجود تھا۔

''یہ تم نے اس کے بالوں کو کیا کر دیا ہے؟'' سائیں نے کہا۔

''سر یہ.... آج کل فیشن میں ہے۔'' لڑکی نے جواب میں کہا تھا۔

میں نے ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا کیونکہ اس سے پہلے ہی سائیں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا اور میں اگلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔

''اب واپسی۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے سوال کیا۔

''ابھی نہیں، ابھی ایک چیز کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کار اسٹارٹ کی اور پھر ہم ایک جیولری شاپ کے باہر رکے۔ سائیں نے وہاں سے خریداری کی اور وہ سیٹ ڈبے میں بند کر کے میرے حوالے کیا اور کار آگے بڑھا دی۔ میں نے ڈبے کو کھولا اس میں موجود سیٹ پر ایک نظر ڈالی۔

''یہ تو ہیرے ہیں۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا کر ''ہاں'' میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

''یہ تو بہت قیمتی ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''جب تمہاری گردن میں سجے گا تو اس کی تمام قیمت وصول ہو جائے گی۔'' اس نے کہا۔

باقی کا راستہ وہ میری خوب صورتی کی تعریفیں کرتا رہا لیکن میں اس کی باتوں سے الجھن کا شکار ہوتی رہی تھی۔

ہم فلیٹ تک پہنچے تو جتنی دیر میں سائیں کار پارک کرتا، میں سیڑھیاں چڑھ کر فلیٹ تک آ گئی لیکن فلیٹ کی چابی نہیں تھی اس لیے میں دروازے کے باہر کھڑی تھی کہ وہ کار پارک کر کے اوپر آ گیا پھر ہم فلیٹ میں داخل ہوئے۔ میں پیچھے تھی اور وہ آگے تھا۔ وہ سیدھا بیڈ روم میں گیا اس کے ہاتھ میں وہ بیگ تھے جس میں میرے جوڑے تھے۔ بیڈ روم میں آتے ہی اس نے وہ جوڑے نکال کر بیڈ پر پھیلائے اور پھر ان میں سے سب سے مہنگا جوڑا نکالا اور مجھ سے کہا۔ ''یہ پہن لو۔''

میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جوڑا پنک کلر کا تھا میں نے وہ جوڑا پہنا اور آئینے کے سامنے آ گئی۔ ایک لمحے تو میں خود کو پہچان ہی نہیں سکی تھی۔ ابھی میں خود..... کی تعریف میں مصروف تھی کہ وہ میرے پیچھے نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جیولری بکس تھا۔ اس نے بکس میں سے ہار نکالا اور مجھے پہنانا شروع کیا اور ساتھ ہی مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں کچھ نہیں بولی اور اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیولری بکس سے ٹاپس نکالے اور میری جانب بڑھا دیے۔ میں نے ٹاپس کانوں میں پہنے۔ ابھی تک میں آئینے کے سامنے ہی تھی اور دیکھ رہی تھی کہ وہ مجھے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ابھی یہ وقفہ بڑھا نہیں تھا کہ اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور مجھے لے کر بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ میں خاموشی سے وہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ وہ مجھے بیڈ پر لے کر لیٹ گیا اور میرے جسم سے ایک ایک چیز علیحدہ کرنے لگا، کچھ دیر میں، میں اس کے ساتھ شریک ہوتی چلی گئی پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ رات بارہ بجے کے قریب اس نے مجھ سے کہا۔ ''کیا ہم کچھ دیر سمندر کے کنارے ٹہل سکتے ہیں؟''

میں نے انکار کر دیا۔

''مجھ میں ہمت نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اس نے میری بات مان لی۔

میں اس کے بعد سوئی نہیں بلکہ اس چھوٹے سے ٹیرس میں آ کر بیٹھ گئی اور سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ ساحل پر کچھ لوگ اب بھی ٹہل رہے تھے۔ ساحل پر روشنیاں بکھر چکی تھیں اور سب کچھ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی ٹیرس پر ہی تھی کہ مجھے سائیں کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔

اگلی صبح میں نے ناشتا بنایا اور ہم دونوں نے ساتھ ناشتا کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ناشتے میں انڈے کھائے تھے۔ دو مزید دن اسی طرح گزر گئے تھے۔ میں پوری طرح تو نہیں لیکن

کسی حد تک اس ماحول سے مانوس ہوتی جارہی تھی۔

تیسرے دن سائیں نے مجھ سے سوال کیا۔ ''کچھ پڑھی لکھی ہو...؟''

''میں ساتویں میں تھی جب میری شادی ہوگئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''پڑھنا چاہتی ہو؟'' اس نے سوال کیا اور میں نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

اس کے دو دن بعد میری ٹیوٹر آگئی اور میری تعلیم کا رکا ہوا سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔

دو برس میں میٹرک کرلیا تھا۔ سائیں ہر پندرہ دن بعد گاؤں چلا جاتا اور ہفتے بعد آتا تھا۔ یہ ایک ہفتہ جو وہ گاؤں میں گزرتا تھا، میرا وقت کتابوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ گاؤں جاتے ہوئے وہ ڈرائیور کو چھوڑ جاتا تھا اور مجھے آزادی تھی کہ میں جہاں چاہوں جاسکتی ہوں لیکن میں نے ایک بار بھی گاؤں واپس جانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ دس برس اسی طرح گزر گئے۔ واپس جانے کے بارے میں اس لیے نہیں سوچا تھا کہ جانتی تھی کہ وہاں مجھے مار دیا جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سائیں ڈنو کس حال میں ہے اور... میرے بعد اکبر کس طرح زندہ رہا ہوگا۔ بی اے کرنے کے بعد میری خود اعتمادی بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک بار جب سائیں گاؤں گیا تو ڈرائیور کے ساتھ ''جن'' کو بھی چھوڑ گیا تھا۔

پہلی رات جب سائیں فلیٹ پر نہیں تھا بارہ بجے کے بعد فلیٹ کی بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ''جن'' باہر موجود تھا۔

''اندر آجاؤں؟'' اس نے کہا تو میں نے انکار کردیا لیکن وہ دھکا دے کر اندر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے لپٹنا چاہا اور ساتھ گالیاں بھی دیتا جارہا تھا۔

جب یہ سلسلہ جاری تھا تو میری نظر چھری پر پڑی، میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے چھری اٹھالی' وہ نہ مانا اور... میری طرف بڑھا تو میں نے چھری اس کے جسم میں اتار دی اور پھر اتارتی چلی گئی۔ جب وہ گر گیا تو میں نے اسے چھوڑا تھا۔ ڈرائیور نے پولیس کو طلب کیا اور پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا۔ کچھ دن حوالات میں رکھنے کے بعد جیل... بھیج دی گئی تھی۔

میں نے اپنے بیان میں ''جن'' کی اس وقت کی زیادتی پر بات کی تھی۔ سائیں نے اپنے تعلقات اور دولت کا استعمال کیا لیکن مجھے دس برس کی جیل ہوگئی۔ دس برس جیل میں گزار کر واپس آئی تو سائیں کا انتقال ہوچکا تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ سائیں کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور جب تک... اسپتال پہنچتے اس کا انتقال ہوچکا تھا۔

مرنے سے پہلے سائیں نے وہ فلیٹ میرے نام کردیا تھا۔ اس وقت ڈرائیور وہاں رہ رہا تھا۔ میں جیل سے واپس آئی اور ڈرائیور سے پوچھا۔ ''یہ اچانک ہارٹ اٹیک کیسے ہوا جبکہ وہ دل کے مریض بھی نہیں تھے؟''

''بی بی اُن کی بیٹی نے گھر سے بھاگ کر شادی کرلی تھی، یہ صدمہ ایسا تھا کہ صاحب نے اسے دل پر لے لیا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے پہلے ہی نالاں تھے۔ نوراں کی اس حرکت کا تمام الزام بھی انہوں نے بیوی پر عائد کیا تھا۔''

''لڑکا کہاں کا ہے؟'' میں نے ڈرائیور سے سوال کیا۔

''گاؤں کا ہی ہے' اس کا باپ کارپینٹر تھا اور اسکول کے فرنیچر کے ٹھیکے لیتے لیتے اس نے شہر میں اپنی دکان کرلی تھی اور اس کا بیٹا اکبر دبئی چلا گیا تھا۔ وہ الیکٹریشن تھا' اور اس نے وہاں خوب کمایا مگر باپ کے مرنے پر آیا تو واپس نہیں گیا بلکہ باپ کا کام... سنبھالنے کے ساتھ اپنی الیکٹرک کی دکان بھی کرلی ہے۔ اب گاؤں میں سائیں کے بعد اس کا ہی سب سے بڑا مان ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

یہ پہلا موقع تھا جب میرے اندر ہوک اٹھی تھی کہ میں گاؤں جاؤں۔ گاؤں دیکھنے سے زیادہ مجھے اکبر کو اور اس کی بیوی کو دیکھنا تھا۔ میں ٹرین سے روانہ ہوئی تھی۔ گاؤں سے پہلے میں اسٹیشن پر اتر گئی تھی پھر وہاں سے بس لی اور گاؤں کی طرف روانہ ہوئی۔

سب کچھ بدل چکا تھا۔ پکی سڑکیں بن چکی تھیں۔ گاؤں پہنچی تو وہاں بھی اتنا کچھ بدل چکا تھا کہ پہچان میں نہیں آرہا تھا۔ میں پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئی تھی۔ بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن میری یادداشت میں بہت کچھ تھا پھر میں اس راستے پر آگئی جہاں سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ اپنا گھر میں نے اس طرح پہچانا تھا کہ گھر کے باہر تختی لگی ہوئی تھی' ایس ڈی کلہوڑو۔

تو سائیں ڈنو امیر ہوتے ہی ایس ڈی ہوگیا تھا۔ گھر کا گیٹ لوہے کا تھا جبکہ میرے گھر میں تو دروازے کی جگہ پردہ ڈلا ہوا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے گیٹ کے ساتھ لگی بیل بجائی اور پھر کچھ دیر میں ایک لڑکی نے گیٹ کھولا۔ ''اکبر ہے گھر پر؟'' میں نے اس بچی سے سوال کیا۔

''بابا تو سویرے دکان پر چلے جاتے ہیں۔'' اس بچی نے کہا۔

''آپ کون ہیں اماں؟'' بچی نے سوال کیا اور میں اس

سے کہہ نہ سکی کہ میں اُس کی دادی ہوں۔
"آپ رکو میں اماں کو بلاتی ہوں۔" بچی یہ کہتے ہوئے اندر کی طرف بھاگی اور ساتھ ہی اماں، اماں کی آوازیں لگا رہی تھی پھر ایک جوان عورت باہر آئی۔ چھوٹی بچی اس کے ساتھ تھی۔
"تمہارا نام نوراں ہے؟" میں نے سوال کیا اور اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔
"آپ کو میرا نام کس نے بتایا؟" اس نے اپنی مادری زبان میں سوال کیا تھا۔
"میں نے صرف یہ پوچھا ہے تم نوراں ہو اکبر کی بیوی؟" میں نے کہا۔ اب اس کی آنکھوں میں حیرت پہلے سے زیادہ پھیل گئی تھی۔
"میرے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو، اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ؟" نوراں نے کہا۔
"فی الحال صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ کراچی سے آئی ہوں۔" میں نے کہا۔
"اتنی دور سے آئی ہو تو باہر کیوں کھڑی ہو؟" نوراں نے کہا اور مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔
"میں چائے لاتی ہوں۔" اس نے کہا اور ساتھ ہی بچی سے کہا۔ "برابر والے ادریس چاچا سے کہو بازار سے کچھ لے آئیں ہمارے گھر کراچی سے مہمان آئے ہیں۔" نوراں نے بچی سے کہا مگر میں کہہ نہ سکی کہ میں مہمان نہیں ہوں۔
"آپ اکبر کے بارے میں پوچھ رہی تھیں، کیا کام تھا اکبر سے آپ کو؟" نوراں نے سوال کیا تھا لیکن میری نظر بیٹھک کی ٹیبل پر اس تصویر پر جم گئی جس میں اکبر کی شباہت مجھے محسوس ہوئی تھی۔
"کام تو کچھ نہیں تھا صرف دعا دینے آئی تھی۔" میں نے کہا اور نوراں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔
"ہزاروں میل کا سفر آپ نے صرف دعا دینے کے لیے کیا تھا؟" اس نے کہا۔
"تو اب تک یہیں کھڑی ہے شمع؟" نوراں نے بچی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
"اس کا نام شمع ہے؟" میں نے کہا۔
"اس کے دادا مرحوم نے یہ نام رکھا تھا۔ اب تو وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔" نوراں بولے جا رہی تھی۔
"شمع اچھا نام ہے۔" میں نے کہا۔
"یہ دراصل اکبر کی والدہ کا نام تھا۔" نوراں نے کہا۔
"بیس سال پہلے وہ اس طرح سے غائب ہوئی تھی کہ اس کا کوئی نشان نہیں مل سکا تھا۔"
"تمہارے سسر نے اسے تلاش نہیں کیا؟" میں نے سوال کیا۔
"بہت تلاش کیا۔ پولیس میں رپٹ بھی لکھوائی مگر کوئی نشان نہیں ملا۔"
"یہ اکبر کی تصویر ہے؟" میں نے اس تصویر کی طرف جس میں مجھے اکبر کی شباہت نظر آئی اشارہ کیا۔
"اسی کی تصویر ہے جب وہ دبئی میں ہوتا تھا۔" نوراں کا جواب تھا۔
"تم چائے بنا رہی تھیں۔" میں نے کہا۔
"ہاں میں نے پانی تو چولہے پر رکھ دیا تھا بس ابھی لائی۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی پھر جتنی دیر میں وہ واپس آئی، میں نے اکبر کی تصویر اپنی قمیص میں چھپالی پھر چائے پیتے ہی میں نے واپس جانے کے لیے کہا مگر اسی وقت ایک جوان آدمی شمع کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تھا۔
"ادریس تیری موٹر سائیکل تو ٹھیک ہے نا؟" نوراں نے سوال کیا۔
"جی بھابی، ابھی اسی پر شہر سے واپس آیا ہوں۔" ادریس کا جواب تھا۔
"یہ اماں کراچی سے آئی ہیں تو انہیں موٹر سائیکل پر لاری اڈے چھوڑ دے۔ اس عمر میں کہاں یہ پیدل بھٹکتی پھریں گی۔" نوراں نے کہا۔
اس کے بعد میں وہاں رکی نہیں۔ ادریس نے مجھے بس اسٹاپ پر چھوڑا اور میں حیدرآباد جانے والی بس میں سوار ہوگئی کیونکہ وہ چلنے کے لیے بالکل تیار تھی۔
حیدرآباد سے میں کراچی کی بس میں سوار ہوئی اور سہراب گوٹھ سے ٹیکسی کر کے اپنے فلیٹ میں آگئی اور آتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اکبر کی تصویر اپنے بیڈ کے سرہانے رکھ دی۔
زندگی کے دن گزار رہی ہوں۔ سائیں بینک میں میرے لیے اتنی رقم چھوڑ گئے تھے کہ آرام سے گزر ہو رہی ہے۔ رات میں ٹیرس پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرتی ہوں اور دن رات اپنے خدا سے ان گناہوں کی معافی مانگتی ہوں جن پر مجھے مجبور کیا گیا تھا۔
آپ بھی میرے لیے دعا کریں کہ مجھے سکون کی موت آجائے باقی اس رحیم و کریم پر ہے کہ وہ مجھے معاف کرتا ہے یا نہیں......

◆◆◆

**حسام بٹ** کی جے-ڈی-پی سے رفاقت کو پینتالیس سال ہو چکے ہیں... جاسوسی کے ساتھ اپنی وابستگی کے دوران اس کا ہر رنگ... ڈھنگ اور ہر روپ دیکھا ہوا ہے... اس کی روزافزوں ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں... بطور کہانی کار ان کی اننگز جاری ہے... ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مشکل پسند انسان ہیں... یہی رنگ ان کے اسلوب اور انداز میں بھی جھلکتا ہے اور یہ ان کی جداگانہ شناخت کا باعث ہے...

# گولڈن جوبلی

انسان سمجھتا ہے کہ دہرے راستوں پر چلنے سے منزل جلد مل جاتی ہے... شاید مل بھی جاتی ہو... مگر تادیر قائم رہنے کے لیے نہیں... خودفریبی اور خودپسندی جیسی علت میں ڈوبے کرداروں کی ایک جھلک...

اپنے کارناموں کی نصف سنچری مکمل کرنے والے کھلاڑی کی اننگز......

اس ریسٹورنٹ کا ماحول نیم تاریک، خواب ناک اور رومان پرور تھا۔ ہلکے میوزک میں کسی نشاط انگیز فضا دلوں کو گدگدانے اور جذبات میں ہلچل مچانے کا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہاں پر عموماً کپلز ہی آیا کرتے تھے۔ وہ ریسٹورنٹ ''ڈیٹ'' کے لیے ایک موزوں اور محفوظ جگہ تھی۔

نازش اور اسد نے اپنے لیے ایک الگ تھلگ کونے والی ٹیبل کا انتخاب کیا حالانکہ وہاں کی ہر ٹیبل ہی پرائیویسی کی امین تھی۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا، کسی کو اِدھر اُدھر

دیکھنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی خیال۔ ان حسین لمحات کو ہر پل اپنی خواہش کے مطابق انجوائے کررہا تھا۔

"اس ریسٹورنٹ کا ماحول زبردست ہے۔" نازش نے گردوپیش پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "یوں محسوس ہورہا ہے، ہم خوابوں کی نگری میں اُتر آئے ہیں۔"

"آج میں بھی یہاں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔" اسد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے اس ریسٹورنٹ کی بہت تعریف سنی ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ یہ جگہ محبت کرنے والوں کے لیے کسی جنت سے کم نہیں۔"

"واقعی..... تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ تائیدی انداز میں بولی۔ "اس جنت میں قدم رکھنے والا ہر انسان اپنے ساتھی میں مگن ہے۔ کوئی کسی کو ڈسٹرب نہیں کررہا۔"

"اس سے پہلے کہ ہم بھی ایک دوسرے میں مگن ہوکر اس جنت نگری میں کہیں کھو جائیں، کچھ آرڈر کرلیتے ہیں۔" اسد نے نازش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ "کھاتے پیتے اور ہنستے کھیلتے گم ہوجانے کا ایک الگ ہی مزہ ہے۔"

نازش نے اسد کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے مینیو کارڈ اٹھالیا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگی۔ اس دوران میں اسد یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد نازش نے کہا۔

"میں تو اسٹرابیری شیک پیوں گی۔ تم اپنے حساب سے کچھ منگوالو۔"

"میرا حساب تم سے جدا تھوڑی ہے۔" اسد نے مخمور لہجے میں کہا۔ "جب زندگی میں ایک ساتھ قدم سے قدم ملاکر چلنے کا فیصلہ کرلیا تو پھر تمہاری پسند ہی میری پسند ہے۔ میرے لیے بھی وہی آئے گا جو تم پیوگی۔ ڈیش فل اینڈ فائنل.....!"

نازش محبت پاش نظروں سے اسد کو دیکھنے لگی۔ اس کے دماغ میں گرماہٹ، دل میں سرسراہٹ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اسد کی معیت میں اسے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

نازش کی عمر تو تیس سال تھی لیکن وہ اپنے خدوخال اور جسمانی ساخت کی بنا پر بائیس تیئیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی خوب صورتی اور دلکشی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ رعنائی سے بھرپور، شاداب بدن کی مالک ایک حسین وجمیل عورت تھی۔

اسد نے دو اسٹرابیری شیک کا آرڈر کیا اور نازش کے ساتھ پیار بھری خوش گپیوں میں مصروف ہوگیا۔ نازش سے اس کی ملاقات کو لگ بھگ ایک ماہ ہوا تھا لیکن اتنے کم عرصے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت زیادہ نزدیک آگئے تھے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا، وہ صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ شاید پیار محبت کے معاملات کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

کم وبیش ڈیڑھ ماہ قبل اپنی ایک حماقت کے نتیجے میں اسد پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور اسے چند گھنٹے حوالات میں گزارنا پڑے تھے۔ اسی مختصری مدت کے دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو اپنی زندگی کا سب کچھ ہار بیٹھا تھا۔ اس ستم نصیب، زخمی جگر شخص کا نام ادریس تھا۔ ادریس کی عمر پینتالیس کے اریب قریب تھی اور وہ حوالات کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے اسد کو بھی اسی حوالات میں بند کردیا تھا۔

اسد، ادریس کے مقابل دوسری دیوار سے کمر ٹکاکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ رات کا وقت تھا۔ ادریس نے نگاہ اٹھاکر اسد کو دیکھا ضرور تھا مگر کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسد کو وہ بندہ بڑا عجیب لگا تھا۔ ادریس کی عدم توجہی اور پُراسرار خاموشی کو دیکھتے ہوئے اسد نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"دوست.....!" اسد نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اس ظالم رات نے ہم دونوں کو اس تکلیف دہ کمرے میں بند کردیا ہے۔ اگر ہم منہ میں زبان دبائے یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے تو ہماری ذہنی اذیت میں اضافہ ہی ہونا ہے۔ اپنی پریشانی کو بڑھانے سے بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بات چیت کریں۔ اس سے ہمارے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں تمہاری تجویز سے اتفاق کرتا ہوں۔" ادریس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "لیکن تم سے میری ایک درخواست ہے۔"

"کیسی درخواست؟" اسد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آئندہ کبھی مجھے دوست کہہ کر مخاطب نہیں کرنا۔"

"دوست کے لفظ سے اتنی نفرت.....!" ادریس کے چہرے پر نظر آنے والے ناپسندیدگی کے تاثرات کی روشنی میں اسد نے کہا۔ "اگر میں غلط نہیں تو تم نے اپنے کسی دوست سے دھوکا کھایا ہے۔ ہیں نا؟"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی یادیں اچھی ہوں یا بُری، زندگی کی آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ میں بھی ایک ایسے ہی دوست کی مہربانی سے یہاں پہنچا ہوں"

"انٹرسٹنگ۔" اسد نے اس کی بات میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "کیا میں تمہارے اس دھوکے باز دوست کا نام جان سکتا ہوں؟"

ادریس نے نہایت ہی کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

"جنید!"

"تمہاری کہانی میں مجھے زبردست ٹوئسٹ نظر آرہا ہے۔" اسد نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں کوئی دقت نہ ہو تو مجھے اپنے حالات کی ہسٹری اور مسٹری کے بارے میں بتاؤ۔"

"جنید کو میں نے اپنی ہر شے سے زیادہ عزیز، اپنے دل کے قریب رکھا ہوا تھا۔" ادریس نے کھوئے کھوئے انداز میں بتایا۔ "یوں سمجھ لو کہ وہ میری جان تھا۔"

اسد نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ "تھا کا تو مطلب یہ ہوا کہ تمہارا وہ دوست اب اس دنیا میں موجود نہیں۔"

"ہاں۔" ادریس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "ایسی ہی بات ہے۔"

اسد کی نگاہ ادریس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے ادریس کی آنکھوں میں جنید کے لیے بے پناہ نفرت موج زن دیکھی۔ اسے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ ادریس اپنے دل و دماغ میں جنید کے لیے غم و غصے کے جذبات رکھتا تھا۔ اس نے ادریس کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر رسان بھرے لہجے میں کہا۔

"اوکے، اوکے...... تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"میں نے کبھی اسے کسی چیز سے منع نہیں کیا تھا۔ میری ذات سے تعلق رکھنے والی ہر شے اس کی تھی۔" ادریس خواب ناک لہجے میں بولا۔ "وہ جب بھی پریشان ہوتا تو سیدھا میرے پاس آتا تھا۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔"

بات ادھوری چھوڑ کر وہ خیالوں میں کھو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ ماضی کے دفینے کی کھدائی میں مصروف ہو گیا ہو۔ اسد نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ جانا اور چاہت بھری نظر سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہا۔ چند


کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے، اعصابی کمزوری دور کرنے، تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔ آپ آج ہی فون کریں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

سیکنڈ کی گمبھیر خاموشی کے بعد ادریس نے کہنا شروع کیا۔
''اس روز، وہ خاصا اُلجھا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کی پریشانی کا سبب پوچھا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔
''یار ادریس! آج تک زندگی کے ہر معاملے میں تم نے میری مدد کی ہے اسی لیے میں تم سے مشورہ لینے آیا ہوں۔ بے روزگاری کے غم نے مجھے اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بتاؤ، میں کیا کروں؟''
''تم نے ہمیشہ جاب کے بارے میں سوچا ہے جبکہ میرا حشر تمہارے سامنے ہے۔'' اس کی بپتا سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''میں نے ساری زندگی ایک لائبریری اور اس میں رکھی کتابوں کو سنبھالنے میں گزار دی ہے۔ جاب میں کچھ نہیں رکھا میرے دوست۔''
''دوسرا کوئی آپشن بھی تو نہیں ہے۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔
میں نے کہا۔ ''میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ تمہیں اپنا کوئی کام کرنا چاہیے۔''
''اپنا کام کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' جنید نے کہا۔ ''اور میرے پلّے تو کچھ بھی نہیں ہے۔''
''اگر تمہیں کہیں سے کچھ سرمایہ مل جائے تو تم کون سا بزنس کرنا چاہو گے؟'' میں نے استفسار کیا۔
''مجھے تو صرف گارمنٹس کی فیلڈ ہی کا تجربہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے دو تین دکانوں پر بطور ملازم یہ کام کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں یہ کام اچھے سے کرسکتا ہوں، خصوصاً گارمنٹس کی سپلائی۔''
''ہوں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔ ''اگر تم چھوٹے پیمانے پر گارمنٹس کی سپلائی کا کام شروع کرو تو ابتدائی طور پر تمہیں کتنے سرمائے کی ضرورت ہوگی؟''
''ڈیڑھ سے دو لاکھ میں ٹھیک ٹھاک طور پر میں اس بزنس کو رن کرلوں گا۔'' جنید نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے، تم کمر کس لو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ دو لاکھ روپے تمہیں میں دوں گا۔''
''تم کہاں سے دو گے؟'' جنید نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''میں تمہاری پوزیشن اور گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم میرے لیے دو لاکھ روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟''
''یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تم مجھے بتاؤ کہ یہ رقم کتنے عرصے میں مجھے لوٹا سکتے ہو؟''
''صرف تین ماہ میں۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔
''تمہارا سرمایہ لوٹانے میں مجھے اس سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''
''تب تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا پھر ایک ماہ کے اندر اندر میں نے جنید کو دو لاکھ روپے دے دیے۔''
ادریس اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو اسد نے پوچھا۔ ''تم نے جنید کے لیے دو لاکھ روپے کا انتظام کیسے کیا تھا۔ ایک ملازمت پیشہ شخص کے لیے یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے؟''
''میرے پاس بی سی (کمیٹی) ڈلتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بلکہ ڈلتی تھی......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پرچیوں میں گڑبڑ کر کے دو لاکھ کا فوری بندوبست کرلیا۔''
''ہاں، میں نے ایسے ہیر پھیر کے بارے میں سنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تو تم نے اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے امانت میں خیانت کر ڈالی؟''
''اسے امانت میں خیانت کہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' وہ بُرا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس بی سی کا ایک ممبر ملک سے باہر تھا۔ میں نے اس سے پندرھویں بی سی دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ بس، میں نے اپنی ایک خاص ٹرک کی مدد سے اسی ماہ اس کی بی سی نکال دی اور دو لاکھ کی رقم جنید کے حوالے کردی تاکہ وہ اپنا بزنس اسٹارٹ کر سکے۔ جنید نے تین ماہ بعد رقم واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا اور میرے اس بیرونِ ملک مقیم دوست کی بی سی کا نمبر آٹھ ماہ بعد تھا۔ وہ اس سے پہلے مجھ سے تقاضا نہ کرتا اور تب تک تو جنید یقیناً مجھے رقم واپس کر ہی دیتا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''
''کچھ بھی ہو مگر یہ بے ایمانی ہی شمار ہوگی۔'' اسد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''تم کچھ بھی سمجھو، مجھے اس کی پروا نہیں۔'' وہ روکھے پھیکے لہجے میں بولا۔ ''میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ دوستی کا مطلب ہے...... دو+ستی...... یعنی دوستی نبھانے کے لیے انسان کو ستی ہونا پڑتا ہے۔ دوستی قربانی مانگتی ہے۔ میں نے جنید کی دوستی میں جو بھی کیا، اس پر مجھے کسی قسم کی ندامت یا پچھتاوا نہیں تھا۔''
اسد چند لمحات تک خاموش نظر سے ادریس کے چہرے

کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا جنید نے اپنے وعدے کے مطابق، تین ماہ کے بعد وہ دو لاکھ روپے تمہیں واپس کر دیے تھے؟''

''صرف دو ماہ میں......'' ادریس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''جنید کے پاس گارمنٹس کے کام کا تجربہ تھا۔ اسے اپنا کام جمانے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ اس نے محنت کی اور آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ چند سال میں وہ گارمنٹس کی دنیا کا ایک بڑا نام بن گیا۔ میں جنید کی اس روز افزوں ترقی سے بہت زیادہ خوش تھا اور بے حد افسردہ بھی......''

بات کو نامکمل چھوڑ کر وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

اسد نے اسے گم گشتگی سے بچانے کے لیے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''افسردہ کیوں......؟''

''جنید جب بے روزگار تھا تو ہماری روز ہی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ باقاعدگی سے ہمارے گھر بھی آیا کرتا تھا۔ وہ فرمائشیں کر کر کے میری بیوی سے اپنی پسند کی ڈشز بنوایا کرتا تھا لیکن گارمنٹس کے تیزی سے پھیلتے ہوئے بزنس نے جنید کو حد درجہ مصروف کر دیا تھا۔ اب ہمیں ملے ہوئے کئی کئی ماہ گزر جاتے تھے۔''

اسد نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر تو تم نے جنید کو دیکھے بغیر جینے کی عادت ڈال لی ہوگی اور یہی تمہاری افسردگی کا سبب بھی تھا۔ تم جنید کو اپنی جان سمجھتے تھے۔ کوئی اپنی جان کے بغیر بھلا کیسے جی سکتا ہے۔ اس کے لیے جگر خون کرنا پڑتا ہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا......؟''

اسد کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ادریس چند لمحات تک ٹٹولتی نظر سے اسے گھورتا رہا پھر جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔

''اگر میرا انٹرویو مکمل ہو گیا ہو تو کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ......''

''تمہاری کہانی کے انجام سے آگاہی پر ہی یہ انٹرویو مکمل ہوگا۔'' اسد نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن میں تمہاری فرمائش کو ٹال بھی نہیں سکتا۔ تو سنو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''میرا نام اسد ہے اور مزاجاً میں ایک بھونرا ہوں۔ کلی کلی منڈلاتا ہوں اور ان کا رس چوس کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ میں عموماً ایک امیر زادے کے روپ میں خوب صورت اور دولت مند عورتوں کو ٹارگٹ کرتا ہوں اور انہی کی دولت کے طفیل ان کے حسن و جمال سے مستفید ہوتا ہوں۔ میری زندگی عیش و آرام سے گزر رہی ہے۔ میں نے کبھی کسی ذمے داری کی زنجیر کو اپنے پاؤں کے نزدیک بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ مجھے اپنے فن میں بے پناہ مہارت حاصل ہے۔ میں غیر محسوس انداز میں اپنی باتوں کا جادو جگا کر شکار کرتا ہوں لیکن کبھی کبھار مجھ سے ٹارگٹ کو سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں، میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہوں مگر میں پولیس والوں سے مک مکا کرنے کا بھی ماہر ہوں۔ چند گھنٹے حوالات میں گزارنے کے بعد میں دوبارہ آزاد فضا میں سانس لینے لگتا ہوں۔ اب کی بار بھی ایسا ہی ہوگا۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر کے ساتھ ڈیل کر لی ہے۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں حوالات سے باہر ہوں گا......تم دیکھ لینا۔''

''تت...... تم تو...... بہت خطرناک انسان ہو۔'' ادریس نے محتاط انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسد نے ترکی بہ ترکی پوچھ لیا۔ ''کیا جنید سے بھی زیادہ خطرناک؟''

ادریس جز بز ہو کر رہ گیا اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اسد کے سوال نے اسے سپردِ عذاب کر دیا تھا۔

☆☆☆

ویٹر نے اسٹرابیری کا شیک سرو کر دیا تھا۔ لو برڈز کے چونچلے جاری تھے۔ وہ شیک کو اسٹرا کی مدد سے دھیرے دھیرے اپنے اندر اتارتے ہوئے پیار بھری باتوں میں مصروف تھے۔ یکایک نازش نے پوچھ لیا۔

''اسد! تم نے فیوچر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''ظاہر ہے، ہمارا فیوچر شاندار ہوگا۔'' اسد نے گول مول جواب دیا۔ ''ہمارے پاسٹ اور پریزنٹ سے کہیں زیادہ تابناک......''

''وہ تو یقیناً ہوگا ہی۔'' نازش نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں دراصل کچھ اور پوچھ رہی تھی۔''

''جو بھی کہنا ہے، کھل کر بولو۔'' اسد اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

''تم سے ملے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کے آس پاس سانس لے رہے ہوں۔'' نازش نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''میں چاہتی ہوں، ہم سدا کے لیے ایک ہو جائیں اور اس کے لیے شرعی رشتے میں بندھنا بہت ضروری ہے۔ تم سمجھ

رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں؟''

''تمہاری خواہش عین فطری ہے نازش۔'' اسد اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔ ''تم سے شادی میری زندگی کا سب سے سہانا خواب ہے۔ میں بھی تمہیں جلد از جلد اپنانا چاہتا ہوں لیکن اس رشتے کو قانونی شکل دینے کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''اسد! میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔'' وہ جذب کے عالم میں بولی۔

''میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے نازش......'' اسد نے جذبات سے معمور لہجے میں کہا۔ ''لیکن ڈیڈی کی واپسی سے پہلے ہماری شادی ممکن نہیں ہے۔''

''تمہارے ڈیڈی کب تک لوٹ آئیں گے؟'' نازش نے پوچھا۔

''ڈیڈی کا بزنس یہاں سے امریکا تک پھیلا ہوا ہے۔'' اسد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں پوری تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ ممی کا میرے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ڈیڈی نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا ہے۔ میں بھی انہیں بے پناہ چاہتا ہوں۔ وہ ڈیڑھ سے دو ماہ میں امریکا سے واپس آجائیں گے۔''

نازش نے ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''اسد! کیا تم نے اپنے ڈیڈی سے ہماری محبت کا ذکر کیا ہے؟''

''آج تک ڈیڈی نے میری ہر فرمائش پوری کی ہے۔'' اسد نے گول مول جواب دیا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' نازش نے کہا۔

''نازش! تم سے شادی کرنا میری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔'' وہ جذباتی ہو گیا۔ ''میں نے ڈیڈی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ انہیں میری پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ جیسے ہی امریکا سے واپس آئیں گے، ہماری شادی دھوم دھام سے ہو گی۔ شادی کے نام پر یاد آیا......''

اسد نے جملہ ادھورا چھوڑا تو نازش نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ ''کیا یاد آیا؟''

''تم ذرا مڑ کر ریسپشنسٹ کو تو دیکھو۔'' اسد نے کہا۔

نازش نے بے ساختہ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اسد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

''اچھا......وہ موٹا گینڈا......''

''میں اس ریسٹورنٹ میں تو آج پہلی مرتبہ آیا ہوں لیکن ادھر ریسپشن پر بیٹھے ہوئے اس ہاتھی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

اسد کی بات نازش کے پلے نہ پڑی تو اس نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''لیکن اس دیوزاد ریسپشنسٹ کا شادی کے ذکر سے کیا کنکشن ہے؟''

''بڑا اسٹرانگ کنکشن ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''یہ بندہ شادی سے پہلے دبلا پتلا کانگڑی سا ہوا کرتا تھا۔ اس نے بھی لو میرج کی تھی۔ اس کی بیوی کو کھانے پینے کا حد سے زیادہ شوق ہے۔ خود تو وہ کھاتی ہی ہے لیکن اس کو کھلا کھلا کر چند ہی سالوں میں رائی سے پہاڑ بنا دیا ہے۔ شادی کے بعد تم میرے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں کرو گی نا......''

اسد کے آخری استفساریہ جملے پر نازش کھلکھلا کر ہنس دی۔

اسی لمحے اسد کے سیل فون پر میسج ٹون بجنے لگی۔ اسد نے فون اٹھا کر دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ڈارلنگ! مجھے دو تین منٹ کے لیے ریسٹورنٹ سے باہر جانا ہو گا۔''

نازش نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''پریشانی والی کوئی بات نہیں میری جان۔'' اسد نے سرسری انداز میں کہا۔ ''بس، میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔ تم چل کرو اور شیک سے دل بہلاؤ۔ میں دو تین منٹ میں لوٹ آؤں گا۔''

''کیا تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ کس کا میسج تھا؟'' نازش اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''اور اس نے تم سے ایسا کیا کہہ دیا کہ تمہیں اٹھ کر ریسٹورنٹ سے باہر جانا پڑ رہا ہے؟''

''میرے ایک ایسے دوست کا میسج ہے جسے تم نہیں جانتی ہو۔'' اسد رسان بھرے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ سڑک کے پار واقع مال میں اپنی فیملی کے ساتھ ہے۔ وہ مجھے کچھ دینا چاہتا ہے۔ اگر تم منع کر دو گی تو میں نہیں جاؤں گا۔''

اس نے نازش کو امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر اسد نے مزید دباؤ ڈالنے کے لیے کہا۔

''میں اپنے اس دوست کو اس ریسٹورنٹ میں نہیں بلانا چاہتا مبادا ہماری محبت کا راز کھل جائے۔ جب تک ہم دونوں

قانونی اور شرعی لحاظ سے ایک نہیں ہو جاتے، میں تمہیں دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ...... کہیں جانے، انجانے میں تمہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔''

نازش، اسد کے اس والہانہ اظہارِ محبت پر خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں درخشاں مستقبل کے خواب ستاروں کے مانند جھلملانے لگے تھے۔

☆☆☆

اسد کے برجستہ استفسار نے ادریس کے اندرون کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسد اس کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا۔ ادریس کی کہانی میں اس کی دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ادریس نے اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے پی سی کے سسٹم میں بے ایمانی سے کام لیا تھا اور اپنے اس فعل کو وہ قربانی کا نام دے رہا تھا۔ اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اچھا ہوں یا بُرا، بہرحال میں نے تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔ مجھے بتاؤ، تمہاری کہانی کا اینڈ کیا ہوا تھا؟''

ادریس کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ ان لمحات میں وہ ہیجانی کیفیت میں دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد وہ مضمحل آواز میں گویا ہوا۔

''اس روز کو میں چاہتے ہوئے بھی اپنی یادداشت سے محو نہیں کر سکتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب صبح میں لائبریری جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو میری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ کچن کو سمیٹنے کے بعد وہ اپنی دوست کی طرف چلی جائے گی۔ ان دنوں اس کی دوست کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ میں نے احتیاطاً گھر کی چابیوں کا ایک سیٹ اپنے ساتھ رکھ لیا کہ اگر میری بیوی کی واپسی میں دیر ہو جائے تو مجھے گھر میں داخل ہونے میں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ خیر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سی سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''مجھے لائبریری میں کام کرتے ہوئے گھنٹا، ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا تھا کہ میرے سر میں شدید نوعیت کا درد اٹھا۔ میں نے فوراً ایک پین کلر ٹیبلٹ لے لی لیکن اس سے ذرا سا بھی افاقہ نہ ہوا۔ لگ بھگ گیارہ بجے میں نے اپنے اسسٹنٹ کو بُلا کر لائبریری اس کے حوالے کی اور آرام کرنے کی غرض سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے بیوی کو اپنی طبیعت کے بارے میں بتانا ضروری نہ سمجھا کہ خواہ مخواہ وہ پریشان ہو جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ میں گھر جا کر تھوڑا آرام کروں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آج کچھ بھی ٹھیک ہونے کا نہیں ہے......''

بولتے بولتے وہ یکایک رکا اور زخمی نظر سے اسد کو تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اذیت کروٹیں بدل رہی تھی۔ چند لمحات کی پُراسرار اور گھائل خاموشی کے بعد وہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''گھر کا بیرونی دروازہ لاک تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میری بیوی اپنی دوست کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔ میں نے دروازے کے کی ہول میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ میرا رخ بیڈ روم کی جانب تھا۔ اس وقت میں نیند کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ میرا سر بھاری اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ درد کی شدت میں اگرچہ قدرے کمی واقع ہو چکی تھی لیکن مکمل آرام ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اپنے گھر کے اندر دو قدم ہی طے کیے تھے کہ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے لگا جیسے وہاں میرے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔'' بات نامکمل چھوڑ کر ادریس نے ایک جھرجھری لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لاکڈ گھر کے اندر کسی کی موجودگی کا احساس بڑا سنسنی خیز اور ناقابلِ یقین تھا۔ میں دبے پاؤں بیڈ روم کی جانب بڑھنے لگا۔ جب میں بیڈ روم کے نزدیک پہنچا تو میرے ہوش و حواس پر گویا آسمانی بجلی گر گئی۔ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور میں پتھر کا بے جان سا بت بن کر رہ گیا۔ میری اس جسمانی اور ذہنی کیفیت کا سبب وہ آوازیں تھیں جو بیڈ روم کے نیم وا دروازے سے میری سماعت تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ مانوس آوازیں میرے دماغ میں ایٹمی دھماکے کر رہی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے سنا۔ میرا عزیز از جان دوست، میری بیوی سے کہہ رہا تھا......

''جانِ من! مجھے تمہاری حالت پر بڑا ترس آتا ہے۔ تم ادریس جیسے خشک اور فلسفی ٹائپ مرد کے ساتھ کتنی پھیکی اور بور زندگی گزار رہی ہو۔ سارا دن لائبریری میں بیٹھ بیٹھ کر وہ بھی ایک کتاب ہی بن کر رہ گیا ہے...... ایک مردہ شے......''

جنید کی بات کے جواب میں میری بیوی نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''جانو! میں ایک کمزور اور مجبور عورت ہوں۔ میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔ قسمت کا لکھا تو سب کو بھگتنا ہی پڑتا ہے...... اگر قدرت نے ادریس کو میرے نصیب میں لکھ دیا ہے تو مجھے اسی جہنم میں زندگی گزارنا ہو گی۔''

''نصیب اور قسمت کچھ نہیں ہوتا اور میں قدرت کو بھی

نہیں مانتا۔'' جنید نے فرعونیت بھرے انداز میں کہا۔ ''انسان اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتا ہے۔ اب تم مجھ ہی کو دیکھ لو...... میں نے اپنی محنت اور کوشش سے سب کچھ حاصل کرلیا ہے۔ بس، ایک تمہیں مستقل بنیادوں پر حاصل کرنا باقی ہے۔ میرے دل میں تمہارے لیے ہمیشہ جگہ رہی ہے۔''

''میں بھی تم سے شدید محبت کرتی ہوں جنید۔'' میری بیوی نے مخمور لہجے میں قطع کلامی کی۔ ''اسی لیے میں نے کبھی تمہاری خواہش کو رد نہیں کیا۔ تم نے جب بھی اشارہ کیا، میں ہر حد سے گزر گئی۔ تم کسی طرح ادریس سے میری جان چھڑادو تاکہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہوجائیں ......''

''ایک تو ہم اب بھی ہیں۔'' جنید نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ہم دونوں باہمی تعاون سے ادریس کو، اسی کے فلسفے کی مار، مار رہے ہیں۔ تمہیں اس کا فلسفہ تو یاد ہے نا......؟''

''ہاں......!'' میری بیوی کی زہریلی ہنسی نے میرے دماغ کے پرخچے اڑادیے۔ ''وہ اکثر تم سے کہا کرتا ہے...... جنید! میری ہر چیز تمہاری بھی ہے۔ اگر تم میری ذات سے تعلق رکھنے والی اشیا کو استعمال کروگے تو اس سے مجھے بہت زیادہ خوشی ہوگی۔''

''اور مجھے اپنے دوست کی خوشی کا بہت زیادہ خیال ہے۔'' جنید نے شیطنت سے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے عامیانہ انداز میں کہا۔ ''تم ادریس کی ذات سے جڑی ہوئی سب سے انمول چیز ہو اور میں اپنی خواہش کے مطابق، جب چاہوں، تمہیں استعمال......''

''بس...... میری برداشت جواب دے گئی۔'' ادریس نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''میں اس کے آگے جنید کی بکواس کو سُن نہ سکا۔ اس وقت میرا دماغ ایک متحرک آتش فشاں کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ اس کے لاوے میں میری سوچ کباب بن کر جل بھن گئی تھی۔ میں نے طیش کے عالم میں کچن کا رخ کیا۔ سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کے مقامات بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اب صرف عمل کا وقت تھا۔ میں نے کچن میں سے گوشت کاٹنے والی تیز دھار چھری اٹھالی اور آندھی وطوفان کی رفتار سے بیڈروم کی سمت بڑھا۔ ان لمحات میں مجھ پر ایک جنون سا سوار ہوچکا تھا۔ میں نے کسی غصیلے بدمست ہاتھی کے مانند بیڈروم کے نیم وا دروازے پر ایک زوردار لات رسید کی۔

ایک ہیبت ناک آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میری نگاہ کے سامنے ایک لعنتی منظر اجاگر ہوگیا۔ انتہائی شرم ناک فضا میں، میں نے ان دونوں کو بیڈ پر قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا۔ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے تیز دھار والی چھری کی مدد سے اندھا دھند جنید پر حملہ کردیا اور بے دریغ اسے کاٹتا چلا گیا۔ چند ہی سیکنڈ میں، میں نے اس دغاباز شخص کو ہزاروں مقامات سے زخمی ایک لاش میں تبدیل کردیا۔ جنید نے میرے اعتماد کا خون کیا تھا، میں نے اسے، اسی کے لہو میں غسل دے کر فنا کے گھاٹ اتار دیا۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ادریس نے گردن جھکالی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔ اسد چند لمحات تک خاموش نظر سے اس حرماں نصیب کو دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم نے اپنے تئیں تو کہانی مکمل کردی لیکن میں تمہاری اس المناک داستان کے انجام میں بہت زیادہ تشنگی محسوس کررہا ہوں۔''

ادریس نے گردن اٹھا کر گھائل نظر سے اسد کی طرف دیکھا اور بوجھل آواز میں استفسار کیا۔ ''اور کیا سننا چاہتے ہو......؟''

''ابھی تم نے میرے سامنے جنید کے قتل کا اقرار کیا ہے۔'' اسد نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''لیکن اپنی بیوی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس بے وفائی کی مہم میں وہ بھی جنید ہی کے جتنی قصوروار تھی۔ تم نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟''

ادریس چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے اسد کو دیکھتا رہا پھر اس سے نگاہ چرا کر سپاٹ انداز میں جواب دیا۔ ''میں نے اس عورت کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔''

''مگر کیوں؟'' اسد ٹپٹا کر رہ گیا۔ ''فساد کی اصل جڑ تو تمہاری بیوی ہی تھی۔ تم نے اسے کوئی عبرت ناک سزا کیوں نہیں دی؟''

''میں نے اس عورت کے بدن پر ایک کھرونچ تک نہیں لگائی کیونکہ وہ میری بیوی تھی، دوست نہیں۔'' ادریس نے اسد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' اسد نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''میری بیوی نے جو کچھ کیا، اس کی یہی سزا ہے کہ وہ زندہ رہے مگر زندگی سے بہت دور...... شرمندگی اور پچھتاوے کے آس پاس۔ باقی جہاں تک جنید کا معاملہ ہے تو......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے

ہوئے بولا۔

''وہ میرا دوست تھا اور اس نے اپنی دوستی میں مجھ پر بہت زیادہ قرض چڑھا دیا تھا۔ میں نے تو محض اس کا قرض اتار کر حساب بے باق کر دیا ہے۔''

اسد نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے اپنا قرض اتار کر مجھے مقروض کر دیا ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ادریس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم کیسے مقروض ہو گئے...... میں نے تم پر کون سا ادھار چڑھایا ہے؟''

اسد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''معاف کرنا...... میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے تم سے ایک اہم بات چھپائی تھی۔''

''کون سی بات......؟'' ادریس اضطراری انداز میں مستفسر ہوا۔

''بہت جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔'' اسد نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''فکر نہیں کرو۔ میں تمہارا قرض اتارنے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''میں نے پولیس کے سامنے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔'' ادریس یکا یک روہانسا ہو گیا۔ ''میں تھانے سے عدالت اور عدالت سے سیدھا جیل چلا جاؤں گا۔ باقی کی زندگی جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزرنے والی ہے۔ پلیز......'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''مجھے موت سے پہلے انتظار کی سولی پر نہ چڑھاؤ۔ ابھی بتا دو، تمہارے من میں کیا چل رہا ہے؟''

''میں جن حسین و جمیل عورتوں کو ٹارگٹ کرتا ہوں ان میں ایک چیز کا ہونا ضروری ہے۔'' اسد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اب تک انچاس عورتوں کو شکار کر چکا ہوں۔ ایک اور کو ٹارگٹ کرنے کے بعد میری ففٹی ہو جائے گی اور میں اپنی اس گولڈن جوبلی کا شاندار جشن مناؤں گا۔''

''تمہارا جو جی چاہے، کرنا......'' ادریس نے بے قرار لہجے میں کہا۔ ''بس، تم مجھے اتنا بتا دو کہ تم جن دلکش عورتوں کو شکار کرتے ہو، ان میں کس چیز کا ہونا ضروری ہے؟''

''بے وفائی......'' اسد نے سفاک لہجے میں کہا پھر ادریس سے استفسار کیا۔ ''تمہاری بیوی کا نام کیا ہے؟''

بے ساختہ ادریس کے منہ سے نکلا۔ ''نازش!''

اسد کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

☆☆☆

اس ریسٹورنٹ کے رومان پرور، پُرسکون ماحول میں یکا یک بھونچال آ گیا تھا۔ کیف آور فضا کا شیرازہ بکھرا تو ہر طرف ایک ہلچل نظر آنے لگی۔ وہ واقعہ اتنا سنگین تھا کہ ریسٹورنٹ کے منیجر کو پولیس بلانا پڑی۔ وہاں پر موجود تمام کپلز کو ریسٹورنٹ کے اندر روک لیا گیا تھا اور پولیس اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ ان کی توجہ کا مرکز و محور وہی ٹیبل تھی جہاں نازش اور اسد اسٹرابیری شیک سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر یہ چند منٹ پہلے کی بات تھی۔ اب اسد کا کوئی اتا پتا نہیں تھا اور نازش......!

نازش کی حالت رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ اس کا سر میز کے اوپر ٹکا تھا۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور اس کے منہ سے جھاگ نکل کر میز کی سطح پر پھیل چکا تھا۔ اسی جھاگ کے اندر اسٹرابیری شیک والا گلاس الٹا پڑا تھا۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ نازش اس دنیا سے ہر تعلق ناتا توڑ کر وادیٔ موت میں سکونت اختیار کر چکی تھی۔ پولیس والوں کے عقب سے ریسٹورنٹ کا اسٹاف اور دیگر لوگ نازش کی موت کا بھیانک منظر دیکھ رہے تھے اور نازش کی زندگی کا چراغ گل کرنے والا کہیں دور اپنی گولڈن جوبلی کا جشن منا رہا تھا۔

اسد نے ڈیڑھ ماہ قبل ادریس کے سامنے حوالات کے اندر جس عزم کا اظہار کیا تھا، آج اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ وہ ایسے کاموں کا ماہر تھا۔ نازش کو اپنی فریبی محبت کے جال میں پھنسانے کے لیے اسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ آج ریسٹورنٹ کی طرف آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ ایک زود اثر زہریلی ٹیبلٹ بھی لایا تھا۔ جب اس کے کہنے پر نازش نے گردن گھما کر موٹے ریسپشنسٹ کی طرف دیکھا تو اسد نے نہایت ہی ہوشیاری سے وہ ننھی سی جان لیوا ٹیبلٹ نازش کے شیک والے گلاس میں ڈال دی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے کسی دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے ریسٹورنٹ سے نکل گیا تھا۔

بے وفائی ایک ناقابلِ معافی جرم ہے۔ مالکِ کائنات نے اس دنیا میں ہر سیر کے لیے سوا سیر بھی پیدا کر رکھا ہے۔ بے وفائی کا ارتکاب کرنے والے مرد و زن کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر کوئی اسد اپنی گولڈن جوبلی کے چکر میں ان کے جیون کا آخری سین، ہائی بیک گراؤنڈ میوزک کے ساتھ فریز بھی کر سکتا ہے۔

❖❖❖

لفظوں میں قید زمانے

**کاشف زبیر** کے لیے مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ہوئے دل دکھ سے لبریز ہو جاتا ہے... کاشف جیسے مصنف برسوں میں پیدا ہوتے ہیں... انسان اور وقت دونوں کی فطرت ایک جیسی ہے، چلے جائیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے... دونوں اپنے پیچھے جاتے ہوئے صرف یادیں چھوڑ جاتے ہیں... کاشف زبیر کی یادیں ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی...

# بغل بچہ

مزاح لکھنا آسان نہیں... مگر کچھ لوگوں میں یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے... وہ لکھنے بیٹھتے ہیں اور لکھتے چلے جاتے ہیں... کاشف زبیر کا شمار بھی ایسے لکھنے والوں میں ہوتا ہے... برجستہ جملوں سے کہانی میں چاشنی پیدا کرنا انہیں خوب آتا ہے... ماضی کی یادیں تازہ کر دینے والی پُرمزاح تحریر... کاشف زبیر کے قارئین کے لیے گولڈن جوبلی کی خاص سوغات...

ایک بچے کی تلاش کا قصہ جو پورے محلے کے لیے دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا......

سوفٹ کی اس ریس میں، میں نے بابو پہلوان کے کتے جبو کو شکستِ فاش دی اور گھر میں گھس کر نہایت پھرتی سے دروازہ بند کرلیا جو ہمیشہ کی طرح کھلا تھا۔ میں نے ہزار بار اپنی پیاری سی گول مٹول بیوی زیتون بانو کو سمجھایا تھا۔

''زینو! دروازہ یوں نہ کھلا رکھا کر۔ کسی دن میرے بجائے ڈاکو آجائیں گے اور تیرے سوا سب کچھ لے جائیں گے۔''

''مثلاً؟'' زینو طنزاً بولی۔ ''میرے خیال میں اس گھر میں میرے سوا کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔''

''مثلاً ابا مرحوم کی وہ گھڑی جو اَب نوادرات میں شمار ہوتی ہے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''آثارِ قدیمہ میں۔'' زینو نے تصحیح کی۔ ''جو اَب دن میں صرف دو مرتبہ درست وقت بتاتی ہے۔ گزشتہ بیس سال سے بارہ بجا رہی ہے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ کیا یہ کبھی چلتی بھی تھی۔ بہتر ہوتا کہ تم اپنے ابا مرحوم کے ساتھ اسے بھی دفنا دیتے۔

دونوں ایک ہی قبر میں خاموش پڑے رہتے۔"

میں نے شوہرانہ برداشت سے کام لے کر زینو کی اشتعال انگیزی کو نظر انداز کیا اور بولا۔ "ڈاکو ہمارا اکلوتا ٹی وی بھی لے جا سکتے ہیں۔"

"لے جائیں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "اب یہ مریخی نشریات دکھانے کے قابل رہ گیا ہے۔ زمین کا کوئی ٹی وی چینل یہ پکڑتا نہیں ہے۔ احسان بھائی نے کتنی بار کہا کہ وہ ہمیں بالکل نیا رنگین ٹی وی لا دیں گے مگر تم مانتے ہی نہیں ہو۔"

"اماں مرحومہ نے مرتے وقت رزقِ حرام اور حرام اشیا سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی تھی۔"

میرے بڑے سالے کسٹم میں سینئر قاصد کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے تنہا ایک رنگین ٹی وی لانا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ حسبِ معمول زینو نے اسے اپنے میکے پر طنز سمجھا اور چلّانا شروع کر دیا۔ "یہ جو گھر کا آدھا خرچ میرے بھائی چلا رہے ہیں، اسے بھی مت لیا کرو۔ تمہاری تنخواہ تو گھر کے کرائے اور بلوں میں نکل جاتی ہے۔"

مجبوراً مجھے پسپا ہونا پڑتا اور نتیجے میں دروازہ ہمیشہ کھلا ہی ملتا۔ اُس روز دروازہ کھلا پا کر مجھے پہلی بار زینو کی عادت اچھی لگی۔ اگر دروازہ بند ہوتا تو وہ بدبخت جمبو یقیناً مجھے بھنبھوڑ چکا ہوتا۔ بابو پہلوان دودھ دہی اور حلوائی کی دکان چلاتا تھا۔ وہ اور اس کا کُتّا ایک سے ایک کینہ پرور اور کمینے تھے۔ بات نہایت معمولی سی تھی۔ میں نے جب تیسری بار بابو کی دکان سے دودھ لیا تو شکایت کر دی کہ پانی میں دودھ کچھ کم ہے۔

پستہ قد، سیاہ رُو اور فٹ بال جیسی جسامت والا بابو نہ جانے کس بنا پر پہلوان کہلاتا تھا، پٹاخے کی طرح اُچھلا اور ہاتھی کی طرح چنگھاڑ کر بولا۔ "مجھ پر الزام لگاتا ہے۔ میں دودھ میں پانی ملاتا ہوں؟"

"پانی میں کم دودھ۔" میں نے صحیح کی۔ "اور یہ درست ہے کہ تم......" میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ بابو

نے اپنے دودھ چلانے والے کرچھے سے مجھ پر قاتلانہ وار کیا تھا۔ اگر میں بروقت پیچھے نہ ہٹتا تو یقیناً میرے سر کے تربوز کے مانند کئی ٹکڑے ہوجاتے۔ اب یہ بابو کی غلطی تھی جس کی وجہ سے میرا پیر سدا کے بدحرام اور کاہل جمبو کی دم پر پڑ گیا۔ کہاں تو وہ ایک لمحے پہلے کسی مردہ کتے سے شرط باندھ کر سویا ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے پورے جوش وخروش سے اچھل اچھل کر بھونک رہا تھا لیکن اس نے کسی کو کاٹنے کی کوشش نہیں کی۔ غالباً اتنے لوگوں کی موجودگی میں اسے اپنے مجرم کو شناخت کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ جس نے اس کی دم پر پیر رکھ کر اس کے خوابِ شیریں میں خلل ڈالا تھا۔ اس کی یہ دشواری بابو نے آسان کی اور جمبو سے چیخ کر کہا۔

''جمبو، ذرا چھوتو اس ایمان زادے کی ٹانگ۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ کنگ سائز جمبو مجھ پر حملہ آور ہوتا، میں نے قریب کھڑے بڑے میاں سے ان کی زندگی کا سہارا لاٹھی چھینی اور جمبو کو چند تسلی بخش قسم کی ضربیں لگائیں جو میری ٹانگ دبوچنے کی کوشش کررہا تھا۔ لاٹھی کھا کر وہ چیاؤں چیاؤں کرتا بابو کے عقب میں جا کھڑا ہوا...... اور اب مالک اور کتا ایک ہی صف میں کھڑے ہوکر مجھ پر بھونک رہے تھے۔ اس کے جواب میں، میں نے دودھ کا برتن نالی میں الٹ دیا۔

''آئندہ میں یہاں سے دودھ لوں تو میری بیوی مجھ پر حرام ہو۔''

یہ قسم کھاتے وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دودھ کی اگلی دکان میل بھر کے بعد آئے گی۔ اُس روز دودھ لاتے لاتے میرا حشر ہوگیا اور چل چل کر میری ٹانگیں لکڑی کی طرح اکڑ گئیں۔ میں نے بھرپور کوشش کی کہ زینو کو ڈبے کا دودھ استعمال کرنے پر آمادہ کرلوں لیکن اس نے میری ہر دلیل اور اپیل نظرانداز کرتے ہوئے واضح کیا کہ اسے صرف بھینس کے دودھ سے دلچسپی ہے۔

''تبھی روز بروز خود بھی بھینس ہوتی جارہی ہو۔'' میں نے نقصِ امن کے خدشے کے تحت یہ جملہ زیرِلب کہا۔

ہمیں اس محلے میں آئے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے حسبِ معمول مالک مکان نے کرایہ نہ بڑھانے اور صرف چھ مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے پر ہمیں مع سازوسامان گھر سے یوں بے دخل کردیا جیسے پولیس بازار سے تجاوزات کو بے دخل کرتی ہے اور جیسے پولیس یہ کام بھتے کی رقم بڑھانے کے لیے کرتی ہے اسی طرح مالک مکان بھی کرایہ بڑھانے کے لیے کرایہ داروں کو انتقالِ مکان پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ بے دخلی کے بعد میں نے جملہ سازوسامان مع بیوی سسرال میں رکھا اور خود کسی نئے مالک مکان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو ایک عدد مکان اور اسے کرائے پر دینے کی نیت رکھتا ہو اور ساتھ ہی آنے والے کرائے دار کے لیے اپنے دل میں کم کمینگی رکھتا ہو۔

خوش قسمتی سے جلد مجھے مطلوبہ صفات کا حامل ایک لینڈ لارڈ مل گیا جو اپنے پورے باشٹھ گز پر بنے سپر لگژری بنگلے کو کرائے پر دینے پر آمادہ تھا۔ کرایہ میری کل تنخواہ کا ساٹھ فیصد تھا اور باقی چالیس فیصد پانی، بجلی، گیس اور ڈاکٹر کے بلوں میں ادا ہوجاتا۔ زینو کو دو ہی شوق تھے۔ ایک کھانا اور دوسرا بہت کھانا۔ وہ آئے دن دردِ معدہ اور بدہضمی کا شکار ہوکر طرح طرح کے چورن اور دوائیں پھانکتی رہتی تھی۔ گھریلو بجٹ کے خسارے کی سب سے بڑی وجہ وہ خود تھی اور اس خسارے کو میں صرف اس لیے برداشت کررہا تھا کہ اس کے بھائی اس خسارے کو باقاعدگی سے پورا کرتے رہتے تھے۔

بڑے سالے کے بارے میں بتاچکا ہوں کہ وہ کسٹم میں سینئر قاصد تھے۔ ان سے چھوٹا سی آئی اے پولیس میں کانسٹیبل تھا اور سب سے چھوٹا صدر میں بریانی اور حلیم کا ٹھیلا لگاتا تھا اور اپنے دو بڑے بھائیوں کی نسبت ذرا حلال کی کماتا تھا۔ وہ تینوں چار کمروں کے آبائی کھنڈر میں رہتے تھے جبکہ مجھے علم تھا کہ بڑے سالے کے سوسائٹی میں دو بنگلے تھے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر ہاؤسنگ اسکیم میں اس کے پلاٹ پڑے تھے۔

چار سال پہلے جب میں تازہ تازہ ایک سرکاری محکمے میں جونیئر اکاؤنٹنٹ بنا تھا۔ وہاں میری ملاقات بڑے سالے سے ہوئی اور جلد یہ ملاقات بے تکلفی کے مدارج طے کرکے دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ وہ اکثر مجھے اپنے گھر لے جانے لگا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان مہربانیوں کے پسِ پشت کیا سازش تھی۔ زیتون بانو تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی لیکن بہ لحاظ وزن وہ تین بہنوں کے برابر تھی۔ اس کی اماں بچپن میں داغِ مفارقت دے گئی تھیں لہٰذا گھر اور باورچی خانے کی تمام ذمے داری اسی پر آگئی اور یہیں سے اس کے اور کھانوں کے درمیان مضبوط تعلقات کا آغاز ہوا جو ہنوز جاری تھا۔ وہ کھا کھا کر اتنی موٹی ہوگئی تھی کہ کوئی ڈیری

فارم کا مالک بھی اسے لے جانے کو تیار نہ ہوتا۔ لہٰذا بھائیوں نے کاٹھ کے ایک اُلو کی تلاش شروع کردی جو مجھ پر آ کر ختم ہوئی۔ مجھ میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو انہیں درکار تھیں۔ چھڑا چھانٹ تھا، سرکاری ملازم تھا اور سب سے بڑھ کر خوش شکل تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا اور اپنی بہن کی تعریفوں کے پُل تعمیر کرنے کے دوران میں یہ بات گول کر جاتے کہ وہ وزن میں کم سے کم بھی مجھ سے دوگنی تھی۔ اگر معلوم ہوتا تو میں شادی کرنے کے بجائے ایک بھینس پال لیتا اور زیادہ فائدے میں رہتا۔

جب میں ایک دلنواز حسینہ (جو میں نے تصور میں سجا رکھی تھی) کو اپنے اردگرد چلتے پھرتے محسوس کرتا اس کی چوڑیوں کی کھنک اور دھیمی سی شیریں آواز سنتا تو انجانے رنگین خیالوں میں کھو جاتا۔ سونے پر سہاگے کا کام اس کے ہاتھوں کے پکے لذیذ کھانوں نے کیا اور رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی جب خاندانی تصاویر دکھانے کے بہانے مجھے زیتون بانو کی تصویر دکھادی گئی۔ یہ شاید نوخیزی کے زمانے کی تصویر تھی جب وہ ایک دُبلی پتلی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ میں ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگیا اور ایک روز ہمت کر کے مدعائے دل زبان پر لے آیا۔ اس کے بھائی تو جیسے پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ انہوں نے جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا کام کیا اور زیتون بانو صرف ایک ہفتے بعد دھم سے میری ویران زندگی میں آ کودی۔ اس کے وزن کی مناسبت سے یہ لفظ ''دھم'' بہت مناسب لگتا ہے۔ سہاگ رات کو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔

''تت...... تم...... تم زیتون بانو ہو؟''

اس نے گھونگھٹ میں شرما کر کہا۔ ''جی سرتاج!''

یکلخت مارے طیش کے میں تھر تھر کانپنے لگا۔ ''اتنا بڑا دھوکا، اتنا بڑا فراڈ۔''

میرے منہ سے پیار بھری باتوں کے بجائے یہ الفاظ سن کر اس نے اپنے خیمے کے پردے جیسا گھونگھٹ الٹ دیا۔ ''سرتاج! خیریت تو ہے۔ نصیبِ دشمناں، آپ کی طبیعت تو خراب نہیں ہے؟''

میں نے دہاڑ کر کہا۔ ''طبیعت نہیں، میرا دماغ خراب ہو رہا ہے اور یہ تمہارے بھائیوں کی کارستانی ہے۔''

''میرے بھائیوں نے کیا کیا؟ انہوں نے تو آپ کے ساتھ نیکی ہی کی۔'' وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

''نیکی! انہوں نے میرے پلّے ایک بھینس باندھ دی۔ یہ بتاؤ تمہارا وزن ایک مہینے میں سو پاؤنڈ سے ڈھائی سو پاؤنڈ کیسے ہوگیا؟'' زینو کے بھائیوں نے مجھے اس کی جو تصویر دکھائی تھی، وہ بقول ان کے صرف ایک مہینے پہلے کی تھی۔

''ہائے اللہ۔'' معاً زیتون بانو نے رونا شروع کردیا۔ ''بھائیوں نے اچھا شوہر ڈھونڈا جو پہلی ہی رات نشہ کر کے آگیا۔ مجھے بھینس کہہ رہا ہے اور میرا وزن تو چار سال سے اتنا ہی ہے۔ میری سہیلیاں میری اسمارٹ نیس پر رشک کرتی تھیں۔''

''وہ شاید بھولو پہلوان کے خاندان سے ہوں گی۔'' میں نے جل کر کہا۔

بعد میں، میں نے پہلی بار لگام پہننے والے گھوڑے کی طرح خاصی اچھل کود مچائی مگر آخرکار مجھے زیتون بانو کو قبول کرنا ہی پڑا۔ سی آئی اے والے سالے نے مجھ پر واضح کردیا کہ اگر میں نے اُن کی بہن کو بلاوجہ تنگ کیا یا کوئی تکلیف دی تو یہ حرکت مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ میرے ساتھ کیا ہوسکتا تھا، اس کا نمونہ دکھانے کے لیے وہ مجھے اپنے ہیڈکوارٹر کے ''خاص کمرے'' میں لے گیا تھا اور وہاں پر مجھے جو ہولناک مناظر دیکھنے کو ملے، اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے ایک تابعدار شوہر بنادیا۔ اگرچہ میں نے جہیز قبول کرنے سے انکار کردیا تھا کہ اس وقت مجھے زیتون بانو سے دلچسپی تھی لیکن بعد میں خاصا پچھتایا تھا۔ شادی کے وقت جو میری تنخواہ تھی، اس میں اضافہ صرف دوگنا ہوا تھا جبکہ مہنگائی میں چار گنا اور بلحاظ وزن میرے خاندان میں تین گنا اضافہ ہوچکا تھا۔ چنانچہ اخراجات اور آمدنی میں توازن خوفناک حد تک بگڑ گیا تھا۔ اب آپ بتائیں کہ میں حرام کھانے پر مجبور نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ میری جھیل جیسی پُرسکون زندگی میں زیتون نامی یہ بھونچال لانے کے ذمّے دار میرے سالے ہی تو تھے۔

میری ڈھائی سو پاؤنڈز وزن کے مساوی دو بیویاں ہوتیں تو گویا میرے ایک ٹکٹ میں دو مزے آجاتے۔ خرچہ بھی اتنا ہی رہتا کیونکہ زیتون بانو کے اخراجات ہر لحاظ سے دو عورتوں کے مساوی تھے۔ وہ دگنا کھاتی تھی۔ اس کا لباس بھی دگنے کپڑے میں بنتا تھا اور دیگر اخراجات بھی اسی لحاظ سے تھے۔ میں نے اپنے خیالوں میں جو گل بدن سجا رکھی تھی وہ گوبھی کا پھول نکلی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بدصورت تھی۔ اس میں سوائے مٹاپے کے کوئی خامی نہیں تھی۔ اپنے خوبصورت نقش و نگار اور پیازی رنگت کے ساتھ وہ ذرا غیر

معمولی صحت مند پیاز نظر آتی تھی۔ وہ سلیقہ شعار تھی۔ اس نے میرے مرغی کے دڑبے سے زیادہ گندے گھر کو آئینے کی طرح چمکا دیا۔ ہاتھ کی لذت کا مقابلہ کسی بڑے سے بڑے ہوٹل کا باورچی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بے شک زینو کے پاس جسمانی حسن نہیں تھا لیکن اس کا وسیع و عریض دل میری محبت سے یوں بھرا تھا جیسے بابو پہلوان کا کڑھاؤ ہمیشہ دودھ سے بھرا رہتا تھا۔ اس کی محبت اور خدمت کی وجہ سے میں نے رفتہ رفتہ اسے قبول کرلیا لیکن پھر بھی کبھی کبھی دل میں ہوک اٹھتی کہ کاش زینو وزن میں نصف ہوتی۔ یہ ہوک عموماً اس وقت اٹھتی تھی جب میری نگاہ بابو پہلوان کی گل اندام بیوی پر پڑتی تھی۔ جسے قدرت نے اپنے دستِ خاص سے تراشا تھا۔ عمر عزیز کے پچیس سال، ایک عدد بچہ اور بابو جیسا شوہر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ بابو کے ساتھ وہ اتنی ہی جچتی تھی جتنی کہ کوئی ہرنی کسی افریقی گینڈے کے ساتھ جچ سکتی تھی۔ میں بابو کی خوش قسمتی اور اپنی بدنصیبی پر کڑھ کر رہ جاتا۔

☆☆☆

اُس روز صبح سے میرا موڈ خراب تھا۔ دن کا آغاز ہی خراب ہوا۔ جب سی آئی اے والا سالا بغیر اطلاع کے نازل ہوا اور زینو نے میرے لیے نہایت محبت سے جو ناشتا تیار کیا تھا، اسے وہ پہاڑی بکرے کی طرح چر گیا۔ بقول اس کے کہ رات بھر ڈیوٹی بھگتانے کے بعد وہ اتنا تھک گیا تھا کہ گھر جانے کی ہمت نہ کرسکا اس لیے ہمارے گھر آگیا جو اس کے دفتر سے قریب ہی پڑتا تھا۔ ناشتا ڈکار کر وہ میرے بستر پر گر کر خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگا اور میں بغیر ناشتے کے جلتے بھنتے دفتر روانہ ہوگیا۔ راستے بھر مجھے بس کے ڈنڈے پر لٹک کر سفر کرنا پڑا۔ اس کے باوجود آدھے گھنٹے تاخیر سے دفتر پہنچا تو وہاں میرے نہایت حلیم الطبع باس آتش فشاں بنے میرے منتظر تھے۔ اکاؤنٹس کی ایک نہایت اہم فائل غائب تھی جو میری تحویل میں تھی۔ ایم ڈی نے اتفاق سے دفتر آتے ہی وہ فائل طلب کرلی اور فائل میری دراز میں لاک تھی۔ نتیجے میں اتنی پھٹکار پڑی کہ موڈ سارے دن کے لیے خراب ہوگیا۔ میں نے جو لنچ منگوایا، اس میں سے مکھی نکلی۔ ناشتے سے محرومی کے بعد میرے پیٹ کو یہ دوسرا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

واپسی میں شام کو بابو پہلوان کی دکان پر معمول سے زیادہ رش تھا۔ میرا تھکن سے اتنا بُرا حال تھا کہ میں صرف گھر جاکر بستر پر گر جانا چاہتا تھا بشرطیکہ سالے صاحب نے اس کی جان چھوڑ دی ہو لیکن میں بابو کی بیوی کے رونے کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ شاید بابو انتقال کر گیا تھا اور اس کی بیوی اپنی جوان بیوگی کا ماتم کر رہی تھی۔ میں نے دلی مسرت چھپاتے ہوئے برابر کھڑے مرزا صاحب سے کہا۔

''افسوس ہوا، اگرچہ مرحوم کو نیک کہنا نیکوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ وہ خوش اخلاقی، خلوص اور دیانت سے اتنا ہی عاری تھا جتنا کہ کوئی پولیس والا ہوسکتا ہے۔ ویسے مرحوم کو ہوا کیا تھا؟ ابھی اس کے مرنے کی عمر تو نہ تھی۔ کیا اس نے اپنی بنائی ہوئی کوئی مٹھائی کھالی تھی؟''

''کس نے؟'' مرزا صاحب کا منہ کھلا رہ گیا۔ ان کے پان زدہ دانت بہار دکھا رہے تھے۔ ''کون مرگیا ہے؟''

''بابو پہلوان۔'' اب کے میں اپنی مسرت نہیں چھپا سکا۔

مرزا صاحب کا منہ مزید کھل گیا۔ اتنا کہ ان کے حلق کا کوا نظر آنے لگا۔ ''بابو کب مرگیا؟'' وہ خفگی سے بولے۔ ''ابھی تو میرے سامنے گھر کے اندر گیا تھا۔''

''مرزا جی! موت کا کیا بھروسا ہے۔'' میں پُر امید لہجے میں بولا۔ ''ممکن ہے اندر جاتے ہی اسے ہارٹ اٹیک ہوگیا ہو۔ چربی اس کے دل و دماغ میں یکساں طور پر بھری ہوئی تھی۔ کرنٹ کھا کر بھی انسان فوراً اللہ کو پیارا ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی فی الفور انتقال کے کئی اسباب ہیں جن میں......''

''بابو فوت نہیں ہوا ہے۔'' مرزا صاحب بولے۔

''پھر کون مرا ہے؟'' میں غور کرتے ہوئے بولا۔

''اجی کوئی نہیں مرا۔'' مرزا صاحب جھنجلائے۔ ''بابو کا اکلوتا بیٹا دوپہر سے غائب ہے۔ نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اسی کی ڈھونڈ مچی ہوئی ہے۔''

''اوہ......!'' مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ ''تبھی بابو کی بیوی اتنا رو پیٹ رہی ہے ورنہ بابو ہرگز اس قابل نہیں......''

''اجی کیا فرمایا؟'' مرزا صاحب چونکے۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ میں گھر جانے کی سوچ رہا تھا کہ کچھ لڑکے ہانپتے کانپتے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بابو کو آواز دی۔ وہ باہر آگیا۔

''کچھ پتا چلا میرے لختِ جگر کا؟'' وہ رقت زدہ لہجے میں بولا۔

''نہیں بابو بھائی۔'' ایک لڑکا بولا۔ ''ہم نے پورا علاقہ چھان مارا ہے لیکن مُنے کا کہیں پتا نہیں چل سکا۔''

”مجھے لگ رہا ہے کہ مُنّے کو اغوا کرلیا ہے کسی مردود نے۔“ مرزا صاحب نے رائے دی۔

بابو نے مرزا جی کو خونخوار نظروں سے گھورا۔ ”مرزا، نہ تیرا منہ اچھا ہے اور نہ تو بات اچھی کرتا ہے۔“

مرزا صاحب نے قطعی بُرا نہیں مانا اور فلفسیانہ انداز میں بولے۔ ”میاں حقائق تو حقائق ہیں۔ اب مُنّا کہیں نہیں مل رہا ہے تو اس کا ایک مطلب ہی رہ جاتا ہے کہ اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے ورنہ صرف تین سال کا بچہ از خود زیادہ دور نہیں جاسکتا۔“

بابو بھی سوچ میں پڑ گیا۔ ”لیکن میرے بچّے سے کسے دشمنی ہوسکتی ہے؟“

”میاں تمہارے تو دماغ پر بھی چربی چڑھ گئی ہے۔ بھلا بچوں سے کون دشمنی کرتا ہے۔ پھر بھی بچے اغوا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ کو خرکار لے جاتے ہیں۔ کچھ کو اونٹوں کی ریس کے لیے اسمگلر اٹھا لے جاتے ہیں اور کچھ تاوان کے لیے اغوا کرلیے جاتے ہیں۔“

ایک صاحب نے گل افشانی کی۔ ”اور کیا، یہ خرکار بچوں سے بیگار کراتے ہیں یا اُن کے ہاتھ پیر توڑ کر ان سے بھیک منگواتے ہیں۔“

کوئی اور بولا۔ ”یہ اونٹ ریس والے کون سے کم ظالم ہوتے ہیں۔ سنا ہے ریس کے دوران میں کتنے ہی بچے اونٹوں کے پیروں تلے آکر مرجاتے ہیں یا ہمیشہ کے لیے معذور ہوجاتے ہیں۔“

یہ سب سن کر بابو پہلوان کا خون خشک ہو رہا تھا۔ وہ دہاڑا۔ ”بند کرو یہ بکواس۔“ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر گڑگڑایا۔ ”یااللہ! میرے مُنّے کو خرکار اور اونٹ ریس کرانے والے نہ لے گئے ہوں۔ بے شک اُسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہو۔ میں اپنے مُنّے کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

بابو کی بات پر مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ اگرچہ ماحول نہایت سنجیدہ بلکہ رنجیدہ تھا۔ ہر شخص دل گرفتہ نظر آرہا تھا۔ حتیٰ کہ جمبو بھی ایک طرف نہایت متانت سے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر لپکنا تو درکنار، بھونکنا بھی مناسب نہ سمجھا تھا۔ ہنسی اس وجہ سے آرہی تھی کہ ایک باپ خود اپنی اولاد کے اغوا ہونے کی دعا مانگ رہا تھا تاکہ تاوان ادا کرکے اسے چھڑا سکے لیکن میں نے خود پر قابو کیا۔ ایسے ماحول میں ہنس کر میں خود کو تماشا نہیں بنوانا چاہتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ میری


## قارئینِ بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ بیرون ملک ڈاک خرچ پر تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کردیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کررہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کردی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

ہنسی پر مشتعل ہو کر بابو، جمبو کو مجھ پر چھوڑ دیتا۔ مجھے بچّے کے غائب ہونے کا افسوس تھا لیکن ساتھ ہی بابو کو پریشان دیکھ کر ایک کمینی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

''بابو! پولیس میں رپورٹ درج کراؤ۔ ممکن ہے بچہ ابھی شہر میں ہی ہو۔'' مرزا صاحب نے مشورہ دیا۔

بابو فوراً تھانے روانہ ہو گیا اور جاتے جاتے اہلِ محلہ سے ایک بار پھر اپنے بچے کو تلاش کرنے کی درخواست کر گیا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ سب ہی تعاون پر آمادہ ہو گئے۔ مرزا صاحب نے ٹولیاں بنا کر روانہ کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے مجھے بھی ایک ٹولی میں شامل کر دیا۔ ظاہر ہے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا، محلے میں اپنے اکلوتے دشمن کے اکلوتے لختِ جگر کی تلاش شروع کر دی۔ گلی، محلے چھانے، گھر گھر پوچھا۔ دو گھنٹے بعد جب ہم واپس آئے تو نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی برآمد ہوا تھا۔ بچہ بدستور غائب تھا۔ بابو تھانے میں رپورٹ لکھوا آیا تھا اور اب کچھ پولیس والے بہ غرضِ تفتیش اس کی دکان پر نہایت رغبت سے کھوئے والے دودھ اور مٹھائیوں پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ مجھ پر کوئی اور اُفتاد پڑتی، میں فوراً گھر روانہ ہو گیا جہاں زینو آتش فشاں بنی میری منتظر تھی۔

''کہاں غائب تھے تم پورے تین گھنٹے سے؟'' وہ جارحانہ انداز میں بولی۔

میں چڑ گیا۔ ''تمہارے ابا مرحوم کو تلاش کر رہا تھا۔ سنا ہے دوزخ سے فرار ہو گئے ہیں۔''

''کیا...... کیا...... تم نے ابا جان کو دوزخی کہا۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''تمہارے ابا کیا تھے؟''

''دیکھو، میرے ابا کو کچھ نہ کہنا۔ اُن کی کسی اولاد نے حرام نہیں کمایا۔''

''تم مجھے میکے کا طعنہ دے رہے ہو۔ جب شادی کی تھی تب نہیں معلوم تھا کہ میرے بھائی کیا کماتے ہیں۔ مجھے پتا ہے تم نے مجھ سے شادی ہی اس لیے کی تھی کہ باقی عمر آرام سے بیٹھ کر کھاؤ......''

اس سے پہلے کہ حالات قابو سے باہر ہو جاتے اور میں رات کے کھانے سے بھی محروم ہو جاتا، میں نے فوراً مصالحانہ رویّہ اختیار کیا۔

''میری پیاری بیوی، مذاق بھی نہیں سمجھتی۔ ارے میں تمہارے ابا کو بھلا دوزخی کہہ سکتا ہوں؟'' میں نے جلدی سے کان پکڑے۔

''نہیں، تم سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔'' وہ رونے کے قریب تھی۔ اگر وہ رونا شروع کر دیتی تو یہ پروگرام کئی گھنٹوں پر محیط ہو سکتا تھا۔

''میری جان، یہ سب مذاق تھا۔ تمہاری محبت اور لذت بھرے کھانوں کی قسم۔'' میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ''اس وقت میرے پیٹ میں میرے سالے، میرا مطلب ہے چوہے دوڑ رہے ہیں۔ ناشتے کے بعد دوپہر کا کھانا بھی آج نصیب نہیں ہوا۔ صبح شکل جو ایسی دیکھی تھی۔'' آخری جملہ میں نے زیرِ لب کہا ورنہ رات کا کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔

''کھانا تو تیار ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''مجھے معلوم تھا آج تم بھوکے ہی واپس آؤ گے۔''

''ایسا ویسا۔ اگر آدھے گھنٹے اور کھانا نہ ملا تو تمہیں کھا جاؤں گا۔'' میں نے باتھ روم جاتے ہوئے کہا اور جب میں نہا دھو کر نکلا تو اپنے بیڈ روم کے بستر پر اس بچے کو خوابِ خرگوش میں مگن دیکھ کر بھونچکا رہ گیا جسے کچھ دیر پہلے سارے علاقے میں ڈھونڈ کر آ رہا تھا۔ میں نے چلّا کر زینت بانو کو آواز دی۔ وہ چمٹا ہاتھ میں پکڑے دوڑی چلی آئی۔

''کیا ہوا؟ کیا اب اپنے ابا مرحوم کو دیکھ لیا۔ وہ بھی فرار ہو کر آ گئے۔'' وہ موقع پا کر بدلہ لینے کی ماہر تھی۔

''زینو، تم غضب کرتی ہو۔ جس بچے کو سارے شہر میں تلاش کیا جا رہا ہے، اسے تم نے اپنی بغل میں چھپا رکھا ہے۔'' میں بولا۔

''کیا؟ کون سا بچہ؟'' وہ ہونقوں کی طرح بولی۔

''یہ بچہ، بابو کی اولاد۔ وہ اس کے اغوا کی رپورٹ تھانے میں لکھوا آیا ہے۔ اب تیار ہو جاؤ گرفتاری کے لیے۔ حکومت نے اغوا کرنے والوں کو بھی پھانسی دینے کا اعلان کر رکھا ہے۔ تمہارے لیے تو پھندا اور پھانسی گھاٹ بھی اسپیشل بنوانا پڑے گا۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔'' وہ خفا ہو کر بولی۔ ''میں اتنی آسانی سے مر کر تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی اور کس کی جرأت ہے جو میرے بھیا کے ہوتے ہوئے مجھے پھانسی دلوائے۔ بھیا خود اسے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔''

''وہ تو خیر بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ بچہ یہاں کیسے آیا؟ اس سے پہلے تو یہاں نظر نہیں آتا تھا؟''

''پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے۔ میں نے اس ڈر سے نہیں بتایا کہ تم بابو کا بچہ سن کر اسے آنے سے منع کر دو گے۔ بہت پیارا بچہ ہے اور پیار کو ترسا ہوا بھی۔ اس کی حرافہ ماں کو بننے

سنورنے اور آتے جاتے مردوں سے آنکھ لڑانے سے فرصت نہیں ملتی۔ میں نے ذرا پیار کیا تو روز بھاگ کر میرے پاس آجاتا ہے۔"

"اور تم نے اسے یہاں سُلا لیا۔ وہاں اس کی ڈھونڈیا مچی ہے اور بقول تمہارے اس کی حرافہ ماں پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"میں بہری نہیں ہوں۔ آہستہ بات کرو۔ وہ کمینی ڈراما کر رہی ہوگی۔ اتنی فکر ہوتی تو اتنے چھوٹے بچے کو باہر نکلنے کیوں دیتی اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں بھی اس کی کچھ زیادہ ہی فکر ہے۔" وہ حسد سے بولی۔ "ویسے بھی بچہ اتنی اتنی دیر میرے پاس رہتا ہے، آج سے پہلے تو اس کی ڈھونڈیا نہیں مچی۔"

"خیر، خیر۔" میں جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔ "بچہ مجھے دو، میں اس کے گھر دے آؤں۔ بے چاری ماں کا رو رو کر بُرا حال ہے۔"

"بچہ دینے جا رہے ہو یا اس بہانے اس کی ماں کا دیدار کرنے؟"

"لاحول ولاقوۃ۔" میں نے بھنّا کر کہا۔ "تم عورتوں کے دماغ میں سوائے شک کے کچھ نہیں ہوتا۔ میں جا کر اس کے باپ کو بلا لاتا ہوں۔ وہ خود آ کر اپنے لختِ جگر کو لے جائے گا۔"

مجھے احساس تھا کہ زیتو بچے کی کمی بری طرح محسوس کرتی ہے لیکن اس میں بھی قصور اس کے بے تحاشا مٹاپے کا تھا۔ ہائی بلڈ پریشر کے باعث وہ دو مرتبہ والدہ محترمہ بننے کا موقع گنوا چکی تھی لہٰذا دوسروں کے بچوں سے اپنی ممتا کی تسکین کر رہی تھی۔ بابو پہلوان کی دکان پر تینوں پولیس والے بدستور شکم پروری میں لگے ہوئے تھے۔ دونوں کانسٹیبل برفی کے ڈونگے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے اور عظیم توند والا حوالدار لسی سے اپنے لالوکھیت جیسے پیٹ کو سیراب کر رہا تھا۔ بابو مسلسل انہیں اپنی داستانِ غم سنا رہا تھا مگر صاف لگ رہا تھا کہ انہیں بابو کی کہانی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

"بابو۔" میں نے اس سے کہنا چاہا۔

"تم چپ کرو۔ مجھے انسپکٹر صاحب سے بات کرنے دو۔" اس نے حوالدار کے عہدے میں زیادتی کرتے ہوئے مجھے جھڑکا، پھر حوالدار سے بولا۔ "صاحب آپ میری تو سن ہی نہیں رہے۔"

"سنیں گے، کیوں نہیں سنیں گے۔" حوالدار اپنی چنگیز مارکا مونچھیں ہلا کر بولا۔ "ذرا اس سے تو نمٹ لیں۔" اس نے دودھ کے کنگ سائز گلاس کو ہلا کر کہا۔

"ضرور، ضرور انسپکٹر صاحب۔" بابو خون کے گھونٹ پی کر بولا۔ "لیکن میری بیوی کا تو کچھ خیال کریں۔ اپنے بچے کی جدائی پر وہ رو رو کر پاگل ہو رہی ہے۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے۔ وہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔"

حوالدار نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ "اتنا ہٹا کٹا مرد ہو کر صرف ایک بچہ۔ ہمیں دیکھ۔ چار گھر والیاں ہیں اور ہر گھر میں چار بچے ہیں۔ ان شاء اللہ اگلے سال فی کس پانچ پانچ ہو جائیں گے۔" پھر اُسے یاد آیا کہ وہ یہاں اپنے خانگی کارنامے سنانے نہیں بلکہ کسی اور کام سے آیا تھا لہٰذا اس نے بادلِ ناخواستہ گلاس چھوڑا اور پولیس کے سب سے پسندیدہ سوال سے تفتیش کا آغاز کیا۔

"تمہاری کسی سے دشمنی؟"

"جناب کسی کو دشمنی تھی تو مجھے اغوا کرتا۔ میرے بچے سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"اوئے دشمنی باپ بیٹا نہیں دیکھتی۔"

"اچھا جی۔" بابو سوچ کر بولا۔ "میرا ایک دشمن بھولا پہلوان ہے۔ اس نے میری چلتی دکان پر قبضے کی کوشش کی تھی۔ جیسے اس کے باپ نے میرے باپ کے اکھاڑے پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری شیر محمد سے بھی میری دشمنی چل رہی ہے۔ جب سے اس نے اپنے، میرا مطلب ہے اپنے باڑے کے دودھ میں زیادہ ہی...... میرا مطلب ہے پانی ملا کر دینا شروع کر دیا، گاہک مجھ سے جھگڑا کرتے تھے۔ میں نے پہلے اسے منع کیا پھر اس سے دودھ لینا بند کر دیا۔ بس تب سے وہ میرا دشمن بنا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں اس نے میرے دودھ کے ڈبوں میں مینڈک ڈلوا دیے تھے۔ یہ سب میری گاہکی خراب کرنے کی سازش تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی دشمن ہیں۔" بابو گویا چپ ہو کر باقی دشمنوں کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ بابو پہلوان موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے دشمنوں کے پیچھے پولیس لگا رہا تھا۔ میرا خون خشک ہونے لگا۔ ظاہر ہے میں بھی اس کے دشمنوں میں شمار ہوتا تھا۔ اگر وہ میرا نام بھی پولیس کے سامنے لیتا اور ممکن ہے پولیس میرے گھر کی تلاشی لیتی اور جب وہاں سے بابو پہلوان کا بچہ برآمد ہوتا تو میرا جو حال پولیس کرتی وہ الگ ہوتا۔ اس کے بعد مجھے پھانسی ورنہ عمر قید تو یقینی ہو جاتی۔ اس

سے پہلے میں کئی بار بابو کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن پولیس کی تفتیش شروع ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر اب میں نے بابو کے بچے کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو سیدھا حوالات جاؤں گا اور میرے سی آئی اے والے سالے کو خبر ہونے تک مجھ پر وہ قیامت گزر جائے گی جو تھانے میں جانے والے ہر بے گناہ شخص پر گزرتی ہے اور جس کے بعد وہ ان جرائم کا اعتراف بھی کر لیتا ہے جو اس کی گزشتہ سات پشتوں میں سے کسی نے نہیں کیے ہوں گے۔ اس دوران بابو بڑے رقت آمیز انداز میں پولیس والوں کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔

''صاحب! میں نے آپ کو سب بتا دیا ہے۔ اب آپ میرے مُنّے کو لا دیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا اور...... جو میرے لال کو تلاش کر کے لائے گا، میں اسے پچاس ہزار روپے انعام دوں گا۔''

ابھی تک پولیس والے روایتی انداز میں رسمی تفتیش کر رہے تھے لیکن پچاس ہزار کا سنتے ہی ان کے انداز میں چستی پیدا ہو گئی اور وہ یوں مستعد ہو گئے جیسے ابھی یہیں کہیں سے بچے کو برآمد کر کے بابو کے حوالے کر دیں گے۔ یہیں کہیں کا خیال آتے ہی میری حالت غیر ہونے لگی۔ ممکن تھا کہ میں بابو پہلوان کے ساتھ نیکی کرتا اور وہ مجھے دریا میں ڈال دیتا۔ یعنی پولیس کے حوالے کر دیتا لہٰذا اس سے پہلے کہ اس کی نظر مجھ پر پڑتی، میں خاموشی سے وہاں سے کھسک لیا۔ مجھے ایک اور اندیشہ بھی لاحق ہو گیا تھا کہ زینو کسی اور کے سامنے بابو کے بچے کی اپنے گھر موجودگی کا اعتراف نہ کر لے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت اس معاملے میں زبان بند رکھنا ہے اور بعد میں کسی ایسی ترکیب سے بچے کو واپس کرنا تھا کہ شبہ ہم پر نہ آئے۔ گھر آ کر میں نے زینو کو حالات اور اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ جوش میں آ کر بولی۔

''ایسی کی تیسی، میں خود بچہ اُن کے منہ پر مار کر آتی ہوں۔ ارے واہ! بچہ آپ ہی آ گیا۔ دیکھتی ہوں وہ ہمارا کیا بگاڑتے ہیں۔ بھیا سے کہہ کر سب کو اندر کرا دوں گی۔''

اس کے کنگ سائز حلق سے کچھ لاؤڈ اسپیکر جیسی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بے وقوف عورت، چپ ہو جا۔ یہ اغوا کا معاملہ ہے اور بچے کے اغوا کا کیس تو اور بھی سنگین ہوتا ہے۔ سنا ہے حکومت اب بچے اغوا کرنے والوں کو سزائے موت دے رہی ہے۔ تیرا بھیا بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ الٹا تجھے بچانے کے لیے سارا الزام مجھ پر رکھ دے گا۔ زندگی رہی تو تجھے بھی مجھ جیسے عقل کے اندھے بہت مل جائیں گے لیکن مجھے زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔''

بات زینو کی سمجھ میں آ گئی اور وہ چپ ہو گئی لیکن میری سمجھ میں کوئی ایسی ترکیب نہیں آ رہی تھی کہ بابو کا بچہ اسے واپس بھی کر دوں اور مجھ پر کوئی الزام بھی نہ آئے۔

''کیوں نہ ہم بچے کو ان کے گھر کے سامنے چھوڑ آئیں۔'' زینو نے اپنی ناقص عقل سے تجویز ایجاد کی۔

''پھول بیگم، تم شاید بھول رہی ہو۔ ہماری گلی کے سرے پر بابو کی دکان سمیت کئی دکانیں ہیں جہاں صبح سے آدھی رات تک لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ کیا ہم سلیمانی چادر اوڑھ کر بچے کو چھوڑنے جائیں گے جو اُن کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہیں۔'' میرے لہجے میں طنز محسوس کر کے زینو خفیف سی ہو گئی مگر زنانہ نفسیات کے مطابق آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔

''ہم یہ کام آدھی رات کے بعد کریں گے جب گلی بالکل سنسان ہوتی ہے۔'' اس نے فوراً دوسری تجویز پیش کی۔

''رات کو وہ تمہارے بڑے بھیا کی صورت والا جمبو کھلا پھرتا ہے۔ ہم بچے کو چھوڑنے جائیں گے اور وہ بھونک بھونک کر سارا محلہ اکٹھا کرے گا۔ میرا تو ویسے ہی جانی دشمن ہے۔''

زینو چراغ پا ہو کر بولی۔ ''تم نے میرے بھیا کو کتے کی صورت والا کہا؟''

''کتے کو ان کی صورت والا کہا ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔ نتیجے میں زینو روٹھ کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھی۔ یوں میں کچھ سکون سے سوچنے کے قابل ہوا۔ اگرچہ اس سکون کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ خاصی دیر ٹہلنے اور سگریٹ کا پورا ایک پیکٹ پھونکنے کے بعد بھی کوئی قابلِ عمل تجویز میرے ذہن میں نہ آ سکی۔ قدرت نے میرے دماغ میں عقل کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی لیکن ساتھ ہی ایک فنی خرابی بھی ڈال دی تھی کہ عین ضرورت کے وقت یہ عقل یوں غائب ہو جاتی جیسے ہماری پولیس موقع واردات سے غائب ہو جاتی ہے۔ بالآخر میں نے مجو خان کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ میرا واحد دوست تھا جو ہنگامی حالات میں کسی کام آنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کے مشوروں پر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ ہی میرے حق میں عبرت ناک برآمد

ہوا۔

مجو خان بیک وقت ایک عظیم شاعر، اعلیٰ پائے کا ادیب، دانشور اور باصلاحیت دروغہ مطبخ یعنی باورچی بھی تھا اور یہ واحد صلاحیت تھی جس کے بل بوتے پر وہ اس دنیائے فانی میں خود کو برقرار رکھے ہوئے تھا ورنہ بحیثیت شاعر، ادیب اور دانشور وہ خاصے عرصے پہلے قاتوں یا ناقدوں کے ہاتھوں وفات پا چکا ہوتا۔ مجو خان، شرّی تخلص کرتا تھا اور اس کا کلام شر انگیزی سے بھرپور ہوتا تھا۔ نتیجے میں ہر مشاعرے سے اس کی واپسی بائی ائر ہوتی تھی یعنی اسے اٹھا کر مشاعرہ گاہ سے باہر پھینکا جاتا تھا۔ مجو خان شرّی کا حوصلہ وصبر قابلِ داد تھا۔ وہ اگلے روز پھر کسی مشاعرے میں پہنچ جاتا۔ اپنے تخلص کے باعث اس کی پولیس والوں سے بھی اچھی سلام دعا تھی اور وہ اکثر تھانے کے دورے پر جاتا تھا جہاں سے واپسی پر اس کی ذہنی اور جسمانی حالت میں حیرت انگیز تبدیلیاں آچکی ہوتی تھیں۔ اس معاملے میں بھی اس کی قوتِ برداشت قابلِ رشک تھی اور کچھ روز کے آرام کے بعد وہ اپنی اصل شکل وصورت پر لوٹ آتا تھا۔ تقریباً ہر قابلِ ذکر ادبی جریدہ مجو کی نگارشات چھاپنے سے انکار کر چکا تھا لیکن ان سب باتوں سے اس کا حوصلہ قطعی پست نہیں ہوا۔ وہ بدستور سطح سمندر سے بلند تھا۔ مجو کمالِ ڈھٹائی سے اپنی شاعری اور تحریروں کو ادبی شہ پارے قرار دیتا تھا حالانکہ میرے خیال میں ان ادبی شہ پاروں سے زیادہ قیمت اس کاغذ کی ہوتی تھی جس پر وہ اپنے قلم سے کلام کے موتی یوں بکھیرتا تھا جیسے بدہضمی کی شکار بکری مینگنیاں بکھیرتی ہے۔ جہاں تک کھانے پکانے کا تعلق تھا، وہ خود کو قدیم مغلئی سے لے کر جدید ترین چینی جاپانی ڈشز کا ماہر قرار دیتا تھا۔ ایسی ڈشیں جو خود چینیوں اور جاپانیوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوں گی۔ ایک موقع پر مجو خان نے خود میرے سامنے اعتراف کرلیا تھا کہ وہ ان کھانوں کو جو خراب ہوجاتے تھے، چینی کھانا کہہ کر اپنے صاحب کے اہلِ خانہ کو کھلا دیتا اور وہ چونکہ نئے نئے دولت مند ہوئے تھے اس لیے خوشی خوشی ان کھانوں کو کھا جاتے تھے۔

مجو کے صاحب کے بنگلے پر چوکیدار نے مجھے آگاہ کیا۔ ”صاحب لوگ ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔“

”ابے...... میں صاحب لوگ سے نہیں، مجو سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے پہچانا نہیں؟“

عمر رسیدہ چوکیدار نے اپنی سال خوردہ عینک درست کی اور سر پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”خو مارا، ہمارا یادداشت بالکل خراب ہوگیا ہے۔ تم مجو خان کا دوست کمال خان ہے؟“

”کمال جمال۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”تمہاری یادداشت ہی نہیں، نظر بھی خراب ہے۔“

چوکیدار خفا ہوگیا۔ ”ہمارا نظر بالکل ٹھیک ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔“

”مجو کہاں ہے؟“

”اندر باورچی خانے میں ہے۔ وہ ہماری بیوی کو کھانا پکانا سکھا رہا ہے۔“

”بیٹے، تمہارا تو دماغ بھی خراب ہے ورنہ اپنی بیوی کو مجو خان جیسے لفنگے کے ساتھ یوں اکیلا نہ چھوڑتے۔“ یہ میں نے دل میں کہا تھا ورنہ چوکیدار اپنی ہم عمر بندوق سے وہیں مجھے مقتول کردیتا۔ میری توقع کے عین مطابق مجو چوکیدار کی نوعمر اور طرح دار بیوی کو کچھ اور ہی سکھانے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں ہڑبڑا کر الگ ہوگئے۔ چوکیدار کی بیوی خاصی بدحواسی کے عالم میں وہاں سے رخصت ہوئی اور جاتے جاتے اپنی زنانہ لغت کے کچھ منتخب الفاظ مجھے سنا گئی۔

”کیوں بے، یہ کیا ہو رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

مجو خان نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے میرے سوال کو نظر انداز کیا اور یوں مجھ سے لپٹ گیا جیسے میں اس کا برسوں سے بچھڑا بھائی ہوں۔

”ابے کمال جمالے، تو کہاں مر گیا تھا؟ اتنے دنوں بعد صورت دکھائی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ تو زن مریدی کرتے کرتے خرچ ہوگیا۔ ایک دو روز میں، میں بھابی کے پاس تعزیت کے لیے جانے والا تھا۔“

”مجو مردود! تیری تو کوئی تعزیت کرنے بھی نہیں آئے گا جب تو رنگے ہاتھوں چوکیدار کی بیوی کے ساتھ پکڑا جائے گا اور وہ تجھے گولی مار کر جہنم رسید کردے گا۔ ویسے کیا تجھے چوکیدار کی آمد کا خدشہ نہیں تھا۔ تو نے دروازہ بھی کھلا چھوڑ رکھا تھا؟“

”بیٹے، وہ عقل سے بالکل پیدل ہے۔ اگر اُس میں ذرا سی عقل بھی ہوتی تو وہ عمر میں خود سے آدھی اور اتنی پُرشباب عورت سے ہرگز شادی نہ کرتا۔ ویسے ہمارے پکڑے جانے کا چانس ہزار میں ایک بھی نہیں ہے۔ اول تو وہ بڑھا دورانِ ڈیوٹی گیٹ سے ہلنے کو گناہ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتا حالانکہ یہ چوکیداری وغیرہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ڈاکو تو ایک طرف رہے، وہ عام چور اُچکوں کو نہیں روک سکتا۔

صرف ملاقاتیوں کے نام پوچھ کر اندر مطلع کر دیتا ہے پھر اس کی نظر اتنی کمزور ہے کہ تین فٹ کے فاصلے سے مجھ میں اور فریج میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا اور وہ جو چپلیں پہنتا ہے، وہ سوگز دور سے اس کی آمد کا اعلان کر دیتی ہیں۔"

"میری بات یاد رکھ۔ تو کسی شوہر کے ہاتھوں ہی مرے گا۔"

"یہ تیرے اندر کا حسد بول رہا ہے۔" مجو ہنسا۔ "ویسے تجھے اتنے عرصے بعد دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

"منافقت مت کر۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اس دخل در معقولات پر تو مجھے قتل کرنے پر غور کر رہا ہوگا؟"

"تو نے سچ کہا۔" اس نے اعتراف کیا۔ "میں پوچھ سکتا ہوں اس وقت تجھے یہاں مرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

مجو کے کہنے پر مجھے اپنا مسئلہ یاد آ گیا۔ ظاہر ہے میں مجو کی اخلاقی حالت سدھارنے نہیں آیا تھا۔ مجو مجھے بنگلے کے باورچی خانے میں لے آیا جو میرے گھر سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ یہاں تین فریج اور ڈیپ فریزر تھے اور سب کھانے پینے کی اشیا سے لبالب بھرے تھے۔ معاً مجھے یاد آیا کہ میں تین وقت کے فاقے سے تھا۔

"یار مجو! کچھ کھانے کو ملے گا؟"

"بول کیا کھائے گا؟" مجو نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔ "ایسا کرتا ہوں کباب رکھے ہیں، وہی گرم کر دیتا ہوں۔"

اس نے فریج سے کباب نکال کر تلے پھر اوون میں رکھ کر گرما گرم نان نکالے۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا اور جب تک میں نے نان کباب کا صفایا کیا، مجو نے دو کپ دودھ پتی تیار کر لی۔ چائے کے بعد اس نے پانچ سو پچپن کا سگریٹ سلگا کر دیا تو میں نے ایک بار پھر رشک و حسد کے جذبات محسوس کیے۔

"مجو، تو ہر لحاظ سے خوش قسمت ہے۔"

"اتنا بھی نہیں۔" مجو سرد آہ بھر کر بولا۔ "صرف کھانا پینا اور عشق لڑانا تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی کا صحیح مزہ اس وقت آتا ہے جب جیب میں لمبا مال ہو۔ خیر تو یہ بتا کہ تیرا مسئلہ کیا ہے؟ کیا تیرے سی آئی اے والے سالے نے تجھے پھر چرس فروشی پر لگانے کی کوشش کی ہے؟"

"نہیں یار! وہ مسئلہ تو میری پھول بیگم نے حل کر دیا تھا۔ میری طرح وہ بھی حرام کی کمائی کے سخت خلاف ہے۔"

"کبھی تیرے گھر کا آدھا بجٹ تیرے سالے پورا کرتے ہیں۔ جیسے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف پاکستان کے بجٹ کا خسارہ بھرتے ہیں۔" مجو خان کی مسکراہٹ میں طنز و خباثت کا تناسب یکساں تھا۔

میں خفت سے بولا۔ "وہ تو میرے سالے اپنی جائز کمائی میں سے دیتے ہیں۔"

"بیٹے اگر جائز کمائی میں ایک پیسا حرام کا شامل ہو جائے تو وہ جائز نہیں رہتی۔ جیسے ایک بالٹی پانی میں ایک قطرہ آب مکروہ کا گر جائے تو پوری بالٹی ناپاک ہو جاتی ہے اور پھر تیرے سالوں کا تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ ان کی کمائی کے سمندر میں شاید ایک آدھ قطرہ ہی جائز کمائی کا ہو۔ مجھے معلوم ہے انہوں نے شہر بھر میں اپنے ناموجود رشتے داروں اور نہ ہونے والی بیویوں کے نام پر جائدادیں بنا رکھی ہیں۔"

"میں یہاں مشورہ لینے آیا ہوں۔ اپنے سسرال کے بارے میں تیرا اشرانگیز پروپیگنڈا سننے نہیں آیا۔" میں نے جل کر کہا۔

بادلِ ناخواستہ مجو اپنے دل پسند موضوع کو چھوڑنے پر آمادہ ہوا۔ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا اور ان کی کمزوریاں معلوم کر کے الم نشرح کرنا شاید اس نے رحم مادر ہی میں سیکھ لیا تھا۔

"ہاں تو بول۔" اس نے سگریٹ سے لگاتار تیسرا سگریٹ سلگایا۔

"ابے، بس کر۔ کیوں اپنی نوکری کے پیچھے پڑا ہے؟ اگر تیرے صاحب کو اپنی سگریٹوں کی گمشدگی کا علم ہو گیا تو؟"

"نہیں ہوگا۔ پچھلی دفعہ وہ باہر سے کئی کارٹن لایا تھا۔ میں نے پورا ایک کارٹن پار کر لیا تھا۔"

تیسری بار رشک و حسد سے کباب ہو کر میں نے مجو خان کو تفصیل سے آج کے روز اپنے ساتھ ہوئی مصیبت اور نحوستوں کی کہانی سنائی جس کا کلائمکس بابو پہلوان کا لختِ جگر تھا جو میرے گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح پڑ گیا تھا۔

مجو تمام کہانی سن کر غور و فکر کرتے ہوئے بولا .... "تو بچہ اب تیرے گھر ہے؟"

میں بھنّا گیا۔ "اُلّو کے پٹھے! اتنی دیر سے میں اور کیا بکواس کر رہا ہوں۔ وہ بچہ چھچھوندر کی طرح میرے حلق میں اٹک گیا ہے جسے نہ میں نگل سکتا ہوں اور نہ اُگل سکتا ہوں۔ اگر میں اسے بابو کو واپس کرنے گیا تو وہ خبیث فوراً مجھ پر اغوا کا پرچہ کٹوا دے گا اور گھر میں کب تک اُسے رکھوں۔ اگر

بھانڈا پھوٹ گیا تو صورتِ حال زیادہ سنگین ہوجائے گی۔"

"تو نے ٹھیک ہی کہا۔ بابو پہلوان اعلیٰ درجے کا احسان فراموش ہے۔ بنگلے پر دودھ کے لیے میں نے ہی اسے لگوایا تھا اور جب میں نے اپنا کمیشن مانگا تو کمینے نے ایسا دھوبی پٹکا دیا کہ دو روز تک کمر دکھتی رہی تھی۔" جگو کا لہجہ فریادی تھا۔

"نہایت کینہ پرور بھی ہے۔ میں نے ایک بار پانی میں دودھ کم ہونے کی شکایت کی تو اس کے بعد سے مالک اور کتا دونوں میرے دشمن بنے ہوئے ہیں۔"

"خیر کتے کا تو میرے پاس نہایت مجرب علاج ہے۔ میں تجھے ایک دوا گوشت کے ٹکڑوں پر لگا کر دے دوں گا جسے کھا کر جبو ایک منٹ میں آنجہانی ہوجائے گا۔"

"بابو کے کتے کا مسئلہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے تو بابو کے پلے، میرا مطلب ہے بچے کے مسئلے پر غور کر اور کوئی ایسا حل بتا تاکہ میں خرچ ہونے سے بچ جاؤں ورنہ میری جان کو اتنا ہی خطرہ لاحق ہے جتنا تھانیدار کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے کو ہوسکتا ہے۔" ایک لمحی ہوں کے ساتھ جگو دریائے فکر میں یوں غوطہ زن ہوگیا جیسے بھینسیں جوہڑ میں غوطہ لگاتی ہیں، پھر چونک کر بولا۔

"بابو نے بچے کی بازیابی پر کتنے انعام کا اعلان کیا ہے؟"

"پچاس ہزار۔"

"ابے گھامڑ! مسئلے کا حل اتنا سامنے ہے اور تو میرے پاس دوڑا چلا آیا۔ بیٹے بابو پہلوان سے پچاس ہزار وصول کر اور بچہ اس کے حوالے کردے۔"

"پچاس ہزار۔" میں دنگ رہ گیا۔ "مگر کیسے؟"

"تو بچہ اس کو دے گا اور اس کے بدلے پچاس ہزار لے لے گا۔"

میں ایک بار پھر بھنّا گیا۔ "گدھے کی ناجائز اولاد، تجھے اتنی دیر سے کیا سمجھا رہا ہوں۔ میں بچہ لے کر بابو کے سامنے نہیں جاسکتا اور اگر چلا بھی گیا تو مجھے یقین ہے کہ مجھے پچاس روپے نہیں بلکہ پولیس کے پچاس ہزار لتر کھانے کو ملیں گے۔"

"پہلے پوری بات تو سنا کر سکندر کے گھوڑے، تو بچے کو سامنے آئے بغیر واپس کرے گا۔"

"اچھا، بذریعہ ڈاک یا کسی کوریئر سروس کے ذریعے؟" میرے لہجے میں طنز محسوس کرکے کبھی بُرا نہ ماننے والا جگو بھی بُرا مان گیا۔

"اٹھ اور فوراً یہاں سے دفع ہوجا۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ موجودہ حالات میں، میں اپنے واحد ہمدرد کو ناراض نہیں کرسکتا تھا۔ "لگتا ہے تو بُرا مان گیا؟"

جواب میں جگو خان نے ایک ناقابلِ اشاعت بات کہی۔

"تُو، تو واقعی بُرا مان گیا ہے۔" میں بات کو پی کر مسکرایا۔ "چل غصہ تھوک دے۔ اب میں درمیان میں نہیں بولوں گا۔ تیرے سر کی قسم۔"

اس قسم پر اس نے ایک بار پھر مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کا درجۂ حرارت معمول پر آگیا تو بولا۔ "دیکھ، بچے کو تیرے گھر رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے لہٰذا تو بچے کو کسی طرح وہاں سے نکال لا پھر ہم بابو پہلوان سے بات کرلیں گے۔"

"بالمشافہ؟" میں گھبرا گیا۔ "یاد رکھو وہ اکیلا ہم دونوں کی چٹنی بنا سکتا ہے۔"

"بکواس بند کر......" اس نے مجھے ایک حرام جانور کی اولاد قرار دے کر کہا۔ "ہم اس سے فون پر بات کریں گے، آواز بدل کر۔"

"یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔" میں نے غور کرکے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے بات میں کروں گا۔" اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "میں ایکٹر بھی بہت اچھا ہوں۔"

"مگر اصل مسئلہ بچے کو میرے گھر سے لانا ہے۔"

"اس کی ترکیب بھی سوچ لی ہے۔" جگو بولا۔ "میں صبح سویرے تیرے گھر ٹیکسی لے کر آؤں گا۔ اس وقت کوئی نہیں دیکھے گا۔ تو چپکے سے بچے اور بھابی کو ٹیکسی میں لانا۔ بعد میں کسی نے دیکھ بھی لیا تو کہہ دینا کہ بھابی کی طبیعت خراب تھی۔ اسے اسپتال لے کر جارہے تھے۔"

"چل یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔ اب یہ بتا کہ بچے کو لاکر تو کیا کرے گا؟"

"میں اسے صاحب کے بیڈ روم میں رکھوں گا۔ پھر ہم بابو پہلوان سے مذاکرات کریں گے کہ اگر وہ اپنے بچے کی زندگی چاہتا ہے تو ہمیں پچاس ہزار روپے ادا کردے۔"

"تاوان!" جگو کی بات سن کر میں دنگ رہ گیا۔ "مگر

جب بابو خود پچاس ہزار روپے دے رہا ہے تو پھر تو تاوان کیوں مانگے گا؟"

"انعام وصولنے میں کئی قباحتیں ہیں۔ اول تو..... بچہ لے کر بابو کے پاس جانا ہوگا۔ اس کی ہمت نہ تجھ میں ہے اور نہ مجھ میں۔ دوسرے یہ کہ میں اسے یقین دلانا چاہتا ہوں کہ بچے کو کسی تاوان کے لیے اغوا کرنے والے گروہ نے اٹھایا تھا۔"

"لیکن یار یہ کچھ اچھا نہیں لگے گا۔ ہم کوئی جرائم پیشہ تو نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے ہم کوئی نیک انسان بھی نہیں ہیں لیکن بچے کے بدلے تاوان لینا مجھے بہت گھٹیا کام لگ رہا ہے۔" میں ہچکچا کر بولا۔

"احمق، یہ انعام ہی ہوگا جو ہم تاوان کہہ کر وصول کریں گے۔ دیکھ گھٹیا کام تو یوں ہوتا اگر بابو تاوان دینے سے انکار کر دیتا اور ہم بچے کو مار دیتے۔ ظاہر ہے یہ کام ہم دس بار پیدا ہو کر بھی نہیں کر سکتے۔ اغوا برائے تاوان ظاہر کرنے کا مقصد اپنی پوزیشن محفوظ رکھنا ہے۔"

مجو خان سے ملنے سے پہلے میں فکر کے مارے فوت ہونے کے قریب تھا۔ مجھے ہر طرف پھانسی کا پھندا اور پولیس کے لتر دکھائی دے رہے تھے لیکن مجو خان نے محض ایک گھنٹے میں میرے محسوسات میں اس قدر تبدیلی کر دی کہ ہر طرف مجھے ہرے ہرے اور سرمئی سرمئی نوٹ نظر آنے لگے تھے۔ پچاس ہزار سے میرے بہت سے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ لیکن نہیں، مجو بھی تھا اور اسے بھی حصہ دینا تھا۔ وہ نصف سے کم پر کیا راضی ہوتا۔ خیر میرے لیے پچیس ہزار بھی بہت تھے۔ میں نے خود کو تسلی دی لیکن اغوا برائے تاوان...... میں سوچ میں پڑ گیا۔ جب تک بچہ میرے پاس تھا، معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا لیکن ایک بار بچہ وہاں سے نکالنے کے بعد میں پوری طرح اس معاملے میں ملوث ہو جاتا اور بے شک میری نیت نیک ہی ہوتی لیکن پکڑے جانے کے بعد ہم پولیس کے سامنے یہ دلیل نہیں دے سکتے تھے۔ مجھے سوچتے دیکھ کر مجو نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"یار، میں فکرمند ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو...... پکڑے جانے کی صورت میں ہم لمبے عرصے کے لیے جیل چلے جائیں گے۔ تیری تو خیر ہے۔ دکھی تو شاید ہی کوئی ہو البتہ خوش بہت سارے ہوں گے مگر میری زیتون بانو کا کیا ہوگا؟"

"پکڑے وہ جاتے ہیں جو غلطیاں کرتے ہیں۔ ہم نے جو منصوبہ بنایا ہے، وہ تمام نقائص سے پاک ہے۔ تو فکر چھوڑ اور میرے کہنے پر عمل کر اور بچہ ایک بار میرے پاس لے آنے کے بعد تیری ذمے داری ختم پھر اس معاملے سے الگ ہو جانا اور رہا رقم کا سوال۔ میں پوری ایمانداری سے اس کا چالیس فیصد تجھے دے دوں گا۔"

"چالیس فیصد!" میں اُچھلا۔ "ہرگز نہیں۔ پچاس فیصد۔ یعنی ففٹی ففٹی۔"

"ابے جب سارا خطرہ میں مول لے رہا ہوں تو حصہ بھی زیادہ مجھے ہی ملنا چاہیے۔"

"بالکل نہیں، پچاس فیصد سے ایک فیصد بھی کم نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میرے یار......" مجو نے کہنا چاہا۔

"پچاس فیصد۔"

"ٹھیک ہے طوطے کی اولاد۔" مجو کسی قدر مشتعل ہو کر بولا اور میں مسکرا دیا۔ "اب غور سے سن۔ میں صبح چھ بجے تیرے گھر ٹیکسی لے کر آؤں گا۔ تو بچے اور بھابی کو تیار رکھنا۔ اسے کچھ اداکاری بھی کرنا ہوگی بیماری کی۔ بچے کو تم دونوں پچھلی سیٹ پر اپنے درمیان بٹھانا۔ بچے کو لے کر ہم ڈاکٹر مینکو کے کلینک آئیں گے۔ وہاں سے ٹیکسی والے کو فارغ کریں گے اور دوسری ٹیکسی لے کر سیدھے صاحب کے بنگلے پر آئیں گے۔ میں چوکیدار اور اس کی بیوی سے کہوں گا کہ بھابی یعنی تیری پھول بیگم آپریشن کی وجہ سے تین چار روز اسپتال میں داخل رہے گی اس وجہ سے بچے کو میرے پاس چھوڑے جا رہے ہیں۔ پھر تم دونوں نو دو گیارہ ہو جانا اور باقی کام میرا۔"

میں نے غور کیا تو مجھے بھی مجو کے منصوبے میں کوئی جھول نظر نہیں آیا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اس نے کئی ایسے ہی منصوبے بنائے تھے جن کا انجام بالآخر اسپتال یا تھانے جا کر ہوا لیکن پچیس ہزار کے کڑکڑاتے نوٹوں نے مجو سے متفق ہونے پر یوں آمادہ کر لیا جیسے پولیس بزور بازو ملزم کو خود سے متفق کر لیتی ہے۔ اگرچہ کچھ خدشات میرے ذہن میں ضرور تھے۔

"مجو، میں اور پھول بیگم اس بچے کو کیسے سنبھالیں گے اگر وہ جاگ گیا اور آمادۂ فساد ہوا تو؟"

"اسے پھر سُلا دینا۔"

"اور اگر وہ پھر سونے پر آمادہ نہیں ہوا تو؟"

''احمق ہے تو۔'' مجو چڑ کر بولا اور اپنی جیب سے کچھ ٹافیاں نکال کر مجھے دیں۔ ''اگر وہ جاگے تو اسے یہ ٹافی کھلا دینا، پھر سو جائے گا اور دس بارہ گھنٹے سے پہلے نہیں جاگے گا۔''

''ان ٹافیوں میں کیا ہے؟'' میں نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ بچہ ہمیشہ کے لیے سو جائے۔''

''ٹافیوں میں تھوڑی سی افیم ہے اور یہ ٹافیاں میں نے چوکیدار کے لیے تیار کی تھیں۔''

''چوکیدار کے لیے؟'' میں دنگ رہ گیا۔ ''اس عمر میں اسے ٹافیوں کا شوق ہے؟''

''شوق تو نہیں ہے لیکن میں اسے کھلا دیتا ہوں۔ جب میرا دل اس کی خواب گاہ کی سیر کو مچل رہا ہوتا ہے۔'' مجو آنکھ مار کر بولا۔

میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔ ''مجو تو کتنا کمینہ ہے۔ عین اس کی چھت کے نیچے اس کے اعتماد کو دھوکا دے رہا ہے۔''

''صرف میں کیوں، اس کی بیوی بھی تو برابر کی شریک ہے۔'' مجو کمال ڈھٹائی سے بولا۔

''وہ کم عمر اور نادان ہے۔ یقیناً تو نے اسے ورغلایا ہوگا جیسے ابھی ورغلایا ہے۔''

مجو کو شرمندہ کرنے کی یہ دوسری کوشش بھی ناکام رہی۔ وہ ایسا چکنا گھڑا تھا کہ کسی قسم کا پانی اس میں ٹھہر ہی نہیں سکتا تھا۔

''یہ تو نے بتایا نہیں کہ بابو سے پچاس ہزار کیسے وصول کرے گا؟''

''بہت آسان طریقے سے۔ میں اس سے کہوں گا کہ اگر وہ اپنے اکلوتے لختِ جگر کی صحیح سلامت واپسی چاہتا ہے تو پچاس ہزار کی رقم سو سو کے نوٹوں کی شکل میں فلاں جگہ پر ڈال دے۔ نوٹ پرانے ہوں اور نشان زدہ نہ ہوں۔ جب رقم مل جائے گی تو ہم بچہ اسے واپس کر دیں گے۔''

''اور اس نے رقم کے ساتھ تیرے رشتے داروں کو بھیج دیا یعنی پولیس والوں کو، تو؟''

''تو آخر کس کام آئے گا؟'' مجو مکارانہ انداز میں بولا۔ ''تو ہمدرد بن کر بابو کا ساتھ دے۔ اگر اس نے پولیس سے رابطہ کیا تو، تو فوراً مجھے بتائے گا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ پولیس سے رابطہ نہیں کرے گا۔ آخر ہم اس سے وہ پچاس ہزار ہی تو مانگ رہے ہیں جو وہ انعام کے طور پر دینے کا اعلان کر چکا ہے۔''

''چل یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔'' میں غور کرتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ بتا کہ اس ڈرامے کا اینڈ کیسے ہوگا؟ یعنی بچے کی واپسی؟''

''یہ کچھ چکر والا کام ہے۔ ہم نے بچے کو اس طرح واپس کرنا ہے کہ وہ بابو تک پہنچ جائے اور ہم بھی سامنے نہ آئیں۔ ایک منٹ۔'' یہ کہہ کر مجو ایک بار پھر دریائے سوچ میں غوطہ زن ہو گیا۔ معاً اس نے ایک نعرہ مارا اور اٹھ کر محوِ رقص ہو گیا۔ یہ رقص کچھ افریقی اور کچھ ریڈ انڈینز کے ثقافتی رقص کی ملغوبہ شکل تھا۔ مجو یوں اچھل اچھل کر لاتیں چلا رہا تھا جیسے اپنے کسی نادیدہ دشمن پر وار کر رہا ہو پھر اس نے جیسے اچانک رقص شروع کیا تھا، ویسے ہی اچانک بند کر دیا اور میز کے نیچے جھکتے ہوئے بولا۔ ''مل گیا۔''

''مسئلے کا حل؟'' میں خوش ہو گیا۔

''ابے نہیں۔ یہ خبیث لال بیگ جو میرے پاجامے کے پائنچے میں گھس گیا تھا۔'' اس نے ایک لال بیگ دکھایا جس کی مونچھیں مجو کی مونچھوں سے اتنی مل رہی تھیں جیسے وہ مونچھ بدل بھائی ہوں۔ یہ خیال اتنا مضحکہ خیز تھا کہ میں بے اختیار قہقہہ مار بیٹھا۔

مجو نے مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔ ''میرے پاجامے میں لال بیگ گھسنے سے تجھے اتنی خوشی کیوں ہو رہی ہے؟''

جب میں نے اپنے خیال سے آگاہ کیا تو اس نے لال بیگ کے خاندان سے اپنے خاندان کے کئی ناجائز رشتوں کا اعلان کیا اور باورچی خانے میں رکھا اسپرے اٹھا کر لال بیگ پر کر دیا۔ وہ چند لمحے تڑپا اور اللہ کو پیارا ہو گیا۔

''تو اتنی خطرناک چیز کچن میں رکھتا ہے؟'' میں نے فکرمند ہو کر کہا۔ ''کسی دن تو نے یہ اسپرے کھانے پر کر دیا تو کھانے والے کا کیا ہوگا؟''

''وہی جو اس لال بیگ کا ہوا ہے۔'' مجو اطمینان سے بولا۔ اب کے وہ کرسی پر بیٹھا تو دونوں ٹانگیں بھی اٹھا کر اوپر رکھ لی تھیں۔ ''ترکیب میں سوچ ہی رہا تھا کہ منحوس کیڑا پاجامے میں گھس گیا۔ خیر، مسئلے کا حل نہایت سادہ ہے۔ رقم مل جانے کے بعد ہم بچے کو ایدھی صاحب کے اپنا گھر کے باہر رکھے جھولے میں ڈال کر بابو کو اطلاع کر دیں گے۔ وہ فوراً آ کر اسے لے جائے گا۔''

میں اُچھلا تو مجو نے کہا۔ ’’تیری پتلون میں بھی کوئی لال بیگ گھس گیا ہے؟‘‘

’’نہیں، میں تیری بات پر اُچھلا تھا۔ کیا لاجواب حل سوچا ہے۔‘‘ میں نے جوش و خروش سے اس کے کندھے کو تھپکا۔

مجو خان کے پاس آتے وقت میں جتنا پریشان تھا، جاتے وقت اتنا ہی مطمئن تھا۔ مجو نے نہ صرف مجھے آنے والی مصیبتوں سے بچالیا تھا بلکہ اب اس بات کے امکانات خاصے روشن تھے کہ چند روز بعد میری جیب میں پچیس ہزار کی موٹی رقم آجائے گی۔

’’آئے ہائے۔‘‘ جیسے ہی میں نے زینو کو مجو خان کے منصوبے سے آگاہ کیا تو وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ’’تم مجو جیسے افیمی اور چرسی کی باتوں میں آگئے؟ یاد نہیں، جب بھی تم نے اُس سے مدد مانگی، اس نے تمہیں کسی نئی مصیبت میں ہی ڈالا اور اب تم پھر اس منحوس کے پاس دوڑ گئے۔ میری بات لکھ لو۔ وہ پچاس ہزار کی رقم لے کر غائب ہوجائے گا۔ تم پکڑے جاؤ گے۔‘‘

اندر سے میں دہل کر رہ گیا تھا لیکن بظاہر مسکراتا رہا۔ ’’فکر مت کرو میری پھول بیگم! مجو غائب نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو میں پولیس کو اس کی نشاندہی کردوں گا۔ یہ بات وہ بھی سمجھتا ہے اور پھر یہ سوچو کہ پچاس ہزار سے ہمارے کتنے مسائل حل ہوجائیں گے۔‘‘ مصلحتاً میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ پچاس ہزار میں سے نصف مجو کو ملے گا۔

’’خاک مسئلے حل ہوں گے۔ مجھے تو لگ رہا ہے ہم کسی پریشانی میں پڑنے والے ہیں۔ دیکھو کمال!‘‘ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ’’ابھی بھی وقت ہے، ہم بابو کے بچے کو اسے لوٹا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری بات پر یقین کرے گا اور اگر اس نے کوئی ہنگامہ کیا تو بھیا کس دن کام آئیں گے؟‘‘

’’قیامت کے دن۔‘‘ میں جل کر بولا۔ ’’احمق خاتون! یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی کہ بابو ہم سے پوچھے گا کہ ہم نے اتنی دیر سے بچے کو کیوں واپس کیا اور پھر کیا یہ بات پولیس اور لوگوں سے بچ رہے گی؟ بے عزتی الگ ہوگی اور پولیس سے الگ نمٹنا پڑے گا پھر ہمیں اس محلے سے بھی جانا پڑے گا۔‘‘

’’یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔‘‘ زینو کمالِ بھولپن سے بولی۔

’’تبھی تو کہتا ہوں میری جان، یہ سوچنے وغیرہ کا کام مجھ پر چھوڑ دو اور اپنے تربوز جیسے سر میں اخروٹ جتنے دماغ کو زیادہ زحمت مت دیا کرو۔ بس جو میں کہوں، وہ کرتی جاؤ۔‘‘ میں نے پیار سے اس کی ہال نما کمر میں ہاتھ ڈالا تو وہ خوش ہوگئی اور اس کے بعد مجھے اس کو منانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ زینو مطمئن ہوگئی تھی لیکن اپنی فکریں اس نے مجھے دے دی تھیں۔ دل میں رہ رہ کر خدشات کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ زینو صحیح کہہ رہی تھی۔ یاری نبھانے کے معاملے میں مجو کا ریکارڈ ون ڈے کرکٹ میں قومی ٹیم کے ریکارڈ سے زیادہ خراب تھا۔ آج تک اُس سے دوستی میں مجھے نقصان ہی ہوا تھا اور فائدے مجو نے اٹھائے تھے۔ مثلاً ایک بار اس کے دادا جان کے انتقال کے موقع پر اس کا غم ہلکا کرنے کے لیے میں اسے ہوٹل لے گیا۔ میرا ارادہ تو چائے پیسٹری کا تھا لیکن مجو اس موقع پر مارے غم کے چار فل پلیٹ بریانی، ایک بروسٹ، زردے کی دو پلیٹیں اور دو پلیٹ قورمہ چھ شیرمال کے ساتھ کھا گیا اور جب بل ادا کرنے کا وقت آیا تو خاموشی سے اٹھ کر باتھ روم کے بہانے وہاں سے فرار ہوگیا۔ بعد میں مجھے اپنی گھڑی دے کر ہوٹل کے خونخوار منیجر اور جلاد ویٹروں سے جان چھڑانا پڑی جو اپنی ٹپ مارے جانے پر سخت مشتعل تھے۔ اس کے علاوہ بھی میری وسیع یادداشت میں کئی ایسے جسمانی، ذہنی اور مالی نقصانات محفوظ تھے جو مجھے صرف مجو کی وجہ سے اٹھانا پڑے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ اکثر میرے نام سے لڑکیوں کو عشقیہ خطوط لکھتا۔ دو مرتبہ مجھے لڑکیوں کے بھائیوں نے اور دو ہی مرتبہ اُن کے منگیتروں نے ظالمانہ طریقے سے پیٹا۔

جس زمانے میں ہم نوکری تلاش کررہے تھے، وہ بے تکلفی سے میرے تعلیمی سرٹیفکیٹ استعمال کرتا تھا اور ستم ظریفی دیکھیے اکثر اسے نوکری مل بھی جاتی تھی اور میں بے روزگار جوتا چٹخاتا پھرتا تھا مگر ظاہر ہے صرف تعلیمی سرٹیفکیٹ کے بل بوتے پر نوکری نہیں کی جاسکتی ہے لہٰذا ہر بار جلد ہی اس کی چھٹی ہوجاتی اور بادلِ ناخواستہ اسے اپنے آبائی پیشے کی طرف لوٹنا پڑتا۔ دروغ برگردن مجو بقول اس کے کوئی لکڑ سکڑ دادا... تاہم ایک مغل بادشاہ کے شاہی باورچی رہے۔ مغل بادشاہ کی عمر تک اور اس بے چارے کو صرف کچھ مہینے حکومت کا موقع ملا تھا۔ بہرحال اب مجو فخر سے خود کو شاہی باورچیوں کی نسل کا تازہ ایڈیشن قرار دیتا تھا۔ مظہر الدین عرف مجو کے والد بزرگوار فخرالدین عرف فخرو نے نہایت محنت سے اپنا کیریئر

بنا یا تھا۔ پہلے انہوں نے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر حلیم بیچی پھر ایک عدد ریڑھی کرلی اور کھانوں کی ورائٹی میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کی یہ برق رفتار ترقی کی دوڑ اس جگی ہوٹل پر جا کر ختم ہوئی جس کے بل بوتے پر انہوں نے مجو کو میٹرک کرایا اور آگے اس نے پڑھ کر نہیں دیا۔ ایف اے میں ہر سال وہ پوری ثابت قدمی سے تمام پرچوں میں فیل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ والد صاحب نے اسے پکڑ کر اپنے ہوٹل کا کیشئر کم ویٹر کم باورچی بنا دیا۔ خود کو ہیرو سمجھنے والے مجو کے لیے یہ کسی سزا سے کم نہیں تھا لہٰذا دوسرے مہینے وہ گھر سے بھاگ گیا اور گھر سے بھاگنے کے ٹھیک پہلی سالگرہ کے موقع پر وہ واپس گھر پہنچ گیا اور نہایت تابع داری سے باپ سے وہ تمام کھانوں کے نسخے سیکھنے لگا جو اس نے خاندانی حکیموں کے خفیہ نسخوں کی طرح اپنے مدقوق سینے میں چھپا رکھے تھے۔ وہ شاید اسی لیے جی رہا تھا کہ جیتے ہی مجو ایک طاق باورچی بنا، وہ اللہ کا پیارا ہوگیا۔ مجو نے پہلی فرصت میں جگی ہوٹل بیچا اور ایک کروڑ پتی کے گھر باورچی ہوگیا۔

☆☆☆

اگرچہ مجو خان نے بہادری سے ایک دلیرانہ منصوبہ بنالیا لیکن صبح ٹھیک چھ بجے جب وہ ٹیکسی لے کر آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور شاید ٹانگیں بھی لرز رہی تھیں لیکن تاریکی کی وجہ سے میں دیکھ نہیں سکا۔ حالت خود میری بھی زیادہ اچھی نہیں ہو رہی تھی لیکن زینو کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے میں یوں مسکرا رہا تھا جیسے کوئی پھانسی کے پھندے پر مسکرا سکتا ہے۔ زینو بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

رات جب میں مجو کے پاس سے واپس آیا تو بابو پہلوان کا بچہ جاگ چکا تھا اور زینو کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھا۔ وہ ہلکے اور تیز سُروں میں ایک ہی مطالبہ کر رہا تھا۔ ''امی پاس جاؤں گا...... ابو پاس جاؤں گا۔'' اسے بہلانے کی کوشش کرتے کرتے وہ رونے کے قریب ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ پہلے ہم نے اسے امی کے پاس لے جانے کا لالچ دے کر دودھ پلایا اور پھر میں نے اسے مجو کی دی ہوئی ٹانی کھلا دی۔ میں ڈر رہا تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ بچے کے تیور خطرناک ہوگئے تھے اور اگر وہ اونچے سُروں میں رونے لگتا تو کوئی نہ کوئی پڑوسی اس کی آواز سن لیتا۔ یہ سب ہی جانتے تھے کہ ہمارے ہاں انسان کا کیا، بلی کا بچہ بھی نہیں تھا۔ ٹانی کھانے کے بعد دس پندرہ منٹ تک میں نے اسے بہلائے رکھا پھر افیم کا اثر ہوا اور وہ سو گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی نے سکون کا سانس لیا لیکن فوراً زینو کو تشویش لاحق ہوگئی۔

''یہ ٹانی میں کیا تھا؟ یہ تو بے ہوش ہوگیا ہے۔'' اس نے بچے کو ہلا جلا کر دیکھا۔

''بے ہوش نہیں ہے۔ بس ذرا گہری نیند میں ہے۔'' میں نے اسے تسلیاں دیں اور ٹانی والی بات گول کر گیا مگر وہ عورت ہی کیا جو آسانی سے اپنے سوال سے دستبردار ہوجائے۔ اس نے پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کر دیا۔ مجبوراً مجھے اُگلنا پڑا۔

''ٹانی میں افیم تھی۔ یہ مجھے مجو نے دی تھی۔''

''افیم؟'' اس نے یوں دہل کر کہا جیسے میں نے ٹانی میں زہر کا اعتراف کیا ہو۔ ''یہ تو بہت خطرناک ہوتی ہے۔ سنا ہے اسے کھانے سے انسان عادی ہوجاتا ہے اور جب اسے یہ نہیں ملتی تو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے۔''

''وہ افیم نہیں ہوتی، ہیروئن ہوتی ہے۔ یہ تو بڑی بے ضرر چیز ہے۔ بہت سے لوگ اسے نیند کے لیے کھاتے ہیں۔''

''لیکن یہ بچہ ہے۔ کہیں اسے کچھ ہوگیا تو ہم اس کے ماں باپ کو کیا منہ دکھائیں گے؟''

''اول تو ہمارے پروگرام میں انہیں منہ دکھانا شامل نہیں ہے۔ ہم منہ چھپانے کے لیے ہی یہ اتنے سارے پاپڑ بیل رہے ہیں اور دوسرے افیم اتنی کم مقدار میں ہے کہ بچے کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

شاید زینو مطمئن ہوگئی لیکن عادت کے مطابق اُس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ مطمئن نہیں ہے کیونکہ کچھ دیر بعد وہ بستر پر خراٹے لے رہی تھی لیکن میری نیند آنے والے لمحات نے اُڑا دی تھی۔ وقفے وقفے سے بچے کو دیکھتا رہا کہ وہ زندہ ہے اور سانس لے رہا ہے۔ صبح تک میں اتنا اعصاب زدہ ہو چکا تھا کہ جب مجو نے نہایت پُراسرار انداز میں دروازے پر دستک دی تو میں نے بہ مشکل خود کو چیخنے سے باز رکھا۔

''کک...... کون ہے؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''میں ہوں مجو۔ تیرا باپ۔''

میں نے سکون کا سانس لے کر دروازہ کھول دیا۔

''بالکل ملک الموت کی طرح وقت پر آیا ہے۔''

''جلدی کر۔ اس سے پہلے کہ کوئی سحر خیزی کا مارا باہر نکل آئے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''ایک منٹ انتظار کرو۔'' میں نے کہا اور اندر بھاگا جہاں زینو زرد چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ میں نے اسے تیار ہونے کو کہا اور بچے کو احتیاط سے اٹھا کر باہر لے آیا۔ مجو نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول رکھا تھا۔ بچے کو میں نے سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ بدستور گہری نیند میں تھا۔ اندر زینو بھی تیار تھی۔ اس نے اپنے بے پناہ جسم کو چادر میں لپیٹا اور کانپتی ٹانگوں سے باہر آ گئی۔ اس وقت وہ سچ مچ کوئی مریضہ لگ رہی تھی۔ پچھلی نشست پر وہ بچے کے ایک طرف بیٹھ گئی اور میں دوسری طرف۔ ہماری کوشش تھی کہ اگر کوئی باہر سے دیکھے بھی تو بچہ اسے نظر نہ آئے۔

اب تک سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا لیکن میری چھٹی حس جس خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی، وہ معاً ہی نازل ہو گیا۔ میں نے ایک بگولے کو آتے دیکھا جو ٹیکسی پر چڑھ دوڑا۔ یہ بدبخت جبو تھا جو ٹیکسی کے اگلے حصے پر پنجے رکھ کر یوں بھونک رہا تھا جیسے بھونکنے کے کسی مقابلے میں حصہ لے رہا ہو۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت ہم ٹیکسی میں تھے۔

''بھیا! ٹیکسی تو چلاؤ۔'' مجو نے بدحواس ہو کر ڈرائیور سے کہا جو اتنی صبح اٹھائے جانے پر پہلے ہی جلایا ہوا تھا۔

''کیسے چلاؤں؟ یہ منحوس کتا تو ہٹے۔''

ڈرائیور نے پہلے کھڑکی سے سر نکال کر اسے ہشکارا لیکن وہ جبو تھا لہٰذا ڈرائیور کو قطعی خاطر میں نہ لایا۔ اس پر ڈرائیور نے نیچے اترنا چاہا تو میں نے بوکھلا کر اسے روک لیا۔

''کیا کرتے ہو؟ یہ نہایت خونخوار کتا ہے۔''

''پھر ہم آگے کیسے جائیں گے؟'' ڈرائیور نے چڑچڑا کر کہا۔

''تم ٹیکسی چلاؤ۔ یہ خود ہی ہٹے گا۔'' مجو نے مشورہ دیا۔ دراصل ہم دونوں کا یہ سوچ کر برا حال تھا کہ کہیں کوئی تحقیقِ حال کے لیے نہ نکل آئے اور ہم رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں۔ ظاہر ہے یہ بات ہم ڈرائیور کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔ خبیث جبو بھی جیسے موقع کی تاک میں بیٹھا تھا یا ممکنہ طور پر اسے اپنے مالک کے بچے کی بو آ گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ہم پر چڑھ دوڑا تھا۔ شکر تھا کہ ہماری بات ڈرائیور کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے ایک دم گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے ریس دی تو جبو بدک کر بونٹ سے اتر گیا۔ موقع غنیمت جان کر ڈرائیور نے گاڑی دوڑائی اور جبو پیچھے آتے آتے بچا۔ اس کے باوجود اس نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا اور بھوت کی طرح ٹیکسی کے پیچھے لگ گیا۔ خاصی دور جا کر اس نے گاڑی کی رفتار سے ہار مان لی۔

باقی کے مراحل منصوبے کے عین مطابق بخیر و خوبی طے ہو گئے۔ اب پروگرام کے مطابق مجھے بابو پہلوان کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔ بہ الفاظ دیگر اس کی جاسوسی کرنا تھی۔

میں ٹھیک دس بجے بابو پہلوان کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ یہ اس کی دکان کا ایک حصہ تھا جہاں وہ لوگوں سے ملا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہاں کئی افراد موجود تھے جو اس کے بچے کی گمشدگی یا اغوا پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ بابو ان کے درمیان کسی غم زدہ بیل کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

''بابو، جب سے تمہارے بچے کی گمشدگی کا سنا ہے، دل پر ایک بوجھ سا تھا۔'' ظاہر ہے یہ بوجھ اس کے بچے کا تھا۔ ''خاص طور سے زینو تو اتنی دکھی ہے کہ اسے اختلاجِ قلب کے دورے پڑنے لگے۔ صبح سویرے اسے اسپتال لے جانا پڑا تھا۔''

اس بات پر مرزا صاحب چونکے۔ ''تبھی میں کہوں صبح صبح یہ کون ٹیکسی میں جا رہا تھا اور میاں تم نے ایک گٹھری سی بھی اٹھا رکھی تھی۔''

چند ثانیے کو میں بدحواس سا ہو گیا۔ ''وہ......وہ...... دراصل......'' میرے منہ سے بے ربط الفاظ نکلنے لگے پھر مجھے بروقت سوجھ گئی۔

''دراصل وہ زینو کے کپڑے اور سامان تھا کہ شاید اسے زیادہ دن اسپتال میں رہنا پڑے۔''

بابو نے بادلِ ناخواستہ جوابی اظہارِ افسوس کیا۔ ''بھابی کی طبیعت کا سن کر افسوس ہوا۔ اب وہ کیسی ہے؟''

''بہتر ہے۔ تبھی میں اسے گھر لے آیا۔''

بیٹھک میں خاموشی طاری تھی جسے وقفے وقفے سے بابو کے منے کی اماں کی آہ جگر خراش درہم برہم کر دیتی تھی۔ اس کی آواز سن کر میرا دل برف کی طرح پگھلنے لگا۔ کئی بار تو میرے جی میں آئی کہ ابھی جاؤں اور اس کا بچہ لا کر اس کے حوالے کر دوں لیکن جب اپنے انجام کا نقشہ سامنے آتا تو جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ دراصل مجھ سے اس شادی شدہ حسینہ کا دکھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں دل میں مجو کو کوسنے لگا جس نے یہ سارا چکر چلایا تھا۔ اس نے میری موجودگی میں بابو کو فون کرنا تھا اور اب تک فون نہیں آیا تھا۔ خدا خدا کر کے گیارہ بجے جا کر گھنٹی بجی۔ بابو نے یوں ریسیور اٹھایا جیسے مرا ہوا چوہا اٹھاتے ہیں۔

''ہیلو، بابو پہلوان بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر ایک دم چونک گیا۔ ''کون ہو تم؟ میرا بچہ کہاں ہے؟ وہ خیریت سے تو ہے؟ ہیلو...... ہیلو...... میری بات سنو۔'' وہ چیخنے لگا پھر ریسیور جھٹکے ہوئے انداز میں واپس رکھ دیا۔

''کیا ہوا جی؟ کون تھا؟'' مرزا صاحب بولے۔

بابو پہلوان چونکا۔ ''کوئی نہیں۔'' پھر ایک دم وہ بدمزاجی پر اتر آیا۔ ''تم لوگوں کو کیا مطلب ہے۔ میرے پاس کسی کا بھی فون آئے۔ آجاتے ہیں منہ اٹھا کر۔'' بابو کی بدمزاجی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور سب بُرا منہ بناتے ہوئے اٹھ کر رخصت ہونے لگے۔

مرزا صاحب نے زیادہ بُرا منایا تھا۔ ''اچھا بابو! ہم چلتے ہیں اور دعا کریں گے کہ تمہارا بچہ مل جائے حالانکہ تم اس کے مستحق تو نہیں ہو۔''

''خبیث آدمی۔'' بابو، مرزا جی کی طرف لپکا لیکن وہ بے وقوف نہیں تھے۔ اس کے ہاتھ آنے سے پہلے ہی وہاں سے دوڑ گئے تھے۔ میں نے جب اٹھنے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تو بابو مجھے گھورے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''کیوں کمالے باؤ، تیرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟''

''فی الوقت تو نہیں ہے۔'' میں مسکرا کر بولا۔ ''ویسے بابو یہ فون کس کا تھا؟''

''تمہیں کیا، کسی کا بھی ہو؟'' وہ اکھڑ انداز میں بولا۔

''دیکھو بابو! غلط مت سمجھو۔ ہمارے اختلافات اپنی جگہ لیکن میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ تمہارا بھلا ہی چاہتا ہوں لیکن تم شاید مجھے دشمن ہی سمجھتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میرا ایک سالا سی آئی اے میں ہے۔ میں تمہاری مدد کے لیے آیا تھا لیکن جب تم نہیں چاہتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بابو پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

''تم تو بُرا مان گئے۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ٹھیک ہے میرا خیال ہے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ابھی جو فون آیا تھا وہ اس شخص کا تھا جس نے میرے منّے کو اغوا کیا ہے۔ اس نے صرف اتنا ہی بتایا ہے اور دھمکی دی کہ اگر میں نے پولیس سے رابطہ کیا تو میں...... میں اپنے بچے کو...... زندہ نہیں دیکھ سکوں گا۔'' بابو رو دینے والے انداز میں بولا۔

''فون کرنے والے نے اور کیا کہا؟'' میں نے تجسس ظاہر کیا ورنہ مجھے معلوم تھا مجو نے کیا کہا ہوگا۔

''اس نے صرف دو باتیں کی ہیں۔ ایک میں پولیس سے دور رہوں اور دوسرے وہ ایک گھنٹے بعد فون کرے گا۔''

''اگر معاملہ تمہارے بچے کی زندگی کا نہ ہوتا تو میں فوراً پولیس کو رپورٹ کرنے کا مشورہ دیتا۔''

''نہیں۔'' بابو جلدی سے بولا۔ ''میں پولیس کو ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔ مجھے اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے۔''

''فی الوقت تو تم دوسری کال کا انتظار کرو اور دیکھو کہ وہ کیا مطالبہ کرتا ہے؟''

ایک گھنٹے بعد پھر مجو کا فون آیا۔ بابو نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ ''ہاں بات کر رہا ہوں۔ دیکھو، تم میرے بچے کے بدلے کیا چاہتے ہو؟ صرف وہی بات کرو۔''

معاً بابو پہلوان کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ ہو گیا۔ ''ل...... لیکن...... اتنی...... بڑی رقم...... میں کہاں سے......''

''خدارا...... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اتنی جلدی......''

''سنو۔ میری بات سنو......'' اس نے ریسیور فون پر پٹخ کر نامعلوم شخص یعنی مجو کو ناقابلِ بیان گالیاں دیں۔ وہ سخت مشتعل ہو رہا تھا۔ ''خبیث...... سؤر کی اولاد۔''

''وہ کمینہ کیا کہہ رہا تھا؟'' میں نے ہمدردی سے کہا۔

بابو چونکا اور خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کمینہ ہے؟''

''جیسے تمہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ فلاں ابن فلاں ہے۔'' میں نے بابو کی گالیوں کا حوالہ دیا۔ بابو نے ایک بار پھر روانی سے پہاڑے کی طرح ان گالیوں کو دہرایا اور بولا۔ ''وہ مردود مجھ سے پانچ لاکھ مانگ رہا ہے۔''

''پانچ لاکھ؟'' یہ سن کر میرا منہ غیر معمولی حد تک کھل گیا۔

''ہاں۔'' بابو رقت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں اپنا سب کچھ بیچ کر بھی اتنی رقم نہیں جمع کر سکتا اور اس خبیث نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے دو دن میں رقم کا انتظام نہیں کیا تو وہ قسطوں میں میرا بچہ مجھے واپس کرے گا۔''

قسطوں کا مفہوم سمجھ میں آتے ہی میں لرز اٹھا۔ مجھے مجو پر غصہ آ رہا تھا۔ پہلے تو اس نے پچاس ہزار کے بجائے پانچ لاکھ کو مطالبہ کر دیا اور پھر اتنی خوفناک دھمکی دی۔ وہ بھی ایک معصوم بچے کے بارے میں۔ بابو کہہ رہا تھا۔

''اس نے مجھے جواب کے لیے رات تک کی مہلت دی ہے۔ رات کو وہ فون کر کے مجھ سے جواب لے گا۔ اب بتاؤ میں اسے کیا کہوں؟ میرے پاس مشکل سے ساٹھ ستر

ہزار نقد ہیں، بیس ہزار کے سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں اور بیوی کے کچھ زیورات ہیں۔ مل ملا کر بہ مشکل ایک لاکھ ہوں گے لیکن پانچ لاکھ کہاں سے ہوں گے۔ میں اپنی دکان اور مکان بیچ بھی دوں تب بھی اتنی رقم نہیں ہوسکتی۔''

''میرا خیال ہے اغوا کرنے والے یا والوں سے بارگیننگ کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ تمہارے بارے میں جانتا ہوگا کہ تم اتنی بڑی رقم کا انتظام نہیں کرسکتے۔''

بابو کا چہرہ قدرے روشن ہوگیا جیسے بجلی تو آگئی ہو لیکن وولٹیج کم ہو۔ ''ایسا ممکن ہے؟'' وہ یوں پُرامید لہجے میں بولا کہ ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ وہ میرے اور مجو کے گٹھ جوڑ سے واقف تھا۔

''شاید۔'' میں ہچکچایا۔ ''دیکھو، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا بابو بھائی! میں چلتا ہوں۔ ابھی تمہاری بھابی کو بھی دیکھنا ہے۔''

گھر جانے کے بجائے میں سیدھا مجو کے پاس پہنچا۔ حسبِ معمول چوکیدار گیٹ پر تھا اور اس کی بیوی مجو کے ساتھ باورچی خانے میں تھی لیکن آج دونوں بیچ بیچ کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ چوکیدار کی بیوی نے مجھے منہ بنا کر دیکھا اور تنتناتی ہوئی چلی گئی۔ مجو مسکرا کر بولا۔

''رانو، تجھ سے جلنے لگی ہے۔''

''بھاڑ میں گئی رانو۔'' میں پھٹ پڑا۔ ''اُلّو کے پٹھے، تو نے فون پر کیا بکواس کی تھی؟ کیا تو چاہتا ہے کہ بابو پولیس کے پاس دوڑ جائے۔ میں نے کتنی مشکل سے اسے روکا ہے۔''

مجو بدستور مسکراتا رہا۔ ''وہ پولیس کے پاس نہیں جائے گا۔ میں نے اسے دھمکی ہی ایسی دی ہے۔''

''میں نے سنی تھی۔ خبیث شخص تو اتنے چھوٹے بچے کے بارے میں ایسی خوفناک بات کہہ رہا تھا؟ اگر اس کے باپ کا ہارٹ فیل ہوجاتا تو پچاس ہزار تیرا باپ دیتا؟''

جملے کا اختتام میں نے اردو کے چند غیر شائع شدہ الفاظ سے کیا مگر مجو پھر بھی مسکراتا رہا۔ ''فکر مت کر۔ وہ مرے گا نہیں۔''

''اور وہ جو تو نے پچاس ہزار کے بجائے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے؟''

مجو نے سر کھجایا۔ ''یار، بارگیننگ کا مرض ہمارے ملک کے ہر شعبے میں سرایت کرگیا ہے۔ اغوا برائے تاوان بھی اس سے بچا ہوا نہیں ہے۔ اغوا کرنے والوں کو اگر دس لاکھ لینے ہوتے ہیں تو وہ ایک کروڑ کا مطالبہ کرتے ہیں اور پانچ لاکھ لے کر خوشی خوشی مغوی کو رہا کردیتے ہیں۔''

''واقعی پھیری والوں نے لوگوں کی عادت خراب کردی ہے۔ ویسے تیرا ارادہ پچاس ہزار کا ہی ہے؟''

''نہیں۔'' مجو اعتراف کرنے والے انداز میں بولا۔

''میں نے سوچا جب ہم ایک جرم میں پوری طرح ملوث ہو ہی گئے ہیں تو کیوں نہ زیادہ سے زیادہ مال کھینچنے کی کوشش کریں۔ بابو پچاس سے اوپر جتنا دینے پر آمادہ ہوگا، ہم وصول کرلیں گے۔''

''اور وہ دھمکی؟'' میں نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

مجو ہنسا۔ ''کیا تو مجھے اتنا کمینہ سمجھتا ہے کہ میں ایک معصوم بچے کو نقصان پہنچاؤں گا؟''

''تیرا سابقہ ریکارڈ تجھے اس سے بھی زیادہ کمینہ ثابت کرتا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''اور یاد رکھ، اب اگر تو نے کوئی گڑبڑ کی تو میں خود پولیس کے پاس چلا جاؤں گا۔ بے شک جیل میں ہم دونوں کو ایک ہی کوٹھری میں رہنا پڑے اور بچہ کہاں ہے؟''

''اس کی فکر بھی مت کر۔ رانو نے اسے اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔''

لیکن جب تک میں نے بابو کے بچے کو دیکھ نہیں لیا، مجھے قرار نہیں آیا۔ رات کو جب مجو نے بابو کو فون کیا تو میں وہیں موجود تھا۔ مجو نے بیچ بیچ بارگیننگ کی اور سودا ستر ہزار پر پٹ گیا۔ طے یہ پایا کہ بابو رقم دے گا اور اس کے ایک گھنٹے بعد اسے اس کا بیٹا مل جائے گا لیکن اس وقت میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے جب بابو نے رقم لے جانے کے لیے میرا انتخاب کیا۔

''اغوا کرنے والے نے مجھے رقم لانے سے منع کیا ہے۔ اب صرف تم ہی بچتے ہو جسے اس سارے معاملے کا علم ہے اور مجھے تم پر اعتبار بھی ہے۔''

اس لمحے مجھے سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ بے چارہ بابو اس شخص پر اعتبار کررہا تھا جس نے نادانستگی میں سہی لیکن تکنیکی طور پر اس کے بچے کو اغوا کیا تھا۔ میں نے انکار کرنا چاہا۔

''بابو! میں یہ کام نہیں......''

''دیکھ کمال، انکار مت کر۔'' بابو جذباتی ہوکر بولا۔ ''تو نے اس مصیبت کی گھڑی میں میرا ساتھ دینے کا عہد کیا ہے تو تجھے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ اس طرح مُصر ہوا کہ

مجھے ماننا ہی پڑا لیکن اب رہ رہ کر دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ بابو نے دو دن بعد رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مجو نے اسے پھر دھمکی دی تھی کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی یا تاخیر ہوئی تو وہ اپنی دھمکی پر عمل درآمد شروع کر دے گا۔

اگلے روز میں نے مجو کو بتایا کہ بابو مجھے ہی رقم دے کر بھیجے گا تو مجو اچھل پڑا۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہوا ورنہ مجھے خطرہ تھا کہ نہ جانے کون آئے اور اس کے پیچھے لگ کر پولیس آجائے۔ تو آئے گا تو مجھے اطمینان رہے گا۔ تو بھی ذرا اطمینان کر لینا اور آتے وقت چاروں طرف نظر رکھنا۔''

اگلے روز بابو نے مجھے پرانے اخبار میں لپٹے ہوئے ستّر ہزار روپے دیے۔ تمام نوٹ سو سو کے تھے اور پرانے تھے۔ بابو نے میرے سامنے ہی انہیں اخبار میں لپیٹا تھا۔ بابو کی بیوی نے لجاجت سے کہا۔

''بھیا! دعا کرنا، میرا لال خیریت سے گھر آئے۔''

''فکر نہ کریں بھابی!'' میں نے لفظ بھابی کو برداشت کر کے کہا۔

مجو نے بابو کو ہدایت کی تھی کہ رقم کا پیکٹ اس کے بتائے ہوئے ایک ڈسٹ بن میں ڈالنا تھا جو مجو کے علاقے ہی میں تھا لیکن ظاہر ہے ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مجھے رقم لے کر سیدھا مجو کے پاس جانا تھا۔ ہم وہیں رقم کے حصے بخرے کرتے۔ اپنا حصہ محفوظ کر کے میں بابو کے پاس آجاتا۔ مجو اس دوران میں اس کے بیٹے کو ایدھی کے اپنا گھر کے جھولے میں ڈال کر بابو کو فون کر دیتا کہ وہ اپنا لختِ جگر کہاں سے حاصل کر سکتا تھا۔

صبح گھر سے نکلتے وقت زینو نے کہا تھا۔ ''کمال! میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہوا بھی تو تیرے بھیا کس دن کام آئیں گے۔'' میں نے کہا۔

''میں تو کہتی ہوں اس سارے چکر کو چھوڑو۔ مجو اور بابو خود آپس میں نمٹ لیں گے۔''

میں سرد آہ بھر کر بولا۔ ''بھول بیگم! اول تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم اس چکر میں گلے تک پھنس گئے ہیں۔ اگر الگ ہونے کے باوجود مجو پکڑا گیا تو پہلی فرصت میں ہمارا نام بک دے گا پھر معاملہ اب پورے پینتیس ہزار کا ہے۔''

''پینتیس ہزار؟ تم تو ستّر ہزار کہہ رہے تھے؟'' زینو نے مجھے گھورا۔

''درست، لیکن آدھا حصہ مجو کا ہوگا۔ وہ بھی تو برابر کا خطرہ مول لے رہا ہے۔''

اس پر زینو نے خاصا واویلا مچایا کہ وہ مُوا مردود، حرام خور اور فلاں فلاں کون ہوتا ہے آدھا حصہ لینے والا۔ پہلے میں نے اسے چپ کرانا چاہا مگر جب وہ ٹیپ کی طرح بجتی چلی گئی تو مجبوراً مجھے شوہروں والی آزمودہ ترکیب آزمانا پڑی۔

میں نے اُسے جھانپڑ مار کر کہا۔ ''چپ کر، جبو کی طرح بھونکے جا رہی ہے۔''

رقم لے جاتے وقت میرا وہی حال تھا جو چور کا چوری کا سامان لے جاتے ہوئے ہو سکتا تھا۔ ہر آتا جاتا شخص مجھے سادہ لباس میں پولیس والا لگ رہا تھا۔ صرف ایک خوانچہ فروش مجھے شریف لگ رہا تھا کیونکہ وہ کسی بھی زاویے سے پولیس والا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ خوانچہ لیے میرے پیچھے ہی چلا آرہا تھا۔ یعنی مجھ سے صرف دو فٹ... پیچھے۔ ظاہر ہے کوئی پولیس والا اتنا احمق نہیں ہوتا کہ جس کا تعاقب کر رہا ہو، اس کی ایڑیوں کے عین عقب میں چلے۔ نہ جانے یہ چھٹی حس کا اشارہ تھا یا کچھ اور میں سیدھا مجو کے پاس جانے کے بجائے پہلے اس ڈسٹ بن تک گیا جہاں مجو نے بابو کو رقم پھینکنے کی ہدایت کی تھی۔ دیو قامت کچرے دان کے پیچھے جانے سے پہلے میں نے محتاط نظروں سے ہر طرف دیکھا مگر وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا، سوائے خوانچہ فروش کے۔ اس کا روٹ بھی شاید یہی تھا۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے نکل کر مجو کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے صاحب کی کوٹھی وہاں سے کچھ ہی دور تھی۔ حسبِ معمول چوکیدار نے یوں آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا جیسے میں کوئی نظر نہ آنے والا جراثیم ہوں جسے وہ خوردبین سے دیکھ رہا ہو۔ کچھ دیر میں نے اس کی خیریت دریافت کی اور اندر مجو کے پاس چلا آیا جو بے تابی سے میرا منتظر تھا۔

''کیا ہوا؟ رقم کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''رقم محفوظ ہے۔ پہلے تو یہ بتا... کہ بچہ کہاں ہے اور تو اسے کب تک ''اپنا گھر'' چھوڑ کر آئے گا؟''

مجو جواب دینے ہی والا تھا کہ باورچی خانے کا دروازہ جہاں ہم بیٹھے تھے، دھڑام سے کھلا اور کچھ پولیس والے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ انہوں نے یوں ہم پر اپنا اسلحہ تان لیا جیسے ہم بہت بڑے دہشت گرد ہوں اور ان کی ایک لمحے کی چُوک سے فائدہ اٹھا کر نہ جانے کیا کر جائیں

گے۔

”ہینڈز اَپ!“ دستے کی قیادت کرنے والا اے ایس آئی گرجا۔ ”خبردار جو کسی نے حرکت کی۔“

مگر ہم ساکت رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ میں اور مجو دونوں ہی تھرتھر کانپ رہے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیسے گڑبڑ ہوگیا اور پولیس یہاں تک کیسے آگئی؟ اسی لمحے ایک ڈی ایس پی اندر آیا جس کے ساتھ بابو پہلوان کو دیکھ کر میرے اور مجو کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

”یہی ہے وہ کمینہ۔“ بابو نے چیخ کر کہا۔ ”میں نے فون پر اس کی آواز صاف پہچان لی تھی۔ ان دونوں نے میرے بچے کو اغوا کیا ہے۔“

”بچہ کہاں ہے؟“ اے ایس آئی نے مجو کو لات مار کر کہا۔

”کون سا بچہ؟“ اس نے کراہ کر کہا۔ ”ہم کسی بچے کے بارے میں نہیں جانتے۔“

”وہ بچہ جسے تم لوگوں نے اغوا کیا تھا۔“ اے ایس آئی بولا اور پھر اپنی پارٹی کو بنگلے کی تلاشی کا حکم دیا۔ یہ سنتے ہی میری حالت مزید دگرگوں ہونے لگی کیونکہ چند لمحے بعد بابو کا بیٹا مل جاتا اور ہم اغوا کے الزام میں لمبے عرصے کے لیے جیل جاتے لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پولیس والوں نے آکر رپورٹ دی کہ کوٹھی میں سوائے چوکیدار اور اس کی بیوی کے کوئی نہیں ہے۔ میں نے دیکھا مجو مسکرا رہا تھا۔

”ڈی ایس پی صاحب! میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ یہ شخص......“ اس نے بابو پہلوان کی طرف اشارہ کیا۔ ”صرف ہم سے دشمنی نکال رہا ہے۔ نہ جانے کس نے اس کا بچہ اغوا کیا اور اس نے موقع غنیمت جان کر ہمارا نام لے دیا اور صاحب ہم بھی کسی ٹٹ پونجیے کے ملازم نہیں ہیں۔“ جب مجو نے اپنے صاحب کا نام لیا تو ایک لمحے کو ڈی ایس پی کا رنگ بھی فق ہوگیا۔

بابو پہلوان پھر چلّایا۔ ”صاحب! یہ جھوٹ بکتا ہے۔ اس سے پوچھیں میرا بچہ کہاں ہے؟“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود مجو اور میری تکا بوٹی کردیتا۔ ”میں نے اسے رقم دی تھی۔ اس کی تلاشی لیں۔ رقم اس کے پاس ہوگی۔“ بابو نے میری طرف اشارہ کیا۔ اب کے مجو کی حالت خراب ہوگئی۔ یہ سوچ کر کہ رقم میرے پاس سے برآمد ہوجائے گی جو ہم دونوں کے جرم کا واضح ثبوت ہوگی لیکن جب اچھی طرح کھنگالنے کے بعد بھی میرے پاس سے کوئی رقم برآمد نہیں ہوئی تو اس کا بھی حیرت سے وہی حال ہوگیا جو بچہ نہ ملنے پر میرا ہوا تھا۔

”بابو کمینے، تُو نے ہمدردی کا اچھا صلہ دیا۔ میں نے جان پر کھیل کر رقم مقررہ جگہ پہنچائی اور تو نے پولیس کو میرے ہی پیچھے لگا دیا۔ میں رقم اس کوڑے دان میں ڈال آیا تھا جس کی تو نے نشاندہی کی تھی۔“ میں نے پوری ڈھٹائی سے اُسے لتاڑتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ بکتا ہے۔ میں خود دیکھ کر آرہا ہوں، وہاں کوئی رقم نہیں ہے۔“ وہ چلّایا۔

”ظاہر ہے، رقم جن کو بھجوائی تھی، وہ لے گئے ہوں گے۔“ میں سکون سے بولا۔

ڈی ایس پی نے بابو سے کہا۔ ”اب تم کیا کہتے ہو؟ اِن کے پاس سے نہ تو بچہ برآمد ہوا ہے اور نہ ہی رقم؟“

میں نے خود مجو کی آواز سنی تھی۔ اس کمالے بدمعاش سے پوچھو کہ یہ اس کے پاس کیوں آیا ہے؟“ بابو اب اپنی آواز کی آخری حدوں کو استعمال کررہا تھا۔

”چلّاؤ مت۔ ہم بہرے نہیں ہیں۔“ ڈی ایس پی تلخ لہجے میں بولا۔

”میرے خیال میں قانون کی کسی دفعہ میں دوست سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اب اگر ڈی ایس پی صاحب اجازت دیں تو میں اپنے صاحب کے قانونی مشیر ایڈووکیٹ رشید احمد صاحب کو فون کردوں؟“ مجو نے لوہا گرم پا کر چوٹ لگائی۔ ڈی ایس پی کا رنگ ایک بار پھر فق ہوا۔ وہ رشید احمد کی حیثیت سے بہ خوبی واقف تھا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ گڑبڑا کر بولا پھر بابو پر گرم ہوگیا۔ ”تم پر اعتبار کرکے مجھ سے زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوئی۔ تمہارے دونوں الزام غلط ثابت ہوئے۔“

باس کو بدلا دیکھ کر ماتحتوں نے بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔ اے ایس آئی نے بابو کی موٹی گردن پر ہاتھ مارا۔ ”اوئے، قانون کے ساتھ مسخری کرتا ہے۔ سرجی! مجھے تو یہ خود ہی مجرم لگتا ہے۔ بچے کو اس نے خود ہی غائب کردیا ہوگا اور اب ان شریف لوگوں پر الزام لگا رہا ہے۔“ دیگر ماتحتوں نے بھی حسبِ توفیق کارِخیر میں حصہ لیا اور پھر چلّاتے ہوئے بابو کو گھسیٹ کر لے گئے۔ ڈی ایس پی نے بادلِ ناخواستہ ہم جیسے کم رتبہ لوگوں سے معذرت کی اور رخصت ہوگیا۔ اگر مجو کا صاحب توپ چیز نہ ہوتا تو یقیناً اس وقت ہم دونوں حوالات میں بیٹھے اپنے نصیب کو رو رہے ہوتے۔ پولیس والوں کے

رخصت ہوتے ہی میں نے مجو کی گردن دبوچ لی۔

"سؤر کے بچے۔ تو نے اپنے ساتھ مجھے مروانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس وقت تو، تو دعوے کر رہا تھا کہ بابو کا باپ بھی تیری آواز نہیں پہچان سکے گا۔ ایکٹر کی اولاد۔"

"ابے چھوڑ!" مجو بولا۔ "تُو نے کون سی کمی کی تھی۔ پولیس کو اپنے پیچھے لگا لایا۔ خبیث، مردود......"

یہ سن کر میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ "یہ تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ پورے راستے میں دیکھتا ہوا آیا ہوں۔ سوائے ایک جھاڑی والے کے کوئی نہیں تھا۔"

"ابے وہی جھاڑی والا جاسوس ہوگا۔" مجو چلّایا۔ "خیر چھوڑ، یہ بتا کہ رقم کہاں ہے؟"

"اونہہ۔" میں نے سر ہلایا۔ "پہلے تو یہ بتا کہ بچہ کہاں گیا؟"

"بچہ!" مجو مکاری سے مسکرایا۔ "بچہ وہیں ہے جہاں اُسے ہونا چاہیے۔"

"اپنا گھر۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "تو پہلے ہی بچے کو وہاں چھوڑ آیا تھا؟"

"میں نے سوچا خوامخواہ خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ؟ پھر بابو کا بچہ تھا بھی بہت خبیث۔ جب روتا تھا تو سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔"

"شکر ہے۔ تیری حرام خوری نے ہمیں بچا لیا۔ میرا مطلب ہے عقل مندی نے۔"

"اب تو فوراً بتا کہ رقم کہاں ہے؟"

"کوڑے دان میں۔"

مجو یوں اُچھلا جیسے کرسی پر اچانک کیلیں نکل آئی ہوں۔

"خبیث کمالے تو سچ مچ رقم کوڑے دان میں ڈال آیا؟"

"اس کوڑے دان میں نہیں بلکہ اس کوڑے دان میں جو تیری کوٹھی کے باہر رکھا ہوا ہے۔" میں نے وضاحت کی تو مجو نے سکون کا سانس لیا۔ "شکر ہے۔ تو نے تو میری جان نکال دی تھی۔" پھر چونکا۔ "اِس وقت کیا ہوا ہے؟"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ کیوں؟ کیا ہوا؟"

"تیرا بیڑا غرق۔" وہ چلّایا اور اٹھ کر باہر دوڑا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ مجو بدحواسی کے عالم میں چوکیدار سے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ابے...... گاڑی...... کچرا......کوڑے دان کہاں ہے......؟ اسے لے گئے؟"

"ہاں۔ کوڑے دان تو گیا۔" چوکیدار بولا۔ "ابھی ابھی گاڑی لے کر گیا ہے۔"

مجو باہر کی طرف بھاگا اور جب تک میں گیٹ سے باہر نکلا، وہ غائب ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے میں سمجھ چکا تھا کہ میں نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے رقم کا پیکٹ جس کوڑے دان میں ڈالا تھا، اسے کچرے والی گاڑی لے گئی تھی۔ یہ کام میں نے چوکیدار کی نظر بچا کر کیا تھا۔ صدمے سے میرا بُرا حال ہو گیا لیکن اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ مجو کے آنے سے پہلے میں نے اندر جا کر بابو کا نمبر ملایا اور آواز بدل کر اس کے بچے کے بارے میں بتایا۔

"رقم دینے کا شکریہ۔ اب تم اپنا بچہ ایدھی صاحب کے "اپنا گھر" سے لے سکتے ہو۔" میں نے کہا اور فون بند کر کے مجو کا انتظار کرنے لگا۔

حسبِ توقع مجو نے مشتعل سانڈ کی طرح آتے ہی مجھ پر حملہ کیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا لہٰذا میں نے بہ آسانی اسے قابو کر لیا۔ بے بس ہو کر اس نے مجھ پر زبانی حملہ کیا اور ایک سے ایک فحش گالیاں دیں اور جب گالیوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"مجو! صبر کر۔ یہ رقم ہماری قسمت میں نہیں تھی۔ شکر کر کہ ہم جیل جانے سے بچ گئے۔"

مجو بھوں بھوں کر کے روتا رہا۔ خاصی دیر بعد جب وہ چپ ہوا تو میں نے جیب سے نکال کر اسے ٹافیاں تھمائیں۔

"یہ لے اپنی امانت۔ میرا خیال ہے کہ ان کی مدد سے تُو اپنا غم غلط کر سکے گا۔"

مجو نے جھپٹ کر مجھ سے ٹافیاں چھینیں۔ "اب تو اپنی منحوس صورت لے کر دفع ہو جا اور آئندہ یہاں آیا تو چائے میں سنکھیا ڈال کر پلا دوں گا۔" اس نے اپنے قاتلانہ عزائم کے ساتھ کہا۔

میں مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ مجو نے جو فاش غلطی کی تھی اور بابو نے اسے بہ آسانی پہچان لیا تھا۔ میں نے اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے اسے وہ ٹافیاں دے آیا تھا۔ ذہین قارئین سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر نہیں تو ذرا ذہن لڑائیے کہ میں نے مجو کو کیا سزا دی تھی؟

◆◆◆

قسط 3:

# شعلہ زن

روبینہ رشید

وہ شعلہ زن تھی یا جوالا مکھی... اس کے وجود میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا... اپنوں کی خود غرضی، دھوکے اور دل وجاں پر گزر جانے والی ناگہانی اس کے وجود کو تہ وبالا کر دینے والے لاوے کے مانند رقصاں تھی... رسوائی کی موت کو اس کا انجام ٹھہرایا گیا مگر مقدر اسے اپنے ساتھ لے اڑا... اس کے راستے میں رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہمالیہ حائل تھے مگر وہ حاتم طائی کی طرح زندگی کی حسن آرا کے مشکل سوالات کے جواب تلاشتی رہی... ہر قیامت نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا... ہر افتاد اسے مضبوط بناتی گئی... پناہ اور بقا کی تلاش اسے مسلسل دوڑا رہی تھی... موت روپ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں تھی... وہ اپنی طاقت سے خود ناآشنا تھی... راہ میں آنے والے ہر پتھر کو وہ اپنے راستے سے ہٹا رہی تھی... اس کے باوجود اس بار آنے والا طوفان شدید تھا... اس میں ناکامی قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی... ایک ایسی قیامت جو کروڑوں افراد کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے...

**ایک سادہ و معصوم نازک اندام دوشیزہ کی سنسنی خیز داستاں......**

Scanned By: ATA-UL-MUSTAFA 0333-4585215
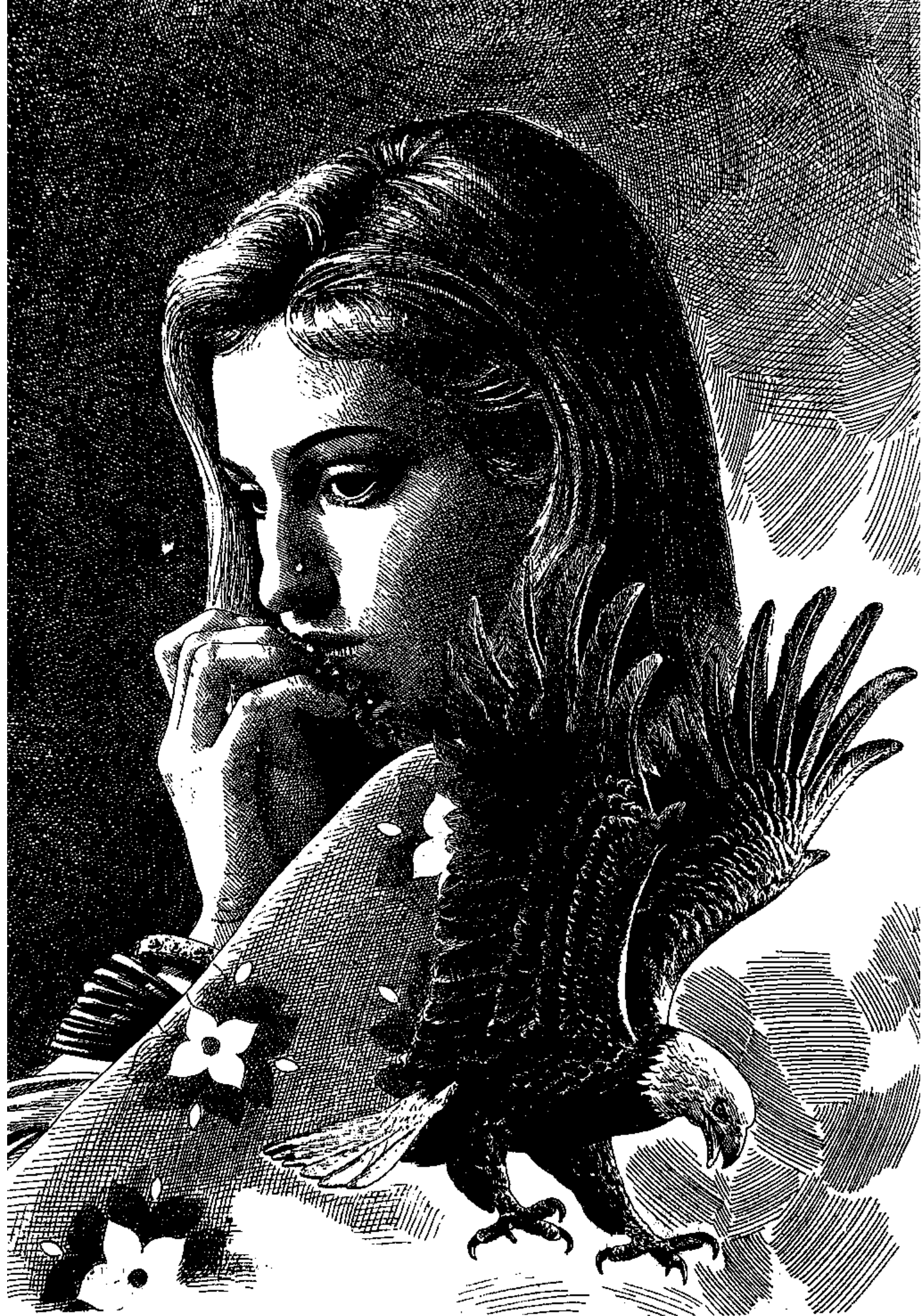
زندگی مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔
مگر یہ دو قدم پوری زندگی پر حاوی محسوس ہو رہے تھے۔

وہ چھوٹا سا کمرا لحہ بہ لحہ تندور بنتا جا رہا تھا۔
آگ کی تپش اور حدت میرے وجود کو جھلسا رہی تھی۔ دھوئیں کی شدت کی وجہ سے کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ سانسیں گلے میں پھنسی جا رہی تھیں۔ جھلتی ہوئی موت کی گرم وادی اور زندگی کی جانب کھلنے والے دروازے کے درمیان سیداں ایک بہت بڑے انگارے کے مانند دہک رہی تھی۔ اسے ہٹائے بغیر دروازے تک پہنچنا اور باہر نکلنا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی ناقابلِ برداشت بُو پھیلی ہوئی تھی۔ زرینہ اب تک بے ہوش تھی مگر دھوئیں کی وجہ سے اس کو سانس بھی قدرے رک رک کر آ رہی تھی۔ میں نے اسے بائیں بازو کی مدد سے پہلو سے چپکا یا ہوا تھا۔ آگ اب چھت پر لکڑی کے شہتیروں تک پہنچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں کمرا ڈھے جانے والا تھا۔ اگر میں کچھ نہ کر پائی تو شاید اس سے بھی پہلے دم گھٹنے سے آنے والی عبرت ناک موت میرا اور زرینہ کا مقدر بن سکتی تھی۔

دھوئیں کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی دینا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ سیداں کے پیروں کی جانب سے نکل کر دروازے تک پہنچ جانا ممکن ہو سکتا تھا۔ ایک بار وہاں تک پہنچنے کے بعد باہر نکلنا آسان تھا۔ سو میں نے اللہ کا نام لیا۔ زرینہ کو مضبوطی سے خود سے لپٹایا اور تیزی سے آگے بڑھی۔ دروازے اور میرے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ تھا مگر آگے بڑھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ایک لمحے کے لیے جہنم میں قدم رکھ دیا ہو۔
آگ کی تیز لپٹوں نے میرے بازو اور کندھے کو جُھلسا دیا تھا۔

سیداں کے پیروں پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے میرے دوپٹے کے کونے نے آگ پکڑ لی تھی۔ میں ایک ہاتھ سے زرینہ کو تھامے دوسرے کی مدد سے دوپٹے میں لگی آگ بجھاتے ہوئے دروازے تک پہنچی۔ میں نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور وہ کھل گیا۔
میں گویا اُڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس وقت ہر خیال اور ہر چیز میرے دل و دماغ سے محو ہو چکی تھی۔ یاد تھی تو صرف تازہ اور صاف ہوا میں سانس لے پانے کی شدید تمنا......

میں اپنی دُھن میں تیزی سے دوڑتی کئی قدم آگے نکل گئی۔ اگر مجھے ٹھوکر نہ لگتی تو شاید میں قبرستان سے باہر نکل کر دم لیتی۔ وہ ٹھوکر اتنی شدید تھی کہ میں خود کو سنبھال ہی نہیں پائی اور زرینہ سمیت زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ میری آنکھیں اب بھی شدت سے جل رہی تھیں اور مجھے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے کئی بار آنکھوں کو رگڑا اور منظر کے قدرے صاف ہوتے ہی اپنے ساتھ گری زرینہ کا جائزہ لیا۔ اس کی نیند یا بے ہوشی نے مجھے تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ اسی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔ اپنے اطمینان کی خاطر میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ پھر ناک کے آگے دونوں انگلیاں رکھ کر اس کی سانس کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ وہ کتنی ٹھیک تھی، یہ تو میں نہیں جانتی تھی مگر وہ زندہ تھی۔
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ جب تک سانس تب تک آس...... وہ زندہ تھی تو اسے ہوش بھی آ ہی جانا تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے دوبارہ اس کے برابر میں ڈھے گئی۔
ابھی میں کچھ سوچ بھی نہیں پائی تھی کہ ہلکے سے دھماکے کی آواز کے ساتھ وہ کمرا ٹوٹ کر بکھر گیا --- کالی دنیا کی مہارانی بننے کے خواب دیکھنے والی سیداں اپنی تمام تر پُراسرار طاقتوں، خواہشوں، حیرتوں اور اس خطرناک کالے سیاہ ناگ کے ہمراہ راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔
دنیا میں قدم قدم پر عبرت لینے اور سیکھنے سمجھنے کے لیے کتنا کچھ ہے، میں نے پھریری سی لیتے ہوئے سوچا مگر گمان انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔
اس کھنڈر میں اب کہیں بھڑکتی آگ نظر آ رہی تھی تو کہیں انگارے سلگ رہے تھے۔ اس آگ کی وجہ سے ہی تھوڑی بہت روشنی بھی موجود تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی کا راج تھا۔ اچانک میری سماعت میں کسی کے تیز تیز قدموں کی چاپ گونجی۔ وہ یقیناً ایک سے زیادہ افراد تھے اور غالباً قبرستان میں داخل ہونے ہی والے تھے۔ میں نے زرینہ کو گود میں اٹھایا اور تیزی سے آواز کی مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔
اونچی نیچی زمین اور بے ترتیب قبروں کے درمیان زرینہ کو اٹھائے بھاگنا خاصا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ قبروں

کے عقب میں برگد کا ایک بڑا اور پرانا درخت تھا۔ اس کی شاخوں اور اوپر سے لٹکتی لمبی لمبی جڑوں نے وہاں سائبان سا بنا رکھا تھا۔ میں اندھوں کی طرح درخت کو ہاتھوں سے ٹٹول رہی تھی۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں ہم وقتی طور پر چھپ سکیں اور اس کے بڑے سے تنے کی پچھلی سمت مجھے وہ پناہ گاہ مل بھی گئی۔ اس تنے میں ایک خاصی چوڑی کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھوں سے اسے جھاڑا اور پھر زرینہ کو سینے سے لگائے اس میں جا گھسی۔ یہ چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اس اندھیرے میں اگر کوئی ہمیں درخت کے آگے پیچھے تلاش بھی کرتا تب بھی ہم اسے نظر نہیں آسکتے تھے۔ البتہ میں تھوڑا سا جھک کر بہ آسانی باہر کا منظر دیکھ سکتی تھی۔

قدموں کی آوازیں رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ وہ تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں طاقت ور ٹارچیں تھیں جن کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دینے والے اندھیرے میں خاصی کمی آگئی تھی اور میں انہیں واضح طور پر دیکھ پا رہی تھی۔

ان میں سے ایک خاصا لمبا اور گنجا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا جسے وہ غالباً کسی بٹن یا لیور کی مدد سے بار بار کھول اور بند کر رہا تھا۔ دوسرا شخص جو اس سے ایک قدم آگے تھا، اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی۔ پستہ قامت اور قدرے بھاری ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ اس کے بال گردن تک لمبے تھے۔ سب سے پیچھے والے کے ہاتھ میں بھی ٹارچ تھی جس کی روشنی میں آگے والے تو نظر آ رہے تھے مگر وہ خود اندھیرے میں تھا۔

''یار ماسٹر! کیا چاقو سے کھیل رہا ہے۔ بگڑ گیا نا تو سامنے والے کا چاقو تیرے پیٹ میں اترنے کے بعد بھی نہیں کھلے گا سالا۔'' پستہ قامت مڑ کر لمبے والے کے بازو پر ہاتھ مار کر بولا۔

''چل بے...... ماسٹر شوکی کا چاقو ہے یہ، تیرے جیسے کسی موچی بٹیرے کے ہاتھ میں نہیں کہ کھلنا بھول جائے، اپن کا چاقو بند ہونا بھول سکتا ہے کھلنا نہیں...... جانتا ہے نا؟'' وہ سفاکی سے بولا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔ ایسے ہی تو تجھے ڈینجر نہیں کہتے۔'' اچانک اس کی آواز کو بریک لگ گیا اور وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''کیا ہو گیا بے آج کیا کریم کی روح گھس گئی ہے تجھ میں جو ایسی حرکتیں کر رہا ہے؟'' ماسٹر شوکی کی توجہ اس کی جانب تھی۔

''یہ......'' پستہ قامت ہکلایا۔ ''یہ دیکھ یہاں تو عجب ہی چکر نظر آ رہا ہے۔''

''کہاں؟ اوہو۔'' شوکی بھی اچھل پڑا۔ ''یہ کیا ہوا ہے آگ لگی ہوئی ہے۔''

وہ تینوں دوڑتے ہوئے جائے واردات پر پہنچے۔

''یہ ہوا کیا ہے؟'' پستہ قامت بولا۔ ''باس نے تو کہا تھا کہ اماں سیداں ہے اپنی بیٹھک میں۔ کوئی وہاں پھٹکے نہیں...... مگر یہاں تو کوئی پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا۔ کوٹھڑی اس بُری طرح تباہ ہو گئی ہے جیسے کسی نے راکٹ مارا ہو یہاں......''

''مجھے تو خوف آ رہا ہے ماسٹر...... یہ کوئی جن بھوت کا چکر بھی ہو سکتا ہے سنا ہے کہ عمل الٹ جائیں تو سب کچھ جلا کر خاک بھی کر دیتے ہیں۔ اور پھر اس جگہ خطرناک آتماؤں کا راج ہو جاتا ہے جو وہاں آنے والے کسی بندے کو نہیں چھوڑتیں۔'' تیسرا جو اَب تک خاموش تھا، لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ابے چپ رہ...... سوچنے دے۔ ہر وقت بھوت پریت، آتما کے خوف میں پڑا رہتا ہے۔'' شوکی اسے جھڑک کر بولا۔ ''آگ اب تک سلگ رہی ہے مگر یہاں کوئی نہیں ہے شاید اماں سیداں واپس چلی گئی ہو۔ پہلے پانی کا بندوبست کرو۔ اس آگ کو تو بجھائیں پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔''

ذرا سی دیر میں ان لوگوں نے بچی کھچی آگ پر قابو پالیا۔ یوں بھی ملبا گرنے کی وجہ سے آگ تقریباً بجھ ہی گئی تھی مگر وہ عجیب سی دل متلا دینے والی بُو اور دھواں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

''میں باس کو فون لگاتا ہوں۔ تم دونوں ذرا یہاں کا جائزہ لو۔'' شوکی ان کو ہدایت دے کر کانوں سے موبائل لگائے درخت کی طرف چلا آیا۔

''جی باس۔'' وہ رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ''ہم قبرستان میں ہی ہیں مگر ایک بُری خبر ہے...... اماں سیداں کوٹھڑی میں نہیں ہے بلکہ کوٹھڑی ہی نہیں ہے۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا پھر لمحے بھر بعد بولا۔ ''نہیں باس! میں نے پی نہیں رکھی نہ ہی میرا دماغ خراب ہے۔ بس وہ کوٹھڑی جل کر گر گئی ہے۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ ہم نے آگ تو بجھا دی

ہے اب رفیق اور کریم ملبے میں دیکھ رہے ہیں...... جو حکم......ہم انتظار کرتے ہیں۔‘‘

پھر وہ موبائل ٹارچ جلاتا ہوا دوبارہ کوٹھڑی کی جانب مڑا۔ واپس جاتے جاتے وہ ٹھٹکا اور دوبارہ برگد کی طرف آیا۔ میں اپنی جگہ جم گئی تھی۔ شاید اسے شک ہو گیا تھا مگر کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ چند لمحے جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ پھر موبائل کی ٹارچ کی روشنی زمین پر ڈالی...... اسے شاید وہاں کچھ نظر آیا تھا۔ اس نے جھک کر اسے زمین سے اٹھایا اور چہرے کے قریب لا کر غور سے دیکھا۔ اس مدھم روشنی میں، میں بھی اسے صاف دیکھ پا رہی تھی۔ وہ زرینہ کے پیروں میں بندھی موتیوں کی مالاؤں میں سے ایک تھی۔

وہ اسے چند لمحے دیکھتا رہا پھر اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے جیب میں ڈال لیا اور کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

’’آگ بجھ گئی ہے مگر سب کچھ انگارا اور راکھ بن گیا ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے کچھ زیادہ گڑبڑ کی بات لگ رہی ہے۔‘‘ پستہ قامت اس کے قریب آ کر بولا۔

’’کچھ...... ابے گھامڑ یہاں سب کچھ ہی گڑبڑ ہے۔ باس آرہا ہے۔ اس نے اماں سیداں کو ڈھونڈنے کو کہا ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے......تو کیا کہہ رہا تھا؟‘‘

’’میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بُو آرہی ہے تجھے......؟‘‘

’’ہاں، کچھ بہت بُری سی بُو ہے تو...... گوشت جلنے جیسی...... ہیں......‘‘ پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ یک دم اچھل پڑا اور تیر کی طرح کوٹھڑی کے ملبے کی طرف لپکا۔

’’تو سچ کہہ رہا ہے...... یہاں اندر کوئی تھا جو اس آگ کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا ہے رفیق......تم لوگ ٹارچ قریب لاؤ۔‘‘ وہ زور سے بولا۔

’’کیا لگ رہا ہے استاد؟ کسی نے دستی بم مارا ہے؟‘‘ رفیق نے یکلخت پوچھا۔

’’مجھے لگتا ہے کہ کسی نے باقاعدہ آگ لگائی ہے۔‘‘ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ’’ہو سکتا ہے کہ آگ لگتے وقت اماں سیداں اندر ہی ہو؟‘‘

’’ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کسی نے اسے بے ہوش کر کے آگ لگا دی ہو......خس کم جہاں پاک......‘‘ شوکی بولا۔

’’مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔ ویسے تو مجھے ایک آنکھ پسند نہیں تھی وہ مغرور بُڑھیا۔ دیکھ کر ہی عجیب سا لگتا تھا۔ حکم یوں چلاتی تھی جیسے وہ سُپر باس ہو اور اپنا باس بھی اس کی ہر بات پر سر جھکا دیتا تھا جیسے زرخرید غلام ہو۔‘‘ رفیق بڑبڑایا۔ ’’مگر پھر بھی اس کا ایسا انجام ہوا۔‘‘

وہ تینوں وہیں ٹہلتے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ میں سن رہی تھی، کچھ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ ان کے نام شوکی، رفیق اور کریم تھے۔ کچھ دیر میں مراد شاہ بھی آ گیا۔ اس نے آتے ہی ان تینوں کو بری طرح پھٹکارا پھر وہ چاروں جلی ہوئی کوٹھڑی کی طرف چلے گئے۔ بوکھلاہٹ، بے یقینی اور تشویش بھری آوازوں کے ساتھ انہوں نے سیداں کی سلگتی چتا کو ٹھنڈا کیا اور کچھ کاوشوں کے بعد اس کی سوختہ لاش ان کے سامنے آ گئی مگر مراد شاہ کو وہ ڈھانچا دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ جادوئی قوتوں کی حامل وہ بُڑھیا اتنی آسانی سے مر سکتی ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو قبرستان میں پھیل کر اسے تلاش کرنے کا حکم دے دیا۔

’’ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے باس! اماں سیداں یہاں کہیں نہیں ہے۔‘‘ شوکی، رفیق اور کریم کچھ دیر بعد آگے پیچھے واپس لوٹے تھے۔ ’’ہو سکتا ہے کہ وہ بستی میں چلی گئی ہو......یا پھر......‘‘

’’ہو تو بہت کچھ سکتا ہے۔‘‘ مراد شاہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ’’میں نے کہا تھا کہ اس کمرے میں اماں کے ساتھ ایک لڑکی اور بچی بھی تھی۔ ان میں سے کوئی نظر آیا؟‘‘

’’نہیں...... یہاں تو دور دور تک کوئی نہیں ہے۔‘‘ رفیق یقین سے بولا۔

’’کوئی بندہ نہیں، کوئی سراغ نہیں۔ گھنٹا بھر میں کوٹھڑی جل کر راکھ ہو گئی...... ہمارے اپنے علاقے میں......اور ہمارے ہاتھ ایک جلی ہوئی لاش کے سوا کچھ نہیں لگا......کوئی سراغ کوئی نشان تک نہیں......ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تین میں سے دو تو زندہ ہی یہاں سے بھاگے ہیں اُڑ کر تو نہیں گئے ہوں گے......کوئی چیز......کوئی کھُرا تو ملنا چاہیے یا پھر تمہاری نظریں ہی کمزور ہو گئی ہیں، تمہارے دماغوں کی طرح؟‘‘ وہ غرایا۔

’’سراغ......ایک منٹ......شاید یہ کسی کام آئے۔‘‘ شوکی جیب سے مالا نکالتے ہوئے بولا۔ ’’یہ مجھے یہاں سے ملی ہے۔‘‘

’’کیا ہے یہ؟ دکھا مجھے۔‘‘ مراد اس کے ہاتھ سے مالا جھپٹتے ہوئے بولا۔ وہ اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ’’یہ...... یہ تو اس چھوکری کے پیر میں تھی۔‘‘ وہ بڑبڑایا۔ ’’یعنی میرا شک ٹھیک نکلا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے لے کر بھاگنے

میں کامیاب ہو گئی...... اور اماں سیداں......'' اس نے مڑ کر جلی ہوئی کوٹھری کی طرف دیکھا۔ ''یہ کہاں سے ملی تجھے...... ٹھیک ٹھیک یاد کر...... کس جگہ سے......؟''

''یہیں اس درخت سے پہلے...... زمین پر سے ملی تھی۔''

''اچھا......'' وہ اچھا کو کھینچتا ہوا بولا۔

''اسے ڈھونڈنا ہوگا...... ابھی اتنی جلدی وہ یہاں سے باہر نہیں نکل سکی ہوگی اگر بستی کی طرف گئی ہوتی تو یقیناً پکڑی جاتی۔ اس کا مطلب ایک ہی ہے۔ وہ یہیں کہیں ہے...... میں اسے عبرت کا نشان بنا دوں گا۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھیں شرارے برسا رہی تھیں۔

''غور سے سنو...... وہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہے اس کے ساتھ امجد کی بیٹی زرینہ بھی ہوگی۔ اچھی طرح چھان مارو پورے قبرستان کو...... ضرورت پڑے تو قبروں میں بھی دیکھو...... یاد رکھو وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے، بہت عیار ہے اور ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکی ہے۔ اسے کسی بھی قیمت پر بچ کے نہیں نکلنا چاہیے، سمجھے؟''

''فکر مت کرو باس۔'' شوکی آگے بڑھا۔ ''بالکل بھی نہیں بچے گی جیسے ہی نظر آئے گی سالی کے پیٹ میں چھ کی چھ گولیاں اتار دوں گا۔ اگلی سانس بھی نصیب نہیں ہوگی اُسے۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

''نہیں۔'' مراد شاہ تیزی سے بولا۔ ''ہرگز نہیں۔ اتنی آسان موت نہیں ملے گی اُسے...... اسے تو تڑپ تڑپ کر ذلیل ہو ہو کر مرنا چاہیے اور یہی ہوگا۔ یہی ہوگا۔ تو بس دیکھتا جا، اس نے مجھ سے مراد شاہ سے ٹکر لی ہے، مذاق نہیں ہے۔ مرتے دم تک پچھتائے گی اور مرنے کے بعد بھی توبہ کرے گی کہ کس سے بھڑی تھی وہ۔'' مراد شاہ نفرت سے بولا۔

''ایسا ہی ہوگا باس...... مگر اس کا فوراً غائب ہونا بہت ضروری ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اس سے دھندے میں کوئی لفڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ اپنا مال بالکل تیار کھڑا ہے دو چار دن میں کنٹینر لگ جائے تو اچھا ہے۔ کون جانے اس کے پیچھے قادر خان ہو۔ ہمارا کام بگاڑنے آئی ہو۔ آخر اماں سیداں جیسی مضبوط دیوار کو گرا ہی دیا نا اُس نے...... آپ نے ہی تو کہا ہے کہ عام لڑکی نہیں ہے۔ اور...... پولیس کی مخبر بھی تو ہو سکتی ہے۔ آج کل یوں بھی بڑی سختی چل رہی ہے۔ یہاں کے بندے تو اپنے ہیں پر ڈپارٹمنٹ میں آج کل بہت کچھ خفیہ طور پر بھی ہونے لگا ہے۔'' شوکی بولا۔

''ہُم...... ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا، اسے تلاش کرنا ہے اور امجد کے خون کے ساتھ ساتھ اس لاش کا معاملہ بھی اس کے سر پر ہی ڈالنا ہے۔ جیلوں کے دھکے اور پھانسی کا پھندا اس سے اچھا تحفہ کیا ہو سکتا ہے اس کے لیے۔'' مراد شاہ زور سے ہنسا۔

میں دم سادھے اُن کی باتیں سن رہی تھی۔ میرے ساتھ یہ عجیب تماشا ہو رہا تھا۔ ہر بار میں پچھلی مشکل سے زیادہ بڑی پریشانی میں پھنسنے کا ریکارڈ بنا رہی تھی۔ ان لوگوں سے رحم کی امید رکھنا حماقت سے کم نہیں تھا۔

یہ لوگ یقیناً کسی جرم میں یا بُرے دھندے میں ملوث تھے۔ اماں سیداں بھی اس گینگ کا ہی اہم کردار تھی۔ اتفاقاً ہی سہی مگر میرے ہاتھوں اس کے خاتمے نے انہیں میرا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں کافی کچھ جانتی ہوں۔ ان کے کاروبار کے متعلق نہ سہی مگر امجد کے قتل اور زرینہ کے معاملے میں انہیں پھنسا سکتی تھی، ایسے میں، میں ان کے لیے خطرے کا سگنل بن چکی تھی۔

اب اس بستی اور اس گھر میں میرا جانا بھی ناممکن نظر آ رہا تھا۔ بہرحال مجھے زرینہ کو کسی طرح وہاں پہنچانا تھا۔ اس کے بعد میں کہاں جاؤں گی، یہ ابھی مجھے خود معلوم نہیں تھا۔

''باس...... ماسٹر...... وہ دونوں وہاں نہیں ہیں؟'' رفیق ہانپتا ہوا واپس آ گیا تھا۔

''وہ اس قدر جلدی کہاں غائب ہو سکتی ہے...... لو یہ بھی واپس آ گیا۔'' مراد، کریم کو منہ لٹکائے واپس آتا دیکھ کر بولا۔ ''میرے حساب سے اسے یہیں ہونا چاہیے یا پھر یہ سارا مفروضہ ہی غلط ہے...... تم لوگ دو لمحے رکو۔''

اس نے موبائل پر کوئی نمبر دبایا اور کان سے لگا کر رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

''ہیلو، کہاں مر گئے تھے؟'' فون لگتے ہی وہ غرایا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے اب میری بات غور سے سن۔ فوراً اماں سیداں کے گھر جا اور دیکھ کیا وہ وہاں ہے...... ہاں، ہاں ابھی فوراً وہاں جو بھی رپورٹ ملے، مجھے بتا میں انتظار کر رہا ہوں۔''

''ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے باس؟'' شوکی نے پوچھا۔

''انتظار...... اگر اماں سیداں کو کچھ نہیں ہوا ہوگا تو وہ اپنے گھر پہنچ چکی ہوگی۔'' مراد کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''اگر وہ لاش اس کم بخت کی ہے تب تو ٹھیک ہے ورنہ پھر اس کی

تلاش سب سے اہم کام ہوگا۔''

وہ چاروں غالباً تین چار قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک ہلکی سی کراہ نما سسکی نے ان کے قدم روک لیے۔ میں خود اپنی جگہ ساکت سی رہ گئی۔ میری گود میں کب سے بے سدھ پڑی زرینہ کو اچانک ہوش آ گیا تھا۔

میں اس کے لیے بے حد پریشان تھی۔ سچ پوچھو تو اس وقت یہاں سے بچ نکلنے کے بعد میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اسے جلد سے جلد ہوش آ جائے مگر اس وقت اس کا ہوش میں آنا ایک بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا تھا۔

اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں خوف و دہشت بھری ہوئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کہاں اور کیوں ہے؟ گود میں لیٹے لیٹے وہ منہ بسورے مجھے گھور رہی تھی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور اندھیرے میں یقیناً اسے میرا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ کسی بھی وقت رونا شروع کرسکتی تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور چہرہ اس کے کان کے قریب لا کر سرگوشی کی۔ ''زرینہ یہ میں ہوں باجی سارہ ...... تم بالکل چپ رہنا۔'' اور دوسرا ہاتھ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کے منہ پر رکھ دیا۔

''تو نے کچھ سنا شوکی؟'' مراد شاہ رکتے ہوئے بولا۔

''ہاں باس...... سنا تو ہے، ہلکی سی آواز تھی کوئی۔'' وہ بھی چوکنا ہوکر بولا۔

''وہ یہیں ہے...... یہیں کہیں چھپی بیٹھی ہے۔'' مراد جوش سے بولا۔

''مشکل ہے باس۔ سارا قبرستان تو چھان مارا ہے ہم نے، ہوسکتا ہے کہ کوئی جناور ہو بلی وغیرہ۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ سر ہلا کر سختی سے بولا۔ ''یہ امجد کی چھوری کی ہی آواز ہے۔ وہ یہیں ہے دیکھو یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے خود ہی سامنے آ جاؤ...... ورنہ اب ہم جان تو گئے ہیں کچھ دیر میں ڈھونڈ نکالیں گے تمہیں اور اس کے بعد تمہارا جو حشر ہوگا، یہ تم خود ہی سوچ لو۔''

وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا، اس کے لہجے میں سفاکی ہی سفاکی تھی۔

''یہ ایسے نہیں مانے گی شوکی۔'' میری طرف سے مسلسل خاموشی پر وہ اس کی جانب مڑا۔ ''تو اسے بلا مجید کو......'' پھر اس نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ میں فاصلے کی بنا پر وہ نہیں سن پائی مگر میں مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ ان سب کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ دوسری طرف زرینہ تھی جو میری گود میں مسلسل کسمسا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ مجھے وہ جانتی تھی مجھ سے پیار بھی کرتی تھی مگر بہرحال میں اس کے لیے کافی حد تک اجنبی تھی پھر میں جس طرح اس کا منہ دابے اسے جکڑے بیٹھی تھی ایسے میں اس کا مجھ سے خوف زدہ ہوجانا فطری سی بات تھی۔

''زرینہ، زرینہ! میری بچی کہاں ہو تم؟'' اس آواز نے مجھے اور زرینہ دونوں کو ہی یک دم چونکا دیا۔ اس کی کسمساہٹ میں بے حد تیزی آ گئی تھی۔ پروین اب تک مجھے نظر نہیں آئی تھی مگر اس کی آواز صاف طور پر میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ زرینہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آ نکلی ہو۔ اگر وہ تھی تو ہوسکتا تھا کہ اس کے ساتھ بستی کے لوگ بھی ہوں۔ اس صورت میں ہماری بچت کی راہ نکل سکتی تھی۔

''زرینہ سامنے آؤ میری بچی۔ اپنی ماں کو جواب تو دو۔ کب سے ڈھونڈ رہی ہوں تجھے...... سارہ کیا تم ہو یہاں، تم تو زرینہ کو لانے آئی تھیں؟'' اس کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مراد شاہ اور اس کے گرگے بھی وہیں موجود تھے۔ ایسے میں میرا زرینہ کو لے کر سامنے آنا درست ہوگا یا غلط...... میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی پھر میرے ذہن میں خطرے کی سیٹی بھی مسلسل بج رہی تھی۔ یہ کوئی چال بھی ہوسکتی تھی۔

دوسری صورت میں اگر یہ پروین ہی تھی تو وہ اسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔ وہ ان کے لیے آسان ہدف ثابت ہوتی۔ اگر ایک بار وہ اسے پکڑ لیتے تو پھر زرینہ اور مجھ تک پہنچنا آسان تر ہوجاتا۔ وہ اب تک مجھے نظر نہیں آئی تھی شاید وہ کسی ایسے زاویے سے اندر داخل ہوئی تھی جو مجھے درخت کے پیچھے چھپے ہونے کی بنا پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں بھی میں فوری طور پر اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے میں نے اپنی جگہ چھپے رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اس کی آمد پر مراد شاہ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔ سچی بات یہ بھی تھی کہ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ میرے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔

''تم اِس وقت یہاں؟'' مراد شاہ نے شاید اسے دیکھ

لیا تھا۔

''ہاں شاہ جی! جس کی اکلوتی بیٹی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو، اسے چین کہاں؟''

''تم پریشان مت ہو ہم بھی اسے ہی ڈھونڈ رہے ہیں۔'' اس بار کم از کم وہ سچ بولا تھا۔ ''آخر وہ امجد کی بیٹی ہے۔ اس کی حفاظت ہماری بھی ذمّے داری ہے۔''

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر اسے سب کچھ بتا دوں' اس کی اصلیت، ارادے اور عزائم...... مگر اسی وقت مجھ پر ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑی میری ساری توجہ پروین کی آواز اور پھر ان سب کی باتوں کی جانب تھی۔ میرے ساتھ یقیناً زرینہ نے بھی اپنی ماں کی آواز سن لی تھی۔ اب جیسے ہی میری گرفت کمزور پڑی وہ میری گود سے نکل بھاگی۔

''زرینہ۔'' میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑنا چاہا مگر وہ تیزی سے پھسلتی اور دوڑتی ہوئی مراد شاہ کے پاس جا پہنچی۔ گھٹنوں سے نیچے ٹخنوں تک لٹکتا وہ سرخ لبادہ شاید اسے تنگ محسوس ہو رہا تھا اسی لیے اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کے اوپر تک کھینچ لیا تھا۔ میں اب درخت کے نیچے سے اسے بے بسی سے تکنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

''اماں۔'' وہ روتی اور چیختی ہوئی جارہی تھی۔ ''اماں کہاں ہے؟'' وہ مراد شاہ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

''وہ...... وہ تو تمہاری سارہ باجی کو ڈھونڈ رہی ہے شاید...... وہ بے چاری جانے کہاں ہوگی؟'' مراد شاہ سادگی سے بولا۔

''چاچا وہ تو میرے ساتھ تھی۔ اُس نے ہی تو پکڑ رکھا تھا مجھے......'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''تمہارے ساتھ؟ کہاں؟''

''وہاں۔'' زرینہ نے اپنا ننھا سا ہاتھ درخت کی طرف بڑھایا جس کے تنے میں موجود کھوہ میں، میں چھپی ہوئی تھی۔ اب وہاں چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''اچھا دکھاؤ تو ذرا مجھے...... میں بھی تو دیکھوں کہ یہاں ایسی کون سی جگہ ہے؟'' وہ زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر درخت کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔

''مگر اماں۔'' وہ ٹھٹکی۔

''اماں سے بھی مل لینا پہلے تمہاری سارہ باجی سے تو مل لیں۔'' وہ اسے گھسیٹتا ہوا برگد تک لے آیا۔ ''ہاں بھئی سارہ اب تم خود باہر آرہی ہو یا......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں بُری طرح پھنس چکی تھی۔ آخرکار میں تنے سے باہر نکلی۔ میرے باہر آتے ہی ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میری آنکھیں چندھیا کر بند ہوگئیں۔

''بھئی داد دینی پڑے گی ہمارا علاقہ...... ہم یہاں برسوں سے کام کررہے ہیں اور پھر بھی تو نے پہلی بار میں ایسی پناہ گاہ ڈھونڈ لی جو ہم سب مل کر تلاش نہیں کر پائے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

اچانک میری آنکھیں کھل گئیں اور ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ مراد شاہ نے میری کلائی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا تھا اور مجھے گھسیٹتا ہوا درخت سے کچھ فاصلے پر بنی پکی قبر تک لے آیا وہاں پہنچ کر اس نے مجھے زمین پر زوردار دھکا دیا۔ میں نے بچنے کی بہت کوشش کی مگر سنبھل نہ سکی اور ذرا دور جا کر گری۔ میرا سر زمین پر پڑے پتھر سے زور سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کو دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہوگئی پھر سر پکڑے ڈولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے مڑ کر درخت کی طرف دیکھا۔ زرینہ ہکا بکا سی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے دوڑ کر میری طرف آنا چاہا مگر مراد نے اسے تھام لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ زرینہ کو لے کر میرے سامنے سے ہٹا تو ایک نیا چہرہ اس کے عقب سے ابھرا۔ وہ غالباً شوکی کا تیسرا ساتھی تھا۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے استہزائیہ انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مذاق اُڑانے والی بڑی جاندار مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''ہائے ہائے سارہ! تجھے تو چوٹ لگ گئی۔ اب کیا کرے گی تو......؟ تو، تو پھنس گئی رے۔'' وہ یک دم چہرے پر ہلکا سا ہاتھ رکھ کر بولا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی آواز بالکل پروین کی آواز تھی میں اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''کیا بات ہے رے تیری کریم! آج تیری ڈراموں کی نوٹنکی کام آگئی...... کمال کی نقل اتارتا ہے تو۔'' مراد شاہ بولا۔

''یہ تو اس کا شوق ہے باس۔'' اس بار اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی آواز مراد شاہ سے مشابہ تھی پھر وہ دوبارہ میری طرف مڑا اور پروین کے لہجے میں بولا۔

''اب تیری خیر اسی میں ہے کہ جو شاہ جی کہیں وہ کر، سمجھ گئی نا۔''

''وہ تو اس کو کرنا ہی ہے ورنہ ابھی اور اسی وقت یہیں اس کی قبر کھود کر دفنا دیں گے۔'' شوکی غرایا۔

''بلکہ شاید قبر کھودنے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ کئی کچی قبریں ہیں یہاں..... انہی میں ٹھونس دیں گے۔'' یہ شاید رفیق کی آواز تھی۔

''ذرا دیکھوں تو میں..... ہے کیا چیز تو آخر؟ بہت ہمت ہے تجھ میں؟ کسی بھی معاملے میں کود پڑتی ہے، کسی سے بھی ٹکرا جاتی ہے۔ اس بستی میں برسوں سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ مراد شاہ یا اماں کے معاملے میں دخل دے پائے..... ہے کون تو؟'' اس کی سخت نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ ایک لمحے کو میں لرز کر رہ گئی۔ ''کس نے بھیجا ہے تجھے؟ قادر خان کی بندی ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''یہ کون ہے؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میرے سوال پر مراد شاہ کا تھپڑ میرے چہرے پر پڑا۔

''سوال تو نہیں کرے گی۔ تیرا کام صرف جواب دینا ہے سمجھی۔''

میرا گال سنسنا سا گیا۔ میں گال پر ہاتھ رکھے اُسے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیسے.....؟ تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تو یہ سب کر گزرے گی اور پھر بچ بھی جائے گی؟ تو کوٹھڑی کو آگ لگا کر اماں کی جان لے لے گی اور پھر یہاں سے نکل جائے گی؟''

میرے کوئی جواب دینے سے قبل ہی اس کا ہاتھ پھر گھوما اور ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر پڑا۔ میں چیختی ہوئی زمین پر جا گری۔

''میں..... میں نے کچھ نہیں کیا۔'' میں بمشکل بول پا رہی تھی۔ میرے چہرے پر آگ سی لگی ہوئی تھی۔

''میں صرف زرینہ کو بچانے کے لیے وہاں گئی تھی۔ سیداں اسے مارنے والی تھی۔ میں اسے لے کر بھاگنا چاہتی تھی اس لیے میں نے کھوپڑی کے پیالے کو لالٹین پر مارا تاکہ اندھیرا ہو جائے۔ وہ لالٹین سیدھی اس کے سر پر گری اور پھر آگ لگ گئی۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔''

''اماں سیداں مر گئی.....؟ جل کر مر گئی اور تو کہتی ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا؟'' مراد نے اس بار میری کمر میں ٹھوکر ماری۔ اس ٹھوکر سے میرے پورے جسم میں درد کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ میرے حلق سے ناقابلِ فہم آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔

''تو خدائی فوج دار ہے؟ اس کی ماں لگتی ہے؟ جو اسے بچانے آئی تھی۔ اب..... اب تجھے کون بچائے گا؟ یہ بتا..... بتا؟'' وہ میری پسلیوں پر ٹھوکریں مارتا ہوا بولا۔

میں درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ٹھوکریں مار مار کر ہی مجھے مار ڈالے گا۔

''میرا اللہ.....'' تکلیف کی شدت کی وجہ سے لفظ میرے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ ''وہ بچائے گا مجھے..... تو کیا کر سکتا ہے۔ اگر اس کا حکم نہ ہوا تو کوئی بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

اگرچہ میں خاصی زخمی ہو چکی تھی۔ نظر بھی یہ آ رہا تھا کہ شاید میرا بچ پانا اب ممکن نہ ہو۔ مراد اور اس کے گرگے جرائم پیشہ افراد تھے، ان کے لیے کسی کو مارنا انوکھی بات نہیں تھی۔ میں تو ان کے سامنے کسی چیونٹی کی طرح تھی جسے وہ لمحہ بھر میں مسل سکتے تھے۔ مگر مایوسی کے اس لمحے میں اللہ پر یقین میری طاقت بن گیا۔ جس رب نے مجھے سیداں کی کالی طاقتوں سے محفوظ رکھا تھا، وہی ان بدمعاشوں سے بھی مجھے بچانے والا تھا۔ توکل کی آرام دہ اور پُرسکون چادر نے گویا میرے وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

''اچھا۔'' مراد مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں بے حد سفاکی تھی۔ ''یہ تو تُو نے ٹھیک کہا کہ میں تجھے ماروں گا نہیں۔'' وہ میرے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنی آنکھیں تک کھنچتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سر میں لگی چوٹ الگ چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہی تھی۔ میری تکلیف سے ڈبڈباتی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ اس کی جگہ اس کے چہرے پر عجیب سی درشتی چھا گئی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر امنڈی سی آئی تھیں۔ وہ مسلسل مجھے گھور رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نظریں میرے دماغ کے آر پار ہو رہی ہوں۔ میں چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب سے نظریں ہٹا نہیں پا رہی تھی۔ چند لمحے وہ مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

''تجھے اتنی آسانی سے مرنا بھی نہیں چاہیے۔ ناک میں دم کر دیا ہے تو نے ہمارا۔ میرے سب سے مضبوط سہارے کو اکھاڑ پھینکا ہے تو نے..... پھر بھی میں تجھے نہیں ماروں گا اور میں ماروں بھی کیوں؟ تو نے تو یوں بھی وہ دو قتل کر رکھے ہیں۔ وہی تیرے پھانسی پر لٹکنے اور عبرت کا نشان

بننے کے لیے کافی ہیں۔ اس سے قبل میں تیری ساری ہڈیاں تڑوا دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے اور تجھے پولیس کے حوالے کریں گے وہ جن کے لیے تو نے یہ سارا تماشا کیا ہے۔ پروین اور بستی والے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر چبا چبا کر بول رہا تھا۔

''دو...... دو قتل؟ میں نے کسی کو نہیں مارا۔'' میں نے سر کو جنبش دینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں دو دو قتل...... امجد اور اماں کا قتل...... امجد کی بیٹی کے اغوا کا جرم...... جادو کرنے کا جرم اور جب اماں نے روکنا چاہا تو تُو نے اس عظیم عورت کو آگ لگا دی۔ اب اس بستی میں اماں یاد رکھی جائے گی اور تجھے لوگ گالیاں دیں گے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

مگر اس کی باتوں نے میرے دماغ میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔ وہ پولیس انسپکٹر تو اسی دن مجھے نہایت مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کہانی کو حقیقت بنانے میں شاید ایک لمحہ بھی نہ لگتا۔ یوں بھی وہ مراد شاہ کے آدمیوں میں ہی شامل تھا۔

''مگر باس...... اسے بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ کیا اس کو زندہ چھوڑنا ٹھیک ہوگا؟'' شوکی نے پوچھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اسے اپنے چاقو کے استعمال نہ ہونے پر سخت مایوسی ہوئی تھی۔

''ہم اسے چھوڑ کہاں رہے ہیں شوکی۔ پکڑی یہ جائے گی رنگے ہاتھوں، الزام اس پر آئے گا۔ پہلے اسے خود کو بے گناہ ثابت کرنا ہوگا پھر ہم پر انگلی اٹھا پائے گی نا اور اسے بولنے دے گا کون؟ اور بولے گی تب بھی سنے گا کون؟ سمجھی؟''

اس نے آخری لفظ مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر نہایت اطمینان سے میرے سر کو بے رحمی سے زمین پر دے مارا۔

ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو، تکلیف کا ایٹم بم میرے سر میں پھٹا اور میرا وجود گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر سا گیا تھا۔ میں نے حیرت اور تکلیف سے مراد کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اور وہ سارا منظر میری نظروں کے سامنے سے غائب ہوتا چلا گیا۔ میری سماعت میں گونجنے والی آخری آواز اذان کی تھی جس نے میرے ذہن کو سکون سے بھر دیا پھر سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش آیا تو صبح کی روشنی اندھیرے کو شکست فاش دے کر اپنی حکمرانی کا اعلان کر چکی تھی۔

میں اسی قبرستان میں تھی۔ روشنی میں وہاں کی ویرانی اور اجاڑپن میں مزید اضافہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس جگہ پڑی تھی جہاں بے ہوش ہوئی تھی۔ گزشتہ رات کا خیال آیا تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی میرا ہاتھ بے اختیار میرے سر پر گیا جو کسی پھوڑے کے مانند دکھ رہا تھا۔ ماتھے سے ذرا اوپر لگنے والی چوٹ سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔ نہ جانے مجھے یہاں پڑے کتنا وقت گزر چکا تھا اور اس وقت نے زرینہ کو نہ جانے کہاں پہنچا دیا ہوگا؟ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ مراد اور اس کے گُرگے نہ جانے اسے کہاں لے گئے ہوں گے۔

سب سے اہم سوال یہ تھا کہ مجھے برباد کر دینے، مار ڈالنے، عبرت کا نشان بنا دینے اور دو قتل کرنے کے الزام میں پکڑوا دینے کے دعوؤں اور اعلانات کے بعد وہ آخر مجھے یہاں اس طرح کیوں چھوڑ گئے تھے؟ میرا خاتمہ ان کے لیے آسان تھا یا پھر پولیس کے حوالے کر دینا۔ پھر انہوں نے مجھے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ یہ سوال سڑک پر لگے سگنل کی سرخ بتی کے مانند بار بار میری سوچ کی گاڑی کو روک رہا تھا۔

گزرنے والی رات میری زندگی کی سب سے مشکل اور بھیانک رات تھی۔ سر میں لگی چوٹ اور جسم پر پڑی مراد شاہ کی ٹھوکروں نے مجھے توڑ پھوڑ سا دیا تھا۔ میں بمشکل اٹھ کر کھڑی ہوئی اور لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھی۔ ابھی میں چند قدم ہی چلی ہوں گی کہ حیرت کے ایک اور جھٹکے نے میرا استقبال کیا۔ مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر زرینہ ایک قبر کے اوپر اس طرح پڑی تھی کہ اس کے ہاتھ اور پیر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر اسی سرخ رنگ کے کپڑے کا لبادہ تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھ پیروں میں وہی مالائیں تھیں۔ میں چند لمحے خاموشی سے کھڑی تشویش بھری نظروں سے اسے گھورتی رہی۔ پہلے تو میں اس خیال سے ہی پریشان تھی کہ وہ میرے خلاف کوئی کارروائی کیے بغیر کیوں چلے گئے مگر اب زرینہ کی اس طرح یہاں موجودگی دوسرا سوال بن گئی تھی۔ زرینہ کو دیکھتے ہی مجھے اماں سیداں کا خیال آیا۔ میں نے پلٹ کر ذرا آگے بنی کوٹھڑی یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ اس کی باقیات کی طرف نظر کی، جلی ہوئی لکڑی شہتیروں اور ملبے کے اندر وہ وہیں دبی پڑی تھی۔ اس کے ساتھی اور جی حضوری میں کھڑے رہنے والے اس کی لاش کو اسی حالت میں چھوڑ گئے تھے کیونکہ ان

کے مفادات اسی میں چھپے ہوئے تھے، میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

ہر گزرتا دن مجھے بہت کچھ سکھا رہا تھا۔ زندگی کی جماعت میں یہ وہ سبق تھے جو صرف وقت ہی پڑھا سکتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک وسوسے نے کروٹ لی۔ کہیں زرینہ مر تو نہیں گئی؟ کل رات جو کچھ بیتا تھا اور جو کچھ ہم نے دیکھا تھا، وہ اپنی تمام تر مضبوط دلی اور بہادری کے میرے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ زرینہ تو پھر بھی ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ شاید اس کا دل اس سارے بوجھ کو برداشت ہی نہ کر پایا ہو۔ اس خیال نے مجھے بے حد بے چین کر دیا۔ میں تمام خیالات کو جھٹکتی تیزی سے اس کے قریب پہنچی۔ اسے سیدھا کر کے سب سے پہلے میں نے اس کی ناک کے آگے ہاتھ رکھا اور پھر اطمینان کی گہری سانس لی۔ وہ زندہ تھی۔ ٹھیک تھی اور بے ہوش تھی۔

''زرینہ......'' میں نے اسے ہلایا۔ جھنجوڑا مگر جواب میں وہ صرف کسمسا کر رہ گئی۔

وہ پچھلی رات والی مکمل اور انتہائی حد تک بے حس و حرکت کرنے والی بے ہوشی میں مبتلا نہیں تھی۔ اُس بے ہوشی میں تو اسے جسم پر پڑنے والے زخموں تک کی خبر نہیں ہو رہی تھی۔ جبکہ ابھی میرے جھنجوڑنے پر اس نے باقاعدہ حرکت کی تھی مگر اس کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔ جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی دوا کے زیرِ اثر ہو۔

مراد شاہ اپنے منصوبے کا سیٹ تیار کر کے گیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ مجھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اس کے حساب سے قدرے پہلے ہوش آ گیا تھا۔ اب میں یہ چاہ رہی تھی کہ میں کسی طرح زرینہ کو ہوش میں لے آؤں۔ اس سارے معاملے میں وجۂ فساد وہی بنی تھی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں نے پچھلی رات ان لوگوں کو قبرستان میں موجود حوض کی بات کرتے سنا تھا وہیں سے پانی لا کر شوکی وغیرہ نے کوٹھڑی کی آگ بجھائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پانی زرینہ کی بے ہوشی کا توڑ ثابت ہو گا مگر اس سے پہلے میں اس کی رسیاں کھولنا چاہتی تھی۔

اس کے ننھے ننھے ہاتھ پیروں کو موٹی سی رسّی سے باندھا گیا تھا جس سے عموماً مویشی باندھے جاتے ہیں۔ وہ رسی اس کی نازک جلد میں گھسی جا رہی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھوں کی رسی کھولنے کی کوشش کی۔ پہلی گرہ کھولنے میں ہی مجھے کئی منٹ لگ گئے۔ رسی کی گرہیں بھی زندگی کی اُلجھنوں کے مانند ہوتی ہیں۔ پہلی گرہ کھولنا ہی سب سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اگر بندہ اسے کھولنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ ابھی میں رسی کے بلوں کو اس کے ہاتھوں سے نکال ہی رہی تھی کہ اچانک قبرستان آوازوں سے بھر گیا۔

''ارے یہ تو واقعی موجود ہے یہاں۔'' ایک حیران آواز گونجی۔

''اور......اور زرینہ بھی ہے، وہ دیکھو اس قبر پر بندھی پڑی ہے۔'' ایک اور عورت پکاری۔

''کمال ہو گیا، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔'' یہ آپا شاہدہ کی آواز تھی۔ ''مراد شاہ کا خواب سچا ثابت ہوا۔''

''عمل ہے اس کے پاس بھی۔'' کوئی اور بولا۔

''آج کل کسی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ شکل دیکھو کتنی معصوم اور سیدھی سادی لگتی ہے اور اعمال دیکھو تو اس قدر شیطانی...... مجھے تو سچ پوچھو تو پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے مگر یہ کالے جادو کا چکر ہو گا یہ نہیں سوچا تھا۔''

''سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا مگر کیا کریں جو نظر آ رہا ہے اس پر تو یقین کرنا ہی پڑے گا۔''

میں ان آوازوں پر پلٹی تو حیرت سے ساکت سی ہو گئی۔ لگتا تھا کہ پوری کی پوری بستی ہی قبرستان میں امڈ آئی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی حتّٰی کہ بچے بھی ماؤں کے ساتھ جُڑے کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر سراسیمگی تھی۔ آنکھوں میں غصہ...... اور وہ سب کے سب مجھے حیرت، افسوس اور طیش کے عالم میں گھور رہے تھے۔

جو وہ سمجھ رہے تھے وہ حقیقت نہیں تھی مگر جو انہیں نظر آ رہا تھا وہ مجھے غلط ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھے صفائی کا موقع دینے کے ذرہ برابر بھی موڈ میں نہیں تھے۔ یوں بھی ہم ظاہر پرست زیادہ ہیں اور پھر نتائج پر پہنچنے میں کسی بلٹ ٹرین سے بھی تیز رفتار۔ یہاں تو جیسے پورا منظرنامہ ہی تیار تھا۔

میں موجود تھی اور زرینہ بھی...... اس کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے اور رسی میرے ہاتھ میں تھی۔ یوں ایک دونی دو اور دو دونی چار کی طرح سیدھا سادہ حساب پورا ہو گیا تھا۔ پوچھنے، بولنے اور بتانے کے لیے گویا کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتی، آوازوں کے اس

شور میں پروین میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
اس کی حالت بہت تباہ تھی۔ چہرہ سُتا ہوا تھا۔ ایک ہی رات میں آنکھوں کے حلقے دگنے ہو گئے تھے، اس کی آنکھیں خون کے مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے یقین نہ آنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔

''زرینہ...... میری زرینہ۔'' وہ مجھے دھکا دے کر زرینہ پر جھک آئی۔ اسے پلٹا کر پیار کرنے لگی۔ ''کیا حال کر دیا میری بچی کا؟'' اس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے رسی چھین لی۔ ''اسے اس طرح کیوں رکھا ہے؟ کیوں باندھا تھا میری بیٹی کو اس رسی سے؟'' وہ رسی کھولنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ روتی بھی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جذباتی کیفیت کی بنا پر بُری طرح لرز رہے تھے۔

''لاؤ میں تمہاری مدد کر دیتی ہوں۔ میں اسے کھولنے کی کوشش ہی کر رہی تھی۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خبردار...... خبردار میری بچی کے قریب بھی نہ آنا۔'' وہ میری طرف پلٹ کر غرائی۔ ''میں نے تمہیں بہن سمجھا تم سے پیار کیا۔ تم پر یقین کیا اور تم نے...... تم نے یہ کیا...... یہ؟'' وہ زرینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میری بیٹی کو اغوا کر لیا؟ تم اسی مقصد کے لیے میرے گھر میں گھسی تھیں نا؟ تم اس پر جادو کرنا چاہتی تھیں اسی لیے اسے اس قبرستان میں لائی تھیں۔ میں تجھے کیا سمجھی تھی اور کیا نکلی تو......؟''

''نہیں پروین ایسا کچھ نہیں...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے تو زرینہ کو بچانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ اگر کل رات میں یہاں نہ پہنچتی تو تم اسے کبھی دیکھ نہیں پاتیں۔ میں نے تم سے کیا وعدہ پورا کرنے کے لیے جو ہو سکا، وہ کیا۔ اور اس کے ساتھ کیا کیا ہوا اور مجھے کیا کیا کرنا پڑا یہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

''بکواس بند کر سارہ۔'' وہ بپھر کر بولی۔ ''اب جو تو نے ایک لفظ بھی بکا تو میں تیرا منہ نوچ لوں گی، میں تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''پروین ایک بار میری بات سن لو پھر جو چاہو کہہ لینا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں سمجھنا تجھ سے، بس اتنا بتا دے کہ تُو نے اسے کیا کیا ہے؟ یہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی؟ اسے کچھ ہو تو نہیں گیا؟''

''یہ صرف بے ہوش ہے اور میں نے اسے کچھ نہیں کیا۔ میں تو خود تھوڑی دیر پہلے تک بے ہوش پڑی تھی مگر شاید تمہیں مجھ پر ذرہ بھر بھی اعتماد نہیں رہا پھر بھی تمہیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری بیٹی کا اصل دشمن کون ہے؟ سیداں...... وہ تھی تمہاری بیٹی کی دشمن...... اس نے ہی اسے اغوا کیا تھا۔ وہ کالا جادو جانتی تھی اور زرینہ پر جادو کرنا چاہتی تھی۔ اس کے مطابق یہ چاند کی پہلی تاریخ کو ستاروں کے کسی خاص سنگم پر پیدا ہوئی ہے، میری وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔''

''اماں سیداں جیسی بھی ہے، برسوں سے اسی بستی میں رہ رہی ہے۔ آج تک تو میری زرینہ کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا پر جب سے تو آئی ہے میرے آنگن میں بربادی آ گئی ہے اور اب تو اپنے گناہ کا بوجھ اس کے سر پر ڈالنا چاہتی ہے۔''

''پروین میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' میں مشکل سے بولی۔

''تو اور تیرا سچ...... اب تو یہ بھی کہے گی کہ مراد شاہ جی بھی اس میں شامل ہیں۔''
''ہاں یہ سچ ہے۔''

''جو تیری پول کھولے تو اسی کو گناہ گار بنا دے، اچھا ہے یہ۔'' وہ سر جھٹک کر بولی اور زرینہ کو گود میں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں جاہل ضرور ہوں سارہ بی بی، پر پاگل نہیں ہوں...... اور تجھے تیرے گناہوں کی سزا ضرور ملے گی۔''

میں بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ میرے لیے یہ سارا جال مراد شاہ نے بُنا تھا۔ میں جانتی تھی وہ مجھے عبرت کا نشان بنانے کے لیے ان ہی لوگوں کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً اس کو جس کی وجہ سے میں اس سارے چکر میں پھنسی تھی اور جس کی وجہ سے میں نے ان دونوں کے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔

وہ میری وجہ سے ناکام ہوئے تھے اور سیداں کو جان سے جانا پڑا تھا، اب وہ پروین اور زرینہ کے ذریعے ہی میرا صفایا کر رہا تھا۔ اس طرح جو کچھ اب تک ہوا تھا، اس کا ملبا میرے سر پر آ گرتا۔ میں نہ صرف پروین کی نظر سے گر جاتی بلکہ مجھے قرار واقعی سزا دلوانے کی آرزو بھی پوری ہو جاتی۔

''اس سے یہ تو پوچھ پروین کہ اماں سیداں کہاں ہے؟'' مراد شاہ کی آواز پر ہم دونوں نے اسے ایک ساتھ

پلٹ کر دیکھا تھا۔

''اماں گھر پر ہوگی۔'' پروین بولی۔

''نہیں ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں، وہ رات سے گھر پر نہیں ہے اور رات گئے یہ اس کے گھر گئی تھی۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ اماں اس کو زرینہ پر جادو کرنے سے روکتے روکتے زمین پر گر گئی ہے اور وہ جگہ یہی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس نے اماں کو کچھ کر نہ دیا ہو۔'' وہ ملامت سے بولا۔

''کس قدر جھوٹ بولو گے مراد شاہ اور کب تک؟'' میں اسے گھورتے ہوئے بولی۔ مجھے اس سے ذرہ برابر بھی خوف نہیں آرہا تھا بلکہ اس کی ڈھٹائی اور اداکاری پر غصہ آرہا تھا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اماں سیداں کیا تھی۔ وہ ایک جادوگرنی تھی، کالے جادو کی ماہر۔ زرینہ کو اس نے ہی اغوا کیا تھا اور تم اس سب میں اس کے خاص مددگار تھے۔ یہی سچ ہے، وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی اور بچو گے تم بھی نہیں۔''

''دیکھا تم لوگوں نے؟ اس نے ہی اماں کو کچھ کیا ہے۔ کہاں ہے اماں...... جواب دے......'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر موڑتا ہوا بولا۔ ''سب جھوٹے ہیں اور سچی صرف تو ہے...... تو جسے یہاں آئے دو اور دو چار دن ہوئے ہیں۔ تیرے آتے ہی یہاں ایک خون ہوگیا۔ ایک اغوا، اماں سیداں غائب ہے اور یہ کالے جادو کا چکر...... نہ جانے تو اور کیا کیا تماشا دکھانے والی ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ میں تجھے یہیں زندہ دفن کر دوں مگر کیا کروں...... اپنی بستی کی ذمے داری ہے مجھ پر اس لیے قانون ہاتھ میں نہیں لے سکتا...... بول کہاں ہے اماں؟''

''تجھے معلوم ہے۔'' میں درد سے دہری ہوتے ہوئے بولی۔ ''تو، تو اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔''

''بکواس بند کر۔'' مراد شاہ میرے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دے کر بولا۔ میرا بازو ویسے بھی جھلسا ہوا تھا اس جھٹکے نے کندھے سے کہنی تک آگ سی بھر دی تھی۔ میرے ہونٹوں سے کراہ چیخ بن کر نکلی تھی۔ ''شوکی، کریم تم لوگ اماں کو ڈھونڈو...... میں اس کو دیکھتا ہوں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس کے حساب سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔ اس کے تحریر کردہ اسکرپٹ کے عین مطابق...... ابھی ذرا دیر میں اماں کی لاش برآمد ہو جاتی اور اس کے بعد مجھے قانون کے حوالے کرنا اس کا ''فرض'' بن جاتا۔

وہاں موجود لوگ اس ساری صورتِ حال پر عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سیداں کے پاس پراسرار طاقتیں موجود تھیں یہ وہ مانتے تھے۔ اس کی بددعا خالی نہیں جاتی تھی۔ وہ شخص کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ لوگ اس سے ڈرتے ضرور تھے مگر اس سے محبت کرنے اور اس کی عزت کرنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی اکڑ اور غرور لوگوں کو اس سے دور ہی رکھتے تھے، سب جانتے تھے کہ وہ کچھ نہ کچھ غلط ہے مگر اسے کہنے کی اور اس سے سوال کرنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔

ایسی ہی کچھ صورتِ حال مراد شاہ کی بھی تھی۔ وہ علاقے کا مکھیا مانا جاتا تھا۔ اس کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوتا۔ بستی کے بہت سے لوگ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس کے ملازم تھے اور جو نہیں تھے وہ بھی اس سے بہت ڈرتے تھے۔ علاقے کے سب الٹے دھندوں میں اس کا ہاتھ تھا، یہ سب جانتے تھے مگر اس کی دہشت اور پولیس سے اس کی ملی بھگت کی وجہ سے کوئی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

''میں نے زرینہ کو اغوا نہیں کیا۔ میں نے اسے بچایا ہے اور یہی سچ ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ تم مجھے کیوں ٹھیک ٹھاک چھوڑ گئے تھے۔'' تکلیف کی شدت سے میری آواز پھٹ رہی تھی۔

''بہت ڈھیٹ ہے یہ...... عادی مجرم لگتی ہے۔'' وہ مجھے دھکا دے کر گراتا ہوا بولا۔ ''اب اگر ذرا سی بھی بکواس کی تو پھر میں ان لوگوں کو نہیں روک سکوں گا، ٹکڑے ہو جائیں گے تیرے۔''

''شاہ جی...... شاہ جی غضب ہو گیا۔'' شوکی بوتل کے جن کی طرح اچانک نمودار ہوا۔ ''قبرستان کی کوٹھڑی جلی پڑی ہے اور وہاں ایک لاش موجود ہے۔''

''لاش۔'' اس ایک لفظ نے سب کو تھوڑا بہت سراسیمہ کر دیا تھا۔

''ہاں لاش...... بُری طرح جلی ہوئی لاش...... پہچان میں نہیں آرہی اب پولیس ٹیسٹ سے ہی پتا چلے گا کہ کون ہے وہ...... پر لگتی عورت کی لاش ہے۔'' وہ نہایت تابع داری سے بتا رہا تھا۔

''پولیس تو جب آئے گی تب آئے گی۔ میں اس سے

پوچھتا ہوں آخر یہ یہیں تھی..... بول کون تھا وہاں اور کوٹھڑی کو آگ کیسے لگی..... کیا کیا تھا تو نے.....؟'' وہ مجھے جھنجوڑ کر بولا۔

''تُو..... تُو جانتا ہے مراد شاہ۔'' میں لرزتے ہوئے بولی۔ ''کوٹھڑی میں آگ لگی تھی۔ اماں سیداں اس میں جل گئی مگر اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ میں تو صرف زرینہ کو لے کر بھاگی تھی وہاں سے..... آگ لالٹین گرنے کی وجہ سے لگی تھی۔'' میں بری طرح ہانپ رہی تھی۔

''تو مار ڈالا تُو نے اس بھلی لوک کو، جلا کے مار ڈالا صرف اس لیے کہ وہ اس بچی کو بچانا چاہتی تھی؟'' مراد شاہ شاندار اداکاری کر رہا تھا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی تجھے اماں کے خون پر معاف نہیں کرے گا۔ مجھے تو پہلے ہی تجھ پر شک تھا مگر میں چپ رہا اور اس غلطی کا کتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا، بستی اماں جیسی ہستی سے محروم ہوگئی۔ مجھے یقین ہے کہ امجد کا خون بھی اس نے ہی کیا ہے۔ کیوں تو ہی ہے نا اس کی بھی قاتل؟ پولیس کو تو پہلے ہی تجھ پر شک تھا۔'' وہ مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

''اللہ سے ڈر مراد شاہ۔ وہ رسّی دراز کرتا ہے مگر جب کھینچتا ہے تو پھر ہر گناہ کا حساب دینا پڑتا ہے۔ امجد کا قاتل تو خود ہے۔'' میں اپنی کانپتی ہوئی انگلی اس کی طرف اٹھاتے ہوئے بولی۔

''کیا بک رہی ہے تُو.....؟'' میرے اس انکشاف پر مراد شاہ بھڑک کر بولا۔ ''اب تُو مجھ پر جھوٹے الزام بھی لگائے گی۔'' شاید یہ بات اس کے علم میں بھی نہیں تھی کہ میں یہ بھی جانتی ہوں۔

''یہ الزام نہیں ہے۔'' میں حتیٰ الامکان زور سے بولی۔ ''مجھے خود سیداں نے بتایا تھا۔ امجد اس روز پروین سے جھگڑنے کے بعد اس کے پاس ہی گیا تھا جہاں زرینہ کے اغوا اور قربانی کی بات ہو رہی تھی۔ امجد نے وہ سب سن لیا اور انہیں دھمکیاں بھی دی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کو ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا اسی لیے اسے مار دیا گیا اور اُسے مارا ہے اِس نے..... مراد شاہ نے۔'' پھر میں نے پروین کی طرف دیکھا۔ ''پروین وہ جیسا بھی تھا، وہ تم سے اور زرینہ سے پیار کرتا تھا۔'' میرے ان الفاظ پر پروین نے رونا شروع کر دیا تھا۔

''تو جتنے چاہے ڈرامے کر لے، اب بچ نہیں سکتی اور تیرا منہ تو میں ابھی بند کرتا ہوں۔'' مراد شاہ نے اچانک قمیص کی جیب سے پستول نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول آتے ہی وہاں ہلکی پھلکی بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ عورتیں سمٹ سمٹا کر تھوڑے فاصلے پر چلی گئی تھیں۔ پروین نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے زرینہ کو اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب گیدڑ بھبکیاں تھیں۔ وہ مجھے خود مارنے کے بجائے پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ یہ پستول صرف میری زبان بندی کے لیے تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ لوگ میری باتیں غور سے سن رہے تھے۔

اپنے انجام کے حوالے سے مجھے یوں بھی کوئی خاص خوش فہمی نہیں رہی تھی جس بُری طرح میں اس چکر میں پھنسی تھی، اس کے نتیجے میں پولیس، تھانہ، جیل اور پھر شاید پھانسی ہی میرا مقدر تھی۔ میں عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ حالات مجھے مایوسی کی دلدل میں دھکیل رہے تھے جبکہ میرا یقین اور ایمان امید کی شمعیں جلا رہا تھا۔

پھر اچانک ایک انہونی ہوگئی۔

مراد شاہ پستول لے کر میری طرف بڑھا ہی تھا کہ قبرستان ٹٹ ٹٹ کی تیز رفتار بوچھاڑ نما آوازوں سے گونج اٹھا..... آوازوں کے ساتھ ساتھ مختلف جگہوں سے زمین سے مٹی اُڑنے لگی تھی۔ لوگ تیزی سے اپنی جان بچا کر بھاگنا شروع ہو گئے تھے۔ پہلی بوچھاڑ کے بعد ہی ایک زوردار آواز گونجی اور مراد شاہ کے ہاتھ سے پستول اچھل کر زمین پر دور جا گرا۔ وہ خود چنگھاڑتا ہوا پیچھے ہٹا تھا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے اپنے سیدھے ہاتھ کو پکڑ رکھا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

''شاہ جی کو گولی لگی ہے۔'' شوکی چیخا اس کے چلّاتے ہی آٹھ دس لوگ مراد شاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے اور وہ چاروں جانب ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔

میں ہکا بکا سی زمین پر پڑی ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ خوف سے میری بری حالت تھی۔ کوئی بھی اُڑتی ہوئی گولی میرا خاتمہ کر سکتی تھی۔ وہاں قبروں کے علاوہ ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جس کی آڑ لی جا سکتی۔ برگد کا وہ مہربان درخت جس نے مجھے رات میں پناہ دی تھی، یہاں سے قدرے فاصلے پر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں گنتی کے چند افراد رہ گئے تھے۔ مراد شاہ کے گرگے اسے اپنے گھیرے میں لیے وہاں سے

نکل بھاگنے کے چکر میں تھے۔
دو لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک بار پھر گولیاں چلنی شروع ہوگئی تھیں۔ فائرنگ خاصی شدید اور کئی اطراف سے ہو رہی تھی۔ مراد شاہ کے ساتھی بھی مسلسل گولیاں چلا رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ حملہ آور جانتے تھے کہ انہیں کہاں اور کس طرح گولیاں چلانی ہیں جبکہ مراد شاہ وغیرہ کو یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان کے مقابل اصل میں ہیں کس طرف..... وہ کھلے میدان میں ہونے کی وجہ سے آسان ہدف بنے ہوئے تھے۔ اگر دشمن انہیں مارنا چاہتا تو اسے ذرا بھی مشکل نہ ہوتی اور وہ ایک ہی ہلّے میں ان سب کو ڈھیر کر سکتا تھا مگر حملہ آوروں کا نشانہ اور مقصد کچھ اور ہی لگ رہا تھا۔

گولیاں، ہانکے کے انداز میں چلائی جا رہی تھیں۔ گاؤں میں شکار کے لیے باقاعدہ ہانکا لگایا جاتا تھا۔ وہاں ہانکے میں گولیاں نہیں چلتی تھیں۔ بلکہ ڈھول، کنستر اور ڈبے بجا کر جانور کو اس طرف بھاگنے پر مجبور کیا جاتا تھا جہاں وہ آسانی سے شکار ہو سکے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی منظر تھا۔ اب گولیاں قبرستان کے عقبی حصے سے برسائی جا رہی تھیں۔ مراد شاہ اور اس کے آدمی ہوا میں گولیاں چلاتے ہوئے باہر کی جانب بھاگ رہے تھے۔

انہیں اس وقت نہ میں یاد رہی تھی اور نہ ہی کوٹھری کے ملبے میں پڑی سیداں کی لاش..... چند لمحوں میں قبرستان میں، میں اکیلی رہ گئی۔ میں اسی طرح زمین پر دم سادھے پڑی تھی اٹھ کر بیٹھنے یا کھڑے ہونے میں کہیں سے گولی لگنے کا ڈر تھا اور یہی خوف مجھے چپ چاپ پڑے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''کھڑی ہو جاؤ بی بی۔'' ایک گہری اور بھاری آواز نے مجھے بے اختیار اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تعداد میں دو تھے۔ ان کے قد چھ فٹ سے زیادہ تھے اور چہرے سرخ و سفید..... دونوں نے ملیشیا کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں جدید طرز کی بڑی بندوقیں تھیں۔ غالباً ان بندوقوں سے ہی بوچھاڑ والی گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔

''م..... میں.....'' میں یک دم انہیں اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر ہکلا گئی۔ وہ لوگ یقیناً برگد کی طرف سے آئے تھے۔
''ہاں تم..... ام تم کو لینے آیا ہے۔ وہ لوگ بھی بھاگ گیا ہے مگر پلٹ کر آئے گا اور فائرنگ کا آواز سن کر پولیس بھی ادھر آئے گا۔ تم ٹیم کھوٹا مت کرو..... فوراً کھڑا ہو جاؤ۔''

مجھے فوراً اٹھنے میں بھی کئی منٹ لگ گئے تھے۔ رات کی چوٹوں کی تکلیف اپنی جگہ شدت سے موجود تھی جبکہ مراد شاہ کے تھپڑ نے میرا دایاں ہونٹ پھاڑ دیا تھا۔ میں ہاتھ کی پشت سے خون پونچھتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔
''آپ..... آپ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
''سوال نہیں..... ابی تم پہنچ جائے گی تو تم کو اُدر سارے سوالات کے جواب مل جائے گا۔'' ان میں سے ایک غرا کر بولا۔

وہ مجھے ساتھ لے کر تیزی سے قبرستان کی عقبی جانب نکلے تھے وہاں ایک بند جیپ ہماری منتظر تھی۔ انہوں نے مجھے جیپ میں چڑھایا اور خود میرے اردگرد بیٹھ گئے۔ جیپ ہمارے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ اس کی آگے والی سیٹ پر تین آدمی پہلے ہی سے موجود تھے۔

جیپ تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میرا دل اپنے رب کے حضور خاموشی سے سجدے میں پڑا تھا۔ میں ایک بار پھر یقینی نظر آنے والی موت کے چنگل سے نکل آئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی مجھے خود نہیں پتا تھا کہ یہ کیا اور کیسے ہوا تھا مگر اگر یہ شر بھی تھا تو میرے لیے اس میں زندگی بچانے والی دواؤں جیسا خیر موجود تھا۔

مجھے کچھ ہی دیر میں ایک بڑے سے مکان میں پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ تین منزلہ قلعہ نما مکان تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا پہلا مکان دیکھا تھا جس کا دروازہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے پورا ٹرک گزر سکتا تھا اور جب اسے بند کیا جاتا تو وہ چھت تک جا لگتا۔ جس کے بعد اندر سے کسی چیز کا باہر نکلنا اور باہر سے اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔ نچلی منزل پر گودام تھا اور ایک طرف سے ہم اوپر جانے کے لیے سیڑھی کی طرف گئے تھے۔ وہیں سے سیڑھیاں نیچے بھی جا رہی تھیں۔ جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس مکان کے نیچے تہ خانہ بھی موجود ہے۔

مجھے پہلی منزل پر ایک کمرے میں لے جایا گیا تھا، اوپر چڑھتے ہی ایک تنگ سی جگہ میں دو تین نوجوان کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں بڑی بندوقیں تھیں۔ ایسی بندوقیں میں نے صرف فلموں میں ہی دیکھی تھیں۔ ان کا کام غالباً وہاں کی نگرانی اور ہر آنے جانے والے کو چیک کرنا تھا۔ ان

کے پاس سے گزر کر ہم ایک لمبی گلی جیسی جگہ میں داخل ہوئے تھے جہاں دونوں طرف کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔

''تم اِدر ہی رکو۔'' میرے ساتھ آنے والوں نے ایک دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہو گئے اور ان کے جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ میں زخمی اور پریشان حال تو تھی ہی مگر یہاں کے ماحول نے مجھے سخت ہراساں کر دیا تھا۔ نہ جانے آگے کیا سامنے آنے والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت بیرونی حصے سے اندر آتی نظر آئی۔ وہ کافی سے زیادہ بھاری بھرکم تھی مگر اس کے باوجود چال سے خاصی چست لگ رہی تھی۔ ڈھیلی ڈھالی پٹھانی قمیص، شلوار اور بڑی سی چادر میں وہ کسی دیو کا پاکٹ سائز ایڈیشن محسوس ہو رہی تھی۔

''آؤ...... تم امارے ساتھ آؤ۔'' وہ میرے قریب آ کر بولی۔

''مگر...... مجھے تو وہ لوگ یہاں کھڑے رہنے کو بول گئے ہیں۔'' میں گھبرا کر بولی۔

''ہاں...... علم ہے مگر ہم کو حکم ملا ہے کہ تم کو کمرے میں لے جائے۔ ابی تم زخمی ہے خون ودون بہہ رہا ہے تو تھوڑا تم کو ٹھیک کرے گا۔ آجاؤ۔'' وہ اتنا کہہ کر آگے کی طرف چل پڑی۔ میرے پاس اس کے پیچھے چلنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لمبی سی گلی نما جگہ میں ہی چار پانچ دروازے چھوڑ کر ایک دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس کو رکتے دیکھ کر گلی کے آخری حصے میں کھڑا بندوق بردار ہمارے پاس آ پہنچا اور اس نے دروازے میں چابی گھما کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں قدرے اندھیرا تھا۔ سفید بلب جلاتے ہی وہاں دن ہو گیا۔ یہ اچھا خاصا کھلا کمرا تھا جس میں ایک بستر، الماری، میز، کرسی وغیرہ سب کچھ ہی موجود تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کمرے میں ایک دروازے کے سوا نہ کوئی کھڑکی تھی نہ ہی روشن دان۔

میرے ساتھ آنے والی عورت نے میرے زخم صاف کر کے مجھے دوائیں وغیرہ لگا دی تھیں۔

''امارا نام حلیمہ بی بی ہے...... اماری ڈیوٹی ہے تمہارے ساتھ۔'' وہ اکھڑ انداز میں بولی۔ ''ام باہر ہی رہے گا۔ تم تھوڑا دیر آرام کر لو۔ کچھ چاہیے ہو یا کوئی ضرورت ہو تو دروازہ کھٹکھٹا دینا ام آجائے گی۔''

وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ میں سر ہلا کر خاموشی سے بس اسے دیکھتی رہی۔ یہ تو میں سمجھ ہی گئی تھی کہ ان میں سے کسی سے سوال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی نکالا اور ایک گھونٹ میں ختم کر ڈالا پھر میں بستر پر بیٹھ گئی۔

اس سے قبل کہ میں کچھ سوچ بھی پاتی، دروازہ دوبارہ کھلا اور حلیمہ اندر داخل ہوئی۔ ''خان جی آرہے ہیں۔'' وہ اتنا ہی بول پائی تھی کہ دروازہ پھر کھلا اور ایک بارعب شخص اندر آگیا۔

وہ مجھے یہاں لانے والوں کی طرح ہی لمبا اور سرخ و سفید تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی درشتی تھی جو سامنے والے کو سہانے کے لیے کافی تھی۔ مزید کمی زخم کے ایک لمبے سے پرانے نشان نے پوری کر دی تھی جو اس کی گوری رنگت پر بہت نمایاں تھا اور اس کے چہرے کو دو حصوں میں بانٹ رہا تھا۔

حلیمہ نے اسے دیکھ کر سر جھکا دیا جبکہ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا اور خود کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے غیر محسوس اشارے پر حلیمہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

''میرا نام قادر خان ہے شاید تم نے سنا ہو۔'' وہ بھاری آواز میں بولا۔

تو یہ قادر خان تھا۔ میں نے اس کا نام پروین سے سنا تھا۔ مراد شاہ اور بستی کے حوالے سے بتاتے ہوئے اس نے اس کا ذکر کیا تھا اس کے مطابق قادر خان اپنی برادری کا سردار تھا اور آدھی بستی پر اس کی حکمرانی تھی۔ اس کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا۔ اس سے ہٹ کر کئی اور دھندے بھی تھے۔ علاقے کی حاکمیت کے حوالے سے اسے ہی مراد شاہ کا مدمقابل سمجھا جاتا تھا۔ اکثر ان کے بندوں میں ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا نام دوسری بار میں نے مراد شاہ کے منہ سے سنا تھا۔

''جی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا جس پر وہ مسکرا دیا۔

''دیکھو لڑکی! میں صرف سچ سننا پسند کرتا ہوں۔ میں نے تمہاری جان بچائی ہے اور آگے بھی اس مراد شاہ سے تمہیں بچاؤں گا مگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا یا دھوکا دیا تو میں تمہارا قصہ تمام کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' وہ

سفا کی سے بولا۔

''تم کون ہو؟ یہاں کیسے اور کیوں آئی ہو؟ مراد شاہ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟ وہ تمہیں کیوں ختم کرنا چاہتا ہے اور اس قبرستان میں کیا ہوا ہے؟''

''میں تو مراد شاہ کو جانتی بھی نہیں ہوں۔ یہ سارا چکر زرینہ کے اغوا سے شروع ہوا۔'' میں نے ہرممکن اختصار کے ساتھ ان چند دنوں میں بیتنے والے ہر اہم واقعے کی رُوداد اس کی گوش گزار کر دی۔

''تو تمہارا مطلب ہے کہ سیداں کالے جادو کی ماہر تھی اور اب وہ جل کر مر چکی ہے اور مراد، امجد کا قاتل ہے؟'' اس کی آنکھیں گہری سوچ میں گم تھیں۔

''جی...... یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ وہ اس معصوم بچی کو مارنا چاہتی تھی اور مراد شاہ جانتا ہے کہ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئی ہوں اس لیے وہ میرا خاتمہ چاہتا ہے۔''

''دیکھو لڑکی! میں سیدھی بات کرتا ہوں۔ نہ مجھے اس زرینہ سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی تم سے...... میں اس مراد شاہ کا پتّا صاف کرنا چاہتا ہوں۔ بہت حساب صاف کرنا ہے اس کے ساتھ...... دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے اور تم تو ان کے خلاف بہت کچھ جانتی ہو اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔ ایک تو تم اس کے خلاف مددگار ثابت ہوسکتی ہو اور دوسرے وہ اس شکست سے تلملا رہا ہوگا...... پھر تم میں کچھ خاص بات ہے جو تم اس سے اس طرح ٹکرا گئیں وہ بھی ایک اجنبی لڑکی کے لیے...... میں نے نالے سے زرینہ کو بچانے والا قصہ بھی سن رکھا تھا۔ میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ یہ شیرنی ہے کون؟ ایسی بہادری آج کل مردوں میں بھی کم ہی نظر آتی ہے۔ پسند آئی تمہاری ہمت مجھے اور تم دیکھ لو گی کہ قادر خان بہادروں کی کتنی قدر کرتا ہے۔'' وہ مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور اگر بہادر تم جیسا خوب صورت ہو تو پھر بات ہی کیا ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔

''جی۔'' میں اس کے انداز پر بوکھلا گئی۔ لگ رہا تھا کہ میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی تھی مگر فی الحال میرا پہلا مسئلہ جان بچانا تھا۔

''ہو تو تم فلمی حسیناؤں جیسی حسین مگر حلیہ بہت خراب ہو رہا ہے تمہارا۔ تمہارے پاس تو دوسرے کپڑے بھی نہیں ہوں گے؟ حلیمہ...... اس نے باہر موجود عورت کو زور سے آواز دی۔ وہ بھی بوتل کے جن کے مانند فوراً ہی حاضر ہو گئی تھی۔

''جی خان جی۔'' جسامت کے مقابلے میں اس کی آواز بہت باریک تھی۔

''اب یہ قادر خان کی مہمان ہے۔ اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہماری ذمّے داری ہے۔ اس کے لیے کپڑوں کا بندوبست کرو اور جو مانگے وہ دو۔ شکایت کا کوئی موقع نہیں ملنا چاہیے۔''

''بالکل خان جی...... جو حکم۔''

قادر خان میری جانب مڑا۔ اس کی نگاہیں مجھے اپنے وجود پر سرسراتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ''اب میں چلتا ہوں، تم سے شام کو ملاقات ہوگی۔''

اس کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی مجھے حلیمہ نے ایک نیا جوڑا لا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کھانا بھی لائی تھی۔ کھانا سامنے دیکھ کر مجھے اپنی بھوک کی شدت کا اندازہ ہوا۔ میں نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑی۔

پیٹ میں غذا پہنچی تو آنکھوں میں نیند بھی چھانے لگی۔ کمرے میں آرام دہ بستر موجود تھا۔ حلیمہ کھانا وغیرہ دے کر باہر جا چکی تھی۔ نیند مجھے اپنی آغوش میں لینے کو بے تاب تھی مگر میں سونے سے پہلے کچھ سوچنا اور اس سے بھی قبل انسان بننا چاہتی تھی۔

میری حالت اتنی تباہ تھی کہ مجھے خود اپنے آپ سے اُلجھن ہو رہی تھی۔ پہلے رات کو درخت کی کھوہ میں چھپے رہنے اور پھر زمین پر بے ہوش پڑے رہنے سے مٹی اور دھول میرے ہم رنگ ہو گئے تھے اس کے بعد صبح مراد شاہ نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ سونے سے پہلے اگر مجھے نہانے کا موقع مل جاتا تو شاید میں سکون سے سو پاتی۔

یہی سوچ کر میں نے دروازہ کھولنا چاہا مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پر موجود ہینڈل کو گھما کر دوبارہ اسے کھولنے کی کوشش کی مگر اسے کھول نہیں پائی۔ مجھے اس کی تھوڑی بہت توقع پہلے سے ہی تھی۔

قادر خان نے میری جان بچائی تھی مگر اس میں اُس کے اپنے مقاصد اور مفادات تھے اور ایسے لوگ آسانی سے کسی پر بھروسا نہیں کیا کرتے۔ میں اس کے لیے مراد شاہ کو برباد کر دینے کی چال کا ایک مہرہ تھی اور ایک طرح سے اس کی قیدی بھی...... میں نے ٹھنڈی سانس لی اور اس بار

دروازے کو زور سے بجایا۔ ایک لمحے میں دروازہ کھل گیا۔
''کیا چاہیے؟'' حلیمہ میرے سامنے کھڑی تھی۔
''میں منہ ہاتھ دھونا چاہتی ہوں اور ہو سکے تو نہانا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''کیا یہ ہو سکتا ہے؟ اس مٹی اور گندگی کی وجہ سے مجھ سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا ہے۔''
''اچھا...!'' وہ اچھا کو کھینچتے ہوئے بولی جیسے موجودہ صورتِ حال میں میری اس فرمائش نے اسے حیران کر دیا ہو۔ وہ خود جمعے کے جمعے نہانے والے اصول پر کاربند نظر آ رہی تھی۔
''ٹھیک ہے۔ میں لے کر چلتی ہوں لیکن کوئی چالاکی مت کرنا۔''
''چالاکی؟'' میں نے معصومیت سے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیسی چالاکی؟''
''یہاں سے بھاگنے کی کوشش...... اور کیا؟ مگر یاد رکھنا یہاں سے نکل بھاگنا ناممکن ہے اور نیچے بندوں کو ایسی صورتِ حال میں فوراً گولی مارنے کا حکم ہے۔'' وہ چمک کر بولی۔
''میں ایسا کیوں کروں گی؟ آخر یہاں سے بھاگ کر میں جاؤں گی بھی کہاں؟ باہر مراد شاہ میری جان کا دشمن ہو رہا ہے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''مجھے تو قادر خان نے پناہ دے کر مجھ پر احسان کیا ہے ورنہ شاید میں اب تک زندہ بھی نہ ہوتی۔''
میری بات سن کر اس نے اطمینان سے سر ہلایا جیسے یہی سننا چاہتی ہو۔
''ہاں...... یہی میں کہہ رہی ہوں۔ یہ یاد رکھنا کہ قادر خان جی مراد شاہ سے زیادہ خطرناک ہیں۔'' وہ بھی اس بار دھیرے سے بولی۔ ''وہ دھوکا دینے والوں کو نہیں بخشتا، سمجھ گئی نا؟''
''جی۔'' میں مختصر جواب پر اکتفا کرتے ہوئے کپڑوں کا جوڑا ہاتھ میں اٹھائے کھڑی ہو گئی۔
اگرچہ یہ قلعہ نما مکان پروین اور اس بستی کے دوسرے گھروں کے مقابلے میں محل سے کم نہیں تھا مگر نہانے کا انتظام یہاں بھی کمرے سے باہر ہی تھا۔ پروین نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں بڑے بنگلوں میں سونے والے ہر کمرے کا الگ غسل خانہ ہوتا ہے نہانے کے لیے کمرے سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی مجھے اپنے ساتھ بنگلے پر کام کے لیے لے کر جائے گی مگر پھر یہ چکر چل پڑا اور اب میں اس کے گھر سے یہاں قادر خان کے ڈیرے پر پہنچ گئی تھی۔
میں نہا دھو کر واپس آئی تو خود کو بہت تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ پیٹ کا درد کافی کم ہو چکا تھا چہرے پر البتہ ہلکی سی سوزش باقی تھی۔ اس معاملے میں مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص کرم تھا۔ بچپن سے ہی مجھے لگنے والی چوٹیں بہت جلد بھر جایا کرتی تھیں۔ ایک بار تو اماں نے پریشان ہو کر بڑے حکیم صاحب سے بات بھی کی تھی مگر انہوں نے اسے اللہ کی نعمت قرار دے کر ان کی فکر ختم کر دی تھی۔ ان کے مطابق میرے جسم میں قوتِ مدافعت بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے بیماریاں کم کم ہی میرے قریب پھٹک پاتی تھیں۔ مجھے خود یاد نہیں تھا کہ آخری بار مجھے بخار بھی کب ہوا تھا۔
یوں بھی میں عام لڑکیوں اور خود اپنی بہنوں کی طرح کبھی چھوئی موئی نہیں رہی تھی۔ میرا ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ میری سہیلیاں خود مجھ سے ڈرتی تھیں۔ بچپن میں آپس کی لڑائیوں میں انہیں ایک دوسرے سے اتنی چوٹ نہیں لگتی تھی جتنی میرے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش میں لگ جایا کرتی تھیں۔
ایک بار مذاق مذاق میں میرا ہاتھ اکبر کے کان پر پڑ گیا تھا۔ کئی دنوں تک اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجتی رہی تھیں۔ وہ اکثر مجھے ''پہلوان'' اور ''غنڈی خالہ'' کہہ کر چھیڑا کرتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی بیک وقت میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اکبر تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا ہوگا کہ میں واقعی سچ مچ کے غنڈوں اور جرائم پیشہ لوگوں میں اس طرح پھنس سکتی ہوں۔ زندگی میرے لیے ہر قدم پر ایک نئی جنگ بنتی جا رہی تھی اور مجھے چاہتے یا نہ چاہتے اس جنگ کو لڑنا پڑ رہا تھا کہ اس میں ہار جانے کا مطلب سب کچھ ہار جانا تھا۔ نہ جانے اب مزید کیا ہونے والا تھا۔ یہ سوچ مجھے اُلجھا رہی تھی۔ کل رات پروردگار کے متبرک نام نے مجھے بچایا تھا۔
اچانک مجھے ایک خیال آیا، میں نے اٹھ کر دوبارہ دروازہ بجایا۔
''اب کیا ہے؟'' حلیمہ نے دروازہ کھولتے ہوئے مجھے گھورا۔
''مجھے ایک کاغذ، قلم، کپڑے کا ٹکڑا، سوئی...دھاگا اور ایک ڈوری درکار ہے۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔
''یہ چیزیں......؟ ان کا کیا کرو گی؟'' وہ میرے

مطالبے پر حیران رہ گئی۔

''مجھے اِن چیزوں کی ضرورت ہے۔ کیا آپ لاکر دے سکتی ہیں؟'' میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، میں لادیتی ہوں۔'' وہ بولی اور باہر کی طرف مڑ گئی۔

تھوڑی دیر میں میری طلب کردہ چیزیں مجھے مل گئی تھیں۔ وہ یہ چیزیں دیتے ہوئے خاصی مشکوک لگ رہی تھی مگر بہرحال اس نے زیادہ سوال نہیں کیے تھے۔

مجھے ٹھیک طرح سے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں کیوں یہ کررہی ہوں۔ بس جو میرے دل نے کہا، میں وہ کر رہی تھی۔

میں نے اُس کے لائے ہوئے کاغذ پر قلم سے آیت الکرسی لکھی پھر اس کو پوری عقیدت کے ساتھ تہ کرکے کپڑے کے ٹکڑے کو سیدھا کرکے اس کے درمیان رکھا۔ کاغذ پر کلمہ اور اللہ کے نام کی تسبیح پڑھ کر پھونکی۔ آیت کے تہ کیے ہوئے کاغذ کو کپڑے میں لپیٹ کر اس کا چھوٹا سا لاکٹ بنایا اور سوئی دھاگے سے اس کی تُرپائی شروع کردی۔ میں نے اماں کو بچپن میں اس طرح آیت الکرسی کا تعویز بناتے دیکھا تھا۔ سلائی کرتے ہوئے کپڑے کی تہ میں باریک سی جگہ چھوڑ دی جاتی ہے جس میں سے ڈوری کو گزارا جاتا تھا۔ میں نے اسی ترکیب سے یہ تعویز بنایا اور اسے گلے میں پہن لیا۔ اسے پہننے سے میرے دل کو عجیب سی طاقت کا احساس ہوا تھا۔

میں عجیب وغریب صورتِ حال کا شکار تھی اور بالکل سمجھ نہیں پارہی تھی کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں اور کیسے ہوتا چلا جارہا تھا۔ گاؤں سے اس طرح نکلنا ہی میرے لیے کم مشکل نہیں تھا اس پر مستزاد یہ کہ مجھے ہر قدم پر نت نئی مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑرہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کاتبِ تقدیر نے زندگی کے نصاب میں موجود تمام مشکل ترین پرچوں اور مضامین کو میرے لیے لازمی قرار دے دیا تھا۔

کچھ دن پہلے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ میں اس طرح ایک بڑے شہر میں دو جرائم پیشہ افراد کے درمیان پھنس جاؤں گی۔ مرادشاہ مجھے ہر قیمت پر موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا تو قادر خان میرے ذریعے اسے کیل ڈالنا چاہتا تھا۔

ان دونوں میں سے کسی کے لیے میری زندگی یا موت کی کوئی اہمیت نہیں تھی اگر کچھ اہم تھا تو وہ ان کے اپنے مفادات تھے جن کے لیے انسانوں کی بلی چڑھانا ان کا روز کا معمول تھا۔

'یہ سب ٹھیک ہے مگر فی الحال تمہیں نیند کی سخت ضرورت ہے سارہ۔' میں نے خود کو سمجھایا۔

نہ جانے آنے والا وقت اپنے دامن میں کیا لے کر آئے اس لیے تھوڑا سا آرام مجھے بہتر سوچنے اور بہتر مقابلے کے لیے تیار کرسکتا تھا، یوں بھی میرے پاس کرنے کو کچھ اور تو تھا نہیں۔

میں نے سونے سے قبل دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کی۔ اپنی پریشانیاں اس سب جاننے والے اور مسبّب الاسباب کے سپرد کرکے میرا دل ہلکا پھلکا ہوگیا۔ میں بستر پر گری اور کچھ سوچنے سے پہلے ہی نیند نے مجھے تمام اندیشوں اور وسوسوں سے بے نیاز کردیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ شاید اس دوران حلیمہ اندر آئی تھی اور مجھے سوتا دیکھ کر رات کا چھوٹا ہرا بلب جلا گئی تھی۔ میں نہ جانے کتنی دیر سوئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی عجیب سی نامعلوم دہشت میرے اعصاب پر چھا گئی اور میں اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور دماغ خطرہ خطرہ کی گردان کیے جارہا تھا۔ جبکہ وہاں ایسا کچھ نظر نہیں آرہا تھا نہ ہی میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

مجھے یہ محسوس ضرور ہورہا تھا کہ شاید بیدار ہونے سے ایک لحہ قبل تک میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی مگر جاگنے کے بعد میرا ذہن بالکل سپاٹ تھا۔ نہ تو مجھے اپنا خواب یاد تھا اور نہ ہی کوئی اور سوچ تھی۔ اس کے باوجود یہی لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ ہے جو ٹھیک نہیں ہے۔

میں خاموشی سے سر جھکا کر بستر پر بیٹھ گئی۔

''چلو۔'' تھوڑی دیر بعد حلیمہ پھر اندر آئی۔

''کہاں؟'' میں نے اسے پریشان ہوکر دیکھا۔

''اوپر خان جی کے کمرے میں...... تم کو خان جی نے اوپر بلایا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''وہاں...... کیوں؟'' میں درحقیقت گھبرا گئی تھی۔

''وہاں...... اس لیے کہ اس کا حکم ہے اور اِدھر جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

میں ایک لمحہ جی کھڑی رہی پھر اُس کے پیچھے چل پڑی۔ باہر نکلتے ہی بندوق بردار نظر آنے لگے تھے۔ اتنی حفاظت یقیناً کسی گڑبڑ کی نشانی تھی۔ یہاں کیا ہو رہا تھا، یہ میں جاننا چاہتی تھی مگر ابھی تو میں خود شدید پریشانی میں گرفتار تھی۔ قادر خان مجھے جس طرح دیکھ رہا تھا، مجھے اس کے بارے میں سوچ کر ہی اُلجھن ہو رہی تھی۔

قادر خان کا خصوصی کمرا دوسری منزل کے درمیان واقع تھا۔ اس منزل پر ملیشیا کے سرمئی شلوار قمیص میں ملبوس کمر سے پستول لگائے اور بندوقیں اٹھائے کئی نوجوان چیتے جیسی پھرتی سے ٹہلتے نظر آرہے تھے۔ موت کا خوف انسان سے کیا کیا کراتا ہے۔

دیکھا جائے تو پیدا ہونے کے بعد اگر کوئی چیز آخر دم تک ساتھ رہتی ہے تو وہ موت ہی تو ہے۔

قدرت کا آہنی ہاتھ خودکار نظام کے تحت موت کے سب کچھ مٹا دینے والے پنجے کو متعین وقت سے پہلے حرکت نہیں کرتے دیتا۔ جیسے ہی وہ لمحہ آتا ہے ویسے ہی زندگی پر نگاہیں گاڑے، اجازت کی منتظر موت زندگی کو اپنی آغوش میں بھر لیتی ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہنے والا ہے مگر اس کے باوجود انسان اس لازمی آخری منزل سے بچنے کے لیے سو سو جتن کرتا ہے، پورا دماغ لڑاتا ہے۔

محافظین کی فوج بناتا ہے۔ نت نئے ہتھیار تراشتا ہے۔ آبِ حیات کی تلاش و تیاری میں عمریں گزار دیتا ہے۔ آخر میں بہرحال نتیجہ وہی نکلتا ہے جو کاتبِ تقدیر بہت پہلے تحریر کر چکا ہوتا ہے۔

ہم دو بند کمروں کے سامنے سے گزر کر تیسرے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ ایک محافظ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

اس کمرے میں داخل ہو کر مجھے بالکل یوں لگا جیسے کہ میں کسی ڈرامے یا فلم کے منظر میں داخل ہو گئی ہوں۔ کمرا بہت اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ چمکتی ہوئی لکڑی کا خوب صورت بستر کمرے کے درمیان رکھا گیا تھا۔ جس کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی الماریوں جیسی دو میزیں رکھی ہوئی تھیں جن پر لیمپ رکھے تھے۔ سامنے سنگھار میز تھی۔ دیوار کے ساتھ بنی چار دروازوں والی بڑی سی الماری کے علاوہ دہاں... دو آرام دہ صوفے اور ایک درمیانی میز بھی موجود تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ بنے شوکیس میں ٹی وی موجود تھا جو اس وقت بند تھا۔ دیوار کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا فریج تھا۔ اس کمرے میں ایک اور دروازہ بھی تھا جو اس وقت بند تھا۔ زمین پر نرم اور موٹا سا قالین بچھا تھا جس میں پیر دھنسے جا رہے تھے۔

''ابی تم ادھر آرام سے بیٹھو...... کوئی ضرورت ہو تو بلا لینا۔ ام باہر ہی ہے۔''

''مگر میں اکیلی......''

''اکیلی ہی رہنا ہوگا۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''مجھے اندر بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔ خان جی اپنی مرضی کا مالک ہے وہ کب آئے گا ام کہہ نہیں سکتا مگر آئے گا ضرور۔'' وہ معنی خیز انداز میں کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

یہ گویا میرے بدترین خدشات کی تصدیق تھی۔ قادر خان، مراد شاہ کے مقابل میرا نجات دہندہ بن گیا تھا مگر اب اس قلعے میں مجھے قادر خان سے کون بچائے گا؟ یہ سوال بھیانک شکلیں بنائے مسلسل میرے اردگرد ناچ رہا تھا۔

اس تازہ ترین واردات نے باقی کے سارے خطرات اور فکروں کو میرے دماغ کی سلیٹ سے مٹا دیا تھا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گئی تو بستر پر بیٹھ گئی۔ بستر کے عین سامنے سنگھار میز تھی۔ اس میں میرا عکس صاف نظر آرہا تھا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں، میں خاصی بدل گئی تھی۔ چہرے کی بے فکری پر سوچ حاوی آرہی تھی۔ مگر اس سے ہٹ کر میرا سنہری مائل گورا رنگ اسی طرح دمک رہا تھا۔ گہری بھوری آنکھیں تمام تر پریشانیوں کے باوجود چمک رہی تھیں۔ میرے گال پر مراد شاہ کے تھپڑوں کے آثار اب بھی سرخ لکیروں کی شکل میں موجود تھے اور ہونٹوں کا داہنا حصہ سوجا ہوا تھا۔ لمبے سیاہ بال جنہیں سونے سے قبل میں نے جُوڑے کی شکل میں باندھ لیا تھا، اس ہنگامے میں کھل کر بکھر چکے تھے۔ میں نے جلدی سے بالوں کو سمیٹ کر باندھا اور سر پر دوپٹا جمایا اور آئینے میں خود کو دیکھ ہی رہی تھی کہ دروازے کا ہینڈل گھوما اور قادر خان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میں بستر سے کھڑی ہو گئی۔

''مت گھبرا...... مت گھبرا...... آرام سے بیٹھ بھئی اور ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' وہ مجھے بھرپور نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''سب کچھ کنٹرول میں ہے بالکل فکر نہ کرو، ہاں تم تو ایک دم نکھر گئی ہو، بہت چمک رہی ہو بھئی۔''

''مجھے حلیمہ نے یہاں بھیج دیا ہے۔'' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔

''ہاں، ہاں، میں نے ہی کہا تھا۔ تجھ سے کچھ بات کرنا تھی۔ کچھ سنا تھی۔ تو پریشان ہو گی ڈری ہوئی، میں جانتا ہوں مگر اب مراد شاہ سے ڈرنے کی تجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ یوں تو ایک لمحے میں اس کا قصہ ختم ہو سکتا ہے۔ ایک گولی اور وہ ختم..... مگر نہیں میں اُسے تڑپتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ بے سروسامان اور مجبور۔'' اس کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔ ''اور اس کے لیے اسے سلاخوں کے پیچھے بھجوانے سے اچھی کوئی ترکیب نہیں ہے۔''

''جی۔'' میں دھیرے سے بولی۔ ''میں اس کو زیادہ نہیں جانتی مگر مجھے ڈر ہے کہ شاید وہ آرام سے نہیں بیٹھے گا اور اب تک تو سیداں کی لاش دریافت ہو گئی ہو گی۔''

''صرف دریافت نہیں، دفن بھی ہو چکی وہ۔ یوں سمجھ لے کہ مراد شاہ کی آدھی طاقت ختم ہو گئی ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''اس نے یقیناً پولیس کو میرا نام دیا ہوگا۔'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''وہ پولیس انسپکٹر ویسے بھی امجد کے قتل میں بھی مجھ پر شک کر رہا تھا۔''

''تو کیوں ڈرتی ہے تیرا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، نہ مراد شاہ نہ اس کا کوئی چیلا چانٹا..... تو اب قادر خان کی پناہ میں ہے اگر میں تجھ سے خوش ہوں اور تیرے ساتھ ہوں تو پھر کون تیرا کچھ بگاڑ سکتا ہے؟'' وہ آرام سے بستر پر دراز ہوتا ہوا بولا۔ ''تو اُن کو چھوڑ، ابھی میں اُن کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی تو تُو مجھ سے میری بات کر..... اپنی سنا۔'' وہ بہکے ہوئے انداز میں بولا۔

''بہت خوب صورت ہے تُو، سچ کہہ رہا ہوں یہ جو فلمی اداکارائیں ہیں نا وہ تیرے اس معصوم حسن کے آگے پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔ اللہ قسم ام سچ بول رہا ہے۔ تف ہے مراد شاہ پر جو تیرے اس حسین چہرے کو برباد کر رہا تھا۔ ارے ہاں تیرا نام بھول گیا۔ کیا نام ہے تیرا؟''

''سارہ۔'' میں بولی۔ میری آواز میرے دل کی طرح بوجھل ہو رہی تھی۔

''ہاں سارہ..... پسند آ گئی ہے تُو مجھے..... اب کس کی مجال ہے جو تجھے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ رانی بن کر رہنے والی ہے تو۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولا۔

''مگر میں..... آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں کرتا سمجھایا کرتا ہوں رانی۔'' وہ بڑی ملائمت سے بولا مگر اس کے لہجے میں کچھ ایسی کاٹ تھی کہ میں لرز کر رہ گئی۔ ''کون کیا ہے؟ کیا کرے گا اور کیا نہیں کرے گا؟ اس کا فیصلہ میں خود کرتا ہوں اور لوگ میرا حکم مانتے ہیں۔ جو نہیں مانتا، میں اُسے کچھ کہنے، سمجھانے اور بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتا۔ بہادر لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں مگر بہادری کے ساتھ عقل زندگی کو لمبا اور خوش گوار بناتی ہے..... بے عقل عموماً جلدی مارے جاتے ہیں۔ ہاں اب تم کہو کیا کہہ رہی تھیں۔'' میں جواب میں خاموشی سے اسے تکتی رہ گئی۔

''آؤ یہاں آ کر بیٹھو'' وہ بستر پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''تمہیں بھوک لگ رہی ہو تو کچھ منگواؤں؟''

''نہیں شکریہ۔'' میں نے جواب دیا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

''تم مجھ سے اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟''

مجھے اپنی جگہ جمے دیکھ کر وہ بستر سے کھڑا ہو گیا۔

''آؤ..... آرام سے بیٹھو اور مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' اس نے میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھے اور ہلکا سا دباؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''تم بلاوجہ خود کو پریشان کر رہی ہو۔''

اس سے قبل کہ میں کچھ جواب دیتی، نیچے کہیں ایک دھماکا سا سنائی دیا جس کے بعد گولیوں کی تڑتڑاہٹ شروع ہو گئی۔

قادر خان آوازیں سن کر چونکا اسی لمحے دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔

''کون ہے؟'' وہ غرایا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''خان جی..... خان جی۔'' آنے والا ہانپ رہا تھا۔ ''خان جی حملہ ہو گیا ہے اور وہ دھوکے سے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ نچلی منزل پر مقابلہ ہو رہا ہے۔''

''کیا؟'' وہ دہاڑا۔ ''کون ہیں وہ؟ اور وہ اندر کیسے گھسے؟ گارڈز کہاں مرے ہوئے تھے؟ گیٹ کس نے کھولا اور کیوں؟''

''کچھ معلوم نہیں خان جی؟ کچھ معلوم نہیں مگر وہ کافی زیادہ ہیں، نیچے اکرم، گل خان اور شبر زخمی ہو گئے ہیں۔ فضل کو سینے میں گولی لگی ہے۔''

''چلو میں چل رہا ہوں۔ تہ خانے میں کون کون ہے؟ سب نیچے آ گئے ہیں؟ سالوں کو زندہ بچ کر نہیں جانا چاہیے۔'' وہ اس کے ساتھ باہر نکلتا چلا گیا۔

اپنے ریڈیو کی آواز آہستہ رکھیے تاکہ آپ کے
پڑوسیوں کے آرام میں خلل نہ پڑے

RIVER-POLLUTION PENALTY £5

اریا میں گندگی پھیلانے والے پر
5 پونڈ جرمانہ کیا جائے گا

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اس سب پر خوش ہونا چاہیے یا پریشان؟ اور ان کا حملہ کس قدر تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے؟ یہ حملہ میرے لیے بھی اتنا ہی تکلیف دہ اور جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا مگر اس میں بھی شک نہیں تھا کہ وہی مجھے قادر خان سے بچانے کی وجہ بھی بنا تھا۔

میں چند لمحے اندر بیٹھی رہی پھر بے چینی نے مجھے کھڑے ہونے پر مجبور کردیا۔ مجھے یقین تھا کہ دروازہ باہر سے بند ہوگا، میں نے یونہی آزمانے کے لیے ہینڈل گھمایا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ دروازہ مقفل نہیں تھا شاید جلد بازی میں وہ اسے بند کرنا بھول گئے تھے۔

میں نے ناب گھمائی اور باہر جھانکا۔ اس لمبی گلی نما جگہ میں کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا، ہاں نیچے سے فائرنگ اور چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں خاموشی سے باہر نکل آئی اور دبے قدموں بیرونی راستے کی طرف چل دی۔

میں سیڑھیوں کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ایک زوردار دھماکے نے مجھے رکنے پر مجبور کردیا۔ نیچے باقاعدہ جنگ ہورہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے دوسری منزل پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں خاموشی سے سیڑھیاں اترتی نیچے پہنچی۔ پہلی منزل سے دوسری منزل کی طرف آتی سیڑھیوں کی درمیانی جگہ کے سامنے پہنچ کر میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہاں درمیان میں لوہے کا دروازہ لگا ہوا تھا جو اس وقت بند تھا شاید اوپری منزلوں کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا۔

میرے لیے یہ باہر نکل جانے کا نادر موقع ثابت ہو سکتا تھا۔ وہاں موجود سب لوگ مرنے اور مارنے میں مصروف تھے۔ ایسے میں کسی کا دھیان کم ہی میری طرف جاتا۔ اگر میں کامیاب ہوجاتی تو شاید اس بستی اور یہاں کے مسائل سے دور بھاگ سکتی مگر اس دروازے نے میرے عزائم پر پانی پھیر دیا تھا۔

''تم...... تم یہاں کیا کررہا ہے؟ کمرے سے باہر کیوں نکلا؟'' پیچھے سے آنے والی پتلی مگر کرخت آواز نے مجھے اچھلنے پر مجبور کردیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ حلیمہ سیڑھی پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔

''میں خان جی کے لیے پریشان ہوں۔'' میں نے بات بنائی۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے حلیمہ بی بی؟ کون لوگ ہیں یہ؟ اور کیا ہونے والا ہے؟''

''تم مت گھبراؤ...... دھندے میں یہ ہوتا رہتا ہے۔ بزدل لوگ ایسے ہی حملہ کرتا ہے مگر اس بار کچھ زیادہ ہوگیا

ہے، کسی نے اندر سے دروازہ کھولا ہے۔ ہمارے میں کوئی غدار ہے؟ اور یہ سب سے بُرا بات ہوا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''تم کو اس سب سے ڈر نہیں لگ رہا؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ڈر؟ کس چیز کا؟'' اس نے الٹا مجھے حیرت سے گھورا۔ ''یہ اس کاروبار کا حصہ ہے۔ ایسے ہی کام چلتا ہے دشمن پیچھے لگا رہتا ہے۔ اس کو ہرانا کام کا حصہ ہے۔ جو جیتتا ہے وہی آگے بڑھتا ہے اور اب تک کوئی خان جی کو نہیں ہرا سکا ہے۔''

''یہ دروازہ کیسے کھلتا ہے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ اسے کس نے بند کیا ہے؟''

''ام نے کیا ہے...... ام اس کو بند کرتا ہے اور ام ہی کھولتا ہے پر تم کیوں پوچھ رہا ہے؟'' وہ اکھڑ انداز میں بولی۔ ''تم کو نیچے جانا ہے؟ مرنا چاہتا ہے؟ گولی پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوتا اور نہ کوئی ڈاکیا اس کو پہنچانے جاتا ہے کہ صحیح پتے پر چھوڑ کر آئے، اور اُڑتی ہوئی گولی بھی بندے کو اوپر پہنچانے کے لیے کافی ہوتا ہے سمجھا۔ اب سیدھا اوپر چلو اور کمرے میں بیٹھو...... چپ چاپ۔''

''اچھا...... مگر یہاں اس منزل پر کوئی بھی نہیں ہے۔''

''تم کو اماری بات سمجھ میں نہیں آتی؟'' وہ غصے میں سیڑھیاں اتر کر میرے قریب آئی اور میرے بازو کو جکڑتے ہوئے بولی۔

''مجھے چھوڑو...... آرہی ہوں میں۔'' میں نے بازو کو جھٹکا دیا۔

''تم ایسا نہیں مانے گا گھسیٹ کر لے جانا پڑے گا تم کو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے زور سے مجھے دھکا دینا چاہا مگر اس سے صرف ایک لمحہ قبل میں اوپر والی سیڑھی پر قدم رکھ چکی تھی۔ اندازے کی غلطی کی وجہ سے وہ لڑکھڑا گئی۔ گرنے سے بچنے کی کوشش میں اس نے ریلنگ اور اس کے ساتھ لگی لوہے کی گرل کو پکڑا۔ یوں وہ گرنے سے تو بچ گئی مگر تقریباً الٹ کر لٹک سی گئی۔ یہ سب چند لمحوں میں ہو گیا تھا اور اس نے اسی چند لمحوں میں خود کو سنبھال بھی لیا تھا۔ اس کی جسامت کے حساب سے اس کی یہ چستی واقعی قابلِ دید تھی۔ اس کے اس طرح الٹنے کی وجہ سے اس کے ڈھیلے ڈھالے کُرتے کی ایک طرف کی جیب سے ایک چھوٹا پستول نیچے آ گرا تھا۔ اس پستول کے گرنے کی آواز پر میں نے اور اس نے بیک وقت نیچے دیکھا۔ میں اس سے ایک سیڑھی اوپر کھڑی تھی۔ میں نے پستول کو دیکھتے ہی بجلی کی سی تیزی سے حرکت کی اور پیر کی مدد سے اسے اپنی جانب سرکا لیا۔ مجھے اس کی جانب متوجہ دیکھ کر حلیمہ بھی گرل چھوڑ کر اس کی جانب لپکی مگر میں اس سے قبل اسے اٹھا چکی تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں آتے ہی اس کا رخ حلیمہ کی جانب کر دیا۔

''توم...... تم یہ کیا کر رہا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ خان جی کو معلوم ہو گیا تو تمہارا بہوت بُرا حشر ہوگا۔'' وہ پستول کی نال اپنی طرف دیکھ کر جہاں تھی وہیں رک کر بولی۔

''تم فکر مت کرو۔ خان جی کو علم نہیں ہوگا، تم اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' میں نے سختی سے کہا۔

اگرچہ میں اسکول میں فوجی ٹریننگ کا کورس کر چکی تھی پھر بھی مجھے یہ پستول چلانا نہیں آتا تھا مگر حلیمہ یہ بات نہیں جانتی تھی اور اس کی لاعلمی ہی میری طاقت تھی۔

''اس دروازے کی چابی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''امارے پاس نہیں ہے۔'' وہ صفائی سے بولی۔

''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تم ہی اسے کھول اور بند کر سکتی ہو۔ مجھے چابی چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے اس سے خان جی کو فائدہ ہوگا۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''اسے جلدی سے کھولو۔''

''ہم یہ نہیں کر سکتا۔ خان جی ام کو مار ڈالے گا اور اگر کوئی اوپر آ گیا تو بہت بُرا ہوگا۔'' وہ سر ہلا کر بولی۔

''ابھی تو پستول میرے ہاتھ میں ہے۔ اتنی گولیاں ویسے بھی چل رہی ہیں حلیمہ بی بی! اگر یہاں ایک چل گئی تب بھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا مگر تم مر جاؤ گی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''کوئی اوپر آ گیا تو بڑا نقصان ہو جائے گا، تم سمجھتا نہیں ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولی۔

''مگر یہ تو میری ہی وجہ سے بند ہے نا؟''

''نہیں...... تمارا مسئلہ نہیں ہے اوپر سارا مال رکھا ہے۔ خان جی کی سخت ہدایت ہے اوپر تو ام بھی نہیں جا سکتا۔'' وہ بے اختیار بول گئی۔

''مال......؟ کیسا مال؟ کیا رکھا ہے اوپر؟'' دوسروں کے معاملوں میں ٹانگ اڑانے کا شوق مجھے پریشانیوں میں پھنساتا آ رہا تھا مگر پھر بھی میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

''ام یہ نہیں بتا سکتا۔''

''ٹھیک ہے پھر تم مرے گا۔'' میں طیش میں آ کر بولی۔ ''چلو اوپر چلو۔'' میں نے دونوں ہاتھوں میں پستول پکڑ کر اس کا رخ اس کی جانب کیا ہوا تھا اور اسی طرح اسے نشانے پر رکھے قادر خان کے کمرے میں لے آئی۔

''اب تمہیں گولی مار دوں؟'' میں نے دروازہ بند کر کے پستول کو حرکت دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں...... ام کو مارنا نہیں، امارا چھوٹا بچہ ہے اور ام ابی مرنا بھی نہیں چاہتا۔'' وہ گڑگڑا کر بولی۔

''تو پھر شروع ہو جاؤ۔''

''تم جو کر رہا ہے، اس پر پچھتائے گا۔ خان جی نے تم پر احسان کیا ہے۔''

''حلیمہ بی بی میں پانچ تک گنتی ہوں۔'' میں اسے اچھی طرح ڈرا دینا چاہتی تھی اس لیے تیزی سے بولی۔ ''ایک...... دو...... تین......''

''رکو، رکو۔ ام بتاتا ہے اوپر پاؤڈر ہے...... نشے کا پاؤڈر جو مال تیار ہوتا ہے اوپر رکھتا ہے نمبرون مال...... باقی مال یہاں پر بکتا ہے۔'' وہ بولی۔

''نشہ......؟'' میرے دل میں قادر خان کے لیے نفرت سی اُمنڈ پڑی۔

ایک تو موت کی سوداگری اور اس میں بھی اپنے لوگوں کے حصے میں دو نمبر کا مال ہی تھا۔ لالچ، گھٹیا پن اور کمینگی کی شاید یہ آخری حد تھی جسے یہ لوگ کاروبار کا نام دے رہے تھے۔ مجھے امجد کی حالت یاد آئی۔ اس کے ساتھ ہی پروین کی تکلیف وہ زندگی اور زرینہ کی مایوس نگاہیں۔ نہ جانے کتنے لوگ اور کتنے خاندان لالچ کے اس مقتل میں صبح شام ذبح ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے شکار تو ڈوبتے ہی ہیں مگر ان کے ساتھ محبت کے رشتوں میں جڑے پورے پورے خاندان بھی ان تاریک راہوں میں زندہ ہونے کے باوجود زندہ نہیں رہ پاتے۔

اگرچہ میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے آئی تھی۔ میری عمر اتنی زیادہ نہیں تھی نہ تو مجھے اتنا تجربہ تھا اور نہ ہی اتنا علم...... مگر زندگی کی تجربہ گاہ میں گزرتا ہر لمحہ مجھے بہت کچھ سکھا رہا تھا۔ سوچ کے نئے راستے کھول رہا تھا اور مجھے وہ بھی دکھائی اور سجھائی دینا شروع ہو گیا تھا جو شاید عام دنوں میں برسوں میں بھی سیکھنا مشکل تھا۔

اس وقت میں خود ایک قیدی تھی، میری دسترس میں کچھ بھی نہیں تھا مگر میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ میں انہیں اس طرح آسانی سے نہیں چھوڑوں گی۔ میری زندگی کا فی الحال تو خود اپنے آپ کو بچانے کے علاوہ یوں بھی کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ اگر ان زہر کے بیوپاریوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں مجھے کچھ ہو بھی جاتا تو بہرحال یہ ہار بھی جیت کے برابر ہی ہوتی۔

''اور...... دروازے کی چابی......؟'' میں نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے حلیمہ سے سوال کیا۔

''یہ...... یہ ہے۔'' اس نے کُرتے کے سامنے بنی لمبی سی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی برآمد کی۔ ''اس سے کھلتا ہے یہ دروازہ...... مگر تم نیچے مارا جائے گا۔ ابی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ حملہ کس نے کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ مراد شاہ کا لوگ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ تم کو نہیں چھوڑے گا۔'' اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

اب میں اُسے کیا کہتی کہ میرے لیے تو یہ معاملہ ایک طرف کنواں دوسری طرف کھائی جیسا تھا۔ اگر میں یہاں رک جاتی تو قادر خان بھی مجھے زندہ درگور کیے بغیر نہیں چھوڑتا اس لیے میرے پاس اس خطرے میں کودنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

''کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟''

''نہیں......'' وہ بولی۔ ''تم نے ام سے سب اُگلوا لیا ہے خان جی ام کو نہیں چھوڑے گا۔ ام پھنس گیا ہے۔''

''تم کو کچھ نہیں ہوگا تم اس کرسی پر بیٹھو۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ جونہی رخ موڑ کر کرسی کی طرف بڑھی۔ میں نے پوری قوت سے اس کا پستول اس کے سر پر مارا۔

''اوغ......'' وہ میرے اندازے کے مطابق سر پکڑ کر زمین پر ڈھیر ہوگئی۔ سچ یہ تھا کہ میں اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی مگر اس کو ہوش میں چھوڑنا میرے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا۔ میں اسے وہیں زمین پر چھوڑ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔ اندر گھستے ہوئے میں نے دروازے میں لگی چابی دیکھی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں نے چابی گھمائی اور اسے لاک سے نکال کر مٹھی میں دبا لیا۔

گلی میں اب بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ سب یقیناً نیچے مصروف تھے۔ سیڑھی کے پاس پہنچ کر میں ٹھٹک گئی۔ وہ سیڑھیاں اوپر بھی جا رہی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اوپر جا کر وہاں موجود چیزوں کو آگ لگا دوں مگر عملاً یہ ناممکن لگ رہا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے نیچے جانے

والی سیڑھی پر قدم رکھا۔ میرے لیے تو فی الحال اپنی جان بچانا ہی مشکل ترین کام تھا۔ ایسے میں اس طرح کی مہم جوئی مجھے بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔

یہ کام بہت مشکل تھا۔ تقریباً ناممکن...... اگر میں اس ذخیرے کو آگ لگانے میں کامیاب ہو جاتی تو اس سے نہ جانے کتنے مزید گھر اُجڑنے سے بچ سکتے تھے۔ اس خیال نے میرے ہاتھ میں موجود چابی کو تالے میں لگنے سے قبل ہی روک دیا اور میں نے سوچے سمجھے بغیر اوپر جانے والی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

نیچے کی طرح اوپری منزل پر بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہاں موجود گارڈز کی میز اور کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ ایک کرسی الٹی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حملے کی خبر پر وہ عجلت میں بھاگے تھے۔ وہاں بھی ایک پتلی سی گلی بنی ہوئی تھی مگر یہاں دروازے صرف تین نظر آرہے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پہلا دروازہ کھولا۔

یہ ایک خاصا لمبا چوڑا وسیع ہال نما کمرا تھا جہاں دیواروں کے ساتھ اور درمیان میں گتے کے کاؤنٹر کا شہر آباد تھا۔ شاید وہ کارٹن ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے، انہیں ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھا گیا تھا۔ ان کی تعداد دیکھ کر معلوم ہو رہا تھا کہ قادر خان منشیات کے حوالے سے بڑا کام کر رہا تھا۔ یہ کارٹن جس طرح پیک کیے گئے تھے، اس سے لگ رہا تھا کہ یہ سارے کا سارا مال ایک ساتھ کہیں دور بھیجا جانا تھا یعنی یہ ایک نمبر مال تھا۔

اتنے بڑے ذخیرے کو برباد کرنے کے لیے ماچس کی تیلی یقیناً کافی نہیں ہو سکتی تھی اور میرے پاس تو ماچس کی ایک تیلی بھی دستیاب نہیں تھی۔ صرف ایک جذبہ تھا کہ میں دنیا کو اس زہر سے بچانا چاہتی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا اور گلی میں جھانکا۔ وہاں اسی طرح خاموشی کا راج تھا۔ کمرے سے باہر آتے ہوئے میں نے بہت آہستگی سے درواز ہ بند کیا اور کوئی آہٹ کیے بغیر آگے کی جانب لپکی۔

شام میں حلیمہ نے جس طرح کھانا اور تمام چیزیں فوراً مجھ تک پہنچائی تھیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ہر منزل پر باورچی خانہ یا اس طرز کی کوئی نہ کوئی جگہ موجود ہے اور میں یہاں اسی کی تلاش میں تھی۔ اگر مجھے باورچی خانہ مل جاتا تو پھر کوئی سبیل نکالی جاسکتی تھی۔

میں نے گلی میں موجود دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکتے ہوئے ساکت سی رہ گئی۔

یہ بھی اسی طرح کا ہال نما کمرا تھا اور یہاں بھی قطار اندر قطار کارٹن کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ڈھیروں مال اوپر تیسری منزل پر پہنچانے اور پھر اتارنے کے لیے کس قدر انتظام کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ اتنے سارے افراد میں سے کسی ایک کو بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اور اس کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں؟ اگر درمیان کی ایک کڑی بھی الگ ہو جائے تو زنجیر خواہ وقتی طور پر ہی سہی ٹوٹ جاتی ہے مگر یہاں تو یہ سب نہ جانے کب سے جاری تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر دروازہ بند کیا اور دوڑتی ہوئی گلی کے آخری کونے میں موجود دروازے تک پہنچی۔ یہ دروازہ پچھلے دو دروازوں کے مقابلے میں چوڑائی میں قدرے کم تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھلتے ہی میرے ہونٹوں سے اطمینان کی سانس برآمد ہوئی۔

یہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ہی تھا۔ دیوار میں لگی ماربل کی سلیب پر تیل کا اسٹوو رکھا ہوا تھا اور دیوار پر لگی چھوٹی سی الماری میں چائے کی پتی، چینی وغیرہ موجود تھی۔ گویا یہ جگہ صرف چائے وغیرہ بنانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ میں نے اس کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا، اس میں تیل موجود تھا۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ نہیں تھا مگر گتے کے کارٹنوں میں آگ بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔

میں نے تیزی سے اسٹوو کے اوپری حصے کو الگ کیا اور نچلے ڈبے میں جہاں تیل موجود تھا، اسے اٹھا لیا۔ اسٹوو کے برابر میں ہی ماچس کی ڈبیا بھی موجود تھی۔

اگرچہ مجھے اس ترکیب کے مکمل طور پر کارگر ہونے پر یقین نہیں تھا مگر پھر بھی اس سے کچھ نہ کچھ خرابی تو پیدا ہو ہی سکتی تھی۔ میں بہر حال وہی کر سکتی تھی جو میری دسترس میں تھا۔ میں تیزی سے باورچی خانے سے نکلی اور پہلے دروازے کو کھول کر بڑے کمرے میں گھس گئی۔

میرا ذہن وسوسوں اور اندیشوں سے بھرا ہوا تھا۔ نیچے جاری مار ا ماری کسی بھی وقت ختم ہو سکتی تھی۔ اگر میں اس سے قبل اپنا کام ختم کر کے یہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب نہ ہو سکی تو جو ہو سکتا تھا، وہ میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ دوسری طرف حلیمہ تھی جسے میں قادر خان کے کمرے میں بند کر کے آگئی تھی۔ اسے کسی بھی وقت ہوش

آسکتا تھا اور اس صورت میں وہ شور شرابا مچا کر دروازہ پیٹ کر دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی تھی۔

میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے کارٹن پر تیل ڈالنا شروع کیا۔ میری خواہش یہ تھی کہ چاروں جانب کم از کم ایک قطار پر اچھی طرح تیل پڑ جائے اگر ایک بار اس کمرے میں اچھی طرح آگ بھڑک اٹھتی تو پھر دوسرے کمرے اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ہونے والی بھگدڑ میرے لیے بہت مفید ثابت ہوتی اور میرے لیے یہاں سے نکلنا آسان ہو جاتا۔

دوسروں کو زہریلی موت سے بچانے والا قدم خود میری بقا کا ضامن بھی بن سکتا تھا۔

میں نے ڈبے میں موجود تیل اچھی طرح کارٹنوں پر پھیلا دیا۔ ماچس میرے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں حلیمہ سے چھینا ہوا پستول تھا۔

میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر ماچس جلا کر ایک کارٹن پر پھینکی مگر وہ اس سے پہلے ہی گر کر بجھ گئی۔ میں نے دوسری تیلی جلائی اور قریبی کارٹن پر ڈالی۔ نتیجہ توقع کے عین مطابق نکلا تھا۔ گتا اور کارٹن دھڑ دھڑ جلنے لگا تھا۔ آگ کو اچھے طاقتور انداز میں ایک سے دوسرے کارٹن پر منتقل ہوتے دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ڈبے میں بہت تھوڑا سا تیل بچا تھا میں نے یہ تیل دوسرے ہال میں موجود پہلی قطار پر الٹا دیا اور ماچس کی تیلی جلا کر اس پر پھینکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کاوش آگ بھڑکانے کے لیے کافی ہوگی۔ یوں بھی دوسرے بڑے ہال کی آگ اتنی شدت سے پھیل رہی تھی کہ اس کے بعد منزل پر کچھ بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

میں ماچس وہیں زمین پر پھینک کر سیڑھیوں کی جانب لپکی۔ دوسری منزل پر پہنچ کر میری سماعت حلیمہ کی آواز یا کسی گڑبڑ کے امکانات کی تلاش میں تھی مگر اس محاذ پر خاموشی ہی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ حلیمہ کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔

میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر لوہے کے دروازے تک پہنچی۔ دوپٹے سے بندھی چابی کو کھولا، پستول کو بغل میں دبایا اور تالا کھولنے کی کوشش کی۔ پہلی کوشش میں چابی گھوم کر چٹ کی آواز کر کے رہ گئی مگر تالا ویسے کا ویسا ہی تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

کہیں حلیمہ نے میرے ساتھ ہاتھ تو نہیں کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے مجھے غلط چابی تھما دی ہو۔ ایسی صورت میں، میں بھی اس پنجرے میں پھنس جاتی، اوپر کی منزل کی آگ کو نیچے پہنچتے دیر نہیں لگتی۔

اس سوچ نے مجھے ایک دم خوف زدہ کر دیا۔ میں نے گڑبڑا کر چابی قفل سے باہر نکالی اور پھر تالے میں لگا کر گھمائی۔ چابی تالے میں ٹھیک سے نہیں لگ پائی اور گھبراہٹ میں میرے ہاتھ سے زمین پر گری اور دروازے کے نیچے موجود گرل میں سے دوسری سیڑھی پر جا پڑی۔

میری سانس رک رہی تھی۔

اب شاید مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

میرا دل زور زور سے چیخنے کو چاہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ خود کو پُرسکون کرنے کے لیے میں زمین پر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے گلے میں پڑے آیت الکرسی کے تعویذ کو پکڑ کر دل ہی دل میں اللہ کا نام دہرانے اور گہرے گہرے سانس لینے سے خوف کی تیز ترین لہر آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کر چابی کو دیکھا۔ وہ صرف ایک سیڑھی نیچے تھی۔ میں نے گرل کے درمیانی حصے میں سے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ گرل میں موجود جگہ کافی کم تھی۔ چابی اور میرے ہاتھ کے درمیان تقریباً تین انچ کا فاصلہ تھا۔ میں نے ہاتھ کو کھینچا اور انگلیوں کو چابی تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس میں احتیاط کی بے حد ضرورت تھی۔ اگر میرا ہاتھ چابی کو اچٹتا ہوا سا لگتا تو وہ نچلی سیڑھی پر بھی گر سکتی تھی اور اس صورت میں میرے اس تک پہنچ پانے اور اسے حاصل کرنے کے امکانات ختم ہی ہو جاتے۔

میری دو انگلیوں نے چابی کو چھوا اور اسے آہستگی سے اپنی جانب کھینچا۔ چابی تھوڑا آگے آ گئی تو میں نے اس اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس بار میں نے چابی کو تالے میں لگانے سے پہلے تالے کا جائزہ لیا۔ یہ قدرے مختلف انداز کا تالا تھا۔ میں نے چابی کو اس میں لگانے سے پہلے تالے کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس میں واقعی ایک لچک سی موجود تھی۔ اسے دبا کر میں نے چابی لگائی اور اسے گھمایا۔ دوسری بار گھمانے کے بعد ٹٹ کی مخصوص آواز آئی اور تالا کھل گیا۔

میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ میں نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی۔

نیچے اب بھی فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں مگر اب ان میں وہ شدت موجود نہیں تھی یا تو کوئی ایک پارٹی دوسری پر قابو پا چکی تھی یا پھر وہ پناہ گاہوں میں چھپے بہتر موقع کی تلاش میں تھے۔

میرے لیے بے دھڑک نیچے اترنا خطرناک تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں آگ کے بھڑک اٹھنے تک کہیں چھپی رہوں کسی ایسی جگہ جہاں سے باہر نکلنا بھی آسان ہو اور ایسی ایک جگہ میری نظروں کے سامنے تھی۔

دوسری سے نچلی منزل پر جانے کے لیے سیڑھیوں کے دو حصے بنے ہوئے تھے۔ دس بارہ سیڑھیاں اتر کر ایک تنگ سی جگہ آتی تھی وہیں سے سیڑھیاں نیچے کی جانب مڑ جاتی تھیں۔ اس جگہ پر دیوار میں ایک الماری بنی ہوئی تھی یہی وہ واحد جگہ ہو سکتی تھی جہاں میں چھپ سکتی تھی۔

میں نے چاروں جانب دیکھتے ہوئے احتیاط سے سیڑھیوں کا پہلا حصہ عبور کیا اور درمیان میں بنی اس الماری کے سامنے پہنچ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر کیا رکھا جاتا ہے اور یہ کہ اس میں اتنی گنجائش بھی موجود ہے یا نہیں اور یہ کہ یہ میرے منصوبے کے لیے بہتر جگہ ہے بھی یا نہیں مگر اس معاملے میں قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ الماری اندر سے بالکل خالی تھی۔ میں نے اس میں گھس کر دروازے کو بھیڑ لیا۔ دروازے میں ہلکی سی جھری میں نے خود چھوڑ دی تھی تاکہ سانس لینے میں آسانی کے ساتھ ساتھ آنے جانے والوں پر نظر بھی رکھی جا سکے۔

نیچے سے آتی فائرنگ کی آوازیں ایک بار پھر زور پکڑ گئی تھیں۔ اس بار یوں لگ رہا تھا جیسے یہ فیصلہ کن راؤنڈ ہو۔

مجھے حیرت تھی کہ ایک گھنٹے سے جاری اس قدر فائرنگ کے باوجود علاقہ پولیس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ شاید کسی نے انہیں خبر کرنا ضروری ہی نہیں سمجھا تھا یا پھر یہ سب کچھ ان کی معلومات میں ہی تھا۔

مجھے اس الماری میں کھڑے کافی دیر ہو چکی تھی اور عین اس وقت جب یہ اعصاب شکن انتظار میری برداشت سے باہر ہو چلا تھا میں نے کسی کے چیخنے کی آوازیں سنیں۔

''آگ...... آگ...... اوپر آگ لگ گئی ہے۔'' اس چیخ کے ساتھ ہی عمارت میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس بار ہنگامہ فائرنگ اور حملے سے زیادہ شدید نوعیت کا تھا۔ دروازے کی جھری سے بہت سے لوگ اوپر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ لوگ خود ہی آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ مجھے یقین تھا کہ یہ آگ اس طرح بجھنے والی نہیں تھی۔ فضا میں اب عجیب سی بُو پھیلنا شروع ہو گئی تھی جو غالباً منشیات کے جلنے کی وجہ سے آ رہی تھی۔ مجھے اب وہاں سے نکلنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش تھی۔

''خان جی بہت غصے میں ہے، ام نے اس کو اتنا انگارا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' اچانک کوئی لینڈنگ پر آ کر رکا تھا۔ وہ دو تھے اور شاید سانس لینے کے لیے رکے تھے۔

''جو ہوا ہے اور ہو رہا ہے، وہ کون کر رہا ہے پہلے حملہ اور اب یہ آگ...... کروڑوں کا مال خطرے میں ہے۔ غصہ تو آنا ہی ہے۔'' دوسرا افسوس سے بولا۔

''ام کو تو اوپر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ سچ بات ہے ام گولی تو کیا گولی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتا۔ تم کو معلوم ہے مگر آگ...... اس سے خوف زدہ ہوتا ہے۔'' پہلے نے سرگوشی کی۔

''بکواس نہ کر، یہ باتیں بنانے کا وقت ہے کیا؟ چل جلدی......''

''ہاں چلو، ام تو خوش تھا کہ آج اس کم بخت مراد شاہ کا پتا صاف ہو گیا۔ ابی کچھ دیر تو امن رہے گا۔ تو یہ نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر یہ خدائی خوار آگ لگ کیسے گیا؟'' وہ بیزاری سے بولا۔

''سنو، کیا واقعی وہ مارا گیا ہے؟'' پہلے نے رازداری سے پوچھا۔

''ہاں ہاں، خود خان جی کہہ رہا تھا کہ اس کے سینے میں گولی لگی ہے۔ اس کے آدمی بھی تو بھاگے تھے اس کو لے کر۔'' دوسرا یقین سے بولا۔ ''ورنہ آج تو سالے پوری تیاری سے آئے تھے۔''

''سچ کہہ رہا ہے ورنہ اتنی فائرنگ پر تو پولیس آ ہی جاتی...... لگتا ہے کہ وہاں بھی پکا انتظام کر کے آیا تھا۔''

''چل بھئی الماری سے پائپ نکال، زبان چلائے جا رہا ہے۔''

''ہاں ہاں۔'' ان میں سے ایک جواب دیتے ہوئے الماری کی جانب بڑھا۔

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا مطلب صرف اور صرف موت ہی ہوتا۔ اب میرا بچنا مشکل تھا۔ میں نے مایوسی سے آنکھیں بند کر لیں۔

''ارے وہاں کچھ نہیں ہے، پائپ نیچے ہے تہ خانے

میں جلدی لاؤ۔'' کوئی زور سے چلایا اور وہ دونوں تیزی سے نیچے کی طرف بھاگے۔

میں نے گہری سانس لے کر آنکھیں کھولیں۔

آگ یقیناً بڑھتی جارہی تھی۔ اس کا اندازہ بڑھتے ہوئے دھوئیں اور بدبو سے ہو رہا تھا۔ پہلی منزل پر اس الماری میں بند ہونے کے باوجود بھی میرے لیے سانس لینا دوبھر ہوتا جارہا تھا۔ اسی وقت میں نے فائر بریگیڈ کی آواز سنی۔ ہمارے گاؤں میں آگ لگ جانے کے حادثے اکثر ہوجایا کرتے تھے۔ کبھی انتقام کے طور پر بھی پورے کے پورے گھر خاکستر کردیے جاتے اگر کسی کو بستی سے نکالا دینا مقصود ہوتا تو بھی سزا کے طور پر اس کا گھر جلا دیا جاتا۔ حادثات کی صورت میں خود گاؤں والے ہی پانی مٹی ڈال کر آگ بجھایا کرتے۔ میں نے کتابوں میں اور ٹی وی پر فائر بریگیڈ کے سرخ انجن کو دیکھا تھا اور اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ یہاں کیوں نہیں ہوتا۔

فائر بریگیڈ کی آواز میرے لیے پرانی یادیں لے آئی مگر دھواں، شور، ہنگامہ، بدبو مجھے فوراً واپس بھی لے آئے تھے۔

وہ مکان اگرچہ بستی کا حصہ تھا مگر بستی سے قدرے باہر بنا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کے دونوں پلاٹس بھی غالباً قادر خان کی ملکیت تھے اور چاردیواری کھینچ کر چھوڑ دیے گئے تھے۔ اگر یہ مکان کہیں بستی میں ہوتا تو وہاں کی تنگ گلیوں کی وجہ سے فائر بریگیڈ کا بھی وہاں پہنچنا ممکن نہیں ہو پاتا۔

فائر بریگیڈ کے آتے ہی زوردار آواز کے ساتھ بڑا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔

میرے لیے اب الماری میں رہنا ناممکن ہوتا جارہا تھا۔ یوں بھی یہ باہر نکل جانے کا بہترین وقت تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے الماری کا دروازہ کھولا اور سیڑھیوں پر اتر آئی۔

اس وقت تک دھوئیں نے ہر طرف چادر سی تان دی تھی۔ آگ کی وجہ سے بجلی بند ہوچکی تھی۔ انتہائی تیز اور ناقابلِ برداشت بو پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں جانب چیخ وپکار مچی ہوئی تھی۔ ہر طرف قیامت کا سا سماں تھا۔

میں تیزی سے بھاگتی ہوئی نیچے اتری اور بڑے دروازے کے قریب پہنچی۔ فائر بریگیڈ کی سرخ لمبی چوڑی گاڑی دروازے کے عین درمیان کھڑی تھی۔

''چلو...... چلو...... باہر نکلو...... یہاں رہنا خطرناک ہے۔''

''باہر نکل آؤ فوراً......'' وہاں موجود ایک باوردی شخص گاڑی سے اترتا ہوا چلایا۔

میں نے سر ہلایا اور دروازے اور گاڑی کی درمیانی جگہ سے باہر نکل گئی۔

''باہر آکر میں نے چند گہری سانسیں لیں پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ تھوڑا آگے جاکر میں نے مڑ کر دیکھا۔

قادر خان کا قلعہ بُری طرح آگ کی لپیٹ میں تھا۔ یہ خدا کا قہر ہی تھا یا کسی خاموش بددعا کا اثر کہ ناقابلِ تسخیر محسوس ہونے والا یہ قلعہ یوں تباہ وبرباد ہو رہا تھا۔

مجھے شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ میرا دل اطمینان سے بھرا ہوا تھا۔

اب یہ بستی آزاد تھی۔

اماں سیداں کے کالے جادو سے، اس کی ''بددعا'' سے، اس کے اَن دیکھے پُراسرار خوف سے...... مراد شاہ سے، اس کے غنڈوں سے، اس کے ظلم سے۔ اور قادر خان کے زہریلے کاروبار سے، اگر وہ بچ جاتا تب بھی اسے اب اپنی لنکا کو دوبارہ بنانے میں بہت وقت لگنا تھا۔

باقی بچی میں...... تو میں پھر دوبارہ اپنے اسی پرانی سکھی کے مانند ساتھ نبھانے والے سوال کے سامنے کھڑی تھی۔ میں کہاں جاؤں گی؟ اور کیا کروں گی؟ میں گہری سانس لے کر آگے چل پڑی۔

سوال وہی تھے مگر اب مجھے جواب کی جلدی نہیں تھی۔

میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک زوردار آواز نے میرے قدموں کو رکنے پر مجبور کردیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔

چہرے پر پڑنے والی تیز روشنی نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔

میرا ہاتھ بے ساختہ میرے چہرے کی ڈھال بننے کے لیے اٹھا...... اتنے میں روشنی اردگرد پھیل سی گئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا اور اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

**بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے**

**محمد فاروق انجم** کو اس دشت کی سیاحی میں کافی وقت بیت چلا ہے... روزگارِ زندگی کے جھمیلوں سے گزرتے ہوئے اپنے اس شوق کو بخوبی وقت دیتے ہیں... ان کی ہر دفعہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایک نئے کاروباری نکتے کے ہمراہ اپنی کہانی لائیں... اس میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ قارئین بہتر کرسکتے ہیں... اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...

Scanned By: AAA-UL-MUSTAFA 0333-4585215

# بے دخل

محبت کرنے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں... مگر کچھ لوگ شاید ہر کام میں اپنی مرضی کو اولیت دیتے ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کی کہانی... وہ ہر صورت اپنی محبت کو حاصل کرنا چاہتا تھا...

پُراسرار انداز میں اپنے دل کی کلی کھلانے کا طریقۂ واردات......

اُس کے چلتے قدم رک گئے۔

وہ ساکت کھڑا رہا۔ اس کی توجہ اپنے عقب میں تھی۔ وہ کچھ سننے کی کوشش کررہا تھا۔ جب کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو وہ سرعت سے گھوما اور اپنے پیچھے ایسے دیکھا جیسے اس کا پختہ ارادہ ہو کہ اس کے پیچھے جو بھی ہوگا، وہ اسے دبوچ لے گا، مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور اچھی طرح سے تسلی کی کہ کہیں وہ بھاگ کر دائیں بائیں ایستادہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے تو نہیں چھپ گیا۔

سڑک سے سوسائٹی کے درمیان کچھ حصہ ویران سا تھا اور دائیں بائیں درخت تھے۔ جونہی وہ راستہ ختم ہوتا تھا آگے چند دکانیں شروع ہوجاتی تھیں اور سوسائٹی کا بڑا گیٹ دکھائی دینے لگتا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ راستہ ویران ہوجاتا اس لیے ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ شام ڈھلنے سے قبل اپنے گھر پہنچ جائے۔

اُس کا نام حسن تھا۔ وہ خوبصورت نوجوان تھا اور ایک فیکٹری میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب کرتا تھا۔ فیکٹری کا حساب کتاب وہی لکھتا تھا۔ اس کا چھوٹا سا گھر تھا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ حسن کا باپ اور اس کے دو بھائی اس جگہ سے بیس کلومیٹر دور ایک علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ اس کی ماں بھی اپنے شوہر اور دوسرے بچوں کے ساتھ رہتی تھی لیکن مہینے، دو مہینے کے بعد وہ حسن کے پاس بھی رہنے کے لیے آجاتی تھی کیونکہ حسن کو اس فیکٹری میں جاب اور اس سوسائٹی میں رہائش ملی تھی، روزانہ بیس کلومیٹر کا سفر کرنا مشکل تھا اس لیے وہ اسی مکان میں رہتا تھا اور چھٹی پر وہ اپنے اس علاقے میں بھی چلا جاتا تھا۔

ان دنوں بھی اس کی ماں آئی ہوئی تھی۔ اس کی ماں سادہ مزاج عورت تھی اور حسن سے بہت پیار کرتی تھی۔

حسن کو جب تسلی ہو گئی کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں ہے تو وہ چلنے لگا۔ ابھی اس نے کچھ ہی راستہ طے کیا تھا کہ اسے پھر اپنے عقب میں کسی کے چلنے کا احساس ہوا۔ اس بار وہ رکا نہیں بلکہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ راستہ تیزی سے طے ہونے لگا اور وہ ویران راستہ اختتام کے قریب تھا کہ حسن چلتے ہوئے یکدم گھوما اور اس کی متلاشی نگاہیں پھر کسی کو تلاش کرنے لگیں۔ اس بار بھی وہاں کوئی نہیں تھا۔

حسن کا دل دھڑکا اور وہ گھوم کر چلنے لگا۔ ویران راستہ ختم ہو گیا، چھوٹی سی مارکیٹ شروع ہو گئی، اس وقت وہاں رونق تھی وہ ان سب کو نظر انداز کرتا، اپنی دُھن میں مگن چلتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔

دروازے پر ہلکی دستک دی تو اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور وہ سلام کر کے اندر چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو اس کی ماں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہی پوچھا۔

’’کیا بات ہے، تم پریشان دکھائی دے رہے ہو؟ سب ٹھیک تو ہے؟ فیکٹری میں کوئی بات ہوئی تھی؟‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے۔‘‘

''پھر کیا بات ہے؟'' اس کی ماں کی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔
''آج کل میرے ساتھ کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔'' حسن نے سوچتے ہوئے بتایا۔
''کیا عجیب ہو رہا ہے؟'' اس کی ماں کے ماتھے پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔
''میں جب بھی اس ویران راستے سے گزرتا ہوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے پیچھے چل رہا ہو۔'' حسن بولا۔
''تمہارا وہم ہے...... میں بھی جانے کیا عجیب ہو رہا ہے۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔'' اس کی ماں نے سنتے ہی ہاتھ ایسے مارا جیسے وہ اپنی ناک پر بیٹھی مکھی اُڑا رہی ہو۔ جس بات کو جاننے کی تشویش تھی۔ وہ حسن کی بات سن کر یکدم معدوم ہو گئی۔
''یہ میرا وہم نہیں ہے ماں جی...... میں چند دنوں سے محسوس کر رہا ہوں۔'' حسن متانت سے بولا۔
اس کی ماں ہنسی۔ ''تم سمجھتے ہو کوئی جن بھوت تمہارے پیچھے ہے...... جن بھوت کہاں سے آ گیا......''
''میں کب کہہ رہا ہوں کہ کوئی جن بھوت میرے پیچھے ہے۔ کوئی ہے جو میرے پیچھے چلتا ہے جونہی میں مڑ کے دیکھتا ہوں، وہ بھاگ کر کہیں چھپ جاتا ہے۔ کوئی ہوتا ضرور ہے۔'' حسن نے کہا۔
''کھانا لے کر آؤں؟'' اس کی ماں نے ایسے پوچھا جیسے اسے اس کی بات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔
''ماں جی آپ میری بات کو نہیں سمجھیں گی...... اس لیے بہتر ہے آپ کھانا لے آئیں۔'' حسن نے بھی اس پر مزید بات کرنے سے اجتناب کرتے ہوئے چارپائی کی طرف کا رخ کر لیا۔
تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں کھانا لے آئی تھی اور کھانے کے دوران اس نے بتایا کہ وہ کل واپس جا رہی ہے۔
''کچھ دن اور رک جاتیں ماں جی؟'' حسن نے کہا۔
''میں پھر آ جاؤں گی۔'' اس کی ماں نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ حسن چپ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں اس کے پاس اس سے زیادہ دن نہیں رہ سکتی ہے کیونکہ اس کے آبائی گھر میں سبھی تھے اور رونق بھی خوب تھی۔
کھانا کھانے کے بعد حسن چہل قدمی کے لیے باہر نکل گیا۔ اس سوسائٹی میں ابھی مکمل آبادی نہیں ہوئی تھی۔ گھروں کے بیچ کئی پلاٹ خالی تھے۔ سڑکیں کشادہ اور دو بہت بڑے پارک اور ان کے قریب مارکیٹ بھی تھی۔
چہل قدمی تو ایک بہانہ تھا دراصل وہ روبی کے لیے باہر نکلتا تھا۔ اس کے قدم اس کے گھر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔
روبی کے والد بھی اسی فیکٹری میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے جہاں حسن کام کرتا تھا۔ دراصل اسے نوکری روبی کے والد نے ہی دلائی تھی اور روبی کے والد حسن کے والد آپس میں دوست تھے۔
حسن نے جب پہلی بار روبی کو دیکھا تھا تو وہ اُسی کا ہو کے رہ گیا۔ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے روبی کا چہرہ رہتا تھا اور رات گئے تک...... اس کی سوچوں میں مستغرق رہنے کی وجہ سے اس کی نیند آدھی سے بھی کم ہو گئی تھی۔ جب روبی اپنے گھر والوں کے ساتھ اسی محلے میں رہتی تھی جہاں حسن کے والدین کی رہائش تھی پھر جب روبی کے باپ کی ترقی ہو گئی اور انہوں نے اس سوسائٹی، جو اس فیکٹری کے مالکان نے خود بنائی تھی، میں رہائش دی تو سب سے زیادہ اداسی اور دکھ حسن کو ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اُڑ کر روبی کے پاس پہنچ جاتا۔
چند دن ہی گزرے تھے کہ روبی کے والد نے حسن کے والد سے رابطہ کر کے بتایا کہ اس کی فیکٹری میں جاب نکلی ہے، حسن کو وہ نوکری دلا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی باپ سے بھی زیادہ حسن پُرجوش ہو گیا۔ اسے اس فیکٹری میں نوکری مل گئی۔ روزانہ بیس کلومیٹر کا سفر کرنا مشکل تھا اس لیے روبی کے باپ کے کہنے پر حسن کو اسی سوسائٹی میں رہائش بھی مل گئی اور یہ بات حسن کے لیے سونے پر سہاگا تھی۔
حسن نے روبی کو کبھی اپنے دل کی بات نہیں بتائی تھی۔ جس طرح سے روبی اس کے ساتھ باتیں کرتی تھی...... مذاق کرتی اور کسی بھی کام کے لیے فون کر کے بلا لیتی تھی، حسن کی دانست میں روبی بھی اسے چاہتی ہے۔
کئی دنوں سے حسن اپنے دل کی بات روبی سے کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس سے بات کرے پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو حوصلہ دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ روبی دراصل اس انتظار میں ہے کب حسن اس سے بات کرتا ہے اور کب وہ بھی اپنے دل کی بات کہہ کر اس بات کو آگے بڑھاتی ہے۔
اب حسن فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ روبی سے اپنے دل کی

بات کہہ دے گا۔ وہ ٹہلتا ہوا روبی کے گھر کے باہر پہنچ گیا۔ کشادہ سڑکوں پر سناٹا تھا اور ہر گھر روشن تھا۔ حسن نے اپنی جیب سے اپنا پرانا موبائل فون نکال کر اس کی اسکرین روشن کی اور وقت دیکھ کر اس نے موبائل فون اپنی جیب میں ڈال لیا۔ حسن نے بیل دی تو تھوڑی دیر کے بعد اندر سے روبی کی امی کی آواز آئی۔ ''کون ہے......؟''

''آنٹی میں ہوں..... حسن۔'' اس نے جلدی سے بتایا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا تو روبی کی امی اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''شکر ہے تم وقت پر آ گئے ہو۔''

''خیریت تو ہے آنٹی؟'' حسن نے پوچھا۔

''تمہارے انکل کہیں گئے ہوئے ہیں اور ہمارا ٹی وی نہیں چل رہا ہے۔'' روبی کی امی نے اپنی پریشانی بتائی تو حسن مسکراتا ہوا اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ پیچھے ہی روبی بھی آ گئی۔ حسن نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تو اسے لگا جیسے دل کی دھڑکن میں کچھ تلاطم سا برپا ہوا ہو۔

روبی کی امی کا ٹی وی پرانا تھا اور اکثر بند ہو جاتا تھا۔ حسن اس پر دائیں بائیں کوشش کر کے کوئی نہ کوئی ٹوٹکا آزماتا تو وہ چل جاتا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے کبھی کوئی تار ہلایا تو کہیں سے اسے تھپتھپایا...... اور اس کی اسکرین روشن ہو گئی۔

''اچھا ہوا چل گیا......'' روبی کی امی ریموٹ پکڑ کر ایک طرف بیٹھتے ہوئے روبی سے بولی۔ ''روبی تم حسن کے لیے چائے بناؤ۔''

''شکریہ آنٹی میں چائے نہیں پیوں گا۔ میں تو ایسے ہی ٹہلتا ہوا ادھر آ گیا تھا۔ اب میں چلتا ہوں۔'' حسن جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے بیٹا اپنا خیال رکھنا۔'' روبی کی امی کی نگاہیں اپنے ڈرامے پر تھیں اور حسن کمرے سے باہر نکلا تو روبی پیچھے ہی تھی۔ گیٹ تک جاتے ہوئے حسن سوچ رہا تھا کہ روبی سے بات کرنے کا اس کے پاس بہترین موقع ہے۔ جونہی وہ گیٹ کے پاس پہنچا، وہ رکا اور روبی کی طرف گھومتے ہی بولا۔

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کیا ضروری بات کرنی ہے؟''

''میں جو بات کرنے والا ہوں، وہ سنجیدہ بات ہے۔'' حسن نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

''تم مجھ سے سنجیدہ بات کرو گے؟'' روبی نے اپنی ہنسی دبائی۔

''کیا تم کو یقین نہیں ہے کہ میں سنجیدہ بات نہیں کر سکتا؟'' حسن کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

روبی نے اپنی ہنسی روکی اور کوشش کی کہ وہ اپنے چہرے پر تھوڑی سی سنجیدگی لے آئے لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہی اور ہنستے ہوئے دوسری طرف گھوم گئی۔ حسن اس کی طرف متانت سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب روبی ہنس چکی تو وہ پھر حسن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''دراصل تمہارے منہ سے سنجیدہ بات سن کر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ اس سے پہلے تم نے کبھی میرے ساتھ ایسے بات نہیں کی نا......''

''روبی تھوڑی دیر کے لیے سنجیدہ ہو جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔'' حسن کے لہجے میں استدعا تھی۔

روبی نے اپنا گلا صاف کیا اور یکدم سنجیدہ ہو گئی۔ ''ہاں...... بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

حسن اس کی طرف دیکھتا رہا اب اس کے اندر بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر ایسے ہی گزری تو روبی نے کہا۔ ''اب کیا ہوا ہے...... تم مجھ سے سنجیدہ بات کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

''روبی...... میں تم کو پسند کرتا ہوں۔'' حسن نے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''مجھے کیوں پسند کرتے ہو؟'' روبی نے پوچھا۔

''تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور......'' ایک بار پھر حسن نے تیزی سے کہنا چاہا۔

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟'' روبی نے اس کی بات کاٹ دی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں تم سے میری شادی ہو جائے۔'' حسن نے اپنی بات مکمل کر دی۔

روبی کی حیرت دوچند ہو گئی۔ ''تم اتنے سنجیدہ ہو گئے ہو کہ میرے ساتھ شادی کا بھی سوچ چکے ہو؟''

''ہاں روبی...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' حسن نے اپنی بات دہرائی۔

روبی سوچنے لگی اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔''

''الجھن کیسی...... ہم دونوں کئی سالوں سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''

''ایک دوسرے کو جاننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم شادی کا سوچنے لگیں۔'' روبی نے کہا۔

''کیا میں نے غلط سوچا ہے؟''

''کسی کی سوچ پر کوئی پابندی تھوڑی لگا سکتا ہے اس لیے میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم نے غلط سوچا ہے، یا ٹھیک......'' روبی سوچتے ہوئے بولی۔

''تم کیا کہتی ہو؟''

''کس بارے میں؟'' روبی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں؟'' حسن اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

''میں کیا کہوں......؟ ابھی تم نے بات کی ہے اور ابھی میں کچھ کہہ دوں۔'' روبی بولی۔

''تم مجھے کل بتا دینا...... ہم کل بات کر لیں گے۔'' حسن نے جلدی سے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے......ہم کل بات کریں گے۔ کل بات کرنا مناسب رہے گا۔'' روبی نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

''میں کل کتنے بجے یہاں آجاؤں؟'' حسن نے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

''یہاں مت آنا...... کل چار بجے میری دوست نے مجھے چائے پر بلایا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں جو ریسٹورنٹ ہے اس نے وہاں بلایا ہے تم چار بجے اس جگہ آجانا۔''

''چار بجے تو میں آفس میں ہوتا ہوں۔ پانچ بجے چھٹی ہوتی ہے۔'' حسن سوچتے ہوئے بولا۔

''تم سوا پانچ تک آجانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' روبی کہہ کر مسکرائی۔

''تم واقعی میرا انتظار کرو گی؟'' روبی کی بات سن کر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایسے پوچھا جیسے کوئی بچہ اپنی من پسند چیز کے ملنے پر بے یقینی کی کیفیت میں چلا جاتا ہے۔

''ہاں میں تمہارا انتظار کروں گی......کل ملتے ہیں۔'' روبی نے کہہ کر گیٹ کھول دیا اور حسن مسکراتا ہوا دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا گیٹ سے باہر نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

حسن کو یقین تھا کہ روبی اسے مثبت جواب دے گی۔ یقیناً وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے یہ نہ کہتی کہ وہ اس کا انتظار کرے گی۔ حسن کی سرشاری بڑھتی جارہی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح ہی حسن کا بھائی ماں کو لینے آگیا۔ ناشتے کے بعد جب اس کی ماں اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ چلی گئی تو حسن اپنے آفس چلا گیا۔

حسن کے لیے وہ بڑا بے چین دن تھا۔ وہ آفس میں بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وقت ایک جگہ ہی تھم گیا ہو۔ بمشکل پونے چار ہوئے تو اس نے بہانہ بنا کر چھٹی لی اور سیدھا گھر چلا گیا۔

حسن جلدی سے تیار ہوا اور سوا چار بجے وہ ریسٹورنٹ پہنچ گیا جہاں اسے روبی نے بلایا تھا۔

روبی ایک میز پر اکیلی براجمان تھی۔ اس نے چہرے پر ہلکا سا میک اَپ کیا ہوا تھا جس سے اس کی خوبصورتی اور بھی دوچند ہوگئی تھی۔ حسن نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ اس کے قریب گیا تو روبی اسے دیکھتے ہی چونکی۔

''تم آگئے......؟'' روبی نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا اور رکا ہیں گھما کر اپنے دائیں بائیں بھی دیکھا۔

''آج آفس میں زیادہ کام نہیں تھا اس لیے میں جلدی چھٹی لے کر آگیا۔'' حسن نے بتاتے ہوئے کرسی کھینچ کر سیدھی کی اور روبی کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''آج تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔''

''تم کیا لو گے؟'' روبی نے جیسے اس کی بات کو نظرانداز کردیا ہو۔

''یہ مجھے تم بتاؤ گی۔ کیونکہ تم میری مہمان ہو۔'' حسن نے جلدی سے کہا۔

''کھانا پینا تو چلتا ہی رہے گا۔ کیوں نا ہم وہ بات کریں جو تم نے مجھ سے رات کی تھی۔'' روبی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

روبی کی بات سن کر حسن کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس کا دل دھڑکا اور اس کے اندر ایک بے کلی سی دوڑنے لگی۔

''تم نے کوئی فیصلہ کرلیا ہے؟'' حسن بولا۔

''میں فیصلہ کرچکی تھی۔'' روبی نے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' حسن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تم نے مجھ سے شادی کرنے کی بات کی تھی۔ تم مجھے بہت پسند کرتے ہو، اور میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہو؟''

''ہاں بالکل ایسا ہی ہے۔''

''جیسا تم نے سوچا ہے تمہاری سوچ کے مطابق ہوسکتا تو ہم ایک ہو جاتے۔'' روبی ایک دم سے بولی۔

''کیا مطلب......؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟'' روبی کی بات سن کر حسن یکدم چونکا۔

''حسن میں صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ جو تم نے سوچا ہے، ویسا نہیں ہوسکتا ہے۔'' روبی نے دوٹوک کہہ دیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہم بہت اچھے دوست ہیں اور ہمارے خاندانوں میں ایک خاص تعلق بھی ہے۔''

''وہ سب ٹھیک ہے مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے۔'' روبی کے چہرے پر قدرے ندامت تھی۔

''ایسا کیوں ممکن نہیں ہے؟'' حسن کا چہرہ اتر گیا اور اس کی مضطرب نظریں اس کے چہرے پر گھومنے لگیں۔

اسی وقت ایک خوش پوش نوجوان دونوں کے پاس آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی روبی اپنی جگہ سے اُٹھی تو اس کے چہرے پر جیسے رونق آ گئی ہو۔ اس نے جلدی سے اس نوجوان کو اپنی ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔ حسن کبھی اس نوجوان اور کبھی روبی کی طرف متحیر سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''حسن ان سے ملو...... یہ نوید ہیں۔ پپا کے ایک دوست ہیں ان کے بیٹے ہیں۔ ان کا اپنا کاروبار ہے اور تین ماہ پہلے ہی ہماری سوسائٹی میں آئے ہیں اور نوید یہ بھی پپا کے دوست کے بیٹے حسن ہیں...... یہ جاب کرتے ہیں۔'' روبی نے دونوں کا تعارف کرایا۔

حسن نے ایک بات محسوس کی تھی کہ جب وہ یہ بتا رہی تھی کہ نوید اپنا کاروبار کرتا ہے تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور بھی واضح ہو گئی تھی۔ جب اس نے یہ بتایا کہ حسن جاب کرتا ہے تو اس کے لہجے سے صاف عیاں تھا جیسے اس کی نظر میں جاب کی کوئی وقعت نہ ہو۔

نوید نے حسن سے ہاتھ ملایا تو حسن نے مریل سے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑ دیا۔

''حسن تم ابھی پوچھ رہے تھے کہ ہماری شادی کیوں نہیں ہوسکتی...... اس کی وجہ نوید ہے...... کیونکہ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور ان سے میری شادی کے لیے میرے گھر والے بھی راضی ہیں۔'' روبی نے پُرمسرت لہجے میں بتایا تو جیسے حسن کے سینے پر چھریاں چل گئی ہوں۔

''تو کیا یہ بھی تمہارا امیدوار ہے؟'' نوید نے ایک نظر حسن پر ڈال کر روبی سے مسکرا کر پوچھا۔

''رات ہی حسن نے اپنے پیار کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اسے یہاں بلا لیا کیونکہ ہم یہاں ملنے کا پہلے سے پروگرام بنا چکے تھے۔ میں نے سوچا کیوں نا جو بات بھی ہو، وہ تمہارے سامنے ہو جائے۔''

حسن کے تن بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ ''روبی...... تم مجھے ٹھکرا رہی ہو...... یہ تین ماہ پہلے تم سے ملا اور ہم دونوں سالوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور تم اس کی طرف مائل ہو گئیں۔''

''ایک دوسرے کو سالوں جاننے کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ اب شادی بھی اسی سے کرلو۔'' روبی نے فوراً جواب دیا۔

''روبی میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' حسن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نوید کو اپنے درمیان سے اُٹھا کر کیسے دور پھینک دے۔

''جو بات کرنا چاہتے ہو، یہیں کرلو نوید کے سامنے، ہم اُٹھ کر کہیں نہیں جائیں گے۔'' روبی بولی۔

''ہم اُٹھ کر نہیں جائیں گے۔ تم اسے کہو کہ یہ یہاں سے چلا جائے۔'' حسن نے حقارت سے نوید کی طرف دیکھا۔

نوید کے چہرے پر غصہ ابھر آیا تھا۔ اس سے پہلے روبی غصیلے انداز میں بولی۔ ''نوید کہیں نہیں جائے گا اور میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا اور اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''روبی تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' حسن نے کہا۔

''دیکھو مسٹر...... جو مجھے سننا تھا، وہ میں نے سن لیا۔ اور جتنا برداشت کرنا تھا، وہ بھی کرلیا اب ایک لفظ ایسا کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' نوید نے اپنی انگلی اس کی طرف کی اور آنکھیں نکال کر اُسے دیکھا۔

''تم کیا کرلو گے؟'' حسن کو بھی غصہ آ گیا۔

''کچھ بھی ایسا کر دوں گا کہ تم پچھتاؤ گے۔'' نوید کے لہجے میں کھلی دھمکی تھی اور اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔

''شاید تم مجھے جانتے نہیں ہو۔'' حسن نے اپنی آستین چڑھائی۔

''میں تم جیسے گھٹیا انسان کو جاننا بھی نہیں چاہتا۔'' نوید نے بھی پلٹ کر جواب دیا۔

حسن غصے سے اُٹھا۔ ''میرا خیال ہے تم مجھے اچھی طرح سے جان ہی لو تو بہتر ہے۔''

حسن کا ارادہ تھا کہ وہ نوید پر حملہ کر دے لیکن عین اس وقت روبی دونوں کے درمیان آ گئی اور اس نے غصے سے حسن سے کہا۔

''اب اگر تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو تمہیں کھڑے کھڑے میں پیٹ دوں گی۔ اتنے لوگوں میں ایک لڑکی سے مار کھاتے ہوئے تم اچھے نہیں لگو گے اس لیے بہتر ہے تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''روبی تم مجھ سے کہہ رہی ہو میں یہاں سے چلا جاؤں؟''

''ہاں تمہیں ہی کہہ رہی ہوں۔''

''تم مجھے موقع دو۔ میں تم سے علیحدگی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' ایک بار پھر حسن نے اپنا رویّہ نرم کر لیا تھا۔

اس بار نوید غصے سے کھڑا ہو گیا۔ ''تم جاتے ہو یا پھر میں تمہیں دروازے تک چھوڑ کر آؤں۔''

حسن نے اس کی طرف زہر آلود نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ اس جگہ موجود سبھی کی نگاہیں ان کی طرف مرکوز ہو چکی تھیں۔

''میں تم کو دیکھ لوں گا۔'' حسن دھیرے سے کہہ کر تیزی سے اٹھ کے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی نوید اور روبی اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''مجھے تو یہ پاگل لگ رہا ہے۔'' روبی نے سر جھٹکا۔

''چھوڑو اِن باتوں کو اور یہ بتاؤ کھانے کے لیے کیا منگواؤں؟'' نوید اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

''تم کچھ بھی منگوالو۔'' روبی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر جیسے اپنی محبت کے پھول اس پر نچھاور کر دیے ہوں۔

حسن اس جگہ سے باہر چلا تو گیا تھا لیکن وہ دروازے کے قریب کھڑا شیشے سے دیکھ رہا تھا کہ دونوں کیسے ایک دوسرے سے پیارے بھرے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

اس وقت حسن کے اختیار میں ہوتا تو وہ نوید کو گریبان سے پکڑ کر باہر لے آتا اور اس وقت تک اسے مارتا رہتا جب تک اس کی سانسوں کی لڑی ٹوٹ نہ جاتی مگر فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے غصے میں خار چھاتا ہوا وہ اس جگہ سے چلا گیا۔

☆☆☆

حسن کے لیے یہ سب ایسے ہی تھا جیسے اب موت اور زندگی کا معاملہ ہو گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کسی طرح سے روبی کے ساتھ اس کی اکیلے میں ملاقات ہو جائے۔ وہ اسے اچھی طرح سے سمجھائے گا تو وہ سمجھ جائے گی اور اس کے دل پر جو ایک بزنس مین کا خمار چڑھا ہوا ہے، وہ اتر جائے گا۔

رات کو حسن نے متعدد بار روبی کو کال کی لیکن اس نے ایک بار بھی اس کا فون نہیں اُٹھایا۔ اس ناکامی نے تو جیسے حسن کو پاگل کر دیا۔۔۔ وہ اسی وقت تیزی سے گھر سے باہر نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا روبی کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔

حسن کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ وہ دروازے کی طرف گیا اور جونہی اس نے دروازے پر ہاتھ مارنا چاہا تو ایک دم سے دروازہ کھلا اور روبی جو چہل قدمی کے لیے باہر نکل رہی تھی، وہ نمودار ہوئی۔ اپنے سامنے حسن کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے ایک لمحے میں اپنے عقب میں دیکھا اور دروازہ بند کر کے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''کیا بات ہے...... کیوں آئے ہو؟'' روبی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں ایسے پوچھا جیسے اسے اس کا اس وقت آنا بہت ہی ناگوار گزرا ہو۔

اپنے سامنے روبی کو دیکھ کر حسن کا غصہ ایک دم سے معدوم ہو گیا اور وہ مسکرایا۔ ''اچھا ہوا تم مل گئیں۔ میں نے تمہیں کتنی بار فون کیا اور تم نے ایک بار بھی میرا فون اٹینڈ نہیں کیا۔''

''مجھے اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ میں ہر کال اٹینڈ کرنے کے لیے دوسرے کام چھوڑ نہیں سکتی۔'' روبی نے منہ بنا کے کہا۔

''روبی میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔'' حسن بولا۔

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ میرے دروازے پر ایسی باتیں نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔'' روبی کا لہجہ دھیما تھا اور وہ دائیں بائیں بھی دیکھ رہی تھی۔ اردگرد کوئی بھی نہیں تھا۔ گلی سنسان تھی اور ہر گھر کا دروازہ بند تھا۔

''نوید تم کو خوش نہیں رکھ سکتا روبی۔'' حسن نے کہا۔

''تم نجومی ہو گئے ہو......؟ وہ مجھے خوش رکھ سکتا ہے یا نہیں یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ بہتر ہے تم اپنی یہ بکواس اپنے منہ میں دبا کر رکھو اور میرا راستہ چھوڑ دو، مجھے جانا ہے۔'' روبی کو اس کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا۔

''تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔'' حسن کے لہجے میں بھی تغیّر آ گیا۔

''تم بھی بُرا کر کے دیکھ لو...... دیکھ لیتے ہیں، کیا نتیجہ نکلتا ہے۔'' روبی نے کہہ کر سر جھٹکا اور ایک طرف سے نکل گئی۔

حسن اس کے پیچھے چلتا ہوا اس کے برابر میں پہنچ گیا۔

''روبی یقین کرو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے صرف اور صرف تم کو ہی چاہا ہے۔'' حسن نے اپنے چہرے پر بے چارگی سجائی۔

''میں نے تم سے کوئی عہد کیا تھا؟ تم کو کوئی دھوکا دیا ہے؟ ہماری محبت کے موضوع پر کوئی بات ہوئی تھی؟ جب ایسا کچھ نہیں ہوا تھا تو خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔'' روبی تیز تیز چلنے لگی۔

''کیا تم فیصلہ کر چکی ہو کہ تم نوید سے شادی کرو گی؟'' حسن ایک بار پھر سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں میں ہی نہیں میرے والدین بھی یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔'' روبی تیز تیز چلتے ہوئے بولی۔

''میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔''

''مت مانو...... تم کو مجبور کون کر رہا ہے۔'' روبی نے بے پروائی دکھائی۔

''میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''جو کرنا چاہتے ہو کر لو۔ ایک پاگل سے اچھائی کی امید کیسے رکھی جا سکتی ہے۔'' روبی کو غصہ آ گیا تھا لیکن اس نے اپنے لہجے پر قابو رکھا۔

حسن رک گیا اور روبی تیز تیز چلتی ہوئی اس سے آگے نکل گئی۔ حسن اسی جگہ ساکت روبی کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو مضبوطی سے بند کیا ہوا تھا۔ پھر وہ گھوما اور اپنے گھر کی طرف چلنے لگا۔

گھر پہنچ کر اس نے پوری قوت سے دروازہ بند کیا اور سامنے پڑا شیشے کا گلاس اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔

☆☆☆

آفس میں حسن ٹھیک سے کام نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کی سوچوں میں روبی چھائی ہوئی تھی۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اُٹھ کر چلا جائے۔ جیسے تیسے آفس ٹائم ختم ہوا تو وہ اپنی کرسی سے اُٹھا اور ابھی جانے ہی والا تھا کہ روبی کا باپ عقب سے بولا۔

''تم گھر جا رہے ہو؟''

حسن نے گھوم کر انہیں دیکھا اور جواب دینے سے پہلے اس کا دل چاہا کہ وہ روبی کے باپ سے اپنی بات کرے۔ جب روبی کے باپ نے دوبارہ اس سے وہی سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی گھر جا رہا ہوں۔''

روبی کا باپ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک کام سے جانا پڑ رہا ہے۔ تم یہ سامان گھر پر دے دینا۔''

حسن نے مریل سے انداز میں شاپنگ بیگ لیا اور جانے کے لیے گھوم گیا۔ روبی کا باپ بھی اس جگہ سے چلا گیا۔

حسن اپنے گھر تک پیدل ہی جاتا تھا۔ وہ روبی کے بارے میں سوچتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا اس سامان کے بہانے وہ ایک بار پھر روبی سے مل سکتا ہے۔ اس بار وہ اس سے اپنے سابقہ رویّے کی معافی بھی مانگے گا اور اسے مائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ نوید کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔

وہ چلتے ہوئے پھر اسی ویران سے راستے پر آ گیا۔ اس نے دیکھا اس سے آگے کوئی جا رہا تھا۔ اس نے جینز پہنی ہوئی تھی اور ہڈ سے اس نے اپنا سر چھپایا ہوا تھا۔ اس کی چال عجیب سی تھی اور وہ اس کے آگے آگے ایسے چل رہا تھا جیسے وہ جھوم رہا ہو۔

اچانک اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کیا تو اس کے ہاتھ میں مہنگا فون تھا۔ وہ اپنے فون کو اپنی جینز کی پچھلی جیب میں ڈال رہا تھا لیکن وہ شاید اپنے ہی خیال میں ایسا مست تھا کہ اسے پتا نہیں چلا اور اس کا موبائل اس کی جیب میں جانے کے بجائے نیچے گر گیا۔

حسن دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ جونہی اس نے دیکھا کہ اس کا موبائل فون نیچے گر گیا ہے، وہ تیزی سے آگے گیا اور فون اُٹھا کر جونہی وہ سیدھا ہوا تو متلاشی نظروں سے شخص دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔

ویران راستہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ حسن تیزی سے آگے بڑھا۔ حسن اسے دور تک تلاش کرتا رہا لیکن وہ ایسے غائب ہو گیا تھا جیسے اسے زمین کھا گئی ہو۔

حسن اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس نے روبی کے باپ کا دیا ہوا شاپنگ بیگ ایک طرف رکھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کو دیکھنے لگا۔ وہ مہنگا اسمارٹ فون تھا۔ اس نے اس کی اسکرین روشن کی تو اندر سم نہیں تھی۔

موبائل فون کو اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد اس نے اپنے پرانے موبائل فون سے سم نکال کر اس میں ڈال دی۔

حسن کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ ایسا قیمتی موبائل فون خریدنے کی اس کے اندر سکت نہیں تھی اور اسے وہ موبائل فون اچانک مل گیا تھا۔ پہلی بار حسن کے دل میں خیال آیا کہ اچھا ہوا وہ اسے کہیں نہیں ملا اب وہ اس موبائل فون کو اپنے پاس رکھے گا۔ جب وہ روبی کے گھر شاپنگ بیگ دینے جائے گا تو وہ اس موبائل فون کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا تاکہ روبی دیکھے تو وہ پوچھنے پر مجبور ہو جائے، اس نے ایسا قیمتی موبائل فون کیسے خریدا......؟

منہ ہاتھ دھونے کے بعد حسن نے ایک بار پھر موبائل فون اُٹھالیا اور اس کا کیمرا کھول کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس کا کیمرا اس شاپنگ بیگ پر رک گیا جو روبی کے باپ نے دیا تھا۔

حسن نے اس شاپنگ بیگ کی تصویر بنائی اور اس کا رزلٹ دیکھنے لگا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ایسا زبردست اور حیران کن رزلٹ......کمال ہے۔''

حسن خوش ہو گیا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد وہ تصویر ڈیلیٹ کر دی اور موبائل فون ایک طرف رکھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ حسن کو پتا ہی نہیں چلا اس کی آنکھ کب لگ گئی اور کب وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

حسن کو لگا جیسے کوئی دروازہ پیٹ رہا ہو۔ اس نے اپنی آنکھوں کو آہستہ آہستہ کھولا اور اپنے خالی دماغ میں سوچنے لگا واقعی کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا، یا نیند میں وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازے بجنے کی آواز پھر آنے لگی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے روبی کا باپ کھڑا تھا۔

''میں کب سے دروازہ پیٹ رہا ہوں کیا کر رہے تھے؟''

''سر میری آنکھ لگ گئی تھی۔'' حسن بولا۔

''میں نے تم سے کہا تھا بیگ گھر دے دینا اور تم نے گھر نہیں دیا۔ مجھے خود تمہاری طرف آنا پڑا۔ مجھے بیگ دے دو۔'' روبی کا باپ بولا۔

''سوری سر میری آنکھ لگ گئی تھی۔ آپ اندر آجائیں۔'' حسن نے دروازہ چھوڑا۔

''میں نے روبی کے لیے شاپنگ کی تھی اور مجھے گھر پر دکھانا تھا۔ اگر پسند آگئی تو ٹھیک اگر تبدیل کرنی پڑی تو مجھے اسی وقت دونوں کو ساتھ لے جانا ہوگا اس لیے مجھے جلدی سے وہ بیگ دے دو۔'' اس نے کہا۔

''میں ابھی لایا سر۔'' حسن کہہ کر جلدی سے اندر چلا گیا اور اس نے جس جگہ وہ بیگ رکھا تھا وہاں دیکھا تو وہ موجود نہیں تھا۔ سونے سے قبل اس نے وہ بیگ اسی جگہ رکھا تھا۔ حسن نے متلاشی نظروں سے کمرے میں دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس کی تلاش میں اس نے سب الماری اور سارا گھر ہی چھان مارا لیکن وہ بیگ نہیں ملا۔ حسن حیران تھا کہ وہ بیگ کہاں گیا؟

ابھی وہ دم بخود کھڑا سوچ رہا تھا کہ روبی کا باپ اندر آگیا۔ ''تم نے اتنی دیر لگا دی......کیا کر رہے ہو؟''

''انکل وہ شاپنگ بیگ مل نہیں رہا ہے۔'' حسن نے ڈرتے ہوئے بتایا۔

روبی کا باپ چونکا۔ ''شاپنگ بیگ نہیں مل رہا ہے؟ اتنا بڑا گھر تو نہیں ہے کہ ایک چیز رکھ کر بھول جائیں کہ کس جگہ رکھی تھی۔ تم نے کہیں بیگ راستے میں ہی تو نہیں گرا دیا تھا؟''

حسن سوچنے لگا۔ ''مجھے یاد ہے میں شاپنگ بیگ گھر لے کر آیا تھا۔ میں نے اسی جگہ رکھا تھا اور اب نہیں مل رہا ہے۔''

''دیکھو حسن...... مجھے شاپنگ بیگ چاہیے۔ میں گھر جا رہا ہوں جلدی سے شاپنگ بیگ لے کر میرے پیچھے ہی آجاؤ۔ میرے سامنے تمہارا جھوٹ اور بہانے بازی نہیں چلے گی۔''

روبی کا باپ اپنی بات دوٹوک کہہ کر چلا گیا۔ حسن نے ایک بار پھر شاپنگ بیگ کی تلاش شروع کی۔ جب وہ بیگ نہ

ملا تو وہ ایک جگہ بیٹھ گیا اور پھر روبی کے گھر چلا گیا۔

دروازہ روبی نے کھولا تو حسن نے اس کی طرف لٹکے ہوئے چہرے سے دیکھا۔ ''کہاں ہے بیگ؟'' روبی نے پوچھا۔

''وہ نہیں ملا۔'' حسن نے بتایا۔

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تم نے نوید کے لیے کی گئی خریداری دیکھی اور جل بھن گئے۔ تم نے وہ بیگ کہیں پھینک دیا ہے۔ تمہارے دل میں نوید کے لیے کدورت ہے......''

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''ایسی ہی بات ہے۔ میں پپا کو بتادیتی ہوں تم نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے۔'' روبی کہہ کر جانے لگی تو حسن نے روک لیا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میری بات کا یقین کرو، میں نے بیگ ایک طرف رکھا تھا اور وہاں سے وہ غائب ہو گیا۔''

''شاپنگ بیگ کو پاؤں لگے ہوئے تھے اس لیے وہ واپس اسی جگہ چلا گیا جہاں سے اسے خریدا تھا۔ وہ اپنے مالک کا بہت خیر خواہ ہے۔ اسی طرح واپس جا کر وہ ان کو ڈھیروں منافع دیتا ہے۔''

''میں دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔''

''اب یہاں آؤ تو شاپنگ بیگ لے کر آنا۔ کوئی بہانہ مت کرنا۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' روبی نے اسے دھمکی دی۔

''میں اب بھی کوئی بہانہ نہیں کر رہا ہوں۔ تم میری بات کا یقین نہیں کر رہی ہو۔'' حسن بولا۔

''مجھے تم پر یقین نہیں ہے۔''

''تم کو تو میری محبت پر بھی یقین نہیں ہے اسی لیے تم نے مجھے جھٹلا کر نوید کو اپنا لیا ہے۔''

''اب اگر تم نے مجھ سے دوبارہ یہ محبت والی بات کی تو میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔'' روبی کو زیادہ ہی غصہ آ گیا۔ وہ حسن کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ ابھی اس کا بُرا حال کر دے گی۔

روبی کے چہرے پر اتنی نفرت دیکھ کر حسن اسی وقت پلٹ گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا گھر پہنچا اور ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک عجیب خیال نے اسے چونکا دیا۔

اسے خیال آیا کہ اس موبائل فون کے کیمرے سے اس نے شاپنگ بیگ کی تصویر بنائی تھی اور پھر ڈیلیٹ کر دی تھی اور اس کے بعد وہ شاپنگ بیگ نہیں ملا تھا۔ ایک عجیب سا خیال تھا...... عجیب سے وہم نے اس کی سوچوں کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔

حسن نے موبائل فون اُٹھایا اور اس کا کیمرا آن کر کے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اس نے اپنی ایک شرٹ اُٹھا کر فرش پر رکھی اور اس کی تصویر کھینچ کر دیکھی اور اس کے بعد اس نے تصویر ڈیلیٹ کر دی...... ایسا کرنے کے بعد حسن نے وہ شرٹ اُٹھائی اور سامنے لٹکا دی۔

وہ اسی کمرے میں ٹہلتا رہا اور بار بار اس شرٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ شرٹ اسی جگہ لٹکی ہوئی تھی۔ اچانک دروازے پر بیل ہوئی تو وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

دروازہ کھولا تو سامنے روبی کھڑی تھی۔ وہ حسن کو دیکھتے ہی بولی۔ ''پپا کا غصہ اس وقت آسمان کو چھو رہا ہے۔ وہ خود آنا چاہ رہے تھے لیکن میں نے ان کو روک دیا۔ وہ تمہاری اس حرکت پر تم کو نوکری سے بھی نکال سکتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھے وہ شاپنگ بیگ دے دو۔''

''میری بات کا یقین کرو، میں نے واپس آ کر بھی سارا گھر چھان مارا تھا لیکن وہ شاپنگ بیگ نہیں ملا......'' حسن نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''کہاں پھینکا ہے وہ شاپنگ بیگ؟'' روبی کو اس کی بات کا بالکل بھی یقین نہیں تھا۔

''میں نے اُسے کہیں نہیں پھینکا ہے۔''

روبی اندر چلی گئی اور دائیں بائیں متلاشی نظروں سے دیکھتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے ہی حسن بھی تھا۔

''یہ اچھا ہے...... تم خود سارا گھر دیکھ لو...... ایک ایک چیز کی تلاشی لے لو۔ میں ایک طرف بیٹھ جاتا ہوں۔''

''جس چیز کو تم کہیں باہر پھینک آئے ہو وہ اس گھر میں کہاں ملے گی؟'' روبی چلائی۔

''میں نے اسے کہیں نہیں پھینکا......'' حسن بات کر رہا تھا اور اس کی نگاہ اس طرف چلی گئی جہاں اس نے اپنی شرٹ لٹکائی تھی اور اسے حیرت کا زبردست جھٹکا لگا...... اس جگہ سے شرٹ غائب تھی۔

''او خدایا......'' حسن کے منہ سے نکلا اور ساتھ ہی اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ شرٹ اس نے اسی جگہ لٹکائی تھی اور اب نہیں تھی۔ اس نے سوچا۔ اس کا مطلب ہے اس موبائل کے کیمرے سے جو چیز ڈیلیٹ کی جائے، وہ زندگی سے ہی ڈیلیٹ ہو جاتی ہے...... یہ کیسا معاملہ ہے...... جو ناقابلِ یقین ہے......

''دیکھ کیا رہے ہو......؟'' روبی نے اسے چونکایا۔

''روبی تم ایک بات بتاؤ گی۔'' اسی لمحے اس کے دماغ میں ایک اور خیال آیا اور اس نے روبی سے پوچھا۔

''اب کیا پوچھنا ہے؟'' روبی جھنجلائی۔

''اگر نوید تمہاری زندگی سے چلا جائے تو تم مجھ سے شادی کرلوگی۔'' حسن نے ایک دم پوچھا۔

اس کا سوال سن کر روبی نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نوید کو جان سے مارنے کا سوچ رہے ہو؟''

''میں ایسا نہیں کرسکتا اور نہ میں ایسا سوچ رہا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری زندگی میں نوید نہ آتا تو ہم ضرور ایک ہوجاتے۔''

''ہاں ایسا ہوجاتا......تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔'' روبی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ان باتوں کے سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔''

''روبی میں ویسا ہی شاپنگ بیگ خرید دیتا ہوں بلکہ تم انکل سے پوچھو کتنے کی خریداری تھی اتنے مجھ سے پیسے لے لو۔ میں نے وہ شاپنگ بیگ کہیں پھینکا نہیں ہے۔''

''تم پیسے دوگے؟''

''ہاں میں پیسے دوں گا۔'' حسن نے جلدی سے اپنا پرس نکالا اس میں سے پانچ ہزار روپے...... نکال کر اس نے روبی کے سامنے رکھ دیے۔ ''انکل سے پوچھ لو...... اس سے زیادہ کی خریداری تھی تو میں سیلری سے کٹوادوں گا۔''

''میں یہ بات پپا کو بتادوں گی اور یہ بھی کہوں گی آئندہ اس پر کبھی بھروسا نہ کرنا۔'' روبی کہہ کر جانے لگی تو حسن جلدی سے اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''میں ایسا نہیں ہوں کہ مجھ پر بھروسا نہ کیا جائے۔ روبی میں نے تم سے جو غصے میں کہا، اس کی معافی مانگتا ہوں اور میرا دل کہتا ہے کہ ہم ہی ایک ہوں گے۔ تمہاری زندگی میں، میں ہی آؤں گا۔ نوید نہیں آئے گا۔''

''تم پاگل ہوچکے ہو۔'' روبی نے بے پروائی سے ہاتھ جھٹکا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''میرا یقین ہے کہ ہم ہی ایک ہوں گے۔ میری محبت مجھے مل کے رہے گی۔'' حسن نے کہا۔

روبی دروازے کے پاس جاکر پلٹی۔ ''کوئی معجزہ نہیں ہوگا اس لیے ایسی خوش فہمیوں میں زندہ رہنا چھوڑ دو۔''

''کچھ تو ایسا ہوگا کہ ہم فنی خوشی ایک ہوجائیں گے۔'' حسن کے لہجے میں کوئی بات پوشیدہ تھی۔

''تم لاعلاج ہو۔'' روبی کہہ کر باہر چلی گئی۔

حسن نے اسی وقت دروازہ بند کیا اور موبائل فون کا کیمرا آن کرکے اپنے پرانے جوتوں کی تصویر کھینچی اور انہیں ایک طرف رکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ باہر جاکر اس نے وہ تصویر بھی ڈیلیٹ کردی۔ تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد جب وہ کمرے میں واپس آیا تو حیرت کا جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ اس جگہ جوتے نہیں تھے۔

وہ موبائل فون پُراسرار تھا۔ اس کے اندر عجیب بات تھی۔ حسن نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اب نوید کی تصویر بنائے گا اور پھر ڈیلیٹ کردے گا۔ اس کے بعد نوید بھی غائب ہوجائے گا۔

یہ سوچتے ہی حسن کے چہرے کی مسکراہٹ بھیانک ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے سرخ رنگ بھر گیا تھا۔

☆☆☆

حسن چاہتا تھا کہ وہ نوید سے ملاقات کرکے اس سے اپنے رویے کی معافی مانگے اور پھر اس خوشی کے ماحول میں اس کے ساتھ ایک تصویر بنائے اور تصویر ڈیلیٹ کرکے ہمیشہ کے لیے نوید کو بھی زندگی سے بے دخل کردے۔

حسن نے پہلے تو کوشش کرکے یہ معلوم کیا کہ نوید کا دفتر کس جگہ ہے۔ اس کے بعد اس نے اس کے آنے جانے کے اوقات معلوم کیے اور دوسرے دن اس نے اپنے آفس سے چھٹی لے لی۔

لنچ بریک پر نوید کے پاس گپ شپ کے لیے وقت ہوتا تھا۔ حسن اس وقت اس کے آفس میں پہنچ گیا۔ وہ ابھی عمارت کے اندر داخل ہورہا تھا اور عین اسی وقت نوید باہر نکل رہا تھا۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا تو نوید اُسے دیکھتے ہی رک گیا۔

''کیسے آئے ہو؟'' نوید نے رک کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی اور آنکھوں میں غصہ عیاں تھا۔

حسن مسکرایا۔ ''آپ سے ملنے آیا ہوں۔''

''مجھ سے کیوں ملنے آئے ہو؟''

''کیا ہم بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟''

''اوہ...... بات کرنے آئے ہو۔ اس کا مطلب ہے لڑائی کے موڈ میں نہیں ہو۔'' نوید نے کہا۔

''میں بالکل لڑنے نہیں آیا بلکہ اپنے اُس دن کے رویے

کی معافی مانگنے آیا ہوں۔'' حسن نے شائستہ لہجہ اپنایا ہوا تھا۔
ایک لمحہ سوچنے کے بعد نوید بولا۔ ''لنچ کرنے جارہا ہوں۔ اگر ساتھ لنچ کرنا چاہتے ہو میرے ساتھ آجاؤ۔ وہ سامنے سڑک پار کر کے ریسٹورنٹ ہے۔''
''ایک شرط پر چلوں گا۔''
''کیا شرط ہے؟''
''لنچ میری طرف سے ہوگا۔''
''اس بار تو نہیں ہاں اگلی بار تم کھلا دینا۔'' نوید بھی مسکرایا۔ دونوں ریسٹورنٹ کی طرف چلے گئے جو سڑک عبور کرنے کے بعد دوسری طرف تھا۔
دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ نوید نے کھانے کا آرڈر دیا تو حسن نے کہا۔ ''مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں غلط تھا۔ کئی دن دل ملامت کرتا رہا اور آج ہمت کر کے آیا ہوں۔ میں اس دن کے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔''
''چھوڑو اِن باتوں کو جو ہوا سو ہوا۔'' نوید بے پروائی سے بولا۔
''ایسے نہیں...... آپ مجھے معاف کر دیں اور میرے ساتھ صلح بھی کرلیں۔'' حسن نے کہا۔
''میری صلح ہی ہے۔ اور صلح کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ تم میرے ساتھ کھانا کھانے والے ہو۔'' وہ مسکرایا۔
''تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔''
''ساری باتیں ختم اب تم کوئی اور بات کرو۔'' نوید نے کہا۔
''بہت شکریہ...... تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اب میرے دل کو سکون پہنچا ہے۔ اس موقع پر ایک تصویر ہو جائے۔'' حسن نے جلدی سے موبائل فون نکالا۔
''تصویر کس خوشی میں؟''
''نئی دوستی کی ابتدا اور تم نے جو مجھے معافی دی ہے اس کی یادگار کے طور پر ایک تصویر تو بنتی ہے۔'' حسن نے کیمرے کا رخ اس کی طرف کیا۔
''پھر ایسے تصویر نہیں بنے گی۔ ایک ساتھ سیلفی ہوگی۔'' نوید خوش دلی سے بولا۔
حسن نے سوچا اور پھر مسکرا کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور دونوں کھڑے ہوئے۔ حسن نے اس کے کندھے پر اپنا بازو رکھا اور ایک ساتھ دو تصویریں بنالیں۔
اس کے بعد کھانا آ گیا۔ دونوں کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرنے لگے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد حسن نے آئس کریم منگوالی۔ اس دوران ... دونوں کے بیچ باتیں بھی ہوتی رہیں اور دونوں ہنستے بھی رہے۔
''ہم کو تو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ تم تو اچھے دلچسپ انسان ہو۔'' نوید نے کہا۔
''میں بھی ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔''
''اچھا...... آج اتنا ہی۔ میری ایک اہم میٹنگ ہے مجھے اجازت دو پھر ملاقات ہوگی۔'' نوید نے اُٹھ کر مصافحہ کیا اور وہ چلا گیا۔
حسن نے اسی وقت تصویر نکالی اور اسے دیکھنے لگا۔ دونوں کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ حسن ایک ہاتھ سے تصویر لے رہا تھا اور دوسرا بازو اس کا نوید کے کندھے پر تھا۔
حسن نے اپنی اور نوید کی تصویر الگ کی اور اپنی تصویر سے نوید کی تصویر الگ کرنے کے بعد وہ اسے مسلسل دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ اس کی انگلی ڈیلیٹ کے بٹن پر تھی۔ حسن کا چہرہ خوفناک ہو چکا تھا۔
اچانک حسن نے فی الحال نوید کی تصویر ڈیلیٹ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور سوچا وہ کچھ دیر کے بعد تصویر ڈیلیٹ کرے گا اور اس کے بعد وہ اس کے آفس میں جا کر تسلی کرے گا کہ وہ روبی کی زندگی سے بھی بے دخل ہو چکا ہے۔
یہ سوچتے ہوئے وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلا اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کو مسکرا کر دیکھا اور جونہی وہ سڑک عبور کرنے لگا ایک تیز رفتار گاڑی آئی اور اس سے قبل کہ وہ حسن سے ٹکراتی اور اسے اُٹھا کر دور پھینک دیتی، وہ ایک دم پیچھے ہوا اور ساتھ ہی اس کا پیر پھسلا وہ سڑک پر ایسے گرا جیسے اسے کسی نے اُٹھا کر پھینک دیا ہو۔ وہ جس انداز میں گرا تھا، اس کا وہ بازو سیدھا ہو گیا تھا جس میں موبائل فون تھا اُسی وقت ایک تیز رفتار سواریوں سے بھری ویگن آئی اور اس کے بازو کے اوپر سے گزر گئی۔ حسن کی چیخیں بلند ہوگئیں۔ اس کا بازو اس کے جسم سے کٹ گیا تھا اور موبائل اس کے ہاتھ سے نکل کر سڑک پر پھسلتا ہوا سڑک کے کنارے پر جنگلا لگے نالے میں جا گرا۔
حسن کا وہی بازو اس کے جسم سے الگ ہو گیا تھا جو اس نے سیلفی بناتے وقت نوید کے کندھے پر رکھا تھا اور جب اس نے اپنی اور نوید کی تصویر الگ الگ کی تھی تو اس کا بازو تصویر سے کٹ کر نوید کے کندھے پر ہی رہ گیا تھا۔
حسن کی چیخیں بلند ہوتی جارہی تھیں اور پھر وہ تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

◆◆◆

**اے-آر-راجپوت** کافی عرصے سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ چھوٹی... بڑی ہر طرح کی کہانیاں لکھتے ہیں... اپنے نام کے ساتھ قلمی نام سے بھی اپنا ہنر آزماتے ہیں... اور خوب لکھتے ہیں... شہری زندگی کے ساتھ دیہی اور اندرون سندھ کے ماحول کو بہت قریب سے دیکھا ہوا ہے... اس لیے ان کی کہانیوں میں موضوعات کی کوئی کمی نظر نہیں آتی... اپنے مشاہدے اور تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تحریروں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ جے۔ڈی۔پی سے ان کی وابستگی اب پرانی ہو چکی ہے...

# منصوبہ باز

سراغرسی معمولی کام نہیں... بلکہ اپنی ذہانت کا غیر معمولی احساس ہی آگے قدم بڑھانے پر اکساتا ہے... ہر بیان کا تجزیہ کرنا... اور ہر شہادت کو پرکھنا کسی بھی سراغ رساں کی بنیادی خوبی کہلاتی ہے... ایک ایسے ہی پولیس افیسر کا قصہ... ایک کیس نے اس کی الجھنوں کو بڑھا دیا تھا... ایک نوجوان کی زندگی کے معاملات روزبروز الجھتے ہی جا رہے تھے... یہاں تک کہ اسے دنیا قاتل کے روپ میں دیکھ رہی تھی...

*ایک منصوبہ باز کی عیاریاں اور ایک پولیس افسر کی چالاکیاں دونوں عروج پر تھیں*

سرد اور ٹھٹھرتی رات کے سناٹوں میں قریب کسی اُلّو کی اسرار بھری آواز... نے اس پُراسرار سائے کو لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا کر رکھ دیا جو ایک جانب سے اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ اور چست لباس میں ملفوف تھا۔

شہر کے پُرسکون علاقے، جسے نواحی تو نہیں کہا جاسکتا تھا، البتہ قدرے مضافات میں وہ دو ہزار مربع گز پر بنی عالیشان کوٹھی کسی نواب کی ملکیت کا ہی تصور دیتی تھی۔ یہ "نواب محل" کے نام سے ہی موسوم بھی تھی۔

اس میں دورِ جدید کی تقریباً ہر سہولت فراہم کرنے کی

کوشش کی گئی تھی۔ کھلے اور ہوادار کمرے، برآمدے، وسیع اور پُر بہار باغ، ہرا بھرا لان...... یوں یہ سب کچھ ایک بلند اور مضبوط چہار دیواری میں محفوظ تھا۔ یہاں آنے جانے کے لیے دو راستے تھے۔ ایک تو بیرونی صدر دروازہ یا گیٹ کہہ لیں، جو کوٹھی کے سامنے مین روڈ پر واقع تھا، جبکہ ایک نسبتاً چھوٹا دروازہ کوٹھی کے عقبی حصے میں ایک سائڈ اسٹریٹ پر کھلتا تھا۔ یہ دروازہ عام طور پر ملازموں کی آمدورفت کے لیے مستعمل رہتا تھا، جو دن میں تو کھلا رہتا تھا البتہ سرِ شام بند کر دیا جاتا تھا۔

کوٹھی کے اطراف میں بھی کچھ فاصلوں پر بنگلے بنے ہوئے تھے۔ یہاں زیادہ تر کاروباری طبقہ یا جدی پشتی رئیس خاندانوں سے ہی تعلق رکھنے والے رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس علاقے کو لوگوں نے "رئیس سوسائٹی" جیسا خودساختہ نام دے رکھا تھا۔

ایک پختہ سڑک کہیں سے سیدھی اور کہیں عمودی ہو کے ان کے درمیان سے گزرتی اور تقریباً دس کلومیٹر بعد وہ مین روڈ سے جا کر مل جاتی تھی۔

اس وقت رات کے ایک بجے کا عمل تھا۔ آخر نومبر کی سرد راتیں تھیں۔ ہر سو گہرا سناٹا طاری تھا اور جنگل کی طرف ہلکی دُھند کا احساس ہوتا تھا۔

وہ پُراسرار سایہ انہی ٹھٹھرتے اندھیاروں سے اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ وہ چوروں کے سے انداز میں نواب محل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں پھرتی اور تیزی تھی۔

پُراسرار سائے کی حرکات وسکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نواب محل کے اندرونی و بیرونی جغرافیہ سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اسی انداز میں چلتا ہوا کوٹھی کی جنوب مشرقی دیوار کی طرف چلا آیا جہاں نعمان کی خواب گاہ کی کھڑکی تھی۔

سایہ یہاں آ کر رک گیا۔ ایک نظر گردوپیش پر ڈالی۔ اس کے بعد اپنی ریڈیم ڈائل والی رسٹ واچ پر......

اب رات کے دو بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ اسے یہاں ٹھہرے ہوئے لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹا بیت چکا تھا۔ پھر وہ وہاں سے چلا اور...... اسی طرح چھپتا چھپاتا ہوا عقبی سمت میں

آ گیا۔ یہاں بھی اس نے نصف گھنٹا گزارا...... وہ بار بار رسٹ واچ میں وقت دیکھ لیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی پُراسرار واقعے کا 'وقت' کے تعین سے بہت گہرا تعلق رہا ہو۔

اسی طرح اس نے کوئی مزید آدھا گھنٹا کوٹھی کا طواف کیا اور پھر پہلے والے مقام پر آ کر رک گیا، جہاں نعمان کی خواب گاہ تھی۔ اس دوران اس نے کوشش چاہی تھی کہ وہ کوٹھی کے کسی چوکیدار کی نظروں میں نہ آنے پائے۔

اب اس کے انداز سے تھکن تو جھلکنے لگی تھی مگر اس کا ذہن ویسا ہی تازہ دم تھا۔ اس نے ایک بار پھر وقت دیکھا پھر اپنے ہونٹ بھینچے۔ یوں وہ پو پھٹنے تک اسی جگہ کھڑا رہا، اس کے بعد وہ پلٹ گیا۔

اب اس کے انداز میں تیزی تھی۔ کچھ دور اس نے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے قریب اپنی پرانے ماڈل کی کار کھڑی کر رکھی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر اس نے چند منٹوں میں ہی اپنے سیاہ چست لباس سے چھٹکارا پایا، عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر پھینکا اور تھکے تھکے انداز میں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر براجمان ہو گیا۔

وہ ایک تیس پینتیس سال کا خوبرو جوان تھا۔ رنگ گندمی تھا، بال قدرے گھنگھریالے اور آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ قد و قامت مناسب تھا۔ یہ محکمہ کیرائی کا جواں سال انسپکٹر شاہد علی تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے آج اسے تیسرا دن تھا۔

وہ چند ثانیے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''اگر آج بیگم شاہانہ کا فون آیا تو کیا مجھے سمجھ لینا چاہیے کہ نعمان واقعی پاگل اور نفسیاتی مریض ہے؟''

پھر جیسے اس نے خود ہی جواب دیا۔ ''شاید نہیں...... یا پھر شاید ہاں......''

وہ اُلجھ گیا اور پھر اس نے اگنیشن سوئچ میں لگی چابی گھما دی۔ کار کا انجن ہلکی غراہٹ سے...... بیدار ہوا اور دوسرے ہی لمحے وہ حرکت کرتی جنگل سے نکل کر لنک روڈ کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

شہر پہنچنے میں اسے پندرہ بیس منٹ ہی لگے تھے۔ اپنی دو کمروں والی رہائش گاہ پہنچ کر اس نے اپنے اسسٹنٹ صفدر کو ..... سیل فون پر ایک میسج ٹائپ کر کے سینڈ کیا۔ اس کے بعد بستر پر گرتے ہی سو گیا۔

وہ یہاں تنہا رہتا تھا۔ ایک باورچی تھا۔ وہی سارے کام بجالانے کا ذمے دار بھی۔ دنیا میں اس کا واحد رشتہ شائلہ سے تھا جو اس کی بڑی بہن تھی اور اس کی شادی کے لیے فکرمند بھی رہتی تھی مگر شاہد اس فکر سے آزاد رہنا چاہتا تھا اور اپنی شادی کے معاملے کو ٹالتا آ رہا تھا۔ بہن شائلہ بھی اسی شہر میں اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔

اگلے دن وہ دیر تک سوتا رہا۔ جاگا تو سب سے پہلے اس نے اپنے سیل پر نظر ڈالی۔ صفدر کا ایس ایم ایس آیا ہوا تھا، وہ اس نے اوپن کر کے پڑھا تو اس کی بھویں پُرسوچ انداز میں سکڑ گئیں۔ صفدر نے مختصراً لکھا تھا۔

''سر! آج بیگم شاہانہ کا فون آیا تھا۔''

''ہمم...... یہ تو واقعی ایک ڈراما ہی لگ رہا ہے جس نے پچھلے کئی دنوں سے بلاوجہ کی سنسنی پھیلا رکھی تھی۔'' ''چلو شاہد میاں! دیکھتے ہیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔''

وہ زیرِلب بڑبڑایا۔ اس کے بعد سیل فون ایک طرف رکھنے کے بعد وہ ہیڈ کوارٹر جانے کی تیاری کرنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

یہ اسی شب کی صبح کا ذکر ہے۔ نواب محل میں صبح تڑکے ہی شور مچ گیا۔ نعمان چیخیں مارتا ہوا اپنی خواب گاہ سے نکلا اور کھلے لاؤنج کی طرف دوڑا...... وہاں وہ...... نوشابہ سے ٹکرا گیا، اگر نعمان دُبلا پتلا اور کمزور نہ ہوتا اور نوشابہ بھرے بھرے بدن کی ایک صحت مند عورت نہ ہوتی تو یقیناً وہ اس سے ٹکرا کر چیخ مار کے گر ہی پڑتی، اب ظاہر ہے ہوا اس کے برعکس ہی تھا۔

نوشابہ سے ٹکرا کر نعمان چیخا تو نہیں البتہ گرنے ضرور لگا تھا لیکن نوشابہ نے اسے بڑھ کر سنبھال لیا۔ ورنہ وہ لاؤنج میں سجے فرنیچر سے ٹکرا کر زخمی بھی ہو سکتا تھا۔

نعمان کو سنبھالتے ہوئے اگرچہ نوشابہ نے کچھ شرم بھی محسوس کی تھی مگر مجبور تھی، کیونکہ نعمان ایک مالک زادہ تھا اور وہ ملازمہ...... اسے چوٹ لگ جاتی تو مالکن اس کے بُری طرح لتے لے ڈالتی۔ وہ جانتی تھی کہ نعمان، بیگم شاہانہ کا کس قدر لاڈلا بیٹا تھا۔

''سنبھالیے خود کو...... کیا ہوا ہے آخر......؟'' نوشابہ کچھ فکرمندی اور کچھ بیزاری سے بولی تھی، لیکن نعمان کا چہرہ فق پڑا تھا۔ آنکھوں سے خوف مترشح تھا۔

لاڈلے بیٹے کی چیخ و پکار سن کر ایک ادھیڑ عمر خاتون بھاری بھرکم پوشاک میں نمودار ہوئیں اور ''ہائے میرے

لعل......!'' کہتی ہوئی نعمان کی سمت بڑھیں۔

یہ بیگم شاہانہ تھیں۔ اپنے نام کی طرح شاہانہ مزاج اور...... اسی رنگ ڈھنگ کی مالک...... بھاری بھرکم جسم، سروقامت، صحت مند اور بارعب شخصیت کی حامل، اس خاتون نے سلیپنگ سوٹ بھی بڑا بیش قیمت پہن رکھا تھا اور وہ بیٹے کی چیخ سن کر اسی لباس میں اپنی خواب گاہ سے نکل آئی تھیں۔

مالکن کو دیکھتے ہی ملازمہ نوشابہ نے فوراً نعمان کو چھوڑ دیا۔ وہ سیدھا ماں کی طرف بڑھ گیا اور ان سے لپٹ کر کسی خزاں رسیدہ پتّے کے مانند کانپنے لگا۔

''ممّا...... مما......! آ...... آج پھر...... وہ...... وہی...... خونی قاتل...... میری جان......'' نعمان خوف سے لرزتے لہجے میں کہتے کہتے رک گیا۔ مارے دہشت کے اس سے آگے بولا ہی نہیں گیا۔

''نوشابہ! تم کیا کھڑی منہ تک رہی ہو، فوراً دبیر کے ساتھ جا کر اس منحوس آدمی کو تلاش کرو اور باہر مالی اور چوکیدار کو بھی مطلع کرو جلدی......'' بیگم شاہانہ نے حکم صادر کیا۔

نوشابہ ''جی مالکن!'' کہتی ہوئی بھاگی۔

''ممی ڈیڈی بچہ......''

اچانک عقب سے ایک طنزیہ آواز ابھری...... بیگم شاہانہ نے نعمان کو سنبھالا دیتے ہوئے نہایت برہمی کے ساتھ گردن موڑ کے پیچھے دیکھا۔

وہاں نیلی کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر گہرے طنز کے آثار تھے۔ وہ نعمان کی بڑی بہن اور بیگم شاہانہ کی بیٹی تھی۔

اپنے بھائی کے بارے میں یہ طنزیہ فقرہ چست کرنے اور ماں کی پُرطیش نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہی وہ ڈائننگ ٹیبل والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد صورتِ حالات معمول پر آ گئی۔ خاندان کے سارے ہی افراد ناشتے کی میز پر موجود تھے، حالانکہ یہ موقع ایسا نہ تھا کہ سب کچھ اتنی جلد معمول پر آ جاتا لیکن ایسے واقعات نعمان کے ساتھ گزشتہ کئی دنوں سے اس تواتر کے ساتھ پیش آتے رہے تھے کہ معمول ہی بن کر رہ گئے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی توجیہہ ابھی تک کوئی پیش نہ کر سکا تھا اور سب نے ان واقعات کو نعمان کی نفسیاتی اور حد سے زیادہ وہم کرنے کی بیماری پر محمول کیا تھا۔ اس ڈر سے پولیس کو بھی رپورٹ نہ کی جاتی کہ کہیں وہ نعمان کو پاگل خانے نہ بھجوا دیں۔

بہرکیف ناشتے کی میز پر اس وقت گھر کی سربراہ بیگم شاہانہ، ان کی بیٹی نیلی، اس کا شوہر سلیم، نور بانو اور اس کا منگیتر نعمان موجود تھے۔

بیگم شاہانہ کے شوہر سعید احمد کا پانچ برس ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔ وہ ایک کاروباری اور سرمایہ دار آدمی تھے۔ ملک کی کئی بڑی کمپنیوں اور تجارتی اداروں میں انہوں نے سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔

اس عالیشان کوٹھی کے علاوہ شہر میں اور بھی انہوں نے پراپرٹیز بنا رکھی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کا بیٹا نعمان ان کا روبار سنبھالتا مگر وہ شروع ہی سے ایک کند ذہن، بیمار اور عجیب قسم کا نفسیاتی اور حد درجہ وہمی مریض چلا آ رہا تھا۔ ڈرپوک اس قدر تھا کہ بادلوں کی گرج چمک سے خوف زدہ ہو جاتا۔ سو قسم کی ادویات کی گولیاں اور پڑیا پھانکتا رہتا۔ ذرا کوئی ٹوٹکا یوٹیوب یا سوشل میڈیا پر دیکھتا تو اس پر اسی وقت بے دریغ عمل درآمد کرنا شروع کر دیتا۔

بیمار تو وہ جیسے سدا کا ہی تھا...... بقول اس کی بڑی بہن نیلی کے، بھیا نے خود کو بیمار کیا ہے یا پھر وہ اداکاری کرتے ہیں تاکہ ان پر کوئی بڑی ذمّے داری نہ ٹھونس دی جائے۔ اگرچہ خود نیلی سہل پسند، آرام طلب اور سست مزاج لڑکی تھی۔ تاہم اپنے چھوٹے بھائی کی طرح نفسیاتی مریض تھی نہ ہی جسمانی طور پر کمزور۔

ادھر جب بار بار تیس سالہ نعمان کے ساتھ یہ واقعات بغیر کسی جانی نقصان کے ہوتے رہے تو ان کی اہمیت بھی نہ رہی۔ مگر بیگم شاہانہ تو ماں تھیں۔ فکر و پریشانی میں مبتلا ہو کر انہوں نے پولیس سے رابطہ بھی کر لیا مگر چند دنوں کی تفتیش کے بعد ہی...... انہوں نے بھی نعمان کو پاگل اور نفسیاتی مریض قرار دے کر جان چھڑا لی۔

تب ہی ایک دور پرے کے رشتے دار نے انہیں سیکریٹ کرائم برانچ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا اور نتیجے میں جواں سال انسپکٹر شاہد علی کو یہ کیس سونپ دیا گیا تھا۔

بات ہو رہی تھی گھر کے افراد کی...... شاہانہ بیگم نے خاوند کے انتقال کے بعد ان کا سارا کاروبار فروخت کر دیا تھا۔ پراپرٹی اور دیگر سرمایہ کار اداروں سے ایک لگی بندھی رقم ہر ماہ مل جاتی تھی جو اُن کے لیے کافی تھی اسی لیے زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔

تیسرا فرد نیلی کا شوہر سلیم تھا جو شادی سے پہلے ہی اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا اور بظاہر ٹھیک ٹھاک کما لیتا تھا۔

چوتھی فرد نور بانو تھی۔ ایک خاموش طبع اور بظاہر سیدھی سادی نظر آنے والی نک سک سی بیس بائیس سالہ لڑکی۔

نور بانو ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی تھی جو شاہانہ بیگم کی مرحومہ بہن کی نشانی تھی۔ بہن کے مرنے کے بعد بیگم شاہانہ اسے اپنے ہاں لے آئی تھی اور اس نے اپنے بیٹے نعمان کے ساتھ اس کی منگنی بھی کر ڈالی تھی، جبکہ شادی چند وجوہات کی وجہ سے التوا کا شکار رہی اور اب ان دنوں نعمان کے ساتھ ہونے والے واقعات کے سبب تو شادی کا معاملہ اور بھی کھٹائی میں پڑتا نظر آرہا تھا۔

بقول نیلی کے اس میں بھی ''بھیّا'' کی چالاکی تھی۔ نور بانو اسے ہرگز پسند نہ تھی اور وہ اس طرح کے ڈرامے کر کے نور بانو کا دل خراب کرنا چاہتا تھا۔

نیلی کا شوہر سلیم مرنجان مرنج انسان تھا اور اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ وہ شاہانہ بیگم کا کوئی دور کا رشتے دار تھا۔

کھانے کی میز پر زیادہ تر نیلی اور نعمان کی ہی آپس میں نوک جھوک لگی رہتی تھی۔

''تم سب دیکھ لینا، کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بھیّا کا صرف وہم ہے۔ ایک خوفناک وہم...... یا پھر......'' نیلی باز آنے والی کب تھی۔ آخری جملہ اس نے دانستہ نعمان کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھ کر ادھورا چھوڑا تو نعمان اسے گھور کر بولا۔

''یا پھر......کیا؟''

''کوئی چالاکی......'' بالآخر نیلی نے غبار نکالا۔

''بُری بات ہے نیلی! تم کیوں ہر وقت بے چارے نومی کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔'' سلیم جو کم ہی بولتا تھا، دو ایک بار وہ بھی بیوی کو ہمت کر کے ٹوک دیا کرتا تھا۔

''تم ہی سمجھاؤ بیٹا اسے......'' بیگم شاہانہ کو جیسے اپنے چہیتے داماد کی شہ ملی۔

''میں تو سمجھاتا ہی رہتا ہوں ممی! مگر......'' سلیم نے ساس کی طرف دیکھ کر کہا مگر نیلی کو اپنی جانب گھورتے پا کر بے چارہ خاموش ہو گیا۔

''اپنی خاطر جمع رکھو ہمشیرہ! ہمیں کچھ نہیں ہوا۔'' نعمان نے تڑسے کہا۔ ''تم خود پر ذرا توجہ دو، آرام طلبی اور ہر وقت گھر بیٹھے میوزک سن سن کر بھدی ہو رہی ہو۔''

''شرم کرو بیٹا! بہن سے ایسا نہیں کہتے۔'' ماں نے پہلی بار بیٹے کو ٹوک دیا۔

''اور ممّا! یہ جو مجھے ہر وقت نفسیاتی مریض اور وہمی، چالاک کہتی رہتی ہے وہ......!'' نعمان ماں سے خفگی سے بولا۔

''ممّا! دراصل آپ ہی کے لاڈ پیار نے اسے چھوئی موئی بنا دیا ہے۔ کسی راہداری یا کمرے میں لائٹ نہ جل رہی ہو تو موصوف وہاں جاتے ہی نہیں ہیں، جب تک روشنی نہ ہو جائے۔ اتنا ڈر آخر کس بات کا ہے؟'' نیلی بولی۔ ''نفسیات کی رُو سے ایسے آدمی کسی خوفناک اور خونی قاتل کا تصور بناتے رہتے ہیں جو انہیں حقیقت میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔''

''خاموش ہو جاؤ اور ناشتا کرو۔'' بالآخر بیگم شاہانہ کو سخت حکم صادر کرنا پڑا۔ سلیم نے سکھ کی سانس لی۔ وہ ناشتا کر کے دفتر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس سارے عرصے میں......نعمان کی منگیتر......نور بانو بالکل خاموش رہی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار رہتی تھی۔

☆☆☆

''آؤ...... آؤ...... بیٹا شاہد!'' بیگم شاہانہ نے خفیہ پولیس کے انسپکٹر کا بڑی شفقت اور محبت سے استقبال کیا۔ ''تم نے بُرا تو نہیں منایا......؟'' اگلے لمحے وہ تھوڑا پریشان بھی ہو گئیں۔

''کس بات پر آنٹی؟'' شاہد حیرت سے مسکرا کر بولا۔

''یہی کہ...... محض چند دنوں کی واقفیت میں ہی تم سے ماں بیٹے کا رشتہ جوڑ لیا۔''

''بالکل نہیں، یہ بُرا منانے والی بات ہو ہی نہیں سکتی۔'' شاہد پورے خلوص سے بولا۔ ''یہ تو آپ کی محبت اور خلوص ہے آنٹی!''

''جیتے رہو بیٹا! دراصل میں بھی ایک بیٹے کے غم کی ماری ہوئی ہوں۔'' بیگم شاہانہ ایک دم دل گیر سی ہو گئیں۔ ''مجھے جس طرح نیلی بیٹی پیاری ہے اسی طرح نعمان بھی مگر نعمان کی طرف میری خصوصی توجہ اس لیے ہے کہ وہ ذرا......'' یہاں کچھ کہتے کہتے بیگم شاہانہ جھجک سی گئیں تو شاہد فوراً مسکراتے ہوئے بولا۔

''نعمان بھی بالکل ٹھیک ہے، آپ اس کی فکر نہ کریں، بعض دفعہ مخصوص حالات انسان کے ذہن پر کچھ منفی اثرات مرتب کرتے ہیں، وہ لوگ جو زیادہ حساس ہوتے ہیں، ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خصوصی توجہ کی ضرورت رہتی ہے۔ آپ تو اچھا کرتی ہیں اس پر خاص توجہ اور محبت کی نگاہ رکھتی ہیں۔'' شاہد بُردبار...... لہجے میں بولا۔

''تم نے بالکل ٹھیک کہا شاہد بیٹے! مگر کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ میرے بے جا لاڈ پیار نے ہی نعمان کو اس قدر چھوئی موئی اور ڈرپوک بنا کر رکھ دیا ہے۔'' بیگم شاہانہ بولیں۔

شاہد نے اس کی بات پر تائیدی انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ مقصد کی بات پر آنا چاہتا تھا۔ ایک ذرا توقف سے وہ اسی طرف آتے ہوئے بولا۔

"آپ بتا رہی تھیں کہ نعمان کو آج پھر وہی خونی قاتل کی صورت میں نظر آنے والا شخص دکھائی دیا تھا۔"

"ہاں!"

"یہ کس وقت کی بات ہے؟ صبح یا رات کے کسی پہر؟" شاہد نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"رات تو نہیں البتہ صبح سویرے ہی کی بات بتا رہا تھا۔" بیگم شاہانہ نے جواب میں کہا۔

"کیا نعمان کو آپ یہاں بلا سکتی ہیں؟"

بیگم شاہانہ نے نوشابہ کے ذریعے بیٹے کو بلا بھیجا۔

تھوڑی دیر بعد نعمان اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ شاہد پہلے تو بہ غور اسے دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ نعمان کسی انجانے خوف کا شکار ہے۔ آنکھوں میں چھپی سراسیمگی اور چہرے کی زردی مائل پیلاہٹ یہ تاثر دے رہی تھی۔

"کیسے ہو نعمان میاں؟" شاہد نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اچھے بھلے بہادر اور صحت مند آدمی ہو۔ کچھ تفصیل بتا سکتے کہ وہ خونی قاتل تمہیں کس وقت اور کس حالت میں دوبارہ نظر آیا تھا؟"

"ہاں!" نعمان نے ہمت کی۔ شاہد کے لہجے نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ "اس مرتبہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ مجھے صبح نظر آیا۔" اس کی بات پر شاہد چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس نے درمیان میں سوال کر ڈالا۔

"کچھ ٹھیک وقت بتا سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی یا پو پھٹنے کا وقت تھا؟"

نعمان کچھ سوچنے کے سے انداز میں بولا۔ "پو پھٹنے سے کچھ آگے کا ہی وقت تھا۔"

تب ہی نعمان کو سخت پچھتاوا ہوا کہ وہ خود بھی اسی وقت ہی واپس لوٹ گیا تھا، کاش! وہ تھوڑی دیر اور وہاں موجود رہتا تو یہ پُراسرار معاملہ حل ہوا ہی چاہتا تھا۔ کم از کم اس پُراسرار قاتل والے روپ کو فرار ہوتے سے پکڑ ہی لیتا۔

"اچھا!" اس نے نعمان کو آگے بولنے کا موقع دیتے ہوئے سوال کیا۔ "اب ذرا اس کی تھوڑی تفصیل بتا دو۔"

نعمان بتانے لگا۔ "مجھے باتھ روم جانے کی حاجت محسوس ہوئی تھی۔ میں بیڈ سے اٹھا تو اچانک میری نظر پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف پڑی، حالانکہ سردی کی وجہ سے میں وہ بند رکھتا تھا مگر اس خونی قاتل نے وہ کسی طرح کھول لی تھی۔ وہ بالکل وہی تھا جو پچھلے چند دنوں سے مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ سوراخ دار نقاب...... ایک ہاتھ میں لمبے پھل والا چاقو جس پر خون تازہ لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری گھگی بندھ گئی اور مارے دہشت کے میری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"آج تم نہیں بچو گے میرے ہاتھوں......" وہ بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا کھڑکی سے اندر آنے کی کوشش کرنے لگا تو اچانک جانے کہاں سے میرے اندر طاقت آگئی کہ میں پوری قوت سے چیخا۔ قاتل بھی ایک دم گھبرا گیا اور پھر پلٹ کر غائب ہو گیا۔ میں اپنے بیڈ روم کے دروازے کو تقریباً دھکیلتا ہوا باہر کو دوڑا تھا۔" اتنا بتا کر نعمان چپ ہو گیا۔

شاہد کی بہ غور اور بھانپتی ہوئی نظروں نے دیکھا، یہ واقعہ دہراتے ہوئے نعمان پر خوف طاری ہونے لگا تھا۔

"کیا تمہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہر بار ایک ہی آدمی قاتل کے روپ میں تمہیں نظر آتا ہے؟ یعنی خنجر بدست، خون آلودہ خنجر......؟" کسی خیال کے تحت شاہد نے سوال کیا۔

"جی ہاں! میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ہر بار نظر آنے والا ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔" نعمان نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ عود کر آئی تھی، جسے شاہد محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ہونٹ بھی بھینچ لیے تھے۔

"ٹھیک ہے، تم فکر نہ مت کرو، ہم اُسے ڈھونڈ نکالیں گے۔" شاہد نے حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ نعمان سے کہا۔ "اب ذرا مجھے تمہاری مما سے باتیں کرنی ہیں، تم اپنے کمرے میں جا کے تھوڑا ریلیکس ہو جاؤ۔"

نعمان اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی شاہد نے ایک طویل ہمکاری خارج کی اور بیگم شاہانہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر ہنوز تفکر و تشویش کے آثار تھے۔

"میرا خیال ہے آنٹی! آپ ذرا نعمان کے متعلق ایک ماہرِ نفسیات کی بھی رائے لے لیں۔"

"کیا؟" اس کی بات پر بیگم شاہانہ کی پریشانی اور تشویش بڑھ گئی۔ "تت...... تمہارا خیال ہے کہ میرا نومی، نفسیاتی مریض......" صدمے کے سبب وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکیں۔

''حوصلہ رکھیں آنٹی، پلیز......!'' شاہد نے ہمت بندھائی۔ ''ضروری نہیں ہے کہ وہ ایسا ہو، جب حالات کسی مخصوص نہج پر آجائیں تو ساری باتوں کو پوائنٹ آؤٹ کرنا ضروری ہوجاتا ہے ورنہ...... اصل مجرم پہچانا نہیں جاتا۔ آپ مجھ سے تعاون کریں اور فوراً میرے اس مشورے پر عمل کریں اور بتائیں کہ ماہرِ نفسیات نے کیا کہا؟''

''ٹھیک ہے بیٹا! نصیب میں یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے اپنے لختِ جگر کو اب پاگلوں کے ڈاکٹر...... کے پاس بھی لے جانا پڑے گا۔'' بیگم شاہانہ غمگین ہونے لگیں۔ شاہد دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

اُس روز نیلی نے اپنے شوہر سلیم کے کہنے پر بیگم شاہانہ کی سالگرہ منانے کا پروگرام بنایا۔ کچھ گھر کی فضا بھی بدلنا مقصود تھا۔ بیگم شاہانہ پچاس برس کی ہوچکی تھیں۔

نعمان ایسی تقریبات سے خوش ہوتا تھا اور ماں بھی چاہتی تھیں کہ اس کا دل بہلا رہے اسی لیے انہیں بھی اپنے داماد اور بیٹی کی تجویز اچھی لگی۔

اس وقت جب...... لاؤنج سجایا جارہا تھا، جھنڈیاں اور غبارے لگائے جارہے تھے، ایک بڑا سا کیک جس پر گولڈن جوبلی لکھا گیا تھا، ایک بڑی سی میز پر رکھ دیا گیا۔

باقی لوگ تیاریوں میں مصروف تھے۔ ملازموں نے بھی نئے چمکتے دمکتے کپڑے پہنے ہوئے تھے، یہ نیلی کا حکم تھا کہ ہر کوئی تیار ہوگا، نوشابہ نے بھی خوب میک اَپ کیا ہوا تھا۔ پھر یہی وہ وقت تھا کہ اچانک لاؤنج کی طرف لرزتی ہوئی چیخ سنائی دی۔

سب وہاں پہنچے تو نعمان کو کیک والی میز کے سامنے کرسی پر تھر تھر...... کانپتے پایا۔ اس کی خوف زدہ نظریں کیک پر جمی ہوئی تھیں جہاں خون پھیلا ہوا تھا اور ایک چاقو بھی کیک میں پیوست تھا۔ نوشابہ کا چہرہ فق اور آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور کم و بیش یہی حال نیلی اور نور بانو کا بھی تھا۔

''وہ...... وہ ابھی ابھی یہاں آیا تھا، اس نے چاقو سے مجھ پر حملہ کیا تھا مگر یہ خون......'' نعمان اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ گنگ ہوکر رہ گیا۔

سب لوگ پھیلی ہوئی آنکھوں سے چاقو اور خون آلودہ کیک کو دیکھنے لگے۔

افتخار کو بھی نعمان کے دوست کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا، وہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے اعلان کردیا کہ اسی وقت پولیس کو فون کر کے بلا لیا جائے اور کسی شے کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ سلیم سمیت سبھی نے اس کی بات پر صاد کیا۔

بیگم شاہانہ نے فوراً خفیہ برانچ کے انسپکٹر شاہد علی کو فون کر کے بلا لیا۔ اس نے پہنچ کے بہ غور جائزہ لیا اور پتا چلا کہ کیک پر لگا خون، ایک کریم ٹائپ فوڈ سیرپ تھا جو چاقو لگنے کے سبب خون کی طرح پھیل گیا۔ تاہم پھر بھی اس کا تجزیہ کرنے کے لیے اسے لیبارٹری بھجوا دیا گیا۔ چاقو کو بھی فنگر پرنٹس کے لیے ایک پولی تھین میں رکھ دیا گیا۔

نعمان سے شاہد نے بیان لیا تو۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں اکیلا کھڑا غبارے میں ہوا بھر رہا تھا کہ وہی قاتل اچانک نمودار ہوا اور...... مجھے اکیلا پا کر اس نے چاقو سے...... حملہ کردیا، میں پیچھے ہٹ گیا اور چیخ ماری، مجھ پر وار کیا ہوا اس کا چاقو میرے بجائے کیک میں پیوست ہوگیا اور پھر وہ شاید دوڑتے قدموں کی آوازیں سن کر گھبرا کر غائب ہوگیا۔

اس کے بیان پر ماسوائے شاہد کے سبھی اب چبھتی ہوئی نظروں سے نعمان کو تکے جارہے تھے جیسے وہ کوئی بچوں کی کہانی سنا رہا ہو۔

مالی محسن اور چوکیدار خاور کو بھی اندر باہر سب جگہ دوڑایا گیا مگر قاتل کا کچھ پتا نہ چلا......

☆☆☆

''سر، فنگر پرنٹس اور کیمیکل رپورٹ آگئی ہے۔'' صفدر نے انسپکٹر شاہد کو بتایا۔

''رزلٹ بتاؤ؟''

''خون تو وہ نہیں تھا، فوڈ سیرپ ہی تھا۔ البتہ چاقو پر کسی کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے۔''

شاہد چونکا۔ ''کیا مطلب؟ چاقو کے فنگر پرنٹس اتنی جلدی حملہ آور قاتل نے صاف بھی کر ڈالے، جبکہ نعمان کے بیان کے مطابق وہ گھبرا کے پلٹ گیا تھا۔''

''یہی تو بات ہے جو ثابت کرتی ہے کہ یہ حرکت نعمان ہی کی تھی، وہ کسی قسم کی ڈرامے بازی کر رہا ہے۔'' اسسٹنٹ صفدر نے کہا۔

''تم تصویر کے ایک ہی رخ پر کیوں نظر رکھے ہوئے ہو صفدر؟'' شاہد نے اسے ٹوکا۔ ''مت بھولو کہ تم عام پولیس ڈپارٹمنٹ کے نہیں بلکہ خفیہ برانچ کے ایک تربیت یافتہ اور تجربہ کار اہلکار ہو۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس خونی حملہ آور نے دستانے پہن رکھے ہوں؟''

''سوری سر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ ممکن ہوسکتا

ہے۔'' صفدر نے ذرا خفیف سا ہو کے کہا۔

☆☆☆

''ارے یار! تم کیا ڈرپوک چوہے کے مانند بالکل ہی کمرے میں بند ہو کر رہ گئے ہو۔''

یہ اسی روز کا ذکر تھا اور...... افتخار نے نعمان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہانک لگا دی تھی۔ ''ارے...... رے...... یہ تمہارا چہرہ کیوں ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا ہے؟''

افتخار نے ایک جانب کمرے میں سکڑے سمٹے نعمان کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ چونک کر کہا۔ اپنے دوست کو دیکھتے ہی نعمان کا چہرہ کھل گیا۔ افتخار وہ واحد آدمی تھا جسے نواب محل میں کسی وقت بھی اسی طرح آنے جانے کی اجازت تھی جیسے کسی گھر کے فرد کو ہوتی ہے۔

''اِفّی! تم آ گئے...... شکر ہے یار......'' نعمان اٹھ کر اس کی جانب بڑھا۔ دونوں گلے ملے۔ ''یار آج پھر وہی......'' وہ بتانے لگا مگر افتخار نے بات کاٹ دی۔

''یہ سب تمہارا وہم ہے۔ اکھاڑ پھینکو اپنے دماغ سے یہ سب کچھ اور جلدی کرو بازی لگاتے ہیں۔ آج تو میں نے تمہیں شطرنج میں ہرانے کا پکا پکا ارادہ کر رکھا ہے۔''

نعمان اس کی بات پر مسکرا دیا۔ افتخار جیسے بے تکلف دوست کے آنے سے اس کے اندر کا بوجھل پن کم ہونے لگا تھا۔

یہی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر افتخار کی حیثیت نواب محل میں بالکل گھر کے فرد کی سی تھی۔ وہ نعمان کا کلاس فیلو تھا۔ کسی پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کے آنے سے نعمان کا دل بہل جایا کرتا تھا۔ بیگم شاہانہ بھی یہی چاہتی تھیں۔

اُدھر جب نعمان کے دوست کی آمد کی خبر نواب محل میں گونجی تو نیلی فوراً حرکت میں آ گئی۔

نیلی سن گن اور ٹوہ لینے والی لڑکی تھی۔ اس کے بغیر اس کا کھانا ہی ہضم نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا اسے جیسے ہی افتخار کی آمد کا پتا چلا، وہ بار بار اور بہانے سے نور بانو کے کمرے میں اس کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے جاتی رہتی تھی، جب تک افتخار نواب محل سے چلا نہیں جاتا تھا۔

''چلو بھائی! آج تو گیم ایک ایک کے مقابلے پر برابر رہا، میں اب چلا......''

افتخار نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی......؟ یار......! ایک بازی اور لگ جانے دو۔'' نعمان نے کہا۔

''نہیں یار! باقی کل...... چلتا ہوں، کل صبح دفتر بھی جانا ہے۔'' افتخار نے معذرت کر لی اور پھر وہ نواب محل سے رخصت ہو گیا۔

گیٹ سے باہر آ کر وہ پائیں باغ کی جانب گھوم گیا۔ شام جھکنے لگی تھی۔ اُدھر ہی وہ ایک ایسے کنج میں کھڑا ہو گیا جہاں رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد شام کے ملگجے میں ایک سایہ اس طرف کو لپکا۔ اس کا انداز چوروں کا سا تھا۔

قریب آنے پر عقدہ کھلا کہ یہ...... نور بانو تھی۔

''دیر کر دی آنے میں...... جانتی بھی ہو کہ میں یہاں اس پاگل اور ذہنی مریض کے لیے نہیں بلکہ تمہاری خاطر آتا ہوں۔'' افتخار، نور بانو کو قریب دیکھ کر خفگی سے بولا۔ اگرچہ اس میں ایک طرح کا پیار بھی تھا۔

''تمہیں نہیں پتا، تم یہاں آ کر مجھے کس قدر کڑے امتحان میں ڈال دیتے ہو۔'' نور بانو ایک نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''جب تک تم کوٹھی میں رہتے ہو، نیلی بار بار بہانے سے آ کر میرے کمرے میں جھانکتی رہتی ہے۔ مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ اسے ہم پر کچھ شبہ ہونے لگا ہے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔'' افتخار بولا۔ ''جب دو چاہنے والے اس طرح چھپ چھپ کر ملتے ہیں تو اس قسم کے خدشات بھی دل میں پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

''بناؤ مت۔'' نور بانو ہولے سے بولی۔ اب بھی وہ باغ کے اس کنج میں کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تھی۔ ''مت بھولو کہ میری منگنی تمہارے دوست نعمان سے ہو چکی ہے۔''

''یہ منگنی نہیں، ایک سودے بازی ہے۔'' افتخار تلخی سے بولا۔ ''کیا حق پہنچتا ہے، بیگم شاہانہ کو تمہاری مرضی معلوم کیے بغیر اپنے پاگل اور ذہنی مریض بیٹے سے منگنی کرنے کا...... میں چاہوں تو اس پر مقدمہ کر ڈالوں۔ اس خود غرض عورت نے اسی وقت کے لیے تمہیں سہارا دیا تھا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس خود غرض عورت کو......'' وہ غصے کے مارے اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

''میں مجبور ہوں اِفّی! کیا کر سکتی ہوں؟'' نور بانو کی آواز میں لرزش تھی۔ اَن کہے غم کی فریاد تک اس کے نرم لبوں پر کپکپا کر رہ گئی۔

''تم میرا ساتھ دو، میرے ذہن میں ایک پلاننگ ہے۔'' افتخار نے بوجھل پن کی فضا کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ ''اس منصوبہ بندی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا

اور......"

"ششش...... شاید کوئی آرہا ہے۔ میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ......" اچانک نور بانو نے کہا۔ اسے بائیں باغ کی داہنی جانب کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس طرف لکڑی کی بینچیں نصب تھیں۔

"اوہو...... ایک تو تم ڈرپوک بہت ہو۔" افتخار بولا۔

"بات ڈر کی نہیں عزت کی ہے۔ چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے۔" نور بانو یہ کہتے ہوئے جلدی سے پلٹ گئی اور افتخار وہیں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہ بھی خاموشی سے ایک طرف کو ہولیا۔

☆☆☆

نور بانو، افتخار سے چوری چھپے مگر مختصراً ملاقات کے بعد پلٹی اور جیسے ہی برآمدے کے قریب پہنچی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ سامنے سیڑھیوں پر بیگم شاہانہ کھڑی اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ اسی لہجے میں بولیں۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

"وہ...... دراصل خالہ امی مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے ذرا ٹہلنے نکل آئی تھی۔" نور بانو نے قدرے اٹکتے ہوئے جواب میں دیا۔

"تمہیں معلوم ہے، رات ہونے کو آئی ہے اور میں جلد شب بسری کی قائل ہوں۔"

"جی۔" نور بانو نے سر جھکا کر ہولے سے کہا۔

"افتخار کہاں ہے؟" بیگم شاہانہ نے پوچھا۔ نور بانو چونکی۔ اسے امید نہ تھی کہ اب بیگم شاہانہ بھی اس سے یہی سوال پوچھیں گی جو اُن کی بیٹی نیلی بھی اس سے پوچھ لیا کرتی تھی اور نور بانو اندر سے تلملا جاتی۔ سمجھ تو گئی تھی کہ اس میں بھی نیلی کی ہی شرارت تھی۔ وہ شک و شبے کی آگ اپنی ماں کے دل و دماغ میں بھی بھڑکانے میں کامیاب رہی تھی۔

"افتخار صاحب؟" نور بانو نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "وہ تو شاید اندر نعمان کے ساتھ شطرنج کھیل رہے ہیں۔"

"نہیں، میں نے کچھ دیر پہلے اسے راہداری سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" بیگم شاہانہ شکوک بھرے لہجے میں بولیں۔

"تو پھر چلے گئے ہوں گے مجھے تو نہیں معلوم۔"

یہی وہ وقت تھا جب بیڈروم کی جانب سے ایک تیز چیخ کی آواز سنائی دی، پھر دوسری اور تیسری بھی...... اندر نعمان بُری طرح چیخ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بیگم شاہانہ چونکی اور نور بانو بھی...... پھر وہ دونوں ہی ایک دم پریشان ہو کے دائیں جانب بھاگیں، جہاں سونے کے کمرے بنے ہوئے تھے۔

نعمان کے کمرے کے باہر نیلی کھڑی دروازہ پیٹ رہی تھی۔

"نومی...... کیا ہوا؟ دروازہ کھولو۔" چیخیں اب بند ہو چکی تھیں، البتہ دروازہ پھر بھی نہ کھلا تھا۔ بیگم شاہانہ نے پھرتی سے اپنی ساڑی کے پلّو سے بندھا ہوا گچھا ہاتھ میں لیا۔ نیلی دروازے سے ہٹی۔ بیگم شاہانہ نے ایک چابی کا انتخاب کر کے وہ قفل میں گھمائی اور جلدی سے دروازہ کھول کر اندر لپکیں۔ نور بانو اور نیلی نے بھی ان کی تقلید کی تھی۔

کیا دیکھتے ہیں اندر کمرے میں نعمان ایک جانب کرسی پر ڈرا سہما بیٹھا بائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف خوف زدہ نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا میرے لعل؟" ماں کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔

"وہ...... وہ...... یہاں سے نظر آیا تھا اور اس نے کھڑکی کھولی تھی۔" نعمان کپکپاتے لہجے میں کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔

"نوشابہ...... محسن...... خاور...... کدھر مر گئے سب......" بیگم شاہانہ پُرجلال انداز میں چیخیں۔ پھر نیلی اور نور بانو کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "تم دونوں یہاں کھڑی کیا تماشا دیکھ رہی ہو؟ جاؤ جا کے چوکیدار اور مالی کو خبر کرو، وہ خونی قاتل ابھی ابھی یہاں سے گیا ہوگا۔"

نیلی کے چہرے پر تو بیزاری نظر آنے لگی تھی مگر ماں کا حکم تھا۔ نور بانو بھی دروازے کی جانب لپکی تو نیلی اس کے عقب میں تھی۔ بیگم شاہانہ بیٹے کو سنبھالنے لگیں۔

☆☆☆

شاہد علی ایک بار پھر نواب محل میں موجود تھا۔ بیگم شاہانہ اور وہ نشست گاہ میں براجمان تھے۔

اگلی صبح ہی بیگم شاہانہ نے فون کر کے شاہد علی کو بلوا لیا تھا۔

"معافی چاہتا ہوں آنٹی! آپ نے شاید ابھی تک میرے مشورے پر عمل نہیں کیا۔" شاہد علی نے معذرت خواہانہ انداز میں بیگم شاہانہ سے کہا تو وہ فوراً بولیں۔

"کل ہی تو میں نے ایک ماہرِ نفسیات کو دکھایا ہے۔"

"تو آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں اب تک؟"

"میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی بیٹا! بس سستی ہو گئی

ذرا۔"

"کیا نام ہے اُس کا؟"

"ڈاکٹر قادر شاہ۔"

شاہد علی، ڈاکٹر قادر شاہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ شہر کا ایک مشہور اور تجربہ کار ماہرِ نفسیات تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک کیس کے سلسلے میں مل چکا تھا۔ وہ ایک ایسے ذہین مجرم کا کیس تھا، جو اپنے شکار کو نفسیاتی حربوں کے ذریعے زیر کرتا تھا مگر جرم کر کے صاف بچ جاتا تھا۔

شاہد پھر نہیں بیٹھا اور اسی وقت نواب محل سے رخصت ہو کے سیدھا ڈاکٹر قادر شاہ کے کلینک جا پہنچا۔

ڈاکٹر قادر شاہ ایک مشہور اور تجربہ کار ماہرِ نفسیات تھا۔ وہ اسی اعتبار سے بہت مصروف بھی رہتا تھا، اس سے ملاقات کے لیے پہلے وقت لینا پڑتا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹر قادر شاہ نے ہچر مچر سے کام لیا لیکن شاہد علی کے اصرار پر وہ وقت دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بیگم شاہانہ کے بیٹے نعمان کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ طبی نقطہ نظر سے ڈاکٹر قادر... نعمان کے متعلق کیا رائے رکھتا تھا۔ شاہد علی نے خود سے بھی نعمان سے متعلق اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔

"آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں ڈاکٹر صاحب؟ کیا نعمان کے ساتھ کوئی خطرناک نفسیاتی مسئلہ ہے یا پھر واقعی کوئی مجرم اس کی جان کے درپے ہے؟"

شاہد علی کے سوال پر ڈاکٹر قادر ہولے سے کھنکارا پھر جواباً بولا۔ "کیس ہسٹری ہے تو بہت گمبھیر..... مگر یہاں میں تمہارے نہیں بلکہ اپنے نقطہ نظر سے بات کروں گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب!" شاہد نے فوراً کہا۔ "آپ کسی پر مجرم ہونے کا شبہ چھوڑ کر صرف نفسیاتی اُلجھنوں سے متعلق اپنا نقطہ نظر پیش کریں۔"

"تم نے جو کچھ بتایا ہے اور میں نے جو کچھ نعمان اور اس کی والدہ سے پوچھا ہے، اس کے مطابق تو اتنی بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ نعمان..... فی الواقع نفسیاتی مریض ہے اور اسے فوری اور باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے، لیکن اس کیس میں اور اس نوعیت کے دوسرے کیسوں میں ایک بنیادی فرق ہے، میں حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

"کیسا فرق ڈاکٹر صاحب؟" شاہد علی نے پوچھا۔

"بیگم شاہانہ نے مجھے جو کچھ بتایا اور ان کے بیٹے سے میں نے جو پوچھا، اس کے مطابق....." ڈاکٹر قادر بتانے لگا۔

"اس کے تحت الشعور میں دوسروں پر جبر و تشدد کرنے کی شدید خواہش پوشیدہ ہوتی ہے....."

"مگر ڈاکٹر صاحب! نعمان تو....." شاہد علی نے درمیان میں کچھ کہنا چاہا تو ڈاکٹر قادر نے ٹوک دیا۔

"میری بات مکمل ہونے دو۔"

"سوری۔" وہ کچھ خفیف سا ہوا۔

"مانا کہ نعمان شروع ہی سے ... جسمانی طور پر کمزور نہیں بلکہ ذہنی صحت کے سلسلے میں بھی پیچھے رہا ہے، ایسے ہی انسان کے تحت الشعور میں وہ منفی خواہشات پروان چڑھتی ہیں، جو کسی کا کچھ نہ بگاڑ پاتا ہو مگر اپنے اندر ایسی شدید خواہش رکھتا ہو۔ مزے کی بات تو یہ ہے نفسیات کی رُو سے خود اسے بھی نہیں پتا ہوتا ہے کہ وہ کر کیا رہا ہے؟ وہ اپنی کسی قریبی عزیز ہستی کو بھی جانی جسمانی نقصان پہنچا سکتا ہے اسی لیے ایسے مریض کو خطرناک قرار دیا گیا ہے۔ اسے فوراً پاگل خانے میں داخل کروانا چاہیے۔"

"اوہو..... تو کیا آپ نے یہ بات اُن سے کہہ دی ہے؟" شاہد علی نے پوچھا۔

"صرف بیگم شاہانہ سے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا پھر آگے بولا۔ "میں بتا رہا تھا ایسا آدمی جو دوسروں سے کمزور ہو، وہ لاشعوری طور پر دوسروں سے نفرت کرتا ہے۔ یوں وہ خود بھی تحت الشعوری کیفیت میں خود کو ایسے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے تا کہ دوسروں سے اپنی کمزوری کا انتقام لے۔ تاہم مجھے ایک بات اب بھی اُلجھا رہی ہے۔" اتنا کہہ کر ڈاکٹر قادر سوچ میں گم ہوا۔

"وہ کون سی؟" شاہد نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"اس نے اپنے ذہن میں کوئی فرضی شخصیت تخلیق کر رکھی ہے۔"

"اوہو....." شاہد چونکا۔ "تو پھر آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ نعمان جس حملہ آور اور خنجر بدست قاتل کا ذکر کرتا ہے، وہ اس کی اپنی ذہنی اختراع ہے؟"

"مگر یہاں ایک چھوٹی سی قباحت ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "اس قسم کے مریض جو ہستی یا جو کچھ اپنے واہمے میں تصور تخلیق کرتے ہیں، وہ بھی اتنی واضح نہیں ہوتی، اسے آپ ایک ہیولا، ایک سایہ یا ایک دھندلا وجود کہہ لیں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! نعمان بڑے وثوق اور وضاحت سے اس خونی حملہ آور کے بارے میں بتاتا ہے۔"

''اس کے لیے آپ کو اپنی تفتیش ان خطوط پر کرنا ہوگی کہ آیا وہ خیالی معما ہے یا حقیقت۔'' ڈاکٹر قادر نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

شاہد اس کا مطلب سمجھتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے رخصت ہوتے دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا۔

''ایک بات یاد رکھنے والی ہے جو میں بیگم شاہانہ سے بھی کہہ چکا ہوں۔'' اس کی بات پر شاہد ٹھہر گیا اور بھویں سکیڑ کر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

''چونکہ ایسے مریض کے تحت الشعور میں کسی پر ظلم کرنے کا متشدد جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے، تو وہ اپنے قریب رہنے والوں کو اس کی زد میں کسی بھی وقت لے سکتا ہے۔ اسی لیے بسا اوقات ایسے مریضوں کو زنجیروں میں بھی جکڑ کر رکھا جاتا ہے لیکن چونکہ نعمان میں یہ کیفیات ہر وقت اور واضح طور پر موجود نہیں ہوتیں، بلکہ ایک خاص وقت یا ایک خاص کیفیت میں وقوع پذیر ہوتی ہیں، اسی لیے انہیں بھی محتاط رہنے کی ازحد ضرورت ہے۔''

''میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب!'' شاہد نے کہا اور رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

شاہد ڈاکٹر کے کلینک سے نکلا تو شام ہو چلی تھی۔ اس کا موڈ چائے پینے کو چاہا، اس مقصد کے لیے اس نے ایک قریبی ریسٹورنٹ کا رخ کیا۔ یہاں ایک سائڈ میں فیملی کیبن بھی بنے ہوئے تھے۔

جب وہ اندر داخل ہوا تو ایک کیبن کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ایک 'کپل' پر پڑی اور وہ چونک گیا۔

وہ دونوں مرد عورت کو پہچان گیا تھا۔ ایک تو نعمان کی منگیتر تھی اور دوسرا نعمان کا دوست افتخار تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، تفتیش وغیرہ کے سلسلے میں شاہد کئی دفعہ نواب محل آتا جاتا رہا تھا۔ اسی مناسبت سے وہ گھر کے افراد سمیت وہاں باقاعدگی سے آنے جانے والوں کو بھی جانتا تھا۔ ان میں افتخار بھی شامل تھا۔

شاہد اُن کی باتیں سننے کے لیے دانستہ ان کے کیبن کے قریب والی ایک کرسی پر براجمان ہوگیا اور ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا آلہ جس کے سرے پر باریک انٹینا لگا ہوا تھا، کان میں لگالیا۔ دیکھنے والوں کے لیے وہ ایک ہینڈ فری یا ائرفون ہوتا، مگر درحقیقت وہ ایک وائس ریسیور تھا۔ اب وہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آتی آوازوں کو بہت واضح طور پر سن سکتا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے اِن ملاقاتوں کا افتخار! اب بس ختم کرو یہ سب......'' شاہد نے نور بانو کو افتخار سے یہ کہتے سنا اور اس کے اندر ہلچل سی مچنا شروع ہوگئی۔

''تم مایوس ہوسکتی ہو نورا! میں نہیں۔'' شاہد نے اب افتخار کو کہتے سنا۔ ''بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے تقدیر خود ہی ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' نور بانو نے پوچھا۔

''تم کہتی ہونا کہ میرے اور تمہارے درمیان بڑی رکاوٹ نعمان ہے، جس سے تمہاری منگنی ہوچکی ہے۔ اب اس کا پاگل پن کھل کے سامنے آرہا ہے، لہٰذا ایسی حالت میں تمہاری اس سے شادی کیسے ہوسکتی ہے؟'' افتخار کے لہجے میں امید تھی۔

''مجھے نہیں پتا۔''

''کیسے نہیں پتا؟ اس کی حالت تم ہی نہیں سب ہی دیکھ رہے ہیں۔''

''اس کے باوجود خالہ امی میری شادی نعمان سے کر دیں گی۔''

''میرا دل کرتا ہے اس خودغرض اور بے حس عورت کو شوٹ کردوں۔'' افتخار نے طیش میں کہا۔ شاہد چونک گیا۔

''مت کرو ایسی باتیں، مجھے ڈر لگتا ہے۔ نعمان کو واقعی کوئی ہلاک کرنے کے درپے ہے۔'' نور بانو نے کہا۔

''کاش! ایسا ہی ہوجائے۔''

''خاموش۔''

''ویسے ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آتی ہے۔''

''وہ کون سی؟ مگر پلیز، اِفی! کوئی بیہودہ بات زبان سے مت نکالنا۔'' نور بانو نے ساتھ ہی اسے ٹوک بھی دیا مگر افتخار کو کوئی پروا نہ تھی وہ کہنے لگا۔

''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے وہ ایسا جان بوجھ کر کرتا ہے۔ جس طرح تم بیگم شاہانہ کے حکم کے سامنے مجبور ہو اسی طرح نعمان بھی اپنی ماں کے آگے مجبور ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہوسکتا ہے وہ تم سے شادی کرنا ہی نہ چاہتا ہو اور تمہیں خود سے بددل کرنے کے لیے ایسا ڈراما کر رہا ہو؟''

''یہ بھی غلط ہے۔'' نور بانو نے مختصراً کہا تو افتخار نے

جیسے پینترا بدلا۔

''میرا نہیں خیال کہ اس فسانے میں کوئی حقیقت بھی ہے۔'' افتخار کہہ رہا تھا۔ ''اس سلسلے میں نعمان کی نک چڑھی بہن نیلی سے میں مفصل انٹرویو لے چکا ہوں۔ اس کے خیال کے مطابق نعمان شروع ہی سے ڈرپوک اور کمزور جسمانی اور ذہنی صحت کا مالک ہے۔ بچپن میں ہم دونوں ڈریکولا سیریز کے ناول پڑھا کرتے تھے، اسے ہر جگہ ڈریکولا نظر آنے لگا۔ کوئی دہشت ناک مووی دیکھ لیتا تو مصیبت آجاتی۔ اب بھی اس نے کوئی ایسی خوف ناک مووی نیٹ پر دیکھ لی ہوگی۔ کسی کو قتل کرتے خونی قاتل کو دیکھا ہوگا یا کسی سیریل کلر کو ہی اب اسے ہر جگہ نظر آنے لگا ہے۔''

''اگر یہی صورت حال رہی تو تمہارا کیا خیال ہے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے گا؟'' نور بانو نے سوال کیا۔ شاہد بھی چونکا۔

''عین ممکن ہے۔'' افتخار نے کہا۔ شاہد کو یوں لگا جیسے یہ بات افتخار نے بہت گہرے انداز و لہجے میں کہی ہو، پھر یک دم اس نے موضوع بدل دیا۔ اس پر بھی شاہد کو اچنبھا سا ہوا۔

☆☆☆

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر تھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ شاہد کو فون پر کال موصول ہوئی۔ اس نے کال اٹینڈ کی تو دوسری جانب سے بیگم شاہانہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''وشش...... شاہد بیٹے! تت...... تم اس وقت کہاں ہو؟''

''خیریت تو ہے آنٹی؟ میں شہر میں ہی ہوں، کیوں کیا ہوا؟'' اس نے بھی فکرمندی سے پوچھا۔

''وہ...... وہ...... اس خونی قاتل نے میری ملازمہ...... نوشابہ کو قتل کردیا ہے۔'' بیگم شاہانہ نے ایک بھیانک انکشاف کرڈالا۔ شاہد کو جیسے بچھو نے ڈنک ماردیا۔ وہ اچھل کر ہی رہ گیا۔

''کیا......؟ کب......؟ کیسے......؟'' وہ تقریباً چیخ پڑا۔ اس کے لیے یہ خبر قطعی غیر متوقع تھی۔

''ابھی دو تین منٹ پہلے کی بات ہے، قاتل نے پہلے نعمان پر ہی حملہ کیا تھا مگر...... تم بس جلدی سے کوٹھی پہنچو...... باقی کی تفصیل خود ہی آکر نعمان بیٹے سے پوچھ لینا۔''

''ٹھیک ہے میں آرہا ہوں، آپ تب تک اپنے ملازموں کو خبردار کردیں کہ کوئی شخص کسی بھی شے کو ہاتھ نہ لگائے اور......''

''میں یہ کام پہلے ہی کرچکی ہوں۔'' بیگم شاہانہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

یہ سنتے ہی شاہد نے کال منقطع کی اور تیزی سے باہر کو لپکا۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ لاش سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا کہ...... نعمان کو دانستہ پاگل، جنونی اور وہمی ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، لیکن اپنی کار میں بیٹھتے بیٹھتے اس کے دماغ میں ایک اور خیال بھی چکرایا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ نعمان اپنی جگہ سچا ہو اور کوئی واقعی اسے قتل کرنا چاہتا ہو۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان کی ملازمہ نوشابہ کیسے اور کیونکر قتل ہوئی؟

وہ جب نواب محل پہنچا تو بیگم شاہانہ نے چھوٹتے ہی اسے بتایا کہ نوشابہ کا قتل کیسے ہوا۔

☆☆☆

شاہد اپنے اسسٹنٹ صفدر صدیقی کے ساتھ نواب محل پہنچا۔ پورچ کی سیڑھیوں پر بیگم شاہانہ، چوکیدار اور مالی کے ساتھ کھڑی نظر آئیں، وہ ان کی بے چینی سے منتظر تھیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''نعمان کہاں ہے؟'' شاہد نے ان کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''وہ...... اپنے کمرے میں ہے۔'' وہ جیسے خود کو سنبھالا دیتے ہوئے بولیں۔

''اس کے ہمراہ اور کون ہے اندر؟''

''نیلی اور نور بانو......''

''جس وقت یہ حادثہ ہوا، کیا اس وقت نعمان کا دوست افتخار یہاں موجود تھا؟'' شاہد نے کسی خیال کے تحت سوال کیا۔ اس کے ذہن میں کل نور بانو اور اس کے درمیان ہونے والی خفیہ گفتگو گردش کررہی تھی۔

''نہیں۔'' بیگم شاہانہ نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ ''ویسے اس کے آنے کا کوئی وقت کب مقرر ہے؟ کبھی دن میں آجاتا ہے تو کبھی شام یا رات میں......''

''اور...... سلیم......؟''

''وہ بے چارہ کہاں ہوتا ہے اس وقت...... شام گئے ہی دفتر سے لوٹتا ہے۔ وہ آج ہی فیصل پور گیا ہوا ہے اپنے کسی کاروباری کام کے سلسلے میں......''

''ہمیں نعمان کے کمرے میں لے چلیں۔'' بالآخر شاہد نے کہا۔ جب وہ کمرے میں پہنچے تو دیکھا نعمان کسی خوف زدہ بچے کے مانند ایک آرام کرسی پر سکڑا سمٹا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا

چہرہ سفید تھا۔نور بانو اسے سنبھالا اور تسلیاں دینے کی کوشش کر رہی تھی اور نیلی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی باہر باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بیٹا! انسپکٹر صاحب آ گئے ہیں، اب گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بیگم شاہانہ نے بیٹے کو پچکارتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری زبان سے پورا واقعہ سننا چاہتے ہیں۔''

ماں کی بات پر نعمان اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔وہ باری باری شاہد اور صفدر کو دیکھ رہا تھا۔

''حوصلہ کرو نعمان!'' شاہد نے ازراہِ تشفی اس سے کہا۔

''جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔لہٰذا اب تم ذرا اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے اسی طرح سب کچھ بیان کر ڈالو جو تمہارے ساتھ پیش آیا۔''

''ہم معمول کے مطابق روزانہ دن میں اور کبھی شام میں باغ میں جا کر بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔'' نعمان نے بتانا شروع کیا۔

''کون ہم لوگ؟'' شاہد نے پوچھا۔

''میں، نور بانو اور کبھی کبھی نیلی باجی۔'' نعمان نے جواب میں کہا۔

''ٹھیک، آگے......''

''میں، نور بانو کو بلانے اس کے کمرے میں گیا، اس نے کہا آپ چلیں میں ابھی آتی ہوں۔ یوں میں اکیلا ہی ریکٹ لے کر باغ میں آ گیا اور خود ہی اکیلے وقت پاس کرنے کے لیے چڑیا اچھال اچھال کر کھیلنے لگا۔''

''نور بانو تمہارے ساتھ کیوں نہیں گئی؟'' شاہد نے پوچھا۔

''وہ شاید اپنا ریکٹ ڈھونڈ رہی تھی، جو اسے مل نہیں رہا تھا۔'' نعمان نے کہا تو شاہد نے نور بانو کے چہرے کی طرف بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔وہ اس کا مطلب سمجھ کر بولی۔

''جی ہاں! یہ صحیح ہے انسپکٹر صاحب! حالانکہ میں اپنا ریکٹ ایک ہی جگہ یعنی الماری کے اوپر رکھتی ہوں تاکہ ضرورت پڑنے پر ڈھونڈنا نہ پڑے لیکن ریکٹ وہاں بھی نہیں تھا۔''

''اچھا آگے بتاؤ کیا ہوا؟'' شاہد نے نعمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں اکیلے کھیل رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ نور بانو کے بجائے نوشابہ چلی آ رہی تھی، میں یہی سمجھا شاید وہ مجھے بلانے آ رہی تھی۔ میں نے کھیل روکا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔یہی وہ وقت تھا جب ایک قریبی باڑھ کے عقب سے کسی نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا۔ میں نے گھوم کر اس طرف دیکھا تو مجھے چند ہی قدموں کے فاصلے پر باڑھ کی دوسری جانب وہی خونی قاتل اپنے ہاتھ میں خنجر لیے کھڑا نظر آیا۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ باڑھ پھلانگ کر کورٹ میں آ گیا اور بہت ہی ڈراؤنی آوازیں نکالنے لگا جیسے وہ...... وہ کوئی ڈریکولا ہو......اس نے مجھے دھمکی بھی دی۔''اب مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔'' میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور میں کوٹھی کی طرف بھاگا۔اس نے اچھل کر مجھے پکڑنا چاہا تو میرا ریکٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔میں ریکٹ چھوڑ کر بھاگا تو اس نے ریکٹ پھینک کر مجھے مارا جو مجھے نہیں لگا۔وہ میرے تعاقب میں بھاگا۔دوسری طرف سے نوشابہ آ رہی تھی۔مگر اس خوف ناک آدمی نے مجھے پکڑ ہی لیا۔تب تک نوشابہ بھی قریب آ چکی تھی۔ اس بے چاری نے میری جان بچانے کی خاطر گھاس پر گرا ہوا ریکٹ اٹھایا اور زور سے اس آدمی کے مارا۔ خونی قاتل نے اسے گالی دی اور مجھے چھوڑ کر نوشابہ کو پکڑ لیا۔ میں اس کے چنگل سے نکل کر اندر کوٹھی کی طرف بھاگا۔تب ہی میں نے اچانک پیچھے سے نوشابہ کی چیخ سنی، میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس خونی قاتل نے نوشابہ کو بُری طرح دبوچ رکھا تھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ بھی بلند تھا۔پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نوشابہ کے سینے میں خنجر اتار دیا۔میں بُری طرح دہشت زدہ ہو گیا۔نوشابہ ساکت ہو گئی اور قاتل نے اس کی لاش اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور دوبارہ مجھے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ میں تو خوف سے گنگ ہو گیا تھا، اسے دوبارہ اپنی جانب خون آلودہ خنجر لیے دوڑتا پا کر میں چیخیں مارتا ہوا اندر گھس گیا۔ دوسری طرف میری چیخیں سن کر امی اور باجی دوڑی آ رہی تھیں۔میں نے انہیں سب بتا دیا۔انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا اور خود شاید پولیس یعنی آپ کو فون کرنے لگیں۔''

''وہ آدمی تمہارے تعاقب میں کوٹھی کے اندر تو نہیں آیا تھا؟'' شاہد نے پوچھا۔

''نہیں، شاید وہ یہ دیکھ کر کہ میں اندر جا چکا ہوں وہ واپس لوٹ گیا ہو۔'' اس کی بات سن کر شاہد نے پُرسوچ انداز میں چند ثانیے اپنے ہونٹ سکیڑے پھر ان سے بولا۔

''ٹھیک ہے، میں ذرا باغ میں جا رہا ہوں۔آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔'' وہ صفدر کو لیے باغ میں آ گیا۔

یہاں کوٹھی کے عقب میں برآمدے سے ایک روش باغ تک آ رہی تھی، یہی روش بیڈمنٹن کورٹ کے پاس سے

کورٹ کے پچھلے گیٹ کی جانب گھوم رہی تھی۔

لان پار کر کے وہ اس روش پر آئے اور قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگے۔ روش پر بجری بچھی ہوئی تھی مگر کہیں بھی اس کی سطح پر ایسے نشانات نظر نہ آئے جس سے کسی قسم کی کشمکش کے آثار ہوں۔ کورٹ خالی تھا۔ شاہد سوچنے لگا کہ نعمان کے بیان کے مطابق اگر قاتل نے نوشابہ کی لاش وہاں ڈالی یا پھینکی تھی تو اس کے بھی آثار موجود ہونا چاہیے تھے مگر وہاں تو خون یا دھبے کے نشانات تو کیا ایک پتھر تک ادھر سے اُدھر ہوتا نظر نہ آیا، لیکن سب سے زیادہ چونکا دینے والا انکشاف یہ سامنے آیا کہ وہاں پر ملازمہ نوشابہ کی لاش...... کا نام ونشان تک نہ تھا۔

یہ دیکھ کر شاہد نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھویں سکیڑ لیں۔ اس کی فراخ پیشانی پر اَن گنت سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ بے اختیار ہی اس کے منہ سے برآمد ہوا۔ ''لاش کدھر گئی؟''

''میں نہیں سمجھتا سر! کہ یہاں قتل جیسی کوئی واردات ہوئی ہو۔'' اس کے اسسٹنٹ صفدر نے جو پہلے ہی اس کیس سے تنگ اور بیزار آیا ہوا تھا، اپنا موقف بھی شاہد کو پیش کر چکا تھا کہ یہ سب اس پاگل دماغ مریض کی ذہنی اختراع ہے۔ شاہد کو بدستور اُلجھا ہوا پا کر وہ پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے بولا۔

''اب بتائیں بھلا، لاش کا دور دور تک نام ونشان نہیں ہے۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں سر! یہ کیس ایک مذاق ہی ہے۔''

کوئی اور افسر ہوتا تو وہ صفدر کو بُری طرح جھڑک دیتا مگر شاہد کا نظریہ تھا کہ کسی بھی اُلجھے ہوئے کیس میں کسی کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہونا چاہیے، خواہ وہ ماتحت ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ بعض دفعہ ایسی اُلٹی سیدھی رائے دوسرے کو درست سمت کی جانب بھی غور کرنے پر مہمیز کرتی ہے۔

شاہد نے صفدر کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اسے ہدایت کی کہ وہ ہیڈ کوارٹر فون کر کے تین کانسٹیبل اور فنگر پرنٹس کے عملے کو بلا لے۔

اس کے بعد وہ پلٹا اور کوٹھی کی جانب چل دیا۔ صفدر سیل فون کان سے لگائے اس کے پیچھے تھا۔ کمرے میں ابھی تک متعلقہ تقریباً سارے ہی افراد موجود تھے۔

وہ سب ان دونوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جیسے شاید کوئی انکشاف کرنے والے ہوں۔

لہٰذا ابھی شاہد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ہی کمرے کے اس ٹھٹکے ہوئے ماحول میں نیلی کی چیخ گونجی۔

''نوشابہ......!'' اس کی نگاہیں اب دروازے کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ سبھی یکبارگی گردنیں موڑ کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے اور ایک حیران کن اور چونکا دینے والا منظر دیکھ کر ہک دک سے رہ گئے۔

کمرے کے دروازے سے نوشابہ، بالکل ہشاش بشاش سی مطمئن اور زندہ سلامت اندر داخل ہو رہی تھی۔ یوں اپنی آمد پر سب کو اس طرح اپنی جانب چونکتے اور حیرت بھری نظروں سے تکتے پا کر نوشابہ کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نمودار ہوئے جبکہ نعمان، نوشابہ کو یوں خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی بھوت کو دیکھ رہا ہو۔

تب ہی بیگم شاہانہ ہونٹ بھینچے اس کی جانب بڑھیں اور اس کا بازو پکڑ کر بولیں۔ ''تت...... تم زندہ ہو؟ تمہیں اس خونی قاتل نے ہلاک نہیں کیا تھا؟'' ان کی بات سن کر نوشابہ پریشان سی ہو گئی۔

''جی جی...... آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ؟''

''تم اب تک کہاں تھیں؟'' اس بار شاہد نے چند قدم اس کی جانب بڑھ کر سوال کیا۔

''مم...... میں تو بیگم صاحبہ سے اجازت لے کر اپنی ایک رشتے دار سے ملنے گئی تھی۔ ابھی تو پہنچی ہوں۔'' تب ہی بیگم شاہانہ نے اپنی پیشانی کو مسلا۔ شاہد نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔

''میں بھول گئی، یہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے مگر......'' بیگم شاہانہ اُلجھ کر رہ گئیں۔ ''جانے کیوں میرے ذہن سے یہ بات ہی نکل گئی تھی۔''

چند لمحے کمرے میں دھڑکتی ہوئی خاموشی طاری رہی۔ نعمان نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ اس کی حالت بالکل خزاں رسیدہ پتے جیسی ہو رہی تھی۔

انسپکٹر شاہد نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ بیگم شاہانہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے آنٹی! اب مزید کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں رہا ہے۔ آج والے واقعے کے بعد یہ صورت حال واضح ہو جانی چاہیے کہ آپ کا لاڈلا نعمان واقعی ایک ذہنی مریض ہے۔ اب تک جو کچھ، وہ دیکھتا اور بیان کرتا رہا ہے، اس کا کوئی حقیقت میں وجود ہی نہیں تھا۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اب آپ اسے ماہر نفسیات ڈاکٹر قادر شاہ کی کلینک میں باقاعدگی کے ساتھ لے جاتی رہیں اور لگ کر اس کا علاج کروائیں۔''

"شش...... شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو بیٹا!" بیگم شاہانہ کی آواز دکھ سے کانپ رہی تھی۔ ان کا لہجہ افسردہ اور بجھا بجھا سا تھا۔ "مجھے اب یہی کرنا چاہیے، میں تو بس ایک آدھ بار ڈاکٹر قادر کے پاس نومی کو لے کر گئی تھی۔"

☆☆☆

"شکر ہے خدا کا سر جی! آپ نے بھی یہ بات مان ہی لی۔" نواب محل سے باہر آتے ہوئے شاہد علی کے ماتحت صفدر نے کہا۔

"ہاں! بسا اوقات کچھ باتیں سب کے سامنے تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔" شاہد نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور صفدر الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا کار کی جانب بڑھتا رہا۔

اگلے دن صفدر...... شاہد سے الجھے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "سر! مجھے آپ کی کل والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ...... بسا اوقات کچھ باتیں سب کے سامنے تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

"تو پھر؟"

"اس کا مطلب ہے سر! کہ آپ کو نعمان والے کیس سے ابھی تک دلچسپی ہے؟"

آفس چیئر پر براجمان انسپکٹر شاہد اپنے ماتحت کی بات پر... اسرار بھرے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "تم بہت عجیب ہو صفدر میاں!"

"کیا مطلب سر؟" وہ ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ تکتا رہ گیا۔

"ایک طرف تم کسی بھی اُلجھے ہوئے کیس سے جان چھڑانے کے درپے رہتے ہو اور دوسری جانب اسی کیس کے حوالے سے اُلجھ بھی جاتے ہو۔ بہر حال مجھے تمہاری یہ ادا پسند آئی۔"

اس کی بات پر صفدر ہنس دیا۔ بولا۔ "پھر بھی سر! کچھ تو بتائیں۔"

"مجھے لگتا ہے اب عنقریب کوئی بڑا واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ اگر نہیں تو پھر میں چند دنوں میں عملاً اس عجیب و غریب کیس کو کلوز کر دوں گا۔"

"کچھ نہیں ہونے والا سر! زیادہ سے زیادہ وہ ذہنی مریض نومی میاں کسی کو زخمی کر دیں گے۔"

"گڈ! اب تم الٹی سیدھی باتیں کرتے کرتے قریب قریب پہنچے ہو۔" شاہد پُرغور لہجے میں بولا اور صفدر اپنا سر دُھن کر رہ گیا۔

"صفدر! تم کل ایک کام کرنا، دو کانسٹیبلوں کو نوکروں کے بہروپ میں نواب محل تعینات کروا دینا۔"

"یہ کام کل ہی ہو جائے گا سر!" صفدر نے فدویانہ لہجے میں کہا۔

☆☆☆

مگر یہ کل نہ آسکی، کیونکہ اس مقصد سے جب بیگم شاہانہ کو اعتماد میں لینے کے لیے شاہد اپنے اسسٹنٹ صفدر کے ہمراہ نواب محل پہنچا تو وہاں ایک خوں ریز واقعہ ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

شاہد، کسی کے علم میں لائے بغیر ماسوائے بیگم شاہانہ کے، کیونکہ نواب محل میں انہی کا حکم چلتا تھا، وہ ان سے اپنے دو آدمیوں کی، جاسوس یا محافظ کی صورت میں تعیناتی چاہتا تھا۔

ابھی وہ دونوں...... نواب محل کے گیٹ پر ہی تھے کہ اچانک گولی چلنے کی آواز گونجی۔ وہ بُری طرح ٹھٹک گئے۔ گیٹ پر متعین چوکیدار خاور بھی بُری طرح چونکا پھر دوسرا اور تیسرا فائر ہوا تو بے اختیار شاہد بڑبڑایا۔

"اوہو...... شاید ہمیں دیر ہو گئی۔"

وہ تینوں کوٹھی کی جانب دیکھنے لگے۔ شاہد نے فوراً چوکیدار خاور کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔

"دیکھو، خاور! میری بات غور سے سنو، تم فوراً عقبی گیٹ کی طرف جاؤ اور دروازہ بند کر دو۔ کسی کو بھی باہر نہ نکلنے دینا خواہ وہ کوٹھی کا فرد ہی کیوں نہ ہو۔ خاور یاد رکھنا، میری ہدایات پر سختی سے عمل کرنا ورنہ تم قانون اور پولیس کے زیرِ عتاب آجاؤ گے۔ تم سے اس سلسلے میں سخت باز پرس ہو گی۔ ایک کام اور کرنا، وہاں کی ساری بتیاں جلا دینا، تاکہ دیکھنے والوں کو تم اور بند عقبی دروازہ نظر آتا رہے۔ تاکہ آنے والے کو معلوم ہو جائے کہ تم وہاں موجود ہو اور راستہ بند ہے۔"

خاور نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اور تم......" شاہد، صفدر کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم اِدھر ہی کھڑے رہو گے اور یہاں سے ہلو گے بھی نہیں، کوئی اگر باہر زبردستی نکلنے کی کوشش کرے تو اسے اچھی طرح پہچان لینا۔ اس دوران تم ہیڈ کوارٹر فون کر کے کچھ ساتھی بلوا لو۔ پھر دو کو اِدھر متعین کر کے تم اندر کوٹھی میں آجانا۔"

یہ ہدایات دینے کے بعد اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر شاہد اندر کوٹھی کی جانب دوڑا۔

کوٹھی کے اندر ابتری مچی ہوئی تھی۔ نور بانو، نیلی اور نوشابہ ہراساں چہروں کے ساتھ، بیگم شاہانہ کے بیڈروم کے سامنے حیران پریشان کھڑی، دروازہ کھلوانے کی کوششوں میں مصروف نظر آئیں۔
شاہد نے تقریباً ہانپتی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا۔
''کیا گولیوں کی آواز اندر سے آئی تھی؟''
''ج......جی ہاں!'' نیلی نے لرزتی آواز میں کہا۔
''نعمان کہاں ہے؟'' کسی خیال کے تحت شاہد نے سوال کیا۔
''وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ نور بانو نے اُسے دوسرے کمروں میں بھی تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔''
''افتخار آیا تھا؟''
''نہیں۔''
''اور یہ اپنے......سلیم صاحب کہاں ہیں؟''
''وہ تو نیفی پور گئے ہوئے ہیں۔''
''یہ دروازہ اندر سے بند ہے کیا؟''
''بند ہی معلوم ہوتا ہے اندر سے، میں بہت آوازیں دے چکی ہوں مگر امی دروازہ نہیں کھول رہی ہیں۔'' نیلی روہانسی ہونے لگی۔
''کوئی اور راستہ ہے کمرے کے اندر داخل ہونے کا؟''
اس پر نیلی نے نور بانو کی طرف دیکھا اور جواب میں بولی۔ ''اس کے کمرے کا ایک دروازہ امی کے بیڈروم میں کھلتا ہے لیکن وہ بھی بند ہے۔ کھڑکیوں کا نہیں پتا کہ وہ بند ہیں کہ کھلی ہیں۔''
''ہم......'' شاہد کے منہ سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا۔ ''تم سب یہیں ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی شاہد آگے بڑھ گیا۔
بیگم شاہانہ کے بیڈروم میں دو ہی کھڑکیاں تھیں اور وہ دونوں باغ کی جانب ہی کھلتی تھیں۔
شاہد نے دیکھا کہ دونوں کھڑکیوں کے چوبی پٹ بند معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے ایک پٹ پر ہاتھ مارا تو وہ کھل گئی۔ وہ بہت احتیاط سے کارنس پر ہاتھ رکھ کے اچھلا اور کمرے کے اندر کود گیا۔
کمرے میں روشنی تھی۔ اسی روشنی میں شاہد نے ایک لرزا دینے والا منظر دیکھا۔ بیگم شاہانہ اپنے بستر پر نصف اوپر اور نصف نیچے کو جھولتی ہوئی جیسے فرش پر ٹکی رہ گئی تھیں۔ ان کے سینے اور پیٹ پر گولیوں کے نشانات تھے جن سے جس جس خون بہہ رہا تھا۔ یوں بیڈ کی چادر بھی خون آلود ہو رہی تھی۔ اس کی سرخی دیکھ کر ہی اچھے بھلے آدمی کا دل دہل جاتا۔
شاہد نے غور کیا، اسے اندازہ ہوا کہ وہ ... سوتے میں بیڈ سے اٹھنے لگی تھیں کہ قاتل ان کے سر پر پہنچ گیا اور انہیں شوٹ کر دیا اور بیگم شاہانہ کو دوسری سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملی۔
یوں شاہد ہی کے لیے دوسرا منظر بھی چونکا دینے والا ہی تھا۔ بیڈ کے سامنے ایک قدم پر نعمان قالین پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔
شاہد نے جھک کر دیکھا۔ وہ اسے بے ہوش ہی معلوم ہو رہا تھا۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کسی بھی قسم کی ابتری یا کشاکشی کے آثار نظر نہیں آئے۔ ہر چیز اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ شاہد بڑے افسوس کے سے انداز میں کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر موجود سب افراد یکبارگی اندر داخل ہوئے۔ ان میں اس کا اسسٹنٹ صفدر بھی تھا اور دو اس کے ہمراہ کانسٹیبل تھے، باقی وہی افرادِ خانہ تھے جو مذکور ہو چکے تھے۔ شاہد گہری نظروں سے سب کے چہروں کے تاثرات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ نیلی نے یہ منظر دیکھا اور جیسے ایک سکتہ کے

سوری جم! میں تمہاری انگوٹھی نہیں لوٹا سکتی۔ وہی بیچ کر میں نے البرٹ سے شادی کی ہے۔

عالم میں کھڑی رہ گئی تھی۔

البتہ نور بانو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جبکہ ملازمہ نوشابہ کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری رہا۔

''آخرکار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔'' شاہد نے ہولے سے کہا۔ ''آنٹی نے ایک خطرناک نفسیاتی مریض کو ضرورت سے زیادہ دیر تک کھلا اور آزاد چھوڑے رکھا اور اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑ گیا۔ کاش! وہ پہلے ہی میرے مشورے پر عمل کر لیتیں تو آج یہ المناک حادثہ پیش نہ آتا۔'' کہتے ہوئے شاہد نے ایک بار پھر سب کے تاثرات تاڑنے کی کوشش چاہی تو اسے ملازمہ نوشابہ کے چہرے پر غیر معمولی طور پر گہری طمانیت کے آثار نظر آئے۔

اس کا نظریہ تھا کہ جیسا ہوتا نظر آئے لوگوں کی موجودگی میں ویسا ہی ہونے دیا جائے، یوں بظاہر ایسا ہی تاثر رکھا جائے جیسا کہ چھپے ہوئے مجرم کی منشا ہو۔

''میں بھی ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ نومی بنتا تھا۔'' نیلی دکھ سے اور رُندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''امی اور دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ڈھونگ کرتا ہے، نور بانو اسے پسند نہیں وغیرہ، لیکن اب سوچتی ہوں کہ میں شاید غلطی پر تھی۔ وہ واقعی ذہنی اور نفسیاتی مریض ہے، کیونکہ وہ امی سے اتنا پیار کرتا ہے کہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، میں نہیں جانتی کہ حقیقت کیا ہے، مگر اس نے امی پر گولیاں چلائی ہیں تو یقیناً وہ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو گا۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ لوگ سب ڈرائنگ روم میں چلے جائیں اور ہمیں ذرا تحقیقات کرنے دیں۔'' شاہد نے آخر میں کہا۔ ''میں بعد میں سب سے مفصل بیان لوں گا، تب تک برائے مہربانی کوئی کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔''

''لیکن ..... انسپکٹر صاحب! نومی کو تو دیکھیے، وہ بے ہوش پڑا ہے۔'' نیلی بولی۔

''ہم نے پولیس سرجن کو بھی کال کر کے بلایا ہے۔'' اس بار صفدر نے اس سے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ دیگر عملے کے ساتھ یہاں پہنچنے والے ہیں۔ باقی ہم سنبھال لیتے ہیں، پلیز۔''

سب لوگ چلے گئے۔ شاہد اور صفدر، دو کانسٹیبل اندر موجود رہے۔

ڈاکٹر، نعمان کی طرف متوجہ ہوا تھا، تب تک شاہد نے انہیں ضروری معلومات سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کے مشورے پر نعمان کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔

''اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' معائنہ کر لینے کے بعد شاہد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ اشارہ بے سدھ پڑے نعمان ...کی طرف تھا۔

''کچھ یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، لیکن معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ نعمان کی بے ہوشی بہرحال قدرتی نہیں ہے۔''

''شبہ مجھے بھی اسی بات کا ہے۔'' شاہد ایک دم بولا۔ اس کے چہرے سے ایک جوش سا ہویدا تھا۔

''یہ کسی دوا کے زیرِ اثر ہے۔'' بالآخر ڈاکٹر نے جیسے اپنا جملہ مکمل کیا تو شاہد نے مزید کہا۔

''میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق نعمان کو وٹامنز وغیرہ کی گولیاں اور کیپسول کھانے کا خبط رہتا تھا۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنے اسسٹنٹ صفدر کو ہدایت کی کہ وہ اسی وقت نعمان کے کمرے میں جا کر اس کی تمام دوائیں اپنے قبضے میں کر کے لیبارٹری بھیج دے اور پتا کرے کہ آیا ان میں وہی دوا موجود ہے جس کا لیبل لگا ہے یا اس میں کچھ اور بھی ہے۔

صفدر ذرا ہی دیر میں وہ دوائیں سمیت لایا اور پولیس سرجن (ڈاکٹر) سے مہر بند پر دستخط لینے کے بعد ایک کانسٹیبل کے ہاتھ بھجوا دیا۔

اُدھر ڈاکٹر بے ہوش نعمان کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ابتدائی معائنے کے مطابق بیگم شاہانہ کی موت اس گولی سے ہوئی تھی جو اُن کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ یوں موت معائنے کے وقت سے اندازاً ایک گھنٹا پہلے واقع ہوئی تھی، نیز پستول جس سے گولی چلائی گئی تھی، وہ خود بیگم شاہانہ کا تھا، جو ہر وقت ان کے بیڈ روم کی الماری میں موجود رہتا تھا۔ یہ بات نیلی سے پتا چلی تھی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری مردہ خانے روانہ کر دی گئی تھی۔ فنگر پرنٹس کے عملے اور فوٹوگرافر بھی واپس جا چکے تھے اور خیال یہی کیا جا رہا تھا کہ پستول پر صرف نعمان کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔

ادھر نعمان کو بھی ہوش آ چکا تھا اور وہ ذرا سہما ہوا سا، ہوش میں آتے ہی بیڈ پر جا بیٹھا تھا، یوں جیسے سونا چاہتا ہو مگر ان سب کو وہاں موجود پا کر الجھا ہوا سا بھی بن گیا تھا۔ ڈاکٹر اور انسپکٹر شاہد دونوں بہ غور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے۔

''آ..... آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ مم.....

میری امی... کہاں ہیں؟'' نعمان نے شاہد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تمہارے ساتھ کوئی حادثہ ہوا تھا؟ پہلے اس کی تفصیل بتاؤ گے؟'' شاہد نے گمبھیر لہجے میں اور بہ غور اس کی طرف گھورتے ہوئے سوال کیا۔

اس کی بات پر نعمان کچھ سوچتا بن گیا اور پھر یکا یک اس کے چہرے پر خوف طاری ہونے لگا۔ اسی لہجے میں وہ بتانا شروع ہوا۔

''ہاں! میں نے آج پھر اس خونی قاتل کو دیکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا، لل...... لیکن......'' وہ رک کر اپنی پیشانی مسلنے لگا، پھر بیان جاری رکھا۔ ''اس نے امی جان پر گولی چلا دی تھی، نہیں...... شاید...... میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔'' وہ پھر تما اور شاہد علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بتائیں نا انسپکٹر صاحب؟ میری امی کہاں ہیں؟''

''وہی پرانا راگ الاپنا شروع کر دیا اس نے......'' صفدر ہولے سے بڑبڑایا۔

شاہد نے اپنے اسسٹنٹ کے اس تبصرے پر کوئی توجہ نہ دی تھی یا پھر شاید سنا ہی نہ تھا، وہ اس وقت پوری طرح نعمان کے بیان پر ہی نہیں، اس کے تاثرات پر بھی غور کرنے میں مصروف تھا۔

''تم نے اپنی امی جان کو قتل کر دیا ہے مسٹر نعمان!'' صفدر سے نہ رہا گیا۔

''کک...... کیا؟'' نعمان کا منہ کھل گیا۔ پھر وہ زور سے چیخ کر بولا۔ ''نہیں...... یہ جھوٹ ہے۔''

شاہد نے یہ مکالمہ جاری رہنے دیا اور نعمان کے چہرے کی جانب تکتا رہا۔ یوں جیسے وہ ''فیس ریڈنگ'' کر رہا ہو۔

''امی جان کو اسی خونی آدمی نے مارا ہے۔ تب پھر میرا وہ خواب نہ تھا، مم...... مجھے اسی وقت امی جان کے پاس لے چلیں۔'' کہتے کہتے اس کا لہجہ رُندھ گیا۔

''تم پہلے بتاؤ کہ تم نے دیکھا کیا تھا؟'' اس بار ڈاکٹر نے نرم لہجے میں اس سے کہا۔ ''تم اپنی ماں کے کمرے میں بے ہوش پڑے ملے تھے ہمیں۔''

''ہاں! میں نے دیکھا......'' وہ پھر رک گیا۔ جیسے ذہن پر زور دے رہا ہو۔ پھر آگے بولا۔ ''رات کا کھانا کھانے کے بعد میں امی جان کے کمرے میں جا کے بیٹھ گیا تھا۔''

''ایک منٹ......'' شاہد نے انگلی اٹھائی۔ ''کیا کھانا کھانے کے بعد تم نے اپنی دوائیں کھائی تھیں؟''

''ہاں! امی کے کمرے میں جانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنی دوائیں کھالی تھیں اور بعد میں امی کے کمرے میں گیا تھا۔'' وہ رکا۔

''بولتے رہو۔'' شاہد نے کہا۔ وہ آگے بتانے لگا۔

''میں اور امی رات کے کھانے کے بعد کافی ایک ساتھ پیتے تھے، نوشابہ ہمارے لیے کافی لے آئی تھی۔ امی اور میں نے کافی پی اور بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے کہ اچانک مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی، مجھے حیرت تو ہوئی تھی کیونکہ مجھے عام طور پر اتنی جلدی نیند نہیں آتی ہے، مجھ سے بیٹھنا مشکل ہونے لگا تو امی جان میری اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولی تھیں کہ میں جا کر آرام کر لوں۔ میں... اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مجھ سے اٹھا بھی نہیں گیا، اچانک دروازہ کھلا اور میں نے اسی خونی قاتل کو ہاتھ میں ایک خوف ناک پستول پکڑے دیکھا۔ میں خوف سے سُن ہو کر رہ گیا، مارے غنودگی کے میرا دماغ اب بھی بُری طرح گھوم رہا تھا۔ ادھر اس خونی قاتل نے اندر آتے ہی امی پر گولی چلا دی اور میں ان کی جانب بڑھا ہی تھا کہ لڑکھڑا کر گرا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔''

''اس سے آگے میں بتائے دیتا ہوں۔'' صفدر بولا۔
شاہد اور ڈاکٹر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ شاہد نے اسے دانستہ کہنے کا موقع دیا۔

''یہ ساری واردات سیدھی سجاؤ ہے۔'' صفدر بول رہا تھا۔ وہ نعمان کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتا بھی جاتا۔ ''تم کمرے میں داخل ہوئے۔ پستول تمہیں معلوم تھا کہ تمہاری امی کہاں رکھتی ہیں، ممکن ہے وہ تم نے پہلے ہی نکال لیا ہو، تم نے اپنی ماں پر تین گولیاں داغ ڈالیں، جب تم جذباتی شاک سے گزرے تو صدمے کے سبب تمہارے اعصاب نے کام کرنا چھوڑ دیا اور تم نڈھال ہو کر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ دراصل صدمے نے تمہیں بے حال کر دیا کہ تم اپنی دماغی خرابی کے باعث یہ کیا کر بیٹھے۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو تمہاری ماں خون میں لت پت بیڈ پر پڑی تھیں اور تم قالین پر پستول ہاتھ میں لیے ڈھیر تھے۔''

صفدر نے اپنی بات ختم کی، ڈاکٹر سوچتا بن گیا مگر شاہد بہ غور نعمان کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ یوں جیسے وہ اپنے اسسٹنٹ کے اس بیان کے بعد اس کے چہرے سے کچھ ''اخذ'' کرنا چاہ رہا ہو۔ منتظر بھی ہو کہ اب نعمان کا کیا ردِعمل سامنے آتا ہے تاکہ اس کی کسوٹی پر آگے قیاس قائم کیا جا سکے۔

نعمان نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، تم لوگوں کو مجھ پر ابتدا ہی سے اس بات شبہ رہا ہے، جو سراسر غلط ہے۔'' پھر وہ شاہد کی طرف دیکھ کر اس سے مخاطب ہو کے بولا۔

''انسپکٹر صاحب!'' اس کے لہجے میں اب سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ مجھے پاگل سمجھتے آئے ہیں، آپ لوگوں نے تو کبھی میری باتوں پر یقین بھی نہیں کیا۔ شاید اب بھی نہ کریں۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ میں نے امی جان کو نہیں مارا ہے، یہ اسی خونی قاتل کی حرکت ہے۔''

''کم از کم میں تمہاری باتوں پر یقین رکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔ ''تم یہ دوا کھالو اور آرام کرو، باقی باتیں صبح ہوں گی۔''

''لیکن امی......؟'' نعمان غم تلے لرزیدہ لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں سے اب آنسو بہنے لگے تھے۔

''اللہ کی یہی مرضی تھی۔ تم یہ گولیاں کھالو۔'' ڈاکٹر نے کچھ گولیاں اُسے دیں اور پانی کا گلاس بھی تھما دیا۔ ''اب جو ہونا تھا ہو گیا، تم دوا کھالو اور آرام کرو، ہم کچھ کرتے ہیں اور تمہیں بتا دیں گے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہی ہوگا۔''

نعمان نے دوا کھالی۔ پھر اسے بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ پھر تینوں باہر نکل آئے۔

دوسرے کمرے میں آکر ڈاکٹر نے ان دونوں کے سامنے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں بھی صفدر کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ بلکہ کافی حد تک آپ کو بھی اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔'' اس کا اشارہ انسپکٹر شاہد علی کی طرف تھا۔

''کہ...... نعمان ایک خطرناک ذہنی اور نفسیاتی بیماری کا کیس ہے۔ تاہم اس وقت میرے ذہن میں کچھ شکوک و شبہات بھی آتے ہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا سوچنے کے سے انداز میں تھا۔ اب شاہد علی بڑی دلچسپی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ نعمان جس قدر بھی ذہنی یا نفسیاتی ذہنی مریض سہی، لیکن اتنی خطرناک اور جان لیوا حرکت کی میں اس سے توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ اپنی ماں کو بھی نہ پہچانے اور اسے اکٹھی تین گولیاں مار دے۔''

''گڈ۔'' شاہد کے منہ سے توصیفی انداز میں برآمد ہوا۔ ''پولیس ڈپارٹمنٹ کے ساتھ کام کرتے ہوئے آپ کو بھی کچھ تجربات حاصل ہوتے رہے ہیں، مگر افسوس صفدر......'' اس نے آخر میں اپنے اسسٹنٹ کی طرف دیکھا۔

''تمہیں میں نے پورا موقع دیا کیس سمجھنے کا، مگر تم بھی روایتی انداز میں سوچتے رہے۔''

''تو پھر آپ کا کیا خیال سر؟'' صفدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میرا خیال یہی ہے کہ نعمان ٹھیک کہتا ہے۔ اس خونی قاتل نے اسے یا اس کی بیماری کو ''ہتھیار'' کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش چاہی ہے۔''

''شواہد؟'' صفدر نے سوالیہ نظروں سے اپنے افسر کی طرف دیکھا۔

''شواہد تلاش کرنے سے ملیں گے، اور کچھ دماغ چلانے سے بھی۔'' شاہد نے پورے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔ یوں لگا جیسے وہ اصل قاتل تک پہنچ گیا ہو۔

''تب آپ ہی کچھ بتائیں؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے انسپکٹر شاہد علی سے کہا تو وہ بولا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل قاتل اب بھی سات پردوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے اور بہت ہی چالاک ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بھی دیگر لوگوں کی طرح بیگم شاہانہ کو یہی مشورہ دیا کہ نعمان کو کسی اچھے ماہرِ نفسیات کو دکھا دیں، انہوں نے میرے مشورے پر اس وقت عمل کیا تھا جب ایک بار نعمان نے ملازمہ نوشابہ کے سلسلے میں جھوٹ بولا تھا یا اس سے بلوایا گیا تھا کہ یہ بھی اسی چھپے ہوئے چالاک مجرم کی چال بھی ہو سکتی تھی، خیر، ڈاکٹر قادر شاہ ایک تجربہ کار ماہرِ نفسیات ہے۔

اس نے جب نعمان کا تفصیلی تجزیہ کیا اور میں اس سے جا کر نعمان سے متعلق ملا تو اس نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں اور نعمان کی بیماری سے متعلق میں نے کئی باتیں ذہن نشین کر لیں تاکہ آئندہ جو بھی واقعات ہوں تو انہی باتوں کی روشنی میں ان کا تجزیہ بھی کرتا رہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر انسپکٹر شاہد ڈرامائی انداز میں رکا۔ پولیس سرجن اور صفدر بڑے اشتیاق کے ساتھ شاہد کی باتیں سن رہے تھے۔

''تب پھر آپ نے کیا محسوس کیا ہے کہ مجرم کون ہے؟ نعمان ہی ہے یا پھر کوئی اور......؟'' پولیس سرجن نے اس بار قدرے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ جواب میں شاہد نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

''مجرم نعمان نہیں کوئی اور ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ نعمان کی نفسیاتی بیماری کو آڑ بنا کر اپنے جرم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا، میرا خیال ہے اب وہ یہ کام کر چکا ہے، کیونکہ

اس کا ٹارگٹ بہرحال نعمان نہیں بیگم شاہانہ ہی تھیں۔ ذرا میرے تجزیے کے اس نقطے پر غور کریں۔ نعمان ہمیشہ اس خونی قاتل کو اپنے آپ پر ہی حملہ کرتے ہوئے دیکھتا آیا تھا۔ مگر آخر میں جب اس نے قاتل کو دیکھا تو نعمان اس کے لیے تر نوالہ ہونا چاہیے تھا یعنی اسے وہ آسانی سے گولی مار سکتا تھا مگر اس نے اس کے بجائے اس کی ماں کو نشانہ بنایا جو اس کی پلاننگ کا ''کلائمیکس'' تھا۔''

''یہ حرکت تو نعمان بھی کر سکتا ہے، سر!'' اس بار صفدر نے کہا۔

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' شاہد نے ہولے سے کہا اور آگے بولا۔ ''یہی تو سمجھنے والی بات ہے، میں بتاتا ہوں۔ ایک نفسیاتی مریض اگر کسی فرضی ہستی کو دیکھتا ہے تو اس کی شکل یا ہیئت کہہ لیں وہ اس قدر واضح نہیں ہوتی جتنی کہ نعمان دیکھا کرتا تھا، وہ بالکل مبہم وجود یا سائے جیسی ہوتی ہے۔ دوسری بات نفسیاتی رو سے یہ بھی میرے لیے قابل غور رہی کہ فرضی وجود کو ایک نفسیاتی مریض کبھی بھی خود سے جسمانی طور پر متصادم، باہم دست و گریباں حتیٰ کہ خود پر حملہ آور ہوتا بھی نہیں دیکھتا۔ سب سے آخری اہم بات جس سے میں نے نتیجہ قائم کیا کہ مجرم نعمان نہیں بلکہ کوئی اور ہے، وہ یہ کہ اگر مریض اپنے تحت الشعور کی چھپی ہوئی کسی خواہش کی وجہ سے کوئی اقدام کر بھی بیٹھتا ہے تو پھر اپنے اس اقدام کے بعد وہ جذباتی و روحانی تسکین بھی محسوس کرتا ہے، یوں وہ فوراً اعتراف کر لیتا ہے کہ یہ کام اسی نے ہی کیا ہے، یقین کریں میری بات کا اگر نعمان نے، بیگم شاہانہ کا قتل کیا ہوتا تو وہ اس کا فوراً اقبالِ جرم کر لیتا، یہ ایک منظم سازش ہے۔''

''مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہونے لگا ہے۔'' پولیس سرجن نے تعریفی نظروں سے شاہد کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''ڈاکٹر! یقین کریں میں خود بھی دھوکا کھا جاتا اگر میں نے اس کے معالج ڈاکٹر قادر شاہ سے مفصل ملاقات نہ کی ہوتی، کیونکہ مجھے شبہ تھا کہ مجرم بھی تھوڑی بہت نفسیات کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے، لہٰذا میں نے بھی یہی حربہ استعمال کیا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو میں محسوس کرتا رہا ہوں۔''

''ہوسکتا ہے سر! آپ صحیح ہوں مگر اب یہ کیسے پتا چلے کہ اصل مجرم کون ہے؟'' صفدر بولا۔

''اصل مجرم کو بھی بھانپ چکا ہوں۔'' انسپکٹر شاہد علی نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی پولیس سرجن اور صفدر دونوں ہی چونکے تھے۔

''کون ہے وہ سر؟'' صفدر سے رہا نہ گیا۔

''کل صبح تک انتظار کرو......'' شاہد نے کہا۔

''اب کیا کریں؟'' پولیس سرجن بولا۔

''اپنے یہاں سے واپس لوٹ جانے کا اعلان......'' شاہد نے سوچتے ہوئے کہا۔ پھر صفدر کو ہدایت کی کہ ان سب سے کہہ دو رات بہت ہو گئی ہے۔ باقی کے بیانات کل لیے جائیں گے۔''

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ سرک چکی تھی۔ ہر سُو گہرا سناٹا طاری تھا۔ آسمان پر چاند بھی نہیں تھا اور اسی لیے اندھیرا زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں ایک سایہ نواب کوٹھی سے باہر نکلا اور باغ کے درختوں اور پودوں سے ہو کر عقبی گیٹ کی طرف جانے لگا۔

اس پُراسرار سائے کے عقب میں ایک اور سایہ بھی تھا جو اول الذکر سائے سے نسبتاً قد و قامت میں چھوٹا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہی معلوم ہوتے تھے۔

یوں وہ دونوں گیٹ کے قریب پہنچ کر رکے، پھر اول الذکر سائے نے گیٹ کھولا اور باہر نکل گیا، البتہ دوسرے سائے نے قدم باہر نہیں نکالا تھا، تاہم پہلے والے سائے کے باہر نکلتے ہی وہ نہایت اطمینان کے ساتھ گیٹ کا دروازہ بند کر کے واپس کوٹھی کی جانب لوٹ گیا۔

پہلا سایہ سائڈ اسٹریٹ پر آیا وہاں کچھ روشنی تھی۔ وہ داڑھی مونچھ والا ایک توانا مرد تھا جو اب سوٹڈ بوٹڈ نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک بریف کیس بھی نظر آرہا تھا۔

وہ سائڈ اسٹریٹ سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مین روڈ پر پہنچ کر رک گیا۔ اگرچہ اسے اندازہ تھا کہ کوئی ٹیکسی ایسے وقت میں ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے مگر وہ اس لیے پُرامید تھا کہ اسی مین روڈ سے آگے ایک ریلوے اسٹیشن تھا اور اس وقت دو اَپ اور ڈاؤن ٹرینوں کی آمد و رفت ہونے کے سبب کوئی ٹیکسی سواری بھی اسے لفٹ دے سکتی تھی۔ بشرطیکہ اس کا رخ اسٹیشن کی طرف ہو۔

اسی آسرے پر وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا رہا۔ جلد ہی اس کی مراد بر آئی مگر ایک حد تک کیونکہ ٹیکسی اسٹیشن کی طرف سے آرہی تھی اور شہر کی جانب اس کا رخ تھا جبکہ اس نے اسٹیشن جانا تھا، تاہم وہ اس پر بھی شاکر تھا کہ...... ٹرین میں ابھی وقت ہے، چھوٹ بھی گئی تو کیا مسئلہ تھا، صبح سویرے والی ٹرین تو مل ہی جاتی، اسی ٹیکسی میں وہ واپس آسکتا تھا۔ بشرطیکہ

ٹیکسی میں ایک آدھ ہی سواری ہوتی۔
اس نے اشارہ کر دیا۔ ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس اس کے چہرے پر پڑی اور وہ رکے بغیر اس کا منہ چڑا کر آگے نکل گئی۔ لیکن جلد ہی اس کی قسمت نے پھر یاوری کی اور مطلوبہ سمت سے ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی، اس نے فوراً ہاتھ کا اشارہ دیا۔ وہ اس کے قریب آکر رک بھی گئی۔ اندر ایک ہی سواری موجود تھی۔
''کہاں جانا ہے جناب؟'' بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی والے ٹیکسی ڈرائیور نے کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال کر پوچھا۔ عقب میں ایک ضعیف آدمی سوار تھا۔ وہ سواری تھی۔
''مجھے اسٹیشن جانا ہے۔ اگر آپ بٹھالیں تو مہربانی ہو گی، کرایہ پورا دوں گا۔'' سوٹ پوش نے لالچ دیا۔ مونچھوں والے ڈرائیور نے پیچھے گردن موڑ کر بوڑھے سے کہا۔
''کیوں بڑے میاں! ثواب کا ہی کام ہے، بیٹھالیں اسے؟''
''میاں! ثواب تم نے میرے لیے چھوڑ دیا اور پیسے خود بناؤ گے، چلو ٹھیک ہے، یہ بھی منافع کا سودا ہے۔'' بوڑھا ہنس کر بولا۔
سوٹ پوش اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔
دفعتاً ٹیکسی کو جھٹکے لگنے لگے۔
''ارے...... پیٹرول ختم ہو گیا۔'' ڈرائیور بڑبڑایا۔
''چلو، قریب ہی پمپ اسٹیشن ہے۔ بھروا لیتے ہیں۔'' وہ خود سے ہی بولا اور ٹیکسی اچانک ایک اور ذیلی سڑک کی طرف موڑ لی۔ سوٹ پوش ذرا بے چین سا ہوا مگر پھر پُرسکون ہو گیا۔
ٹیکسی تھوڑی ہی دیر بعد پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے اندر داخل ہونے لگی تو سوٹ پوش چونکا۔
''یہ کیا......؟ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''
''پولیس کو شرفِ میزبانی عطا کرنے......'' مونچھوں والے ڈرائیور نے طنزیہ ہنسی سے کہا اور سوٹ پوش اپنا بریف کیس سنبھالے دروازہ کھول کر اترنے کی کوشش کرنے لگا تو بوڑھے نے اسے دبوچ لیا۔ اس میں اچانک طاقت آگئی تھی۔ یہی نہیں، مونچھوں والے ڈرائیور نے بھی پستول نکال کر اس کی نال کا رخ سوٹ پوش والے کے چہرے کی طرف کر دیا۔
اسی وقت اندر سے تین چار کانسٹیبل پھرتی سے دوڑتے ہوئے ٹیکسی کے قریب آن پہنچے اور سوٹ پوش کو اتار لیا۔ پل کے پل سوٹ پوش کو یہ سب پلانٹڈ محسوس ہونے لگا اور وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ تاہم وہ اب بھی نقلی داڑھی مونچھیں لگائے ہوئے ڈرائیور کو نہیں پہچان پایا تھا جو انسپکٹر شاہد تھا اور عقب میں بیٹھی بوڑھے کے روپ میں سواری، اس کا اسسٹنٹ صفدر تھا۔

☆☆☆

''جی ہاں! اصل مجرم سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکا ہے، لیکن......'' انسپکٹر شاہد ڈرامائی انداز میں تھما تو سب پلک جھپکائے بغیر اسی کی جانب تکتے رہے۔
شاہد علی نے صبح تڑکے ہی نواب محل آکر اصل مجرم کی گرفتاری کا انکشاف سب کے سامنے کر ڈالا تھا، مگر اس سے پہلے اس نے نشست گاہ میں چوکیدار اور مالی سمیت تمام اہلِ خانہ کو جمع ہونے کی ہدایت کر دی تھی۔
''اصل مجرم کون نکلا پھر انسپکٹر صاحب؟'' نیلی نے پوچھا۔
''لیکن...... آپ تو آگے بھی کچھ کہنا چاہ رہے تھے، پلیز! اپنا جملہ مکمل کریں پھر نیلی آپی کی بات کا جواب دیجیے گا۔'' نعمان نے فوراً کہا۔
''لیکن یہ کہ......'' شاہد نے پھر ڈرامائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے بیان مکمل کیا۔
''اصل مجرم کو تو ہم سلاخوں کے پیچھے پہنچا چکے ہیں مگر ابھی اس کے معاون کار مجرم ساتھی کی گرفتاری باقی ہے۔''
اس ایک اور انکشاف پر وہ سب پھر چونکے اور اس بار ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے تو ملازمہ نوشابہ نے جیسے بے اختیار پوچھ لیا۔
''وہ ساتھی کون ہے؟''
شاہد نے معنی خیز نظروں سے نوشابہ کی طرف دیکھا اور اسی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''تم......''
''کیا؟'' بیک وقت کئی لوگوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نوشابہ کی حالت ایک دم پتلی ہونے لگی۔ اسے غش آنے لگا اور وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ شاہد نے اپنے اسسٹنٹ صفدر کو اسے سنبھالنے کا کہا۔ بالفاظ دیگر محتاط رہنے کی تاکید تھی یہ، کہ کہیں نوشابہ بھانڈا پھوٹ جانے پر کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔
''اصل مجرم کا نام تو بتا دو؟'' نیلی پھر بولی۔
''آپ کے شوہر نامدار میاں سلیم...... ہی اصل مجرم

اور اپنی ساس کے قاتل نکلے ہیں۔" بالآخر شاہد نے آخری انکشاف بھی کر دیا۔ سب کے منہ کھل گئے۔

"ہاں! جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مجھے پہلے ہی شبہ ہو چکا تھا کہ نعمان کی نفسیاتی بیماری کی آڑ میں کوئی خطرناک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس کے لیے مجھے اس کے نفسیاتی معالج ڈاکٹر قادر شاہ سے بھی رجوع کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد میں نے اپنے طور پر بھی خفیہ تحقیق کا دائرہ بڑھانا شروع کر دیا تھا کہ اس سے گھر کے کس شخص کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، نیز یہ کہ مجرم کا تعلق ... افرادِ خانہ سے ہو سکتا ہے۔ ابتدا میں دو نام میرے سامنے مشکوک حیثیت میں آئے مگر جلد ہی میں نے انہیں رد کر دیا، لیکن جب نیلی کے شوہر سلیم کے بارے میں تحقیق کی تو پتا چلا کہ موصوف بے شک ایک چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے مگر وہ ایک ناکام شخص رہا تھا۔ نتیجے میں وہ کئی لوگوں کا مقروض بھی تھا۔ حیلے بہانوں سے اس نے اپنی بیوی نیلی کو اپنی ساس صاحبہ سے کچھ رقم اینٹھنے کا بھی کہا تھا جو اسے نہ مل سکی، موصوف بیوی یا ساس پر زور زبردستی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے، اس کے لیے اس نے اپنے سالے کی نفسیاتی بیماری کو آڑ بنا کر ایک خوفناک کھیل کی ابتدا کی۔

حضرات! کچھ لوگ منصوبہ ساز ہوتے ہیں اور کچھ منصوبہ باز...... منصوبہ ساز خود منصوبہ بناتے ہیں مگر منصوبہ باز...... بنے بنائے پلیٹ فارم پر اپنے منصوبے کی ٹرین چلاتے ہیں۔ سلیم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ نعمان کی صورت میں ایک بنا بنایا منصوبہ اس کے سامنے تھا۔ جس کے مطابق...... اپنے سالے کو نفسیاتی مریض ظاہر کر کے اس کی آڑ میں خود بیگم شاہانہ کا خون کر ڈالے، یوں اسے دوہرا فائدہ ہوتا کہ جائداد پر نیلی اور نعمان دونوں کا ہی حق تھا، نعمان پاگل خانے پہنچ جاتا تو ظاہر ہے کہ اس کا حصہ یا کم از کم اس کی نگرانی نیلی یا بالفاظ دیگر سلیم کے ہاتھ میں آ جاتی۔ نیلی سخت مزاجی کے باوصف پیار اور محبت تلے وہ سلیم کے سامنے موم کی گڑیا ہی تھی۔

خیر اس چالاک آدمی سلیم نے اس منصوبے پر عمل کر ڈالا، لیکن جب اس نے اپنے منصوبے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا تھی، یعنی اپنی ہی ساس صاحبہ کا قتل کرنا تھا تو چالاک منصوبہ باز آدمی نے سب سے پہلے نواب محل سے اپنی موجودگی کو ہٹانے کے لیے کسی کاروباری دورے کا نام لے کر فیض پور کی جانب روانگی اختیار کر ڈالی۔ اس مقصد کے لیے ایک سیکنڈ لاسٹ کھیل کے لیے اسے ایک ساتھی کی تلاش تھی تاکہ اس کے منصوبے میں کوئی ذرا سی بھی کسر باقی نہ رہے، وہ ساتھی اس نے نوشابہ کو چکنی چپڑی باتوں میں پھنسا کر بنایا تھا، جس نے اس کی ہدایت کے مطابق اُس روز باغ میں اپنی اس خونی قاتل کے ہاتھوں ہلاکت کا ڈراما رچایا تھا اور بعد میں ہم سب کے سامنے زندہ سلامت آ گئی تھی، تاکہ ہم سب یہی سمجھیں کہ یہ سارا نعمان کی نفسیاتی بیماری کا قصور تھا۔ وہی ہوا۔

پھر منصوبے کی آخری کڑی میں...... نوشابہ نے سلیم کے ہی کہنے پر نعمان کی کافی میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ سلیم خفیہ طور پر نواب محل میں ہی چھپا بیٹھا تھا۔ لہٰذا جب بیگم شاہانہ کا قتل ہوا تھا جو ظاہر ہے سلیم نے ہی کیا تھا، میں سمجھ گیا کہ سلیم اسی کوٹھی میں ہی نوشابہ کی مدد سے چھپا بیٹھا ہوگا۔ اسی لیے میں نے دانستہ اپنے اور اپنے عملے کا نواب کوٹھی سے نکل جانے کا اعلان کروایا اور یہی نہیں بروقت یہاں پہنچ بھی گیا تھا، پھر میں نے کچھ ایسے انتظامات کروائے کہ سلیم نواب محل سے نکل نہیں پایا جیسا کہ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ اپنی واردات کرتے ہی محل سے نکل جائے گا۔

رات میں، صفدر اور میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ تب ہی میں نے دو مشکوک سایوں کو نکلتے دیکھا اور بعد میں ایک ہی سایہ گیٹ سے نکل کر جب باہر کو نکلا تو میں اور صفدر جلدی سے بھاگ کر...... اس ٹیکسی تک پہنچے جو ہم نے قریب ہی جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ میں چھپا رکھی تھی۔ اس کا بندوبست ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔

باقی کی کہانی آپ سب کے سامنے ہے۔"

سب گنگ کھڑے تھے۔ آخر میں شاہد نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ نیلی اب اپنے مجرم اور قاتل شوہر کے بارے میں کیا آخری فیصلہ کرتی ہے۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ پورا ہو کے رہتا ہے، اسی لیے میرا خیال ہے کہ نیلی کو افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی ابھی لمبی زندگی پڑی ہے۔ وہ بہتر فیصلہ کر سکتی ہے، اپنے بُرے بھلے کی تمیز بھی رکھتی ہے۔ باقی رہے نعمان اور نور بانو، ان دونوں کو... میرا یہی مشورہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں......"

شاہد نے اپنی بات ختم کی تو نشست گاہ میں نیلی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

❖ ❖ ❖

SCANNED BY: ATA-UL-MUSTAFA

زمانوں کی بازگشت

کہانیاں... داستانیں... اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں۔ خیالات محسوسات ازل سے انسان کے ساتھ پیوست ہیں... لیکن انہیں صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا... دوسروں تک پہنچانا انسان نے آہستہ آہستہ اور وقت گزرنے کے ساتھ سیکھا ہے... منظر امام کا شمار بھی ایسے ہی لکھاریوں میں ہوتا ہے... ان کی کہانیوں میں کہیں کھوئے ہوئے زمانوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے... تو کہیں حال و مستقبل سے جڑے واقعات... اور سانحات کے نوحے پڑھنے کو ملتے ہیں... **منظر امام** صحیح معنوں میں ایک "کوزہ گر" ہیں... اختصار نویسی میں وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں... مزاح کمال کا لکھتے ہیں... معاشرے میں بکھری ہولناک سچائیوں کو بڑے سہل میٹھے لفظوں میں ایسے بیان کر دیتے ہیں کہ قاری کے لبوں پر بے ساختہ مسکان بکھر جاتی ہے...

# دنیا گول ہے

کچھ کیفیات بڑی عجیب ہوتی ہیں... جیسے اپنی محبوبہ کا دیدار کرتے ہوئے جو لطف سرور اور بے بس کر دینے والی پُراسرار اور طاقت ور کیفیت طاری ہوتی ہے... یہ خوشگوار ہو یا غم انگیز... عمل پر ابھارتی ہے... کچھ کر گزرنے پر اکساتی ہے... محبت کے سرچشمے میں بہتے... ڈوبتے اور پھر اُبھرتے کرداروں کی بے قراری و کشمکش...

*محبت کے پیچ و خم میں الجھے نقشِ قدم اور کتنی دور...... ایک دلچسپ تحریر*

"میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ مردوں کے وعدے جھوٹے ہوا کرتے ہیں۔" نوشابہ نے کہا۔

کئی دنوں سے اس کا یہی موڈ تھا۔ کہاں تو یہ کہ وہ جب مجھ سے ملتی تو سرشار ہو جاتی۔ اس طرح لہکتی جیسے کوئی پودا بہار کے جھونکوں سے لہلہا رہا ہو...... لیکن اب وہ خاموش ہی رہتی تھی۔

اگر کچھ پوچھتا تو ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتی۔ نہ جانے کیوں۔

وہ مجھ سے ایک تقریب میں ملی تھی۔ پھر ملتی ہی چلی گئی۔ بہت دنوں کے بعد ایک ایسی لڑکی ملی تھی جس میں حسن بھی تھا

اور ذہانت بھی تھی۔ ورنہ عام طور پر ان دونوں خوبیوں کا ملاپ بہت کم ہوا کرتا ہے لیکن نوشابہ میں دونوں خوبیاں تھیں۔

اسی لیے میں اس کی طرف راغب ہوا تھا۔ میں نے اس کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ شاعری کی۔ اس کو عنوان بنا کر نظمیں لکھیں۔ اس کے خواب دیکھتا رہا۔ دوسری ملاقات میں ہی میں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''نوشابہ اگر میں تمہیں شادی کے لیے پروپوز کروں تو تم کیا کہو گی؟''

''ابھی سے؟ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو سمجھا بھی نہیں ہے۔''

''کیا ضرورت ہے سمجھنے کی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تو اتنا سمجھ لیا ہے کہ تم میری زندگی کو خوش گوار بنا دو گی۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ اسے لپک کر میرے سوال کا جواب دینا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس وہ سوچ رہی تھی۔

''کیا بات ہے تم کیا سوچنے لگیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔''

''پوچھو۔''

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''بے وقوف لڑکی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ مجھے تم سے اتنی محبت ہے۔ تم جس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

''چلو اب یہ بتاؤ کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہارے لیے آسمان سے ستارے توڑ کر لے آؤں گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں تمہیں ہر وقت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ، کیا تم مجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پھر وہی سوال کیا تم نے...... میرا جواب ہے ہاں، ہاں، ہاں۔''

''تو پھر تم میرے لیے انور کو راضی کر لو۔ اس سے کہو کہ میرا دل نہ توڑے۔''

''انور؟ کون انور؟'' میں چکرا کر رہ گیا تھا۔

''میرا محبوب۔ جس سے میں نے محبت کی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' میں پریشان ہو گیا تھا۔
''ہاں، یہ سچ ہے۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''تم کو میں نے پسند کیا ہے۔ چاہا ہے۔ دوست بنایا ہے۔ اپنا سب سے بڑا ہمدرد خیال کیا ہے۔ لیکن محبت میں انور سے کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔''
''تو پھر تم نے مجھ سے اتنے وعدے کیوں کیے تھے؟''
''ارسلان! کیا تمہیں یاد نہیں کہ میں نے تم سے کبھی محبت بھرے وعدے نہیں کیے، کبھی اظہار نہیں کیا ہوگا کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔''
میں بھنا کر رہ گیا۔ یہ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ تو خود میں نے سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔
''اب یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''تم میرے لیے آسمان کے تارے نہ لاؤ۔ بس میرے محبوب کو مجھ سے ملوا دو۔ میں بہت بے بس ہو گئی ہوں، کیونکہ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، وہ میرا فون ریسیو نہیں کرتا۔ کسی طرح اسے پیغام بھجواتی ہوں تو کوئی جواب نہیں دیتا۔ اگنور کرتا ہے۔ تم اس کے پاس جا کر میرا حال بتاؤ۔ اس سے کہو کہ میں اس کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ اگر وہ نہ ملا تو نہ جانے کیا کر گزروں۔''
''تمہارا کیا خیال ہے میں یہ کام کر سکوں گا؟''
''ہاں، کیونکہ تم نے خود ہی کہا ہے کہ تم مجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے ہو۔ تو تم میری خوشی کے لیے یہ سب کرو گے۔''
اب میں کیا بول سکتا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اس وقت میرے دل کی جو کیفیت ہو رہی تھی وہ میں ہی جانتا ہوں۔
دل چاہ رہا تھا کہ اس کم بخت کا گلا ہی دبا دوں۔ لیکن کیا کرتا۔ مجبور ہو کر میں نے ہامی بھر لی۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہاری خوشی کی خاطر یہ بھی کر لوں گا لیکن اس کے بعد بھی تم مجھ سے ملتی رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ ملنا ہی چھوڑ دو۔''
''دیکھو، سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔ اگر وہ میری زندگی میں شامل ہو گیا تو پھر مجھے کسی اور کی کیا ضرورت ہوگی؟''
''ہاں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ٹھیک کہتی ہو۔ پھر تم مجھ سے ملو گی تو بے وفائی ہی ہوگی۔''
اس نے مجھے انور کا پتا بتا دیا۔ وہ کسی فرم میں اچھے عہدے پر تھا۔
میں اپنے آپ کو کوستا ہوا اس فرم میں پہنچ گیا۔ انور ایک ہینڈسم نوجوان ثابت ہوا تھا۔ خوش اخلاق بھی تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح کہوں کہ اے خوش نصیب نوجوان، میں تیری اس محبوبہ کا پیغام لے کر تیرے پاس آیا ہوں جس سے میں خود محبت کرتا ہوں۔ لیکن وہ تیرے فراق میں تڑپ رہی ہے۔ جا اس کو اپنا لے۔ اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔
اندازہ لگا لیں کہ کیسی مضحکہ خیز سچویشن تھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا ہوگا لیکن ہو رہا تھا۔
انور ایک علیٰحدہ کمرے میں بیٹھتا تھا۔ اس نے مجھے اسی کمرے میں بلا لیا تھا۔
''جی فرمائیں، آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''انور صاحب میں ایک مظلوم انسان ہوں۔'' میں نے اسٹارٹ لیا۔
''سمجھ گیا۔'' اس نے ہنکاری بھری۔ ''آپ شاید چندہ مانگنے آئے ہیں؟''
''ارے نہیں بھائی، میں ایک مظلوم اور بے بس لڑکی کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔''
''میں سمجھا نہیں۔''
''اس لڑکی کا نام نوشابہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم یقین کرو کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ پاگل ہو رہی ہے تمہارے لیے۔''
''ہاں، وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم اسی نوشابہ کی بات کر رہے ہو تو......''
''وہ سلطان آباد نمبر تین میں رہتی ہے۔''
''ہاں تو پھر وہی نوشابہ ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا ہوا ہے اسے؟''
میں نے اسے بتا دیا کہ اس کا کیا حال ہے۔ وہ کتنی بے قرار ہے کیونکہ انور نے اس سے رابطہ ختم کر دیا ہے۔ وہ اس کے فون کا جواب بھی نہیں دیتا۔
''ہاں اس کا شکوہ درست ہے۔'' اس نے اقرار کر لیا۔ ''میں اس سے دور ہو گیا ہوں۔''
''ایسا مت کرو، لوٹ جاؤ اس کے پاس۔ ورنہ وہ پاگل ہو جائے گی۔ لڑکیاں بہت نازک ہوتی ہیں۔''
''جانتا ہوں میں، لیکن میری کنڈیشن اس سے مختلف نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔
''تو میں اسے یہ خبر سنا دوں کہ تم بھی اس کے لیے بے قرار ہو۔''
''تم غلط سمجھے، میں اس کے لیے نہیں عالیہ کے لیے بے قرار ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''عالیہ کے لیے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ عالیہ کون ہے؟''

''میری محبت۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے اس سے بے پناہ محبت کی ہے۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اگر محبت کرنے والا منہ پھیر لے۔ اگنور کرنا شروع کر دے تو کتنی اذیت ہوتی ہے۔ زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا احساس تمہیں نوشابہ سے مل کر ہو گیا ہو گا لیکن میں اس کے لیے مجبور ہوں۔ میرے پیروں میں عالیہ کی محبت کی زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے میں نوشابہ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

''سمجھ گیا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں اس کیفیت کو محسوس کر سکتا ہوں۔''

''دیکھو بھائی، تم مجھے ایک دردمند دل رکھنے والے انسان معلوم ہوتے ہو۔ اسی لیے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ پلیز کسی طرح عالیہ کے پاس جا کر اس کا دل میری طرف سے صاف کر دو۔ اسے بتاؤ کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟ یعنی میں اب عالیہ کے پاس جاؤں؟''

''ہاں، جس طرح تم نوشابہ کے لیے میرے پاس آئے ہو۔ اسی طرح اب تم میرے لیے عالیہ کے پاس چلے جاؤ، پلیز۔''

''لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں یہ کام کر لوں گا؟''

''میرے دوست تمہارا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ تم ایک ہمدرد انسان ہو۔ تم کسی کو بے قرار نہیں دیکھ سکتے۔''

میں الجھ کر رہ گیا۔ خدا جانے کس چکر میں پڑ گیا تھا۔ وہ شعر یاد آ رہا تھا ''میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے، سر آئینہ میرا عکس ہے پس آئینہ کوئی اور ہے۔''

نوشابہ کی وجہ سے میں انور کے پاس آیا اب انور کی وجہ سے کسی عالیہ کے پاس جانا تھا۔ یہ محبت بھی کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے۔

انور نے مجھے عالیہ کا پورا پتا سمجھا دیا۔ وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں رہتی تھی اور ہر شام کو وہ ٹینس کھیلنے مقامی ٹینس کلب میں جایا کرتی تھی۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے کسی طرح اس کلب کا پاس حاصل کر لیا اور شام کے وقت ٹینس کلب پہنچ گیا۔ کیا لڑکی تھی۔ انور جیسا آدمی اگر اس کے لیے بے چین ہو رہا تھا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اسی قابل تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ میں کس طرح اس تک اپروچ کروں۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے اس وقت اس کے پاس جانے کا ارادہ کیا جس وقت وہ وقفے میں ستانے کے لیے ایک طرف بیٹھی تھی۔ میں خود پر جبر کر کے اور ہمت کر کے اس کے پاس پہنچ ہی گیا۔

''میڈم مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

''جی فرمائیں۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''کیا آپ انور کو جانتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کون انور؟''

''میں انور عزیز کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ، وہ انور؟ بہت اچھی طرح۔ کیا ہوا ہے اس کو؟''

''ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن ہونے والا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میڈم! انور آپ کے لیے بہت پریشان ہے۔ اسی لیے میں اس کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''کمال ہے، وہ کیسا شخص ہے جو کسی اور کو میرے پاس بھیج رہا ہے۔''

''میڈم اس کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو فون کر کر کے تھک گیا ہے۔ کئی بار وہ آپ سے ملنے کے لیے اس کلب میں بھی آیا ہے لیکن آپ اسے اگنور کرتی رہیں۔''

''کیا وہ میرے لیے بہت بے تاب ہے؟''

''جی میڈم ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بظاہر تو وہ ٹھیک ہی ہے لیکن اندر سے گھلتا جا رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم سے کھل کر بات کرنی ہو گی۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''جی میڈم۔ جو کچھ بھی آپ کے دل میں ہے مجھے بتا دیں۔''

''پانچ منٹ رک جائیں، ہم ہال میں چل کر بات کرتے ہیں۔''

وہ چلی گئی۔ اسے ٹینس کے ساتھی کھلاڑی سے معذرت کرنی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد میرے پاس آ گئی۔ ''چلیں، میں نے سب سے ایکسکیوز کر لیا ہے۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ کلب کے ڈائننگ روم میں لے آئی۔ جو کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے روم سے کم نہیں تھا۔ اس نے لیمونیڈ منگوا لیا تھا۔ ''جی اب فرمائیں۔ کیا معاملہ ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''معاملہ صرف اتنا ہے کہ انور آپ کی طرف سے بہت پریشان ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ آپ نے اچانک ہی اس سے رخ موڑ لیا ہے۔ اسے اگنور کر رہی ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس کی شکایت بالکل ٹھیک ہے۔''

''تو پھر لوٹ جائیں، اس پریشان انسان کی طرف۔''

میں نے کہا۔

''مجھے اس کا حال سن کر بہت افسوس ہے۔ لیکن اب میں اس کی طرف نہیں جاسکتی۔ یہ میری مجبوری ہے۔''

''اگر یہ مجبوری ایسی ہے کہ کسی کو بتا نہ سکیں تو...... میں نہیں پوچھوں گا۔''

''نہیں، یہ مجبوری ایسی ہے کہ میں خود کسی کو بتا کر اس سے مشورہ لینا چاہتی تھی، اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔''

''تو پھر بتائیں، کیا مجبوری ہے؟''

''میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے تنویر سے محبت کی ہے لیکن وہ ایک بے حس انسان ہے۔''

''تنویر؟'' میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''اب یہ تنویر کون ہے؟''

''ہے ایک بے وفا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''میں نے اسے پسند کیا تھا پھر اس سے محبت کرنے لگی۔ ہم روزانہ ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے رابطہ ہی ختم کر دیا۔ میں نے پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ بے وفا کسی اور لڑکی کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔''

''میرے خدا۔'' میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ ''کیا سب کی کہانی ایک ہی جیسی ہوتی ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں میڈم۔ میں اپنا سر پیٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ بہرحال اس تنویر کا ایڈریس بتائیں، شاید میں آپ کے لیے کچھ کرسکوں۔''

''نہ جانے کیوں تم پر بھروسا کرنے کو دل چاہتا ہے، یقین ہو رہا ہے کہ تم میرے کام آجاؤ گے۔ میں تمہیں اس کی فرم کا نام بتا دیتی ہوں۔ تم اس سے جا کر ملو۔ اس سے پوچھو کہ اسے ہوا کیا ہے؟''

اس نے مجھے تنویر کی فرم کا ایڈریس دے دیا۔ اب میں ایک نئی مہم پر نکل رہا تھا۔

بہت بڑی فرم تھی اس کی۔ اس کے سیکریٹری نے میری درخواست پر مجھے اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ خاصا کشادہ کمرا تھا اور تنویر بھی ایک معقول انسان دکھائی دے رہا تھا۔

''جی فرمائیں۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اب میں روز روز چندے تو نہیں دے سکتا۔ ایک دو ہوں تو نمٹا بھی جائے یہاں تو روزانہ ہی آیا کرتے ہیں۔''

اس کی بات سُن کر افسوس ہوا۔ اس نے مجھے شاید کسی یتیم خانے کا بندہ سمجھ لیا تھا۔ ''جناب! میں آپ سے چندہ مانگنے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سوری، پہلی نظر میں تم ایسے ہی لگے تھے۔ خیر بتاؤ، کیا کام ہے؟''

''جناب، میں میڈم عالیہ کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کون عالیہ؟'' وہ چونک گیا۔ ''وہ درخشاں سوسائٹی والی۔ ٹینس کی کھلاڑی؟''

''جی ہاں وہی۔''

''کیا ہوا ہے اس کو؟ خیریت تو ہے نا؟''

''فی الحال خیریت سے ہے لیکن اندازہ ہے کہ اس کی خیریت ختم ہونے والی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میڈم عالیہ آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پتا نہیں کہ آپ دل کے معاملات کو کتنی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔''

''یہ بات ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''مسٹر میں دل کے معاملات کو پوری سنجیدگی سے لیتا ہوں۔ کیونکہ میں ایک حساس انسان ہوں لیکن میرے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ میں خود ان معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔ عالیہ کے لیے سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔''

''جناب، مجھے یہ سب پوچھنے کا حق تو نہیں ہے لیکن کیوں؟ آپ کیوں الجھے ہوئے ہیں؟''

''دیکھیں، میری عمر ایسی تو نہیں ہے کہ اس قسم کے معاملات میں الجھوں لیکن کیا کروں، دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا ہوں۔ نوشابہ نام ہے اس لڑکی کا جس نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔''

''نوشابہ؟'' میں کراہنے لگا تھا۔

''ہاں نوشابہ۔ پرانا سا نام ہے لیکن لڑکی بہت ماڈرن ہے، بہت ذہین، بہت اسمارٹ۔''

''اگر بُرا نہ مانیں تو کیا اس کا ایڈریس بتا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں؟''

پھر اس نے جو ایڈریس بتایا، وہ اسی نوشابہ کا تھا جس کو میں نے پسند کیا تھا اور جس لڑکی سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی۔ دنیا گول ہے۔ میں نے سنا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی زیادہ گول بھی ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد میں اور کہیں نہیں گیا۔ کیا فائدہ تھا۔ نوشابہ، انور کا دم بھرتی تھی۔ انور، عالیہ کو رو رہا تھا۔ عالیہ، تنویر کی دیوانی تھی اور تنویر، نوشابہ کو دل میں بسائے بیٹھا تھا اور میں صرف ایک کہانی لکھ کر رہ گیا ہوں۔ ہے کوئی اس چکر سے نکالنے والا؟

❖❖❖

## پہلا رنگ

### شام کا تارا

طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد سستانے کا من کرتا ہے مگر کچھ لوگ منزل کو پانے کے لیے ٹھہرتے نہیں... **اسما قادری** کے سفر کا آغاز بھی ایسا تھا جس میں امکانات کی راہیں روشن تھیں... انتہائی نازک ہوتے ہوئے بہت مضبوط قدموں سے ارتقائی سفر طے کیا... اور اب اس مقام سے آگے بھی نکل آئیں... ان کے تخلیقی بہاؤ نے راستہ بنایا... کٹھن راہوں سے بہ آسانی گزارا... جب جب جہاں جہاں سے گزریں... اپنی تخلیقات کے سنگ میل نصب کرتی گئیں... ہمارے اردگرد بکھرے حقائق اور آس پاس کے مسائل کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہیں... معاشرے کی بدصورت سچائیوں کو خوبصورت الفاظ کے پیراہن میں کہانیوں کی صورت میں پیش کرنا ان کی تحریر کا خاصہ ہے...

# قصہ چہار زن

بسا اوقات کھیل ہی کھیل میں کچھ ایسی صورتِ حال بن جاتی ہے... جس کا تصور بھی نہیں کیا ہوتا... ایک ایسے ہی کھیل کا آغاز... جس نے بڑھتے بڑھتے ایک سنگین وبال کی شکل اختیار کرلی... گزرے ماہ و سال کی دھول میں دبے ہوئے واقعات... جب دھول چھٹی تو ایک ایک واقعے نے ماضی سے حال تک کا سفر کر ڈالا... کچھ چراغوں میں روشنی نہ رہی... اور کچھ بجھ نہ سکے...

*ذہنی...... جسمانی اور جذباتی کیفیات کا احاطہ کرتی ایک پُرتاثر کہانی کے پیچ و خم*

''بس تو پھر آجاؤ۔ ہم تمہیں منتظر ہی ملیں گے۔''

''کون آرہا ہے بھئی؟'' عروج نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مہ پارہ کا جملہ سنا تو استفسار کیا۔

''صباحت۔ اُس کے دادا اور دادی کی شادی کی گولڈن جوبلی منائی جارہی ہے اور وہ ہمیں اس فنکشن کا انویٹیشن کارڈ دینے آرہی ہے۔''

''اوہ...... یہ تو اچھا ہے۔ لبنیٰ اور روشی بھی آنے والی ہیں۔ اس کی ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' عروج نے سن کر تبصرہ کیا۔

''میں نے صباحت کو لبنیٰ اور روشی کی آمد کا بتادیا تھا۔ سن کر خوش ہوگئی کہ اچھا ہے، ان دونوں کے انویٹیشن کارڈ بھی یہیں دے دے گی۔'' مہ پارہ نے اسے آگاہ کیا۔

صباحت ان ہی کی لین کے آخری گھر رفعت پیلس میں رہتی تھی۔ رفعت پیلس بلاشک وشبہ اس علاقے کا سب سے خوب صورت گھر تھا جہاں بیگم وجناب وجیہہ اللہ کئی برس سے اپنے ملازمین کے ساتھ مقیم تھے۔ وجیہہ اللہ صاحب کو

فالج نے گھر تک محدود کر رکھا تھا البتہ بیگم رفعت سے مختلف مواقع پر ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ ایک نہایت خوش شکل، خوش گفتار اور پُرکشش خاتون تھیں جنہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ جو خاتون اس عمر میں اتنی خوب صورت ہیں، وہ جوانی میں کیا غضب ڈھاتی ہوں گی۔ بیگم رفعت،،، کے دونوں بیٹے مع اپنے اہلِ خانہ کے بیرونِ ملک مقیم تھے اور اکلوتی بیٹی بھی دوسرے شہر میں مقیم تھی اس لیے عموماً رفعت پیلس میں خاموشی ہی چھائی رہتی تھی۔ اس خاموشی کو دو سال قبل صباحت کی آمد نے توڑا تھا۔ باہر کی دنیا کی آزادی اور بے راہ روی سے گھبرا کر اس کے والد صبغت اللہ نے اس وعدے کے ساتھ کہ وہ جلد از جلد پوری فیملی کے ساتھ پاکستان منتقل ہو جائیں گے۔ اسے پاکستان بھجوا دیا تھا۔ صباحت اس فیصلے پر زیادہ خوش نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ اس نے سمجھوتا کر لیا تھا اور یہاں اپنا وسیع حلقۂ احباب بنانے میں کامیاب رہی تھی۔ ان چاروں سے دوستی میں بھی اسی نے پہل کی تھی۔ وہ ان کے ساتھ یونیورسٹی میں ہی تھی لیکن اس کا شعبہ مختلف تھا۔

''اچھا ہے کہ ممی بھی اپنی این جی او کی میٹنگ میں جا رہی ہیں۔ ہم سب فرینڈز مل کر خوب ہلا گلا کریں گی۔'' عروج تین اچھی سہیلیوں کی ایک ساتھ آمد کا سوچ کر خوش ہوئی۔

''خوشی کا اظہار تو یوں فرمایا جا رہا ہے جیسے میری موجودگی میں بے چاریاں بہت شرافت کا مظاہرہ کرتی ہوں۔'' خوشی کا اظہار کرتی عروج کو قطعی خبر نہیں تھی کہ والدہ محترمہ عین اسی وقت قدم رنجہ فرما چکی ہیں اس لیے ان کی آواز سن کر سٹپٹا گئی۔

''او ممی، وہ ایکچوئیلی......''

''رہنے دو اپنی وضاحتیں۔ میں صرف انفارم کرنے آئی ہوں کہ میں جا رہی ہوں لیکن تم لوگ ذرا آپے میں ہی رہنا۔ یہ نہ ہو کہ واپسی پر آس پڑوس والوں سے کسی زلزلے کی اطلاعات سننے کو ملیں۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر عروج کو کچھ بھی کہنے سے روکا اور سخت لہجے میں ہدایت دے کر کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئیں۔

''تمہارے ساتھ تو بُری ہوگئی۔'' ان کے جاتے ہی مہ پارہ نے ہونٹوں میں دبا قہقہہ آزاد کیا اور عروج کو چھیڑا۔

''فکر نہ کرو۔ اُن کی واپسی پر میرے ساتھ تم بھی لائن حاضر ہوگی کیونکہ یہ تو طے ہے کہ ان کی کسی ہدایت پر عمل نہیں ہونے والا۔'' عروج نے شانے اچکا کر بے نیازی کا اظہار کیا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں تھا۔ ایک ایک کرکے تینوں سہیلیوں کی آمد کے ساتھ وہاں ایک طوفان سا کھڑا ہو گیا۔ تیز میوزک کی آوازوں نے ایک طرف در و دیوار کو لرزا کر رکھ دیا تو دوسری طرف ہر دو منٹ بعد جاری ہونے والی نئی فرمائش نے باورچی خانے میں ڈیوٹی دیتے خانساماں کا ناک میں دم کر دیا۔

''اوہ گاڈ! بہت مزہ آ رہا ہے۔ میں نے یہاں آنے کے لیے بالکل صحیح وقت چوز کیا ہے۔'' رقص کرتے کرتے نڈھال ہو کر صوفے پر گر جانے والی صباحت نے ایک بلند قہقہہ لگاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

''کیوں اپنے گھر میں مزہ نہیں آ رہا کیا؟ آج کل تو وہاں بھی بہت رونق لگی ہوئی ہے؟'' مہ پارہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کل رفعت پیلس کے پردیسی ہونے والے پنچھی اپنے گھونسلے میں واپس آئے ہوئے ہیں اور وہاں ان دنوں خاصی چہل پہل دیکھنے میں آ رہی ہے۔

''مزہ......'' اس کی بات سن کر صباحت نے منہ بنایا۔

''وہاں صرف دیکھنے کی ہی رونق ہے۔ میری کوششوں سے سب اس ایونٹ کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے جمع تو ہو گئے ہیں لیکن سب کے اپنے اپنے مقاصد ہیں۔ میرے بھائی صاحب جب سے آئے ہیں سیر سپاٹوں میں مصروف ہیں تاکہ جب واپس جائیں تو اپنے دوستوں کو اپنے ہوم لینڈ کی سیر کے قصے کہانیاں سنا سکیں۔ پھپھو اور ان کی بیٹیوں کو شاپنگ سے فرصت نہیں کہ ان کے شہر میں یہاں جیسی ورائٹی نہیں ملتی۔ مما اور چچی کا اپنے میکے والوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا جبکہ پاپا اور چاچو سارا سارا دن زمینوں کے حساب کتاب میں اُلجھے رہتے ہیں۔ ایسے میں تم ہی بتاؤ کہ میں کس کے ساتھ ''مزہ'' کروں۔'' اس نے شکایات کا پورا دفتر ہی کھول دیا۔

''یہ تو واقعی گھور سمسیا ہے۔ کہو تو تمہارے ساتھ اس انیائے کے خلاف ہم کوئی احتجاجی ریلی شیلی نکالنے کا انتظام کریں۔'' مہ پارہ نے شرارتی لہجے میں پیشکش کی۔

''ریلی شیلی کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک ایسی ترکیب سوچ رکھی ہے کہ دیکھنا سب کے کس بل نکل جائیں گے۔'' ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اس نے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

''ایسا کیا بھئی؟ ہم بھی تو سنیں۔'' عروج اور روشی جو بڑی دیر سے ایک چھوٹے سے چاقو کی مدد سے نشانے بازی کی مشق کر رہی تھیں، دھپ سے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولیں اور روشی نے فرنچ فرائز کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

''اے...... دور رہو اس پلیٹ سے۔ یہ تیسری بار ہے کہ تم لوگوں نے فرنچ فرائز پر حملہ کیا ہے۔ اب میں تم لوگوں کو اسے ہڑپ نہیں کرنے دوں گی۔'' لبنیٰ جو اب تک ان کی مشق کے دوران ریفری کا کردار ادا کر رہی تھی، چیل کی طرح جھپٹی اور پلیٹ کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کی لیکن پلیٹ پر روشی کی گرفت مضبوط تھی۔

''صرف تیسرے حملے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم محمود غزنوی کے چاہنے والے ہیں اور سترہ حملوں سے کم پر راضی نہیں ہو سکتے۔ جاؤ عروج ڈارلنگ! اپنے خانساماں سے کہو کہ ہمارے لیے مزید فرنچ فرائز تیار کرے۔''

''خانساماں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ اب اگر کوئی فرمائش آئی تو وہ اسے پورا کرنے کے بجائے ممی کو کال کرنا زیادہ بہتر سمجھے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپس میں ہی معاملے طے کر لو ورنہ ممی آ گئیں تو 'یہ دنیا، یہ محفل، میرے کام کی نہیں' گاتی ہوئی یہاں سے رخصت ہوگی۔'' روشی کے شاہانہ فرمان کے جواب میں مہ پارہ نے اسے اطلاع دی۔

''کیا زمانہ آ گیا ہے، گھر آئے مہمانوں کو دھمکایا جا رہا ہے' ایک وہ زمانہ تھا کہ لوگ مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔'' روشی نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کسی بڑی بوڑھی کے سے انداز میں اظہارِ تاسف کیا لیکن ایک ہاتھ ہنوز فرنچ فرائز کی پلیٹ پر جما ہوا تھا۔

''اُس زمانے میں مہمان بھی خاصے مہذب ہوا

کرتے تھے اور میزبان کے دس بار اصرار پر مشکل سے کوئی شے چکھتے تھے۔'' مہ پارہ نے بلاتکلف اسے آئینہ دکھایا۔

''ہک ہا...... لبنیٰ...... میری پیاری دوست! دیکھا تم نے کیسے دوستوں میں سے مروت اٹھ گئی۔ اب تم ہی اپنے ڈیڈی کی ڈاکٹری کا کچھ خیال کرتے ہوئے یاد کرو کہ فرنچ فرائز کا شمار غیر صحت بخش غذا میں ہوتا ہے اور ایک ڈاکٹر کی بیٹی ہوتے ہوئے تمہیں ایسی چیزیں کھانا قطعی زیب نہیں دیتا۔''

''میں ڈاکٹر کی بیٹی ہوں اس لیے مجھے اس قسم کے کھانے میں کوئی ڈر نہیں ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو میرے ڈیڈی بہت اچھی طرح میرا علاج کر دیں گے فکر تمہیں کرنی چاہیے کہ اگر تمہیں اتنے فرنچ فرائز ٹھونسنے کے بعد کچھ ہو گیا تو پھر...... تیرا کیا بنے گا کالیا؟'' لبنیٰ اس کی باتوں سے قطعی قائل نہیں ہوئی اور فرنچ فرائز کے لیے ثابت قدمی سے ڈٹی رہی۔

''کالیا......؟ تم نے مجھ پر کالے ہونے کی پھبتی کسی۔ تمہیں معلوم ہے کہ کسی کو ایسا کہنا کتنا بڑا اخلاقی جرم ہے۔ اب تو بڑی بڑی رنگ گورا کرنے کی دعوے دار کریموں کی کمپنیاں بھی اپنا سلوگن تبدیل کر چکی ہیں۔'' روشی گویا پنجے جھاڑ کر لڑنے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''بس کر دو یار...... اب یہ نواکتا مت کھولو۔'' ہنس ہنس کر دوہری ہوتی صباحت نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''ہاں یار بس کرو اور سنو کہ صباحت کے پاس کوئی پلان ہے جس پر عمل کرنے کے لیے اسے شاید ہماری مدد کی ضرورت ہے۔'' مہ پارہ نے بھی انہیں ٹوکا تو وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

''میں دادا، دادی کی گولڈن جوبلی پر ایک پرینک کرنا چاہتی ہوں......'' وہ انہیں اپنے ذہن میں موجود خیال کے خدوخال سے آگاہ کرنے لگی۔

''یہ کچھ زیادہ نہ ہو جائے گا میرا مطلب ہے بات پولیس تک بھی جا سکتی ہے۔''

''نہیں جائے گی یار۔ ہم انہیں اتنا ڈرا دیں گے کہ ان کی ہمت ہی نہیں ہوگی۔'' صباحت پر عروج کے ٹوکنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''اچھا مان لیا کہ پولیس تک نہیں جائیں گے لیکن خود گھر والے تو ٹھیک ٹھاک کھنچائی کر سکتے ہیں نا؟''

''ڈیڈی اور چاچو کی تو میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔ وہ جن جگہوں پر رہتے ہیں، وہاں اس سے بھی بڑے بڑے پرینک کیے جاتے ہیں اور کوئی بُرا نہیں مانتا۔ یہاں بھی بُرا ماننے والوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیں گے۔'' وہ اپنے منصوبے کے حوالے سے بہت پُراعتماد تھی۔

''اگر تم مطمئن ہو تو ٹھیک ہے۔ ہمیں تو دوست کی خوشی سے مطلب ہے۔'' مہ پارہ نے گروپ کی غیر رسمی لیڈر کی حیثیت سے بالآخر ہامی بھر ہی لی۔

☆☆☆

''بس کر دو لڑکیو! چل چل کر میرا اجڑا حال ہو گیا ہے اور تم لوگ ہو کہ کسی شے پر دل ٹھک کر ہی نہیں دے رہا۔'' اپنے بھاری بھرکم وجود کو بمشکل سنبھالتی یہ بیگم رفعت...... کی اکلوتی بیٹی نسرین فاطمہ تھیں جو اپنی دونوں بیٹیوں کے پیچھے لڑھکتی ہوئی دہائی دے رہی تھیں۔

''پلیز ماما تھوڑا صبر کریں۔ ہمیں فنکشن کے لیے بہت یونیک اور اسٹائلش سوٹ لینا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم فنکشن میں اس صباحت کی بچی اور اس کی سہیلیوں کے مقابلے میں کم لگیں۔ صباحت تو پہلے ہی ہمیں ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ہم پینڈو ہیں۔'' آگے چلتی ان کی مینا اور شینا نامی بیٹیوں نے ان کی دہائی پر پلٹ کر دیکھا اور شینا نے ذرا تیز لہجے میں انہیں سمجھایا۔

''تم ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا دو تو اس فارن پلٹ لڑکی کے مقابلے میں پینڈو ہی لگو گی۔ تمہارے پاس نہ تو اس جیسی اسمارٹنس ہے اور نہ ہی اس جیسے لب و لہجے میں انگریزی بول سکتی ہو۔ کتنا سمجھایا تھا تمہارے باپ کو کہ ملک سے باہر نہ سہی کسی بڑے شہر میں ہی چل کر رہ لیں تا کہ بچے گروم ہو سکیں لیکن انہیں تو اپنی آبائی حویلی سے عشق ہے۔'' نسرین فاطمہ ان کا مسئلہ تو کیا سمجھتیں، خود بیچ مال میں کھڑی ہو کر اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگیں۔

''افوہ ماما ایک تو آپ ہر جگہ......'' مینا جو فربہی میں ماں کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی اور امید تھی کہ چند سالوں میں انہیں پیچھے چھوڑ دے گی، انہیں اس بے وقت کی راگنی سے بیزار ہو کر کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اسے پیچھے سے تیز تیز چل کر آتی دو لڑکیوں کے ماں سے ہونے والے تصادم کے باعث خاموش ہونا پڑا۔ اس تصادم کے نتیجے میں نسرین فاطمہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھیں اور اپنے بھاری بھرکم وجود سمیت زمین بوس ہو گئی تھیں۔ گرنے کے اس عمل

میں ان سے متصادم ہونے والی عبایا پوش لڑکی نے بھی ساتھ دیا تھا اور ان ہی کے اوپر ڈھیر ہوئی چیخیں مار رہی تھی۔

''آنکھوں کی جگہ بٹن فٹ ہیں کیا جو تمہیں اتنی بڑی خاتون دکھائی نہ دیں اور تم کسی سانڈ کی طرح ان سے آکر ٹکرا گئیں؟'' مینا نے کھینچ کر اس عبایا پوش لڑکی کو ماں کے اوپر سے ہٹایا اور غصے سے بولی۔ شینا البتہ ان اشیا کو سمیٹنے میں مصروف تھی جو نسرین فاطمہ کے ہاتھ سے چھوٹ جانے والے شاپنگ بیگ سے نکل کر ادھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔

''سوری، وی آر ریئلی سوری۔ ایکچو ئیلی میری فرینڈ نے نیا نیا عبایا پہننا شروع کیا ہے اور پریکٹس نہ ہونے کی وجہ سے اکثر اس کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔'' بالوں اور چہرے کو اسکارف میں لپیٹے، آنکھوں پر بڑے بڑے سن گلاسز لگائے دوسری لڑکی نے جلدی سے معذرت کر کے مینا کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

''اسے کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ اتنا لمبا عبایا پہن کر اس میں اُلجھے اور پھر لوگوں کو ٹکریں مارتی پھرے؟'' مینا نے تیوری چڑھا کر سرتاپا عبایا پوش لڑکی کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔

''حکیم نے نہیں جی ڈاکٹر نے مشورہ بلکہ حکم دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر ایکچو ئیلی اس کا ہونے والا فیانسی ہے نا۔''

''ایسے تنگ نظر ڈاکٹر سے منگنی کرنے سے بہتر ہے بندہ زہر پھانک لے۔'' مینا نے سن کر نخوت سے تبصرہ کیا۔

''ارے کم بختو ... پہلے مجھے تو اٹھاؤ۔ اپنی تحقیق و تفتیش بعد میں کرتی رہنا۔'' ابھی تک زمین بوس نسرین فاطمہ کا ضبط بالآخر جواب دے گیا اور انہوں نے شور مچایا۔

''جی ہاں بالکل۔ پہلے آپ اپنی والدہ کو دیکھیں۔ ہم باہر جا کر چیک کرتے ہیں کہ کوئی لفٹر یا کرین وغیرہ دستیاب ہے یا نہیں۔'' بڑے چشمے والی نے بہت خلوص سے اسے مشورہ دیا اور عبایا پوش کا ہاتھ تھام کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ جب تک وہ ماں بیٹیاں اس کی بات کا مطلب سمجھتیں وہ دونوں خودکار زینوں کی مدد سے نیچے پہنچ چکی تھیں۔

''کام ہوا؟'' نیچے پہنچ کر بڑے چشمے والی نے بے چینی سے پوچھا۔

''بالکل، میں نے بڑی ہوشیاری سے وہ لفافہ نسرین آنٹی کے پرس میں رکھ دیا ہے جیسے ہی وہ پرس کھولیں گی انہیں لفافہ نظر آجائے گا۔'' عبایا والی لڑکی نے اپنا حجاب سر سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔

''صباحت کو کام ہو جانے کی اطلاع دے دیتے ہیں پھر؟'' بڑے سن گلاسز والی نے بھی اپنے گلاسز اتار کر پرس میں رکھے اور اپنا موبائل فون نکالتے ہوئے بولی۔

''اسے یہ بھی بتانا کہ اس کی آنٹی کو دھکا مار کر گرانا کوہ ہمالیہ کھسکانے کے برابر تھا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ میرا کندھا ٹوٹ گیا ہے۔'' اب وہ چلتی ہوئی پارکنگ ایریا تک پہنچ چکی تھیں۔ عبایا والی نے اپنا عبایا لپیٹ کر گاڑی کی پچھلی نشست پر پھینکتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔

''شکر کرو، اس کارِ خیر میں، میں نے بھی تمہارا ساتھ دیا تھا ورنہ اس کوہ ہمالیہ کو ہلانا واقعی تمہارے اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔'' وہ موبائل پر نمبر ڈائل کر چکی تھی اور دوسری طرف سے کال اٹھائے جانے کا انتظار کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ہاں صباحت! ہو گیا ہے تمہارا کام۔ تم اپنی طرف کی پروگریس بتاؤ۔''

''ویری گڈ، یہاں بھی کارروائی ڈال دی ہے۔ چار چھ گھنٹے کے وقفے سے تم ایک فون کال بھی کھڑکا دینا۔''

''دیکھ لو۔ کہیں بے چاروں کو ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے۔''

''نہیں ہوگا یار۔ بس تھوڑے سے اُلجھ جائیں گے۔'' وہ مطمئن تھی۔

''اوکے دین..... شام تک آجائے گی کال۔'' اس نے کمٹمنٹ کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

''جرم پر خاموش رہنے والا شریکِ جرم کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ تمہیں بھی اپنی خاموشی کا حساب دینا ہوگا۔'' نسرین فاطمہ اپنے ہینڈ بیگ سے دریافت ہونے والے لفافے کو پڑھ کر حیران ہوئی تھیں اس میں سے برآمد ہونے والی ڈیڑھ سطری تحریر کو پڑھ کر اس سے دگنی پریشان ہو چکی تھیں۔ اس پریشانی میں ہلکا سا خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔

''کیا بات ہے ماما، آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟'' خرید کر لائے گئے ملبوسات کو آئینے میں اپنے ساتھ لگا لگا کر دیکھتی شینا نے ان کی گم صم سی کیفیت کو بہت دیر سے نوٹ کیا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ بس سوچ رہی تھی کہ امی کے لیے تو گفٹ لے لیا ہے لیکن بابا کو کیا گفٹ دوں؟''

انہوں نے غیر محسوس طور پر لفافہ واپس ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے بات بتائی۔
''انہیں آپ ایک عدد نئی وہیل چیئر گفٹ کر دیں یا پھر کوئی فوڈ سپلیمنٹ کیونکہ اس کے علاوہ تو انہیں اب جن چیزوں کی ضرورت رہ گئی ہے انہیں گفٹ میں دینا بہت آکورڈ لگے گا۔'' ایک کرسی پر براجمان اپنے لمبے ناخنوں کو فائل کرتی مینا نے ہنس کر جو مشورہ دیا اسے سن کر اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
''تمیز سے بات کرو۔ وہ تمہارے نانا ہیں۔'' انہوں نے بیٹی کو ڈپٹا۔
''میں نے کیا بدتمیزی کی ہے؟ بس جو سچ ہے وہی کہا ہے۔'' بلا کی منہ پھٹ مینا اُن کی ڈانٹ پر ذرا شرمندہ نہیں ہوئی۔
''کہہ تو یہ ٹھیک ہی رہی ہے ماما! عرصہ دراز سے بستر پر پڑے نانا ابو کے لیے بھلا کسی شے کی کیا اہمیت رہ گئی ہے۔ انہوں نے لائف کو جتنا انجوائے کرنا تھا، کر چکے۔ اب تو وہ بس ایک زندہ لاش ہیں جن کے ساتھ رہنے پر نانی جان کی ہمت کو داد ہی دی جا سکتی ہے۔'' شینا نے بہن کی حمایت کرتے ہوئے کچھ اور بھی حقیقت پسندی کا اظہار کیا۔
''اس میں داد دینے کی کیا بات ہے؟ وہ بیوی ہیں اُن کی اور بیوی کا فرض بنتا ہے.... شوہر کی خدمت کرنا۔'' انہیں نجانے کیوں غصہ آ گیا۔
''فرض بنتا ہے تو پھر یہ فرض اُن کی اُس لاڈلی بیوی نے کیوں پورا نہیں کیا جو نانی جان سے کہیں زیادہ، نانا ابو کے وقت کی حق دار بنی رہی؟'' مینا نے طنز کا تیر چلایا۔
''وہ بہ ذات فرض خدمت کرنے والی ہوتی تو بابا کو اس حال میں پاکستان واپس ہی کیوں بھجواتی۔ یہ تو ہم مشرقی بیویاں ہی ہوتی ہیں جو آخری سانس تک ہر حال میں اپنے شوہر کا ساتھ نبھاتی ہیں۔'' وہ بیٹیوں کو مطمئن کر رہی تھیں یا خود کو، اس بات کا انہیں بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا ہاں اگر ان کے پرس سے کچھ دیر قبل وہ ڈیڑھ سطری خط برآمد نہ ہوا ہوتا تو اس وقت وہ اتنی کنفیوز نہ ہوتیں۔
''شاید نانی جان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ہی آپ کی بھتیجی نے اس گولڈن جوبلی کا کھٹ راگ پھیلایا ہے۔''
''ہاں تو اچھی بات ہے نا؟ اس بہانے ہم سب بہن بھائی برسوں بعد ایک چھت تلے جمع ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی دنیا میں کم ہی ایسے خوش قسمت جوڑے ہوتے ہیں جنہیں ایک ساتھ یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔'' وہ بیٹیوں کی باتوں کا جواب تو دے رہی تھیں لیکن اُن کا ذہن منتشر تھا۔
''چلیں...... نانی جان کے حصے میں کوئی تو اعزاز آیا۔'' شینا طنزیہ مسکرائی۔ دونوں بہنیں بے رحمی کی حد تک سچ بولنے کی عادی تھیں لیکن یہ سچ بس دوسروں کے بارے میں ہوتا تھا۔ خود اپنی ذات پر انہیں کوئی تنقید پسند نہیں تھی۔
''میں بھائی جان کے پاس جا رہی ہوں۔ تم دونوں ایک بار اور اچھی طرح اپنا سامان چیک کر لو کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے عین فنکشن کے موقع پر میرے سامنے کسی کمی کا رونا رویا تو میں ہرگز بھی کان نہیں دھروں گی۔'' انہوں نے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا اور اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی ہوئی سچ مچ صبغت اللہ سے ملاقات کے لیے جا پہنچیں کہ جس بے چینی نے انہیں گھیر رکھا تھا، اسے بس ان ہی کے ساتھ شیئر کیا جا سکتا تھا۔
''السلام علیکم میڈم۔'' صبغت اللہ برآمدے ہی میں بیٹھے ہوئے مل گئے لیکن وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ جمیل بھی موجود تھا۔ رفعت ہاؤس کا سب سے لازمی جزو...... جائداد کے حساب کتاب سے لے کر، وجیہہ اللہ کی ضروریات کا خیال اور بیگم رفعت وجیہہ اللہ کے لیے ڈرائیوری کے فرائض تک وہ ہر کام یکساں خوش اسلوبی سے انجام دے لیا کرتا تھا۔
''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے بے دھیانی سے جمیل کے سلام کا جواب دیا اور صبغت اللہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔
''اگر آپ کوئی بہت ضروری کام نہیں کر رہے ہیں تو میں آپ سے تنہائی میں ایک مسئلہ ڈسکس کرنا چاہتی ہوں بھائی جان۔''
''کچھ زیادہ اہم کام نہیں ہے بس یہ جمیل ذرا دکانوں کی آمدنی کا حساب کتاب چیک کروا رہا تھا۔ تم بیٹھو، ہم یہ کام بعد میں کر لیں گے۔'' انہوں نے فائل بند کر کے جمیل کو تھماتے ہوئے گویا اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا اور خود اکلوتی بہن کی طرف متوجہ ہوئے لیکن نسرین کو جانے کیوں ایسا لگا کہ وہ متوجہ ہوتے ہوئے بھی پوری طرح متوجہ نہیں ہیں اور ان کا دھیان کہیں اور بھٹک رہا ہے۔
''میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے لفافہ نکال کر ان کے حوالے کیا۔
''یہ آج ہی پُراسرار طور پر مجھے اپنے ہینڈ بیگ میں

سے ملا ہے اور پتا نہیں کیوں میں اسے پڑھ کر خوف زدہ ہو گئی ہوں۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔" صبغت اللہ کو وہ ڈیڑھ سطری خط پڑھ کر تبصرہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

"کچھ بھی نہیں ہے سے کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی کی شرارت ہوسکتی ہے؟" وہ جیسے پُرامید ہوئیں۔

"نہیں۔" صبغت اللہ نے نفی میں سر کو جنبش دے کر تردید کی تو نسرین کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی رنگت معمول کے مقابلے میں زردی ہو رہی ہے۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بھائی جان؟" سوال کرتے ہوئے ان کا لہجہ خود بخود سرگوشی میں ڈھل گیا۔

"میرے ساتھ میرے کمرے میں آؤ۔" انہوں نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ نسرین فاطمہ گہری تشویش میں مبتلا ان کے پیچھے چل پڑیں۔ اتنا تو انہیں معلوم تھا کہ ان کی بڑی بھاوج یعنی صبغت اللہ کی بیگم اس وقت گھر میں نہیں ہیں اس لیے وہ تنہائی اور رازداری کے خیال سے انہیں اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے جا رہے ہیں۔

"یہ لو، اِسے پڑھو۔" کمرے میں پہنچ کر انہوں نے ایک مقفل دراز کھول کر اس میں سے ویسا ہی لفافہ برآمد کیا جو نسرین فاطمہ کے پرس میں سے نکلا تھا۔ نسرین نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر اس میں موجود تہ شدہ کاغذ باہر نکالا۔ بغیر کسی القاب یا تمہید کے لکھا تھا۔

"حادثات سب کی زندگیوں میں ہوتے ہیں لیکن تم اتنی حادثے کے بارے میں کیا کہو گے جس کی ذمے داری سراسر تم پر عائد ہوتی ہے۔ کیا تم نے اُس بھیانک حادثے کو بھلا دیا ہے؟ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو سن لو کہ میں تمہیں وہ بھولی ہوئی داستان یاد دلانے آگیا ہوں۔ جب تک تم اپنے کیے کی سزا نہ پالو گے مجھے چین نہیں آئے گا۔

میں تمہیں کیا سزا دوں گا، تم بیٹھ کر اس پر غور کرو۔ تمہاری جان تو میں شاید نہ لوں کہ میرے نزدیک مر جانا اتنا تکلیف دہ عمل نہیں ہے جتنا اپنے کسی پیارے کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھنا اور اسے ہمیشہ کے لیے کھو دینا، کیا تم یہ سزا سہہ لو گے؟"

"یہ...... یہ کہاں سے آیا؟" خط پڑھ کر نسرین فاطمہ کی حالت ایسی ہوگئی جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"رات کو عادت کے مطابق میں کتاب پڑھنے بیٹھا تو اس میں یہ لفافہ موجود تھا۔" انہوں نے تھکے تھکے سے انداز میں بتا دیا۔

"یعنی وہ جو کوئی بھی ہے ہمارے بہت نزدیک ہے۔ ورنہ باہر کا تو کوئی فرد اس انداز میں ہم تک اپنے پیغامات نہیں پہنچا سکتا تھا۔" ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد نسرین فاطمہ سوچنے سمجھنے کے لائق ہو چکی تھیں۔

"میں نے بھی یہی اندازہ لگایا ہے لیکن سمجھ نہیں آتی کہ ایسا کون ہوسکتا ہے؟" صبغت اللہ نے ان کی تائید کی۔

"ملازمین میں سے کوئی......؟" نسرین فاطمہ نے گویا اُن کی رائے طلب کی۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باہر کے کسی فرد نے یہاں کے کسی ملازم کی وفاداریاں خرید لی ہوں۔" وہ اندازے لگا رہے تھے۔

"دونوں صورتوں میں ہم اُسے تلاش کیسے کریں گے؟ براہِ راست پوچھ گچھ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"میرے خیال میں ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا چاہیے۔ ہمارے نام جو پیغامات بھیجے گئے ہیں، وہ بڑے ادھورے سے ہیں۔ مقصد یا تو ہمیں اُلجھانا اور ڈرانا ہے یا پھر وہ ہم سے دوبارہ رابطہ کرے گا اور اپنا کوئی مطالبہ پیش کرے گا۔" وہ اب زیادہ بہتر انداز میں سوچ رہے تھے۔

"کیسا مطالبہ؟ کون ہے یہ جو گڑے مُردے اکھیڑ رہا ہے؟" وہ جھنجلائیں۔

"گڑے مُردے اکھیڑ رہا ہے تو یقیناً اسی امید پر کہ یہاں سے اسے بھاری رقم مل جائے گی؟"

"کیا ہم اس سلسلے میں پولیس سے مدد نہیں لے سکتے۔ نادر کے ایک کزن پولیس میں ہیں۔ آپ کہیں تو میں ان سے بات کروں؟" نسرین فاطمہ نے اپنے شوہر کا نام لیتے ہوئے پیشکش کی۔

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ بھلا کیا بتاؤ گی اپنے شوہر کے کزن کو؟ کیا ہمیں ملنے والے خط ایسے ہیں کہ ہم انہیں کسی کے ساتھ شیئر کرسکیں؟" صبغت اللہ نے اُن کی تجویز سن کر برہمی کا اظہار کیا۔

"یعنی ہمیں ہر صورت انتظار ہی کرنا ہوگا۔" نسرین فاطمہ کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

"ہاں۔" صبغت اللہ کے یک لفظی جواب میں ہزار ہا اندیشے بول رہے تھے۔

☆☆☆

''کیا آپ فرحت اللہ صاحب بات کر رہے ہیں؟''
''جی بالکل، آپ کون؟''
''کون کو چھوڑیے یہ پوچھیں کہ میں نے آپ کو کس لیے کال کی ہے؟''
''اچھا تو یہی بتا دیجیے۔''
''وہ تو بتانا ہی ہے آخر بتانے کے لیے ہی تو فون کیا ہے۔'' دوسری طرف سے ہنسی کی آواز ابھری۔
''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' جھنجلاہٹ محسوس ہونے کے باوجود فرحت اللہ نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔
''اچھا تو غور سے سنیے۔ میں نے آپ کو ایک نہایت اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے لیکن ٹھہریے......''
ایک ڈرامائی توقف کیا گیا جس پر فرحت اللہ نے بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فرحت اللہ کی بیوی آفرین جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی، اُس کی اِس بے چینی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی۔
''اس سے قبل کہ میں آپ کو کچھ بتاؤں، آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ اعصابی طور پر کمزور آدمی تو نہیں ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی شاکنگ نیوز کو سن کر آپ کو نروس بریک ڈاؤن یا ہارٹ اٹیک جیسی پرابلم تو پیش نہیں آجائے گی۔''
''میری اعصابی مضبوطی کا اندازہ لگانے کے لیے یہی کافی ہے کہ میں اتنی دیر سے آپ کی فضول اور لایعنی باتیں بہت سکون سے سن رہا ہوں اور ابھی تک میں نے آپ کو کوئی گالی نہیں دی ہے ورنہ آپ نے خود کو اس کا اچھا خاصا حق دار ثابت کر دیا ہے۔''
''ویل سیڈ! واقعی میں نے اطلاع دینے کے لیے درست فرد کا سلیکشن کیا ہے۔'' دوسری طرف سے ایک بار پھر ہنسی کی آواز سنائی دی لیکن فرحت کنفیوز تھا کہ یہ ہنسی مردانہ ہے یا زنانہ۔
''آپ فرمائیے، میں سن رہا ہوں۔'' ایک بار پھر خود پر ضبط کر کے اس نے بات آگے بڑھائی۔
''رفعت پیلس میں ایک قتل ہونے والا ہے۔''
''کیا؟'' فرحت کو دوسری طرف سے ایسی دھماکے دار خبر سنائے جانے کی امید نہیں تھی اس لیے آواز معمول سے بلند ہوگئی۔
''جی ہاں قتل...... وہ بھی عین گولڈن جوبلی کے فنکشن والے دن۔''
''لیکن کیوں؟ اُس روز کون؟ کیوں اور کیسے قتل کرے گا؟'' خود پر قابو پا کر اس نے کالر سے سوال کیا۔ اس کی زبان سے لفظ قتل سن کر آفرین بھی پُرتجسس سی اس کے قریب آبیٹھی۔
''کیوں کا جواب تو شاید تمہارے بڑے دے سکیں البتہ کون کے جواب میں تمہیں اتنا بتایا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے تمہارے بہن بھائی، ماں باپ یا تم خود...... اس لیے بہتر ہے کہ اُس روز پوری طرح سب لوگ ہوشیار رہیں۔'' دوسری طرف سے تنبیہ کی گئی اور اس کے بعد مزید کوئی سوال کرنے سے قبل سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔
''کیا ہوا؟ کون تھا؟'' آفرین نے اس کے چہرے کے عجیب وغریب تاثرات دیکھ کر اس سے دریافت کیا۔
''پتا نہیں، لگتا ہے شاید کسی نے مذاق کیا ہے؟'' اس نے الجھن زدہ کیفیت میں ہی آفرین کو جواب دیا اور خود اپنے موبائل پر آنے والے نمبر کو ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے نمبر بند ہونے کا مژدہ سنایا جارہا تھا۔
''کچھ پتا تو چلے۔'' اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے آفرین نے اصرار کیا۔ جواباً فرحت کو تفصیلات سناتے ہی بن پڑی۔
''مجھے تو یہ کوئی سیریس ایشو لگ رہا ہے۔ آپ کو اسے بھائی جان اور آپا سے ڈسکس کرنا چاہیے۔'' سب سن کر آفرین نے مشورہ دیا۔ وہ تقریباً تینتیس چونتیس سال کی ایک طرح دار عورت تھی۔ شادی کو کئی برس بیتنے کے باوجود ان کے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے آفرین کی اسمارٹنس پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور ٹک سک سے رہنے کی وجہ سے وہ اپنی اصل عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔
''وہ لوگ خواہ مخواہ پریشان ہوجائیں گے۔'' فرحت اللہ متذبذب تھا۔
''پریشانیاں آپس میں بانٹنے سے ہلکی ہوجاتی ہیں۔ ویسے بھی اس کالر نے خود بھائی جان اور آپا کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آپ ان دونوں سے کئی برس چھوٹے ہیں۔ کیا معلوم ماضی کی کوئی ایسی بات ہو جس کا آپ کو علم نہ ہو اور وہ دونوں جانتے ہوں۔'' آفرین نے اپنے مشورے کے حق میں دلیل دی۔
''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ ڈنر کے بعد میں اُن دونوں سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔'' فرحت اللہ کو آخر قائل ہونا ہی پڑا۔
رات کا کھانا تمام اہلِ خانہ نے ساتھ کھایا۔ پھر

حسب ارادہ فرحت اللہ نے یہ معاملہ بڑے بھائی اور بھن کے سامنے رکھا۔ اس وقت صبغت اللہ کی بیگم نشاط بھی ان کے ساتھ موجود تھیں لیکن باقی بڑوں اور بچوں میں سے کسی کو اس میٹنگ میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

''مجھے تمہارا یہ خیال درست لگتا ہے کہ کسی نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے ورنہ ہماری کسی سے ایسی دشمنی نہیں کہ وہ ہمیں اس طرح دھمکیاں دے۔'' ساری بات سننے کے بعد صبغت اللہ نے ایک نظر نسرین فاطمہ کے رنگ بدلتے چہرے کی طرف ڈالی اور دھیمے لہجے میں بولے۔

''لیکن کوئی ہم سے ایسا بے ہودہ مذاق کیوں کرے گا بھائی جان! میں تو اس کال کے بعد سے بہت پریشان ہو گئی ہوں۔'' آفرین نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

''تقریبات کے موقع پر اس طرح کا پرینک معمولی بات ہے۔ تمہیں تو اس چیز کا تجربہ ہونا چاہیے۔'' نشاط نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے دیورانی کو ٹوکا۔

''پاکستان میں ایسے پرینک معمول نہیں ہیں بھابی اور پرینک عام طور پر عین موقع کے لیے پلان کیا جاتا ہے یہاں تو تقریب سے پہلے ہی دھمکی آمیز کالز آنے لگی ہیں۔'' آفرین قائل نہیں ہوئی۔

''آفرین ٹھیک کہہ رہی ہے بھائی جان! فرض کریں کہ یہ کوئی مذاق ہے پھر بھی ہمیں اپنے طور پر احتیاطاً کچھ حفاظتی اقدامات کر لینے چاہئیں۔'' خوف زدہ نسرین فاطمہ سے زیادہ برداشت نہیں ہوا اور انہوں نے آفرین کے حق میں اپنا ووٹ دے دیا۔

''ٹھیک ہے، میں جمیل سے کہتا ہوں کہ کسی اچھی سیکیورٹی ایجنسی سے گارڈز بلوا لے۔ بچوں سے بھی کہہ دو کہ باہر نکلنے سے گریز کریں اور اگر جانا بہت ضروری ہو تو گارڈز کے ساتھ جائیں۔'' صبغت اللہ اس سے زیادہ مزاحمت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ وہ فیصلہ سنا دیا جو تقریباً سب ہی کے دل کو لگا۔

☆☆☆

''مزہ آ گیا یار۔ سب کی ہوا خشک ہے۔''

''کیوں کیا چل رہا ہے رفعت پیلس میں؟'' صباحت کی کال سن کر مہ پارہ نے تجسس سے پوچھا۔

''سب بوکھلائے ہوئے ہیں۔ رات کو لیونگ روم میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی ہے جس کے نتیجے میں سیکیورٹی گارڈز منگوا لیے گئے ہیں اور گھر والوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ کوئی بھی غیر ضروری طور پر گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔'' صباحت نے خوش خوش اطلاع دی۔

''اوہو...... یہ تو زیادہ ہی ہو گیا۔ باہر نکلنے کی پابندی پر تو سب جھنجلا رہے ہوں گے۔'' مہ پارہ نے افسوس کا اظہار کیا۔

''مگر میں تو خوش ہوں۔ اس بہانے کم از کم سب گھر میں تو موجود ہیں ورنہ میں تو سارے لوگوں کو ایک ساتھ گھر میں اکٹھا دیکھنے کے لیے ترس ہی گئی تھی۔'' صباحت اپنی کارروائی سے مطمئن تھی۔

''چلو مبارک ہو جیسا تم چاہتی تھیں، ویسا ہو گیا۔'' مہ پارہ نے بادلِ ناخواستہ اسے مبارک باد دی۔

''وہ تو خیر ہو گیا لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ اس پرینک کو پوری طرح انجوائے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو کچھ اس طریقے سے ڈسکلوز کیا جائے کہ سب چونک جائیں۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ بھئی کہ سب کو پتا چلے کہ صرف بڑے ہی ہمیں ڈرا دھمکا کر قابو نہیں کر سکتے بلکہ ہم بھی ان کے ساتھ یہ کام کر سکتے ہیں۔''

''تو پھر اس سلسلے میں کوئی آئیڈیا ہے تمہارے ذہن میں؟''

''نہیں آئیڈیا تو کوئی نہیں جب ہی تو تمہیں کال کی ہے۔''

''ہوں...... تم تھوڑی دیر ویٹ کرو، میں عروج سے ڈسکس کر کے کچھ بتاتی ہوں۔'' مہ پارہ نے سلسلہ منقطع کر دیا اور صباحت کا مسئلہ عروج کے سامنے رکھا۔

''اس کا آسان سا حل یہ ہے کہ صباحت تنہائی میں ہونے والے اپنے بڑوں کی گفتگو کی آڈیو یا ویڈیو تیار کر کے سب کے سامنے پیش کر دے کہ ایک ذرا سے مذاق پر وہ کتنے خوف زدہ ہو گئے تھے۔'' عروج نے جھٹ تجویز پیش کر دی۔

''مگر یہ آسان نہیں ہو گا۔ کسی کے بیڈ روم میں ایسی کوئی ریکارڈنگ کرنا ویسے بھی غیر اخلاقی حرکت ہے۔'' مہ پارہ نے اعتراض کیا۔

''بیڈ روم میں ریکارڈنگ کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کچھ ایسا کرتے ہیں کہ بڑے ایک بار پھر میٹنگ پر مجبور ہو جائیں۔ صباحت اس میٹنگ کی آڈیو یا وڈیو ریکارڈ تیار کر

لے گی۔'' عروج نے تجویز پیش کی۔ اس تجویز پر مزید غور و خوض کے لیے روشی اور لبنیٰ کو کانفرنس کال کی گئی اور اس کال کے بعد طے کیا گیا کہ اس بار بھی روشی ہی رفعت پیلس کال کرے گی لیکن اس بار کال کے لیے فرحت اللہ کے بجائے صبغت اللہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔

☆☆☆

''تم کیا سمجھتے ہو صبغت اللہ! کیا تمہارے حفاظتی اقدامات ہونی کو ٹال دیں گے؟ جو ہونا ہے، وہ ہر حال میں ہو کر رہے گا۔'' انجان نمبر سے آنے والی کال سن کر صبغت اللہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ یوں چھپ چھپ کر ہمیں خوف زدہ کرنے کے بجائے سامنے آ کر بات کرو۔''

''سامنے تو آنا ہی ہے لیکن ابھی نہیں فنکشن پر۔ سب کے سامنے بھانڈا پھوٹنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا۔'' دوسری طرف سے قہقہہ لگایا گیا۔

''اگر تمہارا کوئی مطالبہ ہے تو اُسے پیش کرو۔ یوں ڈرا ڈرا کر سارے گھر والوں کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' صبغت اللہ کی ناراضگی کے اظہار میں بھی ایک خوف سا تھا۔

''مطالبہ...... یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ ایسا کرو کہ تم سب بہن بھائی مل کر غور کر لو کہ تمہارے پاس میرے لیے بہترین پیشکش کیا ہے۔ میں بعد میں رابطہ کر کے اس بارے میں معلوم کروں گا۔''

''کیا تم اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

''تا کہ تم پولیس کو کال کر کے مجھے گرفتار کروا دو۔ اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم سارے گھر والوں کو خوف میں مبتلا کرنے کے بجائے براہِ راست مجھ سے ڈیل کرو۔ میں تمہارا ہر مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' صبغت اللہ نے اسے پیشکش کی۔

''مجھے تمہاری پیشکش منظور نہیں۔ تم مجھ سے ایسے مطالبات کرنے کے بجائے صرف میری ہدایات پر عمل کرو اور خیال رکھنا کہ مجھے تمہارے پل پل کی خبر ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جو مجھے غصہ دلا دے۔ میں تمہارے تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود رفعت پیلس میں جب چاہوں، جو چاہوں وہ کر سکتا ہوں۔ اگر تمہیں یقین نہ ہو تو اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔'' دوسری طرف سے سخت لہجے میں کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا اور صبغت اللہ بے بسی سے موبائل کی تاریک ہو جانے والی اسکرین کو دیکھتے رہ گئے۔ بھائی اور بہن سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ انہوں نے باری باری دونوں کو پیغامات بھیج کر اپنے کمرے میں ہی بلا لیا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے بھائی جان؟'' فرحت اللہ نے ان کا چہرہ دیکھ کر ہی بھانپ لیا۔

''ہاں کچھ دیر پہلے اسی بلیک میلر کی کال آئی تھی اور میں اس بارے میں تم لوگوں سے ڈسکشن کرنا چاہتا تھا۔''

''کون ہے وہ؟ کیا اُس نے اپنے بارے میں کوئی اشارہ دیا؟'' نسرین فاطمہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں، میں کوشش کے باوجود اس کے بارے میں نہیں جان سکا، سچ تو یہ ہے کہ میں یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ عورت ہے یا مرد۔ عجیب سی آواز ہے اُس کی، کبھی لگتا ہے کوئی عورت مرد بن کر بات کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور کبھی لگتا ہے کہ کوئی مرد ہے جو لہجے کو بگاڑ کر زنانہ انداز میں بول رہا ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا۔'' فرحت اللہ نے جھٹ ان کی تائید کی۔

''مرد ہے یا عورت...... اصل بات یہ ہے کہ وہ ہم سے چاہتا کیا ہے؟'' نسرین فاطمہ نے سوال کیا۔

''اس نے کھل کر مطالبہ نہیں کیا لیکن اشارہ دیا ہے کہ اگر ہم اسے کوئی اچھی پیشکش کریں تو ہم پر سے مصیبت ٹل سکتی ہے۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کسی کا کوئی مطالبہ کیوں پورا کریں۔ کسی کے پاس ہماری ایسی کون سی کمزوری ہے جو ہم اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوں؟'' فرحت اللہ نے جذباتی لہجے میں اعتراض کیا جس پر صبغت اللہ اور نسرین فاطمہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے اور پھر صبغت اللہ ہی نے جواب دینے کی ذمّے داری سنبھالی۔

''ہماری کمزوری، ہمارے اپنوں کی سلامتی ہے۔ وہ پردے کے پیچھے ہے اس لیے ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن ہم میں سے ہر فرد اُس کے نشانے پر ہے۔ اپنے لیے تو چلو بندہ رسک لے بھی لے لیکن اپنے بچوں کی سلامتی پر کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتا لیکن شاید تم یہ بات نہ سمجھ سکو۔'' روانی میں بولتے ہوئے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے چھوٹے

بھائی کو اس کی بے اولادی کا طعنہ دے گئے ہیں۔
''ٹھیک ہے تو پھر آپ اور آپا جان جو چاہیں فیصلہ کریں لیکن خیال رہے کہ کوئی پیشکش اپنے حصے کے اعتبار سے کیجیے گا۔ میرے ساتھ بچوں کی سلامتی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اس لیے مجھے اپنے حصے کی جائداد میں سے کچھ داؤ پر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' فرحت اللہ نے دوٹوک لہجے میں کہہ کر اپنی جگہ چھوڑ دی تو خاموشی سے اس میٹنگ میں شریک آفرین بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکل گئی۔ نسرین فاطمہ نے تاسف سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔
''آپ کو معلوم ہے کہ بے اولادی فرحت کا سب سے ویک پوائنٹ ہے پھر بھی آپ نے......''
''میری زبان سے تو بس غیر ارادتاً ایک بات نکل گئی تھی لیکن تم دیکھو کہ اس نے کس چالاکی سے خود کو اس معاملے سے الگ کر لیا۔'' صبغت اللہ نے شکوہ کیا۔
''اس نے خود کو الگ نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں بلکہ دیکھا جائے تو تعلق میرا بھی نہیں ہے۔''
''مطلب تم بھی خود کو اس سب سے الگ کر رہی ہو؟'' صبغت اللہ کو صدمہ ہوا۔
''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ خود میرا خیال کریں گے۔ ویسے بھی جائداد میں سے مجھے آپ بھائیوں کے مقابلے میں نصف حصہ ملے گا اور میں اس نصف میں سے زیادہ بڑی رقم نکالنے کی متحمل نہیں ہو سکتی ورنہ مجھے اپنے شوہر کو اس کی وضاحت دینی پڑے گی۔'' نسرین فاطمہ کا جواب بھی واضح ہی تھا۔
''کیا ہم گولڈن جوبلی کا فنکشن منسوخ کروا سکتے ہیں؟''
''یہ کیسے ممکن ہے بھائی جان؟ سارے انتظامات مکمل ہیں۔ دعوت نامے تقسیم ہو چکے ہیں پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم امی جان اور بچوں کے سامنے اس کی کیا وضاحت دیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ بالا ہی بالا اس معاملے کو طے کر لیں اور باقی کا سکون تہ و بالا نہ ہونے دیں۔'' نسرین فاطمہ نے شدت سے صبغت اللہ کی مخالفت کی۔
''ارے بھئی، یہ بھائی بہن کے درمیان کیا میٹنگ چل رہی ہے؟'' اسی وقت نشاط کمرے میں داخل ہوئیں اور ہلکے پھلکے لہجے میں دریافت کیا۔
''بس ایسے ہی گزرے دنوں کو یاد کر رہے تھے۔ آپ بتائیں، آپ کو امی جان نے کیوں یاد کیا تھا؟'' نسرین فاطمہ نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دینے کے ساتھ ساتھ سوال بھی داغ دیا۔
''وہ فنکشن کے لیے صباحت کے تیار کروائے ہوئے لباس اور زیورات پر میری رائے لینا چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ میری بیٹی بہت سمجھدار اور باذوق ہے۔ آپ بہت اطمینان سے اس کی پسند پر بھروسا کر سکتی ہیں۔'' ان کے لہجے میں وہی فخر تھا جو بچوں کی طرف سے مطمئن والدین کا خاصہ ہوتا ہے۔ صبغت اللہ نے دونوں نند بھاوج کو گفتگو میں مصروف دیکھا تو خود خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

روشی کی طرف سے کال آتے ہی صباحت متوقع میٹنگ کی تاک میں لگ گئی تھی جس کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور وہ سب بڑوں کو اپنے والدین کی خواب گاہ میں جمع ہوتا دیکھ کر خود عقبی حصے میں کھلنے والی کھڑکیوں تک پہنچ گئی۔ حسبِ توقع کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے والد صبغت اللہ کو مکمل بند کمرے سے وحشت ہوتی تھی اس لیے علاوہ شدید موسم کے وہ... کمرے کی کھڑکیاں لازمی کھلی رکھتے تھے۔ ایسی ہی ایک کھلی کھڑکی میں اس نے اپنے موبائل کا کیمرا آن کر کے ویڈیو پر سیٹ کرنے کے بعد، اسے ٹکایا اور خود اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ گھر کے اس حصے میں دیوار کے ساتھ ساتھ چیکو، امرود اور آم کے درخت ایک ترتیب میں لگے ہوئے تھے اور اس حصے کی چوڑائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس طرف شاذ و نادر ہی کوئی آتا تھا اس لیے جب اس نے وہاں کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو چونک گئی اور جھٹ اپنا موبائل کھڑکی کی چوکھٹ پر سے اٹھا کر ٹراؤزر کی جیب میں منتقل کیا اور وہاں سے ہٹ کر درختوں کے قریب آ کھڑی ہوئی۔
''آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' آنے والا جمیل تھا جو اسے وہاں کھڑا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔
''تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا سوال داغا۔
''مجھے لگا تھا کہ یہاں کوئی ہے تو میں دیکھنے چلا آیا کہ کہیں کوئی چور اُچکا تو گھر میں نہیں گھس آیا۔''
''اب اگر اطمینان ہو گیا ہے تو تم جا سکتے ہو۔'' جمیل اس گھر کا سب سے معتبر ملازم سہی بہرحال وہ مالکان میں سے تھی اور اسے حکم دے سکتی تھی۔

''اگر آپ کو کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔'' وہ جانے کے بجائے اب بھی اس کی وہاں موجودگی کی وجہ جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

''میں اس آم کے درخت پر کیریاں تلاش کر رہی تھی۔ کیا تم مجھے ایک عدد کیری فراہم کر سکتے ہو؟'' اس نے تیکھے لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ستمبر کے مہینے میں کیری کہاں سے ملے گی؟ ان درختوں پر لگنے والے تمام آم پکنے کے بعد پچھلے ماہ اتارے جا چکے ہیں۔'' اس نے یوں صباحت کو گھورا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

''مطلب تم مجھے کیری فراہم نہیں کر سکتے تو پھر تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ جاؤ اور جا کر اپنا کام کرو۔''

''جی اچھا۔'' صباحت کے غرا کر کہنے پر وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا تو اس نے بہ مشکل اپنے قہقہے کو اپنے حلق میں گھونٹا اور پھر خود اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے موبائل نکال کر ویڈیو چیک کی۔ ویڈیو ایک ہی زاویے سے بنی ہوئی تھی اور اس میں فرحت کی پشت کے علاوہ صرف نسرین فاطمہ کے چہرے کا ایک رخ ہی واضح ہو رہا تھا لیکن آواز واضح تھی۔

''یہاں تو محاذ ہی گرم ہو گیا ہے۔'' ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر وہ دھیرے سے بڑبڑائی لیکن ساتھ ہی اسے تھوڑا سا افسوس بھی تھا کہ برسوں بعد ایک دوسرے سے ملنے والے بہن بھائیوں کے لیے دولت کی اہمیت رشتوں سے زیادہ تھی۔ شاید وہ اپنے والدین کی شادی کی گولڈن جوبلی پر جمع بھی اسی لیے ہوئے تھے کہ بیگم رفعت وجیہہ اللہ نے اس بار جائیداد کی تقسیم کا عندیہ دیا تھا۔

☆☆☆

''پچاس برس۔ پورے پچاس برس بیت گئے مجھے بیگم رفعت وجیہہ اللہ کا کردار نباہتے نباہتے۔ عمر کے انیسویں برس میں جب میرا نام وجیہہ اللہ کے نام کے ساتھ جڑا تھا تو میں نے خود کو کتنا خوش قسمت محسوس کیا تھا لیکن آج......'' انہوں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی چند فٹ کے فاصلے پر موجود دوسرے بیڈ پر نظر ڈالی۔ ماضی کے نہایت خوبرو اور اپنے قدموں کی دھمک سے زمین لرزا دینے والے وجیہہ اللہ نہایت مدقوق و مجبور حالت میں بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ سوتے ہوئے ان کے کھلے منہ سے رال بہہ رہی تھی جسے دیکھ کر کراہیت محسوس کرنے کے باوجود انہوں نے اپنا رخ نہیں بدلا۔ وہ پچھلے پندرہ سال سے جسم کے دائیں حصے پر فالج کا شکار وجیہہ اللہ کے ساتھ اس خواب گاہ میں رہ رہی تھیں اور ان کے بیشتر کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں لیکن اس عمل کے پیچھے محبت سے زیادہ کوئی اور جذبہ کارفرما تھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ یہ آپ تھے جس کی وجہ سے میرا صاف ستھرا کردار داغ دار ہوا، میرے بچوں کی زندگی اضطراب کا شکار ہوئی اور ساری عمر کے پچھتاوے میرا مقدر بن گئے لیکن میں آج بھی آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کی خدمت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے تو صرف اس لیے کہ اپنی زندگی میں سرزد ہونے والے واحد گناہ کا کفارہ ادا کر سکوں۔'' آہستہ سے بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ان کی نظریں ہنوز شوہر کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور وہ بند ہونٹوں کے ساتھ ان سے مخاطب تھیں۔ وجیہہ اللہ کے سامنے ان کے لب ہمیشہ بند ہی رہتے تھے اور کبھی کبھی وجیہہ اللہ کو یوں لگتا تھا کہ فالج ان کے بجائے رفعت کی زبان پر گرا ہو۔

''ہماری شادی کی گولڈن جوبلی منانے والے بچے اگر اس شادی کی حقیقت جان لیں تو شاید ہم دونوں ہی سے اپنے تعلق پر شرمندہ ہو جائیں۔'' انہوں نے ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا اور بستر چھوڑ کر باہر ٹیرس پر نکل آئیں۔ نیچے لان میں ابھی سے تقریب کے لیے انتظامات شروع ہو چکے تھے اور بہت سے لوگ مستعدی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ نیلی وردیوں میں موجود گارڈز ان کام کرنے والوں پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔

جانے صبغت اللہ کو کن وہموں نے ستانا شروع کر دیا ہے جو اسے حفاظت کے لیے ان گارڈز کا انتظام کرنا پڑا۔ شاید داغ دار ماضی انسان کو یونہی وہمی بنا دیتا ہے۔'' گارڈز کو دیکھتے ہوئے انہوں نے تاسف سے سوچا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک کرسی پر آ بیٹھیں۔ شادی کی اس پچاسویں سالگرہ پر انہیں بیتا وقت شدت سے یاد آ رہا تھا۔

وجیہہ اللہ سے ان کی شادی کے بعد ابتدائی دو چار برس بہت خوشگوار گزر رہے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے انجینئر وجیہہ اللہ کی ملازمت بہت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ آبائی زمینوں کی آمدنی میں سے بھی حصہ ملتا تھا۔ صبغت اللہ اور نسرین کی پیدائش تک زندگی یونہی خوشی کے ہنڈولے جھولتے ہوئے گزری لیکن پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔

وجیہہ اللہ کے والد کی وفات کے بعد زمینوں کا انتظام سنبھالنے والے ان کے بھائی نے یک دم ہی ہری جھنڈی دکھادی اور ہر شے پر خود قابض ہو کر بیٹھ گئے۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ اسی زمانے میں وجیہہ اللہ کی ملازمت بھی چلی گئی اور یک دم ہی گھر میں تنگدستی راج کرنے لگی۔ ہونے کو کچھ عرصہ رفعت کے پاس موجود زیورات فروخت کر کے بھی گزارا ہو سکتا تھا لیکن وجیہہ اللہ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے ہاتھ پیر مارے اور دوستوں کی مدد سے پردیس میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اچھی ملازمت سے گھر میں ایک بار پھر پیسوں کی ریل پیل ہو گئی لیکن رفعت کی ذمے داریاں بے حد بڑھ گئیں۔ ہر طرح کے معاملات خود دیکھنے کے ساتھ ساتھ بھرپور جوانی میں نفس کے عفریت سے لڑنا آسان نہیں تھا۔ وہ وجیہہ اللہ سے واپس آنے پر اصرار کرتیں لیکن ہر بار اُن کا جواب ہوتا۔

''واپس آکر میں تمہیں اور بچوں کو وہ زندگی نہیں دے پاؤں گا جو آج تمہیں حاصل ہے۔ اپنے لیے نہ سہی بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے یہ قربانی دے دو۔'' وہ بچوں کو ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتا ہوا دیکھتیں تو اپنے دل پر پتھر رکھ لیتیں۔ برسوں کی اس جدائی میں، وجیہہ اللہ نے صرف دو بار پاکستان کا چکر لگایا۔ اور ان کی ذمے داریوں میں فرحت اللہ کا اضافہ کر کے واپس لوٹ گئے۔ ان گزرے برسوں میں ایک بہت بڑا واقعہ یہ بھی وقوع پذیر ہوا کہ ساری جائداد پر قابض ہو جانے والے وجیہہ اللہ کے بھائی لاولد ہی دنیا سے کوچ کر گئے اور جائداد خود بخود وجیہہ اللہ کو واپس مل گئی۔

''اب تو آپ واپس آکر میرے اور بچوں کے ساتھ رہیں۔ اب تو روپے پیسے کی کوئی تنگی نہیں رہی۔'' وہ جو خود پر شادی شدہ ہونے کا لیبل لگے ہونے کے باوجود بیواؤں جیسی ویران راتیں اور سُونے دن گزارتے گزارتے تھک چکی تھیں، فون پر شوہر سے ملتجی ہوئیں اور جواب میں وہ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد آہستہ سے بولے۔

''میں واپس نہیں آسکتا رفعت! میں نے یہاں ایک گھر بسا لیا ہے۔ میرا ایک چھوٹا سا بیٹا بھی اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے مقابلے میں میری یہاں زیادہ ضرورت ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیسے کر سکتے ہیں آپ؟'' صدمے اور بے یقینی سے ان کی آواز پھٹ کر رہ گئی تھی۔

''مجبوری تھی رفعت! اگر میں ایسا نہ کرتا تو تنہائی مجھے گناہ کے راستے پر لے جاتی۔'' انہوں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''اور میں...... میں یہاں تنہائی کا عذاب کیسے جھیل رہی ہوں کبھی سوچا ہے آپ نے؟'' انہوں نے زندگی میں شاید آخری بار شوہر سے کوئی شکوہ کیا۔

''تم عورت ہو رفعت اور عورتیں اپنی اولاد میں گم ہو کر سب کچھ جھیل لیتی ہیں۔'' وجیہہ اللہ نے دلیل دے کر بات ختم کر دی اور کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ بیوی ان کی اس دلیل سے قائل بھی ہوئی ہے یا نہیں۔

رفعت کی ویران اور بے رنگ زندگی میں شوہر کی بے وفائی کا روگ ایک ایسا دہکتا ہوا شعلہ بن کر داخل ہوا جس نے انہیں ایک آتش فشاں میں تبدیل کر دیا۔ ایسے آتش فشاں میں جسے پھٹنے کے لیے بس ذرا سا بہانہ درکار تھا۔ یہ بہانہ لیے نئے قبول صورت و خوش گفتار ڈرائیور کی صورت میسر آ گیا۔ نعمان چالیس بیالیس سال کا ایک معقول شخص تھا جس کے ساتھ مختلف کاموں کے لیے آتے جاتے کب انہوں نے اپنے دل کے داغ اس کے سامنے عیاں کرنے شروع کیے، کب وہ خاموش سامع سے ہمدرد اور غمگسار بنا اور کب اس ہمدردی اور غمگساری نے اپنے رنگ بدل کر مرد و عورت کا باہمی کشش کا ازلی روپ ڈھالا، انہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ پیاسی زمین، اپنی پیاس بجھاتے صحیح اور غلط کی تفریق سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ کبھی ضمیر کوئی آواز اٹھاتا بھی تو وہ اسے وجیہہ اللہ کی بے وفائی کا طعنہ دے کر چپ کروا دیتیں لیکن یہ سب بہت زیادہ عرصے نہیں چل سکا۔ ایک دن نعمان کسی کام سے گاڑی لے کر گھر سے نکلا تو واپس نہ آسکا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ اسے اسپتال لے جانے تک کی مہلت نہیں ملی اور یوں ایک بار پھر ان کی زندگی میں ویرانی در آئی۔ نعمان کی موت نے انہیں اتنا خوف زدہ کیا کہ وہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئیں اور پھر کبھی نفس کے آگے بے بسی نہ دکھائی لیکن زندگی کے یہ ماہ و سال کس کرب اور آزمائش میں گزرے، یہ بس وہی جانتی تھیں۔

بچوں کی شادیاں، ان کی بیرون ملک منتقلی، وجیہہ اللہ کی معذوری اور بے بسی کی حالت میں وطن واپسی جیسے سارے واقعات انہوں نے اتنے سکون اور وقار سے قبول کیے کہ دیکھنے والوں کو ان کی سنجیدگی اور بُردباری پر رشک

محسوس ہونے لگا اور کبھی کوئی نہیں جان سکا کہ خود ان کے دل میں کیا ہے۔ ان کے دل کا حال نہ جاننے والے آج ان کی شادی کی گولڈن جوبلی کا جشن برپا کر رہے تھے اور انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے زخموں پر نمک پاشی کی جا رہی ہو۔ زخموں کی تکلیف سے بلبلاتی وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور قدرے تیز قدموں سے چلتی ہوئی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وجیہہ اللہ کے رُوبرو جا کھڑی ہوئیں۔ وہ جاگ چکے تھے اور کھلی آنکھوں سے انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''پندرہ برس کسی گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ میں آج کے دن آپ کے ساتھ جُڑنے والے اپنے تعلق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر رہی ہوں۔''

انہوں نے اگر اپنے قدم بہکنے پر خود کو ساری زندگی سرزنش کی تھی تو وجیہہ اللہ کو اس گناہ کی ذمے داری سے کبھی بری بھی نہ کر سکی تھیں اور آج گویا ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔

☆☆☆

''ہاں تو صباحت بی بی! آگے کیا حکم ہے۔ آپ سے دوستی کا ثبوت دینے کے لیے اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''زیادہ کچھ نہیں یار بس ایک فون کال اور وہ لوگ بہت ڈر چکے ہیں اس لیے فوراً مان جائیں گے۔ تم پاپا کو فون کر کے کہنا کہ ایک بریف کیس میں بیس لاکھ روپے رکھ کر اسے تقریب میں اپنے ساتھ رکھیں۔ مناسب وقت پر ان سے یہ بریف کیس وصول کر لیا جائے گا۔ میں عین کیک کٹنے کے وقت سب کے سامنے ان سے اس بریف کیس کے بارے میں پوچھوں گی۔ ظاہر ہے وہ مجھے کوئی واضح جواب نہیں دے سکیں گے اور اس وقت میں پول کھول دوں گی کہ کیسے میں نے اپنی دوستوں کی مدد سے انہیں اور ان کے بہن بھائی کو خوف زدہ کر ڈالا۔'' صباحت گویا ابھی سے اس لمحے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''او کے لیکن یاد رکھنا یہ لاسٹ کال ہوگی۔'' مہ پارہ نے اسے تنبیہ کر کے سلسلہ منقطع کر دیا اور روشی کو کال کر کے اس سلسلے میں ہدایت دینے لگی۔ اب تک کی ساری فون کالز روشی نے ہی کی تھیں اس لیے یہ آخری کال بھی اسے ہی کرنی تھی۔

''سچ پوچھو تو مجھے صباحت کا یہ پرینک بالکل اچھا نہیں لگا۔ خوشی کے موقع پر گھر بھر کو یوں ٹینشن میں مبتلا کر دینا بھلا کون سی تفریح ہے۔'' اس کے فارغ ہونے کے بعد

خاموشی سے ساری کارروائی دیکھتی عروج نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''اچھا تو مجھے بھی نہیں لگ رہا لیکن ہامی بھرنے کے بعد پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے تھے نا ویسے بھی صباحت کو اطمینان ہے کہ کوئی بُرا نہیں مانے گا اور حقیقت کھلنے کے بعد سب اس کو انجوائے کریں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو ورنہ مجھے تو تقریب میں جاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں صباحت کے ساتھ ساتھ ہماری بھی شامت نہ آجائے۔''

''تھوڑی بہت ڈانٹ پڑنے سے زیادہ بھلا کیا ہوگا۔ شکر ہے کہ ماما اور ڈیڈ کہیں اور انوائیٹڈ ہیں اس لیے کچھ بھی ہو کم از کم وہاں ہمیں انہیں فیس نہیں کرنا پڑے گا۔'' مہ پارہ نے اس کے خدشات کے جواب میں تسلی دی۔

''روشی اور لبنیٰ کا آنا تو کنفرم ہے نا۔ یہ نہ ہو کہ عین وقت پر دونوں کوئی بہانہ بنا دیں۔''

''وہ دونوں آرہی ہیں یار۔ یہاں پہنچ کر ہمارے ساتھ ہی نکلیں گی۔ تم کیوں خواہ مخواہ اتنی وہمی ہو رہی ہو۔'' مہ پارہ اس بار چڑ گئی۔

''چھٹی حس...... میری چھٹی حس مسلسل مجھے کسی گڑبڑ کا اشارہ دے رہی ہے۔'' عروج آہستہ سے بڑبڑائی لیکن مہ پارہ نے اس کی بڑبڑاہٹ پر کان نہ دھرے۔

☆☆☆

اجنبی کالر کا مطالبہ صبغت اللہ تک پہنچ گیا تھا۔ بیس لاکھ کی رقم ان کے لیے بہت بڑی نہیں تھی جس کا انتظام کرنا ناممکن ہو لیکن وہ اس معاملے کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کر رہے تھے۔ ہونے کو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس مطالبے کو پورا کرنے کے بعد بلیک میلر کا حوصلہ مزید بلند ہو جاتا اور وہ مسلسل انہیں بلیک میل کرنا شروع کر دیتا۔ اس صورت میں ان سے زیادہ نقصان ان کی اولاد کا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ بلیک میلر کے حوالے کر دیتے تو پیچھے اپنی اولاد کے لیے کیا چھوڑ کر جاتے۔

''دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے اس اولاد نے مجال ہے جو کوئی بات آسانی سے مان جائے۔'' گہری سوچوں سے نشاط کی بڑبڑاہٹ انہیں باہر لے کر آئی۔ وہ پتا نہیں کب کمرے میں واپس آئی تھیں اور بڑبڑانے کے ساتھ ساتھ چیزوں کو ترتیب میں رکھنے کے بہانے انہیں خوب پیچ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے بیگم اتنے غصے میں کیوں ہیں؟'' انہوں نے بمشکل مسکرا کر ان سے دریافت کیا۔

''آپ کے صاحب زادے سے نمٹ کر آرہی ہوں۔ مسلسل باہر جانے کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے سمجھایا ہے کہ آج کا دن نکل جانے دو پھر آزادی سے گھومنا۔'' انہوں نے بیزار سے لہجے میں ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ ایک زوردار دھماکے نے اعصاب کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' صبغت اللہ پریشانی کے عالم میں صورتِ حال جاننے باہر کی طرف لپکے۔ نشاط بھی ان کے پیچھے ہی تھیں۔

''اوپر اسٹور میں آگ لگ گئی ہے۔ آپ فکر نہ کریں سر میں ملازمین کے ساتھ مل کر اسے بجھا لوں گا۔'' سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آتے جمیل نے انہیں تسلی دی اور خود دو تین ملازمین کو ان کے ناموں سے پکارتا ہوا دوبارہ اوپری منزل کی طرف دوڑ گیا۔

''آپ خواتین امی جان کے پاس جا کر انہیں تسلی دیں۔ ہم اوپر جا کر دیکھتے ہیں۔'' ذرا سے فرق کے ساتھ باقی اہلِ خانہ بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ صبغت اللہ نے خواتین کو ہدایت دی اور خود فرحت اللہ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ گئے۔ ملازمین ان سے پہلے ہی اوپری منزل پر پہنچ کر آگ بجھانے کی کارروائی شروع کر چکے تھے اور اب اسٹور سے آگ کے بجائے گاڑھا گاڑھا سا دھواں ہی برآمد ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے جمیل، کیسے آگ لگی اسٹور میں اور وہ دھماکے کی آواز کیسی تھی؟'' انہوں نے دونوں آستینیں چڑھائے، پریشان بالوں کے ساتھ وہاں موجود جمیل سے دریافت کیا۔

''تقریب میں آتش بازی کا بھی پروگرام تھا سر اور اسی مقصد کے لیے کچھ آتش گیر سامان منگوا کر اسٹور میں رکھا گیا تھا۔ پتا نہیں کس کی غلطی سے اس میں آگ لگ گئی اور دھماکے کے ساتھ سارا اسٹور لپیٹ میں آگیا۔ لیکن شکر ہے کہ کسی بڑے نقصان سے پہلے ہی ہم اس آگ کو بجھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں اور جا کر بیگم صاحبہ کو بھی تسلی دیں۔ میں اپنی نگرانی میں ملازمین سے یہاں کی صفائی کرواتا ہوں۔'' جمیل نے پوری رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں تسلی بھی دی تو وہ اس کا شانہ

سمجھا کر فرحت اللہ کے ساتھ واپسی کے لیے مڑ گئے۔

''اچھا سمجھ دار بندہ ہے یہ جمیل، جب سے یہاں آیا ہوں محسوس کر رہا ہوں کہ اس اتنے بڑے گھر کے انتظام و انصرام میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ آگ بجھانے کے آلات تک کی گھر میں موجودگی جمیل کی اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت ہے۔'' ان کے ساتھ اپنی والدہ کے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے فرحت اللہ نے جمیل کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کی۔

''واقعی بہت کام کا بندہ ہے۔ ساتھ میں ایماندار بھی ہے۔ زمینوں کے حساب کتاب میں مجھے معمولی سا بھی گھپلا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ امی جان کی طرف سے وصیت کے اعلان کے بعد میں تو اپنے حصے کی زمینوں کی دیکھ بھال کا کام جمیل کو ہی سونپوں گا چاہے اس کے لیے مجھے اسے ڈبل معاوضہ ہی کیوں نہ دینا پڑے۔'' انہوں نے فرحت اللہ سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے ارادے سے بھی آگاہ کیا۔ اب وہ دونوں بھائی رفعت وجیہہ اللہ کے کمرائے خاص تک پہنچ چکے تھے۔ یہ کمرا اس خواب گاہ سے الگ تھا جہاں وجیہہ اللہ بھی موجود ہوتے تھے۔ رات بیمار اور معذور شوہر کی خدمت میں گزارنے کے بعد وہ انہیں میل نرس کے حوالے کر کے دن کا کچھ حصہ اس کمرے میں آرام کرتی تھیں اور باقی کا وقت عبادات، مطالعے اور حساب کتاب کے لیے مختص تھا۔

''آتش بازی کے سامان میں آگ لگنے سے دھماکا ہوا تھا اور اسٹور میں آگ لگ گئی تھی لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ جمیل اپنی نگرانی میں اسٹور کی صفائی کروا رہا ہے۔'' اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے خواتین کی تسلی کروانا ضروری سمجھا۔

''جمیل کے ہوتے ہوئے ان چھوٹے موٹے مسئلوں پر پریشان ہونے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ بہر حال تم دونوں بیٹھو۔ میں تم سے کوئی بات کہنا چاہ رہی تھی۔'' ہلکے رنگوں کے ملبوسات کے ساتھ ہمیشہ سفید دوپٹا اوڑھنے والی بیگم رفعت ان کے اندازے کے برخلاف اس صورت حال پر بالکل مطمئن تھیں اور بڑی شان سے ایک آرام کرسی پر براجمان انہیں بیٹھنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ دونوں بھائی خاموشی سے ایک ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کی بیگمات اور اکلوتی بہن نسرین پہلے ہی سے وہاں موجود تھیں۔

''میں عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسان ذہنی طور پر موت کے لیے تیار ہو کر اس کا انتظار شروع کر دیتا ہے۔ میں نے بہت عرصے تک تمہارے باپ کی جائداد کا انتظام سنبھالا اور پوری کوشش کی کہ کہیں کوئی ایسی غلطی یا کوتاہی نہ ہو کہ جب تمہاری امانت تمہارے حوالے کرنے کا وقت آئے تو مجھے تمہارے سامنے شرمندگی ہو۔ الحمدللہ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہی اور آج اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش ہو کر تمہاری امانت تمہارے سپرد کرنے جا رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آگے میری اولاد اپنا فرض اسی دیانت داری سے ادا کرے گی اور عمر کے اس آخری حصے میں اپنے والدین کو تہی دست ہونے کا احساس نہیں ہونے دے گی۔'' انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے باری باری ایک ایک کی شکل دیکھی۔

''آپ کی امید انشاء اللہ کبھی نہیں ٹوٹے گی امی جان بلکہ میری تو خواہش ہے کہ آپ اب بھی سارے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھیں تاکہ آپ کو اپنے تہی دست ہونے کا احساس ہی نہ ہو۔'' فرحت اللہ نے سب سے پہلے زبان کھولی اور نہایت فرمانبرداری سے بولا۔ اس کے ان الفاظ پر اس کی بیوی سمیت کمرے میں موجود ہر شخص پہلو بدل کر رہ گیا۔

''نہیں میرے بچے، میری عمر اب ان معاملات کو دیکھنے کے لیے موزوں نہیں رہی ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ تم لوگ اپنی اپنی امانتیں وصول کر لو۔ میں نے شریعت کی رُو سے تمہارے والد کی تمام جائداد تم بہن بھائیوں میں تقسیم کر دی ہے۔ البتہ ذاتی رقم اور زیورات کے حوالے سے میں نے اپنا شرعی حق استعمال کرتے ہوئے ایک چوتھے فرد کو بھی اس میں حصے دار بنا لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میرا احترام کرتے ہوئے اس کا حصہ خوش اسلوبی سے اس کے حوالے کر دو گے۔''

''وہ چوتھا شخص کون ہے امی جان؟'' نسرین فاطمہ کے تجسس نے انہیں خاموش نہ رہنے دیا۔

''جلدی کیا ہے پتا چل ہی جائے گا بلکہ ایک اور خاص بات مزید ہے جو میں آج کی تقریب کے بعد تم سب کے علم میں لاؤں گی۔ ابھی سے صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم لوگ ذہنی طور پر تیار رہو۔'' ان کے بناؤ سنگھار سے مبّرا، اس عمر میں بھی خوب صورت دکھائی دیتے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

"آپ نے تو ہمیں شدید تجسس میں مبتلا کر دیا ہے امی جان۔" صبغت اللہ نے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"یہ رنگ ڈھنگ میں نے تمہاری بیٹی سے سیکھے ہیں صبغت۔ بڑی شریر اور زندگی سے بھرپور بچی ہے۔ اس کی پُراعتماد اور دوٹوک طبیعت کو دیکھ کر ہی میں نے سیکھا ہے کہ انسان کو کوئی ایک تو فیصلہ زندگی میں ایسا کر لینا چاہیے جو صرف اس کی اپنی ذات کے لیے ہو۔ ساری عمر اپنے آپ کو مار کر جیتے رہنے سے بہتر ہوتا ہے کہ اپنے لیے ایک جائز اور سیدھا فیصلہ کر لیا جائے۔" وہ بہت مطمئن اور پُرسکون دکھائی دے رہی تھیں۔ صبغت اللہ اور نسرین فاطمہ نے ان کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن نہ کر سکے۔

"اب تم سب جا سکتے ہو۔ تقریب کے لیے تیار ہونے سے قبل میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے ان سب کو اپنے کمرے سے رخصت کر دیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے امی جان نے کس چوتھے فرد کو اپنی وصیت میں شامل کیا ہوگا؟ مجھے تو لگ رہا ہے کہ وہ اپنی صباحت ہی ہوگی۔ دو سال سے ان کے ساتھ رہ رہی ہے اور ان کے دل میں خاصی جگہ بنا چکی ہے۔" کمرے کی طرف جاتے ہوئے نشاط نے شوہر کے کان میں کھسر پھسر کی۔

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" صبغت اللہ کا اُلجھا ہوا ذہن ان قیاس آرائیوں پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر رائٹنگ ٹیبل پر پڑی اور وہ پیپر ویٹ کے نیچے رکھے ایک سفید لفافے کو دیکھ کر چونک گئے۔ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھایا اور اندر موجود رقعہ نکال کر پڑھنے لگے۔ پہلے ہی کی طرح ٹائپ شدہ الفاظ میں لکھا تھا۔

"حادثہ تمہارے لیے کسی انہونی شے کا نام نہیں ہوگا صبغت اللہ۔ دنیا میں اتفاقات کے تحت پیش آنے والے حادثات سے انکار نہیں لیکن تم تو جانتے ہی ہو کہ کچھ حادثات کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ آج تمہارے اسٹور روم میں لگنے والی آگ بھی ہرگز کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ یہ آگ میں نے لگائی تھی تاکہ تمہیں بتا سکوں کہ اگر میں چاہوں تو اسی طرح تمہارے پورے گھر کو تمہارے خاندان سمیت پھونک ڈالوں اور تم کچھ نہ کر سکو لیکن ایسا کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنا اور تمہارا دونوں کا بھلا سوچوں اور وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ آج بریف کیس میں رقم رکھتے ہوئے اس میں تھوڑا سا اضافہ کر لینا۔ امید ہے اپنے پورے خاندان کی سلامتی کے مقابلے میں تمہارے لیے پچاس لاکھ کی رقم بہت زیادہ نہیں ہوگی۔

اور ہاں...... مجھے امید ہے کہ مجھے تم جیسے عقلمند آدمی کو یہ دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تمہارے پل پل سے آگاہ ہوں اس لیے پولیس تک جانے کی حماقت ہرگز نہیں کرنا۔"

اختتامی الفاظ پڑھتے پڑھتے ان کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ انہوں نے مشکل سے خود کو کرسی پر ڈھیر کیا اور ماتھے پر آیا پسینا صاف کرنے لگے۔

"خیریت تو ہے مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" نشاط جو کمرے میں آتے ہی اپنا واٹس ایپ چیک کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں، ان کی طرف متوجہ ہوئیں تو ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم بس ذرا نسرین کو بلوا دو۔" انہیں جو مسئلہ درپیش تھا اس پر مشورہ لینے کے لیے بیگم سے زیادہ موزوں فرد بہن تھی۔

☆☆☆

"آ گئیں تم لوگ...... میں بہت شدت سے تم لوگوں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ چاروں رفعت پیلس پہنچیں تو استقبالیہ پر صباحت نے بڑی گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا۔

"سنا ہے گیدڑ کی موت آئے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے، ہم نے رفعت پیلس کا کر لیا ہے۔" عروج نے ایک سرد آہ بھر کر اسے جواب دیا۔

"چلو اسی بہانے تم نے اپنا گیدڑ ہونا تسلیم کر لیا ورنہ یونیورسٹی میں تو تم چاروں شیرنیاں بنی گھوم رہی ہوتی ہو۔" صباحت نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

"آج جب تمہارے کرتوتوں میں شراکت کے نتیجے میں بڑوں کے ہاتھوں عزت افزائی ہوگی تو بھیگی بلی بن کر سب کی سننے کا تجربہ بھی کر لیں گے۔" عروج نے کچھ اس انداز سے بے چارگی کا مظاہرہ کیا کہ ان سب کے حلق سے قہقہے اُبل پڑے۔

"واہ بھئی بڑے قہقہے اُبل رہے ہیں۔ لگتا ہے بہت خوش ہو۔" کچھ فاصلے پر کھڑی آفرین ان کے قریب چلی آئی اور ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ لیے صباحت سے

مخاطب ہوئی۔ جب سے بیگم رفعت وجیہہ اللہ نے وصیت میں چوتھے فرد کو شامل کرنے کا عندیہ دیا تھا، وہ بھی نشاط کی طرح یہی سوچ رہی تھی کہ وہ چوتھا فرد صباحت ہے اور ظاہر ہے وہ اس بات پر نشاط کے برعکس ناخوش تھی۔

''خوشی کے موقع پر دوستوں کا ساتھ مل جائے تو خوشی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے بچی! آپ نے بھی اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں اس چیز کا تجربہ کیا ہوگا۔'' صباحت جو اس طنزیہ انداز کے پس منظر سے واقف نہیں تھی، کچھ عجیب سا محسوس کرنے کے باوجود متانت سے مسکرا کر بولی۔

''ہاں یہ بات تو ہے بھئی۔'' فرحین بھی گویا مجبوراً مسکرائی پھر دانستہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''اپنی فرینڈز سے انٹروڈکشن تو کرواؤ بھئی۔''

''شیور۔'' صباحت باری باری سب کا تعارف کروانے لگی۔

''نوز پر تمہاری بیس کچھ ٹھیک نہیں بنی اگر تم کہو تو میں ٹھیک کر دوں۔'' لبنیٰ سے ملتے ہوئے آفرین نے بے ساختہ ہی اس کی ناک کو چھوتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کونسا چیف گیسٹ ہوں کہ سارے مووی کیمرے مجھے ہی فوکس کر کے رکھیں گے۔'' لبنیٰ نے شانے اچکا کر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

''مائنڈ مت کرنا بھئی۔ ہماری چچی شادی سے پہلے ایز آبیوٹیشن ایک پارلر میں کام کرتی تھیں اس لیے انہیں ہر ایک کے میک اپ کا تنقیدی جائزہ لینے کی عادت ہے۔'' صباحت کو اپنی دوست کو یوں ٹوکے جانا مناسب نہیں لگا تو وضاحت دینے لگی۔

''اٹس او کے یار! اب چلو اور چل کر اپنے دادا، دادی سے تو ملاقات کروا دو جن کے لیے یہ محفل سجائی گئی ہے۔''

''ہاں آؤ میرے ساتھ۔'' صباحت انہیں اپنے ساتھ لیے چل پڑی۔ چلتے چلتے لبنیٰ نے بطور خاص پیچھے مڑ کر فرحین کو دیکھا لیکن اب وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

''دادا جان کا تو تمہیں پتا ہے کہ بیمار ہیں تو انہیں بس عین کیک کٹنے کے موقع پر وہیل چیئر پر یہاں لایا جائے گا ہاں میری ایکٹو اینڈ اسمارٹ دادی سے تم مل سکتی ہو۔'' وہ انہیں فیروزی رنگ کے سوٹ پر حسب معمول سفید دوپٹا اوڑھے بیگم رفعت وجیہہ اللہ کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔

''اتنی پیاری پوتی ہو تو دادی خود بخود اسمارٹ اینڈ ایکٹو ہو جاتی ہے۔'' انہوں نے اس کے آخری الفاظ سن لیے تھے اس لیے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

''اسے خواہ مخواہ کریڈٹ نہ دیں آنٹی۔ اس کی آمد سے پہلے بھی ہم نے آپ کو ہمیشہ اسمارٹ اینڈ ایکٹو ہی دیکھا ہے۔'' مہ پارہ نے ان سے ملتے ہوئے انہیں سراہا تو وہ دھیرے سے ہنس دیں۔ ان کے ہنسنے سے ان کے کانوں میں پڑے فیروزے کے آویزے ہلکورے لینے لگے۔ انہوں نے ان آویزوں کے ساتھ کا ہار بھی گلے میں پہن رکھا تھا اور کلائیوں اور انگلیوں کے زیورات میں بھی میچنگ کا خیال رکھا گیا تھا۔ گویا وہ آج کی تقریب کے لیے خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھیں۔

''بڑی شاندار خاتون ہیں تمہاری دادی۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہارے دادا انہیں چھوڑ کر اتنے برس ملک سے باہر کیسے رہے؟ جوانی میں تو یہ اور بھی غضب ڈھاتی ہوں گی۔'' جب وہ لوگ بیگم رفعت سے مل کر واپس پلٹ رہی تھیں تو روشی نے بے ساختہ ہی یہ تبصرہ کیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا یہ تبصرہ انہوں نے سن لیا ہے اور ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر رہا ہے۔

''تم لوگ بیٹھو میں ذرا دوسرے مہمانوں سے مل کر آتی ہوں۔'' انہیں ایک ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں پر بٹھا کر صباحت وہاں سے چلی گئی۔ دوبارہ اس کی آمد اس وقت ہوئی جب کیک کاٹے جانے کا غلغلہ اٹھا۔

''وہ دیکھو، پاپا ہاتھ میں بریف کیس لے کر گھوم رہے ہیں۔ آئی ایم شیور کہ اس میں بیس لاکھ روپے بھی ہوں گے۔'' اس نے بڑی سی میز کے پیچھے بیگم رفعت کے ساتھ کھڑے صبغت اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان چاروں سے سرگوشی میں کہا۔ اس بڑی سی میز پر بہت بڑا کیک رکھا ہوا تھا۔ جس پر لگی موم بتیوں کی شکل پچاس کے ہندسوں جیسی تھی۔

''مہمان انتظار کر رہے ہیں صبغت' جاؤ جا کر اپنے والد کو لے آؤ۔'' بیگم رفعت نے کچھ بے چین سے دکھائی دیتے بیٹے کو حکم دیا تو وہ 'جی اچھا امی جان' کہتے ہوئے حرکت میں آ گئے۔

''اس بریف کیس کو کیوں لادے لادے پھر رہے ہو؟ آرام سے یہاں میز پر رکھ دو کہیں بھاگ تھوڑی جائے

گا۔" ان کی نظر بریف کیس پر پڑی تو وہ بیٹے کو ٹوکے بنا نہیں رہ سکیں۔ صبغت اللہ کو طوعاً و کرہاً بریف کیس میز پر رکھنا پڑا۔

"بے چارے پاپا۔" صباحت بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے بڑبڑائی۔ ان چاروں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی کہ بہرحال بیس لاکھ سے بھرا بریف کیس یوں رکھ کر جانا معمولی بات نہیں تھی۔

"اور دلہن! یہ فرحت کہاں ہے؟ اتنی دیر گزر گئی، میں نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔" اب بیگم رفعت کی مخاطب آفرین تھی۔

"ان کے سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے کمرے میں ہی رک گئے تھے۔ میں کسی کو بھیج کر بلواتی ہوں۔" آفرین نے ادب سے ساس کو جواب دیا اور پھر وہاں موجود افراد پر ایک نظر دوڑانے کے بعد گویا صباحت کا انتخاب کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"صباحت ڈیئر! جاؤ ذرا اپنے چچا کو تو بلا کر لے آؤ۔ کہنا کیک کٹنے والا ہے، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی یہاں آجائیں۔"

"خیال رکھنا۔" صباحت نے سرگوشی میں انہیں ہدایت دیتے ہوئے آنکھوں سے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا اور حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوگئی۔

"یقیناً اس کی چخ چخ کی وجہ سے ہی فرحت کے سر میں درد ہوا ہوگا۔ جب دیکھو میرے بے چارے بھائی کی ناک میں دم کر کے رکھتی ہے اور وہ بے چارہ اپنی کمزوری کے باعث اس کے آگے دب جاتا ہے۔" نسرین فاطمہ کی نشاط کے کانوں میں کی گئی یہ سرگوشی ان چاروں نے اچھی طرح سنی۔ امید تھی کہ آفرین کے کانوں تک بھی یہ الفاظ پہنچ گئے ہوں گے لیکن بظاہر وہ انجان بنی خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک مصنوعی پن تھا اور آنکھوں میں عجیب سی تیزی و طراری جو اس کی مجموعی خوب صورتی کے باوجود نمایاں تھی۔

"مجھے تو میڈم کوئی اونچی شے لگتی ہیں۔" لبنیٰ نے اس پر نظریں جمائے دھیمی آواز میں تبصرہ کیا اور یہی وہ وقت تھا جب اچانک لان کی ساری روشنیاں گل ہوگئیں۔ یک دم اندھیرا ہو جانے پر کئی لوگوں کے منہ سے اضطراری آوازیں نکلیں لیکن پھر آہستہ آہستہ سب نے اپنے موبائل فونز کی ٹارچیں جلانی شروع کر دیں۔

"گڑبڑ ہے۔" ان چاروں کو علم تھا کہ کیک کٹنے سے قبل اچانک لائٹیں بند کر کے آتش بازی کا مظاہرہ کرنے کا پروگرام تھا اس لیے اندھیرا ہونے پر وہ دیگر مہمانوں کی طرح مضطرب ہوئی تھیں نہ انہوں نے اپنے موبائل فونز کی ٹارچیں روشن کرنے کی زحمت کی تھی لیکن حسب پروگرام آتش بازی شروع نہ ہوئی تو پہلی بار انہیں گڑبڑ کا احساس ہوا اور مہ پارہ نے بڑبڑاتے ہوئے ٹارچ آن کر کے میز پر اس جگہ روشنی ڈالی جہاں صبغت اللہ نے بریف کیس رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ بریف کیس وہاں موجود نہیں ہے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھی کہ ہذیانی نسوانی چیخوں نے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ یہ چیخیں گھر کے اندرونی حصے سے آرہی تھیں اور مبینہ طور پر صباحت کی تھیں۔

"آؤ دیکھتے ہیں۔" مہ پارہ نے دوڑ لگائی۔ باقی تینوں کے علاوہ کئی دوسرے افراد نے بھی اس کی پیروی کی لیکن وہ چاروں اپنی پھرتی کی وجہ سے سب سے آگے تھیں۔ لان کی طرح اندرونی عمارت کی روشنیاں گل نہیں ہوئی تھیں اس لیے انہیں راستہ دیکھنے میں کوئی پریشانی پیش نہیں آرہی تھی۔

"کیا ہوا صباحت! کیوں چیخ رہی تھیں تم؟" آخرکار ایک برآمدے میں ان کا لڑکھڑاتی ہوئی صباحت سے سامنا ہو گیا اور مہ پارہ نے اسے تھام کر تیز لہجے میں پوچھا۔

"چچا جان......" اس نے انگلی سے ایک کمرے کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور خود بے ہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی۔ لبنیٰ نے بے ہوش صباحت کو سنبھالنے میں مہ پارہ کی مدد کی جبکہ عروج اور روشی نے سیدھے کھلے دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ دروازے پر پہنچتے ہی ان کی نظریں اندر موجود دل دہلا دینے والے منظر پر پڑیں۔ بستر پر فرحت اللہ لیٹے ہوئے تھے لیکن ایک ایسی لاش کی صورت جس کی کھوپڑی اُڑ چکی تھی اور بستر کی چادر اُن کے اپنے خون میں لت پت ہو رہی تھی۔

"کوئی اندر نہیں جائے گا۔ پولیس کو کال کرو۔" روشی نے کھینچ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور اپنے پیچھے آنے والوں کو تنبیہ کرنے والے انداز میں بولی۔ اس اثنا میں عروج نے اپنے موبائل پر پولیس ایمرجنسی کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند ایک افراد دروازہ بند ہونے سے قبل ہی فرحت اللہ کی لاش دیکھ چکے تھے جو نہیں دیکھ سکے تھے، انہیں بھی پولیس کو کی جانے والی کال نے باخبر کر دیا کہ

فرحت اللہ ہلاک ہو چکے ہیں۔ سرگوشیاں، چہ میگوئیاں، حیرت و استعجاب کا اظہار...... لمحوں میں وہ جگہ مچھلی بازار کا منظر پیش کرنے لگی۔

''بہتر ہوگا کہ آپ سب باہر چل کر بیٹھیں۔ پولیس کی آمد سے قبل جائے واردات پر اتنے لوگوں کی موجودگی شواہد کو ضائع کرسکتی ہے۔'' مہ پارہ جو لبنیٰ کی مدد سے بے ہوش صباحت کو ایک قریبی کمرے میں لٹا کر واپس آچکی تھی، سنجیدگی سے بولی۔ کچھ لوگوں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور کچھ ڈھٹائی سے وہیں جمے رہے۔

''عروج...... جا کر دو سیکیورٹی گارڈز کو یہاں بلا کر لاؤ۔ اس وقت وہی پولیس کے آنے تک لوگوں کو یہاں سے دور رکھ سکیں گے۔'' لوگوں کا رویہ دیکھ کر اس نے دوسری حکمتِ عملی اختیار کی۔ تھوڑی ہی دیر میں دو گارڈز عروج کی معیت میں وہاں پہنچ گئے لیکن خود عروج کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا تم اتنی پریشان کیوں دکھائی دے رہی ہو؟''

''یہاں ایک قتل اور ہوگیا ہے۔''

''کیا......؟'' عروج کی دی ہوئی اطلاع معمولی نہیں تھی۔

''کون؟ کس کا قتل ہوا ہے؟''

''صباحت کے دادا وجیہہ اللہ صاحب کا۔ صبغت انکل جب انہیں لینے ان کے کمرے میں پہنچے تو وہ فوت ہو چکے تھے۔ انہیں گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' عروج نے فُتے ہوئے چہرے کے ساتھ تفصیل بتائی۔ یوں تو وہ چاروں ہی بہادر اور حوصلہ مند لڑکیاں تھیں لیکن ایک خوشی کی تقریب میں ہو جانے والے دو قتل نے ان کے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔

''او مائی گاڈ! یہ تو بہت بُرا ہوا۔''

''میں نے دادا کے کمرے کے باہر بھی سیکیورٹی گارڈز کو کھڑا کر دیا ہے اور پولیس کو بھی اطلاع دے دی ہے لیکن مجھے شک ہے کہ وہاں سے شاید ہی کوئی ثبوت مل سکے جب میں وہاں پہنچی تو وہاں گھر والوں اور ملازمین سمیت کئی لوگ موجود تھے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر موت کی تصدیق کے لیے لاش کو بھی اس کی جگہ سے ہلا ڈالا تھا۔'' اب وہ آہستہ آواز میں مہ پارہ کو تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھی۔

''آؤ صباحت کے پاس چلتے ہیں۔ ہم کچھ کرسکیں اس کے لیے اس کا ہمارے ساتھ ہونا ضروری ہے۔'' مہ پارہ، عروج اور روشی کو اپنے ساتھ لیے اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں انہوں نے صباحت کو لٹایا تھا اور لبنیٰ کو اس کی خبر گیری کے لیے بھیج دیا تھا۔ لبنیٰ کی کوششوں کے نتیجے میں وہ ہوش میں آچکی تھی لیکن صدمے کی کیفیت میں تھی۔

''مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارے لیے ایک بڑا صدمہ ہے صباحت لیکن یوں ہمت ہار کر بیٹھ جانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ تم ہمارا ساتھ دو گی تو انشاء اللہ ہم جلد قاتل تک پہنچ جائیں گے۔'' مہ پارہ نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بہت کچھ کہتی چلی گئی۔ اس گفتگو کے دوران ہی اس نے اسے بریف کیس کے غیاب اور وجیہہ اللہ کے قتل کی خبریں بھی سنا ڈالیں۔

''یہ سب کیسے اور کیوں ہوگیا؟ میں نے تو اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ مل کر بس ایک خوشی سیلیبریٹ کرنی چاہی تھی۔'' وہ سسک پڑی۔

''زندگی میں بہت کچھ ہماری توقعات کے خلاف بھی ہوجاتا ہے پیاری! جو ہو چکا، ہم اسے نہیں بدل سکتے لیکن ہم مجرموں کو ان کے انجام تک پہنچا سکتے ہیں اور ہمیں یہ کام پوری جانفشانی سے انجام دینا ہے۔'' مہ پارہ نے ایک بار پھر اسے سمجھایا تو اس نے گردن کو تفہیمی جنبش دی اور ایک عزم سے بولی۔

''میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آؤ ہم باہر چلتے ہیں۔''

''وہ سب باہر نکل کر آگئیں۔ باہر پولیس آچکی تھی اور لان کا ماحول مکمل طور پر بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چہرے جن پر کچھ دیر قبل خوشیوں اور مسکراہٹوں کے ڈیرے تھے اب ہراساں اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ مہمانوں کی اکثریت کو اس بات پر بے چینی تھی کہ انہیں وہاں سے جانے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی۔ (گارڈز نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے ازخود ہی خارجی راستے بند کر دیے تھے اور اب کوئی بھی شخص بنا اجازت باہر نہیں جاسکتا تھا)

''تو آپ چاروں بھی یہاں موجود ہیں۔ آپ کی موجودگی میں کوئی گڑبڑ نہ ہو ایسا ذرا مشکل سے ہوتا ہے۔'' علاقہ ایس ایچ او نے انہیں دیکھا تو قریب چلا آیا اور کسی فلاسفر کی سی شکل بنا کر تبصرہ کیا۔

''ہماری موجودگی میں گڑبڑ ہو اور اس کی جڑ تک نہ پہنچا جاسکے ایسا بھی مشکل سے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ہمارا یہاں ہونا آپ کے حق میں ہی ہے۔'' مہ پارہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے حقیقت پر مبنی وہ جواب دیا جس کے بعد ایس ایچ او کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور وہ ضابطے کی کارروائی نمٹانے کے لیے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سب بھی اس طرف چل پڑیں جہاں خاندان کی خواتین اکٹھی تھیں اور رونے دھونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو تسلی اور دلاسے دینے کا سلسلہ جاری تھا۔

''آفرین چچی کی حالت بہت خراب ہے۔ بار بار انہیں غش پر غش آرہے ہیں۔'' صباحت جو انہیں ایس ایچ او کے ساتھ معروف چھوڑ کر اپنے اہلِ خانہ کے درمیان پہنچ چکی تھی، نمناک سے لہجے میں بتانے لگی۔

''جوانی میں ہی شریکِ حیات کو کھو دینے کا غم معمولی بھی تو نہیں ہے۔'' روشی نے افسوس سے تبصرہ کیا۔

''تم یہ بتاؤ کہ آتش بازی سے پہلے لان کی لائٹیں بند کروانے کی ذمّے داری کس کی تھی۔'' مہ پارہ جسے ان رسمی باتوں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی، صباحت کو کھینچ کر ایک جانب لے گئی اور اس سے پوچھا۔

''جمیل کی، وہی آتش بازی کرنے والی ٹیم کو ہینڈل کر رہا تھا۔''

''اسے بلاؤ۔'' اس نے فرمائش کی تو صباحت نے ایک ملازم کے ذریعے مردوں کے درمیان کھڑے جمیل کو بلوا بھیجا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں جمیل صاحب کہ حسبِ پروگرام لان کی لائٹیں آف ہوتے ہی آتش بازی کیوں نہیں ہوئی؟'' اس نے براہِ راست جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''ٹائمنگ کے فرق کی وجہ سے۔'' جمیل نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''طے ہوا تھا کہ ٹھیک دس بجے لائٹس آف کی جائیں گی اور دس بج کر تیس سیکنڈ پر آتش بازی شروع ہوگی لیکن افسوس کہ جس ملازم کو لائٹس آف کرنے کی ذمّے داری سونپی گئی اس کی گھڑی دس منٹ آگے تھی اور اس نے پروگرام سے دس منٹ پہلے ہی لائٹس آف کر دیں۔ دس منٹ کے اس فرق کی وجہ سے آتش بازی کے لیے ہائر کی گئی ٹیم کنفیوز ہوگئی اور انہوں نے اپنا کام نہیں کیا۔'' اس نے تفصیل سے پوری بات بتائی۔

''ملازم کا نام بتایئے۔''

''شریف۔'' اس نے سنجیدگی سے مہ پارہ کے سوال کا جواب دیا۔

''کیا آپ نے شریف کو ذمّے داری سونپتے ہوئے آپس میں گھڑیاں ملانے کی ضرورت محسوس نہیں کی؟ ایسے کاموں میں تو یہ بے حد ضروری ہوتا ہے؟''

''جی ہاں، میں نے ایسا کیا تھا لیکن افسوس کہ اس وقت میری اپنی گھڑی کا ٹائم آگے تھے۔ بعد میں، میں نے اسے تو ٹھیک کر لیا لیکن شریف کو بتانا بھول گیا لیکن آپ اس بارے میں اتنی تفتیش کیوں کر رہی ہیں۔ یہاں ہونے والی قتل کی وارداتوں کا لائٹس کے بند ہونے یا آتش بازی سے تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اندرونی حصے کی لائٹس تو ویسے بھی آن ہی تھیں۔'' اس بار جمیل نے صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ سوال بھی کر بیٹھا۔

''قتل کی وارداتوں سے اس تفتیش کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ڈاکے کی واردات سے تو تعلق ہے نا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے صفت انکل کے پورے بیس لاکھ روپے غائب کیے گئے ہیں۔'' مہ پارہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔

''بیس لاکھ نہیں بی بی پورے پچاس لاکھ۔''

''کیا پچاس لاکھ......'' انہیں نسرین فاطمہ کے وہاں چپکے سے چلے آنے اور گفتگو میں دخل دینے پر اتنا جھٹکا نہیں لگا تھا جتنا پچاس لاکھ کی رقم سن کر لگا۔

''ہاں پورے پچاس لاکھ لیکن پہلے تم سب یہ بتاؤ کہ تمہیں بیس لاکھ کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ اس بارے میں گھر کے بچوں کو تو کوئی خبر نہیں تھی۔'' وہ ان پانچوں کو شک بھری نظروں سے گھور رہی تھیں۔

''مجھے پتا تھا پھوپا میں نے آپ لوگوں کی گفتگو سن لی تھی۔'' صباحت میں اتنی ہمت تو نہیں تھی کہ اپنے پرینک کے بارے میں کچھ بتاتی... چنانچہ آدھا ادھورا سا اعتراف کر لیا۔

''بیس لاکھ پہلی ڈیمانڈ تھی بعد میں رقم کا اضافہ کر کے اسے پچاس لاکھ کر دیا گیا۔''

''مگر کس نے؟'' ان سب کا تو دماغ ہی گھوم کر رہ

گیا۔ بیس لاکھ کے مطالبے والی کال کے بعد انہوں نے صبغت اللہ کو کوئی کال نہیں کی تھی اور یہاں رقم میں دگنے سے بھی زیادہ اضافہ کر دیا گیا تھا۔

''اسی نے جس نے پہلے بیس لاکھ کی ڈیمانڈ کی تھی۔'' نسرین فاطمہ نے تنک کر انہیں جواب دیا۔

''مطالبہ کیسے کیا گیا؟ میرا مطلب ہے کہ کیا انکل کے پاس کوئی کال آئی تھی؟'' ساری فون کالز روشی نے ہی کی تھیں اس لیے وہ زیادہ پریشان تھی۔

''کال نہیں آئی تھی بس بھائی جان کو اپنے کمرے میں ایک رقعہ رکھا ہوا ملا تھا۔'' انہوں نے بتایا۔

''اپنے پاپا سے بات کر کے وہ رقعہ حاصل کرو صباحت۔'' مہ پارہ کا اضطراب بڑھ گیا۔ ان کی طرف سے ایسی کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی چنانچہ اس بات کا سیدھا سادہ سا مطلب تھا کہ کوئی اور فرد موقع کا فائدہ اٹھانے کے لیے اس کھیل میں شریک ہو گیا تھا۔ کیسے؟ یہ معما بھی ابھی حل ہونا تھا۔

''میں بلا کر لاتا ہوں سر کو۔'' جمیل نے جھٹ اپنی خدمات پیش کیں اور ذرا سی دیر میں صبغت اللہ کو ان کے درمیان لانے میں کامیاب ہو گیا۔

''میں نے وہ رقعہ پھاڑ کر پھینک دیا تھا اس لیے وہ میرے پاس نہیں ہے۔'' باپ اور بھائی کے بیک وقت قتل ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے پچاس لاکھ کی خطیر رقم بھی گنوائی تھی اس لیے بہت ہی شکستہ اور نڈھال دکھائی دے رہے تھے لیکن ان چاروں نے ان کا نظریں چرا کر جواب دینا الگ ہی محسوس کیا۔

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا انکل! وہ ایک ثبوت تھا جو دورانِ تفتیش پولیس کے کام آ سکتا تھا۔'' عروج نے اعتراض کیا۔

''میں نے کسی تفتیش کے بارے میں سوچا ہی کب تھا؟ میں کہاں جانتا تھا کہ میں آج کی تاریخ میں اپنے باپ اور بھائی کو کھونے والا ہوں؟'' ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ بڑی مشکل سے انہیں پانی وغیرہ پلا کر سنبھالا گیا۔

''آپ اس بلیک میلر کو پچاس لاکھ کی رقم دینے پر راضی کیوں ہوئے۔ اتنی بڑی رقم کسی کو دینا آسان تو نہیں ہوتا۔ کیا آپ کی کوئی کمزوری تھی اس کے ہاتھ میں؟'' مہ پارہ کا دماغ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔

''کیسی کمزوری؟ میں تو اپنے گھر والوں کے تحفظ کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔'' سوال سن کر صبغت اللہ کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تاہم کچھ قبول کرنے کے بجائے انہوں نے ناراض سے لہجے میں جواب دیا۔

''حیرت کی بات یہ ہے کہ مطلوبہ رقم وصول کی جا چکی ہے اس کے باوجود یہاں دو دو قتل کر دیے گئے ہیں۔ مطالبہ پورا ہو چکنے کے بعد۔ آخر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' مہ پارہ کی توجہ صبغت اللہ کی ناراضگی سے زیادہ ہونے والی وارداتوں کی وجوہات تلاش کرنے پر تھی۔

''بیگم صاحبہ آپ لوگوں کو بلا رہی ہیں۔'' کوئی اس کے سوال کا جواب دیتا، اس سے قبل ہی ملازمہ پیغام لیے وہاں چلی آئی۔

''آپ چاروں یہیں ٹھہریں بی بی! بیگم صاحبہ نے فیملی ممبرز کے علاوہ صرف جمیل صاحب کو بلایا ہے۔'' پیغام ملتے ہی اہلِ خانہ سمیت وہ چاروں بھی بیگم رفعت کی طرف چل پڑی تھیں لیکن ملازمہ کی آواز نے قدموں کو روک لیا۔

''یہ میری کلوز فرینڈز ہیں۔'' صباحت کو انہیں ٹوکا جانا بُرا لگا۔

''اِٹس اوکے صباحت! تم جاؤ، ہم یہیں تمہارا انتظار کرتے ہیں۔'' روشی نے اس کا شانہ تھپک کر اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ چاروناچار باقی لوگوں کے پیچھے چل پڑی۔

''ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔'' صباحت کے جانے کے بعد عروج نے پُرسوچ لہجے میں اسی جانب دیکھتے ہوئے کہا جہاں باقی اہلِ خانہ بیگم رفعت کے گرد جمع تھے۔

''فوراً بیان کرو۔ کھٹکنے والی بات کے پیچھے ہمیشہ کوئی کلیو ہوتا ہے۔''

''جب صباحت اپنے چچا کو بلانے کے لیے گئی اور لائٹس آف ہوئیں تو جمیل ٹیبل کے قریب فیملی ممبرز کے ساتھ ہی موجود تھا لیکن جب ہم نے اور دیگر لوگوں نے موبائل کی ٹارچز آن کیں تو وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ کیا اس کا ایک مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ گھڑیوں کے اوقات میں فرق جمیل کی پلاننگ کا حصہ تھا اور وہ اندھیرا ہوتے ہی بریف کیس لے کر چمپت ہو گیا تھا۔''

''تمہاری بات میں دم تو ہے۔ ملازمین میں امتیازی حیثیت حاصل ہونے کے باعث اس کے لیے گھر کے کسی

بھی حصے میں آنا جانا بھی دشوار نہیں اس لیے وہ آسانی سے خط صبغت اللہ انکل کے کمرے میں رکھ سکتا تھا۔'' لبنیٰ نے اس کی تائید کی۔

''لیکن یہ کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ قبل از وقت لائٹس آف کیے جانے کی وجہ سے دوڑ گیا ہو کہ اپنی غلطی کی اصلاح کرلے۔'' روشی نے اعتراض کیا۔ آپس میں گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس جانب بھی دیکھتی جارہی تھیں جہاں بیگم رفعت کے گرد ان کے بیٹا بیٹی، بہوئیں، پوتا پوتی اور نواسیاں ہجوم بنائے موجود تھے لیکن وہ صرف اور صرف جمیل کی طرف متوجہ اور اس سے مخاطب تھیں۔

''دونوں باتوں کے ففٹی ففٹی چانسز ہیں لیکن میں تو اصل میں صبغت انکل کے رویّے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ میں نے تو انہیں اور نسرین آنٹی کو ماضی کے حوالے سے مبہم سی دھمکی دینے کا مشورہ یہ سوچ کر دیا تھا کہ ماضی میں ہر شخص سے کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے جسے وہ دوسروں کے سامنے آشکار ہونے سے ڈرتا ہے لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ صبغت انکل سے ماضی میں کوئی ایسی بڑی غلطی یا جرم ہوا تھا جسے وہ ہر قیمت پر چھپانا چاہتے ہیں۔ کسی واقفِ حال نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہیں پچاس لاکھ دینے پر آمادہ کرلیا۔'' یہ تجزیہ پیش کرنے والی مہ پارہ تھی۔

''یہ تو ہمیں بھی محسوس ہوا تھا لیکن ہم انہیں سچ بتانے پر مجبور تو نہیں کرسکتے نا۔'' لبنیٰ کی رائے ان سب کے جذبات کی ترجمان تھی۔

''یہ جمیل کو رفعت آنٹی سے اتنی ڈانٹ کیوں پڑ رہی ہے؟'' دور سے وہ کچھ سن نہیں سکتی تھیں لیکن نظریں وہیں جمی ہونے کے باعث پوری کارروائی دکھائی دے رہی تھی۔

''ظاہر ہے اُن کے پی اے کی حیثیت سے اس کی ذمّے داری بنتی تھی کہ وہ سارے معاملات پر گہری نظر رکھے لیکن یہاں اتنا کچھ ہوگیا اور اسے کوئی خبر ہی نہیں ہوسکی تو یہ اس کی نااہلی کا ہی ثبوت ہے۔'' عروج نے روشی کی بات پر تبصرہ کیا۔

''مجھے تو یہ نااہلی سے ہٹ کر کوئی اور معاملہ لگتا ہے۔ تم دیگر لوگوں کے تاثرات دیکھو۔ بڑے شرمندہ سے ہیں تو چھوٹے ہکّا بکّا کھڑے ہیں۔'' مہ پارہ نے ان کی توجہ دوسرے پہلو پر مبذول کروائی۔

''کہہ تو تم ٹھیک...... ارے یہ کیا؟ یہ تو جمیل، رفعت آنٹی کے قدموں میں ہی بیٹھ گیا ہے اور ہاتھ جوڑے آنسوؤں کے ساتھ کچھ کہہ رہا ہے۔'' منظر میں پیش آنے والی ڈرامائی تبدیلی نے لبنیٰ کو اپنی بات بدلنے پر مجبور کردیا اسی وقت صباحت نے ہاتھ سے اشارہ کر کے ان چاروں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ تجسّس کی ماری وہ چاروں اس اشارے پر دوڑی گئیں۔

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں بیگم صاحبہ کہ بڑے صاحب اور فرحت صاحب کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے پاس انہیں قتل کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔'' یہ جمیل تھا جو ہاتھ جوڑے بیگم رفعت کو یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا۔

''جواز کیوں نہیں تھا، تم میری فیملی کو تباہ کر کے اپنے باپ کی موت کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت کچھ جانتے ہو، میں نے خود تمہیں اسٹڈی میں اپنی ڈائری پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔'' بیگم رفعت بیک وقت غم و غصے .... کا شکار تھیں۔

''آپ کے بے شمار احسانات نے مجھے کبھی انتقام کی راہ پر نہیں چلنے دیا۔ اگر میں انتقام لیتا بھی تو میرا نشانہ بڑے صاحب اور فرحت صاحب نہیں ہوتے۔ میں اسے نشانہ بناتا جو اصل مجرم ہے۔'' اپنے حق میں دلیل دیتے ہوئے اس نے لحظہ بھر کے لیے سر اٹھا کر صبغت اللہ کی طرف دیکھا اور ان کی پہلے سے زرد پڑتی رنگت مزید زرد پڑ گئی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' عروج نے صباحت کو ٹہوکا دیا۔

''مجھے خود ٹھیک سے نہیں پتا۔ بس دادی نے اچانک ہی جمیل پر ساری وارداتوں کا الزام لگایا اور اسے بُرا بھلا کہنے لگیں جس پر اس نے اعتراف کرلیا کہ پچاس لاکھ اسی نے اُڑائے ہیں۔ اس نے اتفاقاً میری تم لوگوں سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو سن لی تھی اور بعد میں باقاعدہ میرے کمرے میں خفیہ مائیک لگا کر حالات سے آگاہی حاصل کرتا رہا۔ ہماری ایکٹیوٹی سے فائدہ اٹھا کر پاپا سے پچاس لاکھ حاصل کرنے کا منصوبہ اسی کا تھا۔'' صباحت نے دھیمی آواز میں انہیں تفصیل سے آگاہ کیا۔

''اصل مجرم تو میں تھی، نہ میں اپنے قدموں کو بہکنے دیتی، نہ نوبت یہاں تک پہنچتی۔'' بیگم رفعت جیسی شاندار ہستی کی زبان سے نکلنے والے یہ الفاظ سب ہی کے لیے باعثِ حیرت تھے۔

''ہمیں ماضی کی باتوں کو ماضی میں ہی دفن رہنے دینا چاہیے بیگم صاحب میرے باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے لیے میں نے انہیں کبھی بے قصور نہیں جانا۔ وہ میری ماں سے بے وفائی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی امانت میں خیانت کے بھی مرتکب ہوئے تھے۔ اگر اس وقت ایک نوعمر لڑکے نے جذبات میں آکر ان کی گاڑی کے بریکس ناکارہ کر کے ان کی موت کا انتظام کر دیا تھا تو یہ اتنا غیر فطری نہیں تھا۔''

جمیل کی بات ابھی جاری ہی تھی کہ صبغت اللہ دھڑام سے زمین پر آگرے اور سب کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوگئی۔ اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ جمیل بھی انہیں سنبھالنے میں مصروف ہوگیا۔

''یہاں تو لگتا ہے کہ ماضی سے جڑی کوئی کہانی زندہ ہوگئی ہے۔'' وہ چاروں ذرا ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی تھیں اور یہ تبصرہ روشی نے کیا تھا۔

''کہانی تو کچھ کچھ سمجھ آرہی ہے لیکن آج ہونے والے دو قتل اس کہانی کے ساتھ میل نہیں کھا رہے ہیں۔ جمیل کی دلیل میں جان ہے۔ اگر اسے انتقاماً قتل کرنا ہی ہوتا تو صبغت انکل یا ان کے بیوی بچوں کو نشانہ بناتا۔'' وہ پوری کہانی سے واقف نہیں تھیں لیکن اپنی ذہانت کے باعث دو چار جملوں سے ہی بہت کچھ سمجھ چکی تھیں اس لیے مہ پارہ نے یہ تبصرہ کیا تھا۔

''ہمیں ان کے فیملی میٹر سے دور رہتے ہوئے قتل کی تفتیش پر توجہ دینی چاہیے۔''

''آؤ تو پھر اندر چل کر دیکھتے ہیں کہ ایس ایچ او صاحب نے اب تک کیا کارروائی کی ہے۔''

''ہاں چلتے ہیں لیکن پہلے جمیل کی نگرانی کا انتظام کروا دوں۔ قتل نہ سہی پچاس لاکھ ٹھگنے کا مجرم تو وہ ہے ہی۔ ایسا نہ ہو کہ موقع پا کر رقم سمیت فرار ہوجائے۔'' مہ پارہ نے ان کی تجاویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ اس کام کو نمٹانے کے بعد وہ چاروں اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ اندر ان کی ایس ایچ او سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

''کیا صورتِ حال ہے ایس ایچ او صاحب؟'' مہ پارہ نے دریافت کیا۔

''ڈیڈ باڈیز کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا رہا ہوں۔ فرحت اللہ کی لاش کی پوزیشن سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اسے سوتے ہوئے بہت اطمینان سے سر میں گولی ماری گئی اور بے چارے کو دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا البتہ

وجیہہ اللہ صاحب کے بستر اور لاش کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرتے وقت ان کے اور قاتل کے درمیان تھوڑی سی کشمکش ہوئی تھی لیکن کوئی ثبوت حاصل کرنا اس لیے مشکل ہے کہ جائے واردات پر کئی لوگوں کی دخل اندازی ہوئی ہے۔'' یہ صرف ان کے والد کے عہدے کا اثر تھا کہ ایس ایچ او اتنے دوستانہ انداز میں جواب دے رہا تھا۔

''کیا آپ نے وجیہہ اللہ صاحب کے اٹینڈنٹ سے معلومات حاصل کی ہیں؟''

''اسے انتظار میں بٹھایا ہوا ہے۔ موقعِ واردات کے جائزے کے بعد مجھے سب سے پہلے اسی سے بات کرنی تھی اسی لیے اب اُسی کے پاس جا رہا ہوں۔''

''ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔'' ایس ایچ او کا

## پاکستانی خاتون

ایک امریکن عورت، ایک جاپانی عورت اور ایک پاکستانی عورت دریا کی سیر کر رہی تھیں۔

ایک جن آیا اور بولا۔ ''تم سب باری باری کوئی چیز دریا میں پھینکو۔ اگر میں نے وہ چیز ڈھونڈ لی تو میں اس عورت کو کھا جاؤں گا اور اگر میں وہ چیز نہ ڈھونڈ سکا تو اس عورت کا غلام بن جاؤں گا۔''

امریکن عورت نے موبائل کا میموری کارڈ دریا میں پھینکا۔ جن ایک منٹ میں میموری کارڈ تلاش کر کے لے آیا اور امریکن عورت کو کھا گیا۔

اس کے بعد جاپانی عورت نے ایک سوئی دریا میں پھینکی۔ جن وہ سوئی بھی ایک منٹ میں ڈھونڈ کے لے آیا اور جاپانی عورت کو ہڑپ کر گیا۔

اب پاکستانی عورت کی باری تھی۔ محترمہ نے ڈسپرین کی گولی دریا میں پھینکی۔ پورے پانچ گھنٹے تک پانی میں گھومنے کے بعد بھی جب جن صاحب ناکام واپس آیا تو پاکستانی عورت نے جن کو کہا کہ جلدی کرو، گھر میں تمہارے کرنے کے بڑے کام پڑے ہیں۔

اب بھی جن کبھی کبھی چھٹی لے کر دریا پر جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جو پاکستانی عورت نے دریا میں پھینکی تھی اور مجھے ابھی تک نہیں ملی۔

پاکستانی خواتین سے پنگا لینے سے گریز کریں۔

لسبیلہ سے عاشق بلوچ کا تعاون

جواب سن کر عروج نے فیصلہ سنایا۔
''او کے، آجائیں۔'' وہ جانتا تھا کہ ان کی موجودگی اسے فائدہ ہی دے گی اس لیے انکار نہیں کیا۔ وہ سب اس کے پیچھے چل پڑیں۔ ایک قریبی کمرے میں ایک پریشان صورت شخص پولیس کے سپاہی کی نگرانی میں گویا ان کا منتظر تھا۔
''میں نے کچھ نہیں کیا انسپکٹر صاحب! صاحب کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ایس ایچ او کی شکل دیکھتے ہی وہ اس کے آگے گڑگڑانے لگا۔
''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس کے گڑگڑانے کا اثر لیے بغیر ایس ایچ او نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔
''شہباز سر شہباز عالم۔'' اس نے عاجزی سے بتایا۔
''کب سے کام کر رہے ہو یہاں؟''
''تقریباً سات ماہ سے۔''
''وجیہہ اللہ صاحب کے قتل کے وقت تم کہاں تھے؟ میری معلومات کے مطابق تو بیگم صاحبہ کی عدم موجودگی میں تم مسلسل ان کے ساتھ رہنے کے پابند ہو۔'' ایس ایچ او نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ کیس کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنے عملے میں سے کسی کو ذمے داری سونپنے کے بجائے وہ از خود وہاں آیا تھا۔
''میں بیگم صاحبہ کے حکم کے مطابق صاحب کو فنکشن کے لیے تیار کر کے لان پر سے ان کے بلاوے کا منتظر تھا کہ مجھے واش روم جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ مجھ سمیت کسی بھی ملازم کو اٹیچڈ باتھ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے مجھے کمرے سے باہر جانا پڑا۔ فارغ ہو کر میں نے واش روم سے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ ایسا لگتا تھا اسے کسی نے باہر سے بند کر دیا ہے۔ میں اس صورتِ حال پر گھبرا گیا۔''
''پھر آپ نے کیا کیا؟''
''میں نے دروازہ بجایا اور ملازمین کو آوازیں دے کر متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اصل میں ایک تو واش روم الگ تھلگ بنا ہوا ہے۔ دوسرے فنکشن کی وجہ سے سارے ملازمین لان میں ڈیوٹی دے رہے تھے اس لیے کسی نے میری آواز ہی نہیں سنی۔''
''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم واش روم میں بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے۔''
''جی ہاں......'' اس نے چاروں لڑکیوں پر ایک جھینپی ہوئی سی نظر ڈالی اور پھر کسی جرم کا اعتراف کرنے والے انداز میں آہستہ سے بولا۔
''اصل میں مجھے بچپن ہی سے کسی بند جگہ پر تنہا رہ جانے سے خوف آتا ہے اور کبھی ایسی صورتِ حال پیش آجائے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ واش روم میں بند ہونے کے کچھ منٹوں بعد ہی میرا یہ خوف جاگ گیا اور مجھے پتا نہیں چلا کہ میں کب بے ہوش ہو کر گر پڑا۔''
''ہوں...... میں نے اس قسم کے فوبیا کے بارے میں سنا ہے لیکن میرے ذاتی خیال میں ایسا شخص کسی مریض کی دیکھ بھال کے لیے نامناسب ہے۔'' اس ایچ او نے اس کی ساری بات سننے کے بعد تبصرہ کیا۔
''ملازمت کے حصول کے لیے میں نے یہ بات چھپائی تھی۔'' اس نے نظریں جھکا کر اعتراف کیا۔
''آپ کے ہاتھ پر یہ چوٹ کا نشان کیسا ہے شہباز صاحب؟'' گفتگو میں عروج کی مداخلت بالکل اچانک تھی اس لیے وہ ذرا سا گڑبڑا گیا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔
''شاید بے ہوش ہو کر گرتے وقت میرا ہاتھ کسی شے سے ٹکرا گیا تھا لیکن پریشانی میں مجھے اس چوٹ کا احساس نہیں ہو سکا۔ ابھی آپ نے توجہ دلائی تو میں نے یہ چوٹ دیکھی۔''
''تمہارے بیان کی تصدیق کروائی جائے گی۔ جب تک تمہاری بے گناہی ثابت نہ ہو جائے خود کو زیرِ حراست سمجھو......'' ایس ایچ او نے اسے آگاہ کیا اور پھر اس کی دہائیوں کی پروا کیے بغیر وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ چاروں اس کے پیچھے تھیں۔
''میں آپ کو ایک مشکوک فرد کا نام بتانا چاہتی ہوں ایس ایچ او صاحب! مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اس فرد پر کام کریں تو آپ کو یہ کیس حل کرنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔'' باہر آنے کے بعد لبنیٰ نے اچانک ہی ایس ایچ او کو مخاطب کیا تو اس کے ساتھ، ساتھ اس کی تینوں سہیلیاں بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ لبنیٰ نے کسی کے بھی تاثرات کی پروا کیے بغیر وہ مشکوک نام اور اپنے شک کی وجہ بھی بتا ڈالی۔
''یہ تو بہت اہم پوائنٹ ہے لبنیٰ! تمھیں پہلے ذکر کرنا چاہیے تھا۔'' مہ پارہ نے خفگی کا اظہار کیا۔
''بس میں ذرا کنفیوز تھی۔ اس لیے فوری طور پر ذکر نہیں کیا۔''

"کوئی مسئلہ نہیں ہے گرلز......! میں خود دیکھ لوں گا اس چیز کو......" ایس ایچ او نے تسلی دی۔ پھر وہ سب اس کے ساتھ ہی باہر آ گئیں۔

"مجھے اریسٹ کر لیں ایس ایچ او صاحب! میں اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔" ابھی وہ لوگ اہل خانہ کے قریب ہی پہنچے تھے کہ ایک کرسی پر نڈھال بیٹھے صفت اللہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور مضبوط لہجے میں بولے۔

"پاپا......" صباحت نے زور سے پکار کر گویا انہیں روکنے کی کوشش کی۔

"مجھے اعتراف کر لینے دو بیٹا......! ضمیر کے بوجھ کے ساتھ زندہ رہنا بہت مشکل کام ہے۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر ایک نظر بیگم رفعت پر ڈالی لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کرسی پر ایک طرف لڑھک چکی تھیں۔

☆☆☆

یہ دیکھو، یہ آ گئی شہباز عالم کے ڈاکومنٹس کی ویری فیکیشن رپورٹ اس نے خود کو کوالیفائڈ نرس ظاہر کر رکھا تھا لیکن حقیقت میں اس کے ڈاکومنٹس جعلی ہیں۔ میں نے اس کی پرانی رہائش گاہ کا پتا معلوم کروا کر اس کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق وہ محلے کے ایک کلینک میں کمپاؤنڈر ہوا کرتا تھا اور اسی تجربے کا فائدہ اٹھا کر کامیابی سے اپنا کام چلا رہا تھا۔"

"ایسے دھوکے تو ہمارے ہاں عام ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صباحت کے دادا اور چچا کے قتل سے اس کا کیا تعلق بنتا ہے۔"

"ماضی کی داستان جس حد تک سامنے آئی ہے، اس کے حساب سے تو جمیل وہ شخص تھا جو انتقاماً اس خاندان کو نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن جمیل کا بیان ہے کہ پچاس لاکھ کے لالچ کے علاوہ اس نے ایسا کچھ سوچا تک نہیں کیونکہ وہ بیگم رفعت کا احسان مند تھا کہ انہوں نے اس کے باپ کی وفات کے بعد اس کے خاندان کی کفالت کی، اسے اچھی تعلیم دلوائی اور پھر اپنے پاس اچھی ملازمت بھی دی۔" آج پھر وہ چاروں ایک جگہ جمع تھیں اور اس کیس پر بحث کر رہی تھیں۔

"مجھے تو بیچاری رفعت آنٹی پر افسوس ہو رہا ہے۔ شوہر کے غیر منصفانہ رویے نے ان سے ایک ایسی غلطی کروا دی جس کا خمیازہ ان کے ساتھ، ساتھ ان کی اولاد نے بھی بھگتا اور اس دنیا سے جاتے، جاتے وہ اپنے خاندان کے سامنے رسوا ہونے کا دکھ اپنے ساتھ لے کر گئیں۔" لبنیٰ کے لہجے میں حقیقی افسوس تھا۔

"شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ عورت کو اپنا ہر قدم بہت سنبھل کر اٹھانا چاہیے۔" عروج نے تبصرہ کیا۔

"صرف عورت کو الزام نہ دو۔ مرد کی بھی ذمے داری بنتی ہے کہ جب ایک عورت کو اپنی زندگی میں شامل کرے تو اس کی ذہنی، جسمانی، معاشی اور جذباتی ضروریات کا پورا خیال رکھے۔ مرد کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے نہیں بنایا کہ وہ محض بیوی، بچوں پر حکمرانی کرتا رہے اس کا رتبہ اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے سے ہی بلند ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنی ذمے داریاں پوری کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہیں اس کے زیر سایہ رہنے والوں سے لغزشیں بھی ہوتی ہیں۔" روشی کو عروج کا تبصرہ قطعی پسند نہیں آیا چنانچہ شدت سے اس کی مخالفت کی۔

"یار تم لوگ اپنی یہ بحث اگلی عورت مارچ تک سنبھال رکھو اور فی الحال اس کیس پر فوکس کرنے دو۔" مہ پارہ نے انہیں ٹوکا۔

"کیا اس کیس کے بارے میں تمہارے پاس مزید کوئی معلومات ہیں؟" لبنیٰ نے اس سے پوچھا۔

"بالکل ہیں اور ایسی ہیں کہ سن کر دنگ رہ جاؤ گی۔"

"جلدی سے بتا دو پھر۔" روشی نے بے چینی دکھائی۔

"میں نے اور عروج نے شہباز کے پرانے محلے میں جا کر ذرا سی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ شہباز اصل میں آفرین صاحبہ کا پڑوسی تھا اور دونوں کا زبردست افیئر چل رہا تھا لیکن جب آفرین کو فرحت اللہ صاحب نے پسند کر لیا تو اس نے شہباز جیسے کمپاؤنڈر کو لات ماری اور فرحت اللہ سے شادی کر کے باہر سدھار گئی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ کئی برس پرانا یہ افیئر کب اور کیسے دوبارہ اسٹارٹ ہو گیا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ شہباز، رفعت پیلس تک پہنچ گیا۔" مہ پارہ کے کیے گئے انکشافات واقعی چونکا دینے والے تھے۔

"ان کے رابطوں کی تفصیل تو موبائل ریکارڈ سے بھی مل جائے گی۔" "بہتر ہے کہ ہم یہ ساری معلومات ایس ایچ او صاحب سے شیئر کریں تاکہ وہ زیادہ بہتر طور پر اس کیس پر کام کر سکیں۔" لبنیٰ نے مشورہ دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے اماں ابا نے خود پنگے میں ٹانگ اڑانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔" عروج نے اس کی تائید کی۔

"پر ہم بھی تو چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ

جائے کے مصداق کچھ نہ کچھ پنگا لے ہی لیتے ہیں۔'' روشی نے ہنس کر تبصرہ کیا۔ ادھر مہ پارہ کال ملا چکی تھی اور ایس ایچ او کو اب تک حاصل شدہ معلومات فراہم کر رہی تھی۔

''ایسا کریں آپ لوگ تھانے آجائیں یہاں میرے پاس بھی آپ لوگوں کے لیے بہت سی خبریں ہیں۔'' ایس ایچ او نے سنا اور چہکتے ہوئے دعوت دی۔

''اوکے ہم آجاتے ہیں۔'' مہ پارہ نے اس کے چہکنے کو اچھی طرح محسوس کیا اور فون بند کر کے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''لگتا ہے ایس ایچ او نے کوئی کارنامہ سرانجام دے ڈالا ہے۔ ہمیں تھانے بلا رہا ہے۔''

''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔'' وہ فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ تھانے میں ایس ایچ او نے نہایت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔

''آپ لوگوں کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم؟''

''کچھ نہیں ایس ایچ او صاحب...... بس سیدھے کام کی بات کریں۔'' مہ پارہ نے کہا۔

''کام کی بات یہ ہے کہ قاتلوں نے اپنے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر چہکا۔

''اپنی چھترول کے سہارے آپ نے جو اعترافِ جرم کروایا ہوگا، اس سے وہ عدالت میں جا کر صاف مکر جائیں گے۔'' مہ پارہ کو سن کر مایوسی ہوئی تھی اس لیے بے لاگ تبصرہ کیا۔

''ارے نہیں مس! پکے ثبوتوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ فرانزک کی رپورٹ آگئی ہے اور اس کے مطابق وجیہہ اللہ کے دائیں ہاتھ کے ناخنوں میں پھنسے کھال کے ریشوں کا ڈی این اے شہباز سے میچ کر گیا ہے۔ اس رپورٹ کے ساتھ جب میں آپ لوگوں سے حاصل ہونے والی معلومات نتھی کروں گا تو کیس اور بھی پکا ہو جائے گا۔'' وہ بہت خوش تھا۔

''شہباز نے آپ کو کیا بتایا؟'' لبنیٰ نے بے چینی سے پوچھا۔

''جو کچھ آپ لوگوں نے بھاگ دوڑ کر کے معلوم کیا، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ......'' وہ بیٹھے بٹھائے کیس حل ہو جانے پر بڑا کھلکھلا رہا تھا۔

''پوسٹ مارٹم اور فرانزک کی رپورٹیں آنے کے بعد اس نے مان لیا کہ اس نے یہ سب آفرین کے کہنے پر کیا۔ تقریباً سال بھر پہلے سے آفرین اس سے رابطے میں تھی اور اپنی بے وفائی پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے تجدیدِ تعلق کی خواہش ظاہر کرتی رہی تھی۔ اسی کی ہدایت پر شہباز نے موقع ملتے ہی رفعت پیلس میں ملازمت حاصل کی تاکہ جب بھی فرحت اللہ اور آفرین پاکستان آئیں وہ فرحت اللہ سے آفرین کی جان چھڑانے میں اس کی مدد کر سکے۔''

''اس کے لیے تو وہ سیدھے سیدھے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرسکتی تھیں۔ ان کی جان لینے کی کیا ضرورت تھی۔'' لبنیٰ نے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں تبصرہ کیا۔

''مطلقہ کو شوہر کی جائداد میں حصہ نہیں ملتا بی بی! بیوہ بن کر ہی عورت شوہر کی املاک کی حق دار قرار پاتی ہے۔'' ایس ایچ او نے تلخ حقیقت بیان کر کے اس کا اعتراض دور کر دیا۔

''چلیں مان لیا کہ فرحت انکل کو قتل کرنے کا محرک تھا لیکن بیچارے وجیہہ انکل کو کیوں مارا...... وہ بیچارے تو پہلے ہی نہ زندوں میں تھے، نہ مُردوں میں۔'' عروج نے افسوس کا اظہار کیا۔

''آپ نے سنا ہوگا کہ بندے کو ایک جرم چھپانے کے لیے دوسرا جرم بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ صباحت بی بی کے پرینک، اور جمیل کی مفاد پرستی نے آفرین کو اپنے تئیں ایک اچھا موقع فراہم کر دیا اور اس نے یہ سوچ کر سوئے ہوئے شوہر کو عین تقریب والے دن گولی مار دی کہ الزام اس نامعلوم شخص پر آئے گا جو دھمکی آمیز کال اور خط بھیج رہا ہے۔ فرحت اللہ کو گولی مارنے کے بعد اسے واحد فکر آلۂ قتل کو چھپانے کی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ شہباز کے پاس گئی اور وجیہہ اللہ صاحب کو سویا ہوا سمجھ کر اپنے کارنامے سے آگاہ کر دیا لیکن بعد میں جب ان دونوں کو اندازہ ہوا کہ وہ سب سن چکے ہیں تو اس ڈر سے کہ کہیں وہ کسی کو بتا نہ دیں، شہباز نے آفرین کے کہنے پر انہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ جائے واردات سے اس کی غیر موجودگی ظاہر کرنے کے لیے اسے باتھ روم میں بند کیے جانے اور تنہائی اور بند جگہ کا فوبیا جیسی داستانیں گھڑی گئی تھیں جو ہمارے دو چار چھتروں نے جعلی ثابت کر دیں۔'' ایس ایچ او نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

''کیا آفرین نے بھی اعترافِ جرم کرلیا ہے؟'' لبنیٰ نے دریافت کیا۔

''اپنے عاشق کے بیان کے بعد اس کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ ہم نے آلۂ قتل بھی بازیاب کرلیا ہے۔ اس پر سے آفرین بی بی کے فنگر پرنٹس بھی انشاء اللہ مل

جائیں گے۔''

''میری سمجھ سے باہر ہے کہ فرحت اللہ صاحب ہر لحاظ سے شہباز سے بہتر تھے پھر کیوں آفرین دوبارہ شہباز کی طرف پلٹی۔ شہباز سے اسے اتنا ہی اندھا عشق ہوتا تو پہلے ہی اسے نہ چھوڑتی۔'' عروج نے سوال اٹھایا۔

''انسان کبھی بھی ایک خواہش کے پورا ہونے پر اکتفا نہیں کرتا...... آفرین کو دولت مل گئی تو اولاد کی کمی ستانے لگی۔ میڈیکل رپورٹس سے ثابت تھا کہ فرحت اللہ کے ساتھ رہ کر اسے یہ خوشی کبھی نہیں ملے گی اس لیے اس نے یہ داؤ کھیلا۔''

اس بار ایس ایچ او بھی کچھ افسردہ ہوگیا پھر لبنیٰ کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

''آفرین تک پہنچنے میں آپ کی تیز ناک نے بڑی مدد کی۔ اگر آپ نے اس کے ہاتھ سے آنے والی بارود کی بُو کا ذکر نہ کیا ہوتا تو میں اتنی سختی سے اسے شاملِ تفتیش نہ کرتا۔''

''اگر وہ میرے میک اَپ پر تنقید نہ کرتی تو اس مصیبت میں نہ پھنستی۔'' لبنیٰ ناک چڑھا کر بولی تو سب مسکرا دیے پھر مہ پارہ نے پوچھا۔

''صبغت انکل اور جمیل کا کیا ہوگا؟''

''جمیل پر دھوکا دہی کا کیس بنے گا البتہ صبغت اللہ صاحب کو بہت کم سزا ہونے کے چانسز ہیں کیونکہ ایک تو جس وقت اُن سے یہ جرم سرزد ہوا، وہ انڈر ایج تھے دوسرے جمیل جو اس کیس کا مدعی ہو سکتا تھا، اس نے صبغت اللہ صاحب کو معاف کر دینے کا عندیہ دیا ہے۔'' ایس ایچ او نے بتایا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے...... صباحت کی فیملی اتنے صدموں کو سہنے کے بعد صبغت انکل کے لیے کسی سخت فیصلے کی متحمل ہو بھی نہیں سکتی تھی۔'' مہ پارہ نے گویا سکون کا سانس لیا پھر وہ سب ایس ایس ایچ او سے اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہوگئیں۔

''کتنی عجیب بات ہے نا کہ یہ کیس اتنی آسانی سے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے حل ہوگیا پھر بھی دل کو کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی۔ ایک بوجھ سا ہے دل پر......'' باہر آ کر وہ گاڑی میں بیٹھیں تو روشی نے اداسی سے تبصرہ کیا۔

''جب انسانی اقدار اتنی بُری طرح پامال ہوں تو کامیابی کا احساس بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کیس میں بہت سارے کاش ہیں۔ صباحت نے مجھے بتایا تھا کہ رفعت آنٹی کے کاغذات میں سے ایک خط ملا تھا جو انہوں نے عین اپنی شادی کی گولڈن جوبلی والے دن... لکھا تھا۔ اس خط میں انہوں نے اپنی ذاتی املاک میں اپنے بیٹوں اور بیٹی کے علاوہ جمیل نعمان کو بھی حصے دار قرار دیا تھا۔''

''شاید وہ شروع ہی سے جانتی تھیں کہ نعمان کی موت ایک حادثہ نہیں تھی بلکہ اُن کے بیٹے نے اسے پلان کیا تھا اور ان کی بیٹی کو بھی بھائی کے ارادے کی مکمل خبر تھی۔'' روشی نے تبصرہ کیا۔

''ایسی ہی بات ہے۔ ہو سکتا ہے رفعت آنٹی نے اپنی ڈائری میں سب کچھ تفصیل سے لکھا ہو لیکن صباحت نے مجھے نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے اس سے پوچھا۔ اس سارے قصے میں کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بے چاری جھینپی جھینپی سی ہے۔''

''وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گی۔ سمجھدار لڑکی ہے اس بات کو سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لے گی کہ دوسروں کی کرنی کا بوجھ خواہ مخواہ خود پر لادے پھرنا حماقت ہے۔'' روشی نے تبصرہ کیا۔

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ ہماری نسل پچھلی نسل کے مقابلے میں زیادہ پریکٹیکل ہے اور میرے خیال میں پریکٹیکل ہونا منافق ہونے سے بہتر ہے۔ رفعت آنٹی نے بھی شادی کے پچاس سال بعد اس حقیقت کو سمجھا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ نکاح نامے میں خود کو حاصل شدہ حقِ طلاق کو استعمال کرتے ہوئے وجیہہ اللہ صاحب کو چھوڑ دیں گی۔'' ماہ پارہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے بیگم رفعت کے خط سے ملنے والی مزید معلومات سے آگاہ کیا۔

''کاش وہ یہ فیصلہ جوانی میں اُس وقت کر لیتیں جب ان کے شوہر نے انہیں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اُس وقت اُن کے پاس جائز راستے سے اپنی فطری ضروریات پوری کرنے کا آپشن موجود ہوتا۔'' عروج نے افسوس کا اظہار کیا۔

''یہ ہمارے منافقت سے پُر معاشرے کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ہم مصلحتوں کے نام پر وہ نہیں کرتے جو کرنا چاہیے اور پھر فطرت سے ہار کر وہ کر جاتے ہیں جو جائز نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنی تنگ نظری سے جان چھڑا کر جائز کاموں کی راہ میں روڑے اٹکانے چھوڑ دیں تو یقین کرو کہ یہ چوری چھپے کے ناجائز کام خود بخود ہی ختم ہو جائیں گے۔'' مہ پارہ کی بات میں وہ تلخ سچائی تھی جسے سمجھنے کے لیے منافقوں سے پُر اس معاشرے کو ابھی نجانے مزید کتنی صدیاں درکار ہیں۔

❖❖❖

دوسرا رنگ

یہ سارے ادب آداب ہنر یوں ہی تو نہیں آ جاتے ہیں
عمریں تج دینی پڑتی ہیں اِک حرف رقم کرنے کے لیے

حسِ مزاح... ذہانت... علم و دانش اور فہم و ادراک کسی کسی شخصیت میں یکجا ہوتے ہیں۔ **احمد اقبال** کا شمار بھی ایسی ہی شخصیت میں ہوتا ہے۔ گویا ایسے لوگ وقت کی فصیل پر جلتے چراغوں کے مانند ہوتے ہیں... جن کی روشنی میں نئے آنے والوں کو راستے ملتے ہیں... نصف صدی قبل وہ جاسوسی کے ادارے سے وابستہ ہوئے... مسافت زندگی کا مقصد ہے... لطف ہے... ادارے کے ساتھ اُن کی یہ مسافت جاری و ساری ہے الحمدللہ...

Scanned By: AtA-Ul-MUSTAFA 0333-4585215

# دلِ بزدل

کہانی شروع ہوتی ہے... تو اس کا اختتام بھی ہوتا ہے۔ عرصہ دراز پہلے شروع ہونے والی بزدل کی کہانی بھی آپ سب کے ذہنوں میں رچی بسی ہوگی... ایک نہ ختم ہونے والی کوششوں اور جدوجہد کا سلسلہ... ایک آشیانہ... ایک عافیت کدہ کا حصول اس کی زندگی کا حاصل تھا... گولڈن جوبلی کے موقع پر پسندیدہ کرداروں سے تازہ دم کر دینے والی ملاقات کا رنگین و سنگین احوال...

محبت اور عداوت کے کھیل کا چونکا دینے والا اختتام

ایک بار پھر میں نے موبائل فون کو دیوار پر مار کے درست کرنے کا سوچا جو گزشتہ رات سے مجھے کسی طوطے کی طرح رٹا رٹایا جواب سنا رہا تھا۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ پھر مالی نقصان کا خیال دامن گیر ہوا۔ یوں بھی قصوروار تو دوسرا فون تھا جو بند تھا اور اس پر یہ دستور زباں بندی لاگو کرنے والی صائمہ تھی۔ پھر ایک آہِ سرد کے ساتھ میں نے اپنی اکلوتی قائم مقام محبوبہ ڈاکٹر غزالہ کو یاد کیا۔ اس سے معلوم ضرور ہو جاتا تھا کہ صائمہ مصروف ہے یا روٹھی ہوئی ہے۔ اب غزالہ پیا گھر سدھار چکی تھی اور ابھی تک اس کی جگہ کسی نے خود کو تقرری کا مستحق ثابت نہیں کیا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں بقلم خود کوئے جاناں تک جوتیاں چٹخاتا جاؤں۔

میں سیدھا گزر جاتا مگر گنے کا رس بیچنے والے بنگالی اور اس کی ریشمی لنگی کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ اتنی تاخیر سے اس کی دکان داری شروع ہونے کا سبب یقیناً شبِ عروسی ہوگی۔

گزشتہ روز اس کا عقد مسنونہ تھا۔ وہ ٹیلی فون کے کھمبے کو پردہ داری کے لیے کافی سمجھتے ہوئے وہی کاروباری اوقات والی پرانی لنگی پہنے ہوئے تھا جس کو ائر کنڈیشنڈ سمجھا جاسکتا تھا۔ اس میں وقت کے ساتھ ہوا کے آنے جانے کے سوراخ بڑھتے جارہے تھے۔

میں نے پیچھے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ اُچھل پڑا۔ ''شادی بہت مبارک ہو جلیل میاں۔''

''یہ تم ہے شالا۔ ہم کو ڈرا دیا۔'' وہ مسکرایا۔ آج خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ سرمہ اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

''بڑا افسوس ہے تم آج بھی صبح صبح نکل آئے۔ خیر سناؤ۔ کیسی ہے تمہاری دُلہن۔ رات کیسے گزری؟'' میں نے بڑے فحش اشارے کے ساتھ اسے آنکھ ماری۔

''تم شالا ایک نمبر کا کمینہ اور بے شرم ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے مشین کو صاف کرتا رہا۔

میں نے کہا۔ ''ہم اتنے پرانے دوست ہیں یار لیکن بہت افسوس ہے تم نے مجھے شادی میں نہیں بلایا۔ چلو اس کی تصویر ہی دکھا دو۔ سنا ہے تم سے دگنی عمر کی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ جب تم اس کے پاس گئے تو کیا بولا۔ باجی اندر آجاؤں۔''

''سالا تم ابھی جائے گا ورنہ ہم گنا سے مارے گا تم کو۔'' اس کا موڈ خراب ہو گیا۔

عین اسی وقت میں نے میاں منظور عرف مولوی اچھور کو دیکھ لیا۔ یہ خطاب اسے صائمہ نے دیا تھا اور اس کی شخصیت کا خلاصہ تھا۔ فریادی صورت پر برستی دائمی یتیمی اور اداسی سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ خودکشی کرنے جارہا ہے یا ڈاکا ڈالنے۔

میں نے اُسے پیچھے سے جا پکڑا۔ ''ارے میاں جی، ایسے کہاں جارہے ہو، بندوق سے نکلی گولی کا مافک۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر آسمان کی طرف

دیکھا۔ ''جناب والا کیا عرض کروں۔ بندہ احقر و پُرتقصیر نے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ حتی المقدور سعیِ مسلسل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت......''

''او میرے بھائی۔ لغت نہیں ہے میرے پاس۔ آسان اردو میں بتا مجھے۔''

''ہنوز مسماۃ ڈاکٹر صائمہ مفقود الخبر ہیں۔'' اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے جھلا کے کہا۔ ''مفقود الخبر ہیں، یہ تو مجھے بھی پتا ہے۔''

ملا امچور میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دوڑ کر ایک گزرتی ہوئی ویگن کے دروازے سے چپک گیا جہاں پہلے سے چار لٹک رہے تھے اور میری دسترس سے نکل گیا۔ لاحول ولا۔ روتا جائے مرے کی خبر لائے۔ میرے دیے ہوئے سو روپے بھی ضائع ہوئے۔ اس وقت رش کے اوقات میں اسپتال کے اندر جا کے مجنوں کا لیلیٰ لیلیٰ چلاتے پھرنا بھی لاحاصل تھا۔ اس ضعیف حسینہ میٹرن کا اپنے آفس میں ملنا بھی دشوار تھا جو مجھے دعوتِ گناہ دیتی نظروں سے دیکھتی تھی تو مجھ پر لرزہ بخار والی کپکپی طاری ہوجاتی تھی۔

برنس روڈ پہنچنے تک صائمہ کے عشق پر پیٹ میں دوڑنے والے چوہے غالب آچکے تھے۔ چار پوریاں اور حلوا کھانے کے بعد چائے کی طلب اتنی ہی قوی تھی جتنی ساس میں بہو سے لڑنے کی ہوتی ہے لیکن یہاں وہی پہلوان کی ربڑی چائے ملتی۔ دودھ پتی اور چینی کا ملائی والا گاڑھا مشروب۔ اپنے مطلب کی چائے تفنگ چنگیزی عرف توپ صاحب مدیر و ناشر روزنامہ حقیقت ساز کے مرقد پر ہی مل سکتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ انہوں نے مجھے علی الصباح گیارہ بجے کوئی سرپرائز دینے کے لیے طلب کیا تھا۔ ان کے دفتر تک مارننگ واک کے بعد میں نے چار منزلوں کی چڑھائی کا مرحلہ بھی طے کیا۔ توپ صاحب نے ہر روز کی آمدورفت میں کسی دشواری کا شکوہ کبھی نہیں کیا تھا حالانکہ ان کی اپنی عمر اس عمارت سے زیادہ تھی جو میرے خیال میں سکندرِ اعظم کے دور کی تھی۔ اس میں لفٹ لگنے سے زیادہ امکان یہ تھا کہ عمارت گرا کے یہاں کوئی بیس تیس منزلہ تعمیر ہوگی۔ مبینہ طور پر سو پچاس اخبار یہاں سے ایسے بھی نکلتے تھے جن کو خود پرنٹر پبلشر نہیں پڑھتے تھے۔ مگر یہ پریس سینٹر تھا اور اس کو گرانا آزادیِ صحافت پر حملہ سمجھا جاتا۔

دفتر میں قدم رکھتے ہی ایک عجیب منظر میرے سامنے آیا۔ کاتب جواہر رقم غلام رسول جس کو توپ صاحب پیار میں جواہر لال نہرو پکارتے تھے اور غصے میں صرف نہرو۔ ان کے سامنے دست بستہ کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ توپ صاحب معمول کے مطابق کرسیِ ادارت پر رکھے ہوئے تھے اور اپنے خاندانی پاندانی نسخے سے بارہ مسالے والی گلوری بنانے میں مگن تھے۔ ان کی پُھندنے والی آبائی ترکی ٹوپی سامنے میز پر رکھی تھی۔ ایک تصویر دکھاتے ہوئے توپ صاحب آبدیدہ ہوجاتے تھے جس میں ایسی ہی ٹوپی پہنے مولانا محمد علی کے ساتھ کھڑے مسکرانے کی کوشش کررہے تھے۔ توپ صاحب نے نظریۂ ضرورت کے تحت اختراع یہ کی تھی کہ ٹوپی میں پلاسٹک کا مضبوط استر لگوایا تھا چنانچہ کبھی وہ کاتب کو برنس روڈ تک دوڑا دیتے تھے کہ میاں اس میں ذرا گرما گرم مغز نلی والی نہاری تو ڈلوا لاؤ۔ کاتب کا ہاتھ نہیں جلتا تھا اور توپ صاحب نہاری کھانے کے بعد واش اینڈ ویئر ٹوپی کو خود دھوتے تھے۔ وہ ایک عملیت پسند خوش باش انسان تھے۔

توپ صاحب کے مقابل کی کرسی پر بیٹھ کے میں نے غور کیا تو دفتر کا نقشہ خاصا بدلا ہوا تھا۔ اندر نیا رنگ ہوا تھا۔ کچھ نیا فرنیچر نظر آرہا تھا لیکن وہ قدیم تخت غائب تھا جس پر گھٹنا موڑ کے کتابت کرتے جواہر لال نہرو نے ایک عمر گزار دی تھی۔

''بزدل صاحب! آپ انصاف سے ہمارا فیصلہ کریں۔'' مجھے دیکھتے ہی وہ بلبلایا۔

''انصاف اگر دنیا میں کہیں ہوتا ہے۔'' میں نے پاؤں میز پر پھیلا کے کہا۔ ''تو ہم بھی کریں گے۔ تم پہلے چائے بنا کے لاؤ۔'' پھر میں نے گرج کے کہا۔ ''توپ صاحب! ظلم نہیں چلے گا۔''

توپ صاحب نے گلوری منہ میں رکھی اور مکھیاں مارنے والا آلہ میرے پاؤں پر مارا۔ ''اپنے کھر ہٹاؤ پہلے پھر بات کرو۔''

''اخبار کے دفتر میں بھی تشدد...... آہ۔'' میں نے پاؤں نیچے کرلیے۔

''بات یہ ہے میاں بزدل۔'' توپ صاحب نے منہ کے گرائنڈر میں پان کو گھوٹنا شروع کیا۔ ''ہم نے سوچا کہ بہت دن ہوگئے اکیسویں صدی آئے۔ ہمیں بھی اس میں قدم رکھنا چاہیے۔ ہم یہ کتابت وغیرہ ختم کرکے کمپوزنگ کا آغاز کررہے ہیں۔''

''منیر نیازی نے آپ کے لیے کیا خوب کہا۔ ہمیشہ

دیر کر دیتا ہوں میں۔''

''عقل منداس سے پہلے کہہ چکے تھے دیر آید درست آید۔اس جواہر نہرو کی سمجھ میں بات نہیں آرہی ہے۔رورہا ہے کہ میرے پیٹ پر لات نہ ماریں۔اب تم ہی بتاؤ۔ہم تو لات ہمیشہ پیٹ کے عقب میں مارتے ہیں۔'' انہوں نے پیک کا نیا اسٹاک نکالنے کے لیے کرسی کے پیچھے والی کھڑکی کھولی۔گردن کو مرغے کی طرح باہر نکال کے دائیں بائیں دیکھا اور پیک فضا میں چھوڑ کے کھڑکی یوں بند کی جیسے کھلی ہی نہ تھی۔کامیابی کی نئی مسرت کے ساتھ انہوں نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔

''ذرا سوچیے توپ صاحب۔میدانِ حشر میں کتنے پیک والے سرخرو آپ کے خلاف کھڑے ہوں گے۔''

''گاؤدی ہو تم میاں بزدل۔قتل کوئی ایک کرے یا سو۔پھانسی کیا سو بار ہوگی؟'' وہ کڑک مرغی کی طرح ہنسے۔

کاتب نے چائے کا مگ میرے سامنے رکھا تو اس کی صورت دردناک ہو رہی تھی۔میں نے کہا۔''ماموں، حوصلہ کریں۔کمپوزنگ آپ بھی کر سکتے ہیں کمپیوٹر آپ کی سوکن نہیں ہے۔آپ دو ٹانگوں پر چلتے رہے۔پھر ٹانگوں پر آنے جانے لگے اب ویگن ہے جس میں آپ یوں لٹکے نظر آتے ہیں جیسے...... جیسے ڈال سے آم۔''

خطرے کی بو سونگھ کے توپ صاحب نے اچانک غوطہ مارا اور میز کے نیچے غائب ہو گئے۔دروازے کو دھڑ سے کھول کے کسی آتش فشاں کی طرح دھواں دیتا چھ فٹ کا کسرتی بدن والا نوجوان اندر آ کے چلّانے لگا۔''میں چٹنی بنا دوں گا۔'' اس کی ٹی شرٹ پر سرخ دھبے تازہ تھے۔

میں نے سکون سے چائے کا گھونٹ لیا۔''چٹنی مربّا جام جیلی جو چاہو بناؤ لیکن یہ اخبار کا دفتر ہے۔''

مجنوں کے پیچھے آنے والی شٹل کاک برقعے میں سے اس کی خالہ نہیں ایک ماڈل ٹائپ نوخیز حسینہ برآمد ہوئی اس کے چہرے کے میک اپ میں لبوں کی لالی بالکل پان کی پیک جیسی تھی۔

''کہاں ہے اوپر سے یہ پیک اُگلنے والا۔'' نوجوان غصے میں بلبلایا۔''میں آملیٹ بنا دوں گا۔''

میں نے میز پر مُکا مارا۔''ابے ٹارزن کے نطفے۔ہم دو شرفا میں کوئی ہے پان کھانے والا۔''

کاتب نے بھی سر ہلا کے منہ کو معائنے کے لیے پورا کھولا۔''دیکھ لو۔''

شیر کی آواز بلی جیسی نکلی اور اس نے دیدے گھما کے اِدھر اُدھر دیکھا۔''وہ تو ٹھیک ہے مگر...''

''اگر مگر کے بچے۔شکل گم کرو اپنی اس سے پہلے کہ اخبار کے دفتر میں ہنگامہ کرنے پر تم کو تھانے والے لے جائیں اور پیچھے سے بھی لال کر دیں۔'' میں نے اپنا جلالی لہجہ برقرار رکھا۔

لیلیٰ مجنوں کے بدحواسی میں فرار ہونے پر مجھے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونے کا محاورہ یاد آیا۔توپ صاحب نیچے سے نکل کے کرسیِ ادارت پر ایسے سکون سے رونق افروز ہوئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

''توپ صاحب بخدا کسی روز کوئی اصلی توپ لے کر آجائے گا اور آپ کے جرم کی پاداش میں بزدل کو ہلاک کر دے گا۔'' میں نے فریادی لہجے میں دُہائی دی۔

''انشاء اللہ۔'' وہ ترکی ٹوپی ہلا کے گویا ہوئے۔

''آج کے اس خصوصی اجلاس میں کمپیوٹر کمپوزنگ کی قرارداد منظور کی جاتی ہے۔جواہر لال نہرو اس شعبے کا سربراہ ہوگا۔اس کی ماتحتی میں دو کمپوزر ہوں گے اور تنخواہ بھی دُگنی۔بھئی مبارک ہو۔اس خوشی میں دوڑ کے فریسکو سے مٹھائی تو لے آؤ۔''

کچھ دیر پہلے روتی شکل والا فریادی اپنی بتیسی دکھانے لگا''میں ابھی لے کر آتا ہوں جی۔'' اس نے کہا اور خوش خوش باہر نکل گیا۔میں توپ صاحب کی ہوشیاری پر افسوس سے سر ہلانے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدور مات۔

''چلیں کاتب کو تو چکر دے دیا آپ نے۔'' میں نے جیب میں سے ایک ڈائری نکالی۔''لیکن میں ٹلنے والا نہیں۔یہ میرے کئی برسوں کے واجبات ہیں۔''

توپ صاحب نے ٹوپی اتار کے میز پر رکھی۔''بس اب سارے دلدّر دور ہو جائیں گے میاں بزدل۔اخبار کمپیوٹر کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔اب تم مدیر ہو۔میں مدیر اعلیٰ ہو جاؤں گا۔میرے بعد اخبار کو مستقبل میں ایک کروڑ کی اشاعت پر تم ہی لے جاؤ گے۔''

مدیر؟ یعنی ایڈیٹر؟ میں نے خوشی اور غرور سے سوچا اور واجبات کے حساب کی ڈائری کو جیب میں رکھ لیا۔

''ہاں میاں انقلاب آ چکا ہے۔تم کہو اپنی نورِ چشم صائمہ کیسی ہے؟'' توپ صاحب نے کہا۔

''جیسی ہمیشہ سے ہے ویسی ہی ہوگی۔''

"اور بقول شاعر۔ مجنوں کا نام رہ گیا لیلیٰ بھی مرگئی۔ رہے نام اللہ کا۔ ہاں تم بھی ویسے ہی ہو ہمیشہ جیسے۔" توپ صاحب نے کہا۔

"توپ صاحب! میرا قصور ہے تو بتائیں؟"

"ہاں ہاں۔ وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔" توپ صاحب نے ایک آہ بھری۔ "اب سے چالیس پچاس سال بعد جب ہماری جگہ اس کرسی پر تم بیٹھے ہو گے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا چکی ہوگی میاں بزدل۔ پھر یاد آئیں گی ہماری باتیں۔"

"گویا میرا ابھی اندازہ غلط نہیں تھا۔ آپ بتا ہی دیں آج کہ وہ کون تھی۔ شادی کیوں نہیں کی ہوسکی آپ کی؟" میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ خلافِ معمول وہ آج بجھے بجھے سے تھے۔

توپ صاحب خلا میں دیکھتے رہے۔ "ایک لڑکی تھی میاں بزدل وہ بھی۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے اور اس کے حسن کی بھی کیا تعریف کریں۔ لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے کوئی اور نہیں دیکھ سکتا۔ آج ہی کی تاریخ تھی جب وہ مرگئی۔ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔"

"خودکشی؟ مگر کیوں؟"

توپ صاحب نے مجھے یوں دیکھا جیسے انہیں مجھ سے اس درجہ احمقانہ سوال کی امید نہیں تھی۔ "کیوں کرتا ہے کوئی اپنی زندگی کا خاتمہ؟ جب جینا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے اور امید کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔"

"چالیس سال آپ نے تنہا گزار دیے؟"

"قصوروار میں تھا میاں بزدل تو یہ قیدِ تنہائی کی سزا مجھے ہی کاٹنی تھی اور ہمارے بعد تم کاٹو گے دیکھنا۔" وہ اپنے لیے گلوری بنانے لگے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں۔ تم تو خودکشی کرو گے نہیں۔ بزدل صرف نام کے نہیں واقعی میں ہو۔ وہ ضرور مر جائے گی کسی دن۔" انہوں نے ایک گہری دکھی سانس کے ساتھ گلوری منہ میں رکھی۔ "عورت اتنی بہادر کہاں ہوتی ہے جتنی نظر آتی ہے۔"

میں چپ بیٹھا اُن سے نظر چُراتا رہا پھر خاموشی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

صبح اپنی انٹیک موٹر سائیکل پر محبت کی آخری نظر ڈالتے ہوئے میں نے دیکھا کہ خانۂ خدا کی دیوار کے ساتھ کھڑے کھڑے اس پر اتنی گرد جم چکی تھی کہ اب اس پر کچھ ہریالی نمودار ہو رہی تھی۔ اسی وقت مستری مونچھ نمودار ہوا۔ میں نے اسے گلے لگا کے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "اس بے زبان کو آج سے اپنی جانو جو تین سال سے تمہارے در پر پڑی ہے۔"

اس نے مونچھ ہلا کے کہا۔ "سر جی، باقی کے دو پرزے اسی ماہ کمپنی سے بن کر آجائیں گے۔"

"ان کو تم وہاں لگا لینا جہاں میں لات نہ مار سکا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اور آج کے بعد مجھ سے اس مردے میں جان ڈالنے کی بات کرنے سے پہلے اپنی ہونے والی بیوہ سے مہر بخشوا لینا۔"

مستری کی مونچھوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو سر جی۔ مجھ پر اتنا احسان ہے آپ کا۔ میری ایسی تصویر اخبار میں لگائی کہ دیکھتے ہی اس کی اماں نے پسند کرلیا۔"

"مستری مونچھ۔" میں نے اس کی سنے بغیر کہا۔ "جتنا پیسہ تم نے اس آدھے ہارس پاور کی سواری کے پرزے بنوانے کے نام پر ٹھگ لیا۔ اس میں ایک ہارس پاور کا پورا گھوڑا آجاتا۔" میں نے اپنی اس مشین کو آخری بار مطلقہ بیوی کی طرح دیکھا۔ "لیکن اب تم مجھے اور نہیں لوٹ سکتے۔" اور چل پڑا۔

صائمہ کے چودہ نکاتی مطالبات میں سے ایک یہ بھی تھا جو آج پورا ہوا۔

اب مجھے اپنے مالک مکان کو ایک اور قانونی نوٹس ارسال کرنا تھا کہ اس پر ہتکِ عزت کے مقدمات میں ہرجانے کی رقم ایک کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ پچاس لاکھ کا فلیٹ قبل میرے نام کر دے۔ مالک مکان کا نروس بریک ڈاؤن بہت پہلے ہو چکا تھا۔ وہ اعلان کرتا پھرتا تھا کہ کسی رات اس منحوس فلیٹ کو وہ دھماکے سے اُڑا دے گا۔ صائمہ کے مطالبات میں سرفہرست یہی تھا کہ میں یہ کرائے کا فلیٹ چھوڑ کے اپنا فلیٹ لوں اور اسی جگہ آ کے محبت کی گاڑی کا انجن فیل ہو جاتا تھا۔ اس کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ اپنے بچپن کے چار یاروں کو چھوڑ دوں جو اس کے نزدیک سب "چور اُچکے جواری" تھے اور میری ساری کمائی تاش کی بازی میں مکاری سے جیت کر لے جاتے تھے۔

شوہر کے جگری دوستوں کو تمام بیویاں سوکن کیوں

سمجھتی ہیں؟ اس قومی مسئلے پر غور کرتا ہوا میں سڑک کے درمیان نہیں فٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ ایک دھماکا خیز بغیر سائیلنسر والی موٹر سائیکل جیسے میری ٹانگوں میں سے گزر کے سامنے رک گئی۔ میں نے ایک چہرہ دیکھا جس کے سر کے سب بال ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور مونچھ میں شامل ہو چکے تھے۔ ان بالوں میں دانت چمکنے لگے تو مجھے اس کے مسکرانے کا پتا چلا۔

میں نے کہا۔ ”آج تو میں خوش قسمتی سے بچ گیا مولوی صاحب لیکن سچ کہو تمہیں کس نے میرے قتل......“

”سر جی میں بوٹا ہوں۔ بوٹا شاہ جھلی۔ جس کو آپ جہنمی بولتے تھے۔“ اس نے عقیدت سے میرا ہاتھ تھام کے ہونٹوں سے لگایا۔

میں نے ہاتھ کو اجرک سے صاف کیا جو اس نے خود پر لپیٹ رکھی تھی۔ ”کیا اس جرم کی سزا میں تم یہ سواری میرے اوپر سے گزارنا چاہتے تھے؟“

”توبہ توبہ سر جی۔“ اس نے کان پکڑ کے کہا۔ ”آپ تو محسن ہو میرے۔ یاد ہے جب پولیس نے ایک بینک کی واردات میں میرا نام ڈال دیا تھا۔ تو آپ نے ہی مجھے بری کرایا تھا۔ میں نے تو فیس بھی سال بعد دی تھی۔“

”اچھا، اچھا۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”آج کل کسی مدرسے میں ہو؟“

”او نہیں سر جی۔ اپنا کام سیٹ ہے۔ آپ کو جیل لے جانا تھا استاد ڈاڈے شاہ کے پاس۔“

”کیا اس نے اندر بیٹھ کے جیل میں ڈاکا ڈالا ہے؟“

”آپ بیٹھو جی۔ لگ پتا جائے گا۔“ اس نے ایک دھماکے سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ کلمۂ شہادت پڑھ کے میں پیچھے بیٹھ گیا اس کے چلتے ہی پہلے تو میں اڑ کر پیچھے گرنے سے بچا۔ پھر یوں لگا جیسے موٹر سائیکل کبھی کسی بلڈوزر کے نیچے سے گزر گئی کبھی کسی رکشا کے بیچ میں سے تو کبھی اس ریڑھی کے اوپر سے جس کا فریادی مالک گالیاں دیتے ہوئے سڑک پر سے ٹماٹر سمیٹ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لینا بہتر جانا۔ پتا تو چل ہی جائے گا کہ دنیائے فانی سے عالم جاودانی میں پہنچ گیا ہوں۔

جیل میں میری طلبی کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ میرے کچھ موکل اندر بیٹھ کے مجھے یاد کرتے رہتے تھے۔ پرانے واجبات چکاتے تھے یا سفارش کرتے تھے کہ میں ڈکیتی میں گرفتار کسی ملزم کا کیس لے لوں۔ ایک وقت تھا کہ جب کوئی وکیل ان کا ایڈوانس فیس لیے بغیر کیس لڑنے کو تیار نہ تھا تو میں نے ان کا کیس ادھار پر لڑا تھا۔ یہ سودا بہت منافع بخش ثابت ہوا تھا۔ وہ احسان مند ہوئے اور انہوں نے بعد میں ایک کے سو یا ہزار بھی ادا کیے۔ ان کے اور میرے درمیان اعتماد اور دوستی کا ایسا رشتہ قائم ہوا کہ جیسے جیسے شہر میں لوٹ مار بڑھی میرے موکل بڑھے۔ ایک بار تو بینک لوٹنے والے واردات سے قبل ہی آ گئے کہ بزدل صاحب جی۔ کل انشاء اللہ فلاں بینک میں ڈاکا ڈالنے کی نیت کی ہے۔ چادر بھی چڑھا دی ہے پیر دھماکا کے مزار پر۔ آپ ہمارے حق میں دعا کرنا۔ سوچا وکالت نامہ پر دستخط کر جائیں۔ اللہ کو منظور ہوا تو دو کروڑ ملیں گے۔ دو لاکھ آپ کے۔ ویسے تو پولیس سے بھی معاملہ سیٹ ہے پچیس فی صد پر لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا تو عدالت میں وکیل آپ اور باقی فیس بعد میں۔ آگے جو مرضی مولا کی۔

مجھے چور ڈاکوؤں نے کیسے وکیل کیا۔ اس کے پیچھے ایک سچا واقعہ تھا۔ کراچی میں ایک رات ڈاکو محصور ہوئے تو انہوں نے کہا کہ ہم ہتھیار ڈال کے خود کو پولیس کے حوالے کر دیں گے لیکن کسی اخباری نمائندے کے سامنے ورنہ تمہارا کیا ہے۔ پولیس مقابلے میں مار دو گے۔“ اس رات تھانے میں ایک بہت بڑے اخبار کا کرائم رپورٹر موجود تھا جس کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ اس کو بلایا گیا اور اس کی موجودگی میں ڈاکو ہتھیار پھینک کے باہر آ گئے۔ کئی سال بعد یہ واقعہ ان ڈاکوؤں کے ذہن میں تھا جنہوں نے کہا کہ وہ میری موجودگی میں ہتھیار ڈالنے کو تیار ہیں۔ کسی وکیل کو بلانے کا آئیڈیا جو صحافی بھی ہو، ان کا اپنا نہیں تھا تو ان کو میرا نام دینے والا انسپکٹر رحم دل خان تھا۔ وہ میرا بچپن کا دوست اور اب جوانی کا دشمن ہے۔ وہ ایس پی ہو گیا تھا مگر میرے دیے ہوئے نام ظالم خان سے زیادہ مشہور تھا۔

جیل کے بیرونی دروازے سے موٹر سائیکل یوں دندناتی گزری جیسے تیز گام پنڈ رپھڑ والا سے گزرتی ہے۔ آگے جیل کا اصل گیٹ تھا جہاں چھوٹا سا اسٹاپ آیا۔ جان پہچان قائم ہو گئی تو میری شناخت کا مرحلہ آیا۔ ڈراؤنی مونچھوں والے لانس نائیک جس کا زیادہ وقت اپنی توند کے گنبد پر پتلون کو روکنے میں صرف ہو رہا تھا میرے نام بتانے پر خفا ہو گیا۔

”بزدل؟“ وہ غرایا۔ ”میرے ساتھ مخول؟ نام بتا صحیح سے جو شناختی کارڈ میں لکھا ہے۔“

میں نے کہا۔ ''لکھو بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی ایڈووکیٹ مدیر روزنامہ ''حقیقت ساز''۔''

''کیا جی؟'' اس نے صدمے سے سنبھل کے کہا اور رجسٹر میرے سامنے کر دیا۔ ''آپ خود ہی لکھ دو۔''

جیلر کے آفس تک کا راستہ مجھے معلوم تھا لیکن اندر کا عملہ بھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ اس کا سبب مجھے اندر جا کے معلوم ہوا۔ وہاں ایک نیا چہرہ دکھائی دیا جو پرانے سفید ریش جیلر کے مقابلے میں نوجوان ہی تھا۔ اس نے خاصی ناگواری سے ہاتھ ملا کے بادلِ ناخواستہ مجھے بیٹھنے کا کہا مگر مجھے یہاں لانے والے کو باہر نکال دیا۔

''یہ بزدل کیا نام ہے؟'' اس نے مجھے مشکوک نظر سے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''جیسے اپنے پنجاب میں اقبال کو بالا بولتے ہیں نا۔ بس ایسے ہی۔ اصل نام ہے بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔''

اس کا منہ کھل گیا۔ ''کرتے کیا ہو تم؟''

''میں ایڈیٹر ہوں روزنامہ ''حقیقت ساز'' کا اور ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔'' میں نے اپنا پریس کارڈ اور وکالت کا لائسنس آگے بڑھا دیا۔ اس نے صحافت کے لائسنس کو غور سے دیکھا۔ ''اوہو، یہ تو سرکاری ہے۔''

''جی۔ وزارت اطلاعات ونشریات نے جاری کیا ہے اور ایکریڈیشن کارڈ کہلاتا ہے۔ آپ سمجھے ہوں گے وہ ہوگا جو ہر ادارہ جاری کر دیتا ہے ہر ملازم کو۔ ورنہ وہ بھی ہیں کہ اپنے اخبار کا کوئی نام رکھا۔ اپنے شناختی کارڈ چھپوا لیے۔ چیف ایڈیٹر۔ رپورٹر سب خود۔''

بس اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اُس نے پھر اٹھ کے ہاتھ ملایا۔ ''سوری سوری، آپ سے پہلے ملا نہیں تھا نا۔ کالم آپ کا ابا جی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اب میں بھی دیکھوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ جو آپ سے پہلے یہاں پندرہ سال سے تھے۔ وہ کہاں گئے؟''

''ہاں جی وہ خیر سے ریٹائر ہو گئے۔ ڈیفنس میں کوٹھی تو پہلے بھی تھی مگر خود یہاں رہے تو وہ کرائے پر اٹھا رکھی تھی۔ وزیر داخلہ کا سالا رہتا تھا۔ اپنی رہائش کے لیے دوسری خریدی ہے۔ ایک مل لگا لی ہے انڈسٹریل ایریا میں۔ حج پر گئے ہیں۔'' اس نے بڑے طنزیہ انداز میں مجھے اپنے پیش رو کی ساری مال کہانی سنا دی۔

میں نے ایک جہاں دیدہ شخص والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''سب معلوم ہے مجھے۔ اخبار والوں سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ ہر جگہ اندر کے لوگ ہی سب بتا دیتے ہیں۔''

''یہاں بھی بڑے مرید ہیں جی آپ کے۔'' وہ طنز سے بولا۔ ''آپ سے ملنا چاہتے تھے مگر ایسا کرتے ہیں پہلے کھانا منگواتے ہیں۔ آپ بتائیں یہ قانون اور صحافت کا چوروں سے کیسا گٹھ جوڑ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ تو ہمیشہ سے اور ہر جگہ ہے بھولے بادشاہ۔''

''وہ..... میرا نام بہادر علی ہے۔'' وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ''میں کھانے کا کہہ دوں۔''

جیل کے نئے بادشاہ کو مجھ سے بات کر کے کچھ مایوسی ہوئی۔ یہاں دودھ کا دُھلا تو کوئی نہیں تھا۔ یہ جرم کی سلطنت تھی جس کے باسی سب مجرم تھے۔ ان پر کوئی مرد پارسا حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ ایک پرائز پوسٹ تھی۔ قسمت کی لاٹری اسی کے نام نکلتی تھی جو شاہِ وقت کا زیادہ مقرب ہوتا تھا اور کئی امیدواروں کا پتا کاٹ کے آتا تھا۔ ہر جیلر اندر ہی اپنی مافیا بنا کے کام کرتا ہے۔ بہادر علی بھی یہی چاہتا تھا کہ اندر کے معاملات میں باہر کی مداخلت نہ ہو لیکن ڈاکوؤں نے اس کو بائی پاس کر کے مجھ سے رابطہ کر لیا تھا۔ میں بیک وقت دو قوتوں کا نمائندہ تھا۔ عدالت کا اور صحافت کا۔ بہادر علی نے مصالحت کا راستہ اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ اس نے ایک ایک کر کے چار بڑوں کو بلا لیا۔ انہوں نے مصافحہ کر کے ہاتھ سینے پر رکھے۔ وہ بڑے سینئر اور خاندانی قسم کے ڈاکو تھے۔

ایک نے کہا۔ ''وکیل صاحب، منگنی ہو رہی ہے آپ کی۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا؟ مجھے ابھی تم سے پتا چلا۔ کب ہو رہی ہے؟''

دوسرا سر کھجا کے بولا۔ ''خبر تو پکی تھی۔ خیر ہم نے کچھ انتظام کیا ہے۔ وہ آپ لے لو۔''

تیسرے نے گریبان میں سے اخباری کاغذ کا پیکٹ نکالا۔ ''ابھی یہ ایک لاکھ ہیں۔ سمجھو منگنی کے۔''

چوتھا بولا۔ ''شادی کا خرچہ تو زیادہ ہوگا۔ وہ آپ کو بعد میں نذر کریں گے۔''

میں ایک ایک کی صورت دیکھتا رہا۔

ایک یہاں عمر قید کاٹ رہا تھا۔ اس کا کیس مجھے

پرانے وکیل کی اچانک موت کے بعد ملا تھا اور میرا پہلا کیس تھا۔

ڈکیتی کی ایک واردات میں مزاحمت پر گارڈ بھی مارا گیا تھا لیکن اس کو منیجر نے مارا تھا، اس نے ڈاکوؤں اور منیجر کے درمیان معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ بعد میں اس کا الزام سرغنہ پر لگا دیا گیا۔ اس نے سزائے موت کے خلاف اپیل دائر کی تھی۔ سماعت کے آخری مرحلے پر کیس میرے پاس آیا۔ اس کا مرحوم وکیل دلائل سے اسے بے گناہ ثابت کر چکا تھا۔ مجھے کیس ملا تو کچھ نکات میں نے بھی اٹھائے تو اپیل منظور ہو گئی۔ اب وہ صرف ڈکیتی کے الزام میں سات سال کی جیل کاٹ رہا تھا۔ جان بچانے کا کریڈٹ وہ مجھے دیتا تھا مگر میں نے فیس کی نصف رقم سابق وکیل کی فیملی کو پہنچا دی تھی۔

دوسرے ڈاکو صاحب کی سزا میں نے عمر قید سے کم کرا کے سات سال کرا دی تھی۔

تیسرے کی ضمانت منظور کرانے کے بعد اپیل میں سزا نصف ہو گئی تھی جو اب پوری ہونے والی تھی۔

چوتھے کو پولیس تفتیش میں مار دیتی اور کہتی کہ اس نے حوالات میں خودکشی کر لی لیکن میں نے اس کی میڈیکل فٹنس رپورٹ پیش کر کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بالکل صحت مند ہے اور ایسا ہی رہنا چاہیے۔

چنانچہ ان سب کا میرا شکر گزار ہونا بالکل جائز تھا۔ اصل نیک نامی مجھے یہ ملی تھی کہ پولیس یا بیورو کریسی مجھے خرید نہیں سکتی تھی۔ میں حق نمک ادا کرتا تھا۔

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کا وقفہ تھا جس میں جیلر میں اور مجرم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر میں نے کہا۔ ”میں بہت شکر گزار ہوں آپ سب کا۔ یہ وضع داری اب اُن میں بھی نہیں جو ڈاکو ہی ہیں مگر شرفا کہلاتے ہیں۔“

سب سے سینئر نے آہ بھری۔ ”وضع داری اب ڈاکوؤں میں بھی کہاں رہ گئی ہے جی۔ پہلے سردار کے حکم کی پاسداری سب کرتے تھے۔ مال کی تقسیم ہو یا ذمے داری کی۔ اللہ مغفرت کرے۔ سلطانہ ڈاکو نے حکم دیا کہ واردات میں مرنے والے کی بیوہ اب تمہاری ذمے داری ہے۔ تو ماتحت ڈاکو نے اس سے شادی کی۔ حالانکہ مرنے والا چار بچے چھوڑ گیا تھا۔ چار اس نے بھی پیدا کیے۔“

بہادر علی ہنس پڑا۔ ”یہ بھی وضع داری ہے؟“

باقی تین نے اسے حیرانی اور افسوس سے دیکھا۔

پہلے نے مسکرا کے کہا۔ ”اب کیسا سردار کہاں کا سردار۔ ہر لونڈا ریوالور اٹھا کے جہاں چاہے ڈکیتی کرنے پہنچ جاتا ہے اور کتے کی موت مارا جائے تو رونے والا کوئی نہیں ہوتا۔“

میں نے کہا۔ ”آپ سب کا شکریہ۔ یہ تحفہ میں لے لوں گا جب شادی کا خطرہ محسوس کروں گا۔“

”اب اور تب کیا جی۔ تحفہ واپس نہیں کرتے۔ کل کس نے دیکھی ہے۔“ وہ اداسی سے بولا۔ ”رکھ لو بزدل صاحب۔“

میں مشکل میں پڑ گیا۔ جیلر بہادر علی مجھے دیکھ رہا تھا کہ میں کیا فیصلہ کرتا ہوں۔ میں نے پیکٹ لے لیا تو وہ شکر گزار صورت بنا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد جیلر نے مجھے دیکھ کے سر ہلایا۔ ”یہ آپ نے کس قسم کا کلچر چلا دیا ہے۔ بھلا چور ڈاکو کسی کے یار ہوئے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”نیکی کی جائے تو ایک کتا بھی نہیں بھولتا۔ یہ تو انسان ہیں۔ تم قانون کے مطابق چلو۔ یہ جانے کے بعد بھی تمہیں نہیں بھولیں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ٹیکسی منگوا دو۔“

”گاڑی نہیں ہے آپ کے پاس؟“ وہ کچھ حیران ہوا۔

میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا۔ ”میں غریب ملک کا باضمیر صحافی ہوں۔ ایک بات اور...... یہ سب ڈاکو تھے، چور نہیں تھے۔ جی دار لوگ تھے۔“

”میری گاڑی آپ کو چھوڑ دے گی۔ کہاں جائیں گے آپ؟“

میں نے کہا۔ ”ایس پی ایڈمن رحمدل خان کے پاس۔“

”اچھا اچھا۔ گڈ وِل مشن پر نکلے ہیں آپ۔ نیا ایس پی آیا ہے نا“ وہ مسکرایا۔

میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”وہ بہنوئی ہیں میرے۔“

اس آخری بال نے اُسے کلین بولڈ کر دیا۔ اس کی سُپر لگژری دس ہاتھ لمبی کار کی ٹھنڈک میں پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو کے میرا دل چاہا کہ میں ایک قہقہہ ماروں۔ آج کا دن کیا مبارک تھا۔ ایک لاکھ کی کمائی اپنی جگہ۔ ایک دل خوش کرنے والی افواہ بھی ملی تھی کہ میری منگنی ہو رہی ہے..... چہ خوش۔ پکوڑے کو پتا نہیں کہ اسے تلا جا رہا ہے۔

☆☆☆

پولیس ہیڈ آفس کی چیک پوسٹ پر نام کا منتر چلتا تھا۔ میں نے بیل کی طرح منہ اٹھا کے گزرنے کی کوشش کی تو سنتری چلّایا ''او میاں۔ کیا کام ہے؟ کہاں جارہی ہے سواری؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کام تو کوئی نہیں۔ چائے پینے آیا تھا ظالم خان، میرا مطلب ہے رحمدل خان سے۔''

''کون رحمدل خان۔ ایس پی آر ڈی خان۔'' اس کا منہ کھل گیا۔

''ہاں وہی۔ بہنوئی ہیں میرے۔''

سنتری کا ہاتھ سیلوٹ میں اٹھ گیا۔ ''س......س...... سر......سر میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

''میں چلا جاؤں گا سنتری صاحب۔''

رحمدل خان کا کمرا پانچویں منزل کی ٹھنڈی اور پُر ہیبت افسرانہ خاموشی کا حصہ تھا۔ یہاں نام کی تختی پر آر ڈی خان: ایس پی لکھا ہوا تھا۔ میں چق ہٹا کے اندر گھسنے لگا تو ایک سب انسپکٹر دوڑا۔ ''اوئے، کیا بات ہے کہاں گھس رہا ہے۔ کس سے ملنا ہے؟''

''رحمدل خان سے اور کس سے۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''ایس پی صاحب؟ وہ تو میٹنگ میں ہیں۔'' اس کو بریک لگ گئی۔

''چلو آجائیں گے۔ تم اچھی سی چائے بھیج دو میرے لیے۔''

انسپکٹر کے اندر آنے تک میں اس کے باس کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ سخت بدتمیزی تھی اور ایسی گستاخی جس کی سزا پھانسی ہوسکتی تھی مگر میرے اعتماد نے سب انسپکٹر کے غبارے کی ہوا نکال دی۔ وہ ایک چوہے کی طرح رک گیا جو بلی سمجھ کے شیر پر حملہ آور ہونے آیا ہو۔ مجھے دیکھتا بلکہ گھورتا ہوا وہ واپس لوٹ گیا۔ اپنی ساری ملازمت کے دوران اس نے دفتر میں حفظِ مراتب کی یوں ایسی تیسی ہوتے نہیں دیکھی ہوگی۔ چند منٹ میں کرسی کا مالک آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کو شاک لگا مگر وہ آدمی سمجھ دار تھا۔ تمام تعلقات رشتوں اور ماضی کے تجربات کو یاد کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ شور احتجاج لاحاصل ہوگا۔ بدلا اُس کا عہدہ تھا میں نہیں۔

فائل میز پر پٹخ کے وہ میز کی دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کسی دن تم مارے جاؤ گے سالے صاحب۔ میرا پی اے یا انسپکٹر گولی مار دیتا پھر؟''

''یار میں تو پروموشن کی مبارک باد دینے آیا تھا۔ مٹھائی لاتا مگر خیال آگیا کہ تم تو ذیابیطس کے مریض ہو۔''

''اچھا۔'' وہ جھوٹ موٹ ہنسا۔ ''مجھے آج ہی بلکہ ابھی پتا چلا۔''

''یہ بتا بھائی وہ جو تھانیداری میں سموسے آتے تھے۔ وہ یہاں ملتے ہیں؟ چائے کا تو میں نے کہہ دیا۔''

''سموسے آجائیں گے لیکن میرے بھائی میرے باپ۔ خدا کے لیے اِدھر آجاؤ۔ یہ صوفے مہمانوں کے لیے ہی ہیں۔ تھانے میں میری بادشاہت تھی۔ یہاں اوپر دس افسر ہیں۔ ابھی کوئی آگیا تو جواب دینا مشکل ہوگا۔''

اس کی بات میں نے مان لی۔ سرکاری کرسی کے مقابلے میں وہ صوفے یقیناً بہتر تھے جو ایک گوشے میں لگائے گئے تھے۔ بہت بڑی شفاف کھڑکی سے نیچے سڑک کی ٹریفک کا پُرشور منظر بھی اچھا لگتا تھا۔ ''یار بڑا ٹھکہ ہے تمہارا۔ تھانیداروں پر تھانیداری۔''

اس نے دکھ سے آہ بھری۔ ''نہیں یار۔ تھانیداری کی بات ہی کچھ اور تھی۔ سارا علاقہ اپنی بادشاہت کا تھا۔ یہ سرکاری عہدے کبھی انعام ہوتے ہیں کبھی سزا۔ ڈپٹی کمشنر کو ترقی دے کر ڈپٹی سیکریٹری لگا دو۔ ختم ساری بادشاہت۔ بن گیا کلرک۔ خیر چھوڑو۔ بتاؤ کہاں سے آرہا ہے بزدل صاحب کا جنازہ۔''

''ایس پی صاحب۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''حدِّادب۔ تمہارا یہ سالا اب رپورٹر نہیں۔ اخبار کا ایڈیٹر بن گیا ہے۔''

''لعنت اُس دن پر جب تم جیسے کو میری بیوی نے بھائی بتایا مگر یہ بتاؤ توپ صاحب کیا فوت ہورہے ہیں؟''

اسی سب انسپکٹر نے جو میری راہ میں مزاحم ہوا تھا، میز پر ایک پلیٹ میں سموسے رکھے۔ شیشے کی ایک پیالی میں چٹنی تھی دوسری میں رائتا۔ تھانے میں سموسے لفافے میں ہی سامنے رکھ دیے جاتے تھے اور چٹنی اندر پلاسٹک کی تھیلی میں سے نکلتی تھی۔ جب چائے آئی تو بڑے سلیقے سے ٹرے میں۔ خوب صورت ٹی سیٹ نے دل خوش کر دیا۔

میں نے کہا۔ ''برادرِان لا۔ یہ معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ انسپکٹر سے چھلانگ لگا کے تم ایس پی کیسے بن گئے؟''

''جیسے تم ایڈیٹر ہو گئے۔ لیکن سچ پوچھو تو یار، میری پروموشن میں تمہاری کوشش کا بڑا دخل ہے۔ تم نے جو کالم

میری کارکردگی کی تعریف میں لکھے اور لکھوائے اور میری تھانیداری کے دور کو شیر شاہ سوری کا عہد ثابت کیا۔ اس سے بڑا فرق پڑا۔''

''اللہ مجھے معاف کرے اس جھوٹ پر۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''مگر یار ترقی کے کچھ قواعد و ضوابط بھی تو ہوتے ہیں۔''

اس نے تلخی سے کہا۔ ''اجی بزدل صاحب، جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ پولیس میں ابھی تک سارے قانون گوروں کے وقت کے چل رہے ہیں۔ گورے افسروں کے لیے قانون کچھ نہیں تھا۔ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن۔ ماورائے قانون جس کو چاہیں افسر بنا سکتے تھے۔ ایسے ہی مجھے آؤٹ آف ٹرن پروموشن مل گئی۔ سب چلتا ہے مسٹر صحافی۔ تم دھاندلی میں برادر اِن لا بنے تھے کہ نہیں۔ میں ایس پی بن گیا۔'' وہ ہنسا۔

''اندر ایس پی۔ باہر پی ایس۔ ہٰذا من فضلِ ربّی۔'' میں نے ایک آہ بھری۔

اس نے اچانک میز پر رکھا لفافہ اٹھالیا۔ ''ابے..... یہ کیا۔ ڈاکا ڈال کے یہاں آیا ہے؟''

''ایس پی صاحب۔ یہ تحفہ ملا ہے میرے کچھ عقیدت مندوں کی طرف سے۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے بتایا کہ میری منگنی ہو رہی ہے ورنہ بخدا مجھے پتا نہیں تھا۔ یہ ابتدائی اخراجات کے لیے ہیں۔''

''میں نے تو سنا تھا نیا جیلر بہت سخت ہے۔''

''میاں ایس پی صاحب۔ وہ بندہ سیانا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''حیران آپ کو اس بات پر ہونا چاہیے کہ زمانے کو پتا ہے لیکن مجھے اپنی منگنی کا پتا نہیں۔ اس سے بھی زیادہ دردناک واقعہ یہ ہے کہ جس سے منگنی کا امکان تھا غالباً وہ بھاگ گئی ہے۔''

''اچھا کیا اُس نے مگر بھاگی کس کے ساتھ؟'' وہ خوش ہو کے بولا۔

''مذاق کی بات نہیں یار۔ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ کسی کو نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔ مجھے واقعی تشویش ہے۔ پہلے وہ کہیں جاتی تھی تو غزالہ کو پتا ہوتا تھا۔ میں سارے زمانے کی خاک چھان چکا۔''

''اسپتال والے کیا کہتے ہیں؟''

''وہاں وہ ڈریکولا کی خالہ میٹرن ہے۔ کہتی ہے وہ چھٹی پر ہے۔ دوسرا وہ ہلاکو خان چوکیدار ہے۔ ہوسٹل میں کوئی نہیں جانتا۔''

اسی وقت میرے فون کی بیل بجی۔ یہ غزالہ کی کال تھی۔ میری سب بیزاری ایک دم دور ہو گئی۔

''غزالہ......'' میں نے چلّا کے کہا۔ ''بے وفا، کہاں ہو تم؟''

اس نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''بزدل صاحب۔ ہم ہنی مون کے لیے دبئی جا رہے ہیں۔''

''ویری گڈ۔ میں تو پہلے بھی تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔''

''ہم کا مطلب ہے میں اور میرے مجازی خدا۔ مقتول۔''

''کیا؟ اتنی جلدی مار بھی دیا اُسے۔ آفرین ہے تم پر شیر کی بچی۔''

''کیا بک بک لگا رکھی ہے، یہ میرے میاں کا تخلص ہے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''وہ تو تم نے بتایا تھا کہ گائے بھینسوں کی کھالیں اتار کے بیچتے ہیں۔ کہاں دکان ہے؟''

''اُفوہ، کھالوں کی ایکسپورٹ کا بزنس ہے اُن کا۔ نام تو ہے فتح خان۔ شاعری کا شوق ہے۔ کہہ رہے تھے کہ آپ جیسے صاحب ذوق شاعر کو اپنا کلام سنائیں گے۔ میں نے کہا کہ انہیں لنچ پر بلا لیتے ہیں۔ تو آپ آج آئیں، پی سی میں ہم انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے پہلے کی طرح حکم دے کر فون بند کر دیا۔

میں کھڑا ہو گیا۔ ''ایس پی صاحب آپ کے اس بزدل سالے کو غزالہ نے لنچ کے لیے بلایا ہے۔ وقت بدل گیا ہے۔ بہت مال کھایا تھا اُس نے میرا۔ اب میری باری ہے۔''

ظالم خاں ہنسا۔ ''اس کا میکا تو ہے نہیں یہاں۔ کس کے پاس آئی ہے۔''

''میاں لے جا رہا ہے دبئی۔ وہ بدقسمتی سے شاعر بھی ہے اور مجھے اپنا کلام سنانا چاہتا ہے۔'' میں نے ایک لاکھ کا پیکٹ اٹھا لیا۔ ''کیا کروں مجبوری ہے۔ وہ بھی سننا پڑے گا۔''

میں دروازے پر تھا کہ ظالم خان کی آواز آئی۔ ''یار رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ تمہاری باجی نے پائے پکائے ہیں۔''

☆☆☆

میں نے ہال کا دروازہ کھولا تو ایک رازدار ویٹر نے مسکرا کے مجھے مطلع کیا۔ ''وہ اُدھر ہیں آخری کونے میں سر۔ ڈاکٹر غزالہ۔''

وہ ایک گوشے میں تھی جو ہم استعمال کرتے تھے۔ اکیلی تھی، کچھ پریشان اور اداس بھی نظر آرہی تھی۔ اس کی شادی سے پہلے کی شوخی وطراری مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ آسمانی رنگ کی ساڑی بہت خوب صورت تھی۔ ہاتھوں میں سونے کے کنگن، ٹاپس اور نیکلس سب بہت قیمتی تھے۔ شادی سے پہلے وہ کسی قسم کا زیور استعمال نہیں کرتی تھی۔ وہ بہت بدلی بدلی نظر آرہی تھی۔

میں اُس کے سامنے جا بیٹھا تو کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو اجنبی نظروں سے دیکھتے رہے پھر اس نے اداسی سے مسکرا کے کہا۔ ''کیسے ہو؟ صائمہ کیسی ہے؟''

''مجھ سے صائمہ کا پوچھ رہی ہو؟ تمہیں نہیں معلوم۔''

''وہ.. بس بات نہیں ہوسکی ابھی تک۔''

''چھوڑو صائمہ کو اپنی سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔ تم کچھ دُبلی نظر آرہی ہو لیکن زیادہ خوب صورت ہوگئی ہو۔''

اس کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے گلنار ہوا۔ ''تھینک یو۔ اب مجھ سے ایسا جھوٹ بولنے والا بھی کوئی نہیں۔''

''وہ کہاں ہیں تمہارے سرتاجِ من سلامت مقتول صاحب۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا مطلب؟ وہ تمہارے ساتھ تھے جب تم نے فون کیا تھا۔''

''تھے۔ لیکن کسی کا فون آیا تو اٹھ کے کوریڈور میں چلے گئے تھے۔ دس منٹ بعد مجھے بتایا کہ بزدل صاحب سے معذرت کرلینا۔ مجھے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ اب آدھا گھنٹا تو ہوگیا۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اَپ سیٹ ہے۔ ''اس میں پریشانی کی بات کیا ہے۔ کال کرکے پوچھ لو۔''

''کیسے پوچھوں؟'' اس نے کسمسا کے پہلو بدلا۔ ''وہ...... دراصل میرے پاس موبائل فون نہیں ہے۔''

''تم میرے فون سے بات کرلو۔'' میں نے اپنا فون اس کی طرف کھسکا دیا۔

''یار تم سمجھتے کیوں نہیں۔'' وہ جھلاّ کے بولی۔ ''میں فون بھول کے نہیں آئی ہوں۔ ہم دونوں کے پاس ایک ہی فون ہے۔ مجھے بات کرنی ہو تو وہ نمبر ملا کے مجھے دے دیتا ہے۔''

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ ''کیا مطلب؟ اس کو اعتماد نہیں تم پر؟''

''کچھ بھی سمجھ لو۔ وہ کہتا ہے کہ شادی کے بعد بیوی کی پرائیویسی والی بات بکواس ہے۔ شادی سے پہلے کی آزادی کو بھول جاؤ۔ ڈاکٹری پڑھانا تمہارے والدین کا شوق تھا۔ پریکٹس کرنا تمہاری ضرورت نہیں۔'' آنسو اپنی آنکھوں میں روکنے کی کوشش کے باوجود ایک قطرہ آنکھ سے ٹپکا تو اس نے ایک انگلی پر لے کر جھٹک دیا۔

میں نے گلاس میں پانی ڈال کے اس کی طرف کھسکایا۔ ''ایزی، ایزی۔ پانی پی کے مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا؟''

اس نے ایک گھونٹ لیا اور پھر ایک گہری سانس لی۔ ''بزدل! بہت دھوکا ہوا ہے میرے ساتھ۔ اس نے خود کو شادی سے پہلے اس کے برعکس پیش کیا تھا جیسا وہ ہے۔ میرے ماں باپ پرانے وقتوں کے سیدھے لوگ ہیں۔ انہوں نے وہی دیکھا جو سب دیکھتے ہیں۔ اچھا خوشحال گھر۔ مختصر فیملی۔ ایک بہن شادی ہو کے امریکا چلی گئی۔ پڑھا لکھا لڑکا بزنس مین لڑکا۔''

''خود تم نے کچھ نہیں دیکھا تھا لڑکی؟'' میں نے برہمی سے کہا۔

''دیکھا تھا۔ دو بار ملی تھی باہر۔ لیکن اس نے کمال کی اداکاری کی۔ مجھے وہ ایک خوش مزاج روشن خیال بندہ لگا۔ شادی کیا ہوئی راتوں رات اصلیت بدل گئی۔ مجھے بہت بھروسا تھا اپنی سمجھ بوجھ پر۔ خاک دھول۔ میں آتی ہوں۔''

وہ ایک دم اُٹھی اور لیڈیز ٹوائلٹ میں گھس گئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ رونا چاہتی تھی لیکن یہاں سب کے سامنے خود کو تماشا نہیں بنا سکتی تھی۔ میں خالی نظروں سے ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھتا رہا اور میز پر انگلیوں سے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ جب وہ آئی تو کچھ فریش تھی۔ صورتِ حال میری سمجھ میں آچکی تھی لیکن ابھی سب واضح نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر غزالہ، پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ ایسے کب تک چل سکتا ہے؟''

''بالکل نہیں چل سکتا یار۔''

''پھر کیا کرو گی؟ طلاق لو گی؟'' میں نے کہا۔

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''پاگل ہوئے ہو۔ ایسا خیال بھی میرے دل میں آیا تو میں لاپتا ہوجاؤں گی۔ تم

جانتے نہیں اُسے۔''

''جان تو لیا ہے۔ لیکن میرے جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا خیال ہے ہم کھانے کا آرڈر کر دیں؟ میں زیادہ بھوک سے اکثر فوت ہو جاتا ہوں، تم تو جانتی ہو۔'' میں نے بہتر سمجھا کہ وہ کچھ ریلیکس ہو جائے۔

غزالہ نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے ویٹر کو طلب کیا۔ وہ چلا گیا تو غزالہ نے کہا۔ ''بزدل وہ کسی بھی وقت آجائے گا۔ پتا نہیں وہ مجھے اکیلا کیسے چھوڑ گیا۔ اس کو یہ معلوم ہے کہ شادی سے پہلے تم مجھے کیا کہتے تھے۔ قائم مقام محبوبہ۔'' اس کا رنگ پل بھر کے لیے لال ہوا۔ ''ہم کیا کرتے تھے۔ کیسے ملتے تھے یہ میں نے بھی بتایا اسے مگر وہ سب جانتا تھا۔ لیکن کون مرد یقین کرے گا میری بات کا کہ لنچ سے زیادہ ہمارا تعلق نہیں تھا۔ وہ صاف کہتا ہے کہ اب شادی کے لیے کنواری لڑکی ایک بھی نہیں ملتی۔ ذلیل آدمی۔ اس نے پوری تفتیش کی تھی۔ کیا بتاؤں وہ مجھ سے کیسی جرح کرتا ہے۔''

''تم سے شادی کیوں کی تھی اُس حرامزادے نے۔ سوری یار۔ غصہ آگیا مجھے لیکن غصہ تمہیں آنا چاہیے۔ تم کیسے پوری زندگی گزار سکتی ہو ایسے شخص کے ساتھ کیا سوچا ہے تم نے آخر؟''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''طلاق کی تو میں بات بھی نہیں کر سکتی۔ خودکشی ضرور کر سکتی ہوں لیکن سزا مجھے نہیں اس کو ملنی چاہیے۔ سوچتی ہوں قتل کر دوں اُسے۔ ایک ڈاکٹر کے لیے کسی کی جان لینا مشکل نہیں ہوتا۔ پوسٹ مارٹم میں بھی لگے گا کہ ہارٹ فیل ہوا۔ اتنا ٹارچر کوئی شوہر دے سکتا ہے بیوی کو۔ میں نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔''

''ایزی۔ ایزی۔ تم بہت ٹینس ہو اس وقت۔ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا مسئلے کا۔ ہم پھر بات کریں گے۔'' میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ''کوئی غلط قدم مت اٹھانا۔''

''بات کرنے کا یہ موقع بھی آج اتفاق سے مل گیا ہے لیکن ایک بات بتاؤں۔'' اس نے رازداری سے اِدھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے اس کا جانا کوئی اتفاق نہیں، سازش لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں بھی نہ گیا ہو اور کہیں سے ہمیں دیکھ رہا ہو۔''

مجھے اس کی بات پر افسوس ہوا۔ میں اسے پاگل نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ سخت مایوسی اور ڈپریشن کا شکار تھی۔ جب ویٹر نے کھانا لگانا شروع کیا تو میں نے بڑی عجلت میں ایک کام کیا۔ میں نے اپنے دو میں سے ایک موبائل فون کا سارا ڈیٹا صاف کیا، یہ فیکٹری سیٹنگ پر آگیا تو میں نے اس میں سے اپنی سم بھی نکال لی۔ ویٹر گیا تو میں نے موبائل فون کو میز کے نیچے سے غزالہ کی طرف بڑھایا۔ ''غزالہ! یہ موبائل فون لو۔ اور چھپا لو بیگ میں۔''

اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ ''تمہارا موبائل۔ میں کیا کروں گی اس کا......اور......''

''پکڑو۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''میں نے اسے خالی کر دیا ہے۔ یہ اب نئے جیسا ہے۔ اس میں نئی سم خرید کے لگا لینا جب موقع ملے۔ شاید یہ مشکل ہو تمہارے لیے مگر ناممکن نہیں۔''

اس نے فون بیگ میں ڈال لیا۔ ''اور تم کیا کرو گے؟''

''اس میں صرف فیملی اور فرینڈز کے نام تھے۔ دوسرا فون لوں گا تو ای میل سے سب مل جائیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ تم اب کھانا کھاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اوہ بزدل۔'' وہ جذباتی ہو گئی۔ ''سو نائس آف یو۔''

''تمہارے لیے اس رابطے کے ذریعے کو اپنے پتی پرمیشور سے چھپا کے رکھنا اصل مسئلہ ہو گا۔''

''وہ میں کر لوں گی۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''تم کسی بھی وقت مجھے فون کر سکتی ہو۔ میں ہر صبح شام نو بجے میسج دوں گا۔ خیریت پوچھنے کے لیے۔ کم سے کم رابطہ تو ہو گا۔''

''تھینک یو۔'' اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ ''مجھے بہت حوصلہ ملا ہے۔ ایک تم ہی ہو جو کچھ کر سکتے ہو۔''

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا۔ ''صائمہ بھی تو ہے۔ تم نے اس کی بات تک نہیں کی۔''

''آئی ایم سوری۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔ ''میں اتنی اَپ سیٹ تھی۔ اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گئی۔ کیسی ہے وہ؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پتا نہیں۔''

''کیا مطلب، پتا نہیں؟''

''مطلب یہ کہ مجھے نہیں معلوم۔ دو دن سے اُس کا کچھ پتا نہیں۔''

غزالہ مجھے دیکھتی رہی۔ ''بزدل، شادی کر لو اب۔ بہت ہو گئی محبت۔ کوئی مقصد ہی نہ ہو تو محبت کیا......''

میں ہنس پڑا۔ ''پاگل حسینہ۔ میں کیا اکیلا ہی کر لوں

شادی۔ آئی ایم ایف جیسی شرائط عائد کر رکھی ہیں میرے جیسے غریب صحافی پر جسے تنخواہ تک نہیں ملتی۔ مگر تمہاری بات غلط نہیں۔ توپ صاحب نے کل مجھے بہت جذباتی کر دیا تھا۔"

"دیکھو، یہ سب تمہارا فضول کا ڈراما ہے۔ تنخواہ ملے نہ ملے تم اسی صحافت کی شہرت اور وکالت سے اچھا خاصا کما لیتے ہو۔ لیکن مُم اُڑانے کی عادت ہے۔"

"اب تم بھی وہی راگ گاؤ گی صائمہ والا کہ لفنگے یاروں کو چھوڑ دوں جو مجھے لوٹ لیتے ہیں۔"

"غلط کیا ہے اِس میں؟ کہاں جاتا ہے پیسہ۔ کرایہ تک تم دیتے نہیں۔ وکیل اسی لیے بدنام ہیں۔ وہی سدھار سکتی ہے تمہیں۔"

میں نے ایک آہ بھری۔ "سچ کہتی ہو پردیسی حسینہ۔ میں بہت سیریس ہو گیا ہوں اب۔ کم سے کم ایک شادی تو کر ہی لوں اُس سے۔ تم یہ بتاؤ کہ مقتول صاحب نے تمہیں اتنا لمبا وقفہ کیوں دیا ہے۔ ایک گھنٹا ہونے والا ہے۔"

"پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ مجھے واقعی ڈر لگ رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم کاؤنٹر سے اُس کو فون کرو۔ ورنہ میں کرتا ہوں کہ مقتول صاحب مجھے یہاں بلا کے خود کہاں بھاگ گئے؟"

"میں اب کچھ عادی ہو رہی ہوں۔ وہ گھر سے بھی ایسے ہی غائب ہو جاتا ہے بغیر کچھ بتائے۔ رات کو دیکھتی ہوں کہ میں اکیلی ہوں۔ جب کبھی گھنٹوں بعد آتا ہے تو کہتا ہے ایک کال آ گئی تھی امریکا سے۔ باہر جا کے بات کی ورنہ تمہاری نیند خراب ہوتی۔ دوبارہ کوئی ملنے آ گیا اور وہ ان کے ساتھ نکل گیا۔ ساری رات غائب رہا۔ پوچھا تو مشتعل ہو گیا کہ تم میری جاسوسی اور پہریداری مت کرو۔ کاروباری معاملات کا تمہیں کیا بتاؤں۔ میں کسی دفتر میں نوکری نہیں کرتا کہ آنے جانے کا وقت مقرر ہو۔ تم کچھ پتا لگاؤ۔"

میں چونکا۔ "کیا پتا لگاؤں؟"

"یہی کہ اس کے کاروباری شریک کون لوگ ہیں۔ اور اصل کاروبار کیا ہے اُس کا؟"

"تمہیں شک ہے کہ در پردہ وہ کچھ اور کرتا ہے۔ کیوں شک ہے؟" میں نے کہا۔

"یار میں بیوی ہوں اُس کی۔" وہ جھلا گئی۔ "دیکھتی ہوں سنتی ہوں۔ ایک تو یہ کام جو وہ کہتا ہے کہ میں کرتا ہوں۔ یہ جھوٹ لگتا ہے مجھے۔ کھالوں کے بزنس کا کوئی سر پیر ہوتا ہے۔ کہاں سے لیتا ہے۔ کہاں رکھتا ہے۔ گودام کہاں ہے۔ اس کے تو جسم سے کھالوں کی بُو آنی چاہیے، اس میں کیمیکل استعمال ہوتے ہیں۔ دیکھو یہ سراغ لگانا آسان نہیں ہوگا۔ اس میں پولیس کی مدد بھی درکار ہوگی تو رحم دل خان تمہارے کام آ سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ اب ایس پی ہو گیا ہے وہ بھی ہیڈ آفس میں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ کرتا ہوں لیکن ابھی تو تم جا رہی ہو۔ مجھے اس کا بزنس کارڈ دو۔"

غزالہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو میں نے بھی آج تک نہیں دیکھا۔ ہاں فون نمبر لکھ لو۔"

میں نے نمبر سیو کر کے کہا۔ "میں بھی اب چلتا ہوں۔ شام تک اس بدتہذیب میزبان کا انتظار نہیں کر سکتا جو مجھے بلا کے خود بھاگ گیا۔"

غزالہ نے ویٹر کو اشارہ کیا کہ بل لائے۔ "میں بھی جاتی ہوں اوپر اپنے کمرے میں۔ دو سو بارہ نمبر ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ لیکن بل میں دوں گا۔ اب تم مہمان ہو۔ اور بلائے جان بھی۔" میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

اس نے احتجاج کیا۔ "بلایا میں نے تھا۔"

میں نے ایک لاکھ کے نوٹوں سے بھرا پیپر بیگ اُسے دکھایا۔ "بزدل اب بھکو نہیں ہے۔ یہ ہوٹل خرید لوں میں اگر تم کہو۔ ایک لاکھ میں تو مل جائے گا نا۔"

وہ ہنسی۔ "یہ کہاں سے ملے؟"

"جیل میں دوستوں نے کہا کہ تمہاری منگنی ہو رہی ہے تو ابھی یہ رکھ لو۔ میں تو سن کے بھونچکا رہ گیا۔ پتا نہیں یہ افواہ اُن تک کیسے پہنچی۔ جو خود مجھے نہیں معلوم ان کو کیسے پتا چلا۔"

غزالہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کتنے اچھے ہیں یہ تمہارے ڈاکو دوست۔ لیکن وہ جو پرانے یار ہیں نا تمہارے اصل ڈاکو۔"

"یار غزالہ۔ میں اُن کو چھوڑ دوں گا صائمہ کی خوشی کے لیے مگر وہ ملے بھی تو سہی۔"

"کہاں جائے گی وہ لاوارث۔" غزالہ اٹھی۔

میں نے کہا۔ "دیکھو ہوٹل میں ایک شاپ ہے جہاں عام ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ فون کی سم بھی مل سکتی ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ ''میں دیکھ لیتی ہوں۔'' اور کاریڈور میں نکل گئی۔

☆☆☆

حسب معمول اسپتال میں بیماروں اور تیمارداروں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ ایک دروازے سے آنے والوں کا ریلا دوسرے دروازے سے باہر کی سمت میں بہتا جا رہا تھا۔ مریضوں سے زیادہ ان کے تیماردار تھے جو علاج کے لیے نزدیک اور دور سے آئے تھے اور پریشانی سے زیادہ مایوسی کا شکار تھے کہ یہاں دوا علاج نہیں ان کو محض ذلت و خواری ملی تھی۔ میں اس نظام کی ساری خرابیوں کو عام لوگوں سے زیادہ سمجھتا تھا لیکن میری بے چارگی بھی کم نہ تھی۔ آنکھیں اور کان بند رکھتے ہوئے میں آخری پُرسکون حصے میں گیا جہاں انتظامی دفاتر اور میٹرن ڈاکٹر نازنین کا آفس تھا جو نام کے برعکس سوکلو کی چیز تھی۔

اس کے آفس کے باہر کرسی پر اونگھتے چپراسی کو اس وقت ہوش آیا جب میں اندر پہنچ چکا تھا۔ ایک مصنوعی اخلاق کے ساتھ پانچ بچوں والی مس نازنین نے اونگھنا ترک کر کے کہا۔ ''آیئے، آیئے بزدل صاحب، خیریت تو ہے نا؟''

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''یہ تو آپ بتائیں گی۔ آپ امید سے ہیں؟''

''اللہ نہ کرے جی۔ آپ کیسی بات کرتے ہیں۔'' وہ شرما کے خفگی سے بولی۔

''دراصل آپ کی ایم ایس ہونے کی خبر تھی نا؟''

''آپ کچھ کریں نا ہمارے لیے۔ وزیرِ صحت کو بتائیں۔''

''ضرور بتاؤں گا۔ ابھی تو آپ مجھے بتائیں صائمہ کہاں غائب ہے؟''

وہ مسکرانے لگی۔ ''جن بھوت غائب ہوتے تھے پہلے۔ آپ جیسے حق پرست صحافی اب بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ صائمہ کا پتا مجھ سے زیادہ آپ کو ہونا چاہیے۔ آپ منگنی کر رہے ہیں اُس سے۔''

یا مظہر العجائب۔ ایسا بھی کہیں ہوتا ہے کہ سارا زمانہ جانتا ہو مگر برات کے دولھا کو پتا نہ ہو کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ ''یہ خبر کس نے دی آپ کو؟'' میں نے سکون سے کہا۔

''میں نے سنا تھا پھر اس کی ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دیکھی۔''

''کیا درخواست میں لکھا تھا کہ میں بزدل سے شادی کرنے جا رہی ہوں؟''

''نہیں۔ مگر میں نے سنا کہ شاید وہ واپس نہیں آئے گی۔ آپ کو نہیں معلوم؟ حیرانی کی بات ہے۔'' وہ معنی خیز طریقے پر مسکرانے لگی۔

''اس نے کوئی پتا ٹھکانا تو دیا ہوگا؟''

''ہاں دیا ہوگا۔ ایک تو فون نمبر ہوگا۔ دوسرے وہ جب چھٹی پر جاتی ہے تو ایڈریس ان کا دیتی ہے۔ کیا نام ہے ان کا جو اخبار نکالتے ہیں بندوق صاحب۔''

''تفنگ چنگیزی۔ توپ صاحب۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں ہاں وہی توپ صاحب۔ وہ شاید تایا ہیں اُس کے۔ آپ چائے لیں گے؟ یا......''

''اگر زہر مل جائے کوئی اچھا سا تو منگوا لیں اپنے اور میرے لے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ کی پروموشن رکی ہوئی ہے اور میری شادی۔ ہم دونوں کا جینا عبث ہے۔''

وہ دولھا ایک بند گلی میں پہنچ گیا تھا جس کی دُلہن غائب تھی۔ شادی کا ایسا سین اب تک کسی مزاحیہ فلم کا حصہ بھی نہیں بنا ہوگا میں باہر نکلا تو سڑک پر چلتے ہوئے پھر غزالہ کا خیال غالب آ گیا۔ زندگی کیسے خواب دکھاتی ہے اور پھر کیا تعبیر دیتی ہے۔ محبت کی بات ذرا مختلف ہے کہ مجنوں کے دل کو ایک لیلیٰ بھا گئی پھر تو وہی ملکہ حسن اور حور پری۔ صائمہ کے بغیر اب میرے لیے زندگی کا تصور اتنا ہی نامکمل تھا جتنا گھوڑے کے بغیر تانگے کا۔ کبھی دل میں اپنی خوش قسمتی کا خیال بھی آتا تھا کہ اس نے مجھے پسند کر لیا ورنہ معاملات تقدیر کے اپنے ہوتے ہیں۔ کیا ستم ہے مقتول صاحب جیسا شوہر غزالہ کے نصیب میں تھا۔ وہ بڑی ہمہ صفت لڑکی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ جس گھر جائے گی، اسے جنت بنا دے گی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی اس کی طرف سے خاموشی کو اس بات کی علامت سمجھا جا سکتا تھا کہ ابھی تک سب خیریت ہے اور شاید اسے فون کے لیے نئی سم نہیں ملی کہ ابھی تک اس نے کال بھی نہیں کی۔ جوتیاں چٹخاتا میں ''حقیقت ساز'' کے آفس پہنچا تو مجھ میں ایک نئے ایڈیٹر کی شان پیدا ہو چکی تھی۔ فٹ پاتھ پر دہی بڑے کے تھال والے صوفی نے چمچہ لہرا کے نعرہ لگایا۔ ''اوئے خیر ہووے بزدل کی۔'' پھر سامنے موجود گنڈک ریوڑی والے نے اپنا اشتہاری نغمہ گایا۔ ''کڑک پٹاخا ریوڑی۔ بزدل نوں کرے بہادر۔'' وہاں موجود سب ہی میرے قدر شناس اور نیک دل دوست تھے۔ وہ سب جانتے تھے۔ جو میرا خیال تھا کہ نہیں جانتے،

چنانچہ صائمہ آتی تھی تو وہ اس کی ننھی منی گاڑی کے لیے جگہ بنا دیتے تھے یا نیچے ہی اسے مطلع کر دیتے تھے کہ بزدل صاحب اوپر نہیں ہیں۔ کبھی کوئی فرمائش کرتا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب، آپ کوئی اچھی سی دوا تو لکھ دو کاکے کی ماں کے لیے۔ تین دن سے اس کی ناک پرنالے کی طرح بہہ رہی ہے۔'' اور وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے نسخہ لکھ دیتی تھی اور کبھی پوچھ لیتی تھی کہ کاکے دا کی حال اے پہلوان۔ تو وہ خوش ہو جاتے تھے۔ وہ نیچے کھڑے سب خوانچہ فروشوں اور تھڑے والوں کی فری میڈیکل ایڈوائزر ہو گئی تھی اور ہم سب ایک فیملی جیسے بن گئے تھے جس میں امیر غریب افلاطون اور جاہل سب آپس میں کوئی رشتہ رکھتے تھے جو خون کا نہیں تھا تو غرض کا بھی نہیں تھا۔ تاہم یہ بھی ایک سبب تھا کہ ان کے ہاتھوں توپ صاحب ابھی تک مرحوم و مغفور نہیں ہوئے تھے۔ میں بہت پہلے صائمہ کو بتا چکا تھا کہ بفرض محال اگر کبھی اس جنم میں ہماری شادی ہوئی تو میں برات میں ان سب کو بلاؤں گا۔ اور اس نے اتنی ہی سنجیدگی سے کہا تھا کہ ولیمہ کی دعوت میں بھی یہی رکھنا دہی بھلے، ریوڑی، سموسے اور چھولے۔ پیسے تو ہوں گے نہیں تمہارے پاس۔ مفت میں کام ہو جائے گا۔

کسی وجہ کے بغیر میں ریوڑی خریدنے لگا تو مجھے اس سفید چمکتے ڈھیر میں سرخ رنگ بھی نظر آیا۔ میں نے کہا۔ ''واہ پہلوان، لال ریوڑی کا تڑکا بھی لگا دیا۔ اچھا تجربہ کیا ہے۔''

اس نے فریادی صورت بنا کے اوپر دیکھا۔ ''او جی میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب آپ کے توپ صاحب نے اوپر سے کیا ہے۔ روز خراب ہونے والی چیز کو پھینکتا تھا تو دکھ بھی ہوتا تھا اور گھاٹا بھی۔ تو میں اب ملا دیتا ہوں اور گاہک پسند بھی کرتے ہیں لال سفید۔''

میں نے ریوڑی خریدنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ''پہلوان، اب میں ایڈیٹر بن گیا ہوں۔ بزدل نہیں ایڈیٹر صاحب کہا کرو۔'' اور اوپر چلا گیا۔

دفتر کا نقشہ بہت بدل گیا تھا۔ یہ میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک نیا خوب صورت صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ گلاس ٹاپ سینٹر ٹیبل اور درمیان میں گلدستہ وہ منظر پیش کرتا تھا جو یہاں کبھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ آخری دیوار کے ساتھ چار فٹ اونچی پارٹیشن تھی جس کے پیچھے درمیان کے کیبن میں جواہر رقم اب ہیڈ آف کمپوزنگ سیکشن بنے بیٹھے تھے۔ دائیں بائیں والے کیبن ان کے معاونین کے لیے تھے جن کا ابھی تقرر ہونا تھا لیکن تبدیلی آ چکی تھی۔ مجھے برسوں بعد اس انقلاب پر فریب خیال کا گمان ہوتا تھا۔ بزدل واقعی ایڈیٹر بن گیا تھا اور اخبار نئی صدی کے تقاضوں کی کروٹ لے کر مقابلے کے لیے تیار تھا۔ توپ صاحب کی میز ایک کیبن کے اندر چلی گئی تھی۔ اس کے ساتھ والا نیا فرنشڈ کیبن ایڈیٹر کا یعنی میرا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک سلائڈ کرتے پٹوں والی کھڑکی سی تھی۔

یا مظہر العجائب! میں نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ یہ کہیں خواب نہ ہو توپ صاحب جو گوروں کے وقت کی توپ تھے اچانک جدید میزائل کیسے بن گئے تھے۔

ان کے مقابل بیٹھ کے میں نے میز پر مکا مارا۔ ''توپ صاحب! یہ سب کیا ہے؟''

وہ سکون سے گلوری بناتے رہے۔ ''میاں بزدل! یہ ایک شاہی قوام ہے۔ واجد علی شاہ کی گلوری میں استعمال ہوتا تھا۔ لکھنؤ سے ایک عقیدت مند نے بھیجا ہے مگر بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔''

''توپ صاحب، یہ تبدیلی کیوں آ رہی ہے، کیسے آ رہی ہے۔'' میں نے جیب میں سے دو فٹ لمبا کاغذ نکال کے لہرایا۔ ''یہ میرے واجبات ہیں۔ ان کی ادائیگی ہوئی نہیں اور آپ لاکھوں خرچ کر رہے ہیں اخبار کو جدید بنانے پر۔ کیسے؟''

توپ صاحب نے چھت کی طرف دیکھا اور ترکی ٹوپی کو گرنے سے بچا کے میز پر رکھا۔ ''ہٰذا من فضلِ ربّی۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اخبار عارضی طور پر کہیں اور سے شائع ہو رہا ہے۔''

''اللہ کو حاضر ناظر جان کے بتائیں۔ آپ نے کسی بینک میں کامیاب ڈاکا ڈالا ہے؟''

''کیا پوچھتے ہو میاں بزدل۔'' انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب کیا ڈاکا ڈالیں گے۔ جوانی میں بڑی خواہش تھی کوئی بڑا کام کرنے کی جیسے کہ قتلِ عام۔ ایک فہرست ہوتی تھی جیب میں واجب القتل افراد کی۔ یہ بھی سوچتے تھے کسی ڈان کی بیٹی یا بہن کو بھگا کے لے جائیں اور شادی کر لیں۔ سالے کا سب مال اپنا۔ کسی بینک میں ڈاکا ڈالیں۔ مگر کیا ہے وہ لغہ۔ دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے۔ ہم بھی بزدل تھے تو بس صحافت ہی کر سکے۔ لیکن ہم نے تمہارے اس سوال کا مقصد سمجھ لیا۔''

"ہاں اتنا پیسہ آخر آیا کہاں سے؟" میں نے میز پر مُکا مارا۔

"وہ ایسا ہے میاں بزدل۔ پرانی بات ہے کہ ہم نے پتا نہیں کیوں زندگی کا ایک بیمہ کرا لیا تھا۔ کوئی دس لاکھ کا۔ لینے والا کوئی تھا نہیں ہمارے بعد۔ اور ہم مرنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ سال کے سال پریمیم بھر دیتے تھے۔ کمپنی نے تنگ آ کے کہا کہ یہ لو پکڑو اپنے پیسے اور جان چھوڑو ہماری۔" وہ کُڑک مرغی کی طرح ہنسے۔ "پتا نہیں کس حساب سے رقم دگنی ہو کے ملی۔ ہم کیا کرتے۔ یہ سب کر لیا۔"

"آپ کو ایک غریب صحافی کے واجبات کا خیال نہیں آیا؟" میں نے پُررقت لہجے میں کہا۔

توپ صاحب نے کھڑکی کھول کے سر باہر نکالا۔ پیک کا تازہ اسٹاک اُگلا اور پھرتی سے کھڑکی بند کر دی۔ "وقت آنے پر سب ہو گا میاں بزدل۔ دیکھو خیر سے تم ایڈیٹر ہو گئے نا۔ دیر آید درست آید۔"

میں نے کاغذ سمیٹ کر جیب میں رکھا۔ "اپنا حساب تو میں آپ کی لوحِ مزار پر بھی لکھواؤں گا۔ ابھی میری تشریف آوری کے اغراض و مقاصد کچھ اور ہیں۔ میرے دو سوال ہیں آپ سے۔ پہلا یہ کہ صائمہ آپ کے گھر میں لاپتا کیوں ہے؟"

توپ صاحب نے ایک آہ بھری۔ "بقول اپنے مرزا نوشہ۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی، تم صائمہ کا پوچھتے ہو۔ چلو دوسرا سوال پوچھو۔"

تاہم دوسرے سوال کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سیڑھیوں والا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور تیسری جنس کے تین شہ کار شوخ نیلے پیلے لال رنگ کے زنانہ ملبوس میں اندر آ گئے، ان کے فحش میک اَپ والے چہروں پر نقلی زنانہ بال جھول رہے تھے اور تیور بتاتے تھے کہ وہ شرارت پر آمادہ ہیں۔ ایک کے ہاتھوں میں دو پلاسٹک کی بالٹیاں تھیں۔

"ہائے، ہائے، میرے چکنے۔" ایک نے تالی بجا کے کہا۔ "ایک چمی تو دے دے اس ٹھنڈ کی۔" اور ہاتھ مار کے توپ صاحب کی ٹوپی اُڑا دی۔

"لاحول ولا، یہ کیا بے ہودگی ہے۔" توپ صاحب اُچھلے۔ "تم کو پتا ہے......"

"ہائے کیوں نہیں پتا۔ تو بس نام کا توپ ہے۔" دوسرے نے کرسی کے پیچھے سے توپ صاحب کے گلے میں بازو حمائل کیے اور چٹاخ سے ان کے سر کو چوما۔ "توپ چلا سکتا تو بیاہ بھی کر لیتا۔ چل ہماری منڈلی میں شامل ہو جا۔" اس کے دونوں ساتھی بڑے فحش اشاروں میں بہت کچھ کہتے رہے۔

میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے میز پر ہاتھ مار کے کہا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ پتا ہے یہ اخبار کا دفتر ہے۔"

تیسرا تالی بجا کے بولا۔ "ہائے صدقے جاؤں لبو راجا۔ پتا کیوں نہیں۔ کیا کیا خرمستی ہوتی ہے یہاں سب پتا ہے۔"

"فو......فون کرو پولیس کو۔" توپ صاحب غصے میں ہکلانے لگے۔

ایک کمر لچکا کے بولا۔ "ہاں ہاں، بلا لے انہیں۔ وہ بھی خصم ہی ہیں ہمارے۔ تھانے لے جا کے کیا کریں گے۔ وہی جو ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مسئلہ کیا ہے۔ بیٹھ کے بات کرو۔"

دوسرا تالی بجا کے ہنسا۔ "ہائے اس بھولے ناتھ کو دیکھو۔ پوچھ رہا ہے مسئلہ۔ ارے دیکھ یہ دیکھ۔ ستیاناس کر دیا میرے جوڑے کا اس کے منہ کی بواسیر نے۔" اس نے میرے سامنے آ کے اور گھوم کے اپنی فراک دکھائی۔

ایک دم سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کے اور باقی سب کے ریشمی کپڑوں پر پان کی پیک کے داغ تھے جو سادہ کپڑوں پر تو نظر آتے مگر زنانہ قمیصوں کے گل بوٹوں میں اتنے نمایاں نہیں رہے تھے مگر ان کے تقریباتی لباس واقعی برباد ہو گئے تھے۔ وہ سب ان کی نمائش میرے سامنے مٹک مٹک کے ڈانس کے انداز میں کرتے رہے۔

"اب ہمارا کام بھی دیکھ پیارے۔" دوسرا ہاتھ نچا کے اور کمر لچکا کے بولا اور پلاسٹک کی ایک بالٹی اٹھالی۔ میرے کچھ سمجھنے سے پہلے اس نے ہاتھ سے دیواروں پر گوبر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نے دوسری بالٹی اٹھائی۔ اس میں گاڑھا سیاہ ڈیزل تھا۔ وہ ایک برش سے ہر دیوار پر کالا تیل پھیلانے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں ان کو روکنے کی کوشش کرتا، وہ نئے رنگ روغن کا بیڑا غرق کر چکے تھے تیل اور گوبر کے دھبے پنکھے فرنیچر اور کارپٹ سب کو خراب کر چکے تھے۔ توپ صاحب صدمے سے نیم جاں اپنا سر پکڑے بیٹھے تھے۔ اس قوم سے مار پیٹ بھی نہیں کی جا سکتی تھی اور ایک گالی کے جواب میں ان کی فحاشی کو سننا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں بھی بے بسی سے اس تخریب

کاری کو دیکھتا رہا۔ بلاشبہ اب تک توپ صاحب کی پیک سے متاثر ہونے والوں میں سے کسی نے ایسی تباہ کن جوابی کارروائی نہیں کی تھی۔ دس منٹ میں انہوں نے ڈیزل کی بالٹی خالی کی اور توپ صاحب کے سر پر الٹی رکھ دی۔

''ہائے، ہائے صدقے جاؤں۔ کیسی سج رہی ہے نئی ٹوپی تیری ٹنڈ پر۔'' ایک تالی بجا کے ہنسا۔

دوسرے نے تازہ گوبر والی اُن کے پاندان پر الٹی۔

''لے اسے بجا۔''

وہ ٹھٹھے مارتے واپس چلے گئے تو میں نے کہا۔'' کچھ لطف آیا توپ صاحب۔ سیر کو کبھی سوا سیر ضرور ملتا ہے۔''

توپ صاحب صدمے سے ساکت بیٹھے رہے۔ ان کی نظر اپنے نقشین مراد آبادی چاندی کے پاندان پر جمی ہوئی تھی اور سر پر سے بہنے والا سیاہ ڈیزل بہہ کر ان کے چہرے پر آ گیا تھا۔

''نطفۂ نا تحقیق۔ خبیث الزماں۔ ہم نئے جوڑوں کی قیمت دے سکتے تھے۔ بات تو کرتے۔ دیکھو کتنا نقصان کر گئے۔'' توپ صاحب پھٹ پڑے۔ ان کو میں نے اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اب مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ ہر فرعونے را موسیٰ والی کہاوت سچ ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کے واش روم میں گئے جہاں وہ ایک پاک صاف کپڑوں کا جوڑا نماز جمعہ کے لیے رکھتے تھے۔ ان کے نہا کر واپس آنے تک میں معاشرے کے ان سب سے ناکارہ سمجھے جانے والے افراد کی عقل پر حیران ہوتا رہا، انہوں نے بڑی موثر جوابی کارروائی کی تھی۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ ایک اخبار کے مالک کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے جس کے تعلقات کی رسی بہت دراز تھی۔ نہ جانے کیسے انہوں نے ڈیزل اور تازہ گوبر سے پان کی پیک کا جواب دینے کا سوچا۔ اب آفس کو پھر صاف ستھرا بنانا ہزاروں کا خرچ تھا۔ توپ صاحب کا کھیل انہیں پہلی بار بہت مہنگا پڑا تھا۔

مگر واش روم سے برآمد ہوئے تو وہ مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے جو تھوڑی بہت عبرت پکڑی تھی وہ جنگلی کبوتر کی طرح اُڑ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر فون کر کے ایمرجنسی خدمات والوں کو بلاتے رہے پھر پاندان پر سے ٹوپی اٹھا کے مسکرائے۔ ''الحمدللہ، کلاہ صاف ہو جائے گی۔ پاندان کے اندر سب محفوظ ہے۔'' اور نئی گلوری بنانے لگے۔

میں نے کہا۔'' آج کا سبق کافی ہونا چاہیے آپ کو۔''

وہ مسکرائے۔ ''زندگی ایک مسلسل سبق ہے برخوردار۔ اور کوئی سبق آخری نہیں ہوتا۔ بے شک اس وقت ہم غصے میں آ گئے تھے مگر اب ہنسی آ رہی ہے۔''

''اتنا نقصان اٹھانے کے باوجود۔''

توپ صاحب نے میری بات کاٹ دی۔'' وہ کیا فرما گئے ہیں اپنے شیخ سعدی کہ۔ شوق دا کوئی مول نہیں۔ جواری جتنا بڑا دل چاہیے جینے کے لیے۔ وہ جو مونٹی کارلو کے جُوا خانے ہیں۔ وہاں ہر رات کوئی لاکھوں ڈالر ہارتا ہے تو کسی کو لاکھوں ڈالر جیتنے کی خوشی بھی ملتی ہے۔ ہارنے والا ڈالر ہارتا ہے۔ ہمت نہیں ہارتا۔''

میں نے مایوسی سے کہا۔'' یعنی آپ باز نہیں آئیں گے اتنے نقصان کے باوجود۔''

''نقصان؟ میاں ایڈیٹر صاحب۔'' توپ صاحب نے گلوری منہ میں رکھی۔ ''وہ کیا کہتا ہے شاعر۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۔ واللہ لطف آ گیا۔ کیمرا ہوتا تو اس منظر کو ریکارڈ کر لیتے۔ بس ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ کسی نے تصویر نہیں بنائی ہماری۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ توپ صاحب ہنسی مذاق میں پتے کی بات کر جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ فرشتۂ اجل سے بھی وہ ہنس کر کہیں گے کہ میاں عزرائیل۔ بس ایک گلوری کھا کے چلتے ہیں۔ اوپر تو کچھ ملے گا نہیں۔ لو تم بھی کھا لو۔

☆☆☆

رات تک میں اپنا فون پر بار بار دیکھتا رہا کہ غزالہ کی طرف سے کوئی خبر ملے۔ شاید میرے دیے ہوئے فون کے لیے اسے نئی سم نہیں ملی تھی۔ مجھے ہوٹل جا کے اس کی خیریت معلوم کرنے کا خیال بھی تھا لیکن یہ خیال اس وقت خام ہو گیا جب دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے زنانہ آواز میں کہا۔'' بزدل صاحب۔ دروازہ کھولیے۔''

یہ آواز ڈاکٹر غزالہ کی نہیں تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ تینوں گلا پھاڑ کے ہنستے ہوئے اندر آ گئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں تھیلے تھے جن میں نہ جانے کیا بھرا ہوا تھا۔

''اے شکل دیکھو اس سالے کی۔'' ایک نے قہقہہ مارا۔

''سمجھا ہوگا اس نے کہ کبھی نہ ہونے والی جورو آ گئی۔''

دوسرے نے مجھے دھکا دیا۔ اس کے ہاتھ میں دو تھیلے تھے۔ خوشبو سونگھے بغیر بھی میں بتا سکتا تھا کہ ایک میں نہاری اور شیر مال ہوں گے۔

یہ میرے یارِ غار تھے۔ اس وقت کے ساتھی جب میں تندور سے ایک روٹی لے کر کھاتا اور مسجد کے نلکے سے پانی پی کر وہیں بیٹھ کے صحافت پڑھتا اور سوجاتا تھا۔ وہ اچھے وقت تھے جب مساجد چوبیس گھنٹے کھلی رہتی تھیں۔ ضرورت مندوں کو ہر شام اردگرد کے گھروں سے آنے والا کھانا مل جاتا تھا۔ سونے کی جگہ تھی۔ صبح مسجد کے غسل خانوں سے نہا دھو کے سب اپنے اپنے کام سے نکل جاتے تھے خواہ کام تلاشِ معاش کا ہو۔ پھر وہ وقت بھی میں نے دیکھا کہ نمازی گھٹ گئے مسجدوں کی وسعت بڑھ گئی دیواروں نے سنگ مرمر کا بیش قیمت لبادہ اوڑھ لیا۔ فرش پر قالین پڑ گئے۔ منبرو محراب سج گئے۔ جھاڑ فانوس جگمگانے لگے۔ ایئر کنڈیشنز لگ گئے۔ چوریاں ہونے لگیں تو خدا کے گھر میں تالے پڑ گئے۔

صحافت میں ڈگری حاصل کرنے تک وہ مسجد میرا گھر تھی جہاں مولانا شریفی ایک عمر رسیدہ عالم اپنی پُرشفقت مسکراہٹ سے مجھے رشتوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ میرے یہ دوست جن کو صائمہ خدائی خوار کے خطاب سے یاد کرتی تھی اور میری تباہی وگمراہی کا ذمے دار سمجھتی تھی، اسی دور کے ساتھی تھے۔ 'حقیقت ساز' میں نوکری ملنے کے بعد مسجد کی جگہ اخبار کا آفس میری شب بسری کا ٹھکانا بن گیا کیونکہ پریس میں آخری کاپی بارہ بجے رات کے بعد جاتی تھی۔ سوتے سوتے ایک دو بجتے تھے۔ پھر میں دیر تک سوتا تھا جو مسجد میں ممکن نہ تھا۔ مولانا شریفی مجھے وقت پر نماز کے لیے اٹھا دیتے تھے۔ پہلے میں باقاعدگی سے پیش امام صاحب کی خیریت پوچھنے جاتا رہا۔ پھر تساہل کا شکار ہوا۔ آخری بار گیا تو نوجوان موذن کی امامت میں نماز ظہر کے بعد پتا چلا کہ پیش امام مولانا شریفی تو گئے۔ اب ان کی جگہ بیٹا یہ ذمے داری نبھا رہا تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے پوچھا تھا۔ وہ نالائق بدیع الزماں نہیں آیا۔ میں رو پڑا اور بہت دیر روتا رہا مگر اس بات کی خلش بھی وقت نے مٹا دی۔

دفتر پرانے یاروں کا بھی اڈا بن گیا۔ یہ سب وہ تھے جن کو کہیں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ نہ دنیا سے نہ گھر سے نہ قسمت سے۔ پھر یہ شرافت حرام حلال، جائز ناجائز، قانونی غیر قانونی کو بھول کر جینے کا حق چھینتے ہیں۔ ایک شریف الدین پہلے شرفو تھا۔ نوعمری میں گاڑیوں سے ڈیک کیپ۔ ریڈیو کیسٹ پلیئر چرا کر بیچتا رہا۔ اب تو پارٹس ڈیلر شرفو کباڑی تھا جو یہ سب ایک چوتھائی قیمت پر خریدتا اور آدھی قیمت پر بیچتا تھا۔ دوسرا رفیق عرف فیکا پہلے ہوٹل میں باہر والا تھا۔ پھر ویٹر ہوگیا اور اب بسوں کے اڈے پر فیکا ٹی ہاؤس چلاتا تھا۔ تیسرا جان محمد بھی گیراج کا چھوٹا تھا اور اب خود استاد جانو بن گیا تھا۔ ہم سب کو تقدیر کے اتفاق نے ملایا اور جوڑے رکھا تھا۔

''آج ثابت ہوگیا کہ تمہاری کُتّے والی ناک ہے۔'' میں نے کہا۔

شرفو نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ہماری اوقات بھی کُتّے والی ہے بچّے۔'' اور کچن میں گھس گیا۔

''سچ مچ بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے مجھے بھی۔'' میں نے کہا۔

''شرفو کچن میں نہاری گرم کررہا ہے۔'' فیکے نے بتیسی نکال کے مجھے اطلاع دی۔ ''تیری شکل کیوں پھٹے جوتے جیسی ہورہی ہے؟''

''یار سنا ہے میری شادی ہورہی ہے۔'' میں نے لہجے میں رقت پیدا کی۔ . .

فیکا قہقہہ مار کے ہنسا۔ ''ٹی وی کی خبروں پر کان مت دھرا کر بیٹے۔''

میں نے نوٹوں والا شاپر بیچ میں رکھ دیا۔ ''یہ دیکھو۔ جیل کے یاروں نے تیاری کے لیے کیا دیا ہے۔ ایک لاکھ۔''

''یار وہ ڈاکو ہیں۔ ہم شرفا۔'' فیکا بولا۔

میں نے کہا۔ ''تم شرفا؟ سارے ایک سے ایک کمینے۔ اکا کر کے میرے مال پر ڈاکا ڈالنے پہنچ جاتے ہو۔''

''دیکھ یار کھیل میں جیت ہار قسمت کی بات ہے۔'' فیکا بولا۔ باقی سب نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

''اچھا آج تم ہار جاؤ تاکہ میری رقم دگنی ہوجائے۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''دیکھ یار، تو اس ڈاکٹر کا خیال چھوڑ دے۔ نہ تیرا اپنا گھر ہوگا نہ وہ تجھ سے شادی کرے گی۔''

فیکا بولا۔ ''ایک دن تو بھی توپ صاحب جیسا بوڑھا گنجا ہو کے کنوارا مرجائے گا۔''

''تلی مغز اور تڑکے والی نہاری کھا شیرمال کے ساتھ چپ کر کے۔'' شرفو نے دعوت کا سب سامان بیچ میں رکھ دیا۔

خوشبو میرے بھی حواس پر غالب آ گئی تھی۔ اگلے آدھے گھنٹے ہم نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ طعام سے انصاف کیا۔ کچھ دیر ہم سب کیف و سرور کی کیفیت میں مگر مچھ کی طرح نیم دراز پڑے رہے۔ پھر میں نے اپنی چائے بنانے کی مہارت کا استعمال کیا۔ فیکے نے تاش کی نئی گڈی نکالی اور پھینٹنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''دوستو بے شک تم مجھے بہت عزیز ہو۔ مگر مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ آج کے بعد ہم نہیں ملیں گے۔ سنا تم نے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے کیونکہ جب تک میں تمہارا ساتھ رکھوں گا میں پھکو رہوں اور صائمہ کی گھر بنانے کی شرط پوری نہیں ہوگی کبھی۔''

''تو ایک ایسی عورت کے لیے یاروں کو چھوڑ دے گا جس کو تیری خاک پروا نہیں؟'' فیکا بولا۔

''جو تجھے جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ اب لعنت ہے تجھ پر۔'' شرفو نے کہا۔

''مرد بن مرد بزدل۔ ورنہ تجھے ہر عورت کتا بنا کے رکھے گی۔'' جانو استاد بولا۔

''اپنی بکواس بند کرو۔ تم سب گھر بسائے بیٹھے ہو اور لگے ہوئے ہو پروڈکشن میں۔ صائمہ تم کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ اس کی وجہ تم جانتے ہو۔ میں تمہاری خاطر اس کو کیسے چھوڑ دوں۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''اب میں نے سوچ لیا ہے کہ اس کے لیے تمہیں کیا دنیا کو چھوڑ دوں گا۔ تم تو چاہتے ہو میں دنیا سے نامراد جاؤں۔''

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ شاید ان کو میری بات مضحکہ خیز لگی تھی۔ ان کے نزدیک یہ ناممکن تھا۔

فیکے نے کہا۔ ''چل پتے پکڑ مجنوں کی اولاد۔'' اور میں نے پتے پکڑ لیے۔

ہمیشہ کی طرح کھیل رات بھر جاری رہا اور میری دولت رفتہ رفتہ میرے تین یاروں کی جیب میں منتقل ہوتی گئی۔ اپنی ساری عقل و ذہانت کے باوجود میں آج تک کبھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ چالاکی نہیں دکھاتے۔ ہاتھ کی کوئی صفائی نظر نہیں آتی تو پتے ان کے پاس کیسے پہنچ جاتے ہیں خواہ تقسیم بھی میں خود کروں۔ صبح جانو استاد ناشتے کے لیے پوری حلوا لینے گیا۔ ناشتا کرنے کے بعد ہم سب وہیں آڑے ترچھے پڑ کے سوتے تھے تو دوپہر کے بعد اٹھتے تھے لیکن وہ ناشتے کے بعد بھی بیٹھے رہے اور مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں اور مسکراتے رہے۔

میں نے کہا۔ ''تم ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟ میں نے جو فیصلہ کیا ہے۔ خوشی سے نہیں کیا۔ ہم بڑے اچھے دوست تھے لیکن تمہاری خاطر میں صائمہ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ آج بھی تم نے وہی کیا۔''

جانو استاد نے کہا۔ ''ہم بھی تجھے نہیں چھوڑ سکتے۔ دوست ہیں تو دشمنی کیسے کر سکتے ہیں تیرے ساتھ۔ لیکن آج تک تو نے ایک بات سمجھی نہیں اس کا بڑا افسوس ہے۔''

فیکا اٹھ کے گیا اور وہ تین بیگ اٹھا لایا جو میرے بیڈ پر پڑے تھے۔ یہ عام پرانے شاپر تھے۔ میں نے ان سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیا لائے ہیں۔ فیکے نے ان کو درمیان میں میرے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے حیران ہو کے پوچھا اور ایک بیگ میں جھانکا۔ یہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دوسرے بیگ میں دیکھا پھر تیسرے میں۔

وہ سکون سے بیٹھے مسکراتے رہے۔ ''یہ وہ سب مال ہے جو تو سمجھتا رہا کہ ہم نے تجھ سے لوٹا۔''

میں نے بیوقوفوں کی طرح ان سب کی صورت کو دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''میاں بزدل، ہم نے کوئی فارسی تو نہیں بولی۔'' شرفو نے توپ صاحب کی نقل اتاری۔ ''ہر بیگ میں تقریباً دس لاکھ ہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ تو اس ڈاکٹر کے عشق میں گوڈے گوڈے دھنسا ہوا ہے۔ تیرے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ وہ لڑکی اتنی اچھی ہے تیرے لیے مگر تو ذرا بھی اُس کے لائق نہیں۔''

جانو نے کھوپڑی ہلائی۔ ''تو کسی کے قابل نہیں۔ دنیا میں ایک وہی ہے جو تجھے بندے دا پتر بنا سکتی ہے۔ تیرے کرتوت کوئی اور لڑکی ٹھیک نہیں کر سکتی۔ صائمہ کو پروا نہ ہوتی بیٹے تو کب کا تیری شکل پر لعنت بھیج کے جا چکی ہوتی۔''

اب فیکے نے قوالی میں اپنی آواز ملائی۔ ''جتنا ڈھول تو پیٹتا ہے محبت کا۔ اس سے سو گنا ہزار گنا زیادہ وہ تجھ سے کرتی ہے۔ اور اسی لیے نہیں چاہتی کہ تو اس محبت میں گوا چی گاں بن کے پھرتا رہے۔ لاوارث گائے۔ گھر بسانا ہو تو گھر پرایا نہ ہو۔ یہی اس کی خواہش ہے نا تو ہر عورت کی ہوتی ہے۔ ورنہ یا تو ماں باپ رسی تھما دیتے ہیں کہ چاند سی بٹو اب تیرے حوالے۔ اسے فٹ پاتھ پر رکھ یا درخت پر گھونسلا بنا کے رہ۔ لڑکیاں خود آنکھوں پر پٹی باندھ کے ساتھ چل پڑتی

ہیں۔گاتا گاتی ہوئی کہ چل چلیے دنیا دے اُس نگرے۔"

"تو نے دیکھا نہیں ہماری زندگی کو بچّے؟" جانو نے بزرگوں کی طرح فرمایا۔"فرق صاف ظاہر ہے۔ہم گندے کپڑے تھے۔گھر والی ایسا سرف بن کے آئی کہ زندگی بدل دی ہماری۔تو بھی لے آ صائمہ کو ہماری بھابی بنا کے۔یہ پیسے رکھ اور گھر بنا لے۔"

میں بے وقوفوں کی طرح چپ بیٹھا ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔وہ سارے بزرگ اور افلاطون بن کے بول رہے تھے۔یہ الفاظ ان کے منہ سے بڑے عجیب لگتے تھے۔میں ان تین تھیلوں کو دیکھ رہا تھا جو درمیان میں پڑے میری عقل اور سمجھ بوجھ کا منہ چڑا رہے تھے۔شرمندگی اور فرطِ جذبات نے میرے ہونٹوں پر تالے ڈال دیے تھے۔میں خاک عقل اور نظر رکھتا تھا جو اِن تینوں کے ظاہر سے باطن کا اندازہ ہی نہ کر سکا۔

بالآخر وہ خاموش ہو گئے۔میں نے بڑی مشکل سے کہا۔"یار! میں احمق ہوں۔الو کا پٹھا اور عقل کا اندھا ہوں۔تم جوتے مارو میرے سر پر۔میں نے کیا سمجھا تھا۔کیا کہا تھا ابھی۔"

جانو استاد قہقہہ نہ مارتا تو شاید فرطِ جذبات میں میرے آنسو بہہ نکلتے۔"ابے بس کر یہ ڈراما بزدل کے بچے۔ایڈیٹر کی اولاد۔"

جو گالیاں باقی ٹیم کے ارکان نے مجھے دیں قابلِ اشاعت نہیں ہیں لیکن بالآخر یہ جذبات کا طوفان گزر گیا۔شرفو نے وہ تین تھیلے اٹھا کے اس الماری میں رکھ دیے جس میں پرانے اخبار رسالے اور تراشے بھرے پڑے تھے۔میں جو غبارے کی طرح چھت سے لگا ہوا تھا، نیچے اتر آیا۔

"دیکھ پُتر بدیع الزمان آف لالہ موسیٰ۔" پیر جانو استاد نے میرے دادا کی طرح بولنا شروع کیا۔"تو اپنی عقل کو تو رکھوا دے توپ صاحب کے پاس۔کیا سمجھا۔جب وہ ڈاکٹر آئے گی تو خود تجھے کُتّے کی دُم کی طرح سیدھا کر دے گی لیکن اس سے پہلے جو کریں گے، ہم کریں گے۔"

"اب یہ تیس لاکھ ہیں۔ہمیں امید تھی کہ اس میں تین بیڈ کا اچھا فلیٹ اسی جگہ مل جائے گا اور مل گیا۔" دوسرا بولا۔"کہیں دور جانے کی کیا ضرورت تھی۔ہم نے سوچا اسی فلیٹ کے مالک سے بات کرتے ہیں۔ہم نے کل آخری بولی لگا دی تھی کہ بیس لو اور ابھی لو اور نقد لو یہاں۔ورنہ پراپرٹی کہاں بک رہی ہے آج کل۔تم لگے رہتا سال بھر......ہمیں تو سارے شہر میں کہیں نہیں۔اس سے اچھا ہی ملے گا۔"

"لگتا تھا سالا ہارٹ فیل ہونے سے مر جائے گا۔ایک تو کرایہ نہیں مل رہا تھا۔کورٹ کچہری میں الگ دھکے کھا رہا تھا۔ہاتھ جوڑنے لگا کہ بلیک میل مت کرو۔تم کہیں سے بھی معلوم کر لو میری پراپرٹی تیس لاکھ کی ہے۔ہم نے کہا اچھا بیٹے پچیس۔اس سے اوپر ایک پیسہ نہیں۔"

جانو نے قہقہہ مارا۔"مان گیا روپیٹ کر۔ابھی دوپہر کے بعد آنے کا بول دیا تھا۔وہ کاغذات لائے گا۔جہاں وہ کہے انگوٹھا لگا دینا۔قانونی کارروائی ہوتی رہے گی لیکن آج کے بعد مالک تو ہوگا اس فلیٹ کا اُلّو کے پٹھے۔" استاد جانو نے میری کمر میں مُکّا مارا۔

اسی وقت گھنٹی بجی اور پراپرٹی کا مالک آ گیا۔اس کی صورت دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ ترس آیا۔

"تم واقعی خریدے گا اپنا فلیٹ۔یا ابھی کوئی نیا جوک ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

شرفو نے الماری میں سے نوٹوں کے بیگ نکالے۔اس میں سے پانچ لاکھ الگ کیے اور باقی اس کے سامنے رکھ دیے۔"گن لو خود۔پورے پچیس لاکھ۔ایک روپیہ کم نہیں۔"

"ابھی یہ سارا روکڑا ہم کیسے لے جائے گا۔" وہ بیگ قبضے میں لے کر بولا۔"ہم سوچا تم چیک دے گا۔نوٹ نقلی تو نہیں ہے نا؟"

کسی کامیڈی فلم کے منظر جیسی یہ کارروائی ابھی جاری تھی کہ آخری سین میں ایک اور دھماکا ہوا۔کال بیل بجی اور میں یہ سوچتا ہوا دروازے تک گیا کہ اس وقت اور کون آ سکتا ہے۔اپنے مقابل صائمہ کو دیکھ کر عقل و حواس ہوش و خرد سب کا فیوز اُڑ گیا۔اس نے مجھے پھر میری چنڈال چوکڑی کو اور مالک مکان کو دیکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی بے یقینی کا جتنا شکار میں تھا، اس زیادہ صائمہ نظر آتی تھی۔پوچھنا تو مجھے بہت کچھ تھا لیکن اس وقت میں نے بڑی مشکل سے صرف اتنا کہا۔"صائمہ! ٹھیک تو ہو تم؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا سر ہلا کے اور کوئی سوال کیے بغیر کرسی پر بیٹھ گئی۔اس کے سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر تھا لیکن اسے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہم اس فلیٹ کا سودا کر رہے تھے۔

بے یقینی کا زیادہ شکار میرا لینڈ لارڈ تھا۔اس کے لیے بھی سورج جیسے مغرب سے نکل آیا تھا۔اس نے پراپرٹی کی

ملکیت کی اصل فائل میرے حوالے کی۔ میرے کائیاں وکیل اس کا ورق ورق غور سے پڑھتے رہے۔ لینڈ لارڈ اسی طرح ایک ایک نوٹ کا معائنہ کرتا رہا۔ میں بیوقوفوں کی طرح ساری کارروائی کو دیکھتا رہا۔ یہ ناممکن کو ممکن کرنے والا عجیب لمحہ تھا جو الہ دین کے چراغ کی طرح میری گرفت میں آ گیا تھا۔ ایک خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ کاش اس وقت صائمہ بھی یہ سب دیکھتی اور وہ آ گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ان مہمانوں کے لیے چائے تو بنا لاؤ صائمہ۔'' اور ایک اچھی ہاؤس وائف کی طرح اس نے مجھے مسکرا کے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب ہم نے دستخط کیے تو ایک گواہ شرفو استاد بنا۔ دوسرے گواہ کی جگہ ڈاکٹر صائمہ نے دستخط کیے۔ دنیا یکلخت بدل گئی تھی۔ وہ سب ہو رہا تھا جو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

بالآخر میرے لینڈ لارڈ نے سارے نوٹ ایک میلے سے میز پوش میں ڈال کر گٹھڑی سی بنائی اور جانے کے لیے اٹھا۔ ''اچھا بزدل بھائی، کل رجسٹرار کے کورٹ میں ملیں گے۔ کہا سنا معاف۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

اُس کا معافی مانگنا میرے لیے منہ پر پڑنے والے کسی تھپڑ جیسا ہو گیا۔ ''نہیں بڑے بھائی۔ زیادتی میں نے کی تھی۔ معافی میں مانگتا ہوں آپ سے۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''گھر آپ کا تھا اور اب بھی ہے۔''

وہ ایک دم پلٹا اور پوٹلی اٹھا کے نکل گیا۔ ایک لمحہ ہم سب خاموش بیٹھے رہے۔ وہ لمحہ فرطِ جذبات سے بوجھل تھا۔

پھر میں نے کہا۔ ''صائمہ دیکھو میرے ان دوستوں نے وہ سب رقم مجھے واپس کر دی جو مجھ سے جیتی تھی۔ یہ پیسہ پیسہ جوڑتے رہے تھے اور اسی سے میں نے۔ آج یہ گھر خرید لیا ہے۔''

صائمہ کا چہرہ احساسِ ندامت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک گیا۔

''ہم نے کچھ نہیں کیا ڈاکٹر صاحب۔ بس دوستی کا حق نبھایا ہے۔'' شرفو نے ہاتھ جوڑ کے سب کے ترجمان کی طرح کہا۔

''مجھے معاف کر دینا شرفو بھائی۔ آج تک بہت غلط سمجھا میں نے آپ سب کو۔ میرا تو دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ آج مجھے تین بھائی مل گئے ہیں جن کی میں اکلوتی بہن ہوں۔'' صائمہ باقاعدہ رونے لگی۔

شرفو کھڑا ہو گیا۔ ''آنسو پونچھ لو بہابی۔ اللہ تمھیں خوشیاں مبارک کرے۔'' اس نے کہا۔ ایک ایک کر کے وہ سب باہر چلے گئے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارا اور پھر غور کیا۔ آواز تکیے کے نیچے سے نہیں آ رہی تھی۔ فون کہیں نیچے پڑا چلّاتا رہا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کے گرد و پیش پر غور کیا اور ایک دم اٹھ بیٹھا۔ یہ سب خواب تھا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن سب وہی تھا ویسا ہی تھا جیسا ہو سکتا تھا۔ ایک لاکھ کی رقم کا بیگ میز پر رکھا ہوا تھا۔ میرے جوتے آڑے ترچھے فرش پر پڑے تھے۔ میں نے وہی گزشتہ شام والی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ ہر روز کی طرح ایڈیٹر روزنامہ ''حقیقت ساز'' بدیع الزماں لالہ موسوی اپنے حجرۂ ویراں کی بے سرو سامانی میں کسی کھنڈر کے اُلّو کی طرح تنہا تھا۔ اٹھے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی، مرزا نوشہ نے کہا۔ اس وقت گھنٹی پھر بجی اور میں نے جھک کے فون اٹھایا تو جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ صائمہ کی کال تھی۔

''صائمہ کہاں ہو؟'' میں نے چلّا کے کہا۔

اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''کیا بھنگ پی کے سوئے تھے؟ اتنی دیر سے فون کر رہی ہوں۔ سنو میں یہاں ہوٹل میں غزالہ کے پاس ہوں۔ فوراً آ جاؤ۔'' فون بند ہو گیا۔

☆☆☆

میں نے آہستہ سے دستک دی تو صائمہ نے تھوڑا سا دروازہ کھول کے مجھے دیکھا اور میرے اندر جاتے ہی پھر بند کر دیا۔ میں نے ایک نظر میں کمرے کے اندر کا منظر دیکھا۔ غزالہ صوفے پر یوں بیٹھی تھی جیسے ابھی گر جائے گی۔ صائمہ کی اُڑی اُڑی سی رنگت میں عجیب بدحواسی اور ویرانی تھی۔ بیڈ پر کوئی سر تک کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی غزالہ نے ہاتھوں سے منہ چھپا کے رونا شروع کیا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تو غزالہ کا سر میرے کندھے پر آ گیا۔

''غزالہ، غزالہ...... کیا ہے یہ سب؟'' میں نے پریشان ہو کے پوچھا اور پھر صائمہ کی طرف دیکھا۔

صائمہ نے بیڈ کی طرف دیکھا۔ ''کسی نے غزالہ کے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔'' سننے کے بعد اس بات کو سمجھنے میں مجھے بہت دیر لگی۔ پھر میں اٹھ کر بیڈ تک گیا اور کمبل ہٹایا۔ نیچے ایک اجنبی کا چہرہ تھا جس میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ مقتول صاحب واقعی قتل ہو چکے تھے۔ کمبل واپس ڈھانپ

کر میں صوفے پر واپس آ گیا۔ صورتِ حالات کو سمجھ لینے کے بعد میں نے کہا۔ ”غزالہ، اسٹاپ دِس رونا دھونا۔ مجھے بتاؤ۔“

”میں بتاتی ہوں۔“ صائمہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے ... صبح ساڑھے چھ بجے اس کا فون آیا کہ فوراً آ جاؤ۔ یہ بُری طرح رو رہی تھی۔ اس نے مجھے ہوٹل کے کمرے کا نمبر بتایا اور بس۔ میں بھاگی اور آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچی تو یہ سب دیکھا۔“

”غزالہ تم بتاؤ مجھے۔“ میں اس کی طرف پلٹا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں کیا ہوا اور کیسے۔ یہ رات کو کسی وقت آیا۔ ساڑھے بارہ تک تو میں جاگ رہی تھی۔ پھر میں نے ایک نیند کی گولی کھالی۔ کچھ دن سے کھا رہی ہوں میں۔ مجھے پتا نہیں یہ کب اندر آیا صبح آنکھ کھلی تو دیکھا۔ یہ ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ میں اٹھ بیٹھی۔ سخت غصہ تھا مجھے کہ یوں چوروں کی طرح آیا دو دن بعد۔ اور بات بھی نہیں کی مجھ سے میں نے آواز دی، پھر ہلایا۔ اس وقت میری چھٹی حس اور میرے تجربے نے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجائی کہ وہ سویا ہوا نہیں، مردہ ہے، میں گھبرا کے اٹھی اور سب چیک کیا تو شک کی بات ہی نہیں رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ کیا منیجر کو بتاؤں۔ لیکن پھر میں نے صائمہ کو فون کیا۔ اس کا نمبر مجھے کل ہی ملا تھا۔ اس کے آنے تک میں لاش سے دور کھڑی رہی۔ یہ آئی تو اس نے کہا کہ تمہیں بلا کے سب بتائیں۔“ یہ سب غزالہ نے مجھے سسکیوں اور ہچکیوں کے ساتھ بتایا۔

”کیا کہتے ہو تم؟ اب کیا کرنا ہے؟“ صائمہ نے خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد کہا۔

”میں باہر جا کے ظالم خان سے بات کرلوں پھر کچھ کرتے ہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ابھی تم بیٹھو آرام سے۔“

باہر کاریڈور سنسان تھا، ہوٹل کے لاؤنج میں بھی کاؤنٹر پر ڈیوٹی اسٹاف کے سوا کوئی نہیں تھا، صفائی والا عملہ کہیں کہیں اپنے کام میں مصروف نظر آتا تھا۔ سوئمنگ پول سنسان پڑا تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کے میں نے ظالم خان کو فون کیا تو کچھ انتظار کے بعد اس کی نیند میں ڈوبی آواز آئی۔

”سالے صاحب، اللہ خیر کرے۔“

میں نے کہا۔ ”بیڈ روم سے باہر آ کے بات کر۔ ابھی فوراً۔“

اس کے وجود میں جاگ اٹھنے والے پولیس مین نے شاید میرے لہجے کی سنگینی کو محسوس کرلیا، دو منٹ بعد اس نے کہا۔ ”ہاں کیا ہو گیا صبح صبح۔ اتنی بدحواسی۔“

میں نے کہا۔ ”میں باہر سے فون کر رہا ہوں۔ غزالہ تین دن سے اس ہوٹل میں مقیم ہے۔ یار یہ جو جمخانہ پر ہے۔ ہاں وہی۔ اس وقت صائمہ بھی اس کے ساتھ کمرے میں ہے۔ میں باہر سوئمنگ پول پر تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں ہے ابھی۔ مگر فون پر بات نہیں کروں گا۔ تو آجا فوراً۔“

”آتا ہوں یار۔ تُو بہت گھبرایا ہوا لگتا ہے۔ میں پہنچتا ہوں۔ بیس منٹ تو لگیں گے مجھے۔“ اس نے تسلی دینے والے لہجے میں کہا۔

دور سے دیکھنے والا ایک ویٹر میرے قریب آیا۔

”سر! کچھ چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بلیک کافی لا دو مگر گرم۔“

میرے حواس کافی سے خاصے بیدار ہو چکے تھے لیکن میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا کہ اس مشکل سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے جب مجھے ظالم خان سادہ لباس میں نظر آیا تو میں نے کچھ بہتر محسوس کیا۔ وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔

”ابے کیا ہو گیا؟ قتل کر دیا ہے کسی کو؟“ اس نے ساتھ بیٹھ کے میرا کندھا ہلایا۔

”یہی سمجھ لے۔“ میں نے کہا اور کم سے کم الفاظ میں اسے سب بتا دیا۔ وہ سب سنتا رہا لیکن کچھ بھی سن کے فوراً یقین نہ کرنا اس کی پیشہ ورانہ ضرورت تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور یہ بہت سنگین قانونی معاملہ ہے۔

”بات تو آپ کی سمجھ لی میں نے۔“ اس نے کہا۔ ”واردات کی فوری رپورٹ ضروری ہے۔ پہلے تو ایسا کرتے ہیں کہ منیجر سے بات کرتے ہیں۔ وہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ ایسی کسی واردات کی خبر پبلک نہ ہو جس سے ہوٹل کی گڈ ول متاثر ہو۔ میں غزالہ کے ساتھ ہوں، اس نے جھوٹ کچھ نہیں کہا ہوگا لیکن سچ وہ جو ثابت ہو۔ رپورٹ میں اس کا نام ضرور آئے گا اور اسے گرفتار بھی کیا جائے گا۔ آگے اس کے ساتھ سلوک اچھا ہوگا اور اسے پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ اس کی ضمانت بھی منظور ہو جائے گی لیکن تفتیش کرنے والوں کی بھی اپنی مجبوری ہے۔ وہ غزالہ کی اسٹوری

کا سچ جھوٹ ضرور دیکھیں گے۔''
میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ ''فرض کر۔ یہ ثابت ہی نہ ہو کہ غزالہ یہاں کمرے میں تھی۔''
''کیا مطلب؟''
''دیکھ غزالہ کا شوہر چلا گیا تھا دبئی۔ گیا تھا یا نہیں۔ پتا چل جائے گا آسانی سے مگر وہ اہم نہیں۔ تین دن تک اس کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ غزالہ نے اکیلے رہ کر دو دن انتظار کیا۔ پھر صائمہ کے گھر چلی گئی۔ اس میں کوئی بات غیر معمولی نہیں۔ سارا اسپتال گواہ ہوگا کہ وہ کتنے سال سے دوست ہیں۔''
ظالم خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بھائی میرے صائمہ کا گھر ہی نہیں ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں۔''
''درست لیکن اس کا لیوایڈریس ہمیشہ توپ صاحب کے گھر کا ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ہے جب وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر بیٹھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''سب آن ریکارڈ ہے اور گواہ خود توپ صاحب ہوں کہ دونوں لڑکیاں وہیں تھیں تو انہیں کون جھٹلائے گا۔''
ظالم خان سوچ میں پڑ گیا۔ ''یہاں اسٹاف نے اسے دیکھا ہوگا۔ کل رات کا کھانا اور چائے ہوگی۔''
''بات صرف گزشتہ رات کی ہے۔ منیجر بھی تو کچھ کور کرے گا۔ کل رات کی ڈیوٹی والے ایک دو ویٹرز کو سمجھا دے گا۔''
''چل اب پہلے میں جائے واردات دیکھ لوں۔ پھر بلاتے ہیں منیجر کو۔''
کمرے میں دونوں لڑکیاں سخت مضطرب، پریشان اور خوف زدہ بیٹھی تھیں۔ ظالم خان نے رسمی سی تسلی دینے کے بعد لاش کو دیکھا۔ ہم دونوں دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔
''تم دونوں تجربہ کار ڈاکٹر ہو۔ کچھ اندازہ کر سکتی ہو موت کے سبب کا؟''
باری باری دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر صائمہ نے کہا۔ ''زہر خورانی ایک وجہ ہو سکتی ہے لیکن علامات کچھ نہیں۔ سو قسم کے زہر ہیں۔ ان میں منشیات کو بھی شامل کر لو۔ پوسٹ مارٹم کے بغیر کچھ پتا نہیں چلتا۔ دم گھٹنے کی کوئی علامت نہیں۔''
غزالہ بولی۔ ''یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے اسے زہر دیا ہو۔ جس کا اثر دیر سے ہوا۔ یہ جس قسم کے مشکوک کاروبار میں ملوث تھا اور جیسے لوگوں سے رابطہ تھا......''

''کل رات تم نے روم سروس سے کیا منگوایا تھا کھانا یا چائے کافی؟'' ظالم خان نے اس کی بات کاٹ دی۔
''کچھ نہیں۔ ایسے ہی دل گھبرایا تو باہر نکل گئی۔ چلتی رہی اور ایک جگہ بیٹھی تھی کافی پینے تو سینڈوچ منگوا لیا، ہوں تو اسی شہر کی نا۔''
''کسی نے جاتے ہوئے دیکھا تھا تمہیں؟''
''دیکھا ہوگا۔ لیکن بارہ بجے کے بعد واپس آئی تو بہت کم لوگ تھے۔ کاؤنٹر اسٹاف بھی بدل گیا تھا۔ نائٹ شفٹ آگئی تھی۔''
''اب میری بات غور سے سنو۔'' ظالم خان کچھ دیر بعد بولا۔ ''ہم بات کرتے ہیں منیجر سے لیکن پہلے تم دونوں کمرے کو لاک کر کے نکل جاؤ۔ ذرا منہ کو ایسے کور کرنا کہ کاؤنٹر پر یا سروس اسٹاف کو چہرہ واضح دکھائی نہ دے۔ یہاں سے سیدھی توپ صاحب کے گھر جا کے بیٹھ جاؤ۔ بات سمجھ آرہی ہے نا؟''
دونوں نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔
''تمہیں کچھ پتا ہی نہیں۔ پولیس کے سامنے تمہارا یہ موقف ہوگا۔ توپ صاحب کو ساری بات سمجھا دو۔ وہ تجربہ کار جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ سب سمجھ جائیں گے، رائٹ۔ اب نکل جاؤ۔ توپ صاحب کے گھر فون آئے گا کسی کا۔ پولیس کا یا ہوٹل کے منیجر کا۔ پھر تمہیں یہاں آکے ڈراما کرنا ہے غزالہ۔ تم گرفتاری سے تو شاید بچ جاؤ گی لیکن تفتیش پوری ہوگی۔ اس میں سب تم سے ہی پوچھا جائے گا۔ کسی کو شوہر کے مشکوک کردار کے بارے میں ایک لفظ بتانے کی ضرورت نہیں۔ نہ یہ کہ اس کا سلوک تمہارے ساتھ کیسا تھا، وہ ایک عام سا شوہر تھا، نئی نئی شادی ہو تو شوہر جیسے رہتے ہیں وہ بھی رہتا تھا۔ ابھی تمہیں اس کے.... دوستوں دشمنوں کا کچھ پتا نہیں۔ ناؤ گو۔ ہم کچھ کرتے ہیں۔''
مقتول صاحب کو قتل ہوئے دو سے تین گھنٹے ہوئے تھے جب چشم دید گواہ جائے واردات سے غائب ہو گئے۔ بظاہر ظالم خان تجربہ اور ذہانت سے کام لے رہا تھا لیکن طریقے اور حربے سب پولیس کے تھے۔ وہ کوئی مثالی ایماندار اور فرض شناس افسر نہیں تھا۔ بن بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ذرا بھی اس ماحول کو بدلنے کی کوشش کرتا تو دودھ کی مکھی کی طرح باہر پھینک دیا جاتا۔ جو اس کو پہلی بار میرے لیے کرنا پڑ رہا تھا اب تک سب کے لیے کرتا آیا تھا اور سمجھتا تھا کہ ایک اخبار نویس اور وکیل سے پولیس کا ظاہر باطن کچھ

پوشیدہ نہیں ہوتا۔ وہ اعتراف کرتا تھا کہ میں نے اس کی فرض شناسی کارکردگی اور ایمانداری کا کتنا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ آج پہلی بار اسے بھی میرے لیے کچھ کرنے کا موقع ملا تھا۔

صائمہ اور غزالہ نکل گئیں تو ظالم خان نے منیجر کو طلب کیا۔ وہ ڈیوٹی پر آنے کے لیے تیار ہی ہو رہا تھا۔ ''ایس پی صاحب، خیریت ہے نا۔ کیا ہوٹل میں کچھ ہوا ہے؟''

''ظاہر ہے لیکن ابھی میرے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ آپ آجائیں تو بات کرتے ہیں۔''

منیجر آدھے گھنٹے میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ بند کمرے میں یوں بات ہوئی کہ دروازے کھلے تھے لیکن کسی کو بھی قریب آنے کی اجازت نہیں تھی۔ دیکھنے والوں کو ایسا ہی لگا ہوگا کہ تین دوست بے تکلف گفتگو کر رہے ہیں۔ باقی دن کی ساری کارروائی ضابطے کے مطابق ہوئی۔ منیجر نے اپنے ہوٹل کی نیک نامی پر حرف نہیں آنے دیا۔ یہ خبر بنی ہی نہیں کہ علاقے کے تھانیدار نے ایس پی صاحب کے احکامات کی حرف بہ حرف تعمیل کی۔ ایف آئی آر درج ہوئی۔ اس میں موت کی وجہ نامعلوم لکھی گئی۔ غزالہ کا بیان ایک وکیل کی یعنی میری اور پولیس کی ہدایات کے مطابق لکھا گیا۔ مشکل مرحلہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ہو سکتا تھا لیکن ان کے لیے کیا مشکل تھا جو خود یہ کام کرتے ہوں۔ صائمہ اور غزالہ کے کولیگ ڈاکٹرز نے وہی کیا جو وہ پہلے بھی کرتے آئے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ کوئی موثر لیکن دیر میں اثر کرنے والا زہر تھا جو سچ مچ مقتول ہو جانے والے مقتول صاحب کو دیا گیا تھا لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کی وجہ حرکت قلب بند ہو جانا ہی درج کی گئی۔ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔ اس رپورٹ کو چیلنج کون کرتا کہاں کرتا اور کب کرتا۔

مقتول صاحب کے والدین اُفتاں و خیزاں بمشکل تمام دوسرے دن پہنچے اور روتے پیٹتے لاش لے گئے۔ یہ ضروری تھا کہ رسم دنیا نبھانے کے لیے بیوہ ساتھ جائے۔ غزالہ کے ساتھ صائمہ گئی اور صائمہ کے ساتھ میں گیا۔ یہ تین دن کا مشکل مرحلہ تھا جس میں ہم سب کا کردار دیکھنے والوں کو ویسا ہی لگا جیسا حالات کا تقاضا تھا۔ مرنے والے کے عزیز و اقرب اور شناسا احباب کا ردِعمل بے یقینی سے زیادہ شک کا تھا۔ غزالہ پہلے بھی بن بلائے مہمان جیسی تھی۔ نہ کسی نے اس سے بات کی نہ تعزیت۔ خاندان میں اس شادی سے خوش کون ہوتا۔ اس نے خود کو نحوست کا نامہ بر بھی ثابت کر دیا تھا۔ جو تھوڑی بہت ہمدردی تھی، وہ ماں باپ کے لیے محسوس ہوتی تھی۔ اور وہ مجھے بیٹے کے غم سے زیادہ اس کی چھوڑی ہوئی دولت جائداد کے لیے متفکر نظر آتے تھے۔

جب سوگ کی رسمیں تمام ہوئیں تو انہوں نے دبے دبے لہجے میں غزالہ سے پوچھ لیا۔ ''تم اب کیا کرو گی۔ مطلب یہ کہ......''

ہم اس سوال کے لیے غزالہ کو ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے۔

''میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔'' غزالہ نے سکون اور اعتماد سے کہا۔ ''میں یہاں رہ کے عدت کے دن پورے نہیں کر سکتی۔ میں واپس اپنی ڈیوٹی پر اسپتال جاؤں گی۔''

ماں باپ نے سکون کا سانس لیا۔ یہی وہ بھی چاہتے تھے۔ جب ان کا بیٹا نہیں رہا تو بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والی بہو جائے جہنم میں۔ اس کی پروا یہاں کس کو تھی۔ چوتھے دن ہم واپس جا رہے تھے تو ہمیں گھر کے دروازے تک خدا حافظ بھی کسی نے نہیں کہا۔ ساس سسر نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ جان چھوٹی اور غزالہ نے ان کے بیٹے کی پراپرٹی میں اپنے حصے کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ گھر بھی عالی شان تھا جہاں ہم نے قیام کیا۔ ممکن ہے شہر میں اس کی مزید پراپرٹی ہو۔ غزالہ کے حصے میں شوہر کی کوئی چیز آتی تو وہ بینک میں محفوظ نقد سرمایہ تھا جو اس نے نامعلوم کیوں مشترکہ اکاونٹ میں رکھا تھا۔ غزالہ نے جوائنٹ اکاونٹ کے فارم پر دستخط ضرور کیے تھے لیکن اس میں موجود رقم کا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ اسپتال میں اس کی قیمتی گھڑی اور پرس غزالہ کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ غزالہ کے پاس اخراجات کے لیے رقم نہ رہی تو اس نے بریف کیس سے ملنے والی چیک بک کو دیکھا۔ پاس ورڈ جانے بغیر وہ بینک کا کارڈ ...استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ایک لاکھ کا چیک لکھا۔ پھر پانچ لاکھ کا۔ وہ کیش ہو گئے۔ یہ اسے بہت بعد میں بینک سے معلوم ہوا کہ وہ تقریباً پچاس لاکھ کی بلا شرکت غیرے مالک ہو گئی تھی۔ قدرت کے دستِ غیب نے اس کو ساری اذیت اور تمام آزار کا صلہ بڑی فراخدلی سے دے دیا تھا۔ یہ سب اس نے بالآخر اپنے اکاونٹ میں ٹرانسفر کر دیا کہ کسی کا ڈر جھنجھٹ ہی نہ رہے۔ واپسی کے سفر میں وہ بہت پُراعتماد اور پُرسکون نظر آتی تھی۔ میرے اور صائمہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے کئی بار کہا کہ ہماری مدد نے

اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچالی۔ اس کا یقین خود مجھے نہیں تھا کہ اتنی بڑی بات ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔ لیکن یہاں ایسا تھا اور ایسا ہی رہنا تھا۔ ہم اس دنیا سے باہر کہاں جی سکتے تھے۔

بظاہر زندگی اپنے معمول پر رواں دواں تھی۔ خلل کہیں تھا تو میرے اپنے دماغ میں۔ نیند کیا آتی۔ میں اور ظالم خان آدھی رات کے بعد تک باتیں کرتے رہے۔ نہ جانے کیوں خطرے کا وجود احساس میں شامل ہو گیا تھا اور ظالم خان کی یقین دہانی مجھے طفل تسلی لگتی تھی کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی۔ صبح پھر آنکھ جلدی کھل گئی۔ ایک قومی دن کی تعطیل کے باعث اخبار کا دفتر بھی بند تھا۔ فون پر خیریت پوچھنے کے بجائے میں نے چنگیزی منزل جانا بہتر سمجھا۔

چنگیزی منزل شہر کے قدیم ترین حصے لیاری میں ایک صدی پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ وہ عافیت اور سکون کا زمانہ تھا۔ بہت کم آبادی والے شہر پر انگریز کی عملداری تھی۔ جب شہر کو کیپٹل کا درجہ ملا تو نیا شہر ہر طرف پھیلا اور پرانا نظر انداز ہو تو پسماندگی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ بالکل نامعلوم طریقے پر اس علاقے سے جدید سہولتوں والے علاقوں کی طرف نقل مکانی شروع ہوئی اور یہاں کم آمدنی والے رہ گئے۔ شہری انتظامیہ کی ساری توجہ نئی بستیوں کی طرف ہوئی تو بالکل نامعلوم طریقے پر بستی جرائم پیشہ افراد کا ٹھکانا بن گئی۔ تاہم بہت سے وضع دار بھی اپنی آبائی حویلیوں سے نہیں گئے۔ انہی میں ایک تفنگ چنگیزی یا توپ صاحب بھی تھے۔ دو ہزار گز پر محیط یہ دو منزلہ قدیم وضع کی حویلی اس مصروف سڑک پر تھی جو ایک طرف بندرگاہ اور دوسری طرف کلفٹن کو ملاتی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلے کیسے رہ سکتے تھے چنانچہ انہوں نے تین بیڈروم کا ایک حصہ اپنی ضرورت کے لیے الگ کرلیا تھا جو اندر تمام جدید سہولیات سے آراستہ تھا۔ یہاں ایک این جی او علاقے کی غریب خواتین کو بلا معاوضہ کپڑے سینا سکھاتی تھی، نیچے ٹریننگ اسکول تھا اور اوپر گارمنٹ فیکٹری۔ ماہر خواتین یہاں جو کپڑے سیتی تھیں وہ لوکل مارکیٹ کو سپلائی ہوتے تھے اور آمدنی سے کاریگروں کو تنخواہ دینے کے علاوہ دیکھ بھال کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ کوالٹی کی بنا پر اس چھوٹے سے رفاہی یونٹ کی گڈ ول بہت اچھی تھی۔ توپ صاحب کے نام سے نسبت کا فائدہ یہ تھا کہ کوئی لین دین میں بدنیتی نہیں کرسکتا تھا اور ادھار پر جانے والے مال کی قیمت وقت پر مل جاتی تھی۔

وسط کے بارہ فٹ بلند محرابی دروازے کی دونوں طرف اسی طرز کی تین پٹ والی محرابی کھڑکیوں کی قطار تھی جن میں رنگین شیشے ایک عہدِ رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔ کھڑکیوں کے نیچے مجھے تین گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک توپ صاحب کی قدیم سرخ فاکس ویگن جس کا رنگ روپ 1960ء کی مس یونیورس جیسا رہ گیا تھا اور جو اب چلنے سے بھی قاصر تھی لیکن توپ صاحب کو اس کی مفارقت منظور نہ تھی۔ وہ ہر روز رکشا میں سفر کرتے تھے لیکن دوسری گاڑی لانے کو جرم بے وفائی جیسا سمجھتے تھے، اس کا نام بھی اب انہوں نے 'محبوبہ' رکھ دیا تھا اور ایک بچے کو ہر روز دس روپے دیتے تھے کہ اس پر گرد نظر نہ آئے۔ میں نے بقائمی ہوش و حواس صرف دو بار اس کو چلتا ہوا دیکھا تھا اور چونکہ چلانے والے خود توپ صاحب تھے اس لیے ساتھ بیٹھا تو ہمہ وقت کلمۂ شہادت پڑھتا رہا تھا۔

اس کے پیچھے صائمہ کی ننھی منی سبک خرام صابن دانی تھی۔ اس کے خیال میں یہ پیٹرول سونگھ کے چلتی تھی اور فل ٹینک کے ساتھ چاند تک ضرور جاسکتی تھی۔ کراچی کی مرغ جیسی نشیب وفراز والی سڑکوں پر صائمہ کے ساتھ بیٹھ کر میرا سر ٹین کی چھت پر ٹن ٹن بجتا رہتا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ خاصا چپٹا ہو چکا ہے لیکن صائمہ میری اس تجویز کو ہمیشہ بائیں کان سے سن کے دائیں سے اُڑا دیتی تھی کہ چھت میں ایک روشندان میری پریشانی دور کرسکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ دہشت گردی ہوگی۔ چلتی کار کی چھت پر ایک سر رکھا ہوا دیکھ کر راہ چلتے لوگ بیہوش ہوں گے۔ اس کے بالکل پیچھے برقع اوڑھے تیسری خاصی لمبی کار میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ بعد میں غزالہ نے انکشاف کیا کہ یہ مقتول صاحب کی نئی کورولا تھی جس پر وہ کراچی آئے تھے۔ دس دن یہ گاڑی ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں کھڑی رہی تھی۔ واپسی پر غزالہ کو معلوم ہوا کہ گاڑی کسی کے نام نہیں بلکہ ابھی تک اوپن لیٹر پر ہی ہے تو اس نے بہتر سمجھا کہ ساتھ لے آئے اور خریدار کی جگہ اپنا نام لکھ دے۔ ٹرانسفر کی کارروائی تو بعد میں کسی بھی وقت مکمل کی جاسکتی ہے۔

توپ صاحب سحر خیز تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کے وہ چائے پیتے ہوئے ٹی وی پر بی بی سی کا نیوز بلیٹن سن رہے تھے۔ میں کونے میں رکھی الیکٹرک کیتل کی مدد سے اپنے لیے چائے بنا کے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ خاموشی ظاہر کرتی

تھی کہ دوسرے بیڈروم میں صائمہ اور غزالہ ابھی سو رہی ہیں۔ ''صبح صبح آنکھ کھل گئی آج؟'' میں نے کہا۔

توپ صاحب نے اپنا بارہ مسالے والا پان بناتے ہوئے سر ہلایا۔ ''پورا ایک ہفتہ یہ چاند کون سی بدلی میں روپوش تھا۔''

میں نے کہا۔ ''سب بتادیا ہوگا آپ کو بیٹی نے۔ پہلے ایک تھی۔ اب یک نہ شد دوشد۔''

''میاں شہزادے۔ بیٹی ہوتی ہے اللہ کی رحمت۔ اور رحمتوں کا شمار کیا کرنا۔ کالم کہاں ہے؟''

''بس آج قطعہ پر اکتفا کریں۔ دو دن بعد باہر نکلا ہوں تو دنیا کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے۔'' میں نے قطعدان کے سامنے رکھ دیا۔

انہوں نے پان کی گلوری بڑے اہتمام سے منہ میں رکھی اور قطعہ دیکھے بغیر دراز میں ڈال دیا۔ ''خوب سنبھالا تم نے تمام صورتِ حالات کو برخوردار۔ جینا بہت بڑی آزمائش ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ تو سب کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ دونوں بھی سخت ٹراما کی کیفیت میں ہیں ابھی تک۔ ڈاکٹر ہیں کہنے کو لیکن کسی بچی سے زیادہ خوف زدہ ہیں۔ ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی ہیں۔ رات کو ہم نے ڈانٹ ڈپٹ کے سلا دیا تھا۔ کہتی تھیں لائٹ جلتی چھوڑ دیں۔ ہم بیٹھ گئے تھے ان کے پاس۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ اپنی مسیحا بھی خود ہی ہیں مگر دوا ہم نے ضبط کرلی تھی۔ ہم نے ابھی ان کے باہر نکلنے پر مکمل پابندی عائد کردی ہے۔''

''یہ آپ نے بالکل ٹھیک کیا لیکن ایسے کب تک چل سکتا ہے۔''

''ابھی دو چار دن دیکھتے ہیں۔ واپس تو آنا ہے ان کو اسی دنیا میں۔ بڑی والی۔ ہمارا مطلب ہے صائمہ پہلے ہی اسپتال کی نوکری چھوڑ چکی تھی۔ اب غزالہ بھی واپس جانے کے موڈ میں نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے اس سے وجہ پوچھی تھی۔ آخر کیا ہوا؟''

انہوں نے مجھے سخت ملامتی نظروں سے دیکھا۔ ''واہ میاں عاشق صادق، خوب نام روشن کیا تم نے محبت کا۔ سگِ لیلیٰ کو چھینک آئے تو صحرا نورد مجنوں کو خبر ہوتی تھی اور وہ پہنچ جاتا تھا جوشاندہ لے کر۔ اور تم پوچھ رہے ہو ہم سے کہ لیلیٰ کو کیا ہوا ہے۔''

توپ صاحب نے نیچے جھک کر پیتل کا نیا چمکتا ہوا اگالدان اٹھایا اور پیک اس میں تھوک دی۔ ''اس سب کے ذمے دار تم ہو تم۔'' انہوں نے میز پر مکا مارا۔ ''غزالہ کے ساتھ جو بھی ہوا حادثہ تھا لیکن صائمہ کے ساتھ یہ سانحہ برسوں میں ہوا ہے۔ وہ ڈیپریشن کا شکار ہوتی جارہی تھی اور کیوں نہ ہو۔ اس کا کون تھا دنیا میں۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن۔ وہ اکیلے پن کے خلا میں تھی جب تم نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ تم بھی اکیلے ہی تھے نا جب میرے پاس آئے۔ ہم سب ایک دوسرے کے سہارے پر قائم سیارے ہیں۔ بظاہر اپنی اپنی مصروفیت کے مدار میں گردش کررہے ہیں۔ خدا مہربان ہوا تو مجھے لگا کہ اس نے مجھے صائمہ کے روپ میں ایک بیٹی دے دی ہے۔ ایسی بیٹی نصیب والوں کو ملتی ہے میاں شہزادے۔ ہر ویک اینڈ کے علاوہ بھی آجاتی تھی تو میرا یہ آسیب زدہ مرقد ایک گھر بن جاتا تھا۔ اب اس نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گی۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔ اسپتال چھوڑا ہے تو نرسنگ ہوسٹل کی رہائش بھی ختم۔ تو میرا دل باغ باغ ہو گیا مگر میں نے وجہ پوچھی تو پتا ہے اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ بس اب یہیں رہ کے پرائیویٹ پریکٹس کروں گی۔ باہر اپنے نام کا بورڈ لگا دوں گی تو اردگرد کے سب مریض آجائیں گے۔ میں سمجھتی ہوں آپ کو ہر وقت دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ بے وقوف لڑکی کسے بے وقوف بناتی ہے؟ مجھے۔ تغلق چنگیزی کو؟'' وہ تلخی سے ہنسے۔

''اس میں بے وقوف بنانے والی کون سی بات ہے؟''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم بھی اتنے عقل کے اندھے اور احمق ہو۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے بتاؤ میاں بزدل۔ ہمارے تمہارے گھروں میں ہر لڑکی سے ماں باپ کیا کہتے رہتے ہیں۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ تمہارا گھر ہوگا شوہر کا گھر۔ وہ ڈولی اور جنازے والی بات اب چاہے کہی نہ جاتی ہو مگر سچ تو ہے۔ صائمہ نے اتنی محبت دی تم جیسے ناقدرے کو۔ اور بدلے میں اس نے کیا مانگا تھا تم سے؟ بس ایک گھر جو اپنا ہو۔ تم نے کیا دیا اسے اپنی بکواس کے سوا؟ فضول عشقیہ فلمی ڈائیلاگ جن کی محبت میں ضرورت بس اتنی ہی ہوتی ہے جتنی سالن میں گرم مسالے کی۔''

اس موضوع پر وہ اکثر مجھے شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے تھے چنانچہ میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''توپ صاحب اپنا گھر بھی بن جائے گا لیکن۔ کبھی ٹھہری جو

شرطِ وصلِ لیلیٰ۔"

"تو کیا؟ استعفا مرا بہ حسرت و یاس۔ اور کہہ بھی کیا سکتے ہو تم۔ رونا وہی ہوگا تمہارا کہ مجھے تنخواہ تو ملتی نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ 'حقیقت ساز' چل نہیں رہا تھا۔ گھسٹ رہا تھا۔ کمائی تم نے بہت کی۔ مگر ماشاء اللہ لٹائی بھی مغل شہزادوں کی طرح۔ تم کیا جانو بیٹیاں ہوتی ہیں نصیب والی۔ اب دیکھو اخبار کس شان سے آیا ہے۔"

"میں نے دیکھا۔"

"ایجنٹ نے مارکیٹ رپورٹ بہت اچھی دی ہے لیکن برخوردار۔ اس میں میرا تمہارا کوئی کمال نہیں ہے۔ صائمہ کے صدقے میں خدا نے یہ برکت دی ہے۔ تم کہہ سکتے ہو مجھے ایک جذباتی اور خبطی بوڑھا لیکن میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔" انہوں نے تکیے کے نیچے سے چیک بک نکالی اور ایک چیک پھاڑ کے میری طرف بڑھایا۔ "یہ تمہارے اب تک کے واجبات۔ اور آئندہ تمہیں تنخواہ بھی باقاعدگی سے ملے گی گریڈ کے مطابق۔"

میں نے سوتے جاگتے کی سی کیفیت میں چیک کو دیکھا اور جیب میں رکھ لیا۔ "چلیں اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم سب کے دن پھیرے۔ اب انشاء اللہ صائمہ کے لیے گھر بھی بن ہی جائے گا۔"

"دریں چہ شک۔ اس رقم سے تو محل کھڑا ہو جائے گا۔" توپ صاحب ہنسے۔ "مگر صائمہ کی فکر چھوڑو۔ وہ یہاں خوش رہے گی۔ یہ گھر میں نے اُس کے نام کر دیا تھا بہت پہلے ہی۔"

صائمہ نے بڑا انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ اگلے ایک ہفتے میں بھی وہ اور غزالہ گھر سے نہیں نکلیں لیکن ان کا پرائیویٹ پریکٹس کا پلان ایک رفاہی اسپتال کے منصوبے میں ڈھل گیا۔ اخبار کی مصروفیت کے بعد میرا تمام تر وقت چنگیزی منزل میں گزرتا تھا۔ منصوبہ کاغذ پر آیا تو بہت کچھ بدل گیا۔ پہلے یہ طے ہوا کہ نیچے کی پوری منزل کو اسپتال بنا دیا جائے اور نصف حصے کے تربیتی مرکز کو بھی اوپر منتقل کر دیا جائے۔ فری اسپتال صرف خواتین اور بچوں کے لیے وقف ہو پھر خود توپ صاحب نے تجویز دی کہ اوپر کی منزل پر ایک حصے میں آپریشن تھیٹر بنے تو باقی میں دس بیڈ بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ اخراجات کا معاملہ اٹھا تو توپ صاحب نے کہا کہ اس کی فکر مت کرو۔ کروڑوں کی ضرورت بھی ہوگی تو آ جائیں گے۔

مسئلہ گارمنٹس فیکٹری اور اس سے وابستہ خواتین کے مستقبل کا تھا۔ یہ تجویز بھی غزالہ نے دی کہ فیکٹری کو گرد و نواح کی دوسری عمارت میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ علاقے کے پرانے زیادہ رقبہ والے مکان اب گودام بنے ہوئے تھے جو کم کرائے میں مل جاتے تھے۔ ابھی تک سب نیت ارادے اور اصولی اتفاق کی باتیں تھیں۔ ایک دن پہلا عملی قدم یہ اٹھایا گیا کہ گارمنٹس کے شعبے کی نگراں کو میٹنگ میں شریک کر کے فیصلوں سے آگاہ کیا تو وہ پریشان ہوگئی۔ کوثر پروین اسی علاقے کی تجربہ کار اور بہت پُرعزم پریکٹیکل عورت تھی جو اپنی صلاحیت کی بنا پر کسی بڑے ادارے میں زیادہ کما سکتی تھی لیکن ایک فلاحی جذبے کے ساتھ یہاں کام کر رہی تھی۔

"ایسا کرنا سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے گا۔ ہمارے کنٹریکٹ۔"

"گارمنٹس کے کام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کوثر۔ جگہ مل جائے تو اس کو ضرورت کے مطابق پہلے بنائیں گے۔ وہ اس سے بہتر اور زیادہ جگہ ہوگی۔ سب تیاری مکمل ہو جانے کے بعد دو تین دن میں شفٹنگ مکمل۔ اس کی نگرانی تم کرو گی، تیسرے دن کام شروع۔" توپ صاحب نے اسے تسلی سے سمجھایا۔

"یہاں کام کرنے والی عورتوں کے لیے زیادہ دور جانا بھی مشکل ہوگا۔"

"ہم اسی علاقے میں رہیں گے۔ آج پراپرٹی ڈیلرز کو بتا دیں گے۔ تم بھی دیکھو۔ اخراجات کی فکر مت کرو۔" توپ صاحب نے کہا۔

توپ صاحب ناشتے کے بعد چلے جاتے۔ کوثر نے کھانے پکانے اور گھر کے سارے کام کرنے کے لیے ایک ماسی فراہم کر دی تھی۔ میں نصف شب کو آخری کاپی کے پریس میں جانے کے بعد توپ صاحب کے ساتھ لوٹ کر آتا تو کھانا تیار ملتا تھا۔ پہلے ہم دفتر میں ہی کچھ منگوا کے پیٹ بھر لیتے تھے لیکن اب ان کی دو بیٹیوں نے توپ صاحب کے کھانے پینے کی حدود متعین کر دی تھیں۔ ہیلتھ فوڈ کی پابندیوں کی زد میں بزدل کیسے نہ آتا لیکن زندگی میں پہلی بار یہ اچھا لگا تھا کہ کسی کو میری صحت کی فکر مجھ سے زیادہ ہے۔ اکثر میں انہی کے کمرے میں صوفے پر پڑ کے سو جاتا۔ ابھی کورٹ کا کوئی کیس نہیں تھا تو دوپہر کے بعد تک میں پروجیکٹ کی پلاننگ میں شریک رہتا۔ ایک ہفتے بعد میں نے

لنچ سے پہلے بغاوت کر دی۔

''میں ابھی ذرا بھی بیمار نہیں ہوں لیکن آج لنچ میں وہ اسپتال کے مریضوں کو دیا جانے والا کھانا کھایا تو ہلاک ہو جاؤں گا۔''

''ہم آئی سی یو میں بھی جان بچا لیتے ہیں۔'' غزالہ بہت عرصے بعد پہلے کی طرح ہنسی۔

''دیکھو تم عادی ہو۔ ہوسٹل میں یہی گھاس پھوس کھانے کی۔ مسلسل ویجیٹیرین کھانے سے میرا اسلام خطرے میں پڑ گیا ہے۔''

''جیجا جی۔ اب تو ساری عمر پالتو کا پٹا ڈال کے رہنا سیکھ لو۔''

''جیجا جی۔ بہت اچھا لگا تمہارے منہ سے یہ سن کے۔ آج سے تمہاری پروموشن سالی کے عہدے پر اور اس خوشی میں لنچ کی آفر بھی تمہاری طرف سے...... چلو......''

ظاہری بے نیازی سے کام میں مصروف صائمہ نے فائل ایک طرف طرف رکھ دی۔ ''چلو یار۔ زندگی واقعی سخت بور چل رہی ہے کب سے۔'' اس نے غزالہ کی طرف دیکھا۔

''چلو۔ مگر مجھے ڈر لگتا ہے صائمہ۔'' غزالہ بولی۔

''پاگل۔ کیا اپنی باقی زندگی اسی ڈر کے عذاب میں گزارو گی۔ چلو کپڑے بدل کے کچھ فیشن کریں یار۔ اٹھو۔''

پونا گھنٹا میں اشتیاق میں مضطرب رہا۔ آج پھر حسنِ دلارا کی وہی دھج ہوگی۔ فیض نے میرے کان میں کہا۔ اور جب وہ دونوں برق سامانی کے پرانے انداز میں نمودار ہوئیں تو مجھے لگا جیسے سیاہ بادل چھٹنے سے آسمان پر قوسِ قزح کے سارے رنگ نکھر آئے ہیں۔ صائمہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا جب باہر آ کے اس نے کہا۔ ''ہم تمہاری گاڑی میں جائیں گے۔''

غزالہ کا رنگ اُڑ گیا۔ ''وہ...... ابھی میرے نام کہاں ہوئی ہے۔''

''کسی نے پوچھا تو جواب ہم دیں گے، چلو۔'' اس نے چابی بڑھائی۔

غزالہ نے چابی لے لی۔ میں گاڑی کا کور اتار چکا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہم اس ہوٹل میں نہیں گئے جو غزالہ کے لیے آسیب زدہ تھا۔ ہم نے دوسرے پرانے ٹھکانے کا انتخاب کیا۔ ہم تینوں کو دیکھا تو کاؤنٹر پر کھڑا منیجر دوڑا دوڑا آیا۔ ''خوش آمدید سر۔ بہت عرصہ بعد آنا ہوا۔'' وہ ہمیں پرانے گوشۂ عافیت میں لے گیا۔ ایک اُن کے عہد کے تحت ہم نے گزر جانے والے اچھے بُرے وقت کی کوئی بات نہیں کی۔ غزالہ ذرا سی دیر میں وہی پرانی شوخ غزالہ بن گئی جو مجھے بلیک میل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی لیکن اب اس کے اعتماد کا گراف آسمان کو چھو رہا تھا۔ ایک دورِ ابتلا کے صلے میں قدرت نے اس کو دولت مند کر دیا تھا۔ صائمہ نے کھانے کے دوران بھی اپنے فلاحی منصوبے کا ذکر جاری رکھا جس میں ہماری بھی برابر کی شراکت ہو گئی تھی۔

''یہ کام پارٹ ٹائم نہیں چلے گا بزدل صاحب۔'' صائمہ نے کھانے کے بعد کہا۔

''اگر آپ چاہتی ہیں کہ بندہ صحافت اور وکالت چھوڑ کے آپ کے اسپتال میں کمپاؤنڈر ہو جائے۔'' میں نے ہاتھ جوڑے۔

''فضول باتیں ابھی منع ہیں۔'' صائمہ ہنسی۔ ''دیکھو اس پروجیکٹ کے لیے ایک فل ٹائم نگراں چاہیے۔ گارمنٹس فیکٹری کے لیے جگہ مل جانے کے بعد شفٹ کرنے سے پہلے جگہ کو ضرورت کے مطابق بنانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ دوسرے مرحلے میں اسپتال بنانا زیادہ مشکل کام ہے۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ کیا چاہیے لیکن میڈیکل سپلائی میں ایک سو ایک چیزیں ہیں۔ معمولی سرنج سے آپریشن تھیٹر کی ضروریات تک۔ اور یہ کام کسی اسپتال کے انتظامی شعبے کا تجربہ رکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔''

''حق ہے پیر و مرشد۔ آپ کی نظر میں ایسا کون ہے؟''

''ہم اشتہار دیں گے اسٹاف کے لیے۔'' غزالہ نے کہا۔

صائمہ کا سر نفی میں ہلنے لگا اور ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''یار بندہ ہے اور ہمارے مطلب کا ہے۔ کیوں نا تم اس شہزادۂ گلفام پر ڈورے ڈالو۔ دلیر خان پر۔ یوں آئے گا سر کے بل یوں۔'' صائمہ نے چٹکی بجائی۔

غزالہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''تاڑا تو کچ بندے کو ہے بہنا۔ مگر پکی سرکاری نوکری ہے اُس کی۔''

''وہ ہے بڑا جوشیلا اور کام کرتے بھی اسے پانچ چھ سال تو ہو گئے۔ سرکاری نوکری کرتا ہے مجبوری میں۔ تنخواہ ہم اتنی ہی دیں گے تو وہ سب چھوڑ چھاڑ آئے گا۔ شرط لگا لو۔ ڈاکٹر بھی ہے لیکن پھنسا ہوا تھا ایڈمنسٹریشن میں۔ اب منہ

مت کھلوا میرا۔ تو کہے گی تو وہ تنخواہ کے بغیر بھی کام کرے گا۔"

غزالہ نے ہنس کر صائمہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "چل ٹھیک ہے۔ میں دانہ ڈالتی ہوں اُسے۔ ہاں۔ دونوں مل بیٹھیں گے اپنا اپنا دکھڑا لے کر۔ ایک بزدل دوسرا دلیر۔"

"اسپتال کا کوئی نام بھی ہونا چاہیے۔ یہ کسی کو خیال نہیں۔" میں نے کہا۔

"سوچا ہے میں نے۔ سی ایم ایچ۔" صائمہ بولی۔

"کیسا ہے۔ چنگیزی میموریل ہاسپٹل۔"

"چلے گا۔ ایک دم چلے گا۔" میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ بندہ بھی اب چلے گا ورنہ توپ صاحب مجھے فائر کر دیں گے۔"

"فی امان اللہ۔ ان کو مت بتانا ہماری بدپرہیزی کا ورنہ وہ اپنا پرہیز چھوڑ دیں گے۔" صائمہ ہنسی۔

ایک رفاہی اسپتال کا قیام تصوراتی حد تک بڑا دل خوش کن تھا لیکن عملی طور پر یہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ صائمہ کا دلیر خان کو منتخب کرنا بڑا دانشمندی کا فیصلہ تھا۔ میرا کبھی اس سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن غائبانہ تعارف تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انتظامی امور میں اس کی اوپر والوں سے نہیں بنتی تھی کیونکہ وہ ایک روایتی قسم کا اڑیل پٹھان تھا جس کو ایمانداری اور فرض شناسی کا مرض لاحق تھا چنانچہ وہ نہ کھاؤں گا نہ کھانے دوں گا کی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا تھا۔ چھ فٹ کے گورے چٹے پٹھان پر تمام فیمیل اسٹاف کی نظر کیسے نہ ہوتی لیکن صائمہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غزالہ میں دلچسپی ضرور رکھتا تھا۔ غزالہ اس سے سخت چڑتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک وہ خر دماغ اور بدذوق تھا۔ اسے کپڑے پہننے کی تمیز تھی نہ لڑکیوں سے بات کرنے کی۔ روڈ سائڈ کے چارپائی ہوٹلوں پر بیٹھ کے چپلی کباب یا کڑاہی کھاتا تھا تو ٹرک ڈرائیوروں کے قبیلے کا فرد لگتا تھا۔ میز بجا کے پشتو ٹپے گاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

غزالہ کے فون کرنے کے دو دن بعد وہ استعفا دے کر آ گیا۔ غزالہ سے اس کی چخ چخ جاری رہی لیکن اس نے انتظامی امور سنبھالے تو دیکھتے دیکھتے ایک منصوبہ خیال سے حقیقت بن گیا۔ دو ہفتے میں گارمنٹس فیکٹری کچھ پیچھے منتقل ہوگئی۔ یہ ایک ہینڈلوم فیکٹری تھی۔ مالک نے خسارہ اٹھا کے اسے ایک پولٹری فارم والے کو فروخت کیا۔ وہ ناتجربہ کاری اور کچھ برڈ فلو سے دیوالیا ہوا اور لون کی ادائیگی نہ کر سکا۔ لون کی رقم زیادہ نہیں تھی۔ بینک نے اسے اپنی تحویل میں لینے کی کارروائی کا آغاز ہی کیا تھا کہ دلیر خان نے مالک سے سودا کیا اور بینک کے واجبات کلیئر کرنے کے بعد جگہ کرائے پر حاصل کر لی۔ جگہ بہت تھی لیکن ناجائز تعمیرات میں گھر گئی تھی تو ٹرک اندر نہیں جا سکتے تھے لیکن سوزوکی پک اَپ یا کاروں کے لیے راستہ تھا۔ دلیر خان نے قبضہ ملتے ہی کوثر پروین کے ساتھ مل کر کام شروع کیا تو ایک ہفتے میں اس جگہ کا نقشہ بدل گیا جو کسی کھنڈر کی طرح آسیب زدہ نظر آتی تھی۔

کام کی رفتار اس وقت ایک دم بڑھی جب توپ صاحب نے اس رفاہی اسپتال کے بارے میں چوتھائی صفحے کا اشتہار اور میرا کالم لگایا۔ اس میں عطیات نہیں مانگے گئے تھے لیکن بینک اکاؤنٹ کا حوالہ تھا۔ بالکل نامعلوم طریقے پر گمنام لوگوں نے سو روپے سے ایک لاکھ تک کی چھوٹی بڑی رقوم جمع کرائیں تو مجھے توپ صاحب کی نیک نامی اور شہرت کا اندازہ ہوا۔ پھر ان کے فون آنے لگے جو سامان عطیہ کرنا چاہتے تھے۔ اسپتال میں تیس بیڈز کی گنجائش تھی۔ ایک اسٹیل فرنیچر بنانے والے نے بیڈز کی پیشکش کی ایک ہفتے بعد دوسرا آفس فرنیچر والا آ گیا۔ پھر بستر چادر تکیے مل گئے۔ یہ ایسا دور تھا جس میں کسی کو کھانے پینے سونے جاگنے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ میں آدھی رات کو توپ صاحب کے ساتھ ہی آتا تھا اب تیسرا بیڈ روم ہی میری مستقل رہائش بنا ہوا تھا۔ اکثر دیر ہو جاتی تو دلیر خان بھی وہیں سو جاتا۔ اس کی رہائش بہت دور تھی جہاں اس کے دو بھائی اپنی فیملی اور ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے۔ غزالہ اور صائمہ کے ساتھ باتوں میں وقت کا خیال ہی نہ آتا۔ ذہنی اور جسمانی تھکن سے سب کا حال خراب تھا۔ صرف توپ صاحب تھے جو اپنے استھان پر بیٹھے دیوتا کی طرح سکون سے سب دیکھتے رہتے.....اور مسکراتے رہتے تھے۔

آہستہ آہستہ ایک مہینہ میں بالکل نامعلوم طریقے پر صائمہ کے خواب نے حقیقت کا روپ دھارا۔ کسی شاندار افتتاحی تقریب کے بغیر ایک صبح چنگیزی میموریل اسپتال کے دروازے ضرورت مندوں کے لیے کھول دیے گئے۔ آپریشن تھیٹر کے قیام کو جگہ اور مالی وسائل کی کمی کے باعث ملتوی کرنا پڑا تھا۔ چند دن میں زندگی ایک نئے معمول پر آ گئی جس میں میرا کام سب سے کم تھا۔ دلیر خان اب صبح ٹھیک نو بجے آ کے ایڈمنسٹریٹر کے آفس میں بیٹھ جاتا تھا جو

صرف ایک میز کرسی پر مشتمل تھا اور شام چھ بجے تک موجود رہتا تھا جب اسپتال بند ہوتا تھا۔ دونوں ڈاکٹرز کی ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کی تھی ان کی مدد کے لیے دلیر خان نے دو نرسوں کا تقرر بھی کر دیا تھا جو مڈ وائف بھی تھیں۔ ان میں سے ایک شام آٹھ بجے سے صبح آٹھ تک ڈیوٹی دیتی تھی لیکن صائمہ اور غزالہ کے سونے جاگنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ اکثر انہیں رات کو کسی بیڈ کے مریض کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اتوار کو بھی ان کی فرصت آدھی ادھوری ہوتی تھی۔ سرکاری اسپتال میں نوکری کی عیاشی خواب فردا ہو گئی تھی۔ دلیر خان کے لیے غزالہ کی بے رخی کے رویّے میں واضح تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ لڑتے بہت تھے لیکن ہر لڑائی ان کی قربت میں کیسے اضافہ کر رہی تھی، یہ دیکھ کر مجھے اور صائمہ کو خوشی بھی ہوتی تھی اور دکھ بھی ہوتا تھا۔ کاش پاگل لڑکی یہ پہلے ہی سمجھ لیتی تو اتنی خرابی کیوں ہوتی۔

توپ صاحب سے میری گزشتہ شب ہونے والی گفتگو انتہائی غیر متوقع تھی۔ میں اور وہ آخری کاپی جانے کے بعد چائے کی سکون بخش پیالی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ انہوں نے اچانک کہا۔ "میاں مدیر۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تم کو اپنے گھر داماد کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز کر دیا جائے۔"

چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

"جی؟"

"ہاں۔ یہ تو طے ہے کہ اس چار دن کی زندگی میں سے دو تم آرزو میں گزار چکے۔ باقی دو انتظار میں گزرے تو الزام ہم پر بھی آئے گا۔"

"میں کند ذہن آپ کی بات سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"دیکھو یہ تو اب طے ہے کہ تم اس حیات مستعار میں اپنا گھر نہیں بنا سکو گے۔ جو صائمہ کی خواہش یا ضد تھی۔ تو ہم نے اس عزیزہ کو قائل کیا کہ تمہیں بیاہ کر لے آئیں چنگیزی ہاؤس میں۔"

"آپ کا یہ فیصلہ مجھے منظور نہیں۔"

"تم سے منظوری مانگی کس کم بخت نے ہے۔ اب چلو۔" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

مجھے ایک احساسِ ذلت و شکست نے رات دیر تک بیدار رکھا۔ ایک جذباتی اور عقلی کشمکش میرا آزار بنی ہوئی تھی۔ مطلب بہت واضح تھا۔ صائمہ کو اب تمہارے گھر کی ضرورت نہیں، وہ چنگیزی منزل کی مالک ہے۔ بس شادی کرو اور اس کے گھر میں رہو۔ ایک طرف یہ میری روایتی مردانہ غیرت کے منہ پر طمانچہ تھا تو دوسری طرف میری محبت کی رسوائی تھی کہ پتھر کے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر فرہاد لانا تو دور کی بات ہے، میں اس کے لیے دو کمروں کا فلیٹ نہیں خرید سکا تھا۔ پھر عقل کہتی تھی کہ یہ سب فرسودہ معاشرتی تصورات ہیں۔ محبت ان سے ماورا ہے اور اب صائمہ میری ہو سکتی ہے تو اس جاہلانہ غیرت مندی میں کیا رکھا ہے۔

کسی نے فلیٹ کی کال بیل بجائی تو میں دروازے تک گیا۔ وہاں ایک سیلز مین ٹائپ خوش پوش اسمارٹ نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا جس کے ہاتھ میں بریف کیس بھی تھا۔

"میں اسماعیل یوسف ہوں بدیع الزماں صاحب۔" اس نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"آئیے۔ لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" میں نے اسے اندر آنے کے بعد میلے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیسے پہچانیں گے جب پہلے ہم ملے ہی نہیں۔ بیٹھیے میں بتاتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آپ مجھے پانچ منٹ دیں۔ میں منہ دھولوں اور چائے لے آؤں۔ اتنی دیر آپ یہ اخبار دیکھیں۔"

پانچ کے بجائے میں پندرہ منٹ میں اپنا ناشتا بھی بنا کر لے آیا۔ "اب فرمائیے۔" میں نے کہا۔

"شاید آپ کو میرے والد یوسف یاد ہوں۔"

میں نے ذہن پر زور دیا۔ "یوسف تو بہت عام سا نام ہے۔ وہ کیا کرتے تھے؟"

"وہ ڈاکے ڈالتے تھے۔" اس نے سکون سے چائے کی چسکی لی۔

میں بھونچکا رہ گیا، اپنے باپ کے بارے میں بیٹا یہ بات بڑے فخریہ انداز میں بتا رہا تھا۔

"میں سب بتاتا ہوں۔ وہ اپنے نام سے زیادہ بہرام ٹو کے نام سے مشہور تھے۔ اب ضرور آپ کو یاد آ جائے گا۔"

"ہاں۔ ان کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی تھی۔ پھر میں نے اپیل کی تو سزا نصف ہو گئی تھی۔"

"جی۔ وہ عمر قید کاٹ کے نکلے تو بالکل بدل چکے تھے۔ جیل میں وہ نماز پڑھاتے تھے اور درس بھی دینے لگے

تھے۔ وہ اپنی فیملی کو اپنے نام کی بدنامی سے بہت دور رکھتے تھے۔ ہماری ماں ایک اسکول ٹیچر تھیں اور انہوں نے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ ہم نے اپنے ننھیال میں کسی کی صورت نہیں دیکھی۔ رہائی کے بعد ابا عمرے پر گئے اور معلوم نہیں کیسے لوٹ کے نہیں آئے۔ یہ پتا چلا تھا کہ وہ وہیں بھیک مانگتے تھے اور مفلوج تھے۔ ان کی طرف سے فیملی کو کافی رقم ہر ماہ مل جاتی تھی۔ وہ پہلے بھی ہم پر تعلیم کے معاملے میں بہت سختی کرتے تھے۔ ہم دو بھائی تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہم ڈاکٹر بنیں مگر ڈاکٹر ایک بنا۔ میں انجینئر بن گیا لیکن اس میں سارا کمال ہماری ماں کا ہے جس نے شوہر کے لیے زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ ابا کا تو پتا نہیں لیکن ماں کا انتقال دو ماہ قبل ہوا ہے۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ اب ہم کسی قابل ہیں تو ہم آپ سے مل کر اپنے باپ کا قرض ضرور ادا کریں۔"

خاموشی کا ایک مختصر جذبات سے بوجھل وقفہ آیا۔ پھر میں نے کہا۔ "مجھے ایسا کوئی قرض یاد نہیں۔"

"لیکن ماں کو یاد تھا۔" وہ بولا اور بریف کیس کھول کے ایک فائل نکالی۔ "میرا یہ پہلا پراجیکٹ ہے۔ اس میں صرف تیس فلیٹ بنائے ہیں۔ گلستان جوہر میں فرسٹ فلور پر تین بیڈ والے چاروں کارنر فلیٹ ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کا ہے۔ یہ ویسٹ اوپن ہے۔"

میں دم بخود اس نقشے کو دیکھتا رہا اور ایک ڈاکو کے بیٹے کی آواز سنتا رہا جس کا باپ شاید آج بھی حرم کعبہ کے آس پاس کہیں اپنے مفلوج وجود کو گھسیٹ رہا ہوگا اور سب کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہوگا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہوں۔ میں ہوں بہرام ٹو جس کے نام کی دہشت سے ایک جہاں لرزہ براندام تھا۔

"یہاں دستخط کر دیں۔ جی۔ اور یہاں۔ ایک اس جگہ پلیز۔ تھینک یو۔ اب یہ فلیٹ آپ کے نام ٹرانسفر ہو چکا۔ آپ جب چاہیں وہاں منتقل ہو سکتے ہیں۔ یہ فائل رکھیں۔ اس پر میرا فون نمبر ہے۔ کوئی پرابلم ہو گی نہیں۔ ہو تو میں حاضر ہوں۔ اب مجھے اجازت دیں۔"

"آہا دیکھیے ناظرین! یہ چنگیزی میموریل اسپتال کے سامنے تو کسی کی برات ہے۔ گولڈن بابو بینڈ کی موسیقی آپ سن سکتے ہیں جو ایک مشہور فلمی گانے کی دھن بجا رہا ہے۔ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔ محبت کا جنازہ جا رہا ہے۔ اوہو، اس گھوڑے پر سہرا باندھے ہمارا ہیرو سوار ہے۔ آگے جو ناچ رہے ہیں، یہ اس کے یار ہیں۔ استاد شرفو۔ فیکا اور چانو۔ اور ان کے پیچھے گھوڑے کی لگام تھامے دولھا کے برادر نسبتی ایس پی رحم دل خان ہیں۔ دولھا کے پیچھے آپ بہت سے کالے کوٹ والوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ معززین میں شہر کے جانے پہچانے صحافی ہیں۔ اس برات میں کچھ غیر معروف چہرے بھی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ پیرول پر جیل سے رہا ہو کر آئے ہیں۔ سڑک پر لگائے ہوئے شامیانے کے مقابل آپ کو جو نئی لگژری کار پھولوں سے سجی نظر آ رہی ہے، وہ انہی کی طرف سے دلہن چنگیزی میموریل ہاسپٹل کی ڈاکٹر صائمہ کو جہیز میں دی گئی ہے۔ اس کو خود ہی چلا کے وہ اپنے نئے گھر واقع بہرام اسکوائر جائیں گی۔ اور ان بزرگ کو بھلا کون نہیں جانتا جو دولھا کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہ دادائے صحافت حضرت تفنگ چنگیزی ہیں جو توپ صاحب کے نام سے معروف ہیں۔ اُف۔ یہ کیسا قیامت خیز دھماکا تھا۔ اچھا تو یہ مشہور عالم پٹاخا ریوڑی والے پہلوان کی حرکت تھی؟ گھوڑا بدک کے بھاگا ہے لیکن ہمارے ہیرو کو سہرے سمیت فرش پر چت ہونے سے پہلے جس باریش ہستی نے کیچ کیا، وہ شہرۂ آفاق دہی بھلے والے صوفی ہیں۔ اللہ اللہ۔ کیسے نامور اس تقریب میں شریک ہیں۔ دیکھیے دیکھیے کس طرح دولھا کا راستہ روکا گیا ہے۔ دو تلواروں کے ساتھ روایتی لباس میں خٹک ڈانس کرنے والے اور کوئی نہیں اپنے ڈاکٹر دلیر خان ہیں۔ مبینہ طور پر یہ ہمارے ہیرو بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی کے برادر نسبتی ہیں۔

آئیے اب ہم آپ کو اسٹیج کی طرف لے چلتے ہیں جہاں نکاح خواں ہیں مولانا شریفی مرحوم کے صاحبزادے۔ لیجیے نکاح کی تقریب ختم ہوئی۔ آج مہمانوں کی صرف کولڈ ڈرنک یا چائے سے تواضع کی جائے گی۔ دعوت طعام کی رقم اسپتال کے فنڈ میں جمع کرا دی گئی ہے۔ لیجیے ناظرین رخصتی کی گھڑی آ گئی۔ دلہن اب نئی کار میں بیٹھ گئی ہیں۔ ہمارے سرنگوں ہیرو بزدل صاحب ان کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ کار روانہ ہوئی۔ دلہن کی سسٹر ڈاکٹر غزالہ کو زار و قطار روتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ دادائے صحافت توپ چنگیزی اس کو تسلی دے رہے ہیں۔ کار نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔

ہم اس دعا کے ساتھ اجازت لیں گے کہ جیسے خدا نے بان کے دن پھیرے سب کے پھیرے۔

❖❖❖

**تیسرا رنگ**

**نجمہ مودی** عرصہ دراز سے جاسوسی ادارے سے وابستہ ہیں... بیشتر قارئین جانتے ہی ہوں گے کہ نجمہ مودی ہمارے دیرینہ ساتھی قلم کار محمود احمد مودی کی "نصف بہتر" ہیں۔ اگر ان کی تحریر میں میاں جی کا رنگ جھلکتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں... نزاکت، نفاست پسندی کے ساتھ ان کے کرداروں میں مضبوطی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے... قارئین ان کی تحریروں کو حد درجہ پسند کرتے ہیں... اس میں نمایاں کردار ان کے قلم کی سادگی ادا کرتی ہے... جو پڑھنے والوں کو چند لمحوں میں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے...

# شکستِ آرزو

برسوں پر محیط مصروف زندگی کا ہر لمحہ نہایت تکلیف دہ اور ویران ہوتا ہے... بے کیفی... اور شدت سے محسوس ہونے والی تنہائی میں اس کی آمد کسی بہار کے مانند تھی مگر یہ خوب صورت... پُرکیف اور دلکش رفاقت کی مدت نہایت مختصر ثابت ہوئی... زندگی کا طویل عرصہ چمکتی دمکتی روشنیوں کی دنیا کے سنگ گزار دینے والے ایک محبت گزیدہ کی آپ بیتی... اس کے شب و روز میں اندھیروں کے سوا کچھ نہ تھا...

*گولڈن جوبلی کے شمارے کے لیے لکھی گئی ایک دل گداز تحریر......*

بہت سے لوگ اب بھی ٹھنڈی سانس لے کر اس زمانے کو یاد کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، وہ وقت بہت اچھا تھا۔ ملک میں ایک ہی ٹی وی چینل تھا...... اور وہ بھی سرکاری۔ شام کو تلاوتِ کلام پاک سے نشریات شروع ہوتیں اور آدھی رات سے پہلے قومی ترانے پر ان کا اختتام ہو جاتا۔ ابتدا میں بہت ہی کم گھروں میں ٹی وی سیٹ تھے اور جن گھروں میں تھے، ان کے مکین اس بات سے بدمزہ نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی ناک بھوں چڑھاتے تھے کہ جونہی ٹی وی کی نشریات شروع ہونے لگتی تھیں، پاس پڑوس کی بہت سی خواتین اور بچے، کچھ شرماتے اور کچھ باچھیں کھلاتے ان کے ڈرائنگ روم یا بیٹھک میں آ بیٹھتے۔ ایک ہجوم کی شکل میں اہلِ خانہ اور بہت سے پڑوسی مل کر ٹی وی کی نشریات سے محظوظ ہوتے۔ ڈرامے اور کامیڈی شوز کے دوران تو بعض مناظر پر باقاعدہ تالیاں بجا کر داد بھی دی جاتی۔ کسی کو خیال تک نہ آتا کہ ان کی یہ داد فنکاروں تک نہیں پہنچ رہی۔

اس زمانے کی یادوں کے بہت دھندلے، دھندلے نقوش میرے ذہن میں موجود ہیں۔ میں اس وقت بہت ہی چھوٹا تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے طرزِ معاشرت کو کسی حد تک سمجھنے کے قابل ہوا، اس وقت تک تقریباً ہر گھر میں ٹی وی آچکا تھا اور ایک عام سی چیز بن چکا تھا۔ اس کی حیثیت ایک عجوبے کی سی نہیں رہی تھی۔ البتہ لوگ مجھے ضرور کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ حیرت انگیز طور پر مجھے ٹی وی سے کچھ ایسی دلچسپی نہیں تھی، جیسی عام طور پر میری عمر کے لڑکوں کو ہوتی تھی۔

انسان کو اپنے مقدر کا، اپنے مستقبل کا پتا نہیں ہوتا۔ مجھ جیسے انسان کو، جسے ٹی وی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ آگے چل کر مجھے ٹی وی پروڈیوسر بننا ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد مجھے بھی ایک طویل عرصہ اسی طرح گزارنا پڑا جس طرح اس ملک میں لاکھوں نوجوانوں کو سالوں تک گزارنا پڑتا ہے۔ یعنی نوکری کی تلاش میں دھکے کھاتے ہوئے۔ کراچی کی تقریباً تمام قابلِ ذکر سڑکوں پر میں نے جوتیاں چٹخائیں اور نہ جانے کتنے دفتروں میں نہایت عاجزی و انکساری سے حاضری دی لیکن کہیں دال نہ گلی...... میرا مطلب ہے، کہیں نوکری نہ ملی۔

اس دوران میری بڑی بہن کی شادی ہوگئی اور میرے بے روزگار ہونے کے باوجود والدین نے میری بھی شادی کردی۔ ان کے دیگر بے شمار احسانات کی طرح یہ بھی ان کا مجھ پر ایک بہت بڑا احسان تھا۔ میری نالائقی کو دیکھتے ہوئے شاید لاشعوری طور پر انہیں احساس ہوگیا تھا کہ اگر وہ یہ کام کیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو میری بہن بھی گھر بیٹھی رہ جائے گی اور میں خود اپنے لیے بھی کچھ نہیں کرسکوں گا۔ ہم دو بہن بھائی ہی ان کی کل اولاد تھے۔ ہماری شادیاں کرنے کے بعد وہ دو سال کے اندر اندر یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وہ گویا ہماری شادیوں کے ''فرض سے سبکدوش'' ہونے کا ہی انتظار کررہے تھے۔

مجھے اس دوران دو تین چھوٹی موٹی ملازمتیں ملیں لیکن وہ پائیدار ثابت نہیں ہوئیں۔ غنیمت یہ تھا کہ والدین ورثے میں مکان اور بینک میں تھوڑی بہت رقم چھوڑ گئے تھے۔ یوں مجھے کچھ زیادہ بُرے حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سفید پوشی کا بھرم قائم رہا۔ کچھ عرصے بعد تو حالات بہتری کی طرف جاتے دکھائی دینے لگے۔ ان دنوں ملک میں پہلا پرائیویٹ ٹی وی چینل شروع ہوا تھا اور تیزی سے مقبولیت حاصل کرتا جارہا تھا۔ میرے ایک سسرالی عزیز کی اس چینل کے مالک کے کسی قریبی دوست سے اچھی سلام دعا تھی۔ انہوں نے اس شناسائی کو استعمال کرتے ہوئے، خاصی کوشش کے بعد مجھے اس چینل میں ''گھسا'' ہی دیا۔

کاغذات میں تو مجھے ''جونیئر اسسٹنٹ پروڈیوسر'' کا درجہ دیا گیا تھا لیکن ظاہر ہے، مجھے ٹی وی پروڈکشن کی ابجد کا بھی پتا نہیں تھا، اس لیے عملی طور پر میری حیثیت ایک زیرِتربیت کارکن یا اپرنٹس ہی کی تھی اور میری تنخواہ بھی کوئی

خاص نہیں تھی لیکن میں بہت خوش تھا کیونکہ یہ میرے لیے ایک نئی، دلچسپ اور رنگین دنیا تھی۔ یوں تو ملک میں برسوں سے رنگین ٹی وی بھی عام ہو چکے تھے۔ لیکن مجھے پتا چلا کہ اصل رنگینی تو ٹی وی کی اسکرین پر نہیں بلکہ اسکرین کے پیچھے تھی۔

مجھے جن صاحب کے ساتھ نتھی کیا گیا، وہ سینئر پروڈیوسر تھے، سرکاری ٹی وی سے ریٹائر ہو کر آئے تھے۔ انہیں ریٹائر ہوئے بھی کئی سال گزر چکے تھے۔ خاصے عمر رسیدہ تھے۔ چڑچڑے اور بدمزاج بھی تھے۔ خاص طور پر ان کی ماتحتی میں جو لوگ کام کرتے تھے، ان کے ساتھ تو ان کا رویہ تقریباً ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کسی گیرج کے مالک اور مستری کا ان لڑکوں کے ساتھ ہوتا ہے جنہیں ''چھوٹے'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تاہم اس وقت وہ خاصے خوش مزاج اور بذلہ سنج نظر آتے تھے جب اپنے ڈرامے یا کسی شو میں کام کرنے والی خواتین کے جھرمٹ میں ہوتے تھے۔ تاہم اس وقت بھی اگر مجھ جیسا کوئی ''چھوٹا'' ان کے پاس پھٹکنے کی حماقت کر لیتا تو وہ خواہ مخواہ کی کوئی بات نکال کر اس کی طبیعت صاف کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

ان کا خیال غالباً یہی تھا کہ خواتین ان کے رعب داب کے اس مظاہرے سے بہت متاثر ہوتی ہیں۔ وہ خواتین بھی چونکہ عموماً اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال ہوتی تھیں، اس لیے وہ نہایت کامیابی سے تاثر دیتی تھیں کہ وہ واقعی پروڈیوسر صاحب کے غصے اور رعب سے خود بھی لرز کر رہ گئی ہیں گو کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ دوسروں کے ساتھ کر رہے ہوتے۔ اتفاق سے میں ان خواتین کو پروڈیوسر صاحب کی غیر موجودگی میں بھی ان کے بارے میں اظہار خیال کرتے سُن چکا تھا۔ اگر میں ان خیالات سے پروڈیوسر صاحب کو آگاہ کر دیتا تو یقیناً انہیں کافی صدمہ ہوتا لیکن میں نے ایسی حماقت نہیں کی۔ اس وقت تک میں اِدھر اُدھر کافی دھکے کھا کر زندگی کے چند سنہرے اصول تو سیکھ ہی چکا تھا، جن میں سے ایک یہ تھا کہ انسان کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔

کافی عرصے تک میں نہایت مستقل مزاجی سے اپنے باس، پروڈیوسر رئیس رازی صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا۔ میں نے کبھی ذرا سے بھی ناگوار ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جب بھی مجھے جھاڑ پڑتی، میں پہلے سے زیادہ سعادت مندی سے ان کی خدمت میں جُت جاتا، بھاگ بھاگ کر ان کے احکام کی تعمیل کرتا اور پہلے سے زیادہ مؤدب و مستعد نظر آنے لگتا۔ اس کے علاوہ موقع محل دیکھ کر میں نے ہلکی پھلکی خوشامد کا گر بھی آزمانا شروع کیا جو کارگر ثابت ہوا اور اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

ویسے تو خوشامد ہمارے ملک میں زمانۂ قدیم سے ایک تیر بہ ہدف نسخہ چلا آ رہا ہے۔ اَن گنت لوگ اس فن میں یدِطولیٰ حاصل کر کے اور اپنی بے حساب کامیابیوں کی لافانی داستانیں رقم کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور باقی اس وقت بھی ہر جگہ، ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے میں مصروف ہیں۔ چپراسی سے لے کر سربراہ مملکت تک پر یہ نسخہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ مجھ پر صحیح معنوں میں یہ راز شوبز کی دنیا میں آ کر منکشف ہوا۔ یعنی مجھے کامیابی کا نسخہ جاننے میں تھوڑی سی دیر ہو گئی لیکن خیر...... کوئی بات نہیں، دیر آید درست آید۔

تاہم اس نسخے کو استعمال کرنے کے لیے خصوصی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر جگہ، آنکھیں بند کر کے، اندھا دھند اس نسخے کا استعمال شروع نہیں کر دینا چاہیے۔ بعض اوقات فائدے کے بجائے نقصان بھی ہو جاتا ہے لیکن بہرحال آدمی کوشش میں لگا رہے تو اس نسخے کے استعمال کا طریقہ آ ہی جاتا ہے۔ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ سامنے والا کس مزاج اور کس قماش کا آدمی ہے اور اس کے لیے نسخے کے اجزائے ترکیبی کا کیا حساب کتاب رکھنا ہوگا۔

رئیس رازی صاحب آسان آدمی نہیں تھے۔ ''گرگ باراں دیدہ'' قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ سرکاری نوکری کے زمانے میں بہت کچھ دیکھ چکے تھے، بہت کچھ سمجھ چکے تھے لیکن انسان بہرحال انسان ہے، بشری کمزوریاں اس کے ساتھ چلتی ہیں، رفتہ رفتہ مجھے ان کی نبض دیکھنی آ گئی اور دھیرے دھیرے ان کا رویہ میرے ساتھ بہتر ہوتا گیا۔ انہوں نے مجھے کام سکھانا شروع کر دیا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ شوبز کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد مجھے پروڈکشن کے شعبے سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی اور میں محض نوکری کرنا نہیں، بلکہ یہ کام سیکھنا چاہتا تھا، اور سکھانے کے لیے رئیس رازی بہترین آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ڈراما، میوزک، ٹاک شوز، مارننگ شوز، سیاسی پروگرامز، خصوصی پروگرامز، سبھی کچھ کیا تھا۔ ہر فن مولا تھے اور میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ وہ مجھے بھی ہر فن مولا بنا دیں۔

رفتہ رفتہ مجھے لگنے لگا کہ میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ رئیس رازی اکثر و بیشتر اپنا کام مجھے سونپ کر کہیں چلے جاتے۔ کبھی سیٹ یا لوکیشن پر ایک کونے میں اپنے دوستوں اور کاسٹ میں شامل خواتین کے ساتھ گپ شپ کر رہے ہوتے، چائے وغیرہ کا دور چل رہا ہوتا۔ کبھی کبھار اگر اتفاق سے ڈائریکٹر پروگرامز یا کمپنی کے اعلیٰ عہدے داروں میں سے کوئی سیٹ یا لوکیشن پر آ نکلتا تو رئیس صاحب جلدی سے مجھے پیچھے کر کے کیمرا مین کے پاس جا کھڑے ہوتے یا تیزی سے حرکت میں آ جاتے اور سب لوگوں کو ڈائرکشن دینے لگتے۔ میں جوں جوں اس فیلڈ میں آگے بڑھتا گیا، مجھے اندازہ ہوا کہ ڈائرکشن اور پروڈکشن کا کام کچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

ان کے لیے ذہنی اور جسمانی، دونوں ہی طرح کی توانائیاں درکار تھیں، جبکہ رئیس صاحب اب کافی عمر کے ہو گئے تھے۔ وہ کام کیے بغیر ہی تھکنے لگے تھے لیکن بہر حال، ان کا نام چل رہا تھا اور وہ اپنے نام کو اچھی طرح کیش کر رہے تھے۔ روز بہ روز اپنا زیادہ سے زیادہ کام مجھ پر لاد دینا ان کی مجبوری بھی تھی لیکن میں یہ بوجھ بہ خوشی اٹھا رہا تھا۔ جس رفتار سے میرے کام میں اضافہ ہوا تھا، اس حساب سے میری تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی میں بہت خوش تھا۔ میں جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ مجھے حاصل ہو رہا تھا۔ مجھ میں، اندر ہی اندر بے پناہ خود اعتمادی آ چکی تھی۔ میں ڈائرکشن، پروڈکشن کی تمام باریکیوں سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ میرا نام ڈائریکٹر یا پروڈیوسر کے طور پر نہیں آتا تھا لیکن مجھے اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک روز تو رئیس صاحب کو پیش منظر سے ہٹنا ہی پڑے گا، اس وقت ان کی جگہ لینے کے لیے میں موجود ہوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ چینل والوں کو یا پروڈکشنز کو فنانس کرنے والی پارٹیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اس ٹی وی چینل پر میرے چند سال شدید محنت میں گزرے لیکن یہ محنت مجھ پر گراں نہیں گزری تھی۔ میں اس سے لطف اندوز ہوا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اس محنت کا پھل جلد ملنے والا ہے۔ کچھ ایسے آثار نظر آنے لگے تھے کہ جلد مجھے پروڈیوسر بنا دیا جائے گا۔ میری تنخواہ بھی بڑھ جائے گی اور اہمیت بھی۔ مجھے اپنا مستقبل روشن نظر آنے لگا۔ اسی دوران ہمارے چینل نے بیک وقت لاہور اور کراچی کے دو فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ایک زبردست تقریب کا اہتمام کیا جس کے اختتام پر ڈنر بھی دیا گیا۔ یہ تقریب اور ڈنر اس خوشی میں تھا کہ ہمارے چینل پر چلنے والی اور ہماری اپنی تیار کردہ ایک سیریل نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے تھے۔

اس زبردست کامیابی نے چینل اور اس سے وابستہ سبھی افراد کے علاوہ اس سیریل کی کاسٹ کو بھی بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ چینل کو خوب بزنس ملا تھا، پہلی بار اشتہارات کی اس طرح بارش ہوئی تھی کہ مارکیٹنگ والوں کے لیے ان کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ چینل کی مالی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ کئی نئے اداکار راتوں رات ہٹ ہو گئے تھے۔ چینل والوں نے شایانِ شان طریقے سے اس کامیابی کا جشن منایا۔ اس کامیابی پر دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی خوب خوش تھا کیونکہ اس سیریل کی ڈائریکشن میرے باس رئیس رازی ہی کی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ نوّے فیصد کام بے شک میں نے ہی کیا تھا لیکن ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے طور پر نام انہی کا چلا تھا۔

تاہم میری محنت رائگاں نہیں گئی تھی۔ درحقیقت اس سیریل کے بعد ہی مجھے اِدھر اُدھر سے اڑتی اڑتی سی خبریں ملنا شروع ہوئی تھیں کہ چینل کی انتظامیہ مجھے پروڈیوسر کا درجہ دینے پر غور کر رہی ہے۔ دیر سویر سے ہی سہی، لیکن خبریں تو بہر حال ان تک بھی پہنچتی ہی ہوں گی کہ کام کون کر رہا ہے، نام کس کا چل رہا ہے۔ میں نے اپنی دانست میں یہ عقل مندی کی تھی کہ کبھی خود کسی تک یہ خبر پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس کا الٹا ہی اثر ہو جاتا۔

میں بات کر رہا تھا، فائیو اسٹار ہوٹل میں پارٹی کی۔ وہ بلاشبہ ایک یادگار پارٹی تھی۔ پورے ہال میں رنگارنگ ملبوسات اور حسین چہروں کی بہار تھی۔ فضا معطر تھی۔ وجیہہ اور خوش لباس مرد بھی خاصی تعداد میں تھے۔ شوبز انڈسٹری سے وابستہ بہت سی شخصیات موجود تھیں۔ اپنے آپ کو اس انڈسٹری کا ایک حصہ محسوس کرتے ہوئے میں بے حد خوش تھا۔ میں ایک طرح سے میزبانوں میں شامل تھا، اس لیے فرداً فرداً ہر مہمان سے مل رہا تھا۔ ہماری تازہ ترین بلاک بسٹر سیریل کے تقریباً سبھی فنکار وہاں موجود تھے۔ لاہور کے کچھ فنکاروں نے بھی اس میں کام کیا تھا۔ وہ عین اسی وقت لاہور میں جاری پارٹی میں شریک تھے۔

فنکاروں اور دیگر مہمانوں سے ملتے ملاتے میں فراز

خان کے قریب پہنچا۔ اس نے ہماری اس کامیاب سیریل میں سیکنڈ لیڈ رول کیا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ سائڈ ہیرو تھا۔ وہ ایک دراز قد، گورا چٹا، وجیہہ نوجوان تھا۔ ڈراموں میں شوقیہ کام کرتا تھا۔ معاوضے کا چیک بڑی بے نیازی سے وصول کرتا تھا۔ خوش حال آدمی تھا۔ اپنے مرحوم والد کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس چلا رہا تھا۔ ڈراموں کا معاوضہ اس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ خوش حال ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یقیناً خوش قسمت بھی تھا۔ اس نے اب تک صرف تین سیریلز میں کام کیا تھا۔ تینوں کامیاب رہی تھیں۔ تیسری تو بلاک بسٹر ثابت ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اب وہ مرکزی کردار میں آنے لگے گا۔ آفرز آنا شروع ہوگئی تھیں۔

اس زمانے میں پیجرو ہماری سوسائٹی میں نئی نئی متعارف ہوئی تھی اور اسٹیٹس سمبل سمجھی جانے لگی تھی۔ فراز خان شوٹنگ کے لیے پیجرو میں آتا تھا۔ ڈرامے کا پورا کریو اور کاسٹ گویا اس کے آگے بچھی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ رئیس رازی بھی خوب باچھیں کھلا کر اس سے بات کرتے تھے۔ ڈراموں کی کاسٹ میں شامل لڑکیاں شوٹنگ میں وقفوں کے دوران اسی کے آس پاس دکھائی دیتی تھیں۔ مجھ سے بھی وہ خاصی خوش خلقی سے پیش آتا تھا لیکن ہمارے درمیان عموماً صرف رسمی یا پیشہ ورانہ گفتگو ہوتی تھی۔

اس شام میں اس سے سلام دعا کے لیے اس کے قریب پہنچا تو وہ ٹی وی پر چھوٹے موٹے رول کرنے والے چار پانچ لڑکے لڑکیوں میں گھرا کھڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس روز وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی گرمجوشی سے ملا تھا۔ پھر چند لمحے کی رسمی گفتگو کے بعد وہ اپنے اردگرد کھڑے لوگوں سے معذرت کر کے مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس کا بازو میرے کندھے پر تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا اپنائیت بھرا انداز اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسے گوشے میں لے گیا جہاں کوئی ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔

”فرحان ڈیئر! مجھے آپ سے بہت ضروری گفتگو کرنی ہے۔“ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر نیچی آواز میں کہا۔ پہلی بار اس نے مجھے اس طرح دوستانہ انداز میں مخاطب کیا تھا۔

”ضرور کریں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہاں وہ بات چیت نہیں ہوسکتی۔ بات ذرا لمبی ہے۔“ اس کی آواز بہت اچھی تھی اور اس کی مسکراہٹ گو کہ زیادہ تر تصنع آمیز ہوتی تھی لیکن پھر بھی اچھی لگتی تھی۔ میں نے کئی لڑکیوں کو بھی اس کی آواز اور مسکراہٹ کی تعریف کرتے سنا تھا۔

اس نے جیب سے اپنا والٹ نکالا، اس میں سے اپنا بزنس کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ”کل جس وقت بھی آپ کے پاس کم از کم ایک گھنٹا فالتو ہو، میرے دفتر آجائیں بس، آنے سے پہلے میرے سیل نمبر پر فون ضرور کر لینا۔“

میں حیران رہ گیا کہ اسے مجھ سے ایسی ضروری کیا بات کرنی تھی جس کے لیے وہ مجھے آفس بُلا رہا تھا؟ تاہم میں نے اپنی اس حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اس زمانے میں موبائل فون عام نہیں ہوئے تھے۔ سم والے فون تو مارکیٹ میں آئے ہی نہیں تھے۔ موبائل فون رکھنا خاصا مہنگا پڑتا تھا اور کسی حد تک یہ بھی اسٹیٹس سمبل تھا۔ غنیمت تھا کہ میرے پاس اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے موبائل فون موجود تھا۔ میں نے اس سے ملاقات کا وعدہ تو کرلیا لیکن میں دل ہی دل میں اندازے لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ اپنے آفس بلا کر مجھ سے کیا بات کرے گا؟ اپنا کوئی بھی اندازہ میرے دل کو نہ لگا۔ اس سے ہر ضروری بات سیٹ پر یا لوکیشن پر، شوٹنگ کے دوران ہو جاتی تھی۔ اب ایسی نہ جانے کیا بات تھی جس کے لیے غالباً وہ رازداری کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے روز مجھے کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ میں اس سے فون پر بات کر کے شام کو اس سے ملنے چلا گیا۔ اس کا آفس دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں لیکن میں نے فوراً ہی اپنی حیرت پر قابو پالیا۔ اس وقت تک میں دولت مند لوگوں سے میل ملاقات کا کسی نہ کسی حد تک عادی ہو چکا تھا۔ فراز خان میری توقع سے زیادہ گرمجوشی سے ملا اور میرے انتہائی تکلف کے باوجود اس نے میری خوب خاطر مدارت کی۔

کافی دیر کے بعد وہ اس ملاقات کے اصل مقصد کی طرف آیا۔ حالانکہ اس کے شاندار کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا، اس کے باوجود اس کا انداز قدرے رازدارانہ سا ہوگیا۔ دونوں کہنیاں اپنی بڑی سی میز پر ٹکا کر وہ ذرا آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ ”فرحان صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے پلے سے دو لاکھ روپے دے کر پہلی مرتبہ ڈراما سیریل میں سیکنڈ لیڈ کے طور پر کاسٹ ہوا تھا؟“

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ شوبز انڈسٹری میں ایسا ہو رہا تھا لیکن فراز خان کے بارے میں مجھے قطعی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ بھی اس راستے سے آیا تھا۔ رقم پر بھی مجھے ذرا حیرت

ہوئی تھی۔ دو لاکھ روپے اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس زمانے میں نئے اداکاروں سے، اس سے کہیں کم پیسے لینے والے پروڈیوسر بھی ایک سیریل کرنے کے بعد نئی گاڑی لے لیتے تھے۔

''کس کو دیے تھے آپ نے پیسے؟'' میں نے یونہی سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

''یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔'' وہ ''آپ'' سے ''تم'' پر آ گیا۔ اس کا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔ ''ویسے بھی اس بات کا تعلق اصل موضوع کے ساتھ ذرا کم ہی ہے۔ یہ تو میں نے ویسے ہی برسبیلِ تذکرہ بات کی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بات یہاں سے شروع کر کے اصل بات پر آنا مناسب رہے گا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ مجھے صرف پہلی سیریل میں پیسے دینے پڑے۔ میرا رول اچھا تھا، مجھے پسند کیا گیا۔ میری گاڑی اسٹارٹ دھکے سے ہوئی لیکن اس کے بعد اچھے طریقے سے چل پڑی۔ بعد کی دو سیریلز میں کام کرنے کے مجھے پیسے ملے ہیں اور معقول ملے ہیں۔''

وہ خاموش ہو کر پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ''یوں سمجھو کہ بطور اداکار بھی میرا کیریئر بن چکا ہے لیکن میں اصل میں بزنس مین ہوں۔ اداکاری میرا شوق ہے۔ ممکن ہے سال دو سال میں میرا شوق پورا ہو جائے اور مجھے اداکاری سے دلچسپی نہ رہے لیکن میں نے اس فیلڈ میں آنے کے کچھ ہی عرصے بعد ایک بزنس مین کی نظر سے اس کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ مجھے کچھ خبریں بھی ملتی رہتی ہیں جو عام آدمیوں کو نہیں ملتیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں فرحان...... ہمارے ملک میں ایک نئی انڈسٹری جنم لے رہی ہے اور وہ ہے ڈراما انڈسٹری۔ ابھی تو ہمارے ہاں صرف ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل ہے لیکن جلد ہی ملک میں پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا سیلاب آنے والا ہے۔''

''آپ شاید مجھے یہ خوش خبری سنا رہے ہیں کہ میرے لیے کام یا ملازمت کے مواقع بڑھنے والے ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تو تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم چاہو تو کچھ ہی عرصے میں ملازمت یا معاوضے پر کام کرنے کے چکر سے نکل سکتے ہو۔''

''کیسے؟'' میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''اپنا کام کرو۔ نوکری چھوڑو۔ نوکری میں کچھ نہیں رکھا۔ میں ایک پروڈکشن ہاؤس بنانا چاہتا ہوں۔ اس کام میں بہت پیسا آنے والا ہے اور کامیاب بزنس مین وہی ہے جو مستقبل کے امکانات کا اندازہ لگا سکے۔ جتنے بھی سرمائے کی ضرورت ہو گی، وہ میں لگاؤں گا لیکن اس پروڈکشن ہاؤس کو چلاؤ گے تم...... تمام معاملات کا اختیار تمہارے پاس ہو گا۔ میں صرف سائلنٹ یا سلیپنگ پارٹنر ہوں گا۔ خاموش یا سوتا ہوا پارٹنر...... تمہارے اختیارات یہاں تک ہوں گے کہ مجھے بھی تم جس ڈرامے میں کاسٹ کرنا چاہو، کرو۔ جس ڈرامے میں تم مجھے کاسٹ کرنا مناسب نہ سمجھو، اس میں ہرگز کاسٹ مت کرنا۔ میں تم سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ اسٹوڈیو بھی ہم اپنا بنائیں گے۔ میں کروڑوں کے حساب سے انویسٹمنٹ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

اس زمانے میں کروڑوں کا لفظ سن کر مجھ جیسے انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں خواہ مخواہ ہی ذرا تیز ہو جاتی تھیں۔ میں نے اپنی دھڑکنوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مجھے اس منصوبے میں کس حیثیت سے شامل کرنا چاہتے ہیں؟''

''برابر کے پارٹنر کی حیثیت سے۔'' اس نے بلاتامل جواب دیا۔ ''میں صرف مالی اور انتظامی معاملات دیکھوں گا۔ باقی ہر لحاظ سے پروڈکشن ہاؤس کو چلانا تمہاری ذمّے داری ہو گی۔ منافع ففٹی ففٹی۔''

میں ایک لمحے خاموش رہا۔ سچی بات یہ تھی کہ بولنے کے لیے مجھے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ میں چھوٹا آدمی تھا۔ میرے لیے یہ باتیں بہت بڑی تھیں۔ آخر میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ ''فراز صاحب! میں بہت چھوٹا سا آدمی ہوں۔ مجھے اس فیلڈ میں آئے زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا۔ آپ نے مجھے اتنی بڑی ذمّے داری کے قابل کیسے سمجھ لیا؟''

''میں نے تمہارے ساتھ تین سیریلز کی ہیں اور اس دوران تقریباً تین سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔'' وہ ریوالونگ چیئر پر تقریباً نیم دراز ہوتے ہوئے اطمینان سے بولا۔ ''اس دوران میں نے بہت قریب سے، بہت غور سے، لیکن بالکل خاموشی سے تمہارا جائزہ لیا ہے۔ تمہیں بالکل احساس نہیں ہوا ہو گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ کم و بیش سال ڈیڑھ سال سے پروڈکشن کا سارا کام تم نے سنبھالا ہوا ہے۔ اصل پروڈیوسر، ڈائریکٹر تم ہو۔ رئیس رازی کا صرف نام چل رہا ہے۔''

''پھر بھی...... آپ کو ایک نئے پروڈکشن ہاؤس کے

لیے کسی سینئر پروڈیوسر، ڈائریکٹر کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔" میں نے اپنی دانست میں اسے، اپنی ذات سے بالاتر ہوکر مخلصانہ مشورہ دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں نے اس پہلو پر نہیں سوچا ہوگا؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ میں شاید ایک بار پھر بھول گیا تھا کہ وہ بہرحال ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس وقت جو تھوڑے سے پروڈیوسر فیلڈ میں موجود ہیں، وہ سرکاری ٹی وی سے ریٹائر ہوکر آئے ہیں اور انہیں پرائیویٹ سیکٹر میں کام کرتے ہوئے بھی کئی کئی سال ہوگئے ہیں۔ بعض نے تو بے تحاشا کام کیا ہے۔ اب وہ تھک چکے ہیں۔ ان گھوڑوں کو ریس میں جتنا دوڑنا تھا، دوڑ چکے ہیں۔ اب وہ صرف بونس پر چل رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے نخرے بہت ہیں۔ میں کسی کے نخرے نہیں اٹھا سکتا۔ سرکاری نوکری میں انہوں نے بادشاہوں کی طرح وقت گزارا ہے۔ ان کے کمروں میں دربار لگے رہا کرتے تھے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں کام کر کے ان کے مزاج کسی حد تک تو بدلے ہیں مگر پرانی خوبو ابھی پوری طرح گئی نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر، کسی اور سے بات کرنے کے بجائے تم سے کی ہے۔ اگر تم انکار کرو گے تو پھر میں کسی اور کی طرف جاؤں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک کامیاب اور تیز وطرار بزنس مین ضرور تھا لیکن عیار اور مکار نہیں تھا۔ صاف اور دوٹوک بات کر رہا تھا۔ مجھے زندگی کے معاملات کا، اور لوگوں کو کم سے کم وقت میں پرکھ لینے کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا، اس معاملے میں دماغ میرا کچھ زیادہ ساتھ نہیں دیتا تھا، زیادہ تر میں دل کے کہنے پر چلتا تھا، اور اس وقت میرا دل مجھے فراز کے بارے میں کچھ اچھے "سگنل" دے رہا تھا۔ فراز منتظر انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں خاموش تھا۔

"کیا کہتے ہو؟" آخر اس نے پوچھا۔

"مجھے سوچنے کے لیے دو تین دن کا وقت دیں۔" میں نے اپنی دانست میں عقل مندی اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

"دو تین دن نہیں...... تم پورا ایک ہفتہ لے لو۔ اس دوران مجھ سے کچھ پوچھنا ہو تو بلا تکلف اور بلا جھجک پوچھ لینا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "یہ بلڈنگ، جس میں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، زیادہ بڑی تو نہیں، لیکن میری ذاتی ہے۔ اس کے دو فلورز پر ہمارے دفاتر ہیں۔ مزید جو دو فلورز ہیں، وہ پہلے کرائے پر اٹھے ہوئے تھے لیکن اب خالی ہیں۔ اپنے پروڈکشن ہاؤس کے لیے ہم انہیں استعمال کریں گے۔ ایک فلور پر دفاتر بنیں گے۔ دوسرے فلور پر اسٹوڈیو۔ زیادہ تر شوٹنگ آج کل رئیل لوکیشنز پر ہوتی ہیں۔ ہمارا کام آسانی سے چلتا رہے گا۔ ایک ہفتے بعد تم مجھے صرف یہ بتا دینا کہ تم تیار ہو یا نہیں۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہو، تب بھی اپنے دفتر میں فی الحال کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب ہماری تیاریاں مکمل ہوجائیں گی تو تم پندرہ دن کے نوٹس کے ساتھ استعفا دے دینا۔"

میں فراز کو ایک ہفتے بعد جواب دینے کا وعدہ کر کے گھر آیا تو میرے ذہن میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ میں گویا اچانک ہی زندگی کے ایک دوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا اور مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کون سا راستہ میرے لیے بہتر ہوگا۔ میری قوتِ ارادی اس زمانے میں کچھ زیادہ مضبوط نہیں تھی اور قوتِ فیصلہ بھی مجھ میں کچھ کم ہی تھی۔ میری شادی کو بھی اس وقت کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، سات آٹھ سال ہی ہوئے تھے۔ اس وقت تک میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ میری بیوی مجھ سے زیادہ عقل مند ہے اور بہت سے شوہروں کی طرح میں بھی ایک سعادت مند شوہر تھا، چنانچہ میں نے بیوی سے بھی مشورہ کیا۔

بیوی نے زیادہ دماغ کھپائے بغیر مشورہ دے دیا۔ "فوراً اس پیشکش کو قبول کر لو۔ لگتا ہے، خوش قسمتی نے تمہارے دروازے پر دستک دے دی ہے ورنہ مجھے تو امید نہیں تھی کہ تمہیں زندگی میں کبھی کوئی اچھا موقع ملے گا۔"

پھر گویا اسے کوئی خیال آیا، فوراً مجھے تاکید کی۔ "وہاں جا کر لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑ جانا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں تم پر پوری طرح نظر رکھوں گی۔ بغیر اطلاع دیے کسی بھی وقت سیٹ پر آجایا کروں گی۔ شوبز کی دنیا میں جا کر زیادہ تر لوگ رنگیلے پیا بن جاتے ہیں۔ تم ایسی کوشش ہرگز نہ کرنا۔" اس کے لہجے میں دھمکی پنہاں تھی۔

"بیگم! شاید تم بھول رہی ہو کہ میں اس وقت بھی شوبز کی دنیا میں ہی ہوں۔ تم نے کبھی میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سنی؟" میں نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ شوبز کی دنیا میں قدم رکھنے کے کچھ عرصے بعد ہی میں نے ازدواجی زندگی کو پُرسکون رکھنے کا یہ اہم راز پالیا تھا کہ بیوی کے سامنے شکل اکثر مسکین بنا کر رکھو۔

''ابھی تو تم اسسٹنٹ ہو نا تمہارے سر پر رئیس رازی صاحب بیٹھے ہیں۔ نئے پروڈکشن ہاؤس میں جا کر تو تم آزاد اور خودمختار، پروڈیوسر ہو جاؤ گے۔ اصل خطرہ تو اس وقت پیدا ہو گا۔ آزادی اور خودمختاری ملتے ہی تمہارے پر پُرزے نہ نکل آئیں۔'' بیگم نے سخت نظروں سے مجھے گھورا۔ وہ گویا میرے تحت الشعور یا پھر شاید لاشعور میں جھانک کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہاں کچھ مشکوک قسم کے عزائم تو پرورش نہیں پا رہے؟ غالباً میرے ذہن کی زیادہ گہرائیوں میں جھانکنے کی، اس کی کوشش ہمیشہ کی طرح ناکام رہی۔ کم از کم میرا خیال تو یہی تھا۔ آگے اللہ بہتر جانے۔

بیگم کی تائید حاصل ہو جانے کے باوجود میں اس معاملے پر سوچتا رہا۔ فراز خان نے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ میں نے فیصلے پر پہنچنے کے لیے اس مہلت کو پوری طرح استعمال کیا اور آخرکار مجھ میں بھی یہ بازی کھیلنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ خوش قسمتی بعض لوگوں کے دروازے پر دستک دیتی ہے لیکن وہ دروازہ نہیں کھولتے۔ مجھے کئی بار یہی خیال آیا کہ میں انہی لوگوں میں شامل نہ ہو جاؤں۔

فراز خان نے اس دوران اپنی بلڈنگ کے دونوں فلورز پر دفاتر اور اسٹوڈیو تیار کرانے شروع کر دیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے جواب کے انتظار میں نہیں بیٹھا تھا، اگر میں انکار کر دوں گا تو وہ صدمے سے بے حال نہیں ہو جائے گا، وہ کوئی دوسرا آدمی تلاش کر لے گا۔ ایک ہفتے بعد میں نے اسے اپنے جواب سے مطلع کر دیا، جس پر اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے اپنی جگہ اپنا کام کرتا رہا اور میں خاموشی سے اپنی جگہ اپنا کام کرتا رہا۔ فراز خان کو اپنا کام مکمل کرنے میں چار پانچ ماہ لگ گئے۔ اس کے بعد اس نے مجھے گرین سگنل دے دیا کہ میں اب پندرہ دن کے نوٹس کے ساتھ اپنا استعفا دے سکتا ہوں۔

میں نے اپنا استعفا چینل کے ہیڈ آفس میں ایچ آر ڈیپارٹمنٹ کو بھجوا دیا۔ وہاں کسی نے اس پر کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بڑی کمپنی تھی، بڑا سیٹ اپ تھا، لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ البتہ رسمی طور پر دستخط کے لیے جب میرا استعفا رئیس رازی کے پاس پہنچا تو انہیں شاید خاصا زوردار جھٹکا لگا۔ انہوں نے فوراً مجھے بلا بھیجا۔ تاہم جب میں ان کے سامنے پہنچا تو انہوں نے کسی غیر معمولی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ناک پر ٹکی عینک کے شیشوں کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے قدرے ناراضی آمیز انداز میں ہنکارا بھرا، گہری سانس لی اور ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔ ''اچھا...... تو تم بھی ہمیں چھوڑ کر چل دیے۔'' میرا استعفا ان کے سامنے رکھا تھا۔

''بس...... سر...... وہ صورتِ حال کچھ ایسی بن گئی۔'' میں نے بظاہر شرمندگی آمیز اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' انہوں نے پلکیں جھپکائے بغیر بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے انہیں اصل بات بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ ویسے بھی یہ کوئی چھپنے والی بات تو تھی نہیں۔ جلد یا بدیر انہیں پتا تو چل ہی جانا تھا۔

''فراز خان پروڈکشن ہاؤس بنا رہے ہیں۔ اس میں جا رہا ہوں۔'' میں نے نظریں نیچے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''پروڈیوسر کی حیثیت سے؟'' انہوں نے حیرت کا اظہار کیے بغیر پوچھا۔ ممکن تھا کہ انہیں خبر مل چکی ہو۔ شوبز کے شعبے میں...... بلکہ شاید کسی بھی شعبے میں اس قسم کی خبریں چھپی نہیں رہتیں۔

''جی سر۔'' اب میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ پروڈیوسر ہونے کے ساتھ ساتھ میں ففٹی پرسنٹ کا پارٹنر بھی ہوں گا۔

''ٹھیک ہے میاں۔'' انہوں نے ایک طویل سانس لے کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا لی۔ ''ہم تو اسی طرح انڈوں سے نکلنے والے چوزوں کو اڑنا سکھاتے آئے ہیں۔ جب وہ اڑنا سیکھ جاتے ہیں تو کسی زیادہ اونچی شاخ پر جا بیٹھتے ہیں۔''

''سر! میں آپ کے احسانات کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔'' میں نے کافی حد تک حقیقی ممنونیت سے کہا۔ ''آپ کو اگر کبھی میری ضرورت پڑے تو آپ بلاتکلف مجھے بلا سکتے ہیں۔ اگر کوئی بہت ہی بڑی مجبوری نہ ہوئی تو میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔''

''دیکھا جائے گا میاں۔'' انہوں نے بے پروائی سے کہا۔ ''لوگ آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں، دنیا کے کام چلتے رہتے ہیں۔'' ان کی اس بات سے تو میں پہلے ہی

متفق تھا۔ انہوں نے میرے استعفے پر ''نو آبجیکشن'' لکھ کر دستخط کر دیے اور میرے سر سے گویا کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

پندرہ روز بعد چینل سے مجھے اپنے واجبات کا چیک مل گیا اور دوسرے روز میں اپنے نئے آفس میں جا کر بیٹھ گیا۔ پروڈکشن آفس کا افتتاح پہلے ہی ہو چکا تھا۔ فراز خان کچھ اخباروں، رسالوں میں خبریں چھپوانے میں کامیاب رہا تھا۔ میرا کمرا زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن شاندار تھا۔ ضرورت کی سب چیزیں اس میں موجود تھیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں نے تقریباً آزاد اور خود مختار حیثیت میں کبھی ایسے کسی کمرے میں بیٹھنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

میں نے اس دفتر میں بیٹھنے کے بعد ایک دن بھی ضائع نہیں کیا۔ میں ایسے کئی رائٹرز کو جانتا تھا جو پوری پوری سیریل کا اسکرپٹ لکھ کر سرکاری اور پرائیویٹ، دونوں چینلز کے بہت چکر لگا چکے تھے لیکن کسی نے ان کا اسکرپٹ پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے ان سب سے اسکرپٹ لیے اور دن رات ایک کر کے انہیں پڑھا، ان میں سے دو منتخب کیے اور بیک وقت دو سیریلز کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سب ٹی وی آرٹسٹ مجھے جانتے تھے، تھوڑی بہت عزت بھی کرتے تھے۔ مجھے اپنے تمام مطلوبہ فنکاروں کو بک کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ زور شور سے کام شروع ہو گیا۔ فراز خان کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی اور اس میں خرچ کرنے کا حوصلہ بھی تھا۔ چیک سائن کرنے میں وہ تامل نہیں کرتا تھا۔ دل کھول کر خرچ کرتا تھا، اور پھر اسی طرح کماتا تھا۔ قدرت بھی اس پر مہربان تھی۔

میں نے خود بھی بہت محنت کی اور فنکاروں سے بھی بہت زیادہ محنت کرائی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، اس وقت پرائیویٹ چینل ایک ہی تھا، فنکاروں کے پاس وقت تھا۔ انہوں نے بھی تعاون کیا اور دونوں سیریلز جلد مکمل ہو گئیں۔ یوں سمجھیں، دو آدمیوں کا کام مجھ اکیلے نے کیا۔ سرکاری ٹی وی نے تو اس وقت تک پرائیویٹ پروڈکشنز خریدنا شروع نہیں کی تھی۔ ان کا اپنا ہی نیٹ ورک بہت بڑا تھا اور وہ اپنی ضرورت کے مطابق پروڈکشن کرتے رہتے تھے۔ لے دے کر ہمارے سامنے پروڈکشنز کا ایک ہی گاہک یعنی ایک ہی چینل تھا۔ اس کے مالک سے فراز خان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہماری دونوں سیریلز بہت اچھی شرائط پر بک گئیں۔ یوں گویا ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا آغاز بہت اچھا ہوا تھا۔

میں نے ان دونوں سیریلز میں سے صرف ایک میں فراز خان کو کاسٹ کیا تھا۔ وہ بھی ایک ایسے رول کے لیے، جس میں وہ اسی طرح فٹ نظر آیا تھا جس طرح انگوٹھی میں نگینہ۔ وہ اپنے وعدے پر قائم رہا تھا۔ اس نے دونوں میں سے کسی بھی سیریل میں کاسٹ ہونے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی جس سے مجھے اطمینان ہوا تھا کہ اس نے پروڈکشن ہاؤس واقعی صرف اپنے آپ کو پروموٹ کرنے یا اپنا شوق پورا کرنے کے لیے نہیں بنایا تھا۔ وہ سنجیدگی سے بزنس کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی توقعات پر پورا اُترنے کے لیے میں نے بھی سخت محنت کا سلسلہ روز اول کی طرح جاری رکھا۔ ادھر ہماری دو سیریلز کا سودا ہوا، ادھر ہم دوسری دو سیریلز پر کام شروع کر چکے تھے۔

یوں ہمارا کام اچھا چل نکلا۔ پروڈکشن ہاؤس پھلنے پھولنے لگا۔ دفتر میں خوب رونق رہتی۔ سال ڈیڑھ سال بعد فراز خان کا لگایا ہوا سرمایہ دھیرے دھیرے منافع سمیت واپس آنے لگا اور مجھے بھی اس میں سے حصہ ملنے لگا۔ رفتہ رفتہ میرے حالات بہتر ہونے لگے۔ کچھ عرصے بعد میں نے پرانا آبائی مکان فروخت کر کے ایک بہتر علاقے میں، ذرا بہتر مکان لے لیا۔ میرے صرف دو ہی بچے تھے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ دونوں اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

چند سال اسی طرح ہموار انداز میں گزر گئے۔ ان چند سالوں کے دوران مجھے زندگی اور لوگوں کے بارے میں بے شمار تجربات حاصل ہوئے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان چند سالوں کے دوران میں نے پچاسوں سال کی زندگی بسر کر لی ہے۔ شوبز کی دنیا واقعی ایک عجیب دنیا تھی۔ یہاں ہر قدم پر کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ آئے دن کسی نہ کسی کی ایسی کہانی میرے علم میں آتی تھی جس پر سیریل بن سکتی تھی۔ ہر قدم پر کوئی ایسا کردار کھڑا ملتا تھا جس کی زندگی پر ڈراما بنایا جا سکتا تھا، لیکن ظاہر ہے، اب ہم اتنے ڈرامے، اتنے سیریلز تو نہیں بنا سکتے تھے۔

اس دوران ملک میں یک دم ہی ایک انقلاب سا آنے لگا۔ یکے بعد دیگرے پرائیویٹ ٹی وی چینلز قائم ہونے لگے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ملک کے اولین اور اکلوتے ٹی وی چینل پر اس سے پہلے ہی نہ جانے کیوں زوال آنے لگا تھا۔ ادائیگیوں میں بے قاعدگی آنے لگی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ادائیگیاں بالکل ہی رک گئیں۔ اس کے باوجود لوگ امید

کے سہارے وہاں اپنی پروڈکشنز دیتے رہے کہ آج نہیں تو کل حالات بہتر ہو ہی جائیں گے۔ ان کی یہ امید پوری نہ ہوسکی اور اس چینل میں پھنسنے والی رقوم کا پہاڑ اونچا ہوتا گیا۔ بعض بے چارے چھوٹے موٹے پروڈیوسرز نے تو اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی لگا کر، ڈرامے تیار کر کے چینل کی نذر کر دیے تھے اور اب کسمپرسی کا شکار تھے۔

ہماری بھی کافی بڑی رقوم وہاں پھنس گئی تھیں۔ لیکن فراز خان چونکہ مالی طور پر ایک مضبوط آدمی تھا، اس لیے ہمارا کام رکنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ البتہ ہم نے پرانا حساب کتاب جہاں کا تہاں چھوڑ کر نت نئے، قائم ہونے والے چینلز کا رخ کر لیا جہاں ہمیں گرمجوشی سے خوش آمدید کہا گیا۔ وہ لوگ بھی چونکہ نئے نئے میدان میں آئے تھے اور انہیں قدم جمانے کی فکر تھی، اس لیے وہ سب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بھی ہوشیار اور کائیاں ہوتے چلے گئے۔ ڈرامے لینے میں نخرے کرنے لگے اور ادائیگیوں میں تاخیر بڑھتی چلی گئی۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں مالی کرپشن صرف سرکاری اداروں میں ہی ہے لیکن مجھے اپنی عملی زندگی میں اندازہ ہوا کہ کرپشن شاید اجتماعی طور پر ہمارے مزاج میں سرایت کر گئی ہے۔ کوئی خواہ کہیں بھی بیٹھا ہو، بس موقع ملنے کی بات ہے، کوئی بھی داؤ لگانے سے باز نہیں رہتا۔ چینلز پر ڈراموں کو پاس کرنا اور چلانے کے قابل قرار دینا جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا، وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ مشکل یہ تھی کہ سب کی ”فرمائشیں“ پوری کرنے کے بعد بھی بڑی بڑی رقوم چینلز میں پھنسی رہتی تھیں۔

بہرحال کام چل رہا تھا۔ میں اور فراز خان اپنی اپنی جگہ مصروف تھے۔ فراز کو بطور اداکار کبھی کبھار میں اپنے پروڈکشن ہاؤس کے کسی ڈرامے میں کاسٹ کر لیتا تھا اور کبھی کبھار اسے کسی دوسرے پروڈیوسر کی طرف سے بھی بلاوا آجاتا تھا۔ اس کی اب عمر بڑھ چکی تھی۔ زیادہ تر اب اسے کیریکٹر رول ملنے لگے تھے۔ عمر تو ظاہر ہے، میری بھی بڑھ چکی تھی۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتا کہ میں کچھ تھکتا جا رہا تھا۔ ڈراما پروڈکشن ایک اعصاب شکن کام ہے۔ اتنا آسان نہیں، جتنا بہت سے لوگ سمجھتے ہوں گے۔

اس دوران جہاں ٹی وی چینلز کا سیلاب آیا تھا، وہیں ڈراما پروڈیوسرز اور ڈرامے لکھنے والی خواتین کا بھی سیلاب آ گیا تھا۔ بالکل اسی طرح، جس طرح کسی زمانے میں ضخیم ناول لکھنے والی خواتین کا سیلاب آیا تھا۔ ویسے بھی ٹی وی، اور خاص طور پر ڈراما، خواتین کے سر پر ہی چلتا ہے اور خواتین کو عام طور پر خواتین ہی کے لکھے ہوئے ڈرامے زیادہ پسند آتے ہیں، انہیں اچھی ریٹنگ ملتی ہے اور ریٹنگ ہی کی بنیاد پر اشتہار ملتے ہیں۔ چنانچہ کافی عرصے تک ہم بھی ڈرامے لکھوانے کے لیے بعض ایسی خواتین کے پیچھے بھاگتے رہے جن کے ڈرامے بہت اچھی ریٹنگ لے چکے تھے لیکن ہم نے ان کے اسکرپٹس پر ڈرامے بنائے تو ہماری اوپر تلے تین سیریلز فلاپ ہو گئیں۔

یہ سب قسمت کی باتیں تھیں۔ میں تو ویسے بھی مکمل طور پر قسمت کا قائل تھا۔ میں خواہ مخواہ ہی قائل نہیں تھا، میں نے زندگی کے تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ محنت سے آپ کو صرف محدود کامیابی ملتی ہے۔ قسمت سے آپ کو لامحدود کامیابیاں ملتی ہیں۔ تین سیریلز کی ناکامی نے ہمارے پروڈکشن ہاؤس کو مالی طور پر بھی بڑا دھچکا پہنچایا اور ہماری ساکھ کو بھی خاصا نقصان پہنچا۔ ادھر مقابلہ روز بروز سخت سے سخت تر ہو رہا تھا۔ مسابقت بڑھ چکی تھی۔ بہت سے پروڈکشن ہاؤس کھل چکے تھے۔ جدید سہولتوں سے آراستہ بڑے بڑے اسٹوڈیوز وجود میں آ چکے تھے۔ انفرادی طور پر بھی بہت سے پروڈیوسرز کام کر رہے تھے۔

ان میں سے بعض سرکاری ٹی وی سے ریٹائر ہونے کے بعد مختلف چینلز سے وابستہ ہو گئے تھے۔ بعض فری لانسر کے طور پر کام کر رہے تھے اور کامیاب تھے۔ اداکاروں اور اداکاراؤں کا بھی ایک سیلاب آ چکا تھا۔ اچھے بھلے، کھاتے پیتے گھرانوں کے پڑھے لکھے لڑکے لڑکیاں بھی جوق در جوق ٹی وی انڈسٹری میں آ چکے تھے اور سبھی کو کام مل رہا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس فیلڈ میں شہرت بھی تھی اور پیسا بھی۔ اس دور میں بہت سے لوگ عروج کی طرف جا رہے تھے لیکن لگتا تھا کہ میرے اور فراز کے لیے زوال کا زمانہ شروع ہو گیا تھا۔

بہرحال ہم میدان میں ڈٹے رہے۔ چاروں طرف سرگرمی سے کام جاری تھا، حالانکہ اس دوران مجھے یہ بھی پتا چلا کہ مارکیٹ میں بہت سے ایسے ڈرامے بھی پڑے ہوئے تھے جن پر کم و بیش تیس چالیس کروڑ لاگت آ چکی تھی اور انہیں بھی یقیناً بڑی امیدوں اور ارمانوں سے بنایا گیا ہوگا، لیکن انہیں خریدنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اور فراز نے

جس روز یہ خبر سنی، چند لمحوں کے لیے ہم دونوں گم صم سے ہو گئے۔ میری طرح شاید فراز بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ''اوہ خدایا...... کیا ڈراما انڈسٹری پر یہ وقت بھی آنا تھا۔''

شاید وہ اس لیے بھی زیادہ فکرمند تھا کہ ہماری اس وقت بھی دو سیریلز پائپ لائن میں تھیں جن پر فراز نے دل کھول کر پیسا خرچ کیا تھا اور ان میں نئے دور کے کئی اسٹارز کو کاسٹ کیا تھا۔ ہم انہیں بہت اچھا معاوضہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کے نخرے بھی اٹھا رہے تھے اور بڑی مشکل سے، ان سے کام لے رہے تھے۔ ادھر مارکیٹ میں ہمارا کافی سرمایہ پھنسا ہوا تھا۔ زیادہ تر چیزیں، آنے والے کل کے وعدے پر چل رہی تھیں۔ وہ تو غنیمت تھا کہ فراز کی مالی حیثیت مستحکم تھی۔ وہ بوقتِ ضرورت کمپنی میں اپنی جیب سے مزید سرمایہ ڈال دیتا تھا اور جب چینلز سے ادائیگیاں ہوتی تھیں، تو اپنا سرمایہ واپس نکال لیتا تھا۔ ہم جیسی کمپنیوں کو بینک تو قرضہ دیتے نہیں تھے۔

کچھ عرصے سے میں محسوس کر رہا تھا کہ حالات جو بھی چل رہے تھے، فراز ان سے خوش نہیں تھا لیکن وہ ایک بامروت اور وضع دار انسان تھا، گاڑی کو رواں رکھنے کے لیے اگر اسے دھکا بھی لگانا پڑ رہا تھا تو وہ لگائے جا رہا تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد اس نے مجھے یاد دلا دیا کہ وہ ایک خالص بزنس مین بھی تھا۔ میں اتنے برسوں کے دوران اس کے شاندار رویے کی وجہ سے اس حقیقت کو فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔

ایک روز وہ میرے کمرے میں آیا۔ میں اس وقت ایک اسکرپٹ دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اچانک بولا۔ ''فرحان! میں اس پروڈکشن کمپنی میں اپنی پارٹنرشپ ختم کر رہا ہوں۔''

یکدم ہی میرا دل گویا بیٹھ سا گیا۔ چند سیکنڈ کے لیے میں بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کچھ بھی نہ بول سکا۔ ویسے تو ہمارے درمیان جو کنٹریکٹ سائن ہوا تھا، اس میں یہ شق موجود تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی پارٹنر، جب بھی چاہے، کوئی وجہ بتائے بغیر کمپنی سے الگ ہو سکتا ہے اور پارٹنرشپ ختم کر سکتا ہے، لیکن اتنے برسوں تک اس کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھنے اور انتھک محنت کے ساتھ مسلسل کام کرنے کے دوران میں اس شق کو بھول ہی گیا تھا۔

''کیوں...... خیریت...... کیا مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے؟'' آخر میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

''ارے نہیں بھئی...... ایسا کوئی خیال دل میں مت لانا۔'' وہ گویا ہڑبڑا کر بولا۔ پھر اس نے میز کے دوسری طرف سے ہاتھ بڑھا کر محبت آمیز انداز میں میرا کندھا تھپتھپایا۔ ''تم سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے...... بلکہ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے پارٹنرشپ کے لیے تمہارا انتخاب کیا۔ کسی اور کے ساتھ شاید اتنے طویل عرصے تک، اتنے شاندار انداز میں میری پارٹنرشپ چل ہی نہ پاتی۔''

پھر وہ چند لمحے خاموش رہا، گویا اپنا مقصد بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ آخر وہ الفاظ شاید اسے مل گئے۔ اپنے مخصوص، نپے تلے انداز میں وہ بولا۔ ''یہ میرا خالص کاروباری فیصلہ ہے۔ میں اپنی اس کمپنی کے حال اور مستقبل سے مایوس ہوں۔ ہم نے جتنا اچھا وقت دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔ شوبز میں زیادہ تر لوگوں کے لیے عروج کا دور بہت طویل نہیں ہوتا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں طویل عرصے کے لیے عروج نصیب ہوتا ہے۔ بہرحال میدان میرے سامنے موجود ہے۔ میں اب کسی اور سمت میں قسمت آزمائی کرنے جا رہا ہوں۔ میں ایک بہت بڑے پروڈکشن ہاؤس میں پارٹنرشپ کرنے جا رہا ہوں جس کا انٹرٹینمنٹ بزنس میں بہت بڑا نام ہے۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اپنی کنپٹیوں میں کچھ سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں بہ مشکل بول پایا۔ ''اور میرا کیا ہوگا؟''

''میں تمہیں بالکل ہی ڈوبتا ہوا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' اس نے گویا مجھے تسلی دی۔ ''میں اپنا بنیادی سرمایہ تو بہرحال کمپنی سے نکال لوں گا لیکن کمپنی کا نام تم رکھ سکتے ہو۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہماری جو دو سیریلز پائپ لائن میں ہیں، وہ بھی تم رکھ سکتے ہو۔ البتہ ان کا باقی کام تمہیں اپنے سرمائے سے مکمل کرنا پڑے گا یا پھر کوشش کرنا کہ کوئی چینل باقی فائنانسنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ آفس اور اسٹوڈیو البتہ تمہیں چھوڑنا پڑیں گے۔ اگر تم پروڈکشن جاری رکھنا چاہو گے تو کرائے کے اسٹوڈیوز سے کام چلا سکتے ہو۔ تھوڑا بہت ساز و سامان بہرحال میں تمہیں دے دوں گا تاکہ تمہیں کام جاری رکھنے میں آسانی رہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر سب حساب کتاب ہو جائے گا اور کاغذی کارروائیاں بھی مکمل ہو جائیں گی۔''

یہ سب فیصلے سنا کر وہ اطمینان سے رخصت ہو گیا جبکہ میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو

حوصلہ دیا کہ میں ایک مضبوط سہارے سے محروم ضرور ہوا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میرے لیے سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ میں اپنے طور پر بقا کی جنگ لڑ سکتا تھا۔ میں نے سب کچھ قسمت پر چھوڑ دیا اور اسی کام میں منہمک ہوگیا جو کچھ دیر پہلے کر رہا تھا۔

☆☆☆

علیحدگی بڑے پُرسکون انداز میں عمل میں آگئی۔ میں نے اوسط درجے کے ایک علاقے میں دو کمروں کا پورشن کرائے پر لے لیا۔ اس کے گردوپیش کا جائزہ لے کر میں نے یہ اطمینان کرلیا تھا کہ اگر وہاں تھوڑا بہت شور شرابا بھی ہو تو پاس پڑوس تک آوازیں نہ جائیں، کوئی ڈسٹرب نہ ہو، کسی کو اعتراض نہ ہو۔ پروڈکشن آفس میں کبھی کبھار شور شرابا، موسیقی یا مکالموں کی آوازیں بلند ہونے کی نوبت آتی رہتی ہے۔ فراز نے جو تھوڑا بہت سامان مجھے دیا تھا، وہ بھی میں نے انہی کمروں میں سیٹ کرلیا۔ میرا آفس کسی نہ کسی حد تک ایک چھوٹی موٹی کمپنی کا پروڈکشن آفس دکھائی دینے لگا۔ کمپنی کا نام تو اب بھی وہی تھا لیکن اس کا معیار یکدم ہی کافی نیچے آگیا تھا۔

تبدیلی کے اس جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد میں نے ذرا تفصیل سے اپنے مالی معاملات کا جائزہ لیا۔ میرے پاس معمولی سرمایہ تھا۔ فراز کے ساتھ پارٹنرشپ کے دوران بس یہ ہوا تھا کہ میں نے اچھے علاقے میں بہتر مکان لے لیا تھا۔ ہمارا طرزِ زندگی قدرے آسودہ حال لوگوں والا رہا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے اور بیٹی، دونوں کو پڑھنے کے لیے باہر بھیج دیا تھا۔ یوں گویا زندگی کے کافی سال آرام و آسائش سے گزر گئے تھے لیکن کمپنی کے اکاؤنٹ یا میرے ذاتی اکاؤنٹ میں کوئی زیادہ لمبی چوڑی رقم نہیں تھی۔

دو نامکمل سیریلز میرے ہاتھ میں تھیں یا یوں کہیے کہ پائپ لائن میں تھیں۔ ان میں سے ایک تو ابھی شروع ہی کی تھی۔ اس پر تقریباً سارا کام باقی تھا۔ دوسری آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ بہرحال ان دونوں کو مکمل کرنے کے لیے کافی رقم کی ضرورت تھی۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ میں صرف اپنے وسائل سے انہیں مکمل کرسکتا تھا۔ فراز کی عدم موجودگی میں کوئی چینل بھی ان کے لیے فائنانسنگ پر تیار نہیں ہوسکتا تھا۔ کسی بینک نے بھی مجھے قرضہ نہیں دینا تھا۔ شوبز کے کاموں میں اپنا ذاتی گھر وغیرہ بیچنا میں بے وقوفی سمجھتا تھا۔ اس لیے یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے فوراً جھٹک دیا اور کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح کام چلا رہا تھا۔

سب سے بڑا مسئلہ فنکاروں کی ادائیگیوں کا ہوتا تھا۔ اب ان کے لیے کام کے مواقع بھی بڑھ چکے تھے اور نخرے بھی۔ گو کہ ان کی تعداد بھی کافی بڑھ چکی تھی لیکن سبھی ہر وقت مصروف نظر آتے تھے اور ان کے معاوضوں میں بھی خوب اضافہ ہو چکا تھا اور ادائیگی میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تھی تو کام چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ اب فراز سے میری علیحدگی کے بعد تو انہوں نے میرے سامنے بالکل ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں، کیونکہ انہیں معلوم تھا، میں کوئی مالدار آدمی نہیں ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا جیسے میں بہت دھیرے دھیرے جس سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھ رہا تھا، وہ کسی نے میرے نیچے سے کھینچ لی تھی اور میں دھڑام سے نیچے آگیا تھا۔ بہرحال میں خود کو سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

گھسٹ گھسٹ کر میں نے ایک سیریل مکمل کی۔ اس میں کافی طویل عرصہ لگ گیا۔ اس دوران فنکاروں نے مجھے جتنی باتیں سنائیں، ان سے میں بہت دل برداشتہ ہوا۔ خدا خدا کرکے سیریل مکمل ہوئی تو اسے بیچنے میں مجھے دانتوں پسینے آگئے۔ کافی عرصہ دھکے کھانے کے بعد وہ فروخت ہوئی بھی، تو پیسے اچھے نہیں ملے۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ فراز خان کا ساتھ میسر ہونا میرے لیے کتنا اہم تھا۔

کچھ رقم ہاتھ میں آئی تو میں نے دوسری سیریل پر توجہ دی۔ اسے مکمل کرنا تو اور بھی زیادہ جان جوکھوں کا کام محسوس ہوا۔ کئی مرحلوں پر تو میں حوصلہ ہار بیٹھا کہ شاید میں کبھی اسے مکمل نہیں کرپاؤں گا۔ پھر نہ جانے کس طرح میں کام کو آگے بڑھانے لگتا۔ وقفے وقفے سے، اور کچھوے کی رفتار سے اسے مکمل کرنے کے دوران کئی بار مجھے یوں لگا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ باہر سے دیکھنے والوں کے لیے یہ دنیا جتنی حسین ہے، اندر سے اتنی حسین ہرگز نہیں ہے۔ اس کے اپنے الگ قسم کے مسائل، الگ قسم کی مشکلات ہیں۔

یہ سیریل حالانکہ میں نے بہت زیادہ محنت سے بنائی تھی لیکن اسے بیچنا تو گویا ایک نیا ہمالیہ سر کرنے کے برابر ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد تو مجھے شبہ ہونے لگا کہ میری یہ سیریل بھی ڈراموں کے اسی انبار میں شامل نہ ہوجائے جو مارکیٹ میں تیار پڑے تھے اور جنہیں خریدنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس دوران زندگی کے تمام اخراجات بہرحال جاری تھے۔ چنانچہ جب ایک طویل عرصے کی بھاگ دوڑ اور جوڑ توڑ کے بعد یہ سیریل نہایت مایوس کن شرائط پر فروخت ہوئی، اس

وقت تک مجھ پر چھوٹے موٹے قرضے بھی چڑھنے شروع ہو گئے تھے۔

جب قسطوں میں کچھ رقوم ہاتھ میں آنا شروع ہوئیں تو ان کے غائب ہونے کا پتا ہی نہیں چلا۔ کچھ عرصے بعد اپنے حالات کا جائزہ لینے پر مجھے احساس ہوا کہ میں تو کوئی بڑی پروڈکشن شروع کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ بہرحال مجھے کام تو کرنا تھا۔ بقول شاعر، میری پوزیشن یہ تھی کہ ”مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا۔“

کھینچ تان کر میں نے سیریل پر کام شروع کیا لیکن کام چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتار اس سے بھی کم ہوگئی۔ دو تین فنکار تو بیزار ہو کر سیریل چھوڑ کر ہی چلے گئے۔ اس سے میرے لیے مزید مسائل کھڑے ہو گئے۔ جو حصے شوٹ ہو چکے تھے، انہیں دوبارہ شوٹ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے تو وہ ایک بار ہی بڑی مشکلوں سے شوٹ کیے تھے۔ چنانچہ مجھے کہانی میں کئی تبدیلیاں کرانی پڑیں جس سے سیریل کچھ بے تکی سی ہوگئی اور خدا خدا کر کے جب وہ مکمل ہوئی تو میرے لیے اس کو بیچنا مزید مشکل ہو گیا۔ وہ کسی چینل کو پسند نہیں آرہی تھی۔

اس سیریل کے فروخت ہونے تک میں قلاش ہو چکا تھا۔ اوپر سے اس کی فروخت پر جو رقم حاصل ہوئی، وہ لاگت سے بھی کم تھی اور وہ بھی میرے ہاتھ میں آتے ہی خرچ ہونا شروع ہوگئی۔ زندگی کے سب تقاضے تو اپنی جگہ تھے۔ ایک روز مجھے پتا چلا کہ میں تو تقریباً خالی ہاتھ ہوں۔ مجھ پر صحیح معنوں میں زوال آچکا تھا۔ میں کئی دن تک تو اپنے حالات کے بارے میں سوچتا ہی رہا۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ میں کہاں سے کہاں آگیا تھا۔ بچے ابھی باہر پڑھ ہی رہے تھے۔ وہ پارٹ ٹائم تھوڑا بہت کام کر کے کچھ کما لیتے تھے لیکن رہائش اور تعلیم کے مکمل اخراجات نہیں اٹھا سکتے تھے۔ مجھے بھی ان کو کچھ رقم بھیجنا پڑتی تھی۔ امید تھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیں گے تو انہیں اچھی ملازمتیں مل جائیں گی۔ فی الحال میں انہیں احساس بھی نہیں دلانا چاہتا تھا کہ ان کا باپ اپنے وطن میں اچھی خاصی بلندیوں پر اڑتے اڑتے زمین پر آچکا تھا۔

بہرحال، جلد ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر گویا نئے سرے سے زندگی کی جدوجہد شروع کی۔ میں نے ہر پروڈکشن آفس، ہر پروڈیوسر کے دفتر کے چکر لگانے شروع کیے۔ بظاہر میں میل ملاقات اور سلام دعا کے لیے ہی جاتا لیکن باتوں باتوں میں اگر کوئی چھوٹا موٹا کام ملنے کی بھی امید نظر آتی تو میں اس کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہ کرتا۔ زندگی کی گاڑی ایک نئے ڈھب سے چلنے تو لگی، مگر کبھی اسے جھٹکے لگتے، کبھی یہ لہرا جاتی، کبھی اس کا کوئی پہیا پنکچر ہو جاتا، کبھی اس میں پیٹرول ختم ہو جاتا، کبھی اس کے کسی کھائی میں گرنے کا خطرہ محسوس ہونے لگتا۔ بہرحال زندگی کا سفر جاری رہا۔

کبھی میں کسی نئے اور اناڑی پروڈیوسر کے کسی سے معاملات طے کرا دیتا۔ کبھی کسی پروڈیوسر کو اسسٹ کر دیتا۔ کبھی ایڈیٹنگ میں کسی کی مدد کر دیتا۔ کبھی کسی اسٹیج شو کے مختلف معاملات میں کسی کی مدد کر دیتا۔ کبھی کسی چھوٹے موٹے ڈرامے یا کسی خصوصی ٹی وی شو کی پروڈکشن کا کام مل جاتا۔ کبھی کئی کئی دن اپنے دفتر میں بیٹھ کر مکھیاں مارتے ہوئے بھی گزر جاتے۔ میں تنہا دفتر میں بیٹھا انتظار کرتا رہتا، کہیں سے کام کے سلسلے میں بلاوا آئے، کہیں سے کوئی چیک آئے۔ بُلاوا یا چیک تو شاذونادر ہی آتا لیکن ڈراموں میں کام حاصل کرنے، بلکہ ڈائرکٹ ”اسٹار“ بننے کے خواہشمند اکثر آجاتے۔

ان میں لڑکیاں اور ہر عمر کی خواتین بھی شامل ہوتیں۔ یہ سب لوگ اپنے بارے میں حد سے زیادہ پُراعتماد ہوتے کہ اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ فن کی دنیا میں تہلکہ مچا دیں گے۔ کمپنی کا نام ابھی تک چل رہا تھا۔ لوگ کہیں نہ کہیں سے، نہ جانے کب کب کے قصے سن کر چلے آتے تھے۔ بہت سوں کو تو صرف اداکار بننے اور دنیا میں اپنی صلاحیتوں کی دھوم مچانے ہی کا شوق ہوتا تھا لیکن بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ اس فیلڈ میں بہت پیسا ہے۔ وہ دولت اور شہرت، دونوں ہی چیزیں ”دونوں ہاتھوں“ سے سمیٹنا چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے کام مانگتے تھے۔ ان بے چاروں کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں تو خود کام کی تلاش میں اکثر، نہ جانے کہاں کہاں جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا۔

ایک روز آئینے کے سامنے کھڑے ہونے کے دوران مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں زندگی کا خاصا طویل سفر طے کر چکا تھا۔ میرے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔ آئینہ تو ظاہر ہے، میں روز ہی دیکھتا تھا اور روز ہی اپنے سفید بال بھی دکھائی دیتے تھے اور مجھ سے زیادہ میری بیگم کو دکھائی دیتے تھے۔ شاید اس بے چاری کو یہ اندیشہ

محسوس ہوتا تھا کہ میری وجہ سے کہیں لوگ اسے بھی اچھی خاصی عمر رسیدہ نہ سمجھنے لگیں، اس لیے وہ کئی بار مجھے نہایت فراخدلانہ پیشکش کر چکی تھی کہ اپنے بالوں کو رنگنے کے ساتھ ساتھ وہ میرے بالوں کو بھی رنگ دیا کرے گی لیکن میں نے ہر بار شکریے کے ساتھ اس کی یہ پیشکش مسترد کر دی تھی۔ میں اس جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اس روز جسم کے ساتھ ساتھ شاید روح پر بھی کچھ تھکن طاری تھی، اس لیے سفید بالوں کی طرف کچھ زیادہ ہی توجہ چلی گئی۔ مجھے یاد آیا کہ میں تو اپنی پچاسویں سالگرہ بھی منا چکا تھا اور بہت سے دوستوں، شناساؤں نے مجھے "ہیپی گولڈن جوبلی" کے پیغامات بھی بھیجے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر کچھ تاسف محسوس ہوا۔ پچاس سال کی عمر میں آکر میں واپس وہیں پہنچ گیا تھا جہاں سے میں نے عملی زندگی کا سفر شروع کیا تھا۔ بلکہ اس وقت شاید زندگی میں تفکرات اتنے زیادہ نہیں تھے جتنے اب تھے۔

اب تو تفکرات کی وجہ سے اکثر راتوں کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔ نیند اس وقت آنا شروع ہوتی تھی جب دن کا اجالا پھیلنے لگتا تھا۔ کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ مجھے نیند نہ آنے کی وجہ محض تفکرات ہی نہیں تھے، بلکہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری بیوی خراٹے لیتی تھی۔ مگر اس خیال کے ساتھ ہی مجھے ایک اور خیال بھی آجاتا۔ مجھے یاد آجاتا کہ میری بیوی تو شادی کی رات سے ہی خراٹے لے رہی تھی۔ اس رات ہمیں سونے کے لیے جو تھوڑا بہت وقت میسر آیا تھا، اس کے دوران ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ خراٹے لیتی ہے لیکن اس وقت میں اس کی اس عادت سے ذرا بھی ڈسٹرب نہیں ہوا تھا۔ اس کے خراٹوں کے باوجود میں سو گیا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ شادی کے بعد تقریباً پندرہ سال تک ان خراٹوں نے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ڈسٹرب کرنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ یہ نوبت آگئی کہ میرے لیے سونا ہی ناممکن ہو گیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ چند سال سے ہم میاں بیوی الگ الگ کمروں میں سو رہے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اسے مجھ سے، یا مجھے اس سے نفرت تھی۔ یہ مجبوری میں کیا گیا فیصلہ تھا۔ ظاہر ہے، میرے لیے چند گھنٹوں کی نیند تو ضروری تھی۔ مسئلہ محبت یا نفرت کا نہیں تھا۔ محبت یا نفرت کے بارے میں تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بس، زندگی ساتھ گزر رہی تھی، نہ میں اسے کچھ کہتا تھا اور نہ ہی وہ روایتی بیویوں کی طرح میرے ساتھ چخ چخ کرتی تھی۔

ہماری شادی کو پچیس سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اتنے عرصے تک ساتھ رہنے والے دو افراد ایک دوسرے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف کچھ ایسی ہی بے دھیانی سے دیکھتے ہیں جیسے آپ اپنے بازو کو دیکھتے ہیں، اپنی ٹانگ کو دیکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کی ٹانگ یا بازو کی طرح بیوی بھی آپ کے جسم کا حصہ ہے، ہمیشہ سے آپ کے ساتھ ہے۔ یہ میں صرف اپنا تجربہ بتا رہا ہوں۔ عین ممکن ہے اس ضمن میں ہر شخص کا تجربہ اور نظریہ مختلف ہو۔ بعض اوقات تو میں یہ سوچ کر قدرے حیران بھی ہوتا تھا کہ دو انسان اتنا طویل عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ کیسے گزار دیتے تھے؟ میں دیکھتا تھا کہ بعض لوگوں کی شادی کو پچاس یا ساٹھ سال بھی گزر چکے تھے۔

آج کل چونکہ زیادہ تر مجھے فرصت ہی میسر رہتی تھی، اس لیے اپنے اجاڑ سے آفس میں بیٹھا میں اسی قسم کی باتوں پر اور زندگی کے بارے میں مختلف فلسفوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ اکثر میرا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں بھی بھٹکتا رہتا تھا۔ نوجوانی کا دور بھی کیا دور تھا۔ کبھی میں محلے کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ بھی کھیل لیتا تھا۔ بھاگ بھاگ کر کافی رنز بھی بنا لیتا تھا اور سانس نہیں پھولتا تھا۔ اب یہ حال تھا کہ جس بلڈنگ میں میرا آفس تھا، اس میں لفٹ نہیں تھی، آفس گو کہ تیسری منزل پر تھا لیکن اگر میں ذرا تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر آجاتا تھا تو کافی دیر تک سانس قابو میں نہیں آتی تھی۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں اپنی بیوی مجھے حسینۂ عالم سے کم نہیں لگتی تھی۔ اب وہ محض ایک عورت تھی۔ لاتعداد دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی کچھ عرصے تک میری بیگم ذوق وشوق سے خواتین کے رسالے پڑھتی رہی۔ شاید انہی میں اس نے بعض افسانوں میں وجیہہ ہیرو کے لیے "یونانی دیوتا" کی تشبیہ پڑھی ہو گی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں اس نے شرماتے ہوئے مجھے بھی دو چار مرتبہ یونانی دیوتا قرار دے دیا تھا۔ آج کل وہ کئی مرتبہ میرے پیٹ میں ہولے سے انگلی چبھو کر کہہ چکی تھی۔ "اس توند کا کچھ کریں۔ کچھ زیادہ ہی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ دو چار سال بعد کیا حال ہو گا؟"

میں نے اب اس طرح کی باتوں پر غور کرنا چھوڑ دیا

تھا کہ فی الحال میری کمر کا سائز کیا تھا اور مستقبل میں، اس میں کتنا اضافہ متوقع تھا۔ مجھے اب یہ باتیں فضول لگتی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ اب میں ہیرو تو بننے سے رہا۔ عمر تو عمر ہی ہوتی ہے۔ منہ زور گھوڑے کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ آپ ایکسرسائز کر کے خود کو سلم کر لیں، بال کالے کر لیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز عمر ہے۔ بہت سے لوگوں کے خیالات مجھ سے بہت مختلف تھے۔ میری بیوی بھی ان میں شامل تھی۔ میں کسی سے بھی اس موضوع پر بحث نہیں کرتا تھا۔ ان کی اپنی زندگی اور اپنے خیالات تھے۔ میری اپنی زندگی اور اپنے خیالات تھے۔

ان دنوں کبھی کبھی میرا دفتر جانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ اکثر کوئی مصروفیت ہی نہیں ہوتی تھی۔ بس کبھی کبھار اداکاری، گلوکاری یا کامیڈی کے شوقین آ جاتے تھے۔ ان سب کا خیال یہی ہوتا تھا کہ ان کے اندر ایک بہت بڑا اسٹار چھپا ہوا ہے جسے صرف میں ہی اسے باہر لا سکتا ہوں۔ ہر ایک کی بس یہی فرمائش ہوتی تھی کہ میں انہیں کہیں "چانس" دلوا دوں۔ ان شوقیہ فنکاروں کے سلسلے میں میری کوششیں اکثر رائگاں ہی جاتی تھیں۔

اس روز بھی میں بادلِ ناخواستہ ہی دفتر آیا تھا۔ کراچی میں حالانکہ سردی کچھ زیادہ نہیں پڑتی لیکن اس روز کافی سردی تھی۔ کوئٹہ کی طرف سے آنے والی سرد اور خشک ہواؤں نے گزشتہ رات ہی موسم یک دم بدل دیا تھا۔ اس ہوا کی وجہ سے مٹی اڑنے لگتی تھی اور شہر کی تمام تر رونق اور چہل پہل کے باوجود فضا میں ایک قسم کی ویرانی سی در آتی تھی۔ میں نے دفتر کی کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا تو مجھے اسی مخصوص قسم کی ویرانی کا احساس ہوا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ آج تو شاید "ایک چانس کا سوال ہے بابا" والے لوگ بھی نہ آئیں۔

میرا اندازہ غلط نکلا۔ ابھی مجھے دفتر میں آئے آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ لمبے بالوں اور بھوری داڑھی والے ایک گورے چٹے نوجوان نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور نہایت شائستگی و عاجزی سے پوچھا۔ "مے آئی کم ان سر؟"

"یس...... پلیز......" میں نے بھی حتی الامکان شائستگی سے جواب دیا۔ میں اس وقت روزانہ کی طرح چند لوگوں سے ہیلو ہائے کرنے کے لیے فون پر نمبر ملانے شروع کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس دفتر میں لینڈ لائن فون بھی موجود تھا۔ میں دفتر میں ہوتا تھا تو زیادہ تر وہی فون استعمال کرتا تھا اور روزانہ دفتر پہنچتے ہی سب سے پہلے چند کالز کرتا تھا۔ لوگوں سے رابطے رکھنے کی صورت میں ہی کہیں سے کوئی کام ملنے کی امید ہوتی تھی۔

نوجوان کو اندر آنے کی اجازت دینے کے بعد میں نے ریسیور رکھ دیا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو مجھے پتا چلا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے مزید تین افراد قطار بنائے اندر آ گئے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ جینز اور کڑھائی والی کرتی میں تھی۔ سر پر خوب صورت اونی ٹوپی تھی جس کے نیچے سے اس کے بھورے بال کندھوں کو چھوتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ الیکٹرک گٹار اٹھائے ہوئے تھی۔ ایک نوجوان نے اسپاٹ لائٹس اٹھائی ہوئی تھیں۔ ایک کی بغل میں کی بورڈ دبا ہوا تھا۔

وہ اسی طبقے کے لوگ معلوم ہوتے تھے جسے ہمارے ہاں "برگر کلاس" کا نام بھی دیا جاتا ہے، لیکن ایسا لگتا تھا، جیسے کچھ عرصے سے ان کے گھر والوں نے انہیں گھر سے نکالا ہوا تھا کیونکہ ان کے کپڑے ذرا میلے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں اپنے حلیے کی کوئی پروا ہی نہ ہو۔ انہیں دیکھ کر ہپیوں کی یاد آتی تھی جو کسی زمانے میں ہمارے بڑے شہروں میں خاصی تعداد میں نظر آیا کرتے تھے۔ تاہم ان چاروں کی حالت ہپیوں سے بہت بہتر تھی۔ وہ میلے کچیلے نہیں تھے۔

"سلامالیکم سر۔" ان کی قیادت کرنے والے نوجوان نے باچھیں کھلاتے ہوئے، باقاعدہ مجھے سیلوٹ کیا۔ باقی تینوں نے اس کی آواز میں آواز ملانے کی کوشش کی۔ لڑکی گٹار کو بیلچے کی طرح فرش پر ٹکا کر بڑے اسٹائل سے کھڑی ہو گئی جیسے ماڈلنگ کر رہی ہو۔

میرا جی چاہا کہ پہلے انہیں "السلام علیکم" کا درست تلفظ بتاؤں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا اور دھیمی آواز میں جواب دینے پر اکتفا کیا۔

"سر! میرا نام ٹونی ہے۔" ان کے قائد نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر اپنا تعارف کرایا پھر دوسرے دو نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مونی ہے اور وہ سونی ہے۔"

"اور یہ کہیں پونی تو نہیں ہے؟" میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ان کے لیڈر نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا اور مجھے انگوٹھا دکھا کر اپنی دانست میں داد دی۔ "ویری گڈ سینس آف ہیومر سر...... لیکن اس کا نام ذرا الگ ہے...... چھنو ہے اس کا

نام...... خالص دیسی...... آج کل دیسی چیزیں اِن ہیں نا...... ایک مشہور سنگر کا گانا سن کر اس میں سے اس نے اپنے لیے یہ نام پسند کیا ہے۔ اچھا ہے نا؟"

"ہاں، بہت اچھا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ان دنوں میں ہر چیز کو اچھا قرار دینے کی مشق کر رہا تھا۔ اپنا نام گاؤں کی لڑکیوں جیسا رکھنے والی وہ لڑکی اچھی خاصی مغربی لگ رہی تھی۔ اس کی طرف سے نظر ہٹا کر میں نے تینوں لڑکوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "آپ تینوں کیا بھائی ہیں؟ آپ کے والدین نے آپ کے ملتے جلتے نام رکھے ہیں۔"

گروپ کی قیادت کرنے والے نوجوان نے ایک بار پھر کھوکھلا اور بے ہنگم سا نعرہ لگایا۔ "نو...... نو...... ناٹ ایٹ آل...... ہم بھائی تو کیا پڑوسی بھی نہیں ہیں۔ یہ نام ہمارے پیرنٹس نے نہیں، ہم نے خود رکھے ہیں۔ ہمارے یہ نام شوبز کے لیے ہیں۔ اصل نام تو کچھ اور ہیں۔"

ویسے تو میں انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ ان کا تعلق اسی "ایک چانس کا سوال ہے بابا" والے قبیلے سے تھا لیکن میں نے بظاہر معصوم بن کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو آپ لوگ شوبز میں ہیں؟"

"نہیں، نہیں...... آنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ لائیں گے ہمیں شوبز میں۔" اس کے لہجے میں خود اعتمادی اور خوشامد، دونوں کا امتزاج تھا۔

"اچھا...... یعنی ابھی آپ کا کوئی گانا وغیرہ ریکارڈ نہیں ہوا، کوئی نمبر یا کوئی البم مارکیٹ میں نہیں آیا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہم نے گروپ ہی ایک ہفتے پہلے بنایا ہے۔" گروپ کے لیڈر ٹونی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس کا لہجہ فخریہ سا ہو گیا۔ "ہمارے بینڈ کا نام ہے، بنجارے...... اچھا نام ہے نا؟ خالص دیسی نام ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، آج کل دیسی نام...... ایسٹرن...... اورینٹل نام اِن ہیں۔"

وہ تائید طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا، اور وہ لوگ چونکہ متوقع طور پر مجھے "کلائنٹ" محسوس ہونے لگے تھے، اس لیے میں نے جلدی سے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ گویا میری تائید سے حوصلہ پا کر بولا۔ "اب ہمیں انٹرویوز آپ کرائیں گے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہم کس طرح دنیا میں دھوم مچاتے ہیں۔"

میرا کمرا خاصا بڑا تھا۔ اس کے ایک حصے میں چھوٹا موٹا آڈیشن لینے کے انتظامات بھی تھے۔ اسٹینڈ پر کیمرا لگا ہوا تھا۔ لائٹس بھی تھیں۔ ٹونی خود بھی رنگین لائٹس اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور ان لائٹس کے پلگ لگا کر انہیں آن کر دیا۔ رنگ برنگی لائٹس ادھر ادھر گھومتی نظر آنے لگیں۔ اسٹوڈیو نما اس حصے میں جو لائٹس پہلے سے موجود تھیں، اس نے وہ بھی آن کر دیں۔ کمرے میں روشنیوں کا سیلاب آ گیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو ٹونی؟" میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔ "میرا بجلی کا بل تو پہلے ہی بہت زیادہ آتا ہے۔"

"بجلی کے بل کی آپ فکر نہ کریں سر۔" ٹونی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بجلی کے بل میں اس مہینے کچھ حصہ ہم بھی ڈال دیں گے لیکن آپ کو ہمارا آڈیشن تو لینا ہی پڑے گا۔ کل کو آپ اپنے انٹرویوز میں فخر سے کہہ سکیں گے کہ دنیا کے مشہور بینڈ "بنجارے" کا پہلا آڈیشن میں نے لیا تھا۔"

انہوں نے مجھے تقریباً زبردستی پکڑ کر کیمرے پر کھڑا کر دیا۔ ان کی دی ہوئی، میوزک کی ایک سی ڈی بھی مجھے آڈیو سسٹم میں لگانی پڑی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا گٹار اور کی بورڈ بھی بجانا شروع کر دیا۔ میں نے جلدی سے ساؤنڈ پروف دروازہ اور کھڑکی بند کی۔ کمرے میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ان سب نے لہرا لہرا کر گانا شروع کر دیا۔ روشنیوں اور آوازوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ ان کا گانا، گانا کم اور چیخ و پکار زیادہ لگ رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون سی آواز کس کی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سیکڑوں چڑیلیں کسی جنگل میں بین کر رہی ہوں۔ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ اگر یہ گانا چند منٹ جاری رہا تو میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ تاہم میں ہمت کر کے اس گانے کو شوٹ کرتا رہا۔

دو ڈھائی منٹ بعد میں نے ہاتھ اونچا کر کے اشارہ کیا کہ بس، اتنا کافی ہے۔ میں نے میوزک بند کر دیا۔ اس کے بعد بھی بڑی مشکل سے ان کی چیخ و پکار تھمی اور بے ہنگم اچھل کود بند ہوئی۔ مجھے مزید چند لمحوں تک یہی محسوس ہوتا رہا جیسے کمرے میں وہ طوفانِ بدتمیزی جاری ہے۔ جب اس کے ختم ہونے کا یقین آیا تو پتا چلا کہ اتنی سی دیر میں میرے سر میں شدید درد ہو چکا تھا جو لحہ بہ لحہ بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔

"سر! کیسا لگا آپ کو ہمارا گانا؟" ٹونی نے باچھیں

کھلاتے ہوئے داد طلب لہجے میں پوچھا۔
''زبردست۔'' میں نے اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔ اس وقت اپنی حقیقی رائے ظاہر کرنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔ ساتھ ہی میں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ساری بڑی لائٹس بند کردو۔''
''شاعری کیسی تھی سر؟'' ٹونی ابھی مجھ سے مزید داد کا طلبگار تھا۔
''شاعری بھی زبردست تھی۔'' میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ تین چار سے زیادہ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ دھرتی، سماج، بندھن وغیرہ سمجھ میں آئے تھے۔ تاہم مجھے یہ یقین تھا کہ اس کے گانے کا ایک بول بھی وزن اور بحر میں نہیں تھا۔ زیادہ تر الفاظ ہندی تھے۔ شاعر صاحب بھارتی فلموں سے متاثر معلوم ہوتے تھے۔
چھنو نے ٹونی کے بازو میں بازو پھنسا کر محبت سے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر گویا میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''ٹونی صرف بہترین کمپوزر اور سنگر ہی نہیں، بہت اچھا شاعر بھی ہے۔''
''بے شک...... بے شک...... مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔'' میں نے اپنی کنپٹیاں مسلتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ اپنے کانٹیکٹ نمبرز دے جائیں۔ میں یہ آڈیشن ایڈٹ کر کے کچھ چینلز کو دکھاتا ہوں۔ اگر کوئی بات بنتی ہے تو میں ٹونی کو کال کر کے بتا دوں گا، اوکے؟''
''اوکے۔'' ان سب نے یک زبان ہو کر کہا اور باری باری جوش و خروش سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ رخصت ہونے سے پہلے ٹونی نے ہمت دلانے والے انداز میں میرا کندھا تھپکا اور کہا۔ ''اینڈ ڈونٹ وری اباؤٹ دا الیکٹرسٹی بل۔'' اس نے بجلی کے بل کے سلسلے میں تسلی تو دے دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرے گا۔
وہ لوگ کیا رخصت ہوئے، گویا کوئی زلزلہ یا طوفان رخصت ہو گیا۔ میں کافی دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر تھامے، دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے، آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ حالانکہ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بینڈز کے آڈیشن لیے تھے لیکن آج تو گویا دماغ کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔
چند منٹ بعد میں آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھا، میز کی دراز سے دردسر کی دو گولیاں نکال کر کھائیں، الیکٹرک کیٹل پر چائے بنا کر پی۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے دوبارہ خود کو ایک نارمل انسان محسوس کیا۔ تب میں نے روزمرہ کے رابطوں کا وہ کام شروع کیا جو ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے ملتوی ہو گیا تھا۔
میں نے کئی لوگوں کو فون کیے لیکن کسی سے کوئی خوش خبری سننے کو نہ ملی۔ ہر ایک اپنے ہی مسائل کا رونا رو رہا تھا۔ کسی کی لمبی رقم کسی ٹی وی چینل میں پھنس گئی تھی۔ کسی کی آرٹسٹ ڈراما چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ ہر کوئی ہائے ہائے کر رہا تھا۔ کوئی بھی خوشی سے چہکتا سنائی نہیں دیا۔ میں مایوس اور دل شکستہ سا ہو کر چند لوگوں کے پورٹ فولیو دیکھنے لگا۔ یہ لوگ اداکار بننے کے خواہش مند تھے اور اپنے پورٹ فولیو میرے پاس چھوڑ گئے تھے جو کافی دنوں سے میری میز پر ہی پڑے تھے۔ آج سے پہلے میرا انہیں دیکھنے کو دل ہی نہیں چاہا تھا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچ کر حیران ہوا کرتا تھا کہ ہمارے ملک میں کتنے لوگوں کو اداکاری کا شوق تھا۔ کتنے لوگ فلموں میں، اور ٹی وی پر آنے کے لیے دیوانے ہوئے پھرتے تھے۔
میں اب ایک فلاپ کمپنی کے اجڑے ہوئے سے دفتر میں بیٹھا تھا لیکن میرے پاس بھی ہر مہینے اچھی خاصی تعداد میں لڑکے، لڑکیاں، ہر عمر کی خواتین اور حضرات آتے رہتے تھے۔ لڑکیوں کو ہینڈل کرنا آج کے دور میں سب سے مشکل کام ہو گیا تھا۔ ان کا اپنا مزاج اور پس منظر دیکھنے کے بعد، بہت سوچ سمجھ کر انہیں کسی کے پاس بھیجنا پڑتا تھا۔ بعض لوگ تو انہیں کام دینے کے بجائے کسی اور ہی کام پر لگا دیتے تھے۔ بعض لڑکیوں کے لیے یہ بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا تھا جب لڑکیوں کو ہر ایک کی توقعات پر پورا اترنے کے بعد بھی کچھ نہیں ملتا تھا۔ نہ کام ملتا تھا، نہ پیسے ملتے تھے۔
ہماری سوسائٹی میں بڑے ظالم لوگ پڑے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ دوسرے کا سب کچھ لوٹ لیں لیکن اسے کوئی فائدہ نہ پہنچنے دیں۔ بعض تو خیر، فائدہ پہنچانے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہوتے تھے۔ بس، چائے کی پیالی میں طوفان اٹھاتے رہتے تھے۔ ہوائی قلعے بناتے رہتے تھے۔ لمبی لمبی چھوڑتے رہتے تھے جبکہ بعض، کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں، کچھ نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کے لیے کچھ کرتے بھی تھے، تو بڑی مشکلوں سے کرتے تھے۔ لڑکیاں چاہے کسی بھی قبیل کی ہوتیں، انہیں آگے بھیجنا ایک نازک کام تھا۔ ذرا سی اونچ نیچ ہو جاتی تو بات مجھ پر بھی آسکتی تھی۔

کبھی کبھار کوئی خطرناک واقعہ بھی رونما ہو جاتا تھا۔ ایک ماڈل نے خودکشی کر لی تھی۔ ایک ماڈل کا مرڈر ہو گیا تھا۔ غنیمت تھا کہ میرا ان دونوں واقعات سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ ویسے تو جب سے میں نے بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھا تھا، تب سے میں خودبخود ہی کافی محتاط ہو گیا تھا لیکن ان دو واقعات کے بعد تو میں مزید محتاط ہو گیا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ ہر معاملے کو خالص پیشہ ورانہ انداز میں، حتیٰ الامکان دور دور رہتے ہوئے ہینڈل کرتا تھا۔ اب مجھے صرف روزی روٹی کی فکر ہوتی تھی۔

پورٹ فولیو دیکھتے دیکھتے بوریت ہونے لگی تو میں نے دوبارہ انہیں ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کروں۔ خاصی دیر فارغ بیٹھے رہنے اور کئی جماہیاں لینے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے گھر چلے جانا چاہیے۔ کبھی کبھار جلدی گھر چلے جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ابھی میں اس ارادے پر عمل درآمد کے لیے پرتول رہا تھا کہ لینڈ لائن فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔ میرے اپنے ہی گھر کا نمبر تھا۔ یقیناً دوسری طرف بیگم تھی۔ وہ عموماً پہلے لینڈ لائن پر ہی فون کرتی تھی۔ اس سے تصدیق ہو جاتی تھی کہ میں آفس میں ہی موجود ہوں۔ اس کے فون کرنے کی وجہ زیادہ تر یہی ہوتی تھی کہ وہ کہیں جا رہی ہوتی تھی اور وہ مجھے اطلاع دے کر جاتی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو جہاں آرا بیگم؟'' میں نے ریسیور اٹھاتے ہی پوچھا۔ ''کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ تمہیں جہاں آرا بیگم کے بجائے ''کہاں آرا بیگم کہا کروں۔''

''زیادہ پطرس بخاری بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بیگم نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں مسز قریشی کی طرف جا رہی ہوں۔'' ان کی ساس کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''کیا مبارک باد دینے جا رہی ہو؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں کہ کسی کی موت کے تذکرے سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہ کیا کرو۔'' اس کے لہجے سے کچھ زیادہ ہی سنجیدگی ظاہر ہونے لگی۔

''سوری۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''دراصل ان چیزوں کی فہرست کافی لمبی ہے جن کے بارے میں مذاق کرنے سے تم نے مجھے منع کیا ہوا ہے۔ میں بھول جاتا ہوں کہ اس فہرست میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں۔''

''فہرست لمبی ہے تو اسے لمبی ہی رہنے دو، لیکن تم بات لمبی نہ کرو۔'' جہاں آرا بیگم نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ کھانا کچن میں تیار رکھا ہے۔ مائیکرو میں گرم کر لینا اور خدا کے لیے ٹی وی لاؤنج کی ایش ٹرے، بجھے ہوئے سگریٹوں سے نہ بھر دینا۔ پورے گھر میں سگریٹ کی بو پھیل جاتی ہے۔''

''بے فکر رہو، تمہیں گھر میں کہیں سگریٹ کا ایک بھی ٹوٹا نہیں ملے گا۔ کوئی اور حکم میرے آقا؟'' میں نے چراغ کے جن جیسی خیالی آواز بنانے کی کوشش کی۔ اس بار اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے فون ہی بند کر دیا۔ اس کی گفتگو کو مختصر رکھنے کے سلسلے میں اس قسم کے نسخے اکثر کارگر ثابت ہوتے تھے۔

فون بند کرنے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے اپنے خالی گھر میں جا کر بیٹھنا چاہیے یا اس اجاڑ آفس میں ہی بیٹھے رہنا چاہیے؟ ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو اس بار دوسری طرف سے بیوی کی خشک اور بیزار آواز کے مقابلے میں ایک نہایت خوشگوار اور مترنم آواز سنائی دی۔

''سر! کیا حال ہیں؟'' آواز شناسا سی لگی۔ لہجہ بھی شناساؤں والا تھا لیکن مجھے یاد نہ آیا کہ بولنے والی کون تھی۔

''کون بول رہی ہیں؟'' میں نے احتیاطاً پوچھ لینا بہتر سمجھا۔

''ہائے ہائے...... آپ نے تو کہا تھا، تمہاری آواز بہت منفرد ہے علینہ! سیکڑوں آوازوں میں پہچانی جا سکتی ہے۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے، جب آپ نے یہ بات کہی تھی اور اب آپ اس آواز کو پہچان بھی نہیں رہے۔'' وہ باتونی عورتوں کے انداز میں نہایت تیزی اور روانی سے کہتی چلی گئی۔

میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے علینہ کی آواز پہچان لی اور مجھے یاد آ گیا کہ وہ کون تھی۔ دو تین ماہ پہلے وہ ایک مشہور سنگر بننے کا خواب آنکھوں میں سجائے میرے پاس آئی تھی۔ حالانکہ شکل صورت اور شخصیت بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھی اور اس میں اداکاری کے جراثیم بھی موجود تھے مگر نہ جانے کیوں اس پر صرف سنگر بننے ہی کی دھن سوار تھی۔ آواز مناسب ہی تھی۔ تاہم ایسی آواز والی بیسیوں لڑکیاں ریڈیو، ٹی وی اسٹیشنز کے چکر لگاتی پائی جاتی تھیں۔ اور ہزاروں اپنے گھروں میں بیٹھی تھیں۔ میں نے

جو علینہ سے کہا تھا کہ اس کی آواز بہت منفرد ہے اور سیکڑوں آوازوں میں پہچانی جاسکتی ہے، تو یہ کوئی بہت زیادہ مبالغہ آرائی نہیں تھی۔ شوبز کے میدان میں مجھ جیسے زوال زدہ لوگوں کو اس طرح کی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔

''ارے...... علینہ! کیسی ہو چندا؟'' میں نے اپنے لہجے میں خوشی اور جوش وخروش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ میں آج تمہیں فون کرنے کا ارادہ کررہا تھا۔''

''چھوڑیں، خواہ مخواہ کی رسمی باتیں نہ کریں۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولی۔ ''مجھے معلوم ہے، آپ کو میرا نام بھی یاد نہیں ہوگا...... اور یہ لمبی عمر کی بات بھی نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے لمبی عمر کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی۔''

علینہ جب میرے پاس آئی تھی تو میں نے اسے اپنے ریفرنس کے ساتھ کئی ٹی وی چینلز پر اور کئی پروڈیوسرز کے پاس بھیجا لیکن سرِدست کسی کے پاس کوئی ایسا پروگرام نہیں تھا جس میں اسے فٹ کیا جاسکتا۔ بعض نے محض ''وعدوں کے سودے'' کرکے اس کے ساتھ ''دل پشوری'' کرنے کی کوشش کی۔ اسے اس پر بھی کوئی خاص اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ کچھ ایسی نیک پروین نہیں تھی لیکن اس نے اس لیے انہیں دل پشوری کرنے کا موقع نہیں دیا کہ اسے ان سے فائدہ پہنچنے کی کوئی امید نظر نہیں آئی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ''رات گئی بات گئی'' والا معاملہ ہوگا اور اس کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ وہ ''کچھ لو کچھ دو'' کے فارمولے پر تو مفاہمت کرسکتی تھی لیکن بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے دنیا میں تھوڑے بہت دھکے کھالیے تھے۔ اسے کچھ نہ کچھ عقل آگئی تھی۔

آخرکار میں نے اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بھیج دیا۔ وہاں کئی ہالز تھے جن میں تقریبات یا ڈنرز اور پارٹیاں وغیرہ منعقد ہوتی تھیں۔ ایک دو ہال ایسے بھی تھے جہاں میل اور فیمیل سنگرز مہمانوں کی تفریحِ طبع کے لیے گانے بھی گاتے تھے۔ مہمان کھانے پینے اور گپ شپ کے دوران موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ ایسے ہی ایک ہال میں فیمیل سنگر کی ضرورت تھی۔ میل سنگر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس قسم کی جگہوں پر گانے والے کبھی کبھار کسی ٹی وی پروڈیوسر، فلم پروڈیوسر یا کسی پروموٹر وغیرہ کی نظر میں بھی آجاتے تھے اور انہیں کوئی بہتر چانس مل جاتا تھا۔

ایک آدھ سنگر تو ایسی ہی جگہوں سے آغاز کرکے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اسی امید پر میں نے علینہ کو وہاں بھیج دیا تھا۔ اس کی شخصیت اور آواز، دونوں ہی اچھی خاصی تھیں۔ پیسے تو وہاں کم ہی ملتے تھے لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال بہتر تھا۔ تھوڑی بہت ٹپ بھی ملتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی دولت مند مہمان مہربان ہوتا تھا تو اچھی خاصی رقم بھی نذر کرجاتا تھا۔ علینہ نے اپنی پہلی تنخواہ میں سے آدھی مجھے بطور کمیشن بھجوادی تھی۔ میں بھی اس طرح کے کام یہی سوچ کرکرتا رہتا تھا کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال بہتر تھا۔

میرے ذہن میں ان سب خیالات کی لہر ایک لمحے میں ابھری اور معدوم ہوگئی۔ علینہ کی آواز سن کر مجھے اپنا ڈپریشن کچھ کم ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''مایوسی کی باتیں چھوڑو چندا، یہ بتاؤ حالات کیسے جارہے ہیں؟''

''حالات تو بہتری کی طرف جارہے ہیں۔ گزر بسر ہونے لگی ہے لیکن وہ جو فلور منیجر ہے نا...... اکرم...... وہ بڑی منحوس چیز ہے۔ آتے جاتے، لوگوں کی نظر بچا کر چٹکیاں بھرتا رہتا ہے۔ نیل پڑجاتے ہیں جسم پر۔ پتا نہیں، کیا ملتا ہے اسے چٹکیاں بھر کے...... اور کچھ نہیں کرتا...... نہ کچھ کہتا ہے...... بس چٹکیاں بھر کے، احمقوں کی طرح مسکراتا رہتا ہے۔ ایک دو مرتبہ تو میں اسے تھپڑ رسید کرتے کرتے رہ گئی۔ مجھے کوئی دوسرا کام مل گیا نا تو اسے ضرور دو چار تھپڑ مار کے جاؤں گی۔ ہوش ٹھکانے آجائیں گے...... چھچھوندر کا بچہ۔'' اس نے گویا دل کا غبار نکال کر گہری سانس لی۔

میں اکرم کو سرسری سا جانتا تھا۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا۔ دبلا پتلا تھا۔ بال اچھے طریقے سے رنگے ہوتے تھے۔ ڈیوٹی پر اسے ہمیشہ ٹائی اور سوٹ میں رہنا پڑتا تھا۔ اس وقت اس کی شخصیت خاصی معقول نظر آتی تھی اور وہ سنجیدہ مزاج معلوم ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں کوئی اس قسم کی عادت موجود ہوگی۔ علینہ نے بتا کر مجھے حیران کردیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ میں تو اسے معقول آدمی سمجھتا تھا۔'' میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''چھوڑیں فرحان صاحب!'' وہ اپنے مخصوص اور قدرے تیکھے سے انداز میں بولی۔ ''اچھی خاصی عمر ہونے اور شوبز کی دنیا میں بال سفید کرلینے کے باوجود آپ میں مردم شناسی کی صلاحیت کچھ خاص نہیں ہے۔''

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے لڑکی! یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اڑتی چڑیا کے پَر گن لیتا ہوں میں۔'' میں نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ وہ مجھ سے بیس پچیس سال چھوٹی ہونے کے باوجود اور مجھے ''سر'' کہنے کے باوجود، شروع سے ہی بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی۔ زندگی نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ وہ جب میری استانی نظر آنے کی کوشش کرتی تھی تو مجھے اچھا لگتا تھا۔

''ارے چھوڑیں فرحان صاحب! آپ کیا اڑتی چڑیا کے پَر گنیں گے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''آپ کو تو اڑتی چڑیا اور اڑتی چمگادڑ میں فرق کا پتا نہیں چلتا ہوگا۔ خیر...... چھوڑیں ان باتوں کو...... میں تو آپ کو یہ بتانے لگی تھی کہ میں نے اسے سمجھانے اور معقولیت کا راستہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔''

''اچھا......؟ بہت خوب...... اور کیا تھا وہ معقولیت کا راستہ؟'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''میں نے اس سے کہا، یہ تم کیا فضول کام کرتے رہتے ہو، اس نوچ کھسوٹ سے بھلا تمہیں کیا ملے گا، تمہارے ہوٹل میں اتنے امیر لوگ آکر ٹھہرتے ہیں، ان میں بہت سے شوقین مزاج اور ''ضرورت مند'' بھی ہوتے ہوں گے۔ مجھے ان سے ملوایا کرو، دوستی کروایا کرو، جو بھی آمدنی ہوگی، اس میں سے تمہیں تمہارا معقول کمیشن مل جایا کرے گا۔ امدادِ باہمی کے اصول کے تحت زندگی گزارنا کیا کوئی بُری بات ہے؟''

''پھر اس نے کیا کہا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''وہ کمینہ بُرا منا گیا۔ کہنے لگا، میں تمہیں لات مار کر نوکری سے نکال باہر کروں گا۔ میں نے کہا، تمہاری کیا اوقات ہے مجھے نکلوانے کی، مجھے فرحان صاحب نے جنرل منیجر سے بات کر کے رکھوایا ہے، مجھے صرف جی ایم نکال سکتے ہیں یا پھر ہوٹل کے مالک۔''

''اس پر تو وہ اور بھی غصے میں آگیا ہوگا۔ اپنی اتھارٹی دکھانے کا شوق تو ہر ایک کو ہوتا ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں، وہ چپ ہو گیا...... بلکہ یوں کہیں کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔'' اس نے قدرے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''تم تو بہت جھگڑے باز لڑکی ہو۔ اس بے چارے کا غصہ ٹھیک تھا نا۔ تم اسے کس کام پر لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسے غصہ تو آنا ہی تھا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''آپ بھی بڑے بھولے بادشاہ ہیں۔'' وہ ترحم آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں تو حیران ہوں، آپ جیسا آدمی شوبز میں کیسے آگیا اور اتنا ٹائم کیسے گزار گیا۔ ارے بابا، میں نے اسے اس کام پر کیا لگانا تھا، وہ تو پہلے ہی اس کام پر لگا ہوا ہے، اور نہ جانے کب سے لگا ہوا ہے۔ میرے خیال میں تو اس کا اصل کام یہی ہے، نوکری ایک طرح سے اس کا پارٹ ٹائم کام ہے۔ آپ کو پتا ہے، پینتالیس ہزار اس کی تنخواہ ہے اور وہ پینتالیس لاکھ کی گاڑی میں ہوٹل آتا ہے۔ رہتا بھی اچھے علاقے میں ہے۔''

ایک لمحے کے لیے میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس ہوٹل کے خاص خاص لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن علینہ تھوڑے سے دنوں میں شاید مجھ سے کہیں زیادہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

''لیکن...... پھر تو اسے تمہاری آفر یا تجویز لپک کر قبول کر لینی چاہیے تھی۔'' میں نے ذرا سنبھل کر کہا۔ ''اس نے الٹا اس بات پر غصہ کیوں ظاہر کیا؟''

''وہ ابھی مجھے چیک کر رہا ہے۔ اسے مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔ ایسے لوگ ڈرتے بھی تو بہت ہیں نا۔ وہ اپنا اطمینان کرے گا کہ میں اس کے ''کام کی لڑکی'' ہوں یا نہیں؟ کہیں کسی نے مجھے ''پلانٹ'' تو نہیں کیا ہے؟'' اس نے یوں مجھے سمجھایا جیسے کوئی سمجھدار اور جہاندیدہ خاتون کسی احمق بچے کو سمجھا رہی ہو۔ پھر وہ خوشگوار اور قدرے مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے یقین ہے، اس کی اور میری پارٹنر شپ اچھی چلے گی۔''

''اگر تمہارا خیال ہے کہ تم ترقی کے راستے پر قدم رکھنے والی ہو، تو میری طرف سے پیشگی مبارک باد۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''لیکن پھر بھی...... ہر قدم اٹھاتے وقت محتاط ضرور رہنا۔ بے شک تم ایک تیز طرار لڑکی ہو لیکن بہرحال لڑکی ہو۔ دولت اور شہرت کی طرف جانے والے راستے آسان نہیں ہوتے۔''

''آپ بے فکر رہیں سر! آپ نے پہلا قدم اٹھانے کے سلسلے میں میرا ہاتھ تھام کر مجھے سہارا دیا۔ میں نے بس کے پائدان پر پاؤں پھنسا لیا ہے۔ اب آگے جگہ میں خود بنا لوں گی اور سفر کٹ ہی جائے گا...... لیکن فی الحال آپ اس چھچھوندر کے بچے، اکرم کو نوچ کھسوٹ سے باز رہنے کی ہدایت ضرور کر دیں۔ آپ کی بات وہ مان لے گا۔ فی الحال

میری بات نہیں مانے گا لیکن کچھ عرصے بعد ماننے لگ جائے گا۔"

"او کے۔ میں ایک آدھ دن میں خود ہوٹل آ کر اس سے بات کروں گا۔" میں نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ وہ شاید مطمئن ہو گئی اور اس نے "شکریہ" کہہ کر فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے گھر جانا چاہیے یا کہیں اور؟ بیگم گھر پر نہیں تھی۔ گویا حالات کہیں اور جانے کے لیے بھی سازگار تھے۔ کئی جگہیں تھیں جہاں میں جا سکتا تھا لیکن چند منٹ بعد میں کسی فیصلے پر پہنچے بغیر ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ کبھی کبھی میں گاڑی میں بیٹھنے کے بعد فیصلہ کرتا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ میں نے بریف کیس اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ یوں آہستگی سے کھلا جیسے کھولنے والا ہچکچاہٹ کا شکار ہو۔ پھر ایک نسوانی چہرے نے اندر جھانکا۔ دروازہ تھوڑا سا اور کھلا تو اس کا پورا سراپا نظر آ گیا۔

وہ چوبیس پچیس سال کی ایک دبلی پتلی لڑکی تھی جس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ لمبی پلکوں سے آراستہ، بڑی بڑی، گہری سیاہ آنکھیں، جن میں ان گنت سوچوں کی پرچھائیاں لرزتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پتلے اور تراشیدہ سے ہونٹ لپ اسٹک سے بے نیاز تھے۔ بھورے بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر جھکی ہوئی تھی۔ رنگت گوری اور رخساروں کی ہڈیاں قدرے اُبھری ہوئی تھیں۔ چہرہ میک اَپ سے بے نیاز تھا۔

"مے آئی کم اِن سر؟" اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ آواز اچھی تھی اور شرمیلے پن کے امتزاج نے اسے مزید دلکش بنا دیا تھا۔

"یس...... پلیز......" میں نے کھڑے کھڑے ہی جواب دیا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتی اندر آ گئی۔ اس دوران مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دبلی پتلی ضرور تھی مگر نشیب و فراز کی دلکشی جہاں جہاں موجود ہونی چاہیے تھی وہاں ضرور موجود تھی۔ اس نے مجھے بریف کیس لیے کھڑے دیکھا تو ذرا چونکی اور معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔ "اوہ...... میں سمجھی تھی، آپ کا آفس ذرا دیر تک کھلا رہتا ہوگا لیکن...... آپ تو شاید جا رہے ہیں۔ میں کل آ جاؤں گی۔"

"ارے...... نہیں...... آپ کو یوں کوئی بات کیے بغیر واپس جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے بریف کیس واپس رکھ دیا اور دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ "میں تو اس لیے جلدی آفس بند کر کے جا رہا تھا کہ میرے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔"

وہ مسکرا دی۔ شاید اسے میری صاف گوئی پسند آئی تھی۔ میں نے اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس لمحے میری توجہ چھوٹے سے اس سفری بیگ کی طرف گئی جو اس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر معذرت خواہانہ سے انداز میں میری طرف دیکھا اور بیگ فرش پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی اس نے یوں گہری اور طویل سانس لی جیسے بہت دیر بعد اسے آرام سے بیٹھنے کا موقع ملا ہو۔ اس کا لباس قیمتی، جدید یا شاندار نہیں تھا، وہ عام سی شلوار قمیص میں تھی لیکن اس میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔

چند لمحے ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کا دہن ذرا بڑا اور ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ کسی حد تک، آنکھوں ہی کی طرح اس کے چہرے پر ہونٹ بھی نمایاں تھے۔ دھیرے دھیرے ان ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے قدرے شرمیلے سے انداز میں پوچھا۔ "آپ مجھ سے پوچھیں گے نہیں کہ میں آپ کے پاس کیوں آئی ہوں؟" اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ کسی ریڈیو آرٹسٹ جیسی۔

"نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "عام طور پر مجھے ضرورت نہیں پڑتی پوچھنے کی۔ آنے والا تھوڑی بہت دیر میں خود ہی بتا دیتا ہے۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ تاہم اس کی مدھم مسکراہٹ برقرار رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھا کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گویا ازسرِنو میرا جائزہ لیا اور ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے کسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ سنگر یا ایکٹر بننے کی خواہش رکھنے والوں کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔ ان کے زبردست شوق یا مجبوری سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔"

"میں تم سے اس نامعلوم مہربان کا نام نہیں پوچھوں گا جس نے تم سے یہ بات کہی۔ بہرحال آئندہ اس سے ملاقات ہو تو میری طرف سے اس کا شکریہ ضرور ادا کر دینا۔ آج کل کوئی کسی کے بارے میں کسی غرض یا مطلب کے، کوئی اچھی بات کر دے تو یہ اس کی بڑی مہربانی اور اعلیٰ

ظرفی ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر ایک لمحے کے توقف کے بعد سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''مجھے کوئی بہت پاک باز یا ''فرشتہ صفت'' قسم کا انسان ہونے کا دعویٰ نہ پہلے کبھی رہا ہے اور نہ ہی اب ہے لیکن یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کسی کی مجبوری، کمزوری، ضرورت یا جنون کی حد تک بڑھے ہوئے شوق سے کوئی ناجائز فائدہ کبھی نہیں اٹھایا۔ میں معاملات کو خالص پروفیشنل انداز میں آگے لے کر چلتا ہوں۔ پروڈکشن، ڈائریکشن، نئے ٹیلنٹ کو انٹروڈیوس کرانا...... انہی سب کاموں سے میری روزی روٹی وابستہ ہے۔ یہ تو ہوا میرے اندر کے انسان کا تعارف۔ اب تم بتاؤ کہ تمہیں سنگر بننا ہے یا ایکٹریس؟ تمہاری شکل بھی اچھی ہے اور آواز بھی۔ تم کس شعبے میں قسمت آزمائی کرنا چاہتی ہو؟''

''دونوں میں۔'' اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ''جس میں زیادہ کامیابی کی امید نظر آئی، پھر صرف اسی کو اختیار کر لوں گی۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے طمانیت سے سر ہلایا۔ یہ اچھی بات تھی کہ لڑکی میں کم از کم قوتِ فیصلہ تو موجود تھی۔ ''اب تم مجھے اپنا نام بتاؤ۔''

''نام تو میرا نیلم ہے لیکن میں شوبز کی دنیا میں نیلی کے نام سے آنا چاہتی ہوں۔'' اب اس کا لہجہ پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔

''تمہیں معلوم ہے، کافی سال پہلے ہمارے ہاں اس نام کی ایک نہایت مشہور اور کامیاب فلمی ہیروئن ہوا کرتی تھی جو اپنے عروج کے زمانے میں ہی فلم انڈسٹری چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں، مجھے معلوم ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پہلی بار اسے دیکھ کر ہر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ لڑکی کبھی ہیروئن نہیں بن سکتی لیکن وہ نہ صرف اردو، بلکہ پنجابی فلموں کی بھی کامیاب ہیروئن بنی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تمہاری عمر کی لڑکی کو یہ بات معلوم ہے ورنہ نوجوان نسل کو تو شاید نیلی کا نام یاد ہی نہ ہو...... یا پھر شاید معلوم ہی نہ ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے تو میں نے اپنا نام نیلی رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب اصل نیلی کی واپسی کا تو کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔ اگر میں کامیاب ہوگئی تو یوں سمجھیں کہ ان کا نام دوبارہ زندہ ہوجائے گا۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا جوش جھلک آیا۔

''چلو...... فی الحال ہم تمہارا شوبز کا نام نیلی ہی فرض کر لیتے ہیں۔'' میں نے ایک کاغذ پر مختصراً اس کے کوائف نوٹ کرنا شروع کر دیے۔ ''اپنے بارے میں مزید کچھ بتانا پسند کرو، وہ بتادو۔ مثلاً تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ...... تعلیم...... صحیح عمر...... اور ہاں...... خاص طور پر یہ بھی بتادو کہ تمہاری فیملی یا خاندان میں کسی کو تمہارے شوبز میں آنے پر اعتراض تو نہیں ہوگا؟ کل کو کہیں کوئی کلاشنکوف یا گنڈاسا لہراتا ہوا میرے دفتر میں تو نہیں آجائے گا اور گرج کر یہ تو نہیں کہے گا 'اوئے بڈھیا! توں ساڈی کڑی نوں شوبزنس دا رستہ دکھایا اے؟ ہن مرن لئی تیار ہوجا'' اب اس عمر میں مجھ میں اس قسم کے کسی مولا جٹ یا نوری نت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔''

وہ بے ساختگی سے مگر دھیمی سی آواز میں ہنسی، جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اس کی ہنسی پر اعتراض کر دے گا۔ ہنستے وقت اس کے رخساروں میں گڑھے پڑتے تھے۔ حالانکہ اس کا چہرہ قدرے استخوانی سا تھا۔

''ویسے تو کسی مولا جٹ یا نوری نت کی آمد کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے۔'' اب وہ بولی تو اس کے لہجے میں ہلکی سی شگفتگی تھی۔ میرا خیال ہے، وہ اپنے جن نامعلوم تفکرات کا پشتارہ کندھے پر اٹھائے میرے دفتر تک پہنچی تھی، میں اس کا بوجھ کسی نہ کسی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن فرض کریں، ان میں سے کوئی آ بھی گیا تو وہ آپ کو ''بڈھیا'' کہہ کر کیوں مخاطب کرے گا؟ آپ بوڑھے تو نہیں ہیں۔ اچھے بھلے ہینڈسم اور جوان آدمی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کو ادھیڑ عمر کہا جاسکتا ہے۔''

''میں عمر کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا رہنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے عمر کے بارے میں کوئی کمپلیکس ہے۔ میرا خیال ہے کہ پچاس سال کی حد کراس کر لینے کے بعد انسان کو خود کو بوڑھا سمجھنے کی پریکٹس شروع کر دینی چاہیے تاکہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے تک اسے عادت ہوجائے اور جب اچانک کوئی جوان اور حسین لڑکی اسے انکل یا بابا جی کہہ دے تو اسے صدمے سے ہارٹ اٹیک ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ اسی لیے میں اپنے بالوں کو کلر بھی نہیں کرتا۔'' میں نے پہلی ہی ملاقات میں عمر کے بارے میں اپنا فلسفہ بیان کرنا بہتر سمجھا۔

''آپ ضرورت سے بھی کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند

معلوم ہوتے ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بہر حال، اطمینان رکھیے، میری فیملی میں سے کوئی گنڈا سا یا کلاشنکوف لے کر آپ کے دفتر نہیں آئے گا کیونکہ میری کوئی فیملی ہی نہیں ہے۔''

میں چند سیکنڈ غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید وہ اس بات کی کچھ وضاحت کرے لیکن وہ مزید کچھ نہ بولی۔ میں نے بھی کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ میری وہ امید برقرار تھی کہ رفتہ رفتہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ پھر اسے گویا میرے دوسرے سوالوں کا خیال آیا۔ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ''تعلیم میری صرف انٹر ہے۔ بی اے میں داخلہ لیا تھا لیکن صرف چند مہینے کالج جانا نصیب ہوا۔ حالات کچھ ایسے ہوئے کہ تعلیم چھوٹ گئی...... بلکہ تعلیم ہی کیا...... یوں سمجھیں، سبھی کچھ چھوٹ گیا...... اور کیا پوچھا تھا آپ نے......؟ عمر......؟ ہاں، تو عمر میری پچیس سال سے چند مہینے کم ہے۔''

اس کا مطلب تھا کہ جب میری شادی ہوئی تو وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سراپا دیکھ کر مجھے خیال آرہا تھا کہ جب میری شادی ہوئی تو میری بیوی کسی حد تک اس سے مشابہ تھی۔ اس زمانے میں میرا یہ حال تھا کہ جلد از جلد کام ختم کر کے گھر بھاگنے کو جی چاہتا تھا اور اب یہ عالم تھا کہ بیوی گھر پر ہوتی تھی تو گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ وقت بڑا ظالم ہے۔ انسانوں کو بدل دیتا ہے۔ ان کے خیالات بدل دیتا ہے۔ شاید اسی لیے کبھی کبھی میں بے خیالی میں گنگنانے لگتا ہوں:

وقت نے کیا، کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم، ہم رہے نہ ہم

''چلو خیر...... تمہارا یہ ایک چھوٹا سا رسمی انٹرویو تو ہو گیا۔'' میں نے رائٹنگ پیڈ ایک طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ''تم کل آجاؤ، میں یہاں تمہارا ایک ہلکا پھلکا آڈیشن لے لوں گا۔ یہاں وہ ساری چیزیں موجود نہیں ہیں جو صحیح معنوں میں آڈیشن لینے کے لیے ضروری ہوتی ہیں لیکن اگر میں تمہارے اس ابتدائی آڈیشن سے مطمئن ہوا تو پھر کسی اچھے اسٹوڈیو میں ٹائم لے کر میں تمہارا باقاعدہ آڈیشن لے لوں گا۔ پھر اس آڈیشن کی بنیاد پر میں تمہارے لیے کام تلاش کروں گا۔ میں خود تو آج کل کوئی پروڈکشن نہیں کر رہا۔''

''کل آجاؤں؟'' اس کی آواز ایک مدھم بازگشت کی طرح سنائی دی۔ اس آواز میں ہلکی سی فکرمندی بھی تھی اور ایک عجیب سی اداسی بھی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ ''کل تو شاید میں نہ آسکوں۔''

''کیوں؟'' میں یہ سوال کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

اس نے مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا، گویا اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ پھر شاید وہ بہت سوچ سوچ کر اور اٹک اٹک کر بولی۔ ''میں زندگی کے ایک ایسے دور سے گزر رہی ہوں جس میں مجھے خود پتا نہیں کہ کل میں کہاں ہوں گی۔''

''اوہ......'' میں نے پُرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھا اور مزید کچھ پوچھنے سے اپنے آپ کو بمشکل باز رکھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں اپنے آپ کو اس سے بہت سے سوالات کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اسی طرح وہ بھی اپنے آپ کو بہت سی ایسی باتیں کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس سے پوچھی نہیں جا رہی تھیں۔

آخر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے...... میں تمہارا مختصر آڈیشن تو لے لیتا ہوں۔ ایکٹنگ اور سنگنگ، دونوں کے لیے، تھوڑا بہت اندازہ تو مجھے اسی سے ہو جائے گا۔ دوسروں کو دکھانے کے لیے، بعد میں کوئی ٹائم طے کر کے اچھے طریقے سے آڈیشن کر لیں گے۔''

میں نے لائٹس اور ریکارڈنگ کے جو بھی چھوٹے موٹے سسٹم میرے پاس موجود تھے، انہیں آن کیا اور میک اپ یا ڈریسز کے بغیر ہی آڈیشن لے ڈالا۔ یہ آڈیشن کسی کو دکھانے کے لیے موزوں نہیں تھا لیکن مجھے اسی سے اندازہ ہو گیا کہ نیلم میں اداکاری اور گلوکاری، دونوں کی ٹھیک ٹھاک صلاحیت تھی۔ آج کل ایسے آرٹسٹ شاذونادر ہی سامنے آتے تھے جن میں بیک وقت گلوکاری اور اداکاری کی صلاحیتیں ہوتی تھیں۔ میں جب دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھا تو نہایت سنجیدگی سے سوچ بچار شروع کر چکا تھا کہ اس لڑکی کو متعارف کرانے کے لیے کیا کیا، اور کہاں کہاں کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر میرے سامنے بیٹھ چکی تھی۔

''کیا خیال ہے آپ کا میرے بارے میں؟'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے سہمی سہمی سی آواز میں پوچھا۔ اسے گویا پوری توقع تھی کہ میرا جواب مایوس کن ہوگا۔

''اگر میں خود اس وقت کوئی پروڈکشن کر رہا ہوتا...... کوئی سیریل وغیرہ...... تو میں ایک لمحہ سوچے بغیر تمہیں کسی میجر رول میں کاسٹ کر لیتا اور عین ممکن ہے کہ اوریجنل ساؤنڈ ٹریک یا ٹائٹل سانگ بھی تم سے گواتا، لیکن اب چونکہ مجھے تمہارا آڈیشن لے کر دوسروں کے پاس جانا پڑے گا اس لیے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال، میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا اور مجھے اوپر والے سے ہمیشہ اچھی اُمیدیں رہتی ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں مایوسی کی پرچھائیاں کچھ مدھم پڑتی دکھائی دیں اور ان کی جگہ امید کی کرنیں جھلملائیں۔ میں نے گردن موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور شہر کی روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ میں نے دوبارہ نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص، کھوئے کھوئے سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بھی گویا نہیں دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کہیں جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ مجھے بھی گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی، کیونکہ میری بیوی گھر پر نہیں تھی لیکن نیلم کے یوں بیٹھے رہنے سے میں اندر ہی اندر ایک خفیف سا اضطراب محسوس کرنے لگا تھا۔ آخر اس کا ارادہ کیا تھا؟

ایسا لگتا تھا جیسے اس سے میرا ذہنی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ اس نے شاید میرے اندرونی اضطراب کو محسوس کر لیا۔ اس کا ہاتھ میز کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا اور اس کی مرمریں انگلیاں دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں۔ اندر سے شاید وہ بھی مضطرب تھی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ شاید گھر جانا چاہ رہے ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے غیر ارادی طور پر جواب دیا۔ ''میری بیوی گھر پر نہیں ہے۔ اس لیے مجھے گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

''اوہ......'' اس نے یونہی، بے معنی سے انداز میں کہا۔ ''لیکن بہرحال، آپ گھر تو جائیں گے نا؟''

''یقیناً جاؤں گا۔ کیونکہ میری بیوی کو بہرحال واپس تو آنا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک نظر آفس کا جائزہ لیا۔ بیچ کی دیوار میں دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مضطربانہ انداز میں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے دوبارہ میری طرف دیکھا تو اس کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے۔ تاثرات کیا تھے، کئی ملی جلی کیفیات کا ملغوبا تھے۔ وہ بیک وقت گویا شرمندہ بھی تھی اور مضطرب بھی۔ وہ خجالت بھی محسوس کر رہی تھی لیکن اپنے آپ کو کچھ کہنے پر مجبور بھی پا رہی تھی۔

''وہ...... دراصل......'' اس کی آواز گویا گلے میں پھنسی جا رہی تھی۔ ''میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی...... کہ کیا...... آپ کے جانے کے بعد...... آج رات میں آپ کے آفس میں گزار سکتی ہوں؟ وہ...... دراصل میرے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے...... ہوٹل میں ٹھہرنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔ ویسے بھی شاید اکیلی لڑکی کو آسانی سے ہوٹل میں کمرا نہ ملے...... کیا آپ مجھ پر اتنا بھروسا کر سکتے ہیں کہ مجھے یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں؟''

میں نے اب ایک نئے زاویۂ نظر سے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چارگی بھی تھی۔ مجھے اپنے وجود میں اندر ہی اندر ایک قسم کی جُھرجُھری سی محسوس ہوئی۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے اپنا والٹ نکالا اور اس میں موجود رقم کا جائزہ لیا۔ پھر دو ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہو کہ آج کل میرے مالی حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا کہ یہ ہر اعتبار سے میرا زوال کا زمانہ ہے۔ تم یہ پیسے رکھ لو، لیکن کسی ڈھنگ کے ہوٹل میں ''قیام وطعام'' کے لیے یہ رقم بہت کم ہے...... اور تمہاری وہ بات بھی ٹھیک ہے کہ نچلے درجے کے کسی ہوٹل میں تم جیسی لڑکی کا اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں۔ تم اطمینان سے یہاں ٹھہر سکتی ہو۔ دوسرے کمرے میں ایک آرام دہ صوفہ پڑا ہے۔ میں خود بھی کبھی کبھی اس پر سوتا ہوں۔ اس کمرے میں اٹیچڈ باتھ بھی ہے۔ ایک کونے میں چھوٹی سی کچن ٹائپ جگہ بھی ہے۔ میں تمہیں، قریب ہی موجود ایک چھوٹے، لیکن معقول قسم کے ریسٹورنٹ کے ایک ویٹر کا موبائل نمبر بھی دے جاؤں گا۔ تم اسے لینڈ لائن نمبر سے فون کر کے ضرورت کی کوئی بھی چیز پیسوں کے بغیر منگوا سکتی ہو...... لیکن پھر بھی...... یہ پیسے بہرحال رکھ لو۔'' میں نے ہزار ہزار کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

''نہیں...... نہیں۔'' وہ یوں تیزی سے نفی میں سر اور ہاتھ بیک وقت ہلاتے ہوئے ذرا پیچھے ہٹ گئی جیسے میں نے نوٹ نہیں، بلکہ کوئی سانپ یا انگارا اس کی طرف بڑھا دیا ہو۔ ''میں کوئی کام کیے بغیر آپ سے ایک روپیا بھی نہیں

لے سکتی۔"

"یہ تم کام کے سلسلے میں ایڈوانس سمجھ لو۔ جب کام ملنے لگے گا اور اس کے پیسے بھی ملنے لگیں گے تو میرا یہ ادھار واپس کر دینا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ نرمی کے ساتھ ساتھ میرے لہجے میں اصرار بھی تھا۔

اس نے پیسے لے تو لیے، لیکن اس کے لیے مجھے کافی اصرار کرنا پڑا اور جب اس نے وہ حقیر سی رقم قبول کی تو اس کے چہرے پر اس قدر ممنونیت تھی کہ میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ پھر اس نے میرا شکریہ ادا کیا تو مجھے اس کا لہجہ گلوگیر سا لگا۔ اس سے میں مزید شرمندہ ہو گیا۔

میں نے اس وقت اس کی کہانی جاننے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس قسم کا کوئی سوال نہیں کیا کہ وہ کہاں سے آئی تھی، اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا کیوں نہیں تھا؟ وہ قلاش کیوں تھی؟ مجھے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ میں نے جتنا عرصہ شوبز میں گزارا تھا، اس کے دوران ایک سے ایک حیرت انگیز، لرزہ خیز اور سنسنی خیز کہانی سنی تھی۔ ناقابلِ یقین کرداروں سے واسطہ پڑا تھا۔ اب تو خیر، اچھے اور خوش حال گھروں کی پڑھی لکھی، ماڈرن لڑکیاں بھی پوری منصوبہ بندی کے ساتھ شوبز کا رخ کرتی تھیں لیکن میں نے جب کیریئر شروع کیا تو اس طرح کی لڑکیاں کم اور عجیب و غریب حالات کی شکار اور خود اپنی حماقتوں سے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا لینے والی، یا پھر ذرا ایسی ویسی لڑکیاں زیادہ تعداد میں شوبز کا رخ کرتی تھیں۔

بعض لڑکیوں کی کہیں آنکھ لڑ جاتی تھی، عشق بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر جاتا تھا، ظالم سماج بیچ میں حائل ہوتا تھا، شادی ناممکن ہوتی تھی، آخر لڑکی، لڑکے کے ساتھ فرار ہو جاتی تھی، کسی کی شادی ہو جاتی تھی، بعض جوڑوں کی شادی کی نوبت بھی نہیں آتی تھی، کچھ عرصہ ادھر ادھر دھکے کھانے کے بعد، حالات سے گھبرا کر، یا کسی اور وجہ سے لڑکا، لڑکی کو منجدھار میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا تھا، لڑکی اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے اور پناہ تلاش کرنے کے لیے شوبزنس کا رخ کر لیتی تھی، لاکھوں میں سے کوئی ایک کامیاب ہو جاتی تھی، باقی گمنامی کے اندھیروں یا بدنامی کی دلدل میں گم ہو جاتی تھیں۔ بعض پیٹ پالنے یا آسائشوں کے حصول کے لیے ایک طرف نہ جانے کیا کچھ کر رہی ہوتی تھیں، دوسری طرف شوبز کی دنیا میں قدم جمانے کے لیے بھی جدوجہد کرتی رہتی تھیں۔

بعض کو بہت تاخیر سے شوبز کی دنیا سے دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک بار چالیس پینتالیس سال کی ایک نہایت خوش شکل خاتون میرے پاس آئیں۔ وہ ڈراموں میں کیریکٹر رولز کی تلاش میں تھیں۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی سنائی تو میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ موصوفہ سولہ سال کی عمر میں اپنے گاؤں کے ایک پچاس سالہ، نہایت معمولی شکل صورت کے آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھیں۔ زندگی بھر اس شخص نے کبھی کوئی کام دھندا کر کے نہیں دیا۔ الٹا، بات بے بات مار پیٹ کرتا رہا، موصوفہ کما کے لاتی رہیں، اسے بھی کھلاتی رہیں، اس کی خدمت بھی کرتی رہیں اور اس سے جوتے بھی کھاتی رہیں۔ اب، جبکہ وہ بستر پر تھا، اب بھی کما کر اسے کھلا رہی تھیں اور جواب میں اس سے گالیاں کھا رہی تھیں۔ اب بھی وہ مار پیٹ کرنے کے لیے اٹھ کر موصوفہ کے پیچھے بھاگنے کی کوشش کرتا تھا لیکن جسم میں جان نہیں رہی تھی گر جاتا تھا اس لیے گالی گلوچ پر گزارا کر رہا تھا۔ موصوفہ نے اب تک کبھی اسے چھوڑ کر جانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

شوبز کی دنیا میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عورت کو سمجھنا واقعی بہت مشکل ہے۔ چنانچہ عرصہ ہوا میں نے عورت کو سمجھنے کی کوشش ہی ترک کر دی تھی۔ کسی بھی عورت کو۔

جب نیلم ان دو حقیر سے نوٹوں کو نہایت احتیاط سے اپنے بیگ کی جیب میں رکھ رہی تھی تو اس کے چہرے اور لپ اسٹک سے بے نیاز، خشک ہونٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ اس نے شاید بہت دیر سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔ پیسے رکھنے کے بعد وہ دوبارہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے طمانیت سے مسکرائی تو میں نے اسے گویا فیصلہ سنایا۔ "میں نے تم سے جس قریبی ریسٹورنٹ کا ذکر کیا تھا، میں وہاں سے اپنے اور تمہارے لیے کھانا منگوا رہا ہوں۔ میری بیوی چونکہ گھر پر نہیں ہے اس لیے میں آج رات بےفکری سے یہاں کھانا کھا سکتا ہوں۔"

وہ کچھ بھی نہ بولی۔ سادگی اور معصومیت سے میری طرف دیکھتی رہی۔ ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے واضح طور پر بتاؤ

کہ تمہیں ایک بوڑھے اور اُداس آدمی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''آپ بار بار خود کو بوڑھا کیوں کہے جا رہے ہیں؟ آپ کے بالوں میں جو یہ چاندی سی اتر آئی ہے، یقین کریں، اس نے آپ کی شخصیت کا وقار بڑھا دیا ہے۔ لوگ تو اپنے سفید بالوں کو کالے رنگ میں رنگتے ہیں لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ نے یہ بال سفید رنگوائے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ نے اپنے بالوں کو یہ چاندی جیسا کلر کہاں سے کرایا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر نفی میں سر ہلایا۔ ''لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ بال نہ تو میں نے کلر کرائے ہیں اور نہ ہی دھوپ میں سفید کیے ہیں۔ سب کو اندازہ ہے کہ یہ عمر کی وجہ سے سفید ہوئے ہیں اور جو باقی رہ گئے ہیں، آنے والے برسوں میں وہ بھی سفید ہو جائیں گے۔ تم ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ، میں کھانا منگوالوں نا؟ تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''اعتراض؟'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ''یہ تو آپ کا مجھ پر مزید ایک احسان ہوگا۔ کوئی بھلا احسان پر بھی اعتراض کرتا ہے؟''

میں نے کسی حد تک پُرتکلف کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے کے انتظار کے دوران میں نے اس سے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ شاید وہ اس پر ذرا حیران بھی تھی۔ اس نے از خود بھی کوئی بات نہیں کی۔ زیادہ تر ہم خاموشی سے ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ میرا خیال ہے، خاموشی کی زبان میں ہمارے درمیان کچھ مبہم سی گفتگو ہوئی۔

کھانا آیا تو مجھے اپنا اندازہ درست معلوم ہوا کہ وہ اچھی خاصی بھوکی تھی لیکن اس نے پوری کوشش کی کہ اس حقیقت کا اظہار نہ ہونے پائے۔ خودداری اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ اپنا بھرم برقرار رکھے۔ کھانے کے بعد کافی پینے کے دوران اس کے اعصاب شاید مکمل پُرسکون ہو گئے۔ اس نے خود ہی اپنے بارے میں اختصار سے تھوڑا بہت بتا دیا۔ وہ حیدر آباد کی ایک غریبانہ سی کالونی سے آئی تھی۔ وہ چھوٹی ہی تھی کہ ماں کا کسی بیماری میں انتقال ہو گیا۔ باپ کسی زمیندار ٹائپ آدمی کا ڈرائیور تھا۔ وہ ایک اچھا اور مشفق باپ تھا۔ اس کا ارادہ اسے اچھی تعلیم دلانے کا تھا لیکن ابھی انٹر... تک ہی پڑھا پایا تھا کہ ٹریفک کے ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مالک اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھا۔

ان کے چھوٹے اور غریبانہ سے مکان کی ملکیت کچھ متنازع سی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس پر قبضہ کرنے کے لیے دو تین رشتے دار اس مکان میں آ کر قیام پذیر ہو گئے۔ نیلم کے قریب رہنے کے دوران ان کا ارادہ غالباً مکان کے ساتھ ساتھ نیلم پر بھی قبضہ کرنے کا بن گیا۔ نیلم نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان اس کا حشر تقریباً ویسا ہی ہوگا جیسا اس کٹی پتنگ کا ہوتا ہے جسے بیک وقت بہت سے بچے لوٹنے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ اس دوران وہ ان زمیندار صاحب کی نظر میں بھی آ گئی تھی جن کے ہاں اس کے والد ڈرائیور کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ بھی نیلم کی ہر طرح کی مدد کرنے اور اسے اپنے گھر میں ''پناہ'' دینے پر تُل گئے۔

نیلم کے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس حویلی میں اسے کس قسم کی ''پناہ'' ملے گی۔ وہاں اس سے پہلے بھی دو تین لڑکیوں اور دو تین بیواؤں کو ''پناہ'' مل چکی تھی۔ نیلم ان سب کا حشر دیکھ چکی تھی اور ایسی ''پناہ'' سے پناہ مانگ چکی تھی۔ وہ جب تک حالات کا مقابلہ کر سکتی تھی، کرتی رہی لیکن آخر کار اس نے اس گھر سے نکل بھاگنا ہی بہتر سمجھا۔

کالج کے فنکشنز اور مختلف تقریبات میں وہ گلوکاری اور اداکاری کرتی رہی تھی۔ داد و تحسین کے علاوہ اسے کئی سرٹیفکیٹ وغیرہ بھی ملے تھے۔ اس نے شوبز کے میدان میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ کافی دنوں سے وہ کراچی میں دھکے کھا رہی تھی۔ کئی بڑے پروڈکشن ہاؤسز کے چکر لگا چکی تھی۔ بہت کچھ گنوا چکی تھی۔ پھر شاید کسی نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اس کا رخ میرے دفتر کی طرف کر دیا تھا۔

اس کی کہانی تقریباً میری توقعات کے مطابق ہی تھی۔ اپنے کیریئر کے دوران میں نے اس قسم کی کہانیوں پر بہت سی لڑکیوں سے اظہارِ ہمدردی کیا تھا۔ چنانچہ نیلم سے بھی اظہارِ ہمدردی کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ گھر پر میری بیوی کی آمد کا صبر آزما مرحلہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے نیلم کو برابر والا کمرا دکھایا۔ ''صوفہ کم بیڈ'' کا طریقۂ استعمال سمجھایا اور اس سے اجازت چاہی۔

''آپ اپنا آفس ایک اجنبی لڑکی کے سپرد کر کے جا رہے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔'' اس کی آواز بھرانے لگی اور مجھے شک ہوا کہ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی جھلملانے لگی تھی۔ میں نے جلدی سے

کہا۔ ''ان آنسوؤں کو سنبھال کر رکھو۔ جب تمہیں ڈراموں میں کام ملنے لگے گا تو یہ آنسو بہت کام آئیں گے۔ شوبز میں گلیسرین کی مدد کے بغیر رونے والوں کو بڑا فنکار سمجھا جاتا ہے۔''

وہ مسکرادی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کے ساتھ اس کی مسکراہٹ مجھے بڑی دلکش لگی۔ میں اسے شب بہ خیر اور خدا حافظ کہہ کر گھر آ گیا۔ میری بیوی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں اپنے بیڈروم میں جا کر سو گیا۔

نہ جانے میں کتنی دیر سو پایا تھا کہ کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو بیوی کو سرہانے کھڑے پایا۔ وہ ہمیشہ کی طرح پیشانی پر شکنیں ڈالے مجھے گھور رہی تھی۔ میں حیرانی سے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ میرے بیڈروم میں کیا کر رہی تھی؟ وہ تو دوسرے بیڈروم میں سوتی تھی۔

''تم ایسا کیا خواب دیکھ رہے تھے کہ نیند میں بھی تمہاری باچھیں کھلی جا رہی تھیں؟'' وہ غرائی۔ اس کا بس چلتا تو وہ میرے خوابوں پر بھی سنسر لگا دیتی۔

''میں خواب میں دیکھ رہا تھا کہ ایک خوب صورت اور جوان لڑکی میرے آفس میں صوفہ کم بیڈ پر سو رہی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔'' میری بیوی بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ ''جا، اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا۔'' وہ جانے کے لیے مڑی لیکن دروازے پر پہنچ کر اسے گویا کچھ یاد آیا۔ پلٹتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لیے، مجھے دوسری گاڑی لے دو۔ میری گاڑی تو بہت ہی کھٹارا ہو گئی ہے۔ اب تو مکینک نے بھی اسے دیکھ کر ہاتھ جوڑنے شروع کر دیے ہیں۔ آج بھی اس نے واپسی میں بہت تنگ کیا۔ شکر ہے، کچھ راہ گیروں نے ترس کھا کر دھکا لگا دیا۔''

غنیمت تھی کہ خوش حالی کے دنوں سے ہم میاں بیوی کے پاس الگ الگ گاڑی موجود تھی لیکن اب دونوں بہت کھٹارا ہو چکی تھیں۔ ہم دونوں میاں بیوی کی طرح۔

''بیگم! تم نئی گاڑی کی بات کر رہی ہو...... جو حالات چل رہے ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے خطرہ ہے کہ کہیں مجھے اپنی اور تمہاری، دونوں گاڑیاں بیچ کر کوئی اچھی سی موٹر سائیکل نہ خریدنی پڑ جائے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''تمہارے منہ میں خاک...... اور وہ بھی بہت ساری۔'' میری بیوی نے جل کر کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ دروازہ اس نے زوردار آواز کے ساتھ بند کیا۔

دوسرے روز میں تقریباً دوپہر کو آفس پہنچا تو ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ شاید میں کسی اور کے آفس میں آ گیا ہوں۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ کب میں نے اپنے آفس کو آخری بار اتنا صاف ستھرا دیکھا۔ عرصے سے یہاں جھاڑو، پونچھے اور صفائی کے لیے کوئی نہیں آتا۔ آج میز کرسیاں، فرش، حتیٰ کہ کھڑکیوں کے شیشے تک صاف ستھرے تھے۔ ہر چیز سلیقے قرینے سے اپنی جگہ رکھی تھی۔ ہر چیز چم چم کر رہی تھی۔

''یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے حیرت اور بے یقینی سے کہا۔ نیلم اسکول کی ان لڑکیوں کی طرح ہاتھ باندھے ایک کونے میں کھڑی تھی جن کے کلاس روم کا معائنہ کرنے اسکول انسپکٹر آیا ہو۔

''کیسا لگا آج آپ کو آفس؟'' اس نے داد طلب لہجے میں پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر روشن سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کل کے مقابلے میں زیادہ تازہ دم اور خوش نظر آ رہی تھی۔

''یہ تم نے کیا کیا......'' میں نے کراہ کر کہا۔ ''میں یہاں کیسے بیٹھوں گا؟ مجھے تو صاف ستھرے دفتر میں بیٹھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔''

''اب ہو جائے گی۔ میں آ گئی ہوں نا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر میری ریوالونگ چیئر پر بٹھا دیا۔ وہ خود میرے مقابل بیٹھ گئی۔

''لگتا ہے، جب تک مجھے کام ملنا شروع نہیں ہو جاتا، مجھے آپ کے آفس میں ہی قیام...... بلکہ ''قیام و طعام'' کرنا پڑے گا۔'' اس کے لہجے میں ایک قسم کی التجا چھپی ہوئی تھی جس کی تہ میں شاید اس کی خودداری دفن تھی۔

''اس میں تو بڑے خطرات ہیں۔'' میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھار میری بیوی منہ اٹھا کر یہاں نکل آتی ہے۔ اس نے اگر تمہیں یہاں دیکھ لیا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ تمہارا قیام یہیں ہے، تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا ہم دونوں کے لیے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔'' نیلم اطمینان سے بولی۔ ''میں انہیں شبہ تک نہیں ہونے دوں گی کہ میرا قیام یہاں ہے۔ آپ ان کے آتے ہی میرا آڈیشن لینا شروع کر دیجیے گا۔ اگر وہ زیادہ دیر تک بیٹھی رہیں تو آڈیشن ختم ہوتے ہی، ان کے سامنے میں رخصت ہو جاؤں گی۔ بعد میں آ جاؤں گی۔''

میں قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اتنی آسان سی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن سست ہو رہا تھا۔

''آج سے میں آپ کے آفس میں صفائی، جھاڑو پونچھا وغیرہ کرنے والی ماسی بھی ہوں اور آپ کی چپراسی بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کی سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دوں گی۔ یعنی میں ''تھری اِن ون'' ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے، مجھ سے پوچھے بغیر خود ہی اعلان کر دیا۔

''مجھے ان تینوں کی قطعی کوئی ضرورت نہیں...... اور نہ ہی میرے پاس انہیں تنخواہ دینے کے لیے پیسے ہیں۔'' میں نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا صاف جواب دے دیا۔

''تنخواہ......؟'' اس کی آنکھیں معصومانہ انداز میں پھیل گئیں۔ ''تنخواہ آپ سے کون کم بخت مانگ رہا ہے؟ میرے بس میں ہوتا تو میں خود آپ کو بہت سارے پیسے دیتی اور کہتی کہ مجھے ہیروئن کاسٹ کر کے کوئی زبردست قسم کا ڈراما سیریل بنائیں۔''

''تمہارے منہ میں گھی شکر۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں تو آج کل اکثر ایسی ہی کسی اسامی کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں۔ بہرحال...... اگر تم بغیر تنخواہ ماسی، چپراسی اور سیکریٹری وغیرہ کے فرائض انجام دینے کے لیے بہ خوشی تیار ہو تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''ماسی، چپراسی اور سیکریٹری تو ٹھیک ہے...... اس میں سے ''وغیرہ'' نکال دیجیے۔ اس اسامی پر کام کرنے کا فی الحال میرا کوئی ارادہ نہیں۔'' وہ شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اب میں نے ذرا غور سے، ایک نئے زاویۂ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ لڑکی ذہین تھی۔ کوڑھ مغز ہرگز نہیں تھی۔

اس دن کے بعد سے وہ میرے آفس کا حصہ بن گئی۔ سب سے ضروری، سب سے خاص اور سب سے خوب صورت حصہ۔ اس کی وجہ سے مجھے اپنا آفس بہت اچھا لگنے لگا۔ اس سے پہلے ہر صبح میں بادلِ ناخواستہ آفس آتا تھا۔ بس، یہی امید مجھے کشاں کشاں آفس لے آتی تھی کہ شاید روزی روٹی کا کوئی نیا ذریعہ میسر آ جائے، لیکن اب میں ایک مقررہ وقت پر نہایت اہتمام اور اشتیاق سے تیار ہو کر دفتر پہنچتا۔ ایسا لگتا جیسے میرا جوانی کا زمانہ لوٹ آیا تھا۔ زندگی میں جیسے کچھ معنویت سی پیدا ہو گئی تھی۔ روز و شب کی بے کیفی ختم ہو گئی۔ بغیر کسی مصروفیت کے بھی دن یوں گزر جاتا کہ پتا ہی نہ چلتا۔

عجیب بات یہ تھی کہ میرے آفس میں تھوڑے سے دن گزارنے کے بعد ہی نیلم پہلے سے کہیں زیادہ دلکش، نکھری نکھری اور خوب صورت دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کی نہ جانے کتنے دنوں کی تھکن، درماندگی اور ایک بے عنوان سا خوف ختم ہوا تھا تو اس کے وجود میں سے گویا ایک نئی نیلم برآمد ہوئی تھی اور شاید اسی کی وجہ سے میں بھی خود کو ایک نیا فرحان محسوس کر رہا تھا۔ دل میں زندگی کی ایک نئی امنگ جاگ اٹھی تھی۔ اپنے اندر یہ تبدیلیاں محسوس کر کے مجھے خود بھی حیرت ہوتی۔ اب مجھے اس بات کی بھی کوئی خاص پروا نہیں رہی تھی کہ میرے پاس کام آ رہا تھا یا نہیں؟ بس کھینچ تان کر گزر اوقات ہو رہی تھی، میرے لیے گویا یہی کافی تھا۔

میں ابھی تک نیلم کو کوئی کام نہیں دلوا سکا تھا لیکن وہ صبر و تحمل سے انتظار کیے جا رہی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ اسے کب کام ملے گا؟ اس کے لیے گویا یہی کافی تھا کہ میں اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے کئی جگہوں پر متعارف کرایا تھا۔ کئی جگہ اس کے آڈیشن بھی ہوئے تھے۔ بہت سی جگہوں سے جواب اور نتائج کا انتظار جاری تھا۔ شوبز کے کئی لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میرے آفس میں موجود رہتی تھی۔ ان میں سے بعض بے کار قسم کے لوگوں نے خواہ مخواہ دفتر آنا اور جم کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا، وہ نیلم کی وجہ سے آنے لگے ہیں۔ وہ موقع پاتے ہی نیلم کو سبز باغ دکھانے کی بھی کوشش کرتے لیکن میں چونکہ انڈسٹری کے تقریباً سبھی لوگوں کے شجرۂ نسب تک سے واقف تھا، مجھے معلوم تھا، کون کام کا آدمی ہے اور کون بے پر کی ہانک رہا ہے۔ میں نیلم کو سمجھا دیتا تھا کہ کس آدمی سے سیدھے منہ بات کرنی ہے اور کسے منہ نہیں لگانا ہے۔ وہ سعادت مندی سے میری ہدایات پر عمل کرتی۔

تھوڑے سے دنوں میں ہی مجھے کچھ یوں لگنے لگا جیسے وہ میرے آفس کا ہی نہیں، میری زندگی کا بھی اہم حصہ بن گئی تھی۔ میں گھر سے آفس کے لیے روانہ ہوتا تو مجھے یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ آج کوئی کام ملنے کے امکانات پیدا ہوں گے یا نہیں، معاش کا سلسلہ آگے بڑھنے کی کوئی صورت پیدا

ہوگی یا نہیں۔ بلکہ ذہن میں صرف یہ خیال ہوتا کہ دفتر میں نیلم میری منتظر ہوگی۔ اگر مجھے کوئی فکر ہوتی بھی تھی تو صرف یہ کہ مجھے نیلم کے لیے کام تلاش کرنا ہے، جن لوگوں نے اس سلسلے میں وعدے کیے ہوئے ہیں انہیں یاددہانیاں کرانی ہیں۔ یعنی یوں کہیے کہ مجھے اپنے سے زیادہ نیلم کی فکر تھی۔

گو کہ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اب نیلم کو کام ملنے لگے گا، اس کے پاس رقوم آنے لگیں گی، تو وہ یقیناً میرے آفس سے چلی جائے گی۔ اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کر لے گی۔ اس احساس سے نہ جانے کیوں میرا دل ڈوبنے لگتا۔ اس کے باوجود میں بہرحال تمام تر خلوصِ دل سے اس کے لیے کوششیں کیے جارہا تھا۔

ایک روز میں نے اس کے لیے تقریباً آٹھ دس لوگوں کو فون کیے۔ اپنی سینیارٹی اور مقام کو بھلا کر میں نے ان میں سے ایک دو کی تو خوشامد بھی کی۔ گو کہ یہ خوشامد ہنسی مذاق کے انداز میں تھی لیکن خوشامد، بہرحال خوشامد ہوتی ہے۔ شوبز کے اکثر لوگ بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ اصل مقصد سمجھ ہی جاتے ہیں۔ نیلم کو بھی اندازہ ہوگیا کہ میں اس کے لیے کیا کچھ کررہا تھا۔ وہ میز کے دوسری طرف، میرے مقابل دونوں ہاتھوں کے حلقے میں چہرہ ٹکائے، کہنیاں میز پر رکھے بیٹھی تھی۔ جتنی دیر میں لوگوں سے گفتگو کرتا رہا، وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔

میں نے ریسیور رکھا تو اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور پُرجوش انداز میں اسے چوم لیا اور عجیب بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''آئی لو یو فرحان صاحب!'' اس کے ان چند الفاظ پر نہ جانے کتنے جذبات کا غلبہ تھا۔ اس کا انداز پُرجوش سہی، لیکن درحقیقت اس نے ''تشکر، عقیدت اور احترام کا اظہار کیا تھا مگر میرے وجود میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔ اس طرح کی سنسنی کبھی جوانی کے زمانے میں ہی رگ و پے میں دوڑا کرتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میں نے چند لمحوں کے لیے خود کو جوان ہی محسوس کیا۔ میرا دماغ نہ جانے کون سی ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑا تو میں دھیرے دھیرے واپس زمین پر آنے لگا۔

''تم اتنی محبت سے میرا شکریہ ادا کررہی ہو اور میں خود کو تمہارے سامنے شرمندہ محسوس کررہا ہوں کیونکہ صحیح معنوں میں ابھی تک میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کرپایا۔'' میں نے سچ مچ ذرا شرمندگی سے کہا۔

''میری نظر میں رزلٹ اتنا اہم نہیں ہے، آپ کی کوشش زیادہ اہم ہے۔'' وہ افسردگی آمیز سنجیدگی سے بولی۔ ''میرے لیے آج تک کسی نے، کسی غرض کے بغیر کچھ نہیں کیا۔'' اس کے لہجے میں عمر بھر کی محرومی بول رہی تھی۔ میرا دل کٹ سا گیا۔ میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہوتی تو میں پلک جھپکتے میں نیلم کو ٹی وی کی صف اول کی آرٹسٹ بنا دیتا۔

مزید چند دن گزرے تو نیلم مجھے اپنے آفس کا...... بلکہ شاید اپنی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ لگنے لگی۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ اگر وہ کامیابی کے راستے پر کافی آگے نکل گئی اور اس نے آفس آنا چھوڑ دیا تو کیا میں آفس آیا کروں گا، یا میں بھی آفس آنا چھوڑ دوں گا؟ کہیں میں آفس کو تالا لگا کر جنگلوں کی طرف تو نہیں نکل جاؤں گا؟ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ میں نے ایک نئی زندگی شروع کی تھی اور اس سے پہلے میں نے درحقیقت زندگی نہیں گزاری تھی بلکہ زندگی نے مجھے گزارا تھا یا پھر شاید میں نے سرے سے زندگی ہی نہیں گزاری تھی، محض جھک ماری تھی۔

نیلم آفس میں تقریباً سارا دن میرے سامنے ہی رہتی تھی۔ عجیب بات تھی کہ گھر جانے کے بعد بھی میں زیادہ تر اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ میرے مزاج اور میری حرکات و سکنات میں یقیناً کچھ تبدیلیاں آگئی تھیں جنہیں میری گھاگ بیوی نے بھی آخرکار محسوس کر ہی لیا۔ ایک رات ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھے بغیر، بظاہر نہایت سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''آج کل بہت خوش نظر آرہے ہو۔ کبھی کبھی تو اکیلے بیٹھے، ایک ٹک ہوا میں دیکھتے ہوئے احمقوں کی طرح مسکراتے بھی رہتے ہو۔ کہیں اس عمر میں آکر کسی نئی لڑکی کے چکر میں تو نہیں پڑگئے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک دم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

''لاحول ولا......'' میں نے کچھ ہڑبڑا کر اور کچھ گڑبڑا کر کہا۔ ''یہ لڑکی کا خیال تمہارے موٹے دماغ میں اچانک کہاں سے آگیا؟ تمہیں پتا ہے، جب میں شوبز کی دنیا میں بہت مصروف ہوا کرتا تھا اور ہر وقت لڑکیوں میں گھرا رہتا تھا، اس زمانے میں بھی میں کبھی کسی لڑکی کے چکر میں نہیں پڑا۔''

''اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت۔'' بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہے تم کتنے پارسا رہے

ہو۔ تم اصل میں 'سیسنے' پارسا تھے۔ اب اس عمر میں آکر لڑکیوں نے گھاس ڈالنی چھوڑ دی ہے تو بچ بچ تھوڑے بہت پارسا ہو گئے ہو لیکن مجھے یقین ہے، آج بھی کوئی لڑکی یا خوش شکل خاتون ذرا سی گھاس ڈال دے تو بڈھا شیر فوراً چھلانگیں لگانی شروع کر دے گا۔"

زیادہ پڑھی لکھی عورت سے شادی کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں شوہر کی رگ رگ کو سمجھ جاتی ہے۔ ویسے تو خیر اس معاملے میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ بیوی چاہے چٹی اَن پڑھ ہی ہو، شوہر کی رگ رگ کو وہ بھی سمجھتی ہے۔ لاکھوں میں کوئی ایک خوش نصیب ہوتا ہے جس کی بیوی آنکھیں بند کر کے اس پر اعتماد کرتی ہے۔ مجھے ایک بار پھر اندیشہ محسوس ہوا کہ کسی روز میری بیوی آفس پر "چھاپا" نہ مار دے لیکن ایک بار پھر میں نے اسی خیال سے خود کو تسلی دی کہ اسے، ہرگز توقع نہیں ہو سکتی، میں نے مستقل طور پر کسی لڑکی کو دفتر میں پناہ دے رکھی ہوگی۔

میری بیوی تو میرے دفتر نہیں آئی لیکن ایک روز اچانک علی اختر آن پہنچا۔ میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور وہ بھی حسبِ معمول مجھ سے نہ صرف بغلگیر ہوا بلکہ اس نے میری پسلیاں بھی کڑکڑانے کی کوشش کی۔ اس نے نیلم کا گہری نظر سے سرتاپا جائزہ لیا اور پھر مصافحے کے لیے اس کی طرف بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ کسی لڑکی کے لیے بہت ہی مشکل تھا کہ علی اختر اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا اور لڑکی اس سے ہاتھ نہ ملاتی۔ عام لڑکیوں کے لیے تو یہ ایک اعزاز تھا۔ وہ تو اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مری جاتی تھیں۔ نیلم بھی سحر زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے یوں علی اختر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما جیسے علی اختر نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ شوبز کی بڑی اور انتہائی مقبول و معروف شخصیات کا عام لوگوں پر کچھ ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔

علی اختر کا شمار اس وقت شوبز کی اہم ترین اور مشہور ترین شخصیات میں کیا جا سکتا تھا۔ ابتدا میں وہ صرف پاپ سنگر تھا لیکن اب تو اس کے علاوہ میوزک کمپوزر، ٹی وی آرٹسٹ، فلم ایکٹر، ڈائریکٹر، پروڈیوسر، سبھی کچھ تھا۔ پڑوسی ملک جا کر بھی تین چار فلموں میں کام کر آیا تھا، جس کے بعد ملکی شوبز انڈسٹری میں اس کی کچھ اور دھاک بیٹھ گئی تھی۔ ظاہر ہے، جب اس نے اتنی زیادہ کامیابیاں حاصل کر لیں تو اب اس کے پاس دولت کی بھی ریل پیل تھی۔ اس کا رہن سہن، انداز و اطوار، پہناوا، سب کچھ شاہانہ تھا۔

اس نے جب ایک پاپ سنگر کے طور پر شوبز کی دنیا میں قدم رکھا تو وہ ایک خوش شکل، دبلا پتلا، نوعمر سا لڑکا تھا۔ اب، سترہ اٹھارہ سال شوبز کی دنیا میں گزارنے، بہت محنت کرنے اور بے شمار کامیابیاں سمیٹنے کے بعد اس کی شخصیت پر عمر کے کچھ اثرات دکھائی دینے لگے تھے لیکن بہرحال اب بھی اس کا شمار ہینڈسم اور پُرکشش مردوں میں ہوتا تھا۔ جہاں کہیں اس کا شو منعقد ہوتا تھا، حاضرین میں لڑکیوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ اس کی اپنی توجہ بھی لڑکیوں کی طرف ہی زیادہ ہوتی تھی۔ لڑکوں اور مردوں سے تو وہ محض رسمی سی ہیلو ہائے کرتا تھا۔

علی اختر کے بارے میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے شوبز کی دنیا میں، میں نے متعارف کرایا تھا۔ اس سے بھی زیادہ خاص بات یہ تھی کہ اس نے اس بات کو فراموش نہیں کیا تھا اور ایک احسان کے طور پر یاد رکھا تھا۔ شوبز کی دنیا میں کم لوگ ہی اس قسم کی باتوں کو اس انداز میں یاد رکھتے ہیں۔ علی اختر ابھی تک نہ صرف روزِ اول کی طرح میرے ساتھ احترام سے پیش آتا تھا بلکہ اس نے یہ بھی ایک قسم کی روایت بنا رکھی تھی کہ وہ جب بھی میرے آفس کے سامنے سے گزرتا تھا اور بہت زیادہ جلدی میں نہیں ہوتا تھا تو چند منٹ کے لیے ضرور آفس میں آجاتا تھا۔ وہ اسے "استاد جی کے مزار پر حاضری دینا" کہتا تھا۔ میں جب پرائیویٹ ٹی وی چینل میں ملازم تھا اور پہلی بار میں نے اس سے ایک شو میں گانا گوایا تھا، تب سے وہ مجھے استاد جی ہی کہتا آرہا تھا۔

نیلم جب اپنی تنویمی سی کیفیت سے باہر آکر علی اختر سے اپنا طویل مصافحہ ختم کر چکی اور ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ چکے تو علی اختر گویا اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے میز پر آہستہ سے گھونسا مار کر بولا۔ "استاد جی! بس جلدی سے ایک کڑک چائے پلوا دو۔ ائرپورٹ جا رہا ہوں۔ فلائٹ نہ نکل جائے۔"

اس نے گھڑی دیکھی اور میں نے نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً میرا مطلب سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور چائے بنانے کے لیے کچن نما حصے کی طرف چلی گئی۔ علی اختر آنکھ دبا کر نہایت نیچی آواز میں بولا۔ "یہ کیا نئی سیکریٹری رکھی ہے استاد جی؟"

"ارے نہیں یار! سیکریٹری رکھنے والے حالات

کہاں ہیں آج کل۔'' میں نے بھی تقریباً سرگوشی میں جواب دیا۔ اس دوران نیلم چائے کا پانی الیکٹرک کیتل میں رکھ کر میز کی طرف لوٹ آئی۔ میں نے اب اس کا تعارف علی اختر سے کرایا۔ ''یہ مس نیلم ہیں۔ نیا ٹیلنٹ، آواز اچھی ہے۔ گا بھی سکتی ہیں، ایکٹنگ بھی کرسکتی ہیں۔ میں ان کے بارے میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی کیا ہے۔ ان کے لیے کچھ کرنا ہے۔''

علی اختر نے ایک بار پھر گہری نظروں سے نیلم کا سرتاپا جائزہ لیا۔ نیلم ابھی تک اس کی موجودگی سے سحرزدہ سی نظر آرہی تھی۔ علی اختر ایک بار پھر میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''یہ تو میں بہت اچھے وقت پر آگیا۔ مجھے اس وقت اپنی اگلی وڈیو کے لیے ایک فیمیل، بیک اپ سنگر کی ضرورت ہے۔ لڑکیاں تو بہت ہیں لیکن ان میں کوئی بھی خوب صورت نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں، صرف آواز ہی اچھی نہ ہو، شکل بھی اچھی ہو۔ میں پرسوں لاہور سے آجاؤں گا۔ اس سے اگلے دن آپ مجھے فون کرکے ٹائم طے کرکے اسے میرے پاس بھیج دیں۔ مجھے اُمید ہے یہ میری اگلی ویڈیو میں ہوگی۔''

''بھیجنا کیا ہے، میں خود لے کر آجاؤں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کون سے اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ ہے؟''

''ٹرپل اے میں...... کچھ آؤٹ ڈور کا کام بھی ہے۔'' علی اختر نے جواب دیا۔

''بس، ٹھیک ہے۔ میں فون پر پروگرام طے کرکے آجاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم چاہو تو میں ابھی کمپیوٹر پر اس کا آڈیشن دکھا سکتا ہوں۔''

''میں نے بتایا نا کہ ابھی تو میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''لاہور سے واپسی پر فوراً یہ کام کرنا ہے۔ میں خود فون کرلوں گا۔''

یہ پروگرام طے پاگیا اور چائے پی کر علی اختر رخصت ہوگیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے پہلے سے کہیں زیادہ گرمجوشی سے نیلم سے ہاتھ ملایا۔ نیلم کے انداز میں بھی گرمجوشی تھی۔

اب میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ درحقیقت نیلم کو میں نے اسی دن کھودیا تھا۔ کوئی مجھ سے یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ میں نے نیلم کو پایا ہی کب تھا، جو کھودیا؟ لیکن میں کیا کروں، میرے محسوسات کچھ ایسے ہی ہیں۔ مجھے بعد میں یہ پچھتاوا بھی ہوتا رہا کہ میں نے نیلم کو علی اختر سے متعارف ہی کیوں کرایا؟ اسے کیوں بتایا کہ نیلم سنگر اور ایکٹریس بننے کے لیے آئی تھی۔ میں نے علی اختر سے کیوں فرمائش کی کہ وہ نیلم کے لیے کچھ کرے؟ جبکہ میں علی اختر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھ سے بہتر بھلا اسے کون جان سکتا تھا؟ یہ کہنا بھی بے جا نہیں تھا کہ میں اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

میں اپنے طور پر نیلم کے لیے جو کوششیں کررہا تھا، وہ کرتا رہتا، ذرا تاخیر سے ہی سہی، لیکن ان کوششوں کا نتیجہ بھی بہرحال نکل ہی آنا تھا۔ نیلم کچھ نہ کچھ تو بن ہی جاتی۔ اس روز علی اختر کی آمد میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ باتیں شروع ہوئیں تو شاید میرے منہ سے غیر ارادی طور پر سب کچھ نکلتا چلا گیا۔ پھر جو کچھ ہوا، وہ اتنی تیزی سے ہوا کہ میں بس ہونقوں کی طرح بیٹھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔

علی اختر نے لاہور سے واپس آتے ہی نیلم کو ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو بلالیا۔ اس روز آفس سے میری روانگی تک وہ اسٹوڈیو میں ہی تھی۔ دوسرے روز میں آفس آیا تو وہ آفس میں موجود تھی۔ اس روز پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر حقیقی خوشی دیکھی۔ اس نے علی اختر کے ساتھ بیک اپ سنگر کے طور پر نہیں بلکہ ساتھی گلوکارہ کے طور پر ڈوئٹ گایا تھا۔ اسے ریکارڈنگ فون پر کاپی کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی، ورنہ وہ مجھے دکھاتی۔ وہ سافٹ ڈرنکس تیار کرنے والی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا پروگرام تھا اور نیلم کو، بالکل نئی اور نو وارد ہونے کے باوجود اس میں گانے کا موقع بھی مل گیا۔ ظاہر ہے یہ علی اختر کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔

اس کے بعد تو جلد ہی نیلم کی ترقی کا سفر کچھ ایسی تیز رفتاری سے شروع ہوا کہ میں ہکا بکا ایک طرف کھڑا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس ہونق دیہاتی بچے کی طرح، جو ویرانے میں کہیں کھڑا ہو اور تیز رفتار ٹرین اس کے سامنے سے گزرتی جارہی ہو۔ نیلم کو دھڑا دھڑ کام ملنے لگا۔ ڈرامے، سیریلز، میوزک شوز اور نہ جانے کون کون سی پروڈکشنز میں وہ بک ہونے لگی۔ ابھی اس کا کام ٹی وی پر نظر نہیں آیا تھا لیکن اسے چیک ملنے لگے تھے۔ اس کا بینک اکاؤنٹ بھی نہیں تھا۔ مجھے ہی اس کے ساتھ جاکر اس کا اکاؤنٹ کھلوانا پڑا۔

میں نیلم کی جس گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے آگے بڑھانے کی کوشش کررہا تھا، علی اختر نے آتے ہی اسے نہ صرف اسٹارٹ کردیا تھا بلکہ اب وہ فراٹے بھر رہی تھی۔ علی اختر خود جتنے بھی پروجیکٹس کررہا تھا، ان سب میں کسی نہ کسی طرح نیلم کو بھی ایڈجسٹ کرادیتا تھا۔ نیلم کو مواقع ملنا شروع ہوئے تھے تو اس کی صلاحیتیں بھی کھل کر سامنے آئی تھیں۔ وہ

المیہ، طربیہ، ہر قسم کے کردار کر لیتی تھی اور گا بھی لیتی تھی۔ اب اس کے ٹیلنٹ کی قدر ہو رہی تھی۔ وہ کافی مصروف رہنے لگی تھی۔ میں دن چڑھے دفتر پہنچتا تو اکثر وہ جا چکی ہوتی تھی اور دفتر سے میرے رخصت ہونے تک وہ واپس نہیں آئی ہوتی تھی۔ میں جب بھی فون کرتا، وہ مسرت آمیز لہجے میں مجھے بتاتی کہ وہ فلاں جگہ یہ کر رہی ہے، فلاں جگہ وہ کر رہی ہے۔ بعض اوقات مجھے اس کا فون بند بھی ملتا۔ میری زندگی میں ایک بار پھر ویرانی سی چھانے لگی۔ دل کے آنگن میں کچھ عرصے کے لیے بہار سی آئی تھی، اب وہاں پھر خزاں کی ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگیں۔

ایک روز میں آفس پہنچا تو وہ اپنا بیگ کرسی کے قریب رکھے بیٹھی تھی، فون اس کے ہاتھ میں تھا اور کی پیڈ پر اس کی مرمریں انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں۔ شاید وہ کوئی میسج ٹائپ کر رہی تھی۔ اس کا بیگ مجھے پیک لگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھی لیکن آج اس کی خوشی کے اظہار میں ایک قسم کا نیاپن تھا۔

''میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ اٹھ کر مجھ سے تقریباً گلے ملتے ہوئی بولی۔

''کافی دنوں بعد یہ نوبت آئی ہے کہ تم مجھے میرا انتظار کرتی ہوئی ملی ہو۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر میں نے اس کے بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم کہیں جا رہی ہو؟''

''جی سر۔'' وہ اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ، کھنکتی سی آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ کو بہت عرصہ تکلیف دی اور آپ نے میرے لیے بہت زحمت اٹھائی، میں آج جو کچھ بھی ہوں اور آگے چل کر بھی جو کچھ بنوں گی، وہ آپ کی وجہ سے بنوں گی لیکن اب میں یہاں، دفتر میں رہ کر آپ کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنوں گی۔ علی اختر نے میرے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا ہے۔''

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس تصور سے میرا ذہن اور دل سائیں سائیں کرنے لگا تھا کہ وہ جا رہی تھی۔

''کیا بندوبست کر دیا ہے؟'' بمشکل میرے حلق سے آواز نکلی۔

''ڈیفنس میں فرنشڈ اپارٹمنٹ لے دیا ہے۔'' اس کے لہجے میں خوشی پنہاں تھی۔

میں یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس روز پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ جب وہ میرے پاس آئی تھی، اس وقت کی، اور آج کی نیلم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت، خوش لباس اور پُرشباب تھی۔ عمدہ میک اپ کی وجہ سے اس کا حسن کچھ اور نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔

''میرے خیال میں تو تمہیں علی اختر کے دلائے ہوئے اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' میں بمشکل کہہ پایا۔ ''کہیں وہ تمہیں کچھ زیادہ ہی مہنگا نہ پڑے۔''

''آپ فکر نہ کریں سر! وہ میں دیکھ لوں گی۔ میں زندگی کا مقابلہ کرنا جانتی ہوں۔'' وہ پہلے سے کہیں زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ مسکرائی۔

''تم زندگی کا مقابلہ کرنا یقیناً جانتی ہو گی لیکن تم علی اختر کو نہیں جانتیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا، بس پُراسرار سے انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔ میں اس مسکراہٹ کا مطلب سمجھتا تھا۔ بہت سی دوسری لڑکیوں کی طرح شاید وہ بھی یہی کہنا چاہتی تھی کہ علی اختر کو جتنا بہتر وہ سمجھتی ہے، اتنا بہتر شاید اس سے پہلے کوئی نہیں سمجھ سکا ہو گا۔ نیلم نے چونکہ منہ سے یہ بات نہیں کہی، اس لیے میں بھی خاموش رہا۔ ورنہ میں اسے بتانے کی کوشش کرتا کہ علی اختر کو جتنا بہتر میں جانتا تھا، اتنا شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''بہرحال، مجھے جب بھی وقت ملا، میں آپ سے ملنے کے لیے آتی رہوں گی۔ آپ سے تعلق تو اب زندگی بھر نہیں ٹوٹ سکتا۔ آپ میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔''

اچانک اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے، باری باری انہیں چوما، آنکھوں سے لگایا۔ اس کے انداز میں عقیدت اور ممنونیت تھی لیکن اس کے گداز ہاتھوں کے حرارت بھرے لمس سے میرے وجود میں سر سے پاؤں تک بجلی سی دوڑ گئی۔

''آئی لو یو فرحان صاحب۔'' وہ جذبات سے مغلوب لہجے میں بولی۔

اس نے میرے ہاتھ چھوڑے تو گویا زندگی سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہاتھ ہلا کر مجھے خداحافظ کہہ کر رخصت ہو گئی۔ میں بت بنا، وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ نیلم کی موجودگی سے دفتر میں گویا ایک بہار، ایک

ترنگ، ایک عجیب سی مسرت کا احساس رہتا تھا جو اس کے ساتھ ہی رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد دفتر میں گویا کچھ رہا ہی نہیں۔ کہنے کو میں وہیں تھا لیکن میرا وجود گویا اپنے معانی کھو چکا تھا۔ میں وہاں ہوتے ہوئے بھی گویا وہاں نہیں تھا۔ میں شاید کہیں بھی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنے جسم کو حرکت دینے کے قابل ہوا تو میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ نیلم کیسے جارہی تھی؟ کیا اس نے آن لائن کوئی ٹیکسی منگوائی ہوئی تھی؟ میں نے نیچے دیکھا تو وہ مجھے علی اختر کی بی ایم ڈبلیو کی ڈکی میں اپنا بیگ رکھتی نظر آئی۔ گاڑی فٹ پاتھ سے لگی کھڑی تھی لیکن علی اختر نے اوپر میرے پاس آنے کی تو کیا، گاڑی سے اترنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ شاید ڈرائیونگ سیٹ پر ہی تھا۔ نیلم نے ڈکی بند کرکے پسنجر سائڈ کا اگلا دروازہ کھولا اور دوسرے ہی لمحے گویا بڑی سی سیاہ گاڑی نے اسے نگل لیا۔ برسوں کی ویرانی، نہایت تکلیف دہ بے کیفی اور شادی شدہ ہونے کے باوجود شدت سے محسوس ہونے والی تنہائی کے بعد نیلم میری زندگی میں آنے والی خوب صورت رفاقت کی ایک مختصر سی بہار تھی جسے علی اختر اپنی جوانی، وجاہت، اثر رسوخ، دولت اور شہرت کے زور پر لوٹ کرلے گیا تھا اور میں کھڑا منہ دیکھتا رہ گیا تھا...... بلکہ منہ بھی نہیں...... میں تو بس اس کی شاندار گاڑی کی ڈکی کو دیکھتا رہ گیا تھا جو چند لمحوں میں میری نظر سے اوجھل ہوگئی۔

میں پلٹ کر میز کی طرف آیا اور تھکے تھکے انداز میں اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھیر ہوگیا۔ میں اپنے آپ کو وہ مسافر محسوس کررہا تھا جس کی زندگی کا تمام سرمایہ کوئی ڈاکو اچانک لوٹ کرلے گیا تھا۔ مجھے اس روز اندازہ ہوا کہ میں دفتر میں نیلم کی موجودگی کا کس قدر عادی ہوگیا تھا اور نہ جانے کیوں میں نے یہ فرض کرلیا تھا کہ وہ اب زندگی بھر یہیں رہے گی۔ کبھی، کہیں نہیں جائے گی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ یہ احمقانہ سا خیال میرے ذہن کے کسی گوشے میں کب بیٹھ گیا تھا۔ علی اختر نے مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کردیا تھا۔ مجھے اس پر شدید غصہ آرہا تھا لیکن یہ مجبور غصہ تھا۔

تین چار دن میں نے صبر کیا لیکن آخر کار میں نہ رہ سکا۔ میں نے شام کو نیلم کو فون کیا۔ مجھے امید تو نہیں تھی لیکن اتفاق سے وہ گھر پر تھی۔

''کیا میں تم سے ملنے آسکتا ہوں؟'' میں نے ہچکچاتے

کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے، اعصابی کمزوری دور کرنے، تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔ آپ آج ہی فون کریں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

ہوئے پوچھا۔ مجھے اندیشہ تھا، کہیں وہ یہ نہ کہہ دے کہ وہ کسی شوٹ پر جا رہی تھی، بس گھر سے نکلنے ہی والی تھی۔

''کیوں نہیں، اس میں پوچھنے کی بھلا کیا بات ہے؟ آپ کا میرے گھر آنا میرے لیے تو ایک اعزاز ہوگا۔'' اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے میرے آنے کی بات سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھی ہو۔ صرف یہی نہیں، اس نے تو ایک فارسی محاورہ بھی استعمال کر ڈالا۔ ''چشم ما روشن دلِ ماشاد۔'' تاہم میں یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ علی اختر کا، کرائے پر دلایا ہوا فلیٹ اس کے لیے ''میرا گھر'' ہو چکا تھا۔

''بھئی واہ، تمہیں تو فارسی بھی آتی ہے۔'' غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں خوشی کی ترنگ آئی۔

''بس، دو تین لنگڑے لولے سے محاورے ہی آتے ہیں۔'' وہ عاجزی سے بولی۔

''وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں بہت سے محاورے آجائیں گے... بلکہ فارسی کے تو کیا، انگریزی کے بھی آجائیں گے۔'' پھر میں نے جلدی سے کہا۔ ''اچھا، چھوڑو ان باتوں کو...... جلدی سے اپنا ایڈریس بتاؤ۔''

اس نے ایڈریس نہ صرف بتایا، بلکہ سمجھا بھی دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ''اس کے گھر'' میں تھا۔ ابھی شام کے سائے گہرے نہیں ہوئے تھے لیکن وہ نائٹ گاؤن میں تھی۔ ایک خوب صورت، آرام دہ اور طبیعت پر کچھ خاص اثرات مرتب کرنے والا نائٹ گاؤن۔ ''کیا یہ علی اختر کے استقبال کی تیاریاں تھیں؟'' میں سوچے بغیر نہ رہ سکا اور میرے دل کے کسی گوشے سے غم و غصے کی چنگاریاں سی پھوٹیں۔

''اس کا گھر'' دو بیڈ روم کا نہایت خوب صورت، آراستہ و پیراستہ اپارٹمنٹ تھا۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی اور نیلم کے انداز سے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے وہاں رہ رہی تھی۔ اس نے خاصی خوشی کے ساتھ مجھے اپارٹمنٹ کا تفصیلی ''معائنہ'' کرایا۔ اس کے لہجے میں خوشی کے ساتھ ساتھ ہلکا سا فخر بھی تھا۔

خاطر مدارت کے دوران جب وہ میرے قریب صوفے پر بیٹھی تھی تو اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی دلفریب خوشبو میرے حواس سے کھیل رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران موقع مناسب محسوس کرتے ہوئے میں نے وہ بات شروع کی، جو میں دراصل کرنا چاہتا تھا۔

''نیلم! تم یہ تو مانتی ہونا، کہ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں......'' اس نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''میرے خیال میں تو آپ اس دنیا میں میرے سب سے بڑے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں۔''

''تمہارا یہ سب سے بڑا ہمدرد اور خیر خواہ تمہیں مشورہ دینا چاہتا ہے کہ تم علی اختر کے ساتھ رہنے کی غلطی نہ کرو۔'' میں نے گہری سانس لے کر آخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

''میں اس کے ساتھ تو نہیں رہ رہی ہوں۔'' اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''اس نے تمہیں یہ فرنشڈ اپارٹمنٹ لے کر دیا ہے۔ سارا کام بھی وہی دلوا رہا ہے۔ راتوں کو یقیناً اس کا یہاں آنا جانا بھی شروع ہو چکا ہوگا۔ یہ تقریباً ساتھ رہنا ہی ہے...... اور یہ رہنا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ تمہیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ علی اختر جتنا وجیہہ، شائستہ اور نرم خو نظر آتا ہے، اندر سے وہ ویسا نہیں ہے۔ اندر سے وہ ایک درندہ ہے۔ وہ اپنی زندگی میں آنے والی لڑکیوں کو نوچتا کھسوٹتا ہے، بھنبھوڑتا ہے۔ کوئی بھی لڑکی چند دن سے زیادہ اس کے قریب نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے تو آج تک اس کی شادی نہیں ہو سکی، حالانکہ اس کی عمر اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ وہ اب کچھ ایسا لڑکا بالا یا نوخیز اور نوجوان نہیں رہا۔ جو بھی لڑکی اسے اچھی طرح جان لیتی ہے، وہ اس سے شادی پر تیار نہیں ہوتی۔''

وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے یہ سب کچھ سن کر علی اختر پر نہیں، بلکہ مجھ پر افسوس ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے بات جاری رکھی۔ ''صرف یہی نہیں، علی اختر کے ساتھ ایک اور مسئلہ ہے۔ اس کے پاس اب دولت، شہرت اور مقبولیت، سب کچھ ہے لیکن ان چیزوں کے لیے اس کی ہوس ختم نہیں ہوتی۔ وہ اپنے بڑے بڑے پروجیکٹس میں اپنا سرمایہ لگانے کا خطرہ مول نہیں لیتا بلکہ سرمایہ لگانے کے لیے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو گھیرتا ہے اور اس مقصد کے لیے ان کی خدمت میں لڑکیاں پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا...... اور وہ تم جیسی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جنہیں خوب نکھارنے اور گروم کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا دیتا ہے۔ اس قسم کی لڑکیاں بس چار دن اپنی چمک دمک دکھانے کے بعد گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جاتی ہیں۔ کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ وہ کب آئیں، کب چلی گئیں۔ میں تمہیں بڑی محبت، بڑے خلوص سے مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ تم خود کو ان لڑکیوں کی صف میں شامل نہ کرو۔

خرگوش سے وہ کچھوا بہتر ہے جو آخر میں ریس جیت جاتا ہے۔"

نیلم جس طرح خاموشی اور انہماک سے میری بات سن رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا کہ میری تقریر دل پذیر اس کے خیالات میں زبردست انقلاب برپا کر رہی ہے۔ جلد ہی میری خوش فہمی دور ہو گئی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے گہری سانس لے کر ترحم آمیز سے انداز میں میری طرف دیکھا اور بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سر! مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ کو میری زندگی کی، میرے حالات کی اور میرے مستقبل کی بہت فکر ہے لیکن میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی آئی ہوں اور ان کے اچھے یا بُرے نتائج کا سامنا بھی خود ہی کرتی آئی ہوں۔ آپ پلیز، میری بالکل فکر نہ کریں۔ آپ اپنی زندگی ہمیشہ کی طرح ایک پُرسکون اور ٹھہری ہوئی جھیل کے انداز میں گزارتے رہیں۔ آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا، میرے لیے وہی بہت ہے اور میں آپ کے احسانات کو زندگی بھر فراموش نہیں کروں گی لیکن میری زندگی مجھے گزارنے دیں۔ اگر خدانخواستہ میرے ساتھ کچھ غلط ہو بھی گیا تو میں کوشش کروں گی کہ آپ کو پتا بھی نہ چلے، تاکہ آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔"

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا میری زندگی سے نکل جانا ہی میرے لیے سب سے بڑی پریشانی بن گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اگر وہ اچانک میرے دفتر سے چلی گئی یا میری زندگی سے نکل گئی تو میرے محسوسات کیا ہوں گے۔ میرے دل میں ایک گھاؤ سا پڑ گیا تھا جو بہت اذیت دے رہا تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں غصے کا آتش فشاں بھی مچل رہا تھا۔ غصہ شاید مجھے علی اختر پر تھا۔ برسوں بعد میری بے کیف اور نامرادسی زندگی میں آنے والی چھوٹی سی خوشی بھی وہ چرا کر لے گیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ سرِدست نیلم سے اس سلسلے میں مزید بات کرنا بیکار تھا۔ میں نے فیصلہ کیا میں اب علی اختر سے ہی بات کروں گا۔ میں نے نیلم سے اجازت طلب کی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی اور دروازہ کھولنے سے پہلے لجاجت آمیز سے لہجے میں بولی۔ "آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا؟"

"میں تم سے بھلا کیسے ناراض ہو سکتا ہوں۔" آواز میرے گلے میں اٹکنے لگی۔

اس نے ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے، انہیں چوما، آنکھوں سے لگایا اور گلوگیر سے لہجے میں بولی۔ "آئی لو یو فرحان صاحب!"

میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ میں جلدی سے، خود ہی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ عمارت سے باہر آ کر میں نے کھلی ہوا میں چند گہری گہری سانسیں لیں، تب اپنے آپ کو گاڑی ڈرائیو کرنے کے قابل محسوس کیا۔

اس کے بعد میں کئی دن تک علی اختر کو بار بار فون کر کے ملاقات کا وقت لینے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کا منیجر فون ریسیو کرتا اور مجھے بتاتا کہ علی اختر کو تو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے ایک دن اس سے براہِ راست رابطہ ہوا تو اس نے ایک اسٹوڈیو کا نام بتاتے ہوئے کہا کہ وہ وہاں ایک لمبی ریکارڈنگ کر رہا تھا لیکن کسی وجہ سے ریکارڈنگ ایک گھنٹے کے لیے رک گئی تھی۔ وہ اس وقت کو چند لوگوں سے ملاقات کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ وہ صرف اس دوران ہی مجھ سے مل سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ میرے پہنچنے تک اگر کوئی اور موجود ہوا تو وہ اسے رخصت کر دے گا۔ اسٹوڈیو میرے دفتر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور اس سے کہہ دیا کہ میں آ رہا ہوں۔

میں جب وہاں پہنچا تو گارڈز نے مجھے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ گارڈز سے لے کر اسٹوڈیو کے مالکان تک، سب مجھے جانتے تھے۔ علی اختر مجھے لان پر ہی بیٹھا مل گیا۔ یہ اسٹوڈیو ایک خاصی بڑی، بنگلا نما عمارت میں تھا۔ جس میں سوئمنگ پول بھی تھا۔ علی اختر کو چار پانچ آدمی گھیرے بیٹھے تھے۔ زور شور سے بات چیت جاری تھی۔ کچھ کاغذات بھی لہرائے جا رہے تھے۔ علی اختر کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے نیچی آواز میں ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں میرے لیے ناگواری تھی۔ تاہم وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ برآمدے میں شاید کسی سین کی ریہرسل جاری تھی۔ دو باکسر جھوٹ موٹ لڑ رہے تھے۔ پیچھے ایک کارٹن رکھا تھا جس پر بڑا سا پچاس کا ہندسہ نظر آ رہا تھا۔

وہ جا چکے تو میں علی اختر کے قریب پہنچا۔ اس نے پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے انداز میں پہلی سی گرمجوشی اور احترام نہیں تھا۔ اس کے سامنے تپائی پر ایک کلپ بورڈ، کچھ کاغذات اور میک اَپ کا تھوڑا سا سامان پڑا ہوا تھا۔ عمارت کے برآمدے میں اسٹوڈیو

کے کچھ ٹیکنیشن مختلف چیزیں اٹھائے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ ان میں سے دو تین نے دور سے مجھے دیکھ کر اشارے سے سلام بھی کیا۔ مجھے یاد نہیں تھا، وہ کون تھے۔

''لگتا ہے، آپ کو مجھ سے کوئی بہت ہی خاص بات کرنی ہے۔'' میں بیٹھ چکا تو اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ پھر ایک لڑکے کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، شیو بڑھا ہوا تھا، لباس ماڈرن، قیمتی لیکن بے ڈھنگا اور شکن آلود تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود کم بخت ہینڈسم لگ رہا تھا۔

''ہاں...... بات تو بہت ضروری اور خاص ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، گہری سنجیدگی سے کہا۔ وہ گھڑی دیکھنے لگا تو میں نے تمہید یا ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنا بہتر نہ سمجھا اور فوراً ہی اصل بات پر آ گیا۔

''میں نیلم کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ تم کئی لڑکیوں کی زندگی برباد کر چکے ہو۔ میں چاہتا ہوں، نیلم کو تم معاف کر دو۔ اس وقت وہ تمہاری شخصیت کے سحر میں گرفتار ہے۔ اس وقت وہ کسی کے سمجھانے سے کچھ نہیں سمجھے گی...... اور جب وہ سمجھے گی، اس وقت بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم خود ہی اسے چھوڑ دو۔ اپنی شخصیت کی کشش، اپنی لچھے دار باتوں کے جادو اور اپنی دولت کے سحر سے آزاد کر دو۔ اسے اس کی اپنی اور میری ذات کے بل بوتے پر جدوجہد جاری رکھنے دو۔ مجھے یقین ہے، وہ اس صورت میں بھی اسٹار بن جائے گی۔ تمہارے سہارے کے بغیر بھی اپنی منزل پر پہنچ جائے گی۔ تمہارے چنگل میں پھنس کر اس وقت تو اسے ہر چیز بہت حسین نظر آ رہی ہو گی لیکن ایک روز وہ اندھیروں میں کھو جائے گی۔''

علی اختر نے ترحم آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔ ''فرحان صاحب! آپ کے یہ مکالمے بہت اچھے ہیں۔ اگر آئندہ آپ کو کوئی ڈراما پروڈیوس کرنے کا موقع ملے اور کوئی سچویشن موزوں نظر آئے تو اس میں استعمال کر لیجیے گا۔''

''علی! میں بہت سنجیدہ ہوں۔ میری بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش نہ کرو۔ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہت بُرا بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ پر زوال ضرور آ گیا ہے لیکن ابھی میں مرا نہیں ہوں۔ اگر میں فی الحال نیلم کا کیریئر بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کسی کا کیریئر خراب کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے اپنے دھمکی آمیز لہجے کو حتی الامکان متاثر کن بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ خبیث متاثر ہونے کے بجائے استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا۔

پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بات کیا ہے فرحان صاحب؟ میں نے آپ کو اپنی برسوں کی شناسائی کے دوران اتنا جذباتی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آپ شوبز کی دنیا کے آدمی ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ اگر آپ ماضی میں بہت زیادہ کھل کھیلنے والے آدمی نہیں رہے ہیں تو کچھ اتنے زیادہ پارسا بھی نہیں رہے ہیں۔ اب اس عمر میں آ کر آپ کو ایک ایسی لڑکی کی اتنی زیادہ فکر کیوں لاحق ہو گئی ہے جسے آپ پوری طرح جانتے بھی نہیں؟''

حقیقت یہ تھی کہ میں نے نیلم کو بہت زیادہ کریدا نہیں تھا لیکن میرا خیال یہی تھا کہ میں اسے بہت اچھی طرح جان چکا تھا، سمجھ چکا تھا۔ تاہم میں نے علی اختر کے سامنے اپنی زبان سے یہ دعویٰ نہیں کیا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''تم اس بحث میں نہ پڑو کہ میں اسے جانتا ہوں یا نہیں...... وہ مجھے جانتی ہے یا نہیں...... مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم اس سے لاتعلق ہونے پر تیار ہو یا نہیں؟''

اس کی پیشانی پر شکنیں اور چہرے پر واضح ناگواری نظر آنے لگی۔ وہ گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نیلم سے جا کر کیوں نہیں کہتے کہ وہ میری زندگی سے نکل جائے؟''

''میں نے کہا نا...... کہ وہ اس وقت کئی پہلوؤں سے تمہارے جادو میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ میری بات نہیں سنے گی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ مجھے یقین تھا، نیلم اسے بتا چکی ہو گی کہ میں اسے سمجھانے گیا تھا۔

''تو پھر مجھ سے آپ نے کیوں امید رکھ لی کہ میں آپ کی بات مان لوں گا؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں ابھی تک آپ کی عزت کرتا ہوں، شوبز کی دنیا میں زیادہ تر لوگ ان لوگوں کی ہمیشہ عزت کرتے ہیں جنہوں نے انہیں انٹروڈیوس کرایا ہوتا ہے لیکن آپ میری نجی زندگی میں اتنا زیادہ دخل دے کر مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں آپ کی عزت کرنا چھوڑ دوں۔''

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری بات نہیں مانے گا۔ اس کے ساتھ مغز کھپانا فضول تھا۔ میں جب اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا تو وہ طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''کہیں آپ نیلم

کے عشق میں تو گرفتار نہیں ہو گئے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔ وہ میری خاموشی کو گویا اقرار سمجھتے ہوئے بولا۔ ''بڑھاپے کا عشق بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ میرا آپ کو یہی مشورہ ہے، آپ اب اس چکر میں نہ پڑیں۔ آپ بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔''

''میں تمہیں بوڑھا نظر آتا ہوں؟'' میں نے غصے سے کہا۔

اس نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگالی اور ایک طویل، ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''ہماری سوسائٹی میں ایک یہ بھی مسئلہ ہے۔ کوئی بوڑھا اپنے آپ کو بوڑھا تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ اوپر سے حفیظ جالندھری صاحب وہ لازوال نظم لکھ گئے...... ابھی تو میں جوان ہوں...... پھر سونے پر سہاگا یہ کہ ملکہ پکھراج نے اتنے ظالم انداز میں اسے گا دیا۔ خیر...... مجھے ان باتوں سے کیا لینا۔'' پھر اس نے اچانک ہی نہایت بیزاری سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''مجھے تو بس یہ گزارش کرنی ہے کہ آپ میرا وقت ضائع نہ کریں اور میرا دماغ خراب نہ کریں۔ مجھے کام کرنے دیں۔ میرا ٹائم بہت قیمتی ہے۔ آپ کے پاس بھی اگر کوئی کام ہے، تو جا کر وہ کریں، اور نیلم کو بھول جائیں۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ اس بڑھاپے میں آپ کہیں ذلیل ورسوا نہ ہوں۔ آپ کے بچے امریکا میں یا شاید انگلینڈ میں کہیں پڑھ رہے ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے۔'' اس کی نظروں میں ایک بار پھر میرے لیے ترحم جھلک آیا۔

میرا خون کھول گیا اور کنپٹیوں میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ میں ایک جھٹکے سے یوں اٹھا کہ پلاسٹک کی کرسی الٹ گئی۔ میں اسے ایک لات رسید کرتے کرتے رہ گیا۔ میں تیزی سے گھوما اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

علی اختر سے میری اس تلخ اور بے نتیجہ ملاقات کو اس وقت بیس دن گزر چکے تھے، جب ایک شام میں نے آفس سے اپنی بیگم کو فون کر کے بتایا کہ میں رات کو دیر سے گھر آؤں گا، وہ میرا انتظار نہ کرے، مجھے ایک سیریل کی ڈائریکشن کی ذمے داریاں ملنے کی امید پیدا ہو رہی تھی، اس سلسلے میں میری دو میٹنگز طے تھیں جن میں خاصا وقت لگنا تھا۔ میری بیوی نے ''ٹھیک ہے'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ میری اس قسم کی اطلاع کے جواب میں عام طور پر وہ خشک لہجے میں صرف یہی دو الفاظ کہہ کر فون بند کر دیتی تھی۔

میں رات گئے گھر پہنچا تو بری طرح تھکا ہوا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ تمام تر تھکن کے باوجود مجھے نیند نہیں آئے گی، اس لیے میں نے نیند کی گولی کھائی اور چادر سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کس وقت نیند آئی۔ لیکن جب کسی نے بری طرح جھنجوڑ کر مجھے جگایا تو مجھے یہی لگا جیسے میں صرف چند منٹ سو پایا تھا۔ آنکھیں کھولنے پر مجھے ایک دھندلا سا چہرہ نظر آیا جو میری بیوی کا معلوم ہوتا تھا۔

''جلدی اٹھو......'' جب اس نے چیخ کر کرخت آواز میں کہا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری بیوی کا ہی چہرہ تھا۔

اٹھنے کے لیے مجھے جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے کھینچ کھانچ کر نہ صرف مجھے اٹھا کر بٹھا دیا بلکہ تقریباً اسی طرح کھینچتی ہوئی لاؤنج میں لے گئی اور دیوار پر لگے ٹی وی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''ذرا یہ خبر دیکھو۔''

ٹی وی اسکرین پر علی اختر کا بڑا سا کلوز اپ نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈائننگ ٹیبل کا سہارا لیا، پھر اپنے آپ کو ایک ڈائننگ چیئر پر تقریباً گراتے ہوئے کہا۔ ''ارے بھئی، رات علی اختر کا بہت بڑا شو تھا۔ اس کی خبر آ رہی ہو گی۔ میرے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے مجھے گہری نیند سے جگانے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے اپنے لہجے سے بیزاری اور عدم دلچسپی ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔

''احمق آدمی! کانوں کی میل صاف کر کے ذرا دھیان سے سنو، نیوز کاسٹر کیا کہہ رہی ہے...... اور تصویر کے نیچے ٹکر بھی چل رہے ہیں۔'' میری بیوی نے غالباً دانت پیس کر کہا۔

میں نے کانوں میں انگلیاں پھیریں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ اس پر منظر بدل رہے تھے اور نیوز کاسٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''تفصیلات کے مطابق، اوپن ایئر تھیٹر میں کنسرٹ کے دوران جیسے ہی علی اختر نے آ کر اسٹیج پر اپنا وہ گانا شروع کیا جو ان دنوں مقبول بھی ہو رہا ہے لیکن جس پر ایک مخصوص حلقے کی طرف سے دبی دبی تنقیدی آوازیں بھی سنائی دی ہیں، تو کسی نے چیخ کر ایک لفظ پر احتجاج کیا، کھچا کھچ بھرے ہوئے اوپن ایئر تھیٹر میں بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی احتجاج اور چیخ پکار شروع کر دی۔ اسٹیج پر بوتلیں اور دوسری چیزیں پھینکی جانے لگیں۔ ہنگامہ آرائی بڑھتے دیکھ کر علی اختر

اپنے گٹار کی مدد سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اسٹیج کے پیچھے جانے ہی لگے تھے کہ اگلی صفوں کی کرسیوں پر چڑھے ہوئے حاضرین میں سے کسی نے گولی چلادی۔ گولی علی اختر کے سینے میں لگی اور وہ اسٹیج پر گر پڑے۔ انہیں جلد ہی اسپتال لے جایا گیا لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ اس وقت تک جاں بحق ہو چکے تھے۔ کنسرٹ کی فوٹیج میں ایک شخص کی جھلک چند سیکنڈ کے لیے نظر آئی ہے جو بازو اونچا کررہا ہے اور اس کے ہاتھ میں پسٹل ہے۔ وہ لمبے بالوں، گھنی داڑھی اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں والا کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے جو شاید بھیڑ بھاڑ اور افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اوپن ایئر تھیٹر سے غائب ہوگیا۔ ابتدائی تفتیش میں پولیس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس شخص کا تعلق مذہبی انتہا پسندوں کے کسی گروہ سے بھی ہوسکتا ہے جو گانے بجانے کو لہو ولعب میں شمار کرتے ہوئے اپنے انداز سے ان سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کررہے ہیں یا پھر وہ کٹر قومیت پرستوں کے کسی ٹولے کا کارندہ بھی ہوسکتا ہے جن کی طرف سے پچھلے دنوں گانے کے ایک بول میں استعمال کیے جانے والے لفظ پر اعتراض اٹھایا تھا۔ پولیس نے کنسرٹ کی فوٹیج قبضے میں لے کر ممکنہ قاتل کی تلاش شروع کردی ہے۔"

خبر میں وہ فوٹیج بھی دکھائی جارہی تھی لیکن بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ آرائی میں صرف دو تین سیکنڈ کے لیے نظر آنے والا وہ شخص ناقابلِ شناخت معلوم ہوتا تھا۔

"اوہ میرے خدا......" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کراہنے کے سے انداز میں کہا۔ خبر ابھی جاری تھی لیکن میں نے ٹی وی کی طرف سے نظر ہٹالی۔ میری بیوی قریب کھڑی تشویش زدہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"علی اختر کو تم نے ہی انٹروڈیوس کرایا تھا نا......؟" اس نے تاسف زدہ سے لہجے میں تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بہت شاندار فنکار اور بہت شاندار انسان تھا۔ میرا لگایا ہوا پودا جب تناور درخت بن گیا تو کسی ظالم نے اسے کاٹ ڈالا۔" پھر میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور گویا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کے جنازے میں شرکت کرنا ہوگی۔ اس کے منیجر کو فون کرکے معلومات لیتا ہوں۔ ذرا میرے بیڈروم سے میرا فون اٹھا کر لانا۔ مجھ میں تو اس وقت کرسی سے اٹھنے کی بھی سکت نہیں رہی ہے۔"

میری بیوی خاموشی سے گئی اور میرا فون اٹھالائی۔ میں نے علی اختر کے منیجر کا نمبر ملایا تو میری انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ کئی مرتبہ کی کوشش کے بعد میں نے فون بند کرکے ڈائننگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "مسلسل انگیج مل رہا ہے۔ خیر...... میرا خیال ہے اس کی تدفین میں ایک دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔ اخباروں میں، اور ٹی وی چینلز پر خبر آجائے گی۔ میں جنازے میں شرکت کرہی لوں گا۔"

کچھ دیر میں اور میری بیوی علی اختر کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس کی جواں مرگی پر اظہارِ افسوس کرتے رہے۔ پھر میں معمول کے مطابق تیار ہوا اور ناشتا کر کے دفتر روانہ ہوگیا۔ راستے میں، میں نے تین اخبار خریدے۔ ان میں بھی علی اختر کے قتل کی خبر صفحہ اول پر موجود تھی۔ یہ رات کے تقریباً بارہ بجے کا واقعہ تھا لیکن تمام اخبارات میں رپورٹ ہوگیا تھا۔ دفتر پہنچ کر میں نے ٹی وی آن کرلیا۔ ہر چینل سے شاید ہر بلیٹن میں علی اختر کے قتل کی خبر نشر ہورہی تھی اور اخبارات میں بھی یہ خبر جلی سرخیوں میں علی اختر کی تصویر کے ساتھ موجود تھی لیکن کسی بھی خبر کو سُن کر یا پڑھ کر کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ علی اختر کا قاتل کون ہوسکتا تھا یا اس قتل کا محرک اور مقصد کیا ہوسکتا تھا۔ بظاہر یہ ایک اندھا قتل معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک طویل کش لیا۔ میرے ذہن میں یادوں کی ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے میری سگریٹ ختم ہوگئی اور میں نے اسے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ اس کے بعد بھی میرے پاس یادوں کی وادیوں میں بھٹکنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ میں بے پناہ تھکن محسوس کررہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے زندگی میں کچھ زیادہ ہی بھاگ دوڑ، زیادہ ہی محنت کرلی ہو۔ چند لمحے بعد دروازے پر ہلکی سی دستک سن کر میں نے آنکھیں کھولیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یس...... کم ان۔" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور نیلم اندر آگئی۔ وہ سیاہ لباس میں تھی۔ میک اپ سے بے نیاز اس کا چہرہ اور متورم سی آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی ڈورے بتارہے تھے کہ وہ نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ وہ یقیناً صحیح معنوں میں علی اختر کی موت کا سوگ منارہی تھی۔ مجھے یہ تو یقین تھا

کہ علی اختر کی موت کے بعد وہ میرے پاس ہی واپس آئے گی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی واپس آجائے گی۔ میری دھڑکنیں اتنی تیز ہوگئیں کہ ان کی دھمک مجھے اپنی کنپٹیوں میں سنائی دینے لگی۔

''آؤ نیلم...... آؤ۔'' میں میز کا سہارا لے کر جلدی سے اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں گھر سے ٹی وی پر علی اختر کے بارے میں خبر سن کر آرہا ہوں۔ یہاں آکر اخبارات میں بھی پڑھا۔ بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔ میں تو ہل کر رہ گیا ہوں۔ میں نے اس کے منیجر سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا نمبر مسلسل انگیج مل رہا ہے۔ میں اس کے جنازے میں ضرور شرکت کروں گا۔ کیا تدفین کا کوئی پروگرام طے ہوگیا ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں دیے، گردن ذرا ٹیڑھی کیے، میز کے دوسری طرف کھڑی ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس سوگ کے عالم میں وہ مجھے پہلے سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اگر اس وقت کوئی ماہر فوٹوگرافر یا مصور اس کی تصویر بناتا تو وہ ایک شاہکار ہوتی۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ اسی طرح کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کے حزن و ملال اور سوگواری کے علاوہ بھی کچھ تھا جو میری روح تک کو بے چین کر رہا تھا۔

آخرکار اس نے ایک طویل سانس لی، ہاتھ بغلوں سے نکالے اور ایک کرسی کے پشتے کو مضبوطی سے تھام کر گویا اس کا سہارا لیتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو پروڈیوسر یا ڈائریکٹر نہیں، ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔ علی اختر کو قتل کر کے آپ کتنے انجان بنے ہوئے ہیں۔ کتنے لاتعلق اور پُرسکون دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ کو شاید ذرا بھی احساس نہیں کہ آپ نے صرف میری دنیا نہیں اجاڑی بلکہ اس ملک کا بھی بہت بڑا نقصان کیا ہے۔ کتنا اچھا آرٹسٹ تھا علی اختر...... دولت اور شہرت کمانے کے ساتھ ساتھ وہ ملک کا نام بھی روشن کرتا تھا۔''

میرے سر پر جیسے کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے غصے سے کہا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو تم...... میں نے زندگی میں کبھی مکھی بھی نہیں ماری۔ میں بھلا اتنے بڑے اور مشہور فنکار کو کیسے قتل کر سکتا ہوں؟ یہ احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں آیا کیسے؟''

''اس کنسرٹ کی فوٹیج میں ہنگامے کے منظر میں، گولی چلانے والے کی صرف ایک جھلک ہی نظر آئی لیکن میں نے آپ کو تمام تر گیٹ اَپ کے باوجود پہچان لیا۔'' اس کے لہجے میں میرے لیے نفرت تھی جو میرے دل پر قیامت ڈھا رہی تھی لیکن سرِدست میں نے اپنی دلی کیفیات کے بجائے اپنی توجہ صورتِ حال پر مرکوز رکھنے اور اپنی خود اعتمادی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے چند سیکنڈ کی اس فوٹیج میں ہی آپ کو پہچانا۔ اس سے پہلے مہینوں تک روزانہ آپ کی اصلی شکل گھنٹوں تک دیکھتے رہنے کے باوجود میں نے آپ کو نہیں پہچانا تھا۔''

''اپنی یہ احمقانہ کہانی لے کر پولیس کے پاس مت چلی جانا۔ بہت ذلت اٹھانی پڑے گی تمہیں۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''امید تو ہے کہ ذلت نہیں اٹھانی پڑے گی۔'' اس نے اپنے شولڈر بیگ سے فون نکالا اور کوئی نمبر ملایا۔ اس نے چند سیکنڈ کے لیے فون کان سے لگایا لیکن کوئی بات نہیں کی۔ سلسلہ منقطع کر کے فون واپس بیگ میں ڈال لیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نیلم کا طرزِ عمل مجھے بہت پُراسرار لگ رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد کسی نے دستک دیے بغیر زوردار جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ چار پولیس والے دھب دھب کرتے اندر آگئے۔ آگے ایک انسپکٹر تھا۔ پیچھے اس کے تین ماتحت تھے۔ انسپکٹر کا ہاتھ اس کے ہولسٹر پر تھا اور وہ قہرآلود نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے سوالیہ سی نظروں سے نیلم کی طرف دیکھا۔

وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! برابر والے کمرے میں چلے جائیں۔ ویسے تو آپ کو پورے ہی کمرے کی تلاشی لینی ہے لیکن وہاں چار دروازوں والی ایک الماری ہے...... اس کی خاص طور پر تلاشی لینی ہے۔ اس میں ایسا سامان بھرا ہوا ہے جسے شوبز کی دنیا میں ''پراپس'' (Props) کہتے ہیں۔ گیٹ اَپ کا سامان ہو گا۔ کچھ ایسی چھوٹی موٹی چیزیں ہوں گی جو آڈیشن میں، یا شوٹنگ وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے، میں نے جن چیزوں کا آپ سے ذکر کیا تھا، وہ آپ کو وہاں مل جائیں گی۔''

انسپکٹر ایک ماتحت کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے

میں چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ واپس آ گیا اور میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چابیاں دو۔ اس الماری کے چاروں دروازے لاک ہیں۔''

میں نے ایک لمحے توقف کیا تو وہ دہاڑا۔ ''چابیاں دو...... ورنہ میں تالے توڑ دوں گا۔'' اس کا لہجہ ہی نہیں، تاثرات بھی خوفناک تھے۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ گر گیا۔ میری ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی جان ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے میز کی دراز کھولی اور چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ دوبارہ برابر والے کمرے میں چلا گیا اور وہاں سے کھٹر پٹر کی آوازیں آنے لگیں۔

نیلم بھی تھکے تھکے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور پشتے سے سر ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو پولیس والے کمرے میں ہی کھڑے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو یوں مجھ پر گن بھی تان لی تھی جیسے میں فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ مجھ میں اس وقت بھاگنے کی تو کیا، کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

انسپکٹر جلد ہی دوسرے کمرے سے لوٹ آیا۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا، جیسے وہ کسی پولیس مقابلے سے کامیاب واپس آیا ہو۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پستول، لمبے بالوں والی ایک وگ، جھاڑ جھنکاڑ سی ایک بڑی سی داڑھی اور ڈینم کی ایک بڑی سی شرٹ تھی۔ نیلم نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر ان چیزوں کو دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ انسپکٹر سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو فوٹیج میں نظر آئی تھیں، جن کی مدد سے علی اختر کے قاتل نے اپنا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا کہ سر فرحان کے حالات آج کل ٹھیک نہیں ہیں، وہ ان چیزوں کو پھینکیں گے نہیں...... بلکہ انہیں سنبھال کر رکھ لیں گے کہ شاید آئندہ کسی آڈیشن یا شوٹنگ میں کام آ جائیں۔''

اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا بڑا گدھا تھا۔ میں نے نہ صرف ان چیزوں کو سنبھال کر رکھ لیا تھا بلکہ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ نیلم اتنے دن میرے دفتر میں رہی تھی، اس دوران یقیناً اس نے ہر چیز کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہوگا۔

میں نے کراہنے کے سے انداز میں نیلم کو مخاطب کیا۔ ''تم نے میری مخبری کیوں کی نیلم؟ تمہیں تو مجھ سے محبت کا دعویٰ تھا۔''

''محبت......؟'' اس نے چونک کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر گویا بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولی۔ ''اوہ...... اچھا......! وہ جو میں آپ سے ''آئی لو یو...... آئی لو یو......'' کہتی رہتی تھی...... شاید آپ نے اس کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے اصل جذبات اور تاثرات کی طرف آپ کا دھیان نہیں گیا۔ آپ کے کان آپ کو وہی سناتے رہے جو آپ کا دل سننا چاہتا تھا۔ ''آئی لو یو'' تو بچے اپنے والدین سے، اور والدین اپنے بچوں سے بھی کہتے رہتے ہیں۔ یہ میری وہ محبت نہیں تھی جو آپ سمجھتے رہے۔ یہ تو شکر گزاری تھی...... ممنونیت تھی...... احسان مندی کی ایک شکل تھی۔ اب تو میرے پاس آپ کے لیے یہ بھی نہیں رہی۔ آپ نے علی اختر کو قتل کر دیا۔ میری اصل محبت کو قتل کر دیا۔ مجھے آپ سے سخت نفرت ہے...... سخت نفرت......'' وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

''او...... بی بی! بند کرو اپنی یہ ڈائیلاگ بازی......'' انسپکٹر نے اسے ڈانٹا۔ ''یہاں کوئی فلم یا ڈراما نہیں بن رہا۔''

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ میرے دل اور ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میرا زور زور سے رونے اور اپنا سر پیٹنے کو جی چاہ رہا تھا لیکن میں بُت بنا بیٹھا ایک ٹک نیلم کو تک رہا تھا۔

''او چاچا......'' انسپکٹر نے میرا کندھا زور سے ہلایا۔ ''تم یہاں کیا دیوداس بنے بیٹھے ہو۔ اٹھو...... تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ تمہاری باقی فلم جیل اور کورٹ میں بنے گی۔ ویسے تم ابھی سے اپنی زندگی کی فلم کا ''دی اینڈ'' ہی سمجھو۔''

میری زندگی کی فلم کا ''دی اینڈ'' تو ابھی نہیں ہوا لیکن کچھ پتا نہیں، کب ہو جائے۔ مجھے چودہ سال کی سزائے قید بامشقت ہوئی تھی جس میں سے ابھی صرف ایک سال گزرا ہے لیکن مجھے لگتا ہے، ایک صدی گزر گئی ہے۔ گو کہ مجھے حقیقت میں صرف سات سال ہی جیل میں گزارنے ہیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ شاید جیل میں ہی میری زندگی کی شام ہو جائے۔ میں نے مشغلے کے طور پر کچھ عرصے سے روز رات کو جیل کی کوٹھری کے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کی تھی۔ خدا کا شکر ہے، میں اسے یہاں تک مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کل کیا ہونا ہے، یہ اوپر والا جانے۔

❖❖❖

قرشی

گیسٹوفل

گیس، سینے کی جلن اور بدہضمی کیلئے

گیسٹوفل لو

سب ہضم ہو!

QarshiNaturalHealth | www.qarshi.com | www.qarshihealthshop.c